دہلی
110 قلم کار
12 افسانے 104 نظمیں 145 غزلیں
'دہلی کی اردو اکادمی'
ناولٹ: مصطفیٰ کریم
'شہریار کا شعری تفاعل'
گوشۂ اختلاف
اور بہت کچھ
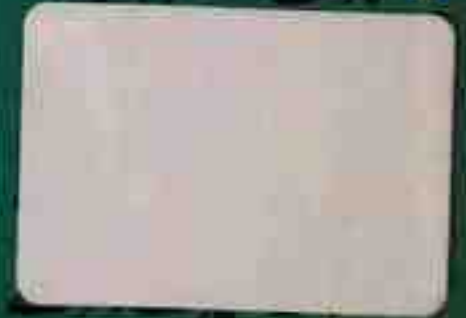
ادب ساز

اردو ادب کا عالمی جریدہ

مدیر

نصرت ظہیر

سہ ماہی ادب ساز دہلی

جلد 5: شمارہ 15-16-17-18 اپریل۔جون: جولائی۔ستمبر: اکتوبر۔دسمبر 2010: جنوری۔مارچ 2011

مدیر: نصرت ظہیر

انتظامی مدیر: مودود صدیقی

معاون مدیر: ثمینہ پروین، شبنم پروین

قانونی مشیر: عنبر قمر الدین، بی اے آنرز، ایل ایل۔ایم، ایڈوکیٹ سپریم کورٹ آف انڈیا

کمپوزنگ: شاہینہ عباسی، دریا گنج، دہلی۔2

مطبع: شوبی آفسیٹ پریس، دریا گنج، نئی دہلی۔2

قیمت فی شمارہ: ہندوستان: پیپر بیک:300 روپے، مجلد:400 روپے، لائبریری ایڈیشن (ہندوستان) 500 روپے

دیگر ممالک: بذریعہ ائر میل: پیپر بیک:US$25 ڈالر/15 یورو/15 پاؤنڈ، مجلد:US$27 ڈالر/17 یورو/17 پاؤنڈ

Library Edition Price Per Issue(India): Rs 500/-

ترسیل زر: چیک/ڈرافٹ بنام: Nusrat Zaheer Ahmed [دہلی (انڈیا) میں قابلِ ادائگی]

ترسیل زر، خط وکتابت کا پتہ: T-37، ہڈکو پلیس، اینڈریوز گنج، نئی دہلی-110049 (انڈیا)

T-37, HUDCO Place Andrews Ganj New Delhi-110049 (INDIA)

منی ٹرانسفر: بنام: Nusrat Zaheer Ahmed اکاؤنٹ نمبر: 9017-201-34335

بنک: Syndicate Bank Indra Prastha Estate, New Delhi-110 002

ای میل: nusratzaheer@gmail.com تخلیقات ان پیج یا دوسرے فارمیٹ میں ای میل کی جا سکتی ہیں

سیل فون: نئی دہلی: 011-9716145593

فون: دفتر: اینڈریوز گنج نئی دہلی: 011-26252715،26253033

سرورق: تصاویر: واجدہ تبسم، ساجدہ زیدی، ساجد رشید اور صلاح الدین پرویز

کور ڈیزائن: کبیر اجمل

بابائے اردو

گوپی چند نارنگ

کی نذر

جنھوں نے پاکستان سے ہندوستان ہجرت کرکے اُس زبان کا دامن تھاما
جسے یتیم و بے آسرا چھوڑ کر غلام ہندوستان کے 'بابائے اردو' مولوی عبدالحقؒ پاکستان ہجرت کر گئے تھے!
جنھوں نے اپنے ہزاروں دل نشیں خطبات اور بے شمار روشن تحریروں سے اردو کی مشترکہ تہذیب کا پرچم بلند رکھا اور
تقسیم وطن کی وجہ بننے کے اس داغ کو دھو ڈالا جو محترم مولوی صاحب
نے اردو تحریک کو پاکستان کی تحریک سے جوڑ کر اس کی پیشانی پر ثبت کر دیا تھا
اور جس کی وجہ سے آگے چل کر پاکستان کی تقسیم کا سبب بھی اردو ہی ٹھہرا دی گئی تھی!
'ادب ساز' اردو زبان کی تہذیبی قوت اور ثقافتی توانائی کو انگیز کرنے، اسے اپنے ضمیر و خمیر کا حصہ بنانے
اور اپنی اکیاسی سالہ زندگی کے بیش تر لمحات آزاد ہندوستان اور باقی دنیا میں اردو کے احیا اور اس کی شان دوبالا کرنے
کے عمل میں صرف کر دینے والے پدم بھوشن پروفیسر گوپی چند نارنگ کو
اس ملک میں 'بابائے اردو' کے لقب کا اصل حقدار مانتا ہے اور اس نابغۂ روزگار ہستی کو سلام کرتا ہے!

ترتیب

آداب/7

باب احتساب:

محاسبہ/دہلی اردو اکادمی/9

نئی بات/19

خراج عقیدت/21

باب تنقید و تحقیق/41

گوشۂ معاصرین/67

باب غزل/91

باب افسانہ/137

رونقِ محفل

آداب

ترقی پسندی اور جدیدیت کی بحث پرانی ہو چکی۔ اتنی پرانی کہ اسے اب اردو ادب کے ماضی کا حصہ سمجھ لیا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ مابعد جدیدیت بھی تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا کے تقاضوں کے سامنے تاریخ کا حصہ بنتے جا رہی ہے، بلکہ بعض لوگوں کے نزدیک تو وہ اس عمل سے گزر بھی چکی ہے۔ کم و بیش اسی عمل کا حوالہ ریئلزم، سرریئلزم اور ساختیات و پس ساختیات کی تھیوریوں اور نظریوں کے تعلق سے بھی دیا جا سکتا ہے اور بہتوں نے دیا بھی ہے کہ اب ادب کے اور بھی نئے پہلوؤں پہ نظار جانے لگی ہے—— یہی زندگی ہے۔

آپ کتنی بھی ادق اور دور از کار تنقیدی اصطلاحات کا استعمال کر کے مختلف تھیوریوں اور تصورات کی توضیح کرتے رہیے، انھیں ایک دوسرے سے متصادم کرتے جائیے، کسی ایک نظریے کو دوسرے نظریے پر مقدم ٹھہرانے کے لیے اپنی تاویلیں اور دلیلیں سامنے رکھ کر دیکھ لیجیے۔ جو بھی آج نیا ہے کل پرانا ہو جائے گا۔ جو آج اجنبی ہے کل اس میں شناسائی کی جھلک ملنے لگے گی۔ جو آج باعثِ استعجاب ہے کل وہی معمول ٹھہرے گا اور پھر ایک دن متروکات میں بھی شامل ہو جائے گا۔ زندگی یہی ہے۔ مسلسل تغیر پذیر۔

مگر یہ بھی تو کوئی نئی بات نہیں ہے۔ زندگی، ہر لحظہ ہر آن، مسلسل بدلتی ہے، اس حقیقت کو لوگ صدیوں سے جانتے مانتے اور پہچانتے آئے ہیں۔ زندگی کا یہ دریا اور اس کا یہ دھارا کسی ایک سمت یا سیدھی لکیر میں نہیں بہتا۔ اس کے بہاؤ کی ان گنت شکلیں اور سمتیں ہیں۔ اس میں نہ جانے کتنی پستیاں بلندیاں، موڑ اور مرحلے آتے رہتے ہیں، جاتے رہتے ہیں۔ صرف ایک بات طے ہے۔ اس کا سفر کبھی رکتا نہیں ہے۔

ادب بھی اسی زندگی کا حصہ ہے۔ چنانچہ وہ بھی اپنی تمام تر توضیحات، حسیات اور تعبیرات و تصورات کے ساتھ تبدیلی و تغیر کے سفر پر گامزن رہتا ہے۔ لیکن یہ سفر، بے گانگی یا لاتعلقی کا سفر نہیں ہے۔ یک رخا بھی نہیں ہے۔ زندگی کی طرح اس کی بھی اپنی کئی سمتیں اور شکلیں ہیں۔ پھر یہ ایسا سفر بھی نہیں ہے جس میں ہمیشہ آگے بڑھا جاتا ہو۔ کبھی یہ پیچھے کی طرف بھی ہوتا ہے۔ کبھی کسی ایک دائرے میں بھی گھومتا نظر آتا ہے۔ کبھی یہ داخل کا سفر ہوتا ہے۔ کبھی صرف خارج کا۔ اس میں سب کچھ پیچھے نہیں چھوڑ دیا جاتا۔ جو کام کا ہے اسے یہ سفر انگیز کر لیتا ہے اور جو کام کا نہیں ہے اسے کھڑکی سے باہر خس و خاشاک کے ڈھیر پر پھینک دیتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجیے۔ وہ جو ٹھوں ٹھوں ٹھاں ٹھاں ٹھام اور ریل کا چکا جام کرنے والا ادب تھا اور جسے اس سفر نے کوڑے دان میں ڈال دیا تھا وہی کوڑے دان صرف رمز و ایمائیت اور علامتیت کے علاماؤں کا بھی تازہ ترین پوسٹل ایڈریس بن گیا ہے۔

'ادب ساز' کا یہ پہلا عام شمارہ ہے جس میں کسی ایک شخصیت کا 'گوشہ' خصوصی مطالعے کے طور پر نہیں رکھا گیا ہے۔ اس کے باوجود 'خراجِ عقیدت'، 'بابِ تنقید و تحقیق' اور 'گوشۂ معاصرین' کے تحت آپ کی ملاقات کئی اہم شخصیتوں سے ہوگی اور ان میں بعض شخصیتوں کو آپ ان کی تخلیقات کی روشنی میں بھی پڑھ سکیں گے۔ مصطفیٰ کریم کا ناولٹ تقریباً دو سال کی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے تاہم یہ اب بھی نیا ہے۔ ایم کاویانی کے تحریر کردہ ڈرامے کی بھی یہ پہلی اشاعت ہے۔ 'گوشۂ اختلاف' میں سکندر علی وجد اور ظ انصاری کی دل چسپ ادبی نوک جھونک کے تراشے پہلی بار یکجا ہو کر چھپ رہے ہیں جس کے لیے ہم ایم کاویانی کے شکر گزار ہیں۔ کرامت علی کرامت اور بلقیس ظفیر الحسن نے علی الترتیب اڑیہ اور تمل زبانوں کی جو کہانیاں ترجمہ کر کے عنایت کی ہیں وہ اپنے آپ میں بڑی ہی دل دوز کہانیاں ہیں اور انھیں پڑھ کر یہ بھی اندازہ ہوتا ہے ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں جو نثری تخلیقی ادب، ادبی تھیوریوں کے جھنجھٹ میں پڑے بغیر لکھا جا رہا ہے وہ مواد content کے لحاظ سے ہی نہیں طرزِ بیان، تکنیک کے استعمال اور treatment کے دیگر پہلوؤں سے بھی ہمارے عصری اردو فکشن سے اعلیٰ اور ارفع ہے۔

ساڑھے تین سو صفحات والے اس شمارے میں تخلیقی ادب کو تقریباً دو تہائی اسپیس ملی ہے، جو بڑی حد تک اطمینان کا مقام ہے۔ ہماری کوشش رہے گی کہ آئندہ شماروں میں بھی یہی تناسب برقرار رہے۔

مدیر

قلم کاروں سے گزارش

گر آپ چاہتے ہیں

ادب ساز

وقت پر شائع ہوتا رہے

اس کی اشاعت پر آنے والے خرچ میں کمی آئے

مضامین وتخلیقات کے متن میں اغلاط راہ نہ پائیں

تو

یہ سب آپ کے تعاون سے ممکن ہے

اپنے مضامین اور تخلیقات

اردو کی ٹائپ شدہ فائل میں خود اچھی طرح پروف پڑھ کر بذریعہ ای میل بھیجیں

یاد رکھیں

خط وکتابت اور مراسلت میں اردو ٹائپ، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے استعمال کو عادت بنانا

دراصل اردو زبان کی ہی خدمت ہے!

اگر آپ کمپیوٹر پر کام کرنا نہیں جانتے تو فوراً سیکھیے، یہ بہت ہی آسان ہے...

ورنہ 'ادب ساز' تو یوں بھی چھپ ہی جائے گا

nusratzaheer@gmail.com

Mobile: 09716145593

بابِ احتساب

محترمہ شیلا دیکشت کے نام

ملک کی ایک درجن سے زائد ریاستی اردو اکادمیوں کے کام کا اور کام کے منظم انداز کا درجہ طے کرنے کے لیے اگر کوئی امتحان منعقد کرایا جائے تو دہلی کی اردو اکادمی کو بلاشبہ دس میں سے کم از کم نو نمبر مل جائیں گے۔ ایک نمبر اُسے اس لیے کم ملے گا کہ کام میں سدھار کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔ چنانچہ دہلی اردو اکادمی کے کام میں بھی یہ گنجائش موجود ہے۔ اس مجموعی تاثر کے ساتھ 'ادب ساز' دہلی کی وزیر اعلیٰ اور دہلی اردو اکادمی کی چیرپرسن محترمہ شیلا دیکشت کو اکادمی کے حسن کارکردگی کے لیے مبارکباد پیش کرنے کے ساتھ درخواست گزار ہے کہ اکادمی کو مزید استحکام بخشنے، بالخصوص اردو کی تعلیم و تدریس اور اردو خواندگی کی اسکیم کا دائرہ بڑھانے کے لیے اکادمی کے بجٹ میں خاطر خواہ اضافہ پر غور فرمائیں اور دہلی حکومت کے آئندہ سالانہ بجٹ میں اس تعلق سے کوئی ایسا اعلان کریں کہ دہلی کی اردو آبادی کے لاکھوں چہرے کھل اٹھیں۔ مدیر

محاسبہ: اردو اکادمی دہلی

محاسبہ

دھلی کی اردو اکادمی

ادارہ

'ادب ساز' نے گزشتہ سال ، ملک کے مقتدر اردو اداروں کی کارکردگی اور مجموعی صورت حال کا ایک معروضی جائزہ لینے اور محاسبہ کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا سب سے پہلے ملک کی سب سے پرانی اردو تنظیم ، انجمن ترقی اردو (ھند) کا جائزہ پیش کیا گیا ، جس کی معروضیت اور غیر جانب داری کی داد، اس ادارے کے مالک و مختار بن کر بیٹھے ہوئے ، ھر جائزو ناجائز طریقے سے ذاتی منفعت کے لیے انجمن کا استحصال کرنے والے سیکریٹری اور اردو کے مشھورومعزز محقق و نقادجناب ڈاکٹر خلیق انجم کے معززحامیوں نے بھی دی۔ اس سلسلے میں اگلا نمبر دھلی کی اردو اکادمی کا تھا، لیکن آئندہ شمارہ ساحر لدھیانوی کی شخصیت کو منسوب ہونے کے سبب سے اسے شمارے میں شامل نہیں کیا جاسکا۔ چنانچہ ملک کی سب سے بڑی صوبائی اردو اکادمی کی محاسبہ رپورٹ زیر نظر شمارے میں پیش کی جارھی ھے۔ ایک صفحہ گزشتہ محاسبے کے اثرات اور فالو اپ follow up کے لیے مخصوص کیا گیا ھے۔ آئندہ شماروں میں بھی یہ سلسلہ برقرار رھے گا اگلا محاسبہ 'غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دھلی' کا ھوگا اور اس کے بعد ھم 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان' کا رخ کریں گے (اس ترتیب کا اشارہ 'ادب ساز' کے ایک اداریے میں پہلے ھی دیا جاچکا ھے) ان اداروں کے بعد فھرست احتساب میں دور درشن اردو چینل، مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی ،خدا بخش اورنیٹل لائبریری پٹنہ، رام پوررضا لائبریری اور دوسری صوبائی اردو اکادمیاں شامل ھیں۔ احتساب کے تعلق سے ھم یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ھیں کہ: * اس میں معروضیت و شفافیت کا پورا خیال رکھا جائے گا * ھر بات پوری تصدیق کے بعد لکھی جائے گی * ذاتی معاملات کو نہیں چھیڑا جائے گا * ادارہ 'ادب ساز' اپنی کہی ھوئی ھر بات کے لیے پوری طرح جواب دہ اور ذمہ دار ھو گا ۔ اردو کے عوام و خواص کو اس زبان کی ترقی میں لگے ھوئے اداروں کی کارکردگی سے واقف کرانا، کہیں پر کوئی کمی پائی جاتی ھے تو اسے مثبت و ھمد ردانہ اور صحت مند انداز فکر کے ساتھ دور کرنے کی تدابیر تجویز کرنا اور اول و آخر تمام اردو والوں کو ان اداروں میں دل چسپی لینے کی طرف راغب کرنا اس سلسلۂ احتساب کا اصل مقصد ھے۔ اب ملاحظہ کیجیے 'اردو اکادمی دھلی' کا احوال:

قومی راجدھانی دہلی کی اردو اکادمی کی اہمیت اور کارکردگی کو اگر ایک جملے میں بیان کرنا ہو تو صرف یہ کہنا کافی ہے کہ یہ ملک کی سب سے بہتر اردو اکادمی ہے جس کی اعلیٰ اور ہمہ گیر کارکردگی کے برابر تو کیا آس پاس بھی کوئی اردو اکادمی نظر نہیں آتی۔ اور وہ بھی تب جب کہ یہ اکادمی اُس مرکزی خطے کی صوبائی حکومت کے ماتحت کام کرتی ہے جسے مکمل ریاست کا درجہ بھی حاصل نہیں ہے۔ جس کی اٹھارہ سال پرانی اسمبلی میں صرف 70 نشستیں ہیں، جس کی وزارتی کونسل وزیر اعلیٰ سمیت صرف 7 لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے اور جہاں اردو کو صرف آٹھ سال پہلے شیلا دیکشت حکومت کی طرف سے ہونے والی زبردست کھینچ تان کے بعد مرکز کی این ڈی اے حکومت نے سرکاری درجے کی منظوری دی تھی۔ وہ بھی پنجابی کے ساتھ!

ہندوستان میں اردو، سرکاری سطح پر

ملک کی اٹھائیس ریاستوں اور سات مرکزی زیر انتظام علاقوں میں اردو کی سرکاری صورت حال مختصراً اس طرح ہے:

■ صرف ایک ریاست (جموں و کشمیر) میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔

■ صرف پانچ ریاستوں میں اردو کو سرکاری طور پر تسلیم شدہ زبانوں میں شامل کیا گیا ہے۔ ان میں بھی صرف تین صوبوں، آندھرا پردیش، بہار اور اتر پردیش میں اردو اس درجہ پر فائز واحد زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ باقی دو صوبوں میں اردو کو یہ درجہ اتراکھنڈ میں سنسکرت کے ساتھ اور مغربی بنگال میں حال ہی میں، پنجابی، نیپالی، اول چکی Ol-Chiki، اڑیہ اور ہندی کے ساتھ دیا گیا ہے۔ گویا مغربی بنگال میں بنگلا پہلی سرکاری زبان ہے اور دوسرے درجے پر 6 زبانیں سرکاری طور تسلیم شدہ ہیں اور اردو اُن میں صرف ایک ہے۔

■ مرکزی زیر انتظام علاقوں میں صرف قومی راجدھانی خطہ دہلی میں اردو کو یہ دوسرا درجہ حاصل ہے، لیکن پنجابی زبان کے ساتھ!

■ مکمل ریاستی درجہ والے صوبوں میں سے، اروناچل پردیش، چھتیس گڈھ، گوآ، گجرات، ہماچل پردیش، جموں و کشمیر، جھارکھنڈ، کرناٹک، کیرل، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، منی پور، میزورم، ناگالینڈ، اڑیسہ، پنجاب، سکم، تمل ناڈو اور تری پورہ وہ انیس 19 ریاستیں ہیں جہاں دیگر سرکاری تسلیم شدہ زبان کا خانہ ایک دم خالی ہے اور اس درجہ پر نہ اردو ہے نہ کوئی اور زبان۔ مرکزی زیر انتظام خطوں میں انڈمان۔ نکوبار جزائر، چنڈیگڑھ، دادرا۔ نگر حویلی اور لکش دیپ وہ چار خطے ہیں جن میں یہ خانہ ابھی تک خالی چل رہا ہے۔

■ ان میں جن ریاستوں میں اردو اکادمیاں قائم ہیں وہ اس طرح ہیں: آندھرپردیش، اتر پردیش، بہار، پنجاب، چھتیس گڑھ، راجستھان، کرناٹک، گجرات، مدھیہ پردیش، مغربی بنگال، مہاراشٹر، ہریانہ اور قومی راجدھانی خطہ دہلی۔

■ کشمیر میں اردو اکادمی کی بجائے باقاعدہ ایک وزارت برائے تہذیبی وثقافتی امور ہے اور وہی اردو زبان وادب سے متعلق کام کاج دیکھتی ہے۔

■ جھارکھنڈ، اور اتراکھنڈ دو ریاستیں ہیں جن کے علاقے پہلے اردو اکادمیوں والے صوبوں کا حصہ تھے، چنانچہ ان صوبوں میں اردو اکادمیوں کے قیام کا مطالبہ زوروں پر ہے۔ لیکن فی الحال ان میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومتیں چل رہی ہیں جو اردو اداروں کے قیام یا اردو تعلیم پر خرچ کو مسلمانوں کی منھ بھرائی تعبیر کرتی رہی ہیں۔ مدھیہ پردیش اور گجرات میں اردو اکادمیاں کانگریس کے دورِ حکومت سے چلی آرہی ہیں۔ جب کہ بہار میں نتیش کمار کی جے ڈی یو پارٹی کی بھاری طاقت کے آگے بی جے پی والوں کی کچھ نہیں چل پاتی چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جموں وکشمیر کے بعد بہار ملک کی پہلی ریاست ہے جہاں سبھی پرائمری اسکولوں میں اردو کی تعلیم لازمی کردی گئی ہے، اور اس فیصلے سے بی جے پی کے آر ایس ایس حلقوں کی حالت وہ ہے جو دُم کٹی چھپکلی کی ہوتی ہے۔ یہی حلقے اتراکھنڈ میں اردو کو دوسری سرکاری طور پر تسلیم شدہ زبان کا درجہ ملنے کے باوجود (جو کانگریس کے دور میں دیا گیا تھا) وہاں اردو اکادمی نہیں بننے دے رہے ہیں۔

■ مرکزی حکومت کی سطح پر اردو کے لیے کافی کام ہوا ہے۔ مرکزی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے تحت قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان یا نیشنل کونسل فار پروموشن آف اردو لینگویج NCPUL اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت اور تعلیمی سرگرمیوں کے سلسلے میں سب سے بڑے ادارے یا Nodal Agency کے طور پر کام کرتی ہے اور اس کا دائرہ کار ملک گیر ہے۔ اس کے تقریباً ایک ہزار کمپیوٹر سینٹر پورے ملک میں کھلے ہوئے ہیں جو صرف اردو والوں کو کمپیوٹر اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے سرکاری طور پر تسلیم شدہ سرٹیفکیٹ جاری کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی (حیدرآباد) اردو میں جدید پیشہ ورانہ اور فاصلاتی تعلیم کی ضرورتوں کو بڑی حد تک پورا کررہی ہے۔ حکومت خدا بخش اورینٹل لائبریری اور رامپور رضا لائبریری جیسے اداروں کی بھی سرپرست ہے جہاں اردو کا بیش قیمت لسانی وادبی ورثہ محفوظ ہے۔

■ اردو ملک میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہونے کے باوجود سرکاری طور پر اب تک علاقائی زبان مانی جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ کئی آئینی مراعات سے محروم ہے۔ چنانچہ حالیہ برسوں میں یہ مطالبہ شدت پکڑنے لگا ہے کہ اردو کو ہندی کے بعد دوسری قومی زبان کا درجہ دیا جائے۔ مستقبل قریب میں اگر یہ مطالبہ مان لیا گیا تو یہ اردو کی ترقی کے سب سے سنہرے دور کا آغاز ہوگا۔

اس کے برعکس ملک کی دوسری متعدد اردو اکادمیاں مکمل ریاست کا درجہ رکھنے والے صوبوں کی حکومتوں کے ماتحت کام کرتی ہیں اور ان کی مجموعی کارکردگی دہلی اردو اکادمی کے مقابلے میں دور دور تک کہیں نہیں دکھائی دیتی۔ ان میں سب سے پھسڈی اور شرم ناک حد تک پیچھے رہنے والی اردو اکادمی مغربی بنگال کی ہے جہاں پینتیس برس مارکسی کمیونسٹ کی قیادت میں اُس بائیں بازو محاذ کی حکومت چلتی رہی جو دبے ہوؤں اور پچھڑے ہوؤں کا سب سے زیادہ دم بھرتی تھی۔ پسماندہ طبقوں کی پس ماندہ زبان اردو کے ساتھ سوتیلے برتاؤ اور اس کی خستہ حالی سے ان مارکسیوں کی چشم پوشی ایک مثالی حیثیت رکھتی ہے جس کا جواب دینے کے لیے ترنمول کی ممتا بنرجی نے اردو کو سرکاری درجہ دے کر زبردست پبلسٹی اسٹنٹ رچ ڈالا ہے۔

دہلی اردو اکادمی کے قیام کی تاریخ کچھ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ اکادمی کی ویب سائٹ پر دی گئی معلومات کے مطابق: ''1976 میں اردو دوستوں کی کوششوں سے دہلی انتظامیہ اور دہلی کے شعبۂ لسانیات کے تحت ایک اردو صلاح کار کمیٹی بنائی گئی جس کا دائرۂ کار صرف دہلی میں سرکاری کام کاج میں اردو کے استعمال سے تعلق رکھتا تھا۔ اسے بااختیار ادارے کی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ وشو بندھو گپتا اس کمیٹی کے صدر رہے۔ دوسرے صدر خورشید عالم خاں بنے۔ چونکہ اس کمیٹی کو کوئی خاص اختیار حاصل نہیں تھا اس لیے اردو کے فروغ کے لیے اس کی کوششیں محدود تھیں۔ چنانچہ محبان اردو اس سے مطمئن نہیں ہوئے۔ دہلی میٹرو پولیٹن کونسل کے اندر اور اردو اخبارات ذریعے بار بار مطالبہ کیا جاتا رہا کہ دہلی میں بھی بہار اور اتر پردیش کی طرح اردو کی ہمہ جہت ترقی کے لیے ایک بااختیار اکادمی قائم کی جائے، جس کا دائرہ کار مذکورہ صلاح کار کمیٹی سے زیادہ ہو۔ 1980 میں جب محترمہ اندرا گاندھی دوبارہ برسرِ اقتدار آئیں تو انھوں نے اپنے آپ کو اردو کے فروغ کے لیے بہتر حالات میں پایا۔ چنانچہ 31 مارچ 1981 کو ان کی ہدایت اور ایما پر دہلی میں اردو اکادمی کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ 21 مئی 1981 کو سوسائٹی رجسٹریشن ایکٹ 1860 کے تحت دہلی کی اردو اکادمی اندراج ہوا۔ 82-1981 میں اکادمی کا سالانہ بجٹ 50 ہزار روپے مختص کیا گیا۔''

یہاں سے دہلی اردو اکادمی شروع ہوئی۔ اس وقت اکادمی ایک کمرے، ایک کرسی ایک میز اور ایک سید شریف الحسن نقوی پر مشتمل تھی۔ لیفٹننٹ گورنر اکادمی کے چیئر مین ہوا کرتے تھے۔ بعد میں جب دہلی کو اسمبلی کا درجہ ملا تو یہ عہدہ وزیر اعلیٰ کے پاس چلا گیا۔ اکادمی کی پہلی میٹنگ اس وقت کے لیفٹننٹ گورنر ایس ایل کھورانہ کی صدارت میں ہوئی۔ بعد میں جگموہن نے اس عہدے پر فائز ہونے کے بعد اکادمی کی توسیع میں خاصی دل چسپی لی۔ پھر جب اسمبلی بنی تو اولین وزیر اعلیٰ مدن لال کھورانہ نے اور ان کے بعد صاحب سنگھ ورما نے اکادمی کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔ شیلا دیکشت کے زمانے میں رہی سہی کسر پوری ہوگئی اور ایک طرح سے دہلی اردو اکادمی نے قومی اردو کونسل NCPUL کے بعد ملک کے دوسرے بڑے اردو ادارے کا درجہ اختیار کرلیا جس کا بجٹ آج، یوں تو دوسری زبانوں، ہندی، پنجابی اور سندھی کی اکادمیوں کی طرح تین کروڑ روپے سال کا ہے لیکن اسے اسکولوں میں اردو ٹیچر رکھنے کے لیے ڈیڑھ کروڑ روپے الگ سے ملتے ہیں۔ اکادمی کا وائس چیئر مین پہلے تو گورننگ کونسل کے اراکین کی نام زدگی کے بعد انھیں میں سے کسی کو چنا جاتا تھا لیکن بعد میں اس کا تقرر وزیر اعلیٰ کی جانب سے براہ راست ہونے لگا۔ ان میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، غلام ربانی تاباں، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر اشتیاق عابدی، پروفیسر الطاف اعظمی، م افضل، پروفیسر قمر رئیس شامل ہیں جنھوں نے اکادمی پر اپنا اپنا خاص اثر چھوڑا۔ جہاں تک سکریٹری کی بات ہے تو اکادمی کے اعلیٰ انتظامی افسر یا سی ای او کے اس اہم عہدے پر اولین سکریٹری سید شریف الحسن نقوی نے سب سے طویل عرصہ گزارا اور لوگوں کو یہ شبہ ہونے لگا کہ انھوں نے اکادمی کی پٹے داری تاحیات اپنے نام کرالی ہے۔ تاہم وہ نقوی ہی تھے جنھوں نے اکادمی کا بنیادی انتظامی ڈھانچہ تیار کیا۔ دفتر میں ڈسپلن قائم ہوا، اور سرکاری دفتروں میں جو نکماپن بالعموم پایا جاتا ہے اس سے اکادمی بڑی حد تک محفوظ رہی۔ البتہ جب نقوی صاحب ریٹائر ہوئے اور توسیع ملازمت کی بھی ساری حدیں موصوف نے پار کرلیں، اور ان کے جانے کے بعد یکے بعد دیگرا اشتیاق عابدی، زبیر رضوی، ڈاکٹر صادق اور مخمور سعیدی اس عہدے پر فائز ہوئے، تب کہیں جا کر پتہ چلا کہ اکادمی نقوی صاحب کے دور میں بس کچھ حدوں تک ہی توسیع پا سکی تھی۔ خاص طور سے اردو کی تعلیم و تدریس کے شعبوں میں وہ کوئی خاص پیش رفت نہیں کرسکی تھی جب کہ نقوی صاحب ان ہی شعبوں میں آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ بعد کے لوگوں نے اس شعبے کی سرگرمیوں کو خاص توسیع دی۔ ہر سطح پر اردو کے طلبا کو اسکالرشپ دینے کے علاوہ عام اسکولوں اور اردو میڈیم اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری کے علاوہ بڑی عمر کے لوگوں کو اردو سکھانے، پانچویں سے گیارہویں کلاس کے اردو طلبا کو انعامات دینے، اردو کی کوچنگ کلاسز چلانے، اسکولوں و لائبریریوں کو اردو کی کتابیں فراہم کرانے، اردو ٹائپ و شارٹ ہینڈ سکھانے کی کلاسیں چلانے کے کئی اہم کام اکادمی نے اپنے ذمے لے رکھے ہیں۔ اردو زبان، ادب اور

تہذیب کو فروغ دینے کے لیے بھی یہ اکادمی اچھا خاصا کام کر رہی ہے۔ مثلاً:

■ 'ایوانِ اردو' کے نام سے ایک ادبی ماہنامہ اور بچوں کا ماہنامہ 'امنگ' کے نام سے بچوں کا ایک رسالہ شائع ہوتا ہے۔ یہ دونوں رسالے خاصے مقبول ہیں اور خاصی تعداد میں چھاپے جاتے ہیں۔

■ مختلف موضوعات پر ہر سال نئی کتابیں چھاپی جاتی ہیں اور اب تک ایک سو سے زائد ٹائٹل چھپ چکے ہیں، جن میں بالخصوص دہلی کے ادیبوں اور یہاں کی تہذیب و ثقافت اور تاریخ سے متعلق کتابیں قابلِ مطالعہ ہیں۔ ان کتابوں کے ساتھ اکادمی، دہلی اور بیرون دہلی منعقد ہونے والے مختلف عالمی، قومی اور صوبائی کتاب میلوں میں شریک ہوتی ہے۔

■ نئے اور پرانے قلم کاروں کو کتابیں چھاپنے میں مدد دی جاتی ہے۔

■ مختلف موضوعات پر سیمیناروں اور ادیبوں سے ملاقاتوں کے پروگرام منعقد کرائے جاتے ہیں، اور طلبا کے استفادے کے لیے سیمیناروں کی کارروائی کو کتابی شکل میں بھی شائع کرایا جاتا ہے۔

■ اکادمی کی ایک خاص سرگرمی سالانہ ڈرامہ فیسٹول کا انعقاد ہے، جس کے لیے ہر سال بچوں کی ڈرامہ ورکشاپ بھی منعقد ہوتی ہے۔ سالانہ ناٹک میلے میں دہلی کے مختلف ڈرامہ ٹروپ حصہ لیتے ہیں، جس سے نوجوانوں میں اردو ڈرامہ کے لیے دل چسپی پیدا کرنے کا ماحول بنتا ہے۔

■ مختلف سماجی اور رضاکار تنظیموں کو مشاعروں، قوالیوں، غزل کی محفلوں وغیرہ کے انعقاد کے لیے مالی تعاون دیا جاتا ہے۔

■ ہر سال جشنِ جمہوریہ اور یوم آزادی کے موقعوں پر دو بڑے مشاعرے منعقد کرائے جاتے ہیں جن کی آج کے گئے گزرے دور میں بھی تھوڑی بہت قدر و قیمت باقی ہے۔

■ بچوں میں اردو کو مقبول کرنے کے مقصد سے، مضمون نویسی، ڈبیٹ، کوئز، قوالی اور غزل وغیرہ کے درجنوں پروگرام شہر کے مختلف اسکولوں کرائے جاتے ہیں اور اکادمی ان میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے بچوں کی حوصلہ افزائی کے لیے انھیں نقد انعامات بھی دیتی ہے۔

■ مصوری کو فروغ دینے لیے ایک سالانہ مقابلہ 'امنگ پینٹنگ کمپیٹیشن' کے نام سے کرایا جاتا ہے جس میں موقع پر تصویر سازی ہوتی ہے اور اس مقابلے میں ہزاروں بچے حصہ لیتے ہیں۔ اس میں تقریباً ساڑھے تین سو بچے ہر سال نقد انعامات کے علاوہ اکادمی کا سرٹیفکیٹ اور مومنٹو حاصل کر لیتے ہیں۔ پہلے دوسرے اور تیسرے نمبر پر آنے والے بچے ان کے علاوہ ہیں جنھیں شیلڈ بھی ملتی ہے۔

■ اکادمی نے 'دارا شکوہ لائبریری' کے نام سے کتابوں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ بھی جمع کیا ہے جس سے طلبا اور ریسرچ اسکالر خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگرچہ اخبار بینی کی عادت ڈالنے کے لیے بھی اکادمی نے شہر کے تقریباً 100 مقامات پر اردو اخبارات کے کارنر قائم کیے ہیں لیکن وہ اب کہیں نظر نہیں آتے۔ البتہ اس لائبریری کا وجود کشمیری گیٹ کے اس وسیع و عریض کمپلیکس میں اب بھی برقرار ہے، جہاں اردو اور سندھی اکادمیوں کے صدر دفاتر شانہ بہ شانہ قائم ہیں۔

■ خوش خطی، کتاب اور خطاطی کی مرتی ہوئی آرٹ کو زندہ رکھنے کے لیے اکادمی نے ایک کیلیگرافی تربیت مرکز قائم کر رکھا ہے، تاہم اس میں طلبا اب کم ہی آتے ہیں۔

■ ان سب کے علاوہ دہلی کی یہ اردو اکادمی وہ کام بھی کرتی ہے جو ملک کی باقی تمام اردو اکادمیاں لازمی طور پر کرتی ہیں اور اکثر کے لیے تو بس یہی ایک سرگرمی اردو کو فروغ دینے کے لیے کافی ہے۔ یہ کام ہے، انعامات کی تقسیم۔ مہاراشٹر اور بہار کی اردو اکادمیاں تو اس کام کو اتنی دل جمعی سے کرتی ہیں کہ سیکڑوں لوگوں کو ایک ساتھ انعام اور اعزاز دے ڈالتی ہیں۔ مہاراشٹر کی اردو ساہتیہ اکادمی نے اس سال گزشتہ پانچ برسوں کے انعامات ایک ساتھ دے ڈالے۔ اس کے برعکس بہار کی اکادمی نے ایک ہی سال میں اتنے انعامات عطا کر دیے کہ لوگوں کو ان کی صحیح تعداد بھی معلوم نہیں ہے۔

■ دہلی اردو اکادمی یہ کام ذرا پابندی سے منظم انداز میں کرتی ہے اور اس کے انعام و اعزاز پانے والوں کی تعداد بھی زیادہ نہیں ہے۔ انعامات دو زمروں میں دیے جاتے ہیں۔ ایک کتابوں کے زمرے میں اور دوسرے ادیبوں و اساتذہ کی کارکردگی کے زمرے میں۔ انعام ہر سال دیے جاتے ہیں اور ان پر اعتراضات بھی خوب ہوتے ہیں۔ ویسے بھی اردو کے اداروں کا شاید ہی کوئی ایوارڈ ایسا ملے گا جس پر کسی نہ کسی کو اعتراض نہ ہوتا ہو۔ چنانچہ دہلی اردو اکادمی کے ایوارڈ بھی بارہا تنقید و اعتراض کا نشانہ بنے ہیں۔ البتہ مجموعی خدمات کے لیے دیے جانے والے ایوارڈز کے سلسلے میں منفی ردعمل کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔

■ آخر میں ایک ایسی سرگرمی کا ذکر لازم ہے جو عرصے سے اکادمی کی شان بنی ہوئی تھی۔ یہ تھا 'نئے پرانے چراغ' کے نام سے منعقد ہونے والا سالانہ سہ روزہ ادبی اجتماع جس نے ایک طرح کے 'اردو میلے' کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ بعد میں جب مرحوم ڈاکٹر قمر رئیس کو وائس چیرمین بنایا گیا تو نہ جانے کیوں یہ مقبول عام سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

محاصبه

ہم نے دہلی کی اکادمی کو دہلی سے جوڑا ہے: پروفیسر اختر الواسع

مدیر 'ادب ساز' نے جوسوال دہلی اردو اکادمی کی کارکردگی اور دوسرے امور کے تعلق سے اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اخترالواسع کو بھیجے تھے وہ اور ان کے جواب حسب ذیل ہیں:

سوال: دہلی اردو اکادمی کے تعلق سے اب تک آپ کی ترجیحات کیا رہی ہیں۔

اختر الواسع: دہلی اردو اکیڈمی کے وائس چیئرمین کی ذمہ داری میں نے 5اپریل2010 کو سنبھالی اور یہ ایک ایسا وقت تھا جب کہ پورا ملک خاص طور سے دہلی دولت مشترکہ کھیلوں کی تیاریوں میں مصروف تھا اور اردو اکیڈمی ہی نہیں بلکہ تمام اکیڈمیوں پر اخراجات کی تحدید کر دی گئی تھی لیکن اس کے باوجود مجھے خوشی ہے کہ ہم (تمام ارکان گورننگ کونسل اور دیگر انتظامی ذمہ داران وکارکنان) اردو اکیڈمی کو اردو والوں تک لے جانے میں کامیاب ہوئے اور ایک عام تاثر -غلط یا صحیح- جو عام ہو گیا تھا کہ اردو اکیڈمی عوام سے کٹ کر صرف دانش گاہوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے، ختم ہوا۔ دوسرے دہلی اردو اکیڈمی واقعی دہلی والوں کی ہے اس احساس اور تعلق کو بحال کرنے کی بڑی حد تک کامیاب کوشش کی گئی۔

سوال: اکادمی کی کارکردگی سے کس حد تک مطمئن ہیں اور کن شعبوں میں آپ سمجھتے ہیں کہ اب بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔

اختر الواسع: دہلی اردو اکیڈمی بلاشبہ ملک کی تمام اکیڈمیوں میں شروع سے ہی ایک امتیازی حیثیت کی حامل رہی ہے اور اس کے لئے ہم تمام اردو والے دہلی اردو اکیڈمی کے بانیوں اور اس کے معماروں کے شکر گزار رہیں گے جنہوں نے اردو اکیڈمی کو امتیازی خدوخال عطا کیے۔ لیکن بہر حال وقت گزرنے کے ساتھ اضافے اور اصلاح دونوں کی گنجائش رہتی ہے۔ مثال کے طور پر اردو خواندگی کے جو مراکز ابھی تک جمنا پار میں ہیں ان کو دہلی کے دوسرے علاقوں تک پھیلانا چاہیے تاکہ اردو بولنے اور لکھنے کا چلن اور زیادہ عام ہو۔

سوال: دہلی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملنے کا مطلب عملی اور حقیقی طور پر آخر کیا ہے۔ اس بارے میں لوگوں کو بہت سی غلط فہمیاں ہیں۔ کیا آپ اصل صورت حال پر کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں۔

اختر الواسع: دہلی میں اردو کو دوسری زبان کا جو درجہ دیا گیا ہے وہ ایک دو دن میں نہیں مل گیا، اس میں پانچ دہائیوں سے زیادہ کا وقت لگا ہے۔ موجودہ تناظر میں ہمیں ایک لسانی اقلیت کے طور پر اپنے حقوق کی بازیافت کے لیے ایک نئی جدوجہد کرنی ہوگی جس میں جہاں ضروری ہو وہاں اردو ذریعہ تعلیم ہو، جہاں ماں باپ یا طالب علم کی خواہش ہو وہاں بحیثیت زبان اردو کی تدریس ہو سکے۔ دفاتر میں درخواست اردو میں دی جا سکے اور جو اردو میں درخواست دے اس کو جواب بھی اردو میں مل سکے۔ اردو اخبارات اور رسائل کو اشتہارات اور سرکاری اعانت اسی طرح ملے جیسے انگریزی اور ہندی کے اخبارات و رسائل کو ملتی ہے۔ مجھے اس حقیقت کے اعتراف میں ذرا بھی تکلف نہیں کہ ابھی بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ اسکولوں میں اردو اساتذہ کا تقرر، اردو میں نصابی کتب کی فراہمی، دفاتر کے اندر اردو جاننے والے افراد کا سرکاری زمرے کی اسامیوں پر تقرر غرض ایسے بہت سے کام ہیں جو ابھی ہونے ہیں۔

سوال: دہلی حکومت کے ویب پورٹل پر اردو اکادمی کے ذریعے دی جانے والی عارضی اردو اساتذہ کی اجرت اسسٹنٹ ٹیچر (سینئر سکنڈری، بیسک ٹریننگ) کے ضمن میں 1893 روپے ماہانہ، ٹی جی ٹی (بی اے، بی ایڈ) کے لیے 2038 روپے اور پی جی ٹی (ایم اے، بی ایڈ) کے لیے 2184 روپے بتائی گئی ہے، جو دہلی حکومت اور اردو والوں دونوں کے لیے بے حد شرم کی بات اس لیے ہے کہ دہلی میں سرکاری طور پر کم از کم اجرتیں اس سے تین گنا زیادہ ہیں۔ ان پڑھ مزدور کو کم از کم اجرت 6090 روپے (203 روپے یومیہ) دی جاتی ہے اور آپ بارہویں تک پڑھے ٹیچر کو 1893 روپے (63 روپے یومیہ) دیتے ہیں۔ یہی اسکلڈ مزدور کی اجرت 6750 روپے (225 روپے یومیہ) ہے، مگر بی اے پاس تربیت یافتہ اردو ٹیچر 2038 روپے (67 روپے یومیہ) پاتا ہے۔ تربیت یافتہ مزدور کی کم از کم اجرت 7440 روپے ہے اور اکادمی ایم اے پاس بی ایڈ ٹیچر کو 2184 روپے (72 روپے یومیہ) تھماتی ہے۔ اس میں بھی آپ کی اکادمی کا عملہ لوگوں کے الزامات کے مطابق رشوت کھا جاتا ہے۔ یہ تمام معلومات آج بھی (19 نومبر 2011 بوقت 12.14 بجے

دوپہر) دہلی حکومت کے ویب پورٹل کے لنک
http://artandculture.delhigovt.nic.in/urdu/scheme.htm
پر دستیاب اعداد و شمار سے لی گئی ہے۔ کیا یہ درست ہے؟ اگر نہیں تو حقیقی صورت حال کیا ہے؟

اخترالواسع: یہاں مجھے بہت ادب کے ساتھ صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آپ کی دی ہوئی معلومات (جو دہلی حکومت کی اپنی ویب سائٹ سے لی گئی تھی۔ مدیر) ناقص اور ازکار رفتہ ہیں۔ آپ دہلی اردو اکیڈمی کی (اپنی) ویب سائٹ کو دیکھیں گے تو آپ کو حقیقی صورت حال کا خود اندازہ ہو جائے گا۔ جن اساتذہ کا تقرر اردو اکیڈمی کے ذریعہ کبھی کیا گیا تھا اس وقت ان میں سے اسسٹنٹ ٹیچر کو تقریباً ساڑھے نو ہزار، ٹی جی ٹی کو تقریباً ساڑھے گیارہ ہزار اور پی جی ٹی کو تقریباً ساڑھے تیرہ ہزار روپے ملتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے اور اب سب پر روز روشن کی طرح عیاں بھی ہے کہ ہم اردو اکیڈمی کی طرف سے اس پر بار بار زور دیتے رہے ہیں کہ اردو اساتذہ کو بھی وہی تنخواہیں اور تمام مراعات ملیں جو باضابطہ اور مستقل اساتذہ کو ملتی ہیں۔ اسی لیے اردو اساتذہ کی 126 اسامیوں کو پُر کرنے کے لیے جب اردو اکیڈمی سے کہا گیا تو ہم نے یہ بات صاف کر دی کہ جس طرح ہندی، انگریزی اور سائنس وغیرہ مضامین کے اساتذہ کا تقرر پوری تنخواہوں پر تمام مراعات کے ساتھ دہلی کا ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ کرتا ہے اسی طرح وہ اردو اساتذہ کا تقرر بھی کرے۔ اردو کے اساتذہ کو ہی آدھی ادھوری تنخواہ و کنٹریکٹ پر کیوں بھرتی کیا جائے۔ اگر ماضی میں ایسا ہو بھی گیا تو ضروری نہیں کہ اس غلطی کو بار بار دہرایا جائے۔

سوال: سرکاری ملازموں کے تبادلے ہوتے رہنا ایک عام بات ہے لیکن اکادمی کے پانچ چھ بڑے ایگزیکٹو افسر پچھلے بیس بائیس سال سے اردو خواندگی اور خود مختار autonomous ادارہ ہونے کی دلیل کے تحت اکادمی میں موجود ہیں۔ اگر چہ یہ لوگ بڑی محنت اور لگن سے کام کر رہے ہیں لیکن لوگوں کے اس طرح کے الزام بھی ہیں کہ طویل عرصے تک ایک ہی جگہ کام کرتے رہنے کی وجہ سے ان سبھی کے اپنے اپنے clouts بن گیے ہیں جو انھیں support کرتے ہیں چنانچہ ان کے اثاثوں کی جانچ کرکے یہ پتہ لگانا چاہیے کہ وہ ان کی معلوم آمدنی سے زیادہ تو نہیں ہیں۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہنا چاہیں گے؟

اخترالواسع: مجھے آپ کی طرف سے اس سوال کے کیے جانے پر تعجب ہے۔ اس لئے کہ آپ خود بھی دہلی اردو اکیڈمی کی گورننگ کونسل کے بہت ہی سرگرم اور معتزز رکن رہے ہیں۔ جن چند لوگوں کا آپ نے تذکرہ کیا ہے، وہ اپنی مرضی یا من مانی کے ذریعہ دہلی اردو اکیڈمی میں ان انتظامی مناصب پر نہیں پہنچے ہوئے ہیں بلکہ ان کا باقاعدہ اور باضابطہ تقرر ہی ان مناصب کے لئے کیا گیا تھا۔ میرا ان کے ساتھ رسمی تعلق آپ کے مقابلہ کافی کم رہا ہے۔ اس لیے آپ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ وہ جس سنجیدگی اور ہمہ وقتی لگن کے ساتھ اکیڈمی کے پروگراموں کو اپنے دوسرے کارکن ساتھیوں کے ساتھ مل کر کامیاب بنانے میں لگ جاتے ہیں، اس کی ستائش نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ میرے لیے یہ بات ہمیشہ رنج کا باعث رہی ہے کہ اردو اکیڈمی کے کارکنان کی تنخواہوں میں جو اضافہ ہونا چاہیے وہ برسوں سے نہیں ہوا ہے۔ جن لوگوں کے اثاثوں کے بارے میں سوالیہ نشان قائم کیا جا رہا ہے ان کی تنخواہیں ایک نقطہ انجماد کو پہنچ کر رکی ہوئی ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں ہے کہ اردو اکیڈمی کے یہی انتظامی ذمہ دار اور کارکنان اس کی کامیابی کے ضامن ہیں۔ ایک بات اور واضح رہنی چاہیے کہ آج تک اکیڈمی کی آڈٹ رپورٹ میں اس طرح کی کسی بدعنوانی کی کبھی نشان دہی نہیں کی گئی ہے۔

سوال: اس عہدے پر رہتے ہوئے آپ کو ایک سال سے زائد عرصہ ہو چکا ہے۔ اس دوران کوئی ایسا خاص کام آپ کی قیادت میں ہوا ہے جس سے آپ کو قلبی اطمینان یا مسرت کا احساس ہوا ہو؟

اخترالواسع: (الف) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے ملک گیر سطح پر اردو کے تخلیقی ادب کی خریداری کی گئی۔ (ب) دہلی کی عوامی مقبول شخصیات جو بقید حیات نہیں ہیں ان کی یاد میں پروگرام کیے گئے تا کہ نئی نسل ان سے واقف ہو سکے۔ (ج) دہلی اردو اکیڈمی کے سالانہ ایوارڈ کی تقسیم میں دہلی والوں کو اولیت دی گئی۔ (د) اس دوران اردو اخبارات کا اکیڈمی کے تئیں مثبت رویہ رہا۔ (ہ) اکادمی کے ماہناموں 'ایوانِ اردو' اور 'امنگ' کی مقبولیت اور اشاعت میں لگاتار اضافہ ہو رہا ہے کیوں کہ ان رسالوں کا معیار بتدریج بلند ہو رہا ہے۔ (و) دولت مشترکہ کھیلوں کے موقع پر ہندوستانی تہذیب و ثقافت کو روشناس کرانے کے لیے جو کلچرل پروگرام کیے گئے ان میں اردو کو محوری حیثیت حاصل رہی۔ (ز) جن قلم کاروں یا ان کے پسماندگان کو ماہانہ مدد دی جاتی ہے اس کی رقم اور تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔

سوال: اکادمی کے تعلق سے کیا کوئی ایسا نیا منصوبہ آپ کے ذہن میں ہے جو دہلی میں اردو خواندگی کو موثر طور پر بڑھا سکے اور جسے آنے والا دور آپ کے نام اور دور کے ساتھ یاد رکھے۔

اخترالواسع: اردو خواندگی مراکز کی توسیع اور اردو سرٹیفکیٹ کورس کے مراکز میں اضافہ ہو اور دہلی میں اردو کا چلن عام ہو یہ میری دلی خواہش ہے۔ ■■

ادب ساز
کی رائے اور تاثرات

■ کسی بھی ادارے کے معتبر ہونے کی سب سے پہلی نشانی یہ ہوتی ہے کہ اس کے معاملات میں شفافیت کس قدر ہے۔ دہلی اردو اکادمی میں پہلے شفافیت صرف اس قدر تھی کہ اس میں آر ٹی آئی (رائٹ ٹو انفارمیشن) ایکٹ کے تحت ضروری جانکاریاں حاصل کرنے کا نظم موجود تھا۔ ویب سائٹ کے نام پر دہلی حکومت کی عام سائٹ پر صرف ایک مختصر باب مخصوص کر دیا گیا تھا۔ لیکن حال ہی میں اکادمی نے اپنی ایک الگ ویب سائٹ قائم کر کے شفافیت کی ساری کمی دور کر دی ہے۔ اس سائٹ پر اکادمی کے سبھی کاموں کی تفصیل، ان سے متعلق اخراجات کا حساب کتاب، یہاں تک کہ اکادمی کے ٹنڈر، مختلف اسکیموں سے متعلق فارم وغیرہ ڈاؤن لوڈ کیے جا سکتے ہیں۔ اس معاملے میں صرف قومی اردو کونسل NCPUL ہی دہلی اردو اکادمی سے آگے نظر آتی ہے، جس نے اپنے رسائل و جرائد بھی ویب سائٹ پر ڈال رکھے ہیں۔ ورنہ ملک کی باقی اردو اکادمیوں کی ویب سائٹیں یا تو بے حد مختصر اور نہ ہونے کے برابر ہیں یا سرے سے ہیں ہی نہیں۔

■ شفافیت کو کچھ اور بڑھانے کے لیے دہلی اردو اکادمی کو چاہیے کہ اکادمی کی میٹنگوں کی توثیق شدہ روداد minutes بھی ویب سائٹ پر ڈال دی جائیں تاکہ عام لوگوں کو یہ اندازہ ہو سکے کہ ان کی نمائندگی کے لیے نامزد کیے گئے اکادمی کے ممبران ہر میٹنگ میں شرکت کے ایک ہزار روپے وصول کرنے کے علاوہ اور کیا کرتے ہیں۔

■ دہلی میں صرف اردو کی اکادمی کو اپنے بیشتر معاملات انٹرنیٹ پر دستیاب کرنے کا شرف حاصل ہے ورنہ ہندی، پنجابی اور سندھی کی اکادمیوں نے تو اپنی الگ ویب سائٹ بھی نہیں کھولی ہے۔ اس کے لیے اردو اکادمی کے انتظامیہ کی تعریف کی جانی چاہیے۔

■ اکادمی نے سیلم پور، جعفر اباد اور دیگر مقامات پر کارخانوں اور گھریلو صنعتوں وغیرہ میں کام کرنے والے ناخواندہ لوگوں کو بنیادی تعلیم دینے کا جو سلسلہ 'اردو لٹریسی' پروگرام کے تحت شروع کر رکھا ہے اور جس میں، اکادمی کے موجودہ سکریٹری انیس اعظمی کے بقول اس وقت 6 ہزار لوگوں کا اندراج ہے، اسے مزید توسیع دی جانی چاہیے اور اس میں اندر لوک، شاہین باغ، فصیل بند دہلی شہر، جہانگیر پوری، سیما پوری، نرائنہ اور سنگم وہار جیسے علاقوں کی مزدور بستیوں کو بھی شامل کرنا چاہیے۔

■ اس سال اکادمی 'اردو ہیریٹیج فیسٹول' کے نام سے ایک سالانہ سہ روزہ اردو میلہ غالباً نومبر میں شروع کرنے جا رہی ہے، جس کے تحت مختلف تاریخی عمارتوں میں یا ان کے نزدیک، ثقافتی پروگرام کرائے جائیں گے، اور ان میں مشہور اور کافی مہنگے فنکار شریک ہوں گے۔ 'ادب ساز' کی رائے ہے کہ ان مشہور شخصیتوں کے علاوہ دہلی میں موجود اچھے فنکاروں کو بھی بلایا جانا چاہیے اور یہ میلہ صرف موسیقی کے پروگراموں تک محدود نہ رہے بلکہ اس میں تمثیلی مشاعرے، شعری نشست، ڈرامے، اور اسٹیج اداکاروں سے اردو کے بہترین نثر پارے سنوانے جیسے پروگرام بھی شامل ہونے چاہئیں کیونکہ اردو ثقافت و تہذیب کا مطلب صرف موسیقی اور 'صوفی سنگیت' نہیں ہے۔

■ 'نئے پرانے چراغ' سہ روزہ اجتماع کا سلسلہ بلا تاخیر شروع ہونا چاہیے کیوں کہ یہ دہلی کے تمام ادبی تخلیق کاروں کے اجتماع کا واحد سالانہ موقع ہوا کرتا تھا اور اس کا کوئی بھی متبادل کہیں نہیں ہے۔

■ دہلی کی شیلا دیکشت حکومت اردو اکادمی کا ہندی اکادمی جتنا ہی خیال رکھ رہی لیکن اسے اردو اکادمی کے بجٹ میں اضافہ کرنا چاہیے کیونکہ اردو بولنے والی آبادی دیگر زبانوں کی آبادی کے مقابلے میں سب سے زیادہ پچھڑی ہوئی ہے لہٰذا وہ سرکاری مدد کی زیادہ حق دار بھی ہے۔

احتساب کا محاسبہ

کیا ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کا کوئی علاج نہیں ؟

ادارہ

'ادب ساز' شمارہ 10-11 کے 'باب احتساب' میں 'انجمن ترقی اردو (ہند) پرائیویٹ لمیٹڈ' کے عنوان سے، سو سال سے بھی زیادہ پرانی انجمن ترقی اردو کا جو ہمدردانہ و قطعاً غیر جانب دارانہ جائزہ پیش کیا گیا تھا، اس سے بہت زیادہ تو نہیں البتہ تھوڑی سی یہ امید ضرور تھی کہ عملاً بڑی حد تک انجمن کے مالک و مختار بنے ہوئے اس کے سکریٹری اور اردو کے مشہور محقق اور نقاد ڈاکٹر خلیق انجم کچھ نہ کچھ نوٹس اس محاسبے میں کہی ہوئی باتوں کا ضرور لیں گے اور کم از کم وہ اصلاحات تو انجمن میں نافذ کر ہی دیں گے جن سے ان کا عہدہ اور تقریباً ایک لاکھ روپے ماہانہ کی تنخواہ متاثر نہ ہوتے ہوں۔ مگر افسوس ایسا بالکل نہیں ہوا۔

'ادب ساز' کے مدیر سے ادارہ ساز ڈاکٹر خلیق انجم کے بزرگی و خوردی کے خوش گوار اور بڑی حد تک بے تکلفانہ تعلقات میں اس محاسبے سے کسی قسم کی کمی نہیں آئی اور جب جب ان سے ادبی و صحافتی معاملات میں کسی قسم کے تعاون کی درخواست کی گئی انھوں نے ہمیشہ کی طرح خاص دل چسپی لیتے ہوئے پوری طرح مدد فرمائی۔ اس سے خلیق انجم صاحب کے حسنِ سلوک اور فراخ دلی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انجمن کی عزت و حرمت اور اس کے معاملات میں ان کے کردار کی یہ خوبیاں دور دور تک نظر نہیں آتیں۔ جس انجمن کو انھوں نے نہایت جانفشانی اور لگن سے ایک منظم اور نہایت متمول اردو ادارے کی شکل دی اسے اور اس کی تمام املاک کو انھوں نے جوڑ توڑ کر کے اب بھی اپنی جاگیر بنا رکھا ہے اور اس میں شفافیت، جمہوریت اور ضابطوں کی پاس داری کے تعلق سے تمام اصولوں کی دھجیاں اڑانے کا عمل وہ کھلے عام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اردو میں کوئی بھی انھیں اس سب سے روکنے ٹوکنے والا نظر نہیں آتا۔

'ادب ساز' نے انجمن کے معاملات درست کرنے کے لیے اپنی رائے بھی دی تھی، جس کے اہم نکات یہاں نئے قارئین کے لیے دوہرائے جارہے ہیں:

■ انجمن کا آئین، اس کی رکنیت کے ضوابط، عہدیداروں و عام اراکین کے نام، میٹنگوں میں لئے گئے فیصلے وغیرہ کسی ایک کتابچے یا علاحدہ کتابچوں کی صورت میں فوراً شائع کئے جانے چاہئیں اور جس کو یہ سب معلومات درکار ہوا سے قیمتاً یہ کتابچے فراہم کئے جائیں۔

■ خلیق انجم صاحب کی عمر کاغذ پر 76 سے تجاوز کر چکی ہے (یہ بات ڈیڑھ سال پہلے کی ہے) اور ان کا حافظہ بھی اب ساتھ چھوڑتا جارہا ہے اس لئے انہیں باعزت طور پر سبک دوش کر کے ان کی جگہ کھلی مسابقت و مقابلے کے تحت کسی نوجوان کو انجمن کے اعلیٰ منتظم کا عہدہ سونپا جانا چاہئے، اور عہدے کی حیثیت صرف تنظیمی رکھی جائے۔ خلیق انجم صاحب نے چونکہ انجمن کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اس لئے انہیں انجمن اور 'اردو گھر' کے سرپرست یا مشیرِ اعلیٰ کی تاحیات علامتی حیثیت دے کر ان کی ذات سے استفادہ کیا جائے۔

■ ہر جگہ سے ریٹائر ہو چکے 70 سال سے اوپر کے لوگوں کو انجمن کے عہدے و رکنیت سونپتے رہنے کا سلسلہ فوراً بند کیا جائے اور 'اردو گھر' کو اولڈ ایج ہوم نہ بنایا جائے۔

■ 'انڈیا اسلامک سینٹر' کی طرز پر انجمن کی ممبر شپ بڑھائی جائے، اور اس کی ہی طرح ہر سال اس کے باقاعدہ چناؤ کرائے جائیں۔

■ انجمن کے ہر عمل میں شفافیت transparency قائم رکھی جائے کہ یہی بدعنوانیوں کو روکنے کا سب سے کارگر طریقہ ہے۔

■ 'اردو گھر' کی تمام منزلیں موجودہ کرایہ داروں سے خالی کرائی جائیں اور ان میں اردو طلبا کے لئے پیشہ ورانہ تعلیمی کورس شروع کرنے کا کوئی ادارہ قائم کیا جائے جو انجمن کو مالی استقامت بھی فراہم کرے گا اور اس سے اردو قوم کو بھی سہارا ملے گا۔

■ نئے زمانے کے نئے تقاضوں کے تحت، انجمن کے آئین میں ایسی ترامیم کی جائیں کہ آئندہ اس کا کوئی جنرل سکریٹری ذاتی منفعت کے لئے انجمن کا استعمال نہ کر سکے اور جمہوریت کو طاق پر نہ رکھا جاسکے۔

لیکن اس رائے کی اشاعت کے ڈیڑھ سال بعد بھی، انجمن کا آئین و دستور، ممبروں کے نام اور ان کی تعداد، میٹنگوں کی روداد، حساب کتاب ...سب کچھ صیغۂ راز میں رکھا جارہا ہے۔ صرف ایک کام شفافیت کے نام پر یہ ہوا ہے کہ انجمن کی ایک ویب سائٹ انٹرنیٹ پر آگئی ہے جس کا یو آر ایل anjumantaraqqiurduhind.org ہے۔ لیکن اس میں شفافیت کس قدر ہے ملاحظہ فرمایئے۔ نہ اس پر انجمن کا دستور موجود ہے، نہ اس کے تنظیمی ڈھانچے کا ذکر ہے، نہ کسی میٹنگ کا احوال۔ ہاں، انجمن کی مطبوعات، اس کے 'اردو گھر' میں چلائے جانے والے تین ڈپلومہ کورسز کا ذکر (ان میں سے دو کورس دراصل قومی اردو کونسل کے کورس ہیں)، انجمن کے 19 ملازمین کے نام، انگریزی میں لکھی گئی انجمن کی تاریخ ضرور موجود ہے۔ ایک صفحہ members کے عنوان سے ہے جسے دیکھ کر خوشی ہوئی۔ مگر جب ممبرز کو کلک کیا تو 18 ہستیوں کے نام سامنے آئے۔ تھامس واکر آرنلڈ، ڈبلیو بیل، نواب عمادالملک سید حسین بلگرامی، سید راس مسعود، پنڈت ہردے ناتھ کنزرو، ڈاکٹر ذاکر حسین، کرنل بشیر حسین زیدی، پنڈت آنند نرائن ملا، مالک رام، سید حامد، پروفیسر جگناتھ آزاد، علامہ شبلی نعمانی، حبیب الرحمن خان شیروانی، محمد عزیز مرزا، مولوی عبدالحق، قاضی عبدالغفار، پروفیسر آل احمد سرور اور ڈاکٹر خلیق انجم۔ یعنی ڈاکٹر انجم کو چھوڑ کر انجمن مجموعی طور سے مرحومین کی انجمن ہے اور انجم صاحب ہر میٹنگ میں عالم ارواح سے ان بزرگوں کو بلا کر روحوں سے مشورہ کرتے ہوں گے۔ آخر موجودہ ممبروں اور عہدیداروں کے نام اس طرح چھپانے کی وجہ کیا ہے؟ اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ موجودہ ممبران کیوں خود کو چھپائے رکھتے ہیں۔ انجم صاحب سے پوچھیے تو ممبروں کی پردہ پوشی کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ، "جناب ہمارے دشمن چاروں طرف بیٹھے ہوئے ہیں۔ ممبروں کی فہرست جاری کردی گئی تو وہ توڑ پھوڑ مچادیں گے۔ آپ سمجھتے نہیں ہیں ہماری مشکلوں کو!" لیکن 'یہ اردو کے غازی یہ پراسرار بندے' یعنی انجمن کے ممبر آخر کیوں خود کو پردۂ اخفا میں رکھے رہتے ہیں۔ کیا اس لیے کہ ان معصوم بھیڑوں کو پہلے ہی کھونٹوں سے باندھ دیا گیا ہے اور ان کی منھ بھرائی کردی گئی ہے۔

'ادب ساز' کو اپنے ذرائع سے جو معلومات ملی ہے اس کے مطابق انجمن کی گورننگ کونسل کے اراکین یہ ہیں (یا تھے)۔ صدر، راج بہادر گوڑ مرحوم، سرپرست اخلاق الرحمٰن قدوائی، نائب صدور صدیق الرحمٰن قدوائی، سید شریف الحسن نقوی، سکریٹری، خلیق انجم، اراکین: شمیم حنفی، شاہد ماہلی، اطہر فاروقی، اسلم پرویز، آفاق احمد بھوپال، رضیہ حامد بھوپال، نیر مسعود لکھنؤ، خواجہ محمد یونس لکھنؤ، سید رضی حیدر پٹنہ، کشمیری لال ذاکر چنڈی گڑھ، ثاقب رضوی علی گڑھ، عبدالرحیم خاں حیدرآباد، سالک لکھنوی کولکاتا، ظل الرحمٰن علی گڑھ، محمد فیروز دہلوی دہلی، کاظم علی خاں لکھنؤ، شاہد علی خاں دہلی، شہباز حسین، گلزار دہلوی، وشو ناتھ طاؤس اور بیگم حمیدہ حبیب اللہ۔ مجلس عاملہ یا ایگزیکٹو کمیٹی خط کشیدہ حضرات پر مشتمل ہے۔ ان میں کتنے ممبر علیل یا سخت علیل ہونے کی بنا پر شاذ و نادر ہونے والی میٹنگوں میں شریک نہیں ہوسکتے، کتنے انتقال فرما چکے ہیں، اور ان کی جگہیں کیوں اب تک پر نہیں ہوئیں، یہ پتہ لگانا اردو کے اداروں میں دل چسپی لینے والے سبھی لوگوں کا فرض ہے۔

آج جب پورے ملک میں کرپشن کے خلاف ایک عوامی ابھار دکھائی دے رہا ہے، لوگ ہر ادارے میں شفافیت کا مطالبہ کررہے ہیں، ایک ایسی انجمن کے سکریٹری کی من مانیاں کسی دوسرے سیارے کی داستان معلوم ہوتی ہیں جسے حکومت نے ہندوستانی عوام کی کروڑوں روپے کی جائداد (وہ قطعہ اراضی جس پر اردو گھر واقع ہے اور جس کی مالیت آج ایک ارب روپے سے بھی کہیں زیادہ ہے) تقریباً مفت دے دی تھی، اور جس کا حساب کتاب جاننے کا آرٹی آئی ایکٹ کے تحت آج ہر ہندوستانی شہری کو حق ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انجمن ایک رضاکار ادارے کے زمرے میں آتی ہے، اور آرٹی آئی ایکٹ کی وہ سیدھے طور پر پابند نہیں ہے لیکن رضاکار اداروں میں بھی شفافیت کے کچھ ضابطے ہوتے ہیں جن کے تحت انجمن یہ معلومات عام کرنے کی پابند ہے کہ ہندوستانی ٹیکس دہندہ کی جس ملکیت کو وہ اپنے تصرف میں لارہی ہے، اس کا نظام کس طرح چل رہا ہے، وہ کن ضابطوں کے تحت کام کررہی ہے اور ان ضابطوں کی کس حد تک پابندی کی جارہی ہے۔ اس سلسلے میں کوئی بھی شہری عدالتی چارہ جوئی کرسکتا ہے۔

ہمارا اس سلسلے میں یہ مشورہ ہے کہ سرکردہ بہی خواہان اردو، اور اہم جانی پہچانی شخصیتوں کا کوئی وفد ڈاکٹر خلیق انجم سے ملے، ان سے پوچھے کہ وہ کیوں اس قدر رازداری برت رہے ہیں، کن ضابطوں کے تحت اب تک نہ صرف اس عہدے پر قائم ہیں بلکہ تمام بھتوں و ذاتی اخراجات سمیت تقریباً ایک لاکھ روپے کی تنخواہ ہر ماہ ایک رضاکار ادارے سے اٹھارہے ہیں اور یہ کہ کب تک اس سلسلے کو جاری رکھیں گے۔ یہ تمام کارروائی میڈیا کی موجودگی میں کی جائے تاکہ سب کچھ سب کے سامنے رہے۔ ہمارا خیال ہے اس کے بعد ہی ڈاکٹر خلیق انجم کو یہ خیال آسکے گا کہ جو کچھ وہ کررہے ہیں وہ اخلاقی اور جمہوری قدروں اور ضابطوں کے قطعاً خلاف ہے۔

اگر یہ نہیں کیا جاسکتا تو اردو کے اس معزز ڈاکٹر کا کوئی علاج نہیں ■■

نئی بات

اردو دانش ور: ایں چہ بوالعجبیست

اطہر فاروقی

قومیں جب پہلی مرتبہ تہذیبی زوال کے مظاہر سے روبہ رو ہوتی ہیں تو اکثر ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ وہ اس صورتِ حال کا کس طور سامنا کریں۔ آزادی کے بعد یہی ہندستانی مسلمانوں کے ساتھ ہوا جو یہاں صدیوں حکمراں اور پھر انگریزوں کے ساتھ بھی شریکِ اقتدار رہے مگر تقسیم ہندستان کے سبب وہ اپنے ہی ملک میں ایک حواس باختہ قوم بن کر رہ گئے۔ اس مضمون میں ہندستانی مسلمانوں کے حوالے سے میرے معروضات کا سیاق وسباق آزادی کے بعد اردو کی وہ صورتِ حال ہے جسے مسلم سیاست اور خصوصاً شمالی ہند کے مسلم اشراف نے اتنا بگاڑا کہ اب اس کی کوئی کل سیدھی ہونے کی امید نظر نہیں آتی۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں ہندی مسلمانوں کے تہذیبی زوال میں ایک اہم زاویہ اردو کا بھی تھا جسے آزادی کے بعد ہندوؤں کی اکثریت نے غلامی کی وراثت سے تعبیر کیا اور سیاسی طور پر زوال آمادہ مسلمان اس سیاق وسباق میں کسی حسنِ تدبیر کا مظاہرہ نہ کر پائے اور ہندو اکثریت کی اردو مخالف آندھی نے اردو کے تناور درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ اردو تمام ہندی مسلمانوں کی زبان کبھی نہیں تھی مگر اورنگ زیب کے زوال (1707) کے بعد سے ہندی-اردو تنازعے کی ابتدا تک، یہ شمالی ہند کی ایسی زبان ضرور تھی جو ہندو اور مسلم دونوں ہی مذہبی فرقوں کی سیاست میں فیصلہ کن رول ادا کرتی رہی۔

تقسیم ہند کے نتیجے میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کے پاکستان ہجرت کر جانے کے بعد جب شمالی ہند کے نظامِ تعلیم سے اردو کو فسطائی طریقے سے باہر کر دیا گیا تو چند سرکاری مسلمانوں کے سوا ہندی مسلمانوں میں وہ دانش ور طبقہ موجود ہی نہ رہا جو آزمائش کی گھڑی میں اگر ایک طرف اس جبر کے خلاف صف آرا ہوتا تو دوسری طرف جمہوری طریقے سے اردو کے حقوق کی بازیافت کرتا۔ ہندستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کی نام نہاد سیکولر سیاسی قیادت نے بھی اردو کے لیے ایسے کسی حق کا مطالبہ نہ کیا جو ایک زبان کے طور پر اردو کے تحفظ میں معاون ہو سکتا۔ تقسیم ہند کے بعد خصوصاً شمالی ہند کے مسلمان جس نفسیاتی خوف، اور قیام پاکستان کے لیے ذمے دار طبقے کے طور پر جس شدید اخلاقی دباؤ میں جیتے رہے اس کے نتائج کا تجزیہ سہل نہیں۔ ان حالات میں اربابِ اقتدار نے بھی نہایت ناکارہ مسلمانوں کو اردو اداروں میں ان عہدوں پر مامور کیا جو مسلمانوں کو بے وقوف بنانے کے لیے حکومت وقتاً فوقتاً قائم کرتی رہی تھی۔ اس سے اردو کے حالات نہ صرف یہ کہ مزید خراب ہوئے بلکہ انھوں نے مضحکہ خیز صورت بھی اختیار کر لی۔ سرکاری ضرورتوں کے مطابق جب کبھی زبان کے طور پر اردو کے فروغ کی بات ہوتی یا اردو تعلیم کے متعلقات زیرِ غور آتے تو صورتِ حال دیدنی ہوتی۔ یہ منظر نامہ آج بھی ایسا ہی ہے۔

اردو سے متعلق جلسوں اور سیمناروں میں مسندِ صدارت پر کوئی ایسا سرکاری مسلمان جلوہ افروز ہوتا ہے جو ملازمت کے زمانے میں خود کو شیڈولڈ کاسٹ سے بھی بدتر تصور کرتا تھا اور صرف آقا کی ضرورت کے مطابق ہی اسے یاد آتا تھا کہ وہ مسلمان ہے مگر ریٹائر ہونے کے بعد وہ کچھ شیروانیاں سلوا کر خود کو دانشوروں کی صف میں شامل کر لیتا ہے۔ تقسیم سے قبل اپنی تعلیم ختم کر لینے والے انگریزوں کے زمانے کے ان جوکروں میں بعض کو انگریزوں کے زمانے کی فارسی بھی آتی ہے۔ اردو چوں کہ مسلم حسیت کا اہم زاویہ بن گئی یوں اردو کا نام آتے ہی اکثر سرکاری مسلمانوں کی چاندی ہو جاتی ہے۔ اور پھر یہ سرکاری مسلمان اردو کے نام پر ایسی گل افشانیٔ گفتار شروع کرتے ہیں کہ باید وشاید۔ کوئی زبان کی ہمہ گیری کے نام پر ان تمام ہندوؤں کے نام گنواتا ہے جنھیں اس نے خود اپنی زبان سے یہ کہتے سنا کہ وہ اردو کے عاشق ہیں۔ اردو کے ہندو جوکروں کی قصیدہ خوانی کرتے ہوئے جو بات اس سرکاری مسلمان کو یاد نہیں آتی وہ یہ ہے کہ ان ہندوؤں نے تقسیم سے قبل اردو اس مجبوری کے تحت پڑھی کیوں کہ اس کی تعلیم خصوصاً شمالی ہند اور غیر منقسم

پنجاب میں لازمی تھی۔ تقسیم کے بعد جب ہندی مسلمان ہر طرح کے اقتدار سے محروم ہو گئے تو ان ہندوؤں کی نئی نسلوں نے تو اردو کو خیر باد کہہ دیا مگر ان کی پرانی یعنی اردو داں نسل نے اپنے ہندو نام اور اردو دانی کا پورا فائدہ اٹھایا۔ ان سماجیاتی حقائق سے بے خبر اردو کی ترویج و ترقی کے نام پر منعقد ہونے والے جلسوں میں سرکاری مسلمان جو مزے کی باتیں کیا کرتے ہیں ان میں بالعموم ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کا کسی علمی بحث سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ان اردو دانش وروں میں کسی کو اردو کی ترویج و ترقی کے نام پر کسی غیر مسلم مغنیہ کی مترنم آواز میں اردو کا جاگتا جادو اس زبان کے درخشندہ مستقبل کا آئینہ معلوم ہوتا ہے۔ اس دانش ور کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کسی دوسرے مسلم دانش ور کو اپنے کسی ایسے کتے کی یاد آجاتی ہے جو اس کے بچپن میں زندہ تھا — وہ کہتا ہے کہ صاحب ہمارے کتے کی دیکھ بھال کرنے والا ملازم بھی جو زبان بولتا تھا وہ اردو ہی تھی۔ اور کمال کی بات تو یہ ہے کہ اُس زبان کو ہمارا کتا بھی سمجھتا تھا۔ پھر ان ہی فدویانِ حکومت میں سے کسی کو اچانک کوئی اور معمولی اور قطعی غیر متعلق واقعہ اردو کے تعلق سے یاد آجاتا ہے اور وہ اسے کسی ایسے تاریخی واقعے سے تعبیر کرتا ہے جسے تاریخ میں شامل نہ کر کے گویا بڑی بددیانتی کی گئی ہے۔

فروغ اردو کی اس بحث میں اچانک کسی سرکاری مسلمان کا ذہن چھلانگ لگا کر مسلم یونیورسٹی کی تعلیمی پستی پر پہنچ جاتا ہے اور اُسی دم کسی دوسرے مسلمان کو اپنے آبائی قصبے کے کباب روٹی بیچنے والے یا کسی چائے خانے کے اردو بولنے والے لوگ یاد آجاتے ہیں۔ اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی کسی اور سرکاری مسلمان کو کسی یونیورسٹی میں اپنے کسی واقف کار کو اردو پروفیسر نہ بنانا فروغ اردو کی بحث کے ذیل میں سب سے اہم نکتہ معلوم ہوتا ہے۔ ایسی ہی بے ربط باتیں کر کے اردو کی ہر محفل اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ یہ قطعی ممکن ہے کہ یہ محفل پرائمری سطح کی اردو تعلیم کے مسائل پر ہو، جسے تعلیم سے متعلق کسی رضاکار ادارے نے حکومت کے مالی تعاون سے منعقد کیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ این سی ای آر ٹی یا کسی صوبے میں اردو کی نصاب سازی کے لیے ذمے دار کسی کمیٹی کا کوئی سنجیدہ سیشن ہو مگر حشر دونوں کا محفل لطیفہ جیسا ہی ہوتا ہے۔ آزادی کے بعد ہم تعلیم کے ماہر، آئین کے واقف کار، حکومت کے فیصلوں اور پالیسیوں پر نظر رکھنے والے اردو میں پیدا ہی نہیں کر سکے اور متذکرہ بالا جوکروں کو اردو والوں نے دل سے تو دانش ور تسلیم نہیں کیا مگر ان کے حماقت آمیز رویوں کی کبھی کھل کر مخالفت بھی نہیں کی۔ تہذیبی پستی کا ثبوت اس سے بڑھ کر دوسرا نہیں ہو سکتا کہ جس کو کہیں جگہ نہ ملی وہ اردو میں چلا آیا۔ روٹی اردو کی کھائی اور اقتصادی طور پر پسماندہ اردو آبادی کی سماجی پیچیدگی کو نظر انداز کر کے اردو والوں پر لعنت ملامت کرتا رہا۔ شمال کی تو بات چھوڑ دیجیے جنوب تک میں جہاں مسلم اداروں نے تعلیم کے میدان میں خاصا مثبت کام رضاکارانہ طور پر کیا ہے، اردو کے تعلق سے صرف اور صرف فروعی بحثیں اس عظیم زبان کا مقدر ہیں جو ہندستان کی ایک بڑی لسانی اقلیت کی زبان ہے۔ ٹیکس دہندہ کے طور پر اپنی زبان کے لیے وہ تمام حقوق حاصل کرنے کی اردو لسانی اقلیت اتنی ہی مجاز ہے جتنی دوسری لسانی اقلیتیں۔ مگر اس سوال کو صحیح تناظر میں کبھی اٹھایا ہی نہیں گیا۔

اردو کے فروغ کی ہر بحث میں ہم اس زاویے کو فراموش کر دیتے ہیں کہ جب تک اردو تعلیم کے متعلقات قومی تعلیمی نظام ہی کے تناظر میں زیر بحث نہ آئیں گے اور اس امر پر مسلسل زور نہ دیا جائے گا کہ پرائمری اور ثانوی سطح پر اسکولوں میں اردو تعلیم کا انتظام معقول ہو، زبان کے طور پر اردو کا فروغ کسی طرح ممکن نہیں۔ اردو کے فروغ کا اسم اعظم اردو رسم خط ہے جو اردو کی باقاعدہ تعلیم کے بغیر مسابقت کے اس دور میں کوئی نہیں سیکھے گا۔ پھر جب ایک طالب علم کو سہ لسانی فارمولے میں تین زبانیں پڑھنی ہی ہیں تو اس میں اگر ایک زبان اردو بھی ہو — جو بچے کا آئینی حق ہے — تو اس سے سرکاری مسلمانوں کی 'ہندو دوستی' کو آخر کیا نقصان پہنچے گا؟ مگر یہ ایسے مسائل ہیں جن پر سرکاری مسلمانوں نے خود شاید ہی کبھی سوچا ہو؟ ویسے ان ہندتوا دوست سرکاری مسلمانوں نے حکومت اور ہندو مذہب کو مسلمانوں کے حوالے سے دنیا بھر میں جتنا رسوا کیا اس کا حساب کسی کے پاس نہیں۔ ہندستان میں حکومتیں ہندو نوازی اور مسلم کشی کے باب میں کتنی ہی بدنام کیوں نہ ہوں مگر غور سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی حد تک حکومت کو تمام غلط مشورے سرکاری مسلمانوں نے ہی دیے۔

حالات بدل گئے ہیں، ہندستانی معاشرہ تعلیم اور قومی ترقی کی ایک نئی راہ پر گامزن ہے۔ زبانوں کا مجموعی کردار تبدیل ہو رہا ہے اور بول چال کی زبان کی سطح پر اردو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کی ثقافت اور اردو کی تعلیم کو علاحدہ علاحدہ رکھا جائے: اسکولوں کے نظام میں اردو کی تعلیم کے فروغ کے لیے تمام ممکن کوششیں کی جائیں۔ تعلیم، ثقافت اور زبان کے عمومی فروغ کے لیے اردو والے اردو آبادی کے تناسب سے بجٹ میں رقم کے اختصاص کا مطالبہ پوری قوت سے کریں۔ اس جمہوری و آئینی حق کا پرزور اور فیصلہ کن استعمال ہی اردو کو فروغ کی پٹری پر آگے بڑھا سکتا ہے۔ ■■

ڈاکٹر اطہر فاروقی، 80 سکھ دیو وہار، نئی دلی ۔ 110025

خراجِ عقیدت

واجدہ تبسم

16مارچ1935- 27 دسمبر2010

ساجدہ زیدی

1926- 9 مارچ 2011

ساجد رشید

11مارچ1955-11جولائی2011

خراجِ عقیدت

واجدہ تبسم: ادب کے عوامی رشتے کی آخری کڑی؟

—اخبارات اور انٹرنیٹ سے

اردو کی صاحب طرز خاتون افسانہ نگار واجدہ تبسم 27 دسمبر 2010 کو ممبئی میں انتقال کر گئیں۔ وہ ایک طویل عرصہ سے صاحب فراش تھیں۔ انہیں ذیابطیس کا مرض تھا، اور جوڑوں کے درد اور گٹھیا جیسی بیماریوں کے سبب بستر سے اٹھنے سے معذور تھیں۔ انتقال کے وقت 75 برس کی تھیں۔ چونکہ وہ گزشتہ کئی سال سے اردو کی ادبی دنیا سے کٹ گئی تھیں اس لئے ان کے انتقال کی خبر بے حد تاخیر سے لوگوں تک پہنچی اور تدفین کے موقع پر اردو دنیا سے تعلق رکھنے والوں کی اکثریت غیر موجود تھی۔ واجدہ تبسم 16 مارچ 1935 میں مہاراشٹر کے مردم خیز علاقہ امراوتی میں پیدا ہوئی تھیں۔ انھوں نے عثمانیہ یونی ورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا تھا۔ 1955 میں ممبئی آئیں اور ممبئی میں ہی ایک افسانہ نگار کے طور پر متعارف ہوئیں۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'شہر ممنوع' بے حد مشہور اور مقبول ہوا۔ پاکستان میں اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ 'شہر ممنوع' کی اشاعت کے بعد اردو ادب کے پنڈتوں نے یہ پیشن گوئی کی تھی کہ واجدہ تبسم کے قلم سے بہترین افسانے نکلیں گے۔ واجدہ تبسم نے اردو ادب کو بہترین افسانے دیئے بھی۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں نوابی دور کے حیدرآباد کی جو تصویر پیش کی وہ آنکھیں کھولنے والی تھی لیکن یہ افسانے کچھ اس قدر 'بولڈ' تھے کہ ان پر فحش نگاری کا الزام لگنے لگا۔ ان کے افسانوی مجموعے، اترن، نتھ کا بوجھ، نتھ کا زخم، یوں تو عوام میں بے حد مقبول ہوئے مگر اردو کے نقادوں کی نظروں میں یہ قابل اعتنا نہیں ٹھہرے۔ واجدہ تبسم کے افسانوں کے تقریباً ایک درجن مجموعے شائع ہوئے۔ انہوں نے اپنے زمانہ کے مشہور فلمی اور ادبی ماہنامہ 'شمع' میں کئی ایسے افسانے بھی لکھے جو حیدرآبادی ماحول سے دور تھے۔ ایسے ہی افسانوں میں ایک سیریز امریکہ سے متعلق افسانوں پر تھی۔ واجدہ تبسم نے اپنے افسانوں سے کافی پیسہ کمایا بلکہ کہا یہ جاتا ہے کہ جوہو کا بنگلہ ان کے افسانوں کے معاوضے کی رقم سے ہی بنوایا گیا تھا۔ واجدہ تبسم نے بچوں کیلئے بھی کہانیاں تحریر کی تھیں۔ بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ 'پھول کھلنے دو' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ 1960 میں واجدہ تبسم نے اپنے خاندان کی رضامندی کے بغیر اپنے کزن اشفاق سے شادی کی تھی۔ وہ ریلوے میں ملازم تھے۔ چند برس پہلے اشفاق صاحب کا بھی انتقال کر گئے جس کے بعد وہ بے حد اداس رہنے لگیں۔ مرحومہ کے پسماندگان میں تین بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک بیٹے کو بطور ہیرو متعارف کرانے کیلئے ایک فلم 'ٹیپو سلطان' بنانی شروع کی تھی۔ اس فلم کی موسیقی ان کے دوسرے بیٹے نے دی تھی اور شوہر پروڈیوسر ڈائرکٹر تھے۔ فلم مکمل نہیں ہوسکی تھی جس کی وجہ سے واجدہ تبسم کو زبردست مالی خسارہ برداشت کرنا پڑا تھا۔ واجدہ لوگوں کے خیال کے برعکس بہت مذہبی قسم کی خاتون اور نماز روزے کی پابند تھیں۔ اکثر کہا کرتی تھیں کہ ان کی باطنی مذہبی قوت ہی انھیں کہانیاں لکھنے کے لیے اکساتی ہے۔ ان کی 27 کتابیں شائع ہوئیں جن میں 'اترن' کو ان کا ماسٹر پیس مانا جاتا ہے۔ مسلم کٹھ ملاؤں نے ایک عورت کے قلم سے ایسی کہانیاں لکھے جانے پر شور مچایا مگر عام قاری نے ان کی کہانیوں کو بے حد پسند کیا۔ ان کی یہ کہانی درجن بھر زبانوں میں ترجمہ ہوچکی ہے اور اس پر ٹی وی فلم بھی بنی ہے۔ ان کی کتابوں میں تہہ خانہ (1968) کیسے سمجھاؤں (1977) زخم دل اور مہک اور مہک (1978) اور زر زن زمین (1989) بھی خاصی مشہور ہیں۔

واجدہ تبسم کی موت پر ملک کی شخصیات نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ وہ رشیدہ جہاں اور عصمت چغتائی کے بعد بے باکی سے لکھنے والی اولین خاتون افسانہ نگار تھیں۔ وہ بے حد بولڈ تھیں، انہیں کوئی پسند کرے یا نہ کرے ان کے افسانے عوام میں مقبول ہوئے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں 'شب خونی' جدیدیت نے ادب سے عوام کے جس رشتے کو منقطع کرنے میں سب سے بڑا کردار ادا کیا، واجدہ تبسم اس رشتے کی آخری کڑی تھیں، اور اردو تنقید کے چودھریوں نے واجدہ کے ساتھ جتنی بھی ناانصافی کیوں نہ کی ہو ان کی تخلیقات آج بھی عام اور خاص دونوں طرح کے قارئین کو متاثر کرتی ہیں۔ ■■

اترن

واجدہ تبسم

''نکو اللہ، میرے کو بہوت شرم لگتی۔''

''ایو اس میں شرم کی کیا بات ہے؟ میں نئیں اتاری کیا اپنے کپڑے؟''

''اوں...'' چمکی شرمائی۔

''اب اتارتی کی بولوں انابی کو؟'' شہزادی پاشا جن کی رگ رگ میں حکم چلانے کی عادت رچی ہوئی تھی، چلا کر بولیں۔

چمکی نے کچھ ڈرتے ڈرتے، کچھ شرماتے شرماتے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے پہلے تو اپنا کرتا اتارا، پھر پاجامہ... پھر شہزادی پاشا کے حکم پر جھاگوں بھرے ٹب میں ان کے ساتھ کود پڑی۔

دونوں نہا چکیں تو شہزادی پاشا ایسی محبت سے جس میں غرور اور مالکن پن کی گہری چھاپ تھی، مسکرا کر بولیں، ''ہور یہ تو بتا کہ اب تو کپڑے کون سے پین رئی؟''

''کپڑے...'' چمکی بے حد متانت سے بولی، ''یہی اچ میرا میلا کرتا پاجامہ۔''

''یہی اچ...'' شہزادی پاشا حیرت سے ناک سکوڑتے ہوئے بولیں۔

''اتے گندے، بد بو والے کپڑے؟ پھر پانی سے نہانے کا فائدہ؟''

چمکی نے جواب دینے کی بجائے الٹا ایک سوال جڑ دیا۔

''ہور آپ کیا پین رے پاشا؟''

''میں؟'' شہزادی پاشا بڑے اطمینان اور فخر سے بولیں۔

''وہ میری بسم اللہ کے وخت چمک چمک کا جوڑا دادی ماں نے بنائے تھے، وئی... مگر تو نے کائے کو پوچھی؟...''

چمکی ایک لمحے کو تو سوچ میں پڑ گئی، پھر ہنس کر بولی، ''میں سوچ رئی تھی۔'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''ہو پاشا... یہ میرے کو حمام میں بھگا لے تو اس کو جاڑ مار چوٹی کے ساتھ کیا منا نے مار لیتے بیٹھیں؟... جلدی نکل... تمیں تو بی پاشا کو جا کو بولتیوں...''

اپنی سوچی ہوئی بات چمکی نے جلدی سے کہہ سنائی۔ ''پاشا میں سوچ رئی تھی کہ کبھی آپ ہور میں 'اوڑھنی بدل' بہناں بن گئے تو آپ کے کپڑے میں بھی پہن لے سکتی نا؟''

''میرے کپڑے؟... تیرا مطلب ہے کہ وہ سارے کپڑے جو میرے صندوقاں بھر بھر کو رکھے پڑے ہیں؟''

جواب میں چمکی نے ذرا ڈر کر سر ہلایا۔

شہزادی پاشا ہنستے ہنستے دہری ہو گئی... ''ایو کتی بے خوف چھوکری ہے... اگے تو تو نوکرانی ہے... تو تو میری اترن پہنتی ہے... ہور عمر بھر اترن ہی پہنیں گی...''

پھر شہزادی نے بے حد محبت سے جس میں غرور اور فخر زیادہ اور خلوص کم تھا... اپنا ابھی ابھی کا نہانے کے لئے اتارا ہوا جوڑا اٹھا کر چمکی کی طرف اچھال دیا۔

''یہ لے اترن پہن لے۔ میرے پاس تو بہوت سے کپڑے ہیں۔''

چمکی کو غصہ آ گیا... ''میں کائے پہنوں، آپ پہنو نا میرا جوڑا یہ جوڑا...''

اس نے اپنے میلے جوڑے کی طرف اشارہ کیا۔

شہزادی پاشا غصے سے ہنکاری۔ ''انابی... انابی...''

انابی نے زور سے دروازے کو بھڑ بھڑایا اور دروازہ جو صرف ہلکا سا بھڑا ہوا تھا، پانوں پاٹ کھل گیا۔

''اچھا تو آپ صاحبان ابھی تک ننگے اچ کھڑے وے ہیں...'' انابی ناک پر انگلی رکھ کر بناوٹی غصے سے بولیں۔

شہزادی پاشا نے جھٹ اسٹینڈ پر ٹنگا ہوا نرم نرم گلابی تولیہ اٹھا کر اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا، چمکی یوں ہی کھڑی رہی۔

انابی نے اپنی بچی کی طرف ذرا غور سے دیکھا، ''ہور تو پاشا لوگاں کے حمام میں کائے کو پانی نہانے کو آن مری؟...''

''یہ انوں شہزادی پاشا نے بولے کی تو بھی میرے ساتھ پانی نہا۔''

انابی ڈرتے ڈرتے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔ پھر جلدی سے اسے حمام سے باہر کھینچ کر بولیں۔ ''چل، جلدی سے جا کر نوکر خانے میں کپڑے پین۔ تمیں تو سردی وردی لگ گئی تو مرے گی۔''

''اب یہ چکٹ گوند کپڑے نکو پہن، وہ لال چنی میں شہزادی پاشی پرسوں اپنا کرتا پاجامہ دیئے تھے، وہ جا کو پہن لے۔''

وہیں ننگی کھڑی وہ سات برس کی ننھی سی جان بڑی گہری سوچ کے ساتھ رک رک کر بولی... ''امی جب میں ہور شہزادی پاشی ایک برابر کے ہیں تو انوں میری اترن کیوں نئیں پہنتے؟''

''ٹھہر ذرا، میں مما کو جا کے بولتیوں کی چمکی میرے کو ایسا بولی۔''

لیکن انابی نے ڈر کر اسے گود میں اٹھالیا...'' آگے پاشا انے تو چھنال پاگل ہو لی ہوگئی ہے ایسے دیوانی کے باتاں کائے کو اپنے مما سے بولتے آپ؟ اس کے سنگات کھیلنا، نہ بات کرنا، جب اس کے نام پو جوتو مار دیو آپ۔''

شہزادی پاشا کو کپڑے پہنا کر، کنگھی چوٹی کر کے، کھانا وانا کھلا کر جب سارے کاموں سے نچنت ہو کر انابی اپنے کمرے میں پہنچیں تو دیکھا کہ چمکی ابھی تک ننگا جھاڑ بنی کھڑی ہے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ دیکھا آتے ہی انہوں نے اپنی بیٹی کو دھنکنا شروع کر دیا۔ ''جس کا کھاتی اسی سے لڑائیاں مول لیتی... چھنال گھوڑی۔ ابھی کبھی بڑے سرکار نکال باہر کر دیئے تو کدھر جائیں گے اتے نخرے؟''

انابی کے حسابوں تو یہ بڑی خوش نصیبی تھی کہ وہ شہزادی پاشا کو دودھ پلانے کے واسطے رکھی گئی تھیں۔ ان کے کھانے پینے کا معیار تو لازماً ہی تھا، جو بیگمات کا تھا کہ بھئی آخر وہ نواب صاحب کی اکلوتی بچی کو اپنا دودھ پلاتی تھیں۔ کپڑا لتا بھی بے حساب تھا کہ دودھ پلانے والی کے لئے صاف ستھرا رہنا لازمی تھا اور سب سے زیادہ مزے تو یہ تھے کہ ان کی اپنی بچی کو شہزادی پاشا کی بے حساب اترن ملتی تھی... کپڑے لتے ملنا تو ایک طے شدہ بات تھی، حد یہ کہ اکثر چاندی کے زیور اور کھلونے تک بھی اترن میں دے دیئے جاتے تھے۔

ادھر وہ حرافہ تھی کہ جب سے ذرا ہوش سنبھال رہی تھی، یہی ضد کئے جاتی تھی کہ میں بی پاشا کے اترن کیوں پہنوں؟ کبھا کبھار تو آئینہ دیکھ کر بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ کہتی... ''امی میں تو بی پاشا سے بھی زیادہ خوبصورت ہوں نا؟ پھر تو انوں میری اترن پہنانا؟''

انابی ہر گھڑی ہولتی تھیں۔ بڑے لوگ تو بڑے لوگ ہی ٹھہرے۔ اگر کسی نے سن گن پالی کہ موئی انا نا اصل کی بیٹی ایسے ایسے بول بولتی ہے تو ناک چوٹی کاٹ کر نکال باہر کر دیں گے... ویسے بھی دودھ پلانے کا زمانہ تو مدت ہوئی بیت گیا تھا۔ وہ تو ڈیوڑھی کی روایت کہیئے کہ انا لوگوں کو مرے بعد ہی چھٹی کی جاتی تھی۔ لیکن قصور بھی معاف کیئے جانے کے قابل ہو تو ہی معافی ملتی ہے ایسا بھی کیا؟ انابی نے چمکی کے کان مروڑ کر اسے سمجھایا۔

''آگے سے کچھ بولی تو یاد رکھ... تیرے کو عمر بھر بی پاشا کی اترن پہننا ہے مجھی کی نئیں، گدھے کی اولیاد!''

گدھے کی اولیاد نے اس وقت زبان سی لی... لیکن ذہن میں لاوا پکتا ہی رہا۔

تیرہ برس کی ہوئیں تو شہزادی کی پہلی بار نماز قضا ہوئی۔ آٹھویں دن گل پوشی ہوئی تو ایسا زرتار، جھم جھماتا جوڑا امماں نے سلوایا کہ آنکھ ٹھہرتی نہ تھی... جگہ جگہ سونے کے گھنگھروؤں کی جوڑیاں ٹنکوائیں کہ جب بی پاشا چلتیں تو چھن چھن پازیبیں سی بجتیں۔ ڈیوڑھی کے دستور کے مطابق وہ حد سے سوا قیمتی جوڑا بھی اترن میں صدقہ دے دیا گیا۔ انابی خوشی خوشی وہ سوغات لے کر پہنچیں تو چمکی جو اپنی عمر سے کہیں زیادہ سمجھ دار اور حساس ہو چکی تھی، دکھ سے بولی، ''امی مجبوری نا طے لینا ہور بات ہے مگر آپ ایسے چیزاں کو لے کو خوش مت ہوا کرو۔''

''اگے بیٹا'' وہ رازداری سے بولیں ''یہ جوڑا اگر بکانے کو بھی بیٹھے تو دو سو کلدار روپے تو کہیں نئیں گئے۔ اپن لوگاں نصیبے والے ہیں کہ ایسی ڈیوڑھی میں پڑے۔''

''امی...'' چمکی نے بڑی حسرت سے کہا... ''میرا کیا جی بولتا کی میں بھی کبھی بی پاشا کو اپنی اترن دیوں؟''

انابی نے سر پیٹ لیا'' آگے تو بھی اب جوان ہوگئی گے ذرا عمل پکڑ۔ ایسی ویسی باتاں کوئی سن لیا تو میں کیا کروں گی ماں، ذرا میرے بڑھے چونڈے پر رحم کر۔''

چمکی ماں کو روتا دیکھ کر خاموش ہوگئی۔

مولوی صاحب نے دونوں کو ساتھ ساتھ ہی قرآن شریف اور اردو قاعدہ شروع کرایا تھا... بی پاشا نے کم اور چمکی نے زیادہ تیزی دکھائی... دونوں نے جب پہلی بار قرآن شریف کا دور ختم کیا تو بڑی پاشا نے از راہ عنایت چمکی کو بھی ایک ہلکے کپڑے کا نیا جوڑا سلوا دیا تھا۔ ہر چند کہ بعد میں اسے بی پاشا کا بھاری جوڑا بھی اترن میں مل گیا تھا لیکن اسے اپنا وہ جوڑا جان سے زیادہ عزیز تھا... اس جوڑے سے اسے کسی قسم کی ذلت محسوس نہ ہوتی تھی۔ ہلکے زعفرانی رنگ کا سوتی جوڑا... جو کتنے ہی سارے جگمگاتے لس لس کرتے جوڑوں سے سوا تھا۔

اب جب کہ خیر سے شہزادی پاشا پڑھ لکھ بھی چکی تھیں، جوان بھی ہو چکی تھیں... ان کا گھر بسانے کی فکریں کی جا رہی تھیں۔ ڈیوڑھی، ستاروں، درزیوں، بیوپاریوں کا مسکن بن چکی تھی۔ چمکی یہی سوچے جاتی کہ وہ تو شادی کے اتنے بڑے ہنگامے کے دن بھی اپنا ہی جوڑا پہنے گی جو کسی کی اترن نہیں تھا۔

بڑی پاشا، جو واقعی بڑی مہربان خاتون تھیں، ہمیشہ اپنے نوکروں کا اپنی اولاد کی طرح خیال رکھتی تھیں۔ اس لئے شہزادی کے ساتھ وہ چمکی کی شادی کے لئے بھی اتنی ہی فکر مند تھیں... آخر نواب صاحب سے کہہ کر انہوں نے ایک مناسب لڑکا چمکی کے لئے تلاش کر ہی لیا۔ سوچا کہ شہزادی پاشا کی شادی کے بعد اسی جھوڑ جھمیلے میں چمکی کا بھی عقد پڑھا دیا جائے۔

اس دن جب شہزادی پاشا کے عقد کو صرف ایک دن رہ گیا تھا... اور ڈیوڑھی مہمانوں سے ٹھساٹھس بھری پڑی تھی اور لڑکیوں کا ٹڈی دل ڈیوڑھی کو سر پر اٹھائے ہوئے تھا، اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ہوئی شہزادی پاشا پیروں میں مہندی لگواتے ہوئے چمکی سے کہنے لگی، ''تو سسرال جائے گی تو تیرے پیروں کو میں مہندی لگاؤں گی۔''

''ایو خدا نہ کرے...'' اناؤں نے پیار سے کہا... ''اس کے پانواں آپ کے دشمناں چھوئیں... آپ ایسا بولے سو بس ہے۔ بس اتی دعا کرتا پاشا کہ آپ کے دولہے میاں ویسا شریف دولہا اس کا نکل جائے۔''

''مگر اس کی شادی کب ہورئی جی؟'' کوئی چلبلی لڑکی پوچھ بیٹھی۔

شہزادی پاشی وہی بچپن والی غرور بھری ہنسی ہنس کر بولیں، ''میری اتی ساری اترن نکلے گی تو اس کا جہیز تیار سمجھو...''

اترن... اترن... اترن... کئی ہزار سوئیوں کی باریک باریک نوکیں جیسے اس کے دل کو چھید گئیں... وہ آنسو پیتے ہوئے اپنے کمرے میں آکر چپ چاپ پڑ گئی۔

سرِ شام ہی لڑکیوں نے پھر ڈھولک سنبھال لی۔ ایک سے ایک واہیات گانا گایا جا رہا تھا۔ پچھلی رات رت جگا ہوا تھا۔ آج پھر ہونے والا تھا۔ پرلی طرف صحن میں ڈھیروں چولہے جلائے، باورچی لوگ انواع واقسام کے کھانے تیار کرنے میں مشغول تھے۔ ڈیوڑھی پر رات ہی سے دن کا گمان ہو رہا تھا۔

چمکی کا روتا ہوا حسن نارنجی جوڑے میں اور کھل اٹھا۔ یہ جوڑا وہ جوڑا تھا، جو اسے احساس کمتری کے پاتال سے اٹھا کر عرش کی بلندیوں پر بٹھا دیتا تھا۔ یہ جوڑا کسی کی اترن نہیں تھا۔ نئے کپڑوں سے سلا ہوا جوڑا، جو اسے زندگی بھر ایک ہی بار نصیب ہوا تھا، ورنہ ساری عمر تو شہزادی پاشا کی اترن پہنتے ہی گزری تھی اور اب چونکہ جہیز بھی تمام تر ان کی اترن ہی پر مشتمل تھا اس لئے باقی کی ساری عمر بھی اسے اترن ہی استعمال کرنی ہوگی۔

''لیکن بی پاشا... ایک سیدزادی کہاں تک پہنچ سکتی ہے۔ وہ تم بھی دیکھ لینا۔ تمے ایک سے ایک پرانی چیز مجھے استعمال کرنے کو دیئے نا؟ اب تم دیکھنا۔''

ملیدے کا تھال اٹھائے وہ دولہا والوں کی کوٹھی میں داخل ہوئی... ہر طرف چراغاں ہو رہا تھا... یہاں بھی وہی چہل پہل تھی، جو دلہن والوں کے محل میں تھیں، صبح ہی عقد خوانی جو تھی۔

اتنے ہنگامے اور اتنی بڑی کوٹھی میں کسی نے اس کا نوٹس بھی نہ لیا... پوچھتی پاچھتی وہ سیدھی دولہا میاں کے کمرے میں جا پہنچی... ہلدی مہندی کی رتجوں رسموں سے تھکے تھکائے دولہا میاں اپنی مسہری پر دراز تھے۔ پردہ ہلا تو وہ مڑے، اور دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

گھٹنوں تک لمبا زعفرانی کرتا۔ کسی کسی پنڈلیوں پر منڈھا ہوا تنگ پاجامہ، ہلکی ہلکی کلدانی کا کڑھا ہوا زعفرانی دوپٹہ۔ روئی روئی، بھیگی بھیگی گلابی آنکھیں، چھوٹی آستینوں والے کرتے میں سے جھانکتی گداز بانہیں، بالوں میں موتیا کے گجرے پروئے ہوئے... ہونٹوں پر ایک قاتل سی مسکراہٹ... یہ سب نیا نہیں تھا... لیکن ایک مرد جس کی پچھلی کئی راتیں کسی عورت کے تصور میں بیتی ہوں... شادی سے ایک رات پہلے بہت خطرناک ہو جاتا ہے... چاہے وہ کیسا ہی شریف ہو۔

تنہائی جو گناہوں کی ہمت بڑھاتی ہے۔

چمکی نے انہیں یوں دیکھا کہ وہ جگہ جگہ سے ٹوٹ گئے... چمکی جان بوجھ کر منہ موڑ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ تلملائے سے اپنی جگہ سے اٹھے اور ٹھیک اس کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ آنکھوں کے گوشوں سے چمکی نے انہیں یوں دیکھا کہ وہ ڈھیر ہوگئے۔ ''تمہارا نام؟'' انہوں نے تھوک نگل کر کہا۔

''چمکی...'' اور ایک چمکیلی ہنسی نے اس کے پیارے پیارے چہرے کو چاند کر دیا۔

''واقعی تم میں جو چمک ہے اس کا تقاضا یہی تھا کہ تمہارا نام چمکی ہوتا...''

انہوں نے ڈرتے ڈرتے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا۔ خالص مردوں والے لہجے میں... جو کسی لڑکی کو پٹانے سے پہلے خواہ مخواہ کی ادھر ادھر کی ہانکتے ہیں... لرزتے ہوئے اپنا ہاتھ شانے سے ہٹا کر اس کے ہاتھ کو پکڑتے ہوئے بولے... ''یہ تھال میں کیا ہے؟''

چمکی نے قصداً ان کی ہمت بڑھائی... ''آپ کے واسطے ملیدہ لائی ہوں، رت جگا تھا نہ رات کو...'' اور اس نے تلوار کے بغیر انہیں گھائل کر دیا... ''مونہہ میٹھا کرنے کو...'' وہ مسکرائی۔

''ہم ملیدے ولیدے سے منہ میٹھا کرنے کے قائل نہیں ہیں... ہم تو... ہاں'' اور انہوں نے ہونٹوں کے شہد سے اپنا منہ میٹھا کرنے کو اپنے ہونٹ بڑھا دیئے... اور چمکی... ان کی بانہوں میں ڈھیر ہوگئی... ان کی پاکیزگی لوٹنے... خود لٹنے... اور انہیں لوٹنے کے لئے...

وداع کے دوسرے دن ڈیوڑھی کے دستور کے مطابق جب شہزادی پاشا ان کی اترن اپنا سہاگ کا جوڑا اپنی انا اپنی کھلائی کی بٹیا کو دینے گئیں، تو چمکی نے مسکرا کر کہا،

''پاشا... میں... میں... میں زندگی بھر آپ کی اترن استعمال کرتی آئی... مگر اب آپ بھی...''

اور وہ یوں دیوانوں کی طرح ہنسنے لگی... ''میری استعمال کری ہوئی چیز اب زندگی بھر آپ بھی...'' اس کی ہنسی تھمتی ہی نہ تھی۔

سب لوگ یہی سمجھے کہ بچپن سے ساتھ کھیلی سہیلی کی جدائی کے غم نے عارضی طور سے چمکی کو پاگل کر دیا ہے۔ ■■

خراجِ عقیدت

ساجدہ زیدی کی شاعری میں تلاشِ ذات

زویا زیدی

ساجدہ زیدی کا انتقال، اور وہ بھی بڑی بہن زاہدہ زیدی صاحبہ کے انتقال کے چند ہفتوں بعد ہی -- اردو زبان و ادب کا دوہرا نقصان ہے جس کے صدمے سے سنبھلنے میں وقت لگے گا۔ 'ادب ساز' سے وہ بڑا لگاؤ رکھتی تھیں۔ اپنی غیر مطبوعہ تحریریں ہمیں مرحمت فرماتی رہتی تھیں۔ ان میں مرحومہ کی آپ بیتی بھی تھی جس کے چند اوراق ہم شائع کر چکے ہیں۔ ان کا آخری تبرک، وہ چند نظمیں ہیں جو انھوں نے خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجی تھیں۔ وہی نظمیں ہم نذرانۂ عقیدت کے طور پر زیر نظر مضمون کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ ان کی دختر ڈاکٹر زویا زیدی ادب کی گہری سمجھ رکھتی ہیں چنانچہ ان کا لکھا ہوا یہ مضمون ایک غم زدہ بیٹی سے کہیں زیادہ ایک ادب شناس کا خراجِ عقیدت ہے۔ مضمون عنایت فرمانے کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ ادارہ

ساجدہ زیدی کی شاعری کو اگر شروع سے آخر تک ایک تسلسل میں پڑھا جائے تو ایک pattern ایک نمایاں خاکہ ابھر کر آتا ہے کہ دانستہ یا غیر شعوری طور پر وہ ہمیشہ کوشاں رہتی ہیں خود کو سمجھنے، خود کو explore کرنے اور خود شناسی کے عمل سے دوچار ہونے میں، اور گاہے گاہے عرفانِ ذات کا اظہار کرنے میں۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شاید ان کی پوری شاعری ہی ذات کا اظہار ہے اور جب وہ حیات و کائنات پر بھی reflect کرتی ہیں، ان پر سوچتی اور فکر کرتی ہیں تو وہ بھی اپنی ذات کے آئینہ میں۔ یہ اظہارِ ذات اور اظہارِ خودی شاید ان کی شاعری کا ایک انفرادی، ایک unique پہلو ہے اور شروع سے آخر تک پایا جاتا ہے۔ ہر تجربۂ حیات، ہر تجربۂ کائنات، ہر خیال، ہر فلسفہ ان کی ذاتی کسوٹی سے گزر کر، ان کے ذہن سے distill ہو کر ہی صفحات پر قلم کے ذریعہ اترتا ہے۔ گو کہ ان کی پوری حیات ایک canvas ہے، ایک قرطاس ہے، جس پر وہ اپنے خامۂ ذات سے مستقل لکھتی رہتی ہیں:

ہتھیلیوں پہ اگائے ہیں آرزو کے کنول
چراغِ زخم جلائے ہیں شب کے سینے میں
رگوں میں زہر کو دوڑا دیا لہو کی طرح
مژہ پہ قطرۂ شبنم میں آگ دہکائی
ہر اک لمحے کو اک عمر کا خراج دیا
ہر ایک خار کو سو آبلوں کی رعنائی

'سیلِ وجود'

ان کی شاعری ایک پختہ عمر کی شاعری ہے۔ لہٰذا اس میں نہ تو وہ نوجوانی کے عشق کا اُبال ہے نہ ہی تانیثیت کا Stereo typical اظہار ہے بلکہ اس سے دانستہ گریز ہے۔ ابتدا میں ہی وہ یہ establish کر دیتی ہیں کہ:

میں وہ تصویر نہیں...
نقش بہ دیوار نہیں...

عورت کے عام perception ''مجھ کو سمجھا گیا، میں شعرِ مجسم خود ہوں/ بانکپن اور ادا/ رمزِ تبسم/ نگہ لطف کے تیر/ کالی زلفوں کی گھٹا/ دستِ حنائی کا کرم/ یہی سرمایۂ ہستی ہے مرا/...'' کو ایک 'ہتھیار' کا نام دے کر، وہ اپنی نظم 'میں وہ تصویر نہیں' میں آگے بڑھ جاتی ہیں اور پھر کہتی ہیں: ''فلسفۂ شعر/ تڑپ دل کی/ تمنا کا طلسم/ دردِ ہستی کی چبھن/ آبلہ پائی کی اساس/ تلخ کامی کی مٹھاس/ لوگ سمجھے کہ مری ذات کا حصہ ہی نہیں...'' اور جیسا کہ عام

طور پر سمجھا جاتا ہے ایک عورت کے لیے ''مجھ کو ہنگامۂ عالم سے سروکار ہی کیا؟/'' اور پھر عورت کی ذات کے المیے کو بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں: ''میں یوں ہی گھٹتی رہی، سکڑتی رہی لمحہ لمحہ/ اور لوگوں کی انا بڑھتی رہی/ پھولتی، پھلتی رہی'' اس بات کا اظہار کرتی ہیں کہ کس طرح سے عورت کو marginalise کرکے حاشیہ پر ڈال کے، ایک Stereotypical image دے کر مردوں کی انا کو feed ہوتی اور ان کو احساسِ برتری ہوتا ہے۔ ان اشعار میں مشہور فرانسیسی مصنفہ 'Simone de Beauvoir' کی کتاب 'The Second Sex' میں جو عورت کا analysis ہے اس کی واضح بو آتی ہے اور ان کے feminist نظریات کا اظہار ہوتا ہے۔

اسی نظم کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہتی ہیں، اور سوالات کرتی ہیں:

''کس نے جھانکا ہے مری ذات کی تنہائی میں؟
کون بھٹکا ہے مری روح کی پہنائی میں؟
کس نے امواجِ تخیل کو گنا ہے میری؟
کس نے رکھا مرے ناکردہ گناہوں کا حساب؟
قلب میں دبکے ہوئے نشترِ غم
شعلۂ عشق کا رقصِ بسمل
لذتِ وحشتِ دل، ٹیس خوشی میں غم کی
لغزشیں خواہشِ بیکار کی
اور لذتِ اجسام، میں جلنے کی ہوس
دورِ تجدیدِ تمنا کا تمنا و نشاط
لطف احساس کی بھٹی میں جلے جانے کا،
کرب، امکان کے دھارے پہ بہے جانے کا،
عیش، افکار کے شعلے کے بھڑک اٹھنے کا
کیفیت، حرفِ تمنا کی فنِ شعر میں ڈھل جانے کی
حوصلہ، موت کی وادی میں سفر کرنے کا،
خوف، خود اپنی ہی ہستی کے تقاضوں سے
کہ اس بحر کا شاید کوئی ساحل ہی نہیں
اضطرار، اس کا کہ موجودہ امکان کی خلیج
کبھی پیا اک قدم ناپ سکیں
اضطراب، اس کا کہ اک ہستیِ مطلق بھی نہیں،
جس کی طاعت میں ملے روح کو دیرینہ سکون...

'آتشِ سیال' صفحہ 126

مندرجہ بالا اشعار میں سطحی طور پر احساس ہوتا ہے کہ شاید اپنے غم و آلام میں، اور اپنی محرومیوں میں، وہ ایک masochistic قسم کا pleasure، ایک لذت، حاصل کرتی ہیں، مگر غور کرنے پر یہ احساس واضح طور پر ہو جاتا ہے وہ انہی محرومیوں کو مشعل راہ بنا کر انھیں سے تخلیق کا سرچشمہ پیدا کرتی ہیں اور انھیں سے 'ہتھیلیوں پہ آرزو کے کنول اگانے' کا 'رگوں میں زہر کو لہو کی طرح' دوڑانے کا کام لیتی ہیں، انھیں زخموں سے 'شب کے سینے میں چراغ' جلاتی ہیں...

جیسے بھی حالات ہوں زندگی جینے اور کرنے کی تمنا ان کے یہاں برقرار رہتی ہے۔ ایک بھرپور زندگی جینے کی مسلسل خواہش کبھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی، اور وہ 'ہر اک لمحہ کو اک عمر کا خراج' اور 'ہر ایک خار کو سو آبلوں کی رعنائی' بخشتی چلتی ہیں، کم از کم بخشنے کے لیے کوشاں ضرور رہتی ہیں۔ پھر خود ہی سوال کرتی ہیں:

تم نے ان ریگزاروں کی بنجر زمیں میں
کتنے رفتار و گفتار کے گل کھلائے
اس عقوبت کدے کی سیاہی میں
کتنے چراغ تمنا جلائے...؟

'پردہ ہے ساز کا' نظم 'کب سے محوِ سفر ہوں' صفحہ 28

ہر ایک شاعر کی طرح جو اپنا نشان چھوڑ جانے کی خواہش ہمیشہ دل میں رکھتا ہے انھوں نے یہ چاہا:

میں آنکھیں بند بھی کر لوں تو نظارہ رہے باقی
میں اپنے ہونٹ بھی سی لوں
تو میرے نطق کی گرمی سے ہر محفل پگھل جائے

'آتشِ سیال' نظم 'وجدان' صفحہ 20

اور پھر اس بات کو ثابت کرنے میں establish کرنے میں اور achieve کرنے میں ساری عمر گزار دی اور گاہے گاہے اپنی تمام شاعری میں اس کا اظہار کرتی رہیں، اپنی ہستی کے نہاں خانوں میں اُترتی رہیں اور شاعری میں اتارتی رہیں:

غرض عمر کی راہ سنگلاخ پر چلتے چلتے
گل و نسترن، لالہ و سمن سے گزرتے
لق و دق دشتِ بے کاخ و کو کا
پا پیادہ سفر کرتے کرتے،
لمحے لمحے کے قرطاس پر ہم نے
اک داستاں چھوڑ دی

رمزِ تخلیق کی والہانہ زبان چھوڑ دی

ان اشعار میں عرفانِ ذات بھی ہے، زندگی کرنے کے عمل کا عزم بھی ہے اور اس بات کا احساس بھی ہے کہ مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے بھی زندگی جینے کا ہنر نہیں چھوڑا بلکہ تخلیق کی نہ صرف راہیں نکالیں بلکہ تخلیق کی زبان پیدا کی...

اور اسی تگ و دو میں:

ہر قطرۂ لہو سے جلایا چراغِ گل
گزرے کچھ اس طرح سے غمِ دو جہاں سے ہم
(از غزل نظر حامی) پردہ ہے ساز کا ورق 139)

شاید مشکل پسندی ہی چلتے چلتے ان کی ذات کا ایک حصہ بن جاتی ہے:

نہیں قرار کی لذت سے آشنا یہ وجود
وہ خاک میری نہیں ہے جو کو بہ کو نہ رہے

'آتشِ زیرِپا' صفحہ 162

اک سیلِ خوں میں بہتا رہا کاروانِ عمر
دل ڈر رہا ہے جادۂ ہموار دیکھ کر

'آتشِ زیرِپا' غزل 85 صفحہ 142

اسی زندگی کی جدوجہد میں، زمانے کی سفاکی سے گزرتے وجود کے المیے کے احساسِ مسلسل نے ان کی روح میں ایک مستقل اضطراب پیدا کر دیا ہے بلکہ شاید یہ اضطراب روح ہی ہے جو ہر تجربہ کو، ہر شے کو شدت سے محسوس کرتا ہے اور ہر خوشی میں غم کی کسک اور ہر غم میں ایک راحت کا احساس رکھتا ہے۔ احساسِ تنہائی، زمانے کی سفاکی اور سیاست کی فسوں کاری کو وہ ایک کائناتی رنگ دے دیتی ہیں، لیکن یہ احساسِ ذات کے عرفاں سے ہی پیدا ہوتا ہے، جب کہ عام طور سے حالات عرفانِ ذات کا ذریعہ بنتے ہیں اور انسان کو 'اپنے اندر ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی' پر مجبور کرتے ہیں...

ساجدہ زیدی 'اپنے اندر' ڈوبتی ابھرتی رہتی ہیں اور 'سراغِ زندگی' پاتی رہتی ہیں اور 'اپنا بنتی' رہتی ہیں... درحقیقت اقبال کی شاعری ان کی زندگی میں اکثر مشعلِ راہ کا کام کرتی ہے اور اس کا اظہار ان کی تصنیفات میں ہوتا رہتا ہے:

کہ یہ طویل سفر، یہ مہیب تنہائی،
کہیں نہ ڈس لے مجھے راستوں کی پہنائی،
مگر یہ قدرتِ فیاض مہرباں نکلی،
قدم بڑھائے تو پہلے مجھے رفیق دیا
جو میرے ساتھ رہا اس سفر میں اس طرح
کہ جیسے ذہن و دل و روح و جسم و جان و نظر،
کبھی پہ اس کا اجارہ
کبھی ہیں اس کا گھر
میں سوچتی ہوں مگر!
یہ 'زہرِ غم' بھی اگر چھوڑ دے تو ہوگا
کہ یہ طویل سفر، یہ مہیب تنہائی

'آتشِ سیال' نظم 'سوچ'

وہ 'زہرِ غم' کو اپنا 'رفیقِ حیات' چن کر اسے اپنے 'رگ و پے میں اتارتی رہتی ہیں' کہ: رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم پھر دیکھیے کیا ہو

وہ ہر نوائے صورت میں، زندگی کے نشیب و فراز میں، قدرت کے کاشانۂ ہستی میں، صبحِ صادق، شام کے سرنگوں سایوں میں، ڈھلتے سورج کی سرخی میں، آگہیِ ذات ڈھونڈتی ہیں، عرفانِ غمِ حیات ڈھونڈتی ہیں:

وہ معصوم دل جو ازل سے تھا
اسرارِ فطرت کا جویا
گزرتی ہواؤں سے سرگوشیاں کرتا
طلسمِ منور سے یوں کانپ جاتا
کہ ہر گام کو سجدہ گاہِ تمنا بناتا
سرمئی کیف ——اور
گونجتی خامشی میں
لالہ زارِ تصور کھلاتا
نغمۂ آتشیں سے گہربار کرتا
شرربار کرتا
وہ سرشار ہوتا...
مگر دل ہی کیا نغمۂ آتشیں سرد ہے
یہ کیا شے ہے —جو
تصادم کے ملبے تلے نیم جاں ہے؟

'دل سیلِ خوں میں بہہ گیا' ('آتشِ زیرِپا') صفحہ 48

زندگی کے آخری پڑاؤ میں یہ احساس اور بڑھ جاتا ہے:

جب گزار آئے اک عمرِ غم پیرہن
جب سنوار آئے گیسوئے ہستی —شکن در شکن
جب تلاشِ صداقت میں دے آئے ہم
نطق و لب، جان و تن،

تب کھلا ہم پہ یہ عقدۂ دل شکن

کہ...

لوحِ ہستی پہ تحریر، اسرارِ جاں — رائیگاں

بے مقدر زباں، سحرِ حرف و بیاں — رائیگاں

جوہرِ ہر نفس، بر زمین و زماں — رائیگاں

شر بارِی جان و تن — رائیگاں

'عرصۂ بال و پر رائیگاں' ('آتش زیرِ پا') صفحہ 53

غرض کہ عمر کے ہر حصہ میں احساس کی جو مسلسل لڑی ہے اس کا اظہار ہوتا رہتا ہے اور خوب ہوتا ہے۔ قوت گفتار اور زبان پر عبور اتنا ہے الفاظ کبھی کم نہیں پڑتے بلکہ فراوانی عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی جاتی اور شاعری میں نئی نئی تراکیب، استعارے اور تلمیحات و علامات جڑتے جاتے ہیں مگر آخر تک احساس تشنگی کم نہیں ہوتا:

مجھے شاید ہمالہ کی فلک پیمائیاں آواز دیتی ہیں

میں اپنی موت سے

ان برف زاروں کی درخشندہ معیت میں ملوں گی

توڑ دوں گی حلقۂ زنجیرِ مجبوری

'یومِ حساب' ('آتش زیرِ پا') صفحہ 43

زندگی اختتام پر پہنچ جاتی ہے مگر Spirit of inquiry سوالوں کی زنجیر ختم نہیں ہوتی:

''مگر یہ آرزومندی...؟

دکھوں کے گہرے ساگر میں

بس اک بے بادباں کشتی...

مگر یہ عشق کا دریا...؟

سفینہ روح کا،

جو ماورائے موجِ دریا...

مگر یہ درد کا رشتہ...؟

مکافاتِ تمنا

مگر یہ غم... یہ زہرِ غم...؟

گزرتے موسموں کے

تم کا نغمہ...

وغیرہ...

'زندگی تو سوالوں کی زنجیر ہے' ('پردہ ہے ساز کا') صفحہ 60

اور اسی طرح سے ان کی شاعری ذات کی عکاسی کرتی چلتی ہے، جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے:

ایک دن میں نے سوچا

کہ اس دل کی دولت کو

یوں طشت از بام کرنے سے کیا فائدہ؟

یہ میری متاعِ نظر ہے

مرے ذہن کا بے محابا سفر ہے

مری از ازل تا ابد سرگراں

جستجوؤں کا دھندلا نشاں ہے...

تلاشِ حقیقت کا خوابِ گراں ہے

اور پھر

دور سے ایک آواز آئی

کہ ان ٹوٹے الفاظ کے آئینے میں مرے ہم نوا

میرے چہرے کا دھندلا سا اک عکس دیکھیں

تو شاید مجھے جان جائیں

مری زخم خوردہ انا کے

کسی گوشۂ مختصر پر

کوئی مرہم نرم رکھ دیں

'حرفِ اول' ('آتش سیال') صفحہ 18، مارچ 69

اب کسی نے مرہم نرم رکھا نہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے۔ مگر ہاں ان الفاظ اور اشعار کے آئینہ میں ساجدہ زیدی کو جان و پہچان تو ضرور گئے اور آنے والے وقتوں میں امید ہے کہ اور بہتر جان جائیں گے کہ جو شناخت ساجدہ زیدی نے وقت کے آئینہ میں اپنی بنائی ہے، جو نقشِ قدم اس عدم کے بیاباں میں چھوڑ گئی ہیں وہ آنے والے دور میں ضرور ادب و انسان کی رہنمائی کریں گے:

بڑی بات ہے اس عدم کے بیاباں میں اک نقشِ پا چھوڑ جانا

زمانے کی سفاک محفل میں اپنا پتا چھوڑ جانا

نظم 'آتش سیال' (بلقیس کے نام)

■■

Dr. Zoya Zaidi Sanoobar Clinic, 12 Abad Market, Doodhpur, Aligarh (U.P.) Tel: 9837287801 (m) Res: 0571-2400328I (p)
Clinic: 0571-2705046 Email: zoyazaidi50@gmail.com

ساجدہ زیدی

زماں۔ابد تک...

میں اپنی روداد روز و شب کا
حساب لکھتی تھی
دور—— ماضی کی راہ داری میں
جانے کب سے بھٹک رہی تھی...
جو میں نے
لفظوں کے جنگلوں سے گذرتے جانا
کہ یہ تو ماضی نہیں—— مرا حال ہے
مرے ہر گذرتے لمحے کی داستاں ہے
یہی مری کم نصیبیوں کی...
مری ہنرمندیوں کی—— پیہم
حکایتِ جاوداں ہے...
ہر لمحہ امتحاں ہے...

افق کے اک گوشۂ فسردہ پہ
حرف مبہم میں یہ بھی تحریر تھا کہ
کل بھی شاید یہی زماں ہو
یہی ہو احوال زندگانی
کہ حال ماضی میں کل بھی شامل تھا
اب بھی شامل ہے۔اور روز ابد تلک
یوں ہی شامل رہے گا۔یوں ہی
ہماری آوارہ گردیوں میں
ہماری بے تابیوں میں۔ناکام حسرتوں میں
ہماری صحرانوردیوں میں
ہماری شب زندہ داریوں میں
زماں کا یہ سلسلہ۔یہ دریائے روز و شب
جاوداں رہے گا...

زماں کی اس بیکراں حقیقت میں ہم بھی یوں ہی
رواں رہیں گے
زماں کے دریا میں ہم بہیں گے
(نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن)
ہر ایک لمحہ ہمارا روز حساب ہوگا...
زماں ہمارے وجود میں بہتے بہتے اک دن
ہمارے مرقد میں جا رکے گا...
ہمارا سارا افسانہ یہ روز و شب
یہ سب کاروانِ رنج و تعب...
اسی دن کی داستاں ہے
زماں۔اب تک رواں دواں ہے

شاعر کا غم

یہ میرا غم...
گذرتے موسموں کے غم کا نغمہ ہے
کہ بینائے محبت کے شکستہ تار کے سرگم کا نغمہ ہے

یہ کیسی دوریٔ منزل ہے
کیسی نارسائی، کیسی تنہائی ہے جو
ہر خود نگر لمحے میں پنہاں ہے
یہ غم کیا ہے؟
یہ دل کیا ہے؟
یہ رنج مستقل کیا ہے؟

یہ غم ہر رائیگاں لمحے کا حاصل ہے
کہ ہفت آفاق کی رفعت کا حامل ہے
کہ ان لمحوں کی زنجیر گراں ہے جن میں
ہم نے اپنی ہستی کو پرویا ہے...؟
یہ دل کی حسرتوں کا راز ہے
یا غیب کی آواز ہے
یا آرزومندی کا مرزاں ساز ہے
وہ آرزو...
جو درد کے ساگر میں
اک بے بادباں کشتی ہے—— اور
مرزاں و حیراں ہے...

یہ غم...شاعر کا غم ہے/ زندگی اس میں سمٹ آتی
ہے/ ہفت آفاق سے آواز آتی ہے/ یہ غم اس کارزار
زیست میں
شاید۔جہادِ زندگی کا حرف اول ہے/ تمہاری
جستجوؤں کے سفر کی ایک مشعل ہے
تمنا کی حکایاتِ نہاں کا
رمز آخر ہے...

مکافات

وحشت تنہائی میں — اک اجنبی آواز کی گونج
اور پھر — ہر طرف خار تھے
ہر آبلہ پائی کی پذیرائی تھی

وقت کے دشت جنوں ساماں میں...
ایک ذرہ کہ ہے عالم پہ محیط
اس کو پانا مرا مقسوم نہیں
وہ ہو معدوم — تو پھر زیست کا مفہوم نہیں
کون سا نجد ہے
اس زخم نظر سے آگے
یہ بھی معلوم نہیں

میں جو آئینۂ ہستی تھی
کوئی چشم طلب گار تھا جب
اب — طلسمات تغیر میں اسیر
گم شدہ قطرۂ بے مایہ ہوں
جو صدف میں بھی نہیں
اور کسی آنکھ کا آنسو بھی نہیں
کون پلکوں پہ سجائے گا اسے
کون دیکھے گا اس آئینے میں اپنے خد و خال؟

زندگی ایک تلاشِ بیکار
ایک، سناٹے میں ڈھلتا ہوا لاحاصل درد
موت ہر لحظۂ ہستی کے تعاقب میں رواں

میں ہوں، یا تم ہو
اسی حلقۂ گرداب میں ہیں
اس کے زندانی بھی ہیں
اس کے تماشائی بھی...

اسی گرداب کے محور میں — بس اک شعلہ جلائے رکھنا
اپنی تقدیر ہے...
یا اپنی مکافات ہے — معلوم نہیں

قرب و دوری

بس اک نام، اک حرف ہے، جس کی خاطر
یہ سانسوں کا زنداں
یہ لمحوں کا محبس
مہ و سال کی یہ بے جان گردش
گوارا ہیں مجھ کو

اچٹتی نگاہوں کے انمول موتی
دکھوں کے سمندر سے پائے ہیں میں نے
گریزاں توسط میں بیتے ہوئے
چند لمحوں کی پونجی کو لے کر
یہ کانٹوں بھرے کوس در کوس
تنہا بتائے ہیں میں نے

یہ پیمانِ تنہائی...
روحوں کی بندش ہے
جسموں کا ناطہ ہے
ذہنوں کا سنجوگ ہے

یہ کہنے سے حاصل ہی کیا ہے
کہ ہم اور تم دو کنارے ہیں — دریائے ایام کے
جو اپنی بانہوں میں
اک پاٹ چوڑا سمیٹے ہوئے منتظر ہیں
کہ یہ وقت کا تند دریا
یہ آبِ رواں کب تھمے گا

دائرے

تمہاری آواز کی موج نے، جانِ من
ہزاروں سوالات کے دائرے
ذہن کی سطح پر
تند گرداب کی طرح پھیلا دیے...

کیا یہ سچ ہے
کہ ہر اتصال تمنا
تصادم، تلاطم کا اک اجنبی سلسلہ ہے؟
یہ افکار کا پا پیادہ سفر
یہ دل اور اجسام کا شعلہ اندام رشتہ
روح کی تشنگی کا پیام مسلسل — یہ صحرا
یہ اپنی حدوں سے گزرتا ہوا
ممکنات تخیل کا دریا
یہ شام و سحر کے فرومایہ معمول کو
خار و خس کی طرح
بہاتی مٹاتی ہوئی جوئے غم
یہ حیراں نگاہوں کا وصل
اور کہیں دور — اپنے وجود و عدم کا
کوئی راز پانے کا پیہم ستم
یہ تخلیق کا کرب — یہ تند چشمہ

یہ سب...
اور سب حرف معنی کی قیدوں سے آزاد رشتے
خود اپنی اسی آتش میں جل جائیں گے؟
کیا یہ زنجیر جسم و دل و جاں پگھل جائے گی؟
کچھ کہو! — جانِ جاں
کیا یہی حد امکاں کی داستاں ہے؟
کیا یہی — گم شدہ معنویت کا پہلا نشاں ہے؟

خراجِ عقیدت

ساجد رشید: ایک حقیقت نگار

اسیم کاویانی

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

جس طرح آگ کو آگ سے نہیں بجھایا جا سکتا، اور آکٹوپس کے بطن سے آکٹوپس ہی پیدا ہوتا ہے اُسی طرح تشدد پسندی سے تشدد کو ختم نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس کے لیے ضرورت اس ذہنیت کو بدلنے کی ہے جو تشدد پسندی کو جنم دیتی ہے۔ اسی طرح اکثریتی فرقہ پرستی کے جواب میں اقلیتی فرقہ پرستی کو بڑھاوا دینے کا اردو صحافت کا غیر عاقلانہ طرزِ عمل اور ہمارے رہنماؤں کی ناعاقبت اندیشانہ روش فکر قوم کو ہلاکت اور بربادی کی ڈگر پر دھکیلنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ ہندستانی جمہوریت کی کج رویوں، ہمارے لیڈران قوم کی غلط کاریوں، دھرم کے ٹھیکے داروں کی ناانصافیوں اور حکومت و امارات کے مسند نشینوں کی رعونتوں کی شکار صرف اُمتِ مُسلمہ ہی نہیں ہے کہ جس کے چہرے کے خدوخال ہر اردو اخبار کے صفحوں پر کھنچے نظر آتے ہیں۔ جس طرح یہ مظلوم اور فریادی چہرہ ملیانہ، بھیونڈی اور گجرات کے فسادات کے شکار مسلمان کا ہو سکتا ہے، اسی طرح یہ چہرہ ماؤ وادیوں اور میزو باغیوں کے ہاتھوں ہلاک شدگان کا بھی ہو سکتا ہے۔ اونچی ذات والوں کے ظلم و ستم جھیلتے دلتوں اور اچھوتوں کا بھی ہو سکتا ہے۔ گلوبلائزیشن اور انڈسٹریلائزیشن کے استحصال زدہ مزدوروں اور کاشت کاروں کا بھی ہو سکتا ہے۔ فسطائی جماعتوں اور علاقائی پارٹیوں کی عصبیت کی مار جھیلتے بہاریوں اور اتر بھارتیوں کا بھی ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک ایسا معاشرہ چاہتا تھا جہاں ہر مظلوم اور فریادی کو انصاف ملے اور ہر ظالم و جابر کیفرِ کردار کو پہنچے۔ وہ ظالم اور مظلوم کو 'ظالم' اور 'مظلوم' کی حیثیت سے ہٹ کر ہندو اور مسلمان کی نظر سے دیکھنے کے خلاف تھا۔ وہ انھیں رنگ، نسل اور علاقائی نسبتوں سے منسوب کرنے کے بھی خلاف تھا، وہ ساجد رشید تھا۔

وہ ایک صحافی تھا، ایک افسانہ نگار تھا، ایک ادبی رسالے کا مدیر تھا، جب کہ نہ تو ہماری زبان میں صحافیوں کی کمی ہے، نہ ہی افسانہ نگاروں کی اور نہ ہی اردو رسالوں کی، پھر ساجد رشید کی کیا اہمیت ہے کہ ہم اسے یاد رکھیں!

ساجد کی اہمیت یہ ہے کہ پچھلی تین دہائیوں میں اُبھر کر آئے ہوئے اہم اردو صحافیوں کی مختصر سی مختصر فہرست میں بھی ساجد کا نام نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اکثر امور میں اس کی آگہی و بے باکی کا تو اس کے ہم عصروں میں کوئی مثیل بھی نہ تھا۔ اس مدت میں اردو ادب کے افق پر طلوع ہونے والے سیکڑوں افسانہ نگاروں میں سے اگر ہم درجن بھر ممتاز افسانہ نگاروں کے نام چُنیں تو یہ فہرست ساجد رشید کے نام کے بنا نامکمل رہے گی۔ اس کے افسانوں میں ہمارے آس پاس کی زندگی کا دھڑکتا دل اور ہمارے زمانے کے نشیب و فراز اور پست و بلند کا آئینہ دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کا رسالہ 'نیا ورق' عصری جرائد میں بالکل الگ پہچان کا حامل تھا، جس میں ساجد نے ہماری زندگی پر اثر انداز ہونے والے سیاسی، سماجی اور مذہبی مسائل پر فکر انگیز اور چشم کشا بحثیں چھیڑیں تو دوسری طرف چرکین کی ہرازیات اور امیر حمزہ و عمرو عیار کی صاحبقرانی اور عیاری کی داستانوں سے بھرے اور ماضی کی پناہ گاہوں میں منہ چھپانے والے ادبی جریدوں کو یہ پیغام بھی دیا کہ در حقیقت زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کیا ہوتا ہے۔

ساجد کو شکایت تھی کہ اردو ادب میں ہماری زوال پذیر تہذیب کی ملمع سازی یا پھر پرتصنع شہری زندگی کی دل فریب ترجمانی کیوں زیادہ نظر آتی ہے؟ جب کہ اصل ہندستان دیہات میں بستا ہے۔ شہروں میں اس کی حقیقی صورت اپنی سمائی سے زیادہ آبادی کو سموئی ہوئی بستیوں، تنگ و تاریک گلیوں اور گندی چالیوں میں رونما ہے، جن سے ہمارے ادیبوں نے کم ہی سروکار رکھا ہے۔ ہمارے لکھنے والوں کی اکثریت خواص پسند اور جاگیردارانہ روایتوں کی ذہنی غلام رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے نقشِ قلم پر چلتے ہوئے (بمشکل پانچ فیصدی) فیوڈل کلاس کے

> اگر و بھو تی کسی ایسی خاتو ن قلم کا ر کے غیر مرد کے ساتھ ہم بستر ہونے کے اظہار کو اس کا' چھنال پن ' ما نتے ہیں تو کسی راجند ر یا دو یا کسی کملیشور کے اپنی سوانحی کتابو ں میں دوسری عورتوں کے ساتھ ہم بستر ہو نے والے قصوں پر وہ انہیں کیا کہیں گے ؟ جوش ملیح آبادی ،ندافاضلی اور ساقی فاروقی دوسری عورتوں حتاً کہ دوسروں کی عورتوں سے بھی اپنے جنسی رشتوں کو اپنی خود نو شتوں میں بڑے فخر سے بیا ن کرچکے ہیں...
>
> بدکار مرد کو کیا کہیں گے؟ از ساجد رشید نیا ورق جون تا نومبر 2010

تہذیبی زوال کے ماتم سے ہنوز فارغ نہیں ہو سکی ہے۔

ساجد نے اپنی افسانہ نگاری کا آغاز کیا تو ترقی پسند تحریک کی شکست و ریخت کا دور شروع ہو چکا تھا۔ اس نے ترقی پسندی کے سرداروں کو ایمرجنسی کے آمروں کی جی حضوری کرتے دیکھا تو دوسری طرف محرومی و یاسیت کے شکار اور اپنی ہی ذات یا داخلیت میں گرفتار ادیبوں کے گروہ کو جدیدیت کے بیابان میں بھٹکتا ہوا پایا۔ اُن کی اپنے ہی اصولوں کی پامالی اور ان کی بے مقصدیت و بے اصولیوں میں سے ساجد خود کو کسی کے سپرد نہ کر سکا۔

منٹو، بیدی، عصمت اور پریم چند کے شیدائی ساجد نے اپنے آس پاس کی سانسیں لیتی زندگیوں کے رنج و غم اور محسوسات، روایات و رسوم کے کھوکھلے پن سے پیدا شدہ سماجی بدنمائیوں اور رنگ بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ساتھ انسانی تعلقات کے بدلتے انداز و اطوار اور پرانی قدروں کی شکستگی، صنعتی کلچر کے دباؤ کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ اس کے ساتھ ساتھ قومی، بین الاقوامی سیاست کے بدلتے نشیب و فراز، انڈر ورلڈ کے کرتوت، روایت پرستی اور دھرم کے ڈھکوسلے اس کی صحافتی تحریروں کے نمایاں موضوع رہا کرتے تھے۔ اس کی زود نگاری کی وجہ سے ہم اس کی صحافتی تحریروں اور افسانوں کے اسلوب میں کوئی نمایاں فرق نہیں ڈھونڈ پاتے۔ اس نے کہیں کچھ پایا تو کہیں کچھ کھویا۔ یعنی اس کے مشہور اخباری کالم 'زندگی نامہ' جریدے کے کالم 'دست خط' اور دیگر اخباری شذرات میں اس کا ادب آشنا طنزیہ اسلوب اس کے معاصر صحافیوں میں جہاں اُسے ایک امتیازی مقام کا حامل بناتا ہے، وہیں اس بات کا احساس بھی ہوتا ہے کہ اس کے افسانوں میں عصر حاضر کی کھردری حقیقتوں کے بے رحم اور کہیں کہیں صحافیانہ اظہار نے ان کی فسوں کاری میں کچھ کمی سی رکھ دی ہے۔

ساجد کے انداز فکر کو سمجھنے کے لیے اس کے جریدے 'نیا ورق' کے اداریوں پر نظر ڈالنا ضروری ہے:

کئی برس پہلے جب ملیالم ادیبہ (ثریا) کملا داس نے اپنی سوانح عمری 'My Story' میں اپنے ایک گمنام دوست اور اپنے شوہر کے ساتھ ہوئے اپنے جنسی تجربات کو بیان کیا تھا اور اسی طرح تسلیمہ نسرین نے 'دوی کھنڈیتا' (دولخت) میں غیر مردوں کے ساتھ اپنے جنسی تعلقات کا حال لکھا تھا تو ان کی مخالفت میں کافی ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ Feminism کی اس رو میں دوسری خواتین قلم کاروں نے بھی اپنے جنسی تجربوں کو بیان کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس پر ہندی کے معروف ناول نگار وبھوتی نرائن رائے کی یہ رائے ادبی حلقوں میں نزاع کا موضوع بن گئی تھی کہ "خواتین قلم کاروں میں ہوڑ لگی ہوئی ہے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ان سے بڑی چھنال کوئی نہیں ہے۔" اس پر ساجد رشید نے جو تبصرہ کیا تھا وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے:

"اگر وبھوتی کسی ایسی خاتون قلم کار کے غیر مرد کے ساتھ ہم بستر ہونے کے اظہار کو اس کا 'چھنال پن' مانتے ہیں تو کسی راجندر یادو یا کسی کملیشور کے اپنی سوانحی کتابوں میں دوسری عورتوں کے ساتھ ہم بستر ہونے والے قصوں پر وہ انھیں کیا کہیں گے؟ جوش ملیح آبادی، ندا فاضلی اور ساقی فاروقی دوسری عورتوں حتیٰ کہ دوسروں کی عورتوں سے بھی اپنے جنسی رشتوں کو اپنی خودنوشتوں میں بڑے فخر سے بیان کر چکے ہیں۔ زبیر رضوی واحد ایسے شاعر ہیں، جنھوں نے اپنے خوبصورت شباب پر جوش اور فراق جیسے مردوں کے ملتفت ہونے کا اظہار بڑی بے باکی سے کیا ہے، وگرنہ مرد قلم کار تو غیر عورتوں کے ساتھ اپنے جنسی رشتوں کو چٹخارے لے لے کر بیان کرنے ہی میں اپنی قوت مردی کا اعجاز تصور کرتے ہیں... قابل غور امر ہے کہ بے وفا عورت کے لیے ایک گالی چھنال موجود ہے، لیکن جو شخص مجرد نہیں ہے اور اپنی بیوی کے ہوتے ہوئے کسی غیر عورت کے ساتھ جنسی رشتہ قائم کرتا ہے اس کے لیے کیا چھنال جیسی کوئی گالی ہماری لغات میں موجود ہے؟ ہم بھی جانتے ہیں کہ مرد کے لیے بے وفا لفظ تک کا بھی استعمال نہیں ہوتا ہے... مرد کی بے وفائی کو معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا بلکہ اسے رشک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ دراصل مذہب سے لے کر ادب تک مرد ہی تفہیم و تفسیر کا کام کرتا رہا ہے۔ خدا مرد، تمام پیغمبر مرد، تمام صوفیا اور سنت مرد، تمام مفسرین مرد!" بدکار مرد کو کیا کہیں گے؟ نیا ورق جون تا نومبر 2010)

جب گجرات میں ایم ایف حسین کی پینٹنگس پر فحش ہونے کا الزام لگا کر

ان کے آرٹ اسٹوڈیو کو توڑ پھوڑ کر بند کر دیا گیا اور بعد ازاں بڑودہ کی سیاجی راؤ یونی ورسٹی کے مصوری کے ایک طالب علم کو بھی فحاشی کے جرم میں جیل بھیج دیا گیا تو ساجد نے لکھا تھا:

''فنون لطیفہ کو یرغمال بنانے کی کوشش کرنے والے اتفاق سے ہمارے ملک میں ہندوتووادی ہیں... سوال صرف سنگھ پریوار کی ذیلی تنظیموں کا نہیں (جو) ہندستان میں اکثریتی فرقے سے تعلق رکھتی ہیں، اس لیے اپنی دہشت گردی میں موثر ہیں۔ مصر اور ترکی میں ان کے نام اور شکلیں بدل جاتی ہیں، لیکن ان کی منشا اور ان کا طریقہ کار یکساں ہوتا ہے۔ مصر میں عربی کے سب سے مقبول اور بزرگ ادیب نجیب محفوظ کو سڑک پر ذبح کرنے کی ناکام کوشش کرنے والے اور ترکی میں اورحان پامک کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دینے والے ایک ہی ذہنیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس لیے حسین کے سلسلے میں سنگھ پریوار کی مذمت تو ہمارے لیے آسان ہوگی، لیکن نجیب محفوظ اور اورحان پامک پر حملہ آور ہونے والوں کے تعلق سے ہمارا موقف کیا ہوگا؟ اس سوال کا جواب اظہار رائے کی آزادی کے تئیں ہماری ایمان داری کا سخت امتحان ثابت ہوگا۔ اگر اس امتحان سے گزرنے کے لیے ہم تیار نہیں ہیں تو سنگھ پریوار کو اپنی مذہبی دل آزاری کے لیے ترشول اٹھانے کا پورا حق ہے۔''

ص:10، سہ ماہی نیا ورق، ممبئی، جولائی تا ستمبر 2007

ساجد کے افسانوں کا کینوس اتنا پھیلا ہوا ہے کہ سرسری طور پر گفتگو کرنا ممکن نہیں۔ یہاں صرف ایک افسانے 'بادشاہ بیگم اور غلام' کا ذکر کروں گا۔ مہانگر کے انڈر ورلڈ سے تعلق رکھنے والی اس کہانی میں بادشاہ کے استعارے میں ایک علاقے کے خطرناک ڈان کا ذکر ہے۔ حیدر آباد سے کام کی تلاش میں آئی ایک غریب عورت کے حسن و جوانی نے اسے باشاہ کی بیگم بنا دیا، اور غلام، بادشاہ کا دست راست ہے۔ کہانی یوں شروع ہوتی ہے کہ بادشاہ کے قتل کے مجرم وٹھل اور جبار جیل سے ضمانت پر رہا ہو جاتے ہیں۔ انھیں خوف ہے کہ غلام اور بادشاہ کے پالتو کتے کے ذریعے ان کے خلاف گواہی اور شناخت اُن کے لیے مصیبت کھڑی کر دے گی، اس لیے وہ باشاہ کے مسکن پر پہنچتے ہیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ وہ غلام اب بادشاہ بنا ہوا ہے اور بیگم اس کی معشوقہ!

غلام کے ہاتھ میں ڈابر ہاؤنڈ کا پٹا تھا جو ان دونوں کو دیکھ کر بھونکے جا رہا تھا۔ غلام وٹھل کو دیکھ کر خطرہ بھانپتے ہوئے گھگیا کر کہتا ہے کہ وہ جرم کی بادشاہت ان کو سونپ دے گا اور اُن کی خدمت کرے گا۔ ساجد نے اس کہانی کا انجام یوں پیش کیا ہے:

''غلام اور بیگم کی آنکھیں دو پستولوں کو اپنے اوپر تنا ہوا دیکھ کر موت کے خوف سے ابل پڑیں۔ جبار اور وٹھل پر حملہ آور ہونے کے لیے کتا آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ غلام کے لیے اسے قابو میں رکھنا مشکل ہو رہا تھا کہ وٹھل کے پستول سے یکے بعد دیگرے دو گولیاں نکلیں اور زوردار جھٹکے سے غلام کے ہاتھ سے کتے کا پٹا چھوٹ گیا اور وہ فرش پر اپنے دونوں گھٹنوں پر جھکتا چلا گیا۔ اس نے اپنے گھٹنے پر گاڑھے گرم خون کی چپچپاہٹ محسوس کی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا کتا فرش پر خون میں لت پت بے حس و حرکت پڑا تھا اور اس کے سینے اور گردن پر دو سوختہ سوراخوں میں سے خون بہ رہا تھا۔ اسے خود کو یہ یقین دلانے میں کچھ لمحے ضرور لگ گئے تھے کہ گولی اسے نہیں لگی اور وہ اپنے نہیں کتے کے خون میں گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا ہے اور اس کی دونوں ہتھیلیاں غیر ارادی طور پر سینے سے لگ کر رحم طلب انداز میں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ فرش پر مردہ کتے کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور زبان جبڑے سے باہر نکل آئی تھی'' (افسانہ: بادشاہ، بیگم اور غلام،)

جب وٹھل اور جبار گلی میں سراسیمہ و ہراساں کھڑے لوگوں کے درمیان سے نکل کر اپنی وین میں آکر بیٹھتے ہیں تو پچھلی سیٹ پر بیگم بھی آکر بیٹھ جاتی ہے ''بیگم پچھلی سیٹ پر بیٹھی انکھیوں سے وٹھل کو دیکھتے ہوئے ساڑی کو اپنے سینے کی گولائیوں پر درست کر رہی تھی۔ جبار نے مسکرا کر وٹھل کو دیکھا اور وین اسٹارٹ کر دی۔''

افسانے کے اس انجام کے پیچھے مہانگر کے ان مجرموں کی یہ منطق تھی کہ اس دنیا میں انسان ہی وہ جاندار ہے جس کی وفاداری کو طاقت اور لالچ کے ذریعے جھکایا اور خریدا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں (بیگم اور غلام) بھی ان کے اقتدار کے آگے سرتابی نہیں کر پائیں گے، لیکن کتا چوں کہ جانور ہے، اس کی وفاداری نہیں بدل سکتی اس لیے اسے مارنا ان کے لیے ضروری ہو گیا۔ بیگم کا وٹھل کے ساتھ چلے جانا بتاتا ہے کہ زندگی کے جبر کے آگے رشتوں کی حیثیت کتنی کمزور ہے۔

ساجد نے کہیں لکھا ہے کہ ''یہ ہماری فکر کا دوغلا پن ہے کہ ہماری فرقہ واریت تو ہماری 'مذہبیت' ہے، جب کہ دوسروں کی مذہبیت ان کی 'فرقہ پرستی'۔ اس نے تسلیمہ نسرین اور سلمان رشدی کو دنیا بھر میں 'مظلوم انٹلکچولس' سمجھ کر شہرت اور دولت سے نوازے جانے کا سبب ہمارے پُرجوش رہنماؤں کے قتل کے فتوؤں اور ان کے برپا کیے گئے بے مہار احتجاجوں اور ہنگاموں کو قرار دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ قلم کا جواب قلم سے دیا جانا چاہئے نہ کہ کسی کا سر قلم کر کے۔ اپنے ایسے ہی خیالات کی بنا پر اسے ایک 'انتہا پسند سیکولرسٹ' سمجھا جانے لگا۔ اس کی تلخ نگاریوں کی وجہ سے اردو والوں کے ایک حلقے نے اس سے دوری بنالی تھی، جب کہ ہندی والوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

جہاں اس بات کا غم ہے کہ ساجد جلد(بعمر 56سال) بچھڑ گیا ، حتٰا کہ اس نے آج کے دور کی اوسط انسانی عمر سے بھی ایک دہا کم پا یا ، وہیں اس بات کی خوشی ہے کہ وہ صحافت،کالم نگاری،افسانہ نگاری اور ادارت کے سبھی شعبوں میں اپنا ایک خاص نقش ثبت کر گیا،بھیڑ سے الگ پہچانا گیا، جرأت تحریراور حقیقت پسندی کی ایک روشن اور قابلِ تقلید مثال چھوڑ گیا ...اس کی سیاسی او رسماجی سر گرمیوں اور بطور کارٹونسٹ اور تھیٹر آرٹسٹ کے جز و وقتی مشا غل کو بھی نظر میں رکھیں تو یہ احساس اور شدید ہو جاتا ہے کہ وہ کتنا فعال اور عملی انسان تھا

2005 میں جب ساجد ہندی اخبار 'مہانگر' کا اڈیٹر تھا تب اس کے دفتر کے نیچے کچھ مسلم جنونیوں نے چاقوؤں سے حملہ کر کے اسے شدید زخمی کر دیا تھا اور وہ بمشکل اپنی جان بچا پایا تھا جب کہ اسی ساجد نے 1987 میں شیوسینا کے سربراہ بال ٹھاکرے کے نفرت انگیز بیانوں کے خلاف بمبئی ہائی کورٹ میں اپنی جان کی پروا کیے بنا گواہی دی تھی۔ اس کی گواہی (بشمول دیگر گواہان) کی وجہ سے جسٹس بھڑوچا (جو بعد میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مقرر ہوئے) کی عدالت میں رام جیٹھ ملانی جیسا وکیل اپنے موکل بال ٹھاکرے کو چھ برس تک کے لیے حق رائے دہی سے محروم کر دیے جانے کی سزا سے نہیں بچا سکا تھا، اور شیوسینا کے امیدوار کا چناؤ بھی رد کر دیا گیا تھا۔ ان دنوں ساجد رشید کو عدالت کی طرف سے سکیورٹی فراہم کرنے کی پیش کش کی گئی تھی تو ساجد نے جواب دیا تھا ''جب اندرا گاندھی کو ان کے محافظوں ہی نے گولی ماردی تھی تب کسی بھی سکیوریٹی کی کیا گارنٹی رہ جاتی ہے؟''

اردو اور ہندی کے اخبارات و جرائد میں کالم نویسی، افسانہ نگاری اور ترجمہ کرنے کے علاوہ اس نے اردو کے چند جرائد جاری کیے اور ایک اخبار بھی نکالا۔ کچھ ہندی اور اردو اخباروں سے وابستہ رہا۔ دونوں زبانوں کے کئی ایوارڈ حاصل کیے۔ ساجد رشید کی اب تک شائع ہو چکی کتابیں یہ ہیں:

رگوں میں جمی برف (ناول) ریت گھڑی (افسانے) نخلستان میں کھلنے والی کھڑکی (افسانے) سونے کے دانت (ہندی کہانیاں) ایک چھوٹا سا جہنم (افسانے) زندگی نامہ (اخباری کالم کا انتخاب)

میں صرف چار سال قبل اس سے پہلی بار ملا تھا، اگرچہ برسوں سے اس کا کالم 'زندگی نامہ' جریدہ 'نیا ورق' اور اس کے افسانے پڑھتا رہا تھا۔ میری کم نویسی کے باوصف ایک زمانے میں ماہ نامہ 'گگن' کے اڈیٹر شمس کنول سے میری وابستگی کی بنا پر وہ میرے نام سے آشنا نکلا۔ پہلی ہی ملاقات میں یوں لگا کہ ہم برسوں کے ساتھی ہوں۔ نیاز اور 'نگار' کے میرے مطالعے سے متاثر ہو کر اس نے مجھ سے 'نیا ورق' کے لیے 'نیاز کے معترضین' نامی مضمون لکھوایا۔ میرے مرتبہ 'انتخاب گگن' کو دیکھ کر اتنا خوش ہوا کہ 'صحافت' (ممبئی) کے سنڈے ایڈیشن کا ضمیمہ شائع کر دیا، جس کا وہ ایسوسی ایٹ اڈیٹر تھا۔ وہ اپنے قریبی دوستوں سے بھی ان کی کسی تحریر کا تقاضا نہ کرتا تھا کہ ناپسندیدگی کی صورت میں وہ اس تحریر کو مسترد کرنے کا حق کھو دے گا۔ میں نے مسترد کیے جانے کے خوف سے بے نیاز ہو کر کئی مضمون بھیجے اور ساجد نے انھیں اہتمام کے ساتھ 'صحافت' میں شائع کیا اور اکثر تحریر کی اشاعت کے بعد لوگوں کا موافقانہ ومخالفانہ ردعمل بھی بتاتا رہا۔ اسے شکایت تھی کہ بنیاد پرست عناصر اپنی مخالفت کے اظہار میں جتنے پُر جوش ہیں، ہمارے عقلیت پسند ساتھی اپنی زبانی ستائش کو تحریری شکل دینے میں اتنے ہی سرد مہر اور سست قلم ہیں۔

جہاں اس بات کا غم ہے کہ ساجد جلد (بعمر 56 سال) بچھڑ گیا، حتیٰ کہ اس نے آج کے دور کی اوسط انسانی عمر سے بھی ایک دہا کم پایا، وہیں اس بات کی خوشی ہے کہ وہ صحافت، کالم نگاری، افسانہ نگاری اور ادارت کے سبھی شعبوں میں اپنا ایک خاص نقش ثبت کر گیا۔ بھیڑ سے الگ پہچانا گیا۔ اپنے باغیانہ تیور، جرأتِ تحریر اور حقیقت پسندی کی ایک روشن اور قابلِ تقلید مثال چھوڑ گیا۔ ایک زمانے میں اس کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں اور بطور کارٹونسٹ اور تھیٹر آرٹسٹ کے جز وقتی مشاغل کو بھی نظر میں رکھیں تو یہ احساس اور شدید ہو جاتا ہے کہ وہ کتنا فعال اور عملی انسان تھا۔ 11 مارچ 1955 میں ضلع گونڈا، یو پی (اب 'بلرام پور') کے ایک کاشت کار خاندان میں آنکھیں کھولنے والے ساجد کی کم سنی میں بمبئی میں نمود، والدین کی جد جہد بھری زندگی کا مشاہدہ، اوسط تعلیم اور ساری عمر تقلید پسند اور ماضی پرست غریب مسلمانوں کے محلوں میں دانتوں کے بیچ زبان کی طرح گزر بسر کرنے کا منظر نامہ اگر ہم اپنے خیال سے محو نہ کریں اور اس کے باوصف ساجد کی عقلیت پسندی کی کج کلہی اور اپنی تحریر کی طرفگی کو برقرار رکھنے کے ہنر کو بھی ملحوظ رکھیں تو قطرے پر گہر ہونے تک جو گزرتی ہے، غالب کے ان لفظوں کی معنویت بھی واضح ہو جائے گی۔ اردن گاولی اور اس کے گرگوں کی ڈگڑی

چال کے گرد و نواح میں اپنی نوجوانی کا بڑا حصہ گزارنے والا اور داؤد ابراہیم کا اسکولی ساتھی ساجد اگر ایک اوسط ذہن کا عام نوجوان ہوتا تو بقول وجیہ الدین (ٹائمز آف انڈیا، ممبئی) اس میں جرم کی دنیا سے جڑ جانے کی تمام اہلیت موجود تھی، لیکن جیسا کہ اس نے اسی اخبار کے نامہ نگار کو اپنے ایک انٹرویو میں بتایا تھا: ''لٹریچر نے اسے بچالیا۔'' آج جب کہ اس کی زندگی کی فردِ عمل مکمل ہو چکی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ بنیاد پرستی، روایت و تقلید اور تعصب و تنگ نظری کے تند و تیز طوفانوں میں گھرے ہماری صحافت و ادب کے سفینے کو اس کے سیکولرازم اور سوشل ازم میں اٹوٹ وشواس رکھنے والے قلم نے کس طرح سنبھالے رکھا، کس طرح بچائے رکھا۔

ابھی ساجد کی قبر کی مٹی بھی خشک نہیں ہونے پائی تھی کہ کسی نے اس کے نامۂ اعمال کا محاسبہ شروع کر دیا تو کہیں سے اس کے عقائد پر بحث شروع ہو گئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے صحافیوں کی دو قسموں کا ذکر کیا ہے۔ ایک تو وہ کہ جو مذاقِ عوام کی پیروی کریں، اور ہمیشہ وہی کچھ لکھیں جنھیں عوام پڑھنا پسند کرتے ہیں، اور دوسرے وہ صحافی جو اسی سچی بات کو لکھیں جو وہ لوگوں کے لیے بہتر اور مفید سمجھتے ہیں اور لوگوں کی خوشی یا ناخوشی کی پروا نہ کریں۔ جس طرح ایک طبیب مریض کو دوائے تلخ تجویز کرتے ہوئے مریض کی پسند یا ناپسند کو ملحوظ نہیں رکھتا، ایسے ہی صحافیوں کو آزاد نے صحافت کی اعلا قدروں کا حامل قرار دیا تھا۔ ساجد بھی ہمیشہ وہی لکھتا رہا جو وہ اپنے قارئین کے لیے بہتر اور صحیح سمجھتا رہا اور اس سلسلے میں اس کے قلم نے کبھی کسی خوف یا لالچ سے سمجھوتا نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے دوست کم اور دشمن زیادہ بنائے۔ مولوی عبدالحق نے کبھی کہا تھا کہ ''دوستو! دنیا میں کہیں نہ خالص نیکی پائی جاتی ہے اور نہ خالص بدی، اس طرح انسان بے عیب ہوا ہے نہ ہوگا۔'' ساجد بھی دوسرے انسانوں کی طرح خیر و شر کا پتلا تھا۔ اس کی زندگی میں بھی کمزوریاں رہی ہیں، لیکن کچھ لوگوں کو اس کے مواخذے کی اتنی جلدی کیوں ہے! سنگ باری کے لیے ہر کسی کا دل مچلتا ہے، لیکن پہلا پتھر وہ اٹھائے جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ جب کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے وفورِ عقیدت سے اپنے کتنے ہی مشاہیرِ ادب کے گرد پرستش کا ایک ایسا زریں ہالا بُن رکھا ہے کہ جہاں جاتے ہوئے فرشتوں کے پر جلتے ہیں۔

میری نظر میں کسی کی ذاتی زندگی اتنی اہمیت نہیں رکھتی اور اسے اپنے زمانے میں ملا عوام کا ردّ و قبول بھی اس کے فن کو سمجھنے کا ایک کمزور پیمانہ ہے۔ کسی فرد کی زندگی کے حالات اور اس کے متعلقات سے ہم صرف اس شخص کے مادی وجود سے آشنائی کا دعوا کر سکتے ہیں جب کہ اس کی شخصیت کی حقیقی نمائندگی اس کے فن و ہنر سے ہوتی ہے، جو کہ اس کے ذہن و فکر کا آئینہ ہوتا ہے۔ اور اس آئینہ خانے میں اس کے حاصل ہی نہیں لاحاصل کا، اس کے یقین ہی نہیں گمان کا، اس کی بصارتوں ہی نہیں بصیرتوں کا، اس کے ہوش ہی نہیں جنون کا اور اس کی حقیقتوں ہی کا نہیں اس کے خوابوں کا چہرہ بھی دیکھا جا سکتا ہے، اور وہی اصل قدر و اہمیت رکھتا ہے۔ یقیناً ساجد کے رشحاتِ قلم بھی نقادانِ فن کی تنقید و تجزیے کا موضوع بنیں گے اور وقت کا مورخ اس کی قلمی کارگزاریوں کے پائیدار یا ناپائیدار ہونے کا فیصلہ آپ کرے گا۔

اس کا کردار اپنی زندگی ہی میں بحث و تنقید کا نشانہ بن گیا تھا۔ کسی نے اسے دین سے دُور سمجھا تو کسی نے خدا بیزار، کچھ لوگوں نے اس کے ماضی کی کسی تحریر سے اہانتِ رسول کا شاخسانہ بھی کھڑا کیا۔ اربابِ اردو ایسے عناصر سے یہ سوال پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ انھیں اس بات کا فیصلہ کرنے کا کیا اختیار ہے کہ ساجد نے اہانتِ رسول کا ارتکاب کیا تھا؟ وہ اپنے کس لکھے پر بخشا جائے گا اور کس لکھے پر اس کی مغفرت نہیں ہوگی؟ وہ خدا سے قریب تھا یا خدا سے دُور تھا؟ وہ حضرات کیا چیز ہیں، خداتعالا نے تو حضرت موسا کو ٹوک دیا تھا کہ اے موسا! میں نے تجھے دنیا میں اس لیے بھیجا تھا کہ تو مجھے میرے بندوں سے قریب کرے نہ کہ مجھے ان سے دور کردے! تو نے ایک چرواہے سے میری خدائی کی ایسی تشریح و توضیح کیوں کی کہ وہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا۔ وہ غریب اپنی کنگھی سے میرے بالوں کی جوئیں نکالنا چاہتا تھا۔ وہ میرے ہاتھ پاؤں دابنا چاہتا تھا اور مجھے اپنی روٹی اور پنیر کھلانا چاہتا تھا، تب وہ اپنی نادانی ہی میں سہی، مجھے اپنے سے کتنا قریب محسوس کر رہا تھا، لیکن تم نے ان باتوں کو اہانتِ خدا سے تعبیر کیا۔ اس کی فہم کی تحقیر کی اور اپنی دانائی سے میری عظمت اور بزرگی کو اس طرح بیان کیا کہ اس چرواہے نے چشم زدن میں اپنے اور میرے درمیان ناقابلِ عبور فاصلہ حائل پایا، اس کا دل ٹوٹ گیا اور وہ مجھ سے جدا ہو گیا۔

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی

مولانا روم

وہ مذہبی عناصر جن کی دانائی نے عقیدوں، رسموں اور روایتوں کے ہالے میں بجے سجائے خدا کو اپنا مقصود و معبود بنایا ہوا ہے، اگر ساجد کا تصورِ مذہب انھیں راس نہیں آتا تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔

آں کس کہ شد صاحب نظر، دینِ بزرگاں خوش نکرد

■■

عسیم کاویانی، ممبئی۔ موبائل: Mb.9322154702 ای میل آئی ڈی: aseemkavyani@gmail.com

راکھ

ساجد رشید

مہلک بیماری اور سفاک موت بھی شمع کے چہرے کی کشش کو ختم نہیں کر سکے... جمال نے فرش پر رکھی بیوی کی لاش کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ شمع کا مردہ جسم سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا، صرف چہرہ کھلا تھا۔

شمع کی گھنی سیاہ پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ یک ٹک اس کے سرخ و سفید چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ شمع نے پیالی اٹھا کر کافی کا ایک گھونٹ لیا لیکن اس کی پلکیں بدستور جھکی رہیں۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا'' وہ میز پر تھوڑا جھک گیا۔ ''میں بہت سیریسلی کہہ رہا ہوں میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

جمال نے شمع سے کل بھی یہی بات کہی تھی، لیکن شمع نے کوئی جواب دیا تھا صرف جھرجھری لے کر رہ گئی تھی۔ جمال کی اس خواہش کو سن کر وہ خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اسے شادی کے اس تصور ہی سے بخار سا ہو جاتا تھا جسے ساری دنیا کی عورتیں تحفظ سمجھتی ہیں۔ بابا کو اگر پتہ چل گیا کہ میں ایک مسلمان لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہوں تو... سوچ کر ہی وہ کانپ جاتی تھی۔

جمال سے اس کی ملاقات دو برس قبل فوٹوگرافی کے ایک ایکزیبیشن میں ہوئی تھی، جسے تین امیچر فوٹوگرافرز نے مل کر ترتیب دیا تھا۔ شمع کو ایک تصویر بے حد پسند آئی تھی جس کا عنوان تھا 'زندگی' جس میں ایک سی گل کو سمندر کی بپھری موجوں سے کچھ اوپر پرواز کرتے دکھایا گیا تھا۔

شمع نے جب ایکزیبیشن کے ناظم سے اس فوٹوگرافر کے بارے میں پوچھا تو اس نے باریک فریم کو چشمہ لگائے ایک سانولے سے نوجوان کی طرف اشارہ کیا تھا ''جمال احمد...'' اس نے ایک ڈھیلی ڈھالی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔ وہ ایک عورت سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ جمال کو ایک عمدہ تصویر پر مبارکباد دینے کا خیال ترک کر کے وہ گیلری کی سیڑھیاں اترنے لگی تب اس نے سوچا کہ یہ فنکار کی ناقدری ہوگی۔ وہ لوٹ کر ایکزیبیشن ہال میں آ گئی تھی اور اس عورت کے جانے کا انتظار کرنے لگی تھی جو اپنی سوتی ساری سلیولیس بلاؤز اور ہینڈلوم کے جھولے کی وجہ سے کوئی آرٹ کریٹک معلوم ہو رہی تھی۔ اس عورت کے چلے جانے کے بعد شمع نے جمال کے قریب جا کر اپنا تعارف کراتے ہوئے تصویر کی تعریف کی اور دوران گفتگو اس نے بتا دیا تھا کہ وہ جے جے اسکول آف آرٹس میں انسٹرکٹر ہے اور ملازمت کا یہ اس کا پہلا سال ہے۔ دوسرے روز جمال نے کالج میں جا کر شمع کو وہی تصویر تحفے میں پیش کر دی تھی۔ دونوں کی رسمی ملاقاتیں دوستی میں اور دوستی جلدی ہی محبت میں بدل گئی تھی۔

''جمال اگربتیاں کہاں ہیں؟'' جمال نے گردن گھما کر دیکھا، فوٹوگرافر منوج اس سے مخاطب تھا۔ جمال نے وال کیبنیٹ کھول کر اگربتی کا پیکٹ نکال کر منوج کو دیا۔ منوج نے اگربتیاں شیشے کے ایک گلاس میں سلگا کر شمع کے سرہانے رکھ دیں۔ دھواں دھیرے دھیرے بل کھاتا ہوا فضا میں ایسے تحلیل ہونے لگا جیسے کمرے کے بوجھل ماحول سے وہ بھی افسردہ ہو۔ منوج نے جمال کے قریب آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دکھا۔ ''کیا تم نے اپنے ڈیڈی کو خبر کر دی ہے؟''

جمال نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اور شمع کے بابا کو؟''

جمال نے سر جھکا دیا۔ شمع کے بابا کو اس نے دادر ہندو کالونی میں خود جا کر خبر دی تھی انہوں نے شمع کی موت کی خبر ایک سنگین خاموشی کے ساتھ سنی تھی اور اس کے گھر سے باہر نکلتے ہی دروازہ بند کر دیا تھا۔

''شمع اور میں شادی کرنا چاہتے تھے۔'' جمال کے اس جملے پر شمع کے بابا کا چہرہ ایک دم سے سرخ ہو گیا تھا۔ انہوں نے اپنے جنیؤ میں انگوٹھا ڈال کر

> وہ کچھ دیر تک تو خاموشی سے اپنے جوان بیٹے کے اتنے بڑے ارادے پر غور کرتی رہیں پھر کہا "اگر وہ مسلمان ہوجاتی ہے تو میرے خیال میں تمہارے ابو کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" جمال دس بارہ دنوں تک شمع سے روز ہی ملتا رہا لیکن مذہب تبدیل کرنے کی تجویز اس کے سامنے رکھنے کی ہمت وہ اپنے میں مجتمع نہیں کرپارہا تھا ایک روز جہانگیر آرٹ گیلری کے سماور ریسٹورنٹ میں جمال نے شمع سے اسنیکس کے لئے پوچھا تو اس نے یاد دلایا کہ آج اس کا منگل وار کا برت ہے وہ صرف لیمو پانی لے گی... جمال نے کافی ختم کرلی لیکن وہ اپنی منشا بیان نہ کرسکا...

اسے دوبارہ اوپر نیچے کیا اور پھر موٹے چشمے کے پیچھے سے اسے گھورتے ہوئے بولے تھے "تم جانتے ہو ہم لوگ یونیری برہمن ہیں۔ میرے پتا جی پونے میں اس عمر میں بھی جنم لگن اور مرتیو کی رسمیں کرتے ہیں اور تم ایک مانساہاری مسلمان۔" جمال اس سوال کے لئے پہلے ہی سے تیار تھا اور اس نے فوراً کہا "میں دھرم بدل لوں گا" جمال کے اس جواب نے کچن میں ماں کے ساتھ چھپ کر دونوں کی باتیں سن رہی شمع کے دل کے بوجھ کو کم کر دیا تھا۔

"کوئی بھی غیر ہندو، ہندو نہیں بن سکتا۔" بابا اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی انگلیاں جنیؤ میں تیزی سے اوپر نیچے ہونے لگیں۔

"اور اگر میں آریہ سماجی طریقے سے ہندو بن جاؤں کیا تب بھی آپ مجھے سویکار نہیں کریں گے؟"

"نہیں، کبھی نہیں" بابا نے سخت لہجے میں جواب دیا "کون کس دھرم میں پیدا ہوگا یہ ایشور کی اچھا سے ہوتا ہے انسان کی مرضی سے نہیں سمجھے۔"

"تب تو میرے مسلمان ہونے میں بھی میری مرضی کا نہیں بھگوان کی اچھا کا دخل ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔" جمال نے ٹھہر ٹھہر کر اپنی دلیل رکھی۔

"میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔" ان کا لہجہ درشت ہوگیا تھا۔

دوران گفتگو شمع کی ماں نے جمال کے لئے اپنی چھوٹی بیٹی کے ہاتھ سے جب اسٹیل کے گلاس میں پانی بھجوایا تو بابا نے بڑی ملائمت سے لڑکی سے کہا "شیشے کے گلاس میں پانی لاؤ..." جمال پانی پیے بغیر ہی اٹھ کر چلا آیا تھا۔ دوسرے روز جمال کو شمع نے بتایا کہ اس کے چلے جانے کے بعد اسے پہلی بار پتہ چلا کہ بابا مسلمانوں کو سخت ناپسند کرتے ہیں وہ کہہ رہے تھے "میری بیٹی اگر کسی مہار (چمار) کے ساتھ بھی بھاگ جائے تو مجھے اتنا دکھ نہیں ہوگا جتنا ایک ملیچھ کے ساتھ شادی کرنے سے ہوگا۔" کہتے ہوئے شمع رو پڑی تھی۔ "میں تمہیں نہیں کھونا چاہتی تھی جمی۔" ہچکیوں سے اس کے کندھے ہلنے لگے تھے۔

اسی روز جمال نے اپنی والدہ کو شمع کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ کچھ دیر تک تو خاموشی سے اپنے جوان بیٹے کے اتنے بڑے ارادے پر غور کرتی رہیں پھر کہا "اگر وہ مسلمان ہوجاتی ہے تو میرے خیال میں تمہارے ابو کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" جمال دس بارہ دنوں تک شمع سے روز ہی ملتا رہا لیکن مذہب تبدیل کرنے کی تجویز اس کے سامنے رکھنے کی ہمت وہ اپنے میں مجتمع نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک روز جہانگیر آرٹ گیلری کے سماور ریسٹورنٹ میں جمال نے شمع سے اسنیکس کے لئے پوچھا تو اس نے یاد دلایا کہ آج اس کا منگل وار کا برت ہے وہ صرف لیمو پانی لے گی... جمال نے کافی ختم کرلی لیکن وہ اپنی منشا بیان نہ کرسکا۔ شمع نے ٹھنڈے لیمو پانی کے گلاس پر ابھر آنے والے ابخرات کی بوندوں کو انگلی سے پھیلاتے ہوئے کہا۔ "میرے بابا تمہارے ہندو ہوجانے کے بعد بھی تمہیں سویکار کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں تو میں نے بھی فیصلہ کرلیا ہے۔" کہہ کر اس نے کچھ توقف کیا اور پھر فیصلہ کن انداز میں کہا "میں ہی مسلمان ہوجاتی ہوں۔"

وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شمع اتنا بڑا فیصلہ اتنی جلدی کرلے گی۔ اس نے غور سے شمع کے چہرے کو دیکھا۔ جذبات سے لرزاں چہرے پر اس کی آنکھیں لبالب بھر آئی تھیں...

شمع نے ایک روز خاموشی سے بدن کے کپڑوں کے ساتھ گھر اور مذہب دونوں چھوڑ دیا۔ جامع مسجد میں کلمہ پڑھ کر وہ شما کلکرنی سے شمع جمال ہوگئی۔ مسجد ہی میں جمال اور شمع کا نکاح ہوا تھا۔ نکاح میں شمع کی طرف سے صرف منوج شریک ہوا تھا جبکہ جمال کے گھر کے تقریباً سارے ہی لوگ موجود تھے۔

جمال کی بڑی بہن نے کمرے میں شمع کے مردہ جسم کو دیکھتے ہی ایک دبی دبی چیخ ماری اور جمال سے لپٹ کر رونے لگیں۔ جمال کی آنکھیں خشک تھیں اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سینے میں گاڑھا دھواں بھر گیا ہو۔

"یہ کیسے ہوگیا جمال..." وہ کہتیں جاتی تھیں اور روتی جاتی تھیں۔

"خدا کو یہی منظور تھا باجی۔"

بڑی بہن نے دوپٹے سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے اپنی والدہ اور والد کے بابت دریافت کیا کہ وہ اب تک کیوں نہیں پہنچے؟ پھر اس نے مراٹھی ترجمہ والے قرآن کو کپ بورڈ سے اتارا اور شمع کے قریب بیٹھ کر دھیمی آواز

میں تلاوت کرنے لگی۔ شمع عربی تو نہیں پڑھ سکی تھی البتہ وہ کبھی کبھار قرآن کا مراٹھی ترجمہ ضرور پڑھ لیا کرتی تھی۔

جمال کو اس درمیان ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں سینئر فوٹوگرافر کا جاب مل گیا تھا۔ ایجنسی نے ہی اسے بوریولی میں سنگل روم کا ایک فلیٹ بھی الاٹ کردیا تھا۔ جو میاں بیوی کے لئے کافی تھا وہ اس فلیٹ میں شمع کے ساتھ منتقل ہوگیا تھا لیکن ہفتے کے روز دونوں محمد علی روڈ پر واقع جمال کے والد کے مکان پر ضرور جاتے تھے۔ شمع نے ایک روز سوچا کہ اتنا عرصہ گزر چکا ہے بابا نے بھی آئی (ماں) نے تو اس کی غلطی کو معاف کردیا ہوگا۔ وہ جمال کو بتائے بغیر کالج سے فارغ ہوکر دادر ہندو کالونی پہنچ گئی۔ وہ دروازے پر کھڑی بیل بجاتی رہی لیکن کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ شاید آئی ہول سے اسے دیکھ لینے کے بعد ایسا کیا گیا تھا۔ اس کے بعد پھر کبھی اس نے ماں کی دہلیز پر قدم نہیں رکھا تھا۔

شمع نے خود کو جمال کے گھر کی تہذیب کے مطابق ڈھالنے کی پوری کوشش کی تھی۔ رمضان کے روزے اس نے پہلی بار رکھے۔ منگل وار کے برت کا معمول برقرار رہا۔ جمال جب تک گھر نہیں آجاتا وہ کھانا نہیں کھاتی۔ اس نے یہ عادت اپنی آئی سے پائی تھی۔ آئی کہا کرتی تھی پتی پرمیشور ہوتا ہے اس سے پہلے کھانا نہیں چاہئے۔ جمال نے اسے کئی بار سمجھایا کہ ان کے یہاں اس قسم کی کوئی تہذیب نہیں ہے اسے وقت پر کھالینا چاہئے لیکن وہ ہمیشہ ہنس کر ٹال جاتی۔ لوگ کہتے ہیں کہ محبوبہ جب بیوی بنتی ہے تو اس میں پہلے جیسی کشش نہیں رہ جاتی ہے لیکن شادی کے بعد دونوں کی محبت میں نہ صرف شدت آگئی تھی بلکہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر خود کو ادھورا محسوس کرتے تھے۔

کمرے میں شمع کے بے جان جسم کے قریب ہی باجی اور کچھ دوسری رشتے دار عورتیں اور بچیاں قرآن کی تلاوت کررہی تھیں۔ ابو اور امی بھی پہنچ گئے تھے۔ امی تو شاید راستے بھر روتی رہی تھیں ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں انہوں نے آتے ہی جمال کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا جیسے وہ اس کے سینے کا سارا درد اپنے کلیجے میں اتار لینا چاہتی ہوں۔ تب بھی اس کی آنکھیں خشک رہیں۔

"بیٹے غسالہ کو میں نے خبر کردی ہے وہ بس آتی ہی ہوگی" انہوں نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ ابو دروازے کے قریب سوسائٹی کے دوسرے لوگوں کے درمیان اپنی بہو کی ملنساری اور سگھڑپن کی تعریفیں کررہے تھے۔

"رمضان کے مہینے میں بہو نے سارے روزے رکھے اور پانچوں وقت نماز ادا کی کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ غیر قوم سے آئی ہے۔" میت میں آنے والے بھی مرحومہ کی انہیں صفات کی تعریفیں کررہے تھے۔

"جمال میاں تم نے بتایا نہیں تدفین کب ہوگی؟" ابو نے دوبارہ اسے یاد دلایا۔ جمال نے نم آنکھوں سے شمع کی لاش کی طرف دیکھا سرہانے اگربتیاں سلگ رہی تھیں دھویں کی پتلی گاڑھی لکیریں فضا میں دھیرے دھیرے رینگ رہی تھیں اماں اور باجی کی تلاوت کی آواز ماحول کو مزید سوگوار بنارہی تھی

"شمع کو قبرستان نہیں شمسان لے جانا ہے"

"ہیں!" جمال کے اس جواب پر ابو بہت زور سے چونکے اور ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا چند ثانیوں تک وہ بیٹے کے چہرے کو دیکھتے رہے

گذشتہ ایک مہینے سے شمع کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ ڈاکٹر نے یرقان تشخیص کیا تھا اور یہ بھی تنبیہ کردی تھی کہ بیماری کے سنگین نتائج بھی نکل سکتے ہیں کیوں کہ شمع حاملہ تھی۔ جمال نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی یہ بیماری اتنی خطرناک ثابت ہوگی ورنہ وہ دفتر سے چھٹی لے کر خود ہی اس کی نگہداشت کرتا۔ یہی سبب تھا کہ اس نے بیماری کے دنوں میں بھی شمع کو منگل وار کا برت رکھنے سے نہیں روکا۔ دو تین روز قبل شمع کو دن میں چار پانچ قے ہوئی تو وہ روہانسی ہوگئی اس نے جمال سے کہا" دیوالی میں اپنے بابا اور آئی کا آشیرواد لینے نہیں گئی تھی نا شاید اس کا پاپ ہے۔" جمال نے اس بات پر محبت بھری ڈانٹ پلائی تھی کہ وہ پڑھی لکھی ہوکر اس طرح کے وہم رکھتی ہے اس نے کہا تھا" وہم ہے یا حقیقت میں نہیں جانتی لیکن پنرجنم میں میرا وشواش ضرور ہے میری اوپر والے سے یہی پرارتھنا ہے کہ دوسرے جنم میں بھی وہ مجھے تمہاری ہی پتنی بنائے۔" اس جملے پر جمال نے بے اختیار اس کی زرد پیشانی کو چوم لیا تھا۔

کل رات اچانک ہی شمع کی طبیعت بگڑ گئی ڈاکٹر کو بلوایا گیا۔ ڈاکٹر نے دوائیں اور انجکشن دے کر اس خدشے کا اظہار ضرور کردیا تھا کہ یرقان اپنے آخری اسٹیج پر ہے اس لئے شمع کو کل سویرے ہی کسی اچھے اسپتال میں داخل کروانا بہت ضروری ہے۔ جمال نے آنکھوں میں ہی ساری رات کاٹ دی۔ انجکشن کی وجہ سے شمع گہری نیند ضرور سوئی لیکن صبح جاگنے کے بعد اس کی حالت پھر بگڑ گئی۔ شمع کی ایسی حالت دیکھ کر جمال بری طرح نروس ہوگیا تھا اس نے ڈاکٹر کو فون کیا لیکن ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی شمع بجھ گئی تھی۔

"بیٹے تمام لوگ آچکے ہیں۔ غسالہ نے میت کو غسل بھی دے دیا ہے۔"

ابو جمال کو قریب بلا کر بولے "تدفین کب کرنی ہے۔ مغرب بعد یا عشا بعد؟"

ابو کو جواب دینے کے بجائے جمال شمع کی لاش کو دیکھنے لگا جسے غسل کے بعد کفن پہنا کر دیدار کے لئے رکھا گیا تھا۔ غسل کے بعد چہرہ کچھ اور نکھر آیا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ اٹھ کر کہے گی "ارے مجھے جگایا کیوں نہیں؟" اکثر چھٹی کے روز جمال پہلے اٹھ جاتا تو خود ہی چائے بنا کر پی لیتا۔ شمع کے بیدار ہونے پر ناشتہ دونوں ساتھ ہی میں کرتے تھے۔ شمع کو گہری نیند سے جگانے میں اسے اس لیے تکلیف ہوتی تھی کہ وہ ہفتہ کے چھ روز بڑے سویرے اٹھ کر گھر کے کام کاج میں جٹ جاتی تھی۔ جمال کو دفتر بھیجنے اور کالج جانے کی تیاری میں اسے کافی وقت لگتا تھا اس لئے عام دنوں میں صبح سویرے اٹھنا اس کی مجبوری تھی۔

"مہرہ صاحب نے کہا ہے کہ ایجنسی کی طرف سے شمع کو ایک Obituary ٹائمز آف انڈیا میں دی جائے۔"

منوج نے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

جمال نے کاغذ پر نظر ڈالی۔

شمع جمال

تاریخ پیدائش۔ 18 اپریل بروز بدھ 1968

تاریخ وفات۔ 2 جون بروز منگل 1995

جمال کی نظر تاریخ وفات پر ٹھہر گئی۔ اوہ آج منگل وار ہے۔ شمع کے برت کا دن! شمع نے اسے بتلایا تھا کہ "میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے تب سے منگل وار کا برت رکھ رہی ہوں۔ کبھی ناغہ نہیں کیا" اس نے بڑے فخر سے کہا تھا۔ شمع کی آواز کی بازگشت دیر تک جمال کی سماعت میں جاری رہی۔

"جمال میاں تم نے بتایا نہیں تدفین کب ہوگی؟" ابو نے دوبارہ اسے یاد دلایا۔ جمال نے نم آنکھوں سے شمع کی لاش کی طرف دیکھا سرہانے اگربتیاں سلگ رہی تھیں۔ دھویں کی پتلی گاڑھی لکیریں فضا میں دھیرے دھیرے رینگ رہی تھیں اماں اور باجی کی تلاوت کی آواز ماحول کو مزید سوگوار بنا رہی تھیں۔

"شمع کو قبرستان نہیں شمسان لے جانا ہے۔"

"ہیں!" جمال کے اس جواب پر ابو بہت زور سے چونکے اور ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ چند ثانیوں تک وہ بیٹے کے چہرے کو دیکھتے رہے جو فرط جذبات سے لرز رہا تھا پھر انہوں نے شمع کی لاش کو غور سے دیکھا اور غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا "کیا یہ مرحومہ کی اپنی خواہش تھی۔"

"نہیں شمع کے اور میرے درمیان کبھی اس موضوع پر بات نہیں ہوئی اور پھر اتنی جلدی یہ سب ہو جائے گا ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔"

"دیکھو میاں وہ مسلمان ہو چکی تھی اس نے کلمہ پڑھا تھا وہ..."

ابو دانتوں کو بھینچ کر سخت لیکن دبی ہوئی آواز میں بولے۔

"شمع نے میرے مذہب سے متاثر ہو کر اپنا مذہب نہیں بدلا تھا۔ مجھے حاصل کرنے کے لئے اس نے مذہب تبدیل کرنے کی محض رسم ادا کی تھی۔"

جمال نے شمع کے زرد چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" ابو کی آواز غصے سے بلند ہو گئی کمرے اور راہداری میں موجود تمام لوگ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"میں کہہ چکا ہوں جو مجھے کہنا ہے۔ میں اس کی آتما کو سکون پہنچانا چاہتا ہوں۔" جمال نے سر جھکا کر مضبوط لہجے میں کہا۔

"آتما!" ابو نے دانتوں کی کچکچا کر کہا۔ "کیا مردہ جسم کو جلانے سے اس کی آتما کو سکون مل جائے گا؟" ان کا لہجہ تیز اور تلخ تھا۔ امی اور باجی جلدی سے کلام مجید رحل پر بند کر کے باپ بیٹے کے قریب چلی آئیں۔

"ابو ذرا سوچیے تو شمع نے میرے لئے مذہب بدل دیا تو کیا میں اس کی آتما کو سکون پہنچانے کے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتا؟"

امی اور باجی نے اسے خدا کا واسطہ دے دے کر سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا "شمع کی آتما کو داہ سنسکار سے ہی سکون ملے گا۔"

اس جواب پر ابو اپنے غصے کو برداشت نہ کر سکے اور امی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے سیڑھیوں سے دھم دھم کرتے ہوئے اتر گئے۔ باجی کچھ لمحوں تک اس کا منہ تکتی رہیں پھر شمع کے بے جان چہرے پر ایک نظر ڈال کر برقعہ پہنتے ہوئے وہ بھی چلی گئیں۔ ایک ایک کر کے سارے رشتے دار شناسا اپنی خشمگیں نگاہوں کی حدت کو کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ کمرے میں اب صرف اگربتیوں کا دھواں تھا جو اذیت ناک خاموشی کے ساتھ لپٹ کر گریہ کر رہا تھا۔

منوج کی دستک پر دروازہ کھلا۔ سامنے شمع کے بابا کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے آئی منہ میں پلو دیئے ایسے کھڑی تھیں جیسے رو پڑیں گی۔ بجھے ہوئے چہرے اور دھندلی آنکھوں سے انہوں نے منوج کے پیچھے کھڑے جمال کو شاکی نظروں سے دیکھا۔ جمال نے آگے بڑھ کر پیتل کی ایک چھوٹی سی کلسی جس کے منہ پر سرخ کپڑا بندھا ہوا تھا، بابا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کی بیٹی کو لوٹانے آیا ہوں۔"

بابا نے کلسی کی طرف کانپتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔ آئی دونوں ہاتھوں کو منہ پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں اور جمال کی آنکھیں میں ٹھہرا ہوا آنسوؤں کا سیلاب بھی بہہ نکلا۔ ■■

بابِ تنقید و تحقیق

پروفیسر مرزا خلیل بیگ کے نام

تنقید

تحقیق

عصری شاعری کا اسمِ اعظم

شہر یار کا شعری تفاعل

مشتاق صدف

شہر یار اپنے اولین شعری مجموعہ 'اسم اعظم' (1965) سے ہی اردو شاعری کا اسم با مسمیٰ قرار دیے گئے تھے۔ چار سال بعد ان کی شہرت و مقبولیت کا 'ساتواں در' (1969) بھی کھل گیا۔ بعدازیں ان کے شعری سفر کا ایک پڑاؤ 'ہجر کے موسم' (1978) سے موسوم ہوا تو ان کی شاعری کی ایک واضح سمت و رفتار کا اندازہ ہوا۔ پھر انھوں نے 'خواب کا در بند ہے' (1985) کہہ کر سب کو حیران و ششدر کر دیا لیکن اسی پر وہ قانع نہیں ہوئے بلکہ اپنی پلکوں سے 'نیند کی کرچیں' (1995) بھی چنتیں۔ اس کے بعد 'حاصل سیر جہاں' (2001) کی شکل میں ان کا پورا کلام ہمارے سامنے آیا، جس سے وسیع تناظر میں ان کے شاعرانہ کمال سے آگاہی ہوئی۔

شہر یار کا پہلا مجموعہ کلام 'اسمِ اعظم' شائع ہوا تو ہمارے کچھ بڑے ناقدین نے اسے سراہا تو کچھ نے اس میں معنی کی جہتوں کے فقدان کی نشاندہی کی اور کچھ نے تراکیب کی عدم شمولیت کا ذکر کیا لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہمارے کم و بیش تمام چھوٹے بڑے نقادوں نے شہر یار کی شاعری میں سادگی اظہار کی خوبی کا اعتراف ضرور کیا اور اُن کی اس پہلی کاوش کو نئی اور پرانی اردو شاعری کے باہم ارتباط کا ایک اہم نشان قرار دیا۔ اس کا دیباچہ وحید اختر نے لکھا تھا لیکن جب گوپی چند نارنگ کا فکرانگیز مضمون 'نقوش' میں شائع ہوا جس میں پہلی مرتبہ شہر یار کے معنیاتی نظام اور شعری و اسلوبیاتی ساختوں کو نشان زد کیا گیا تھا تو ایک نئی بحث کا آغاز ہوا اور شہر یار کو نئی شاعری بالخصوص نئی غزل کا نمائندہ شاعر تسلیم کیا جانے لگا اور ان کی شاعری میں اجنبیت، تنہائی، رات، نیند، خواب اور شکست خواب کی تمثالوں اور تلازموں کے ساتھ ساتھ ایک اداس حزنیہ لے کا احساس کیا جانے لگا۔

دراصل شہر یار کی پہلی شعری کاوش کے ظہور پذیر ہونے کا زمانہ آزادی، تقسیم اور ہجرت کا زمانہ تھا۔ یہ زمانہ برصغیر میں تہذیبی، اخلاقی اور سماجی اقدار کی شکست و ریخت کا زمانہ تھا۔ فرقہ واریت سے جھلس رہی انسانیت کا زمانہ تھا۔ مینی فیسٹو اور اعلان نامہ کی ناکامیوں اور بے معنی وعدوں کا زمانہ تھا۔ اس صورتِ حال میں شہر یار نے زندگی کے نئے مطالبات اور امکانات پر غور و فکر کا ایک نیا چراغ فروزاں کیا یعنی ایسی شاعری کی جو منفرد بھی تھی اور یگانہ بھی۔ عشق و وفا، درد و کرب، صبر و ضبط اور ایثار کے جذبہ سے سرشار بھی تھی اور رشتوں کے تقدس اور انسانی معتقدات اور آدرشوں سے ہم آہنگ بھی اور جو محبت اور نفرت، نیکی اور بدی، جھوٹ اور سچ کی بنی بنائی راہوں پر ایک طرح کی ضرب بھی تھی۔ شہر یار کی یہ خوبی کہیے کہ اس دورِ امتحان میں انھوں نے اپنی انفرادیت کا سانچہ خود ہی تیار کیا اور خود ہی اسے پروان بھی چڑھایا جس کی پیروی ان کے بعد کی نئی نسل نے کی۔ انھوں نے نہ تو بنے بنائے کسی شاعرانہ پیمانے کو توڑنے کی کوئی شعوری کوشش کی اور نہ ہی کچھ نیا کام کرنے کا دعویٰ ہی کیا بلکہ اپنی شخصیت، اپنے مزاج، اپنی افتادِ طبع اور اپنے تجربات و محسوسات کو کشادگی کے ساتھ شعری پیکر عطا کیا۔ غور کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ شہر یار کے تجربات و محسوسات کی جڑیں زندگی اور تہذیب کے باطن کو چھوتی ہیں۔ نیز ان کی شعری تخلیق میں دلکشی اور تازگی کے رنگ و نور بھی بکھرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ آزادی کے کچھ برسوں بعد یا یہ کہیے کہ پانچویں اور چھٹی دہائی میں ایک تیز رفتار تغیر آیا، سب کچھ بدل سا گیا۔ انفرادی اور اجتماعی درد و غم اور احساسِ تنہائی کا زور بڑھا، سیاسی اور سماجی سروکار میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان حالات میں شعر و ادب کی افہام و تفہیم کا انداز بھی بدلا۔ ایک طرف جہاں نئی فکریات سامنے آئیں وہیں دوسری طرف موضوعات کے انتخاب میں بڑی سوجھ بوجھ سے کام لیا جانے لگا اور جب موضوعات نئے آئے تو نئی شعری بوطیقا بھی سامنے آئی۔ اردو شاعری کی زبان اور لب و لہجے میں بھی نیا پن اور انوکھا پن دکھائی دینے لگا۔ غزلوں اور نظموں میں ہر طرح کے سماجی و سیاسی مسائل کے اظہار پر زور دیا جانے لگا۔

شہر یار انھی شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے ادلتے بدلتے حالات میں بھی داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر اپنے فکر و شعور کو اشعار کی شکل میں طاقت گویائی عطا کی۔ تبھی تو شہر یار کی شاعری میں تہذیب و اقدار کی پاسداری اور دردمندی کی ایک دلکش اور دل کشا فضا ملتی ہے جو ان کے دوسرے معاصرین شعرا سے مختلف ہے۔

اس زمانے میں جدیدیت کے نام پر نئے نئے تجربات کیے گئے اور نئی نئی بدعتوں کا سلسلہ بھی شروع ہوا جس کے شکار بہت سے شعرا ہوئے لیکن شہر یار کبھی ان چکروں میں نہیں آئے۔ انھوں نے نئے طرز احساس، نئے لب ولہجہ کو ضرور اپنایا مگر کسی بھی نوع کے ابہام سے اپنی شاعری کو دور رکھا۔

یہ بھی جانتے ہیں کہ ترقی پسندوں کی طرح جدیدیوں کا بھی اپنا ایک الگ نظریہ رہا ہے۔ ان کا مسلک اور نصب العین ایک مخصوص نظریے کی پیداوار رہی ہے۔ ان کی نظریاتی جکڑ بندی سے زندگی کی حقیقتیں ابہام کی نذر ہو گئیں جس سے تخلیقی ادب کی پہچان دھندلی ہو گئی۔ لیکن شہر یار کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ جدید ہوتے ہوئے بھی جدید نہیں رہے اور جدید نہ ہوتے ہوئے بھی جدید کہے جا سکتے ہیں۔ ان کے بیشتر اشعار سہل ممتنع کا عمدہ نمونہ ہیں البتہ ان کی نظموں میں کئی نظمیں ایسی ہیں جن پر ابہام کی ہلکی پرت دیکھی جا سکتی ہے۔ تاہم ان میں عصر رواں کے سوا بھی بہت کچھ ہے۔ لہٰذا ان پر ابہام پرستی کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی پوری شاعری وقتی حصار سے ماورا اور زندگی سے قریب تر ہے۔ شہر یار کے یہاں ایسی بہت سی نظمیں ہیں جن کا رشتہ زندگی سے ہے۔ 'ہم سفر'، 'جرم وسزا'، 'نیا کھیل'، 'موت'، 'ایک اور موت'، 'زیست کا حاصل اور حقیقت'، 'زندگی... جو آنے والی ہے'، 'عہد حاضر کی دل ربا مخلوق'، 'انسان یا بت'، 'زندگی کی خواہش'، 'زندہ رہنے کا یہ احساس' وغیرہ ان کی ایسی ہی نظمیں ہیں جن سے زندگی سے گہری محبت، سماج سے والہانہ لگاؤ اور کائنات سے گہرے عشق کا اندازہ ہوتا ہے۔ گویا ان نظموں سے ذات و کائنات سے گہری ہم رشتگی ظاہر ہوتی ہے۔ شہر یار کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی عقل، اپنے حواس اور اپنے ادراک کو کبھی کسی فکری نظام کے ہاتھوں گروی نہیں رکھا اور وہ جدیدیت کی طرف سے کھینچی گئی لکیر پر چلنے کے بجائے ہمیشہ اپنی ایک نئی رہ گزر کی تلاش وجستجو میں سرگرداں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے زندگی کی حقیقتوں کو کبھی دھندلا نہیں ہونے دیا۔ شہر یار کا بیدار ذہن تخلیقی ادب کے تقاضوں سے اچھی طرح واقف ہے تبھی تو انھوں نے احساس اجنبیت پر کوئی شعر کہا تو محسوس ہوا کہ اس سے بہتر کوئی سوچ ہی نہیں سکتا اور جب انھوں نے تنہائی اور غم پر کچھ کہا تو احساس ہوا کہ ان سے بہتر تنہائی کے کرب اور غم کی آنچ کو کوئی بیان ہی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جب انھوں نے وقت، خواب، شہر، سایہ، ہجر و وصال، نیند، رات اور دن، مہتاب اور سورج، تاریکی، روشنی، منزل، موت، صدا اور سناٹا پر اپنے احساسات و محسوسات کو لفظوں میں ڈھالا تو ایسا لگا کہ ان سے بہتر کوئی شعر ہی نہیں کہہ سکتا۔ جب انھوں نے سماجی وعصری حسیت کا اظہار کیا تو ہم نے انھیں سب سے بہتر سماج کا نبض شناس سمجھا۔ یہ سب دراصل ان کے شاعرانہ کمال کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر اپنی شاعری کو خوب سے خوب تر بنانے کی سعی وجستجو کی۔

میری دانست میں شہر یار کو کسی نظریے اور فارمولے سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے جن نقادوں نے انھیں جدیدیت سے جوڑ کر دیکھا اور پرکھا نیز ان کے کلام کو ہمدردانہ نظر سے پڑھنے کی سفارش کی ان کے حوالے سے صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ شہر یار کی شاعری کے مطالعے کے لیے کسی سفارش یا اپیل کی ضرورت نہیں۔ وحید اختر نے 'اسم اعظم' کے 'تعارف' میں جدید شاعری اور جدید شاعروں کو ہمدردانہ نظر سے پڑھنے کی بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اب تک جدید شاعری اور جدید شاعروں کو ہمدردانہ نظر سے کم ہی پڑھا گیا ہے، اگر تعصب کی عینک اتار دی جائے اور نظم کی ہیئت میں نئے تجربوں اور معانی و بیان کے نئے راستے ڈھونڈنے کی کوشش کو بدعت نہ سمجھا جائے تو اس شاعری میں ہمارے لیے فکر و نظر کا بہت کچھ سامان مل سکتا ہے۔'' حاصل سیر جہاں، شہر یار، 2001، ص6

یہ بات دوسرے کج فہم شاعروں کے لیے تو کہی جا سکتی ہے لیکن شہر یار کے لیے ہرگز نہیں۔ شہر یار کے ابتدائی دنوں کی شاعری کے مطالعے کے لیے اس طرح کی سفارش کو کیوں کر جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟ ان کی شاعری پر پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسے نقاد و دانشور کی رائے آج بھی شہر یار کی شاعری کی کلید کا درجہ رکھتی ہے۔ پروفیسر نارنگ نے شہر یار کے اولین شعری مجموعے کی جن خوبیوں کو اجاگر کیا ان کی بنیاد پر آج بھی ہم شہر یار کی شعری منطق کو جانچتے اور پرکھتے ہیں۔ شہر یار کے جن شعری خصائص کا ذکر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے مضمون 'شہر یار: نئی شاعری اور اسم اعظم' میں کیا ہے اور جس طرح ان کی انفرادیت، معنیات اور تازگی کو واضح کیا ہے وہ مضمون آج بھی شہر یار کی شاعری کی تفہیم کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ پروفیسر نارنگ نے شہر یار کی شاعری میں دو دنیاؤں کی نشاندہی کی ہے۔ ایک 'خواب' اور دوسری 'آگہی'۔ پھر خواب اور آگہی کی ان دو دنیاؤں کا محور و مرکز 'وقت' کو

قرار دیا۔ انھوں نے اسے امیجز کے ذریعے سے بھی پیش کیا اور اس کی وضاحت ان لفظوں میں بھی کی ہے:

''آگہی کی دُنیا 'دن کے عذاب کی' اور 'سورج' اور 'دھوپ' کی دُنیا ہے جبکہ 'خواب' کی دُنیا 'نیند'، 'رات' اور 'مہتاب' کی دُنیا ہے۔ یہ 'آرزو' اور 'امید' کی روشنی کا مسکن ہے جبکہ آگہی کی دُنیا میں 'ناامیدی'، 'اداسی' اور 'غم' ہے۔ آگہی کی دُنیا کو 'دشت' اور 'صحرا' سے بھی تشبیہہ دی گئی ہے، جس میں ہر طرف 'خلا' ہی 'خلا' اور 'سناٹا' ہی 'سناٹا' ہے۔ انسان یہاں 'اجنبی' ہے اور 'تنہائی' کا احساس اُسے کھائے جاتا ہے اور خواب کی دُنیا سے کوئی 'صدا' یا 'آواز' اس تک نہیں آتی۔ خواب اور آگہی کی ان دو دُنیاؤں میں جو چیز ربط قائم رکھے ہوئے ہے، وہ 'وقت' ہے۔'' ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، گوپی چند نارنگ، 2004، ص259

غور کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ شہریار کی شاعری پر لکھے گئے اب تک کم و بیش تمام مضامین کی تان کہیں نہ کہیں نارنگ صاحب کی مذکورہ رائے پر ہی ٹوٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔ آج بھی بیشتر لکھنے والے شہریار کی شاعری کی انھی خوبیوں کو روشنی میں لاتے ہیں۔ مذکورہ بحث کے تعلق سے یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ شہریار کی شاعری اپنی معنیاتی کشش اور توانائی سے ہمیں اپنے مطالعے پر مجبور کرتی ہے۔ اس کے لیے کسی اپیل، سفارش یا ہمدردی کی قطعاً ضرورت نہیں۔

شہریار نے مختصر ترین نظم کہنے کا کامیاب تجربہ کیا اور زمانے کی عام روش کے مطابق اپنی شاعری کو کبھی چیستاں نہیں بننے دیا۔ انھوں نے زندگی، زمانہ، زمین، انسان، تہذیب اور کائنات کی بدلتی ہوئی حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔ انھوں نے زندگی اور موت کے فلسفے کو بھی سمجھنا چاہا اور فرد اور جماعت کی کش مکش کو بھی۔ انھوں نے انسان اور فطرت کے رشتے کی فہم و ادراک کی سعی کی ہے تو ظاہر اور باطن کے ساتھ غم و انبساط اور خیر و شر کے امتیاز کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ گویا وہ ایک ایسے فن کار ہیں جن کی آواز ذات و کائنات کی آواز ہے اور جن کی شاعری میں انسان اور اس کے متعلقات کا عکس، انسان کی تنہائی کا نوحہ، تہذیب و ثقافت اور تمدن کا آشوب، عشق اور عشق کی مختلف اشکال، زندگی اور زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی باتیں سب کچھ ان کے یہاں اشاریت اور ایمائیت کے ساتھ مل جاتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری غم و نشاط، رنج و راحت اور زخم و مرہم کے باہم ربط و تسلسل کی شاعری ہے۔ زندگی اور موت، خوشی اور غم کی آپسی جنگ کی شاعری ہے۔ خواہش ذات، خواہش دنیا، ذہنی اضطراب، وصل و فراق اور فتح و شکست کی شاعری ہے جو مخصوص آگہی کے ساتھ جلوہ فگن ہے۔ کہیں خوابوں کی شکست، آرزوؤں کا خون، تمناؤں کی ارتھی نکلتی ہوئی نظر آتی ہے تو کہیں تاریکی، یادوں کی برات، کہیں تاریکی سے مبارزت اور کہیں روشنی سے محبت جھلکتی ہے۔ اسی طرح اقرار اور انکار، غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں سے ان کی شاعری عبارت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ چیزیں ان کے یہاں کہیں ہلکی تو کہیں گہری ہوگئی ہیں۔ جس طرح سمندر میں کہیں لہریں تیز اٹھتی ہیں اور کہیں سست ہو جاتی ہیں۔ کہیں سمندر کی روانی میں ٹھہراؤ تو کہیں تیز بہاؤ کا احساس ہوتا ہے اور کہیں موجوں کے گہرے تھپیڑوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ شہریار کی شاعری بھی کچھ اسی نوع کی ہے جس میں فکر و فن کا بہاؤ کہیں آہستہ رو ہے تو کہیں تیز رفتار، کہیں ٹھہراؤ تو کہیں سبک روی، کہیں صبر و ضبط تو کہیں اضطراب کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ جس طرح کہیں سمندر کی لہریں کناروں پر اپنا سر پٹکتی ہیں اُسی طرح کہیں شہریار بھی ضبطِ غم کی بات کرتے ہیں اور کہیں غم کی دیوار توڑتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ یہ اشعار دیکھیے:

لوگ سر پھوڑ کر بھی دیکھ چکے
غم کی دیوار ٹوٹتی ہی نہیں

ہزار پرسشِ غم کی مگر نہ اشک بہے
صبا نے ضبط یہ دیکھا تو لاجواب ہوئی

دراصل شہریار نے ناصر کاظمی کی طرح میر کو ہی اپنا ہم عصر شاعر مانا ہے کہ ان کے یہاں درد کی وہ آنچ ہے جو میر سے بہت ملتی جلتی ہے لیکن جہاں تک محرکات کی بات ہے، شہریار کے شعری محرکات معاصر تناظر سے میل کھاتے ہیں۔

'اسم اعظم' سے 'نیند کی کرچیں' تک کے شہریار کے شاعرانہ سفر پر سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی شاعری قدیم و جدید دونوں کی توانا اور مثبت روایتوں سے علاقہ رکھتی ہے اور مجملہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری زندگی اور زندگی کی سچائی، زمین اور زمین کے نشیب و فراز، حقیقت اور حقیقت کے اسرار و رموز، ہوا اور ہوا کے تیز و تند جھونکے، پانی اور پانی کی تشنگی، آسمان اور آسمان کی پستی، رات اور رات کے اجالے، دن اور دن کے اندھیرے، خواب اور خواب کی نیند، تنہائی اور تنہائی کی بھیڑ، نیند اور نیند کی بیداری سے عبارت ہے۔ اسی طرح ساحل اور ساحل کا سمندر، وصل اور وصل کا ہجر، آنکھ اور آنکھ کا اندھاپن، وحشت اور وحشت کی دیوانگی، بات اور بات کا گونگاپن، طوفان اور طوفان کی سرد مہری، صحرا اور صحرا کی پیاس سے ان کی شمعِ فکر و فن فروزاں ہے گویا اجتماعِ ضدین کا منبع و مرجع ہے شہریار کی

شاعری۔ دراصل وقت، نیند، آنکھ، خواب، موت، ہجر، وصال، صحرا، ساحل دریا، تنہائی، شام وسحر، دن، رات، بات، زمین، آسمان، روشنی، ریت، سایہ، پرچھائیں، مہتاب، سورج، چاند، منزل، آرزو، دریچے، روشنی، ہوا، آندھی، طوفان، فاصلہ، اجنبی، تشنگی، پیاس، تیرگی، زندگی، زیست، شجر، دھوپ، دل، وحشت، دشت، صحرا، سمندر، کشتی، سیلاب، چراغ، برف، لہو، پھول، خوشبو، بگولے، موسم، سفر، مسافر، منزل، گھر، مکان، آگ، بستی، گاؤں، شہر، صدا، آہٹ، سنسان، سناٹا، سکوت وغیرہ شہریار کی شاعری کے کلیدی الفاظ اور بلیغ استعارے ہیں جن کا استعمال انھوں نے اپنے شعری مجموعوں میں بار بار کیا ہے اور ہم ان ہی الفاظ کو ان کی شاعری کے تخلیقی محرک کی بنیاد قرار دے سکتے ہیں۔ یہ وہ الفاظ ہیں جن کے مناسبات اور تلازمات کی نشاندہی کم وبیش تمام لکھنے والوں نے کی ہے۔ ان الفاظ سے شہریار ایک ایسی شعری فضا خلق کرتے ہیں، جس میں ذات وکائنات کے غم والم، خوشی وانبساط اور عشق کی گرمی کے ساتھ زندگی کے بھید بھرے سنگیت بھرے پڑے ہوتے ہیں۔ ان الفاظ سے وابستہ تراکیب (کم ہی سہی) تلازمات اور مترادفات کو اگر ہم یکجا کریں تو شہریار کے شعری افق پر ایک ایسی کہکشاں ابھرتی ہے جو دلوں کو روشن کر دیتی ہے۔

شہریار کی شاعری میں ایسی آبدار مثالوں کی کمی نہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا۔ یہاں چند اشعار پر ہی اکتفا کیجیے:

زندگی میں ابھی خوشیاں بھی ہیں رعنائی بھی
زندگی سے ابھی دامن نہ چھڑا مان بھی جا

عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو
میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو

وہ دیکھو ریت کی تہہ اور بھی دبیز ہوئی
ہماری پیاس بجھی ہے، نہ بجھنے والی ہے

مدتیں ہو گئیں سورج نہیں نکلا کوئی
شہر کا شہر ہے بے چین پگھلنے کے لیے

میری تنہائی کی رسوائی کی منزل آئی
وصل کے لمحے سے میں ہجر کی شب بدلوں گا

پانی کی ایک بوند سے پیاس کی ابتدا کرو
چشمے پہ جب رسائی ہو کہنا طلب کچھ اور ہے

پہلے تجھے دیکھا تھا پرچھائیں کی صورت میں
پھر جسم ترا میری رگ رگ میں اتر آیا

دل پریشاں ہو مگر آنکھ میں حیرانی نہ ہو
خواب دیکھو کہ حقیقت سے پشیمانی نہ ہو

پھر کہیں خواب وحقیقت کا تصادم ہوگا
پھر کوئی منزل بے نام بلاتی ہے ہمیں

گردش وقت کا کتنا بڑا احساں ہے کہ آج
یہ زمیں چاند سے بہتر نظر آتی ہے ہمیں

معجزوں کی منتظر آنکھیں رہیں شام وسحر
اس زمانے میں ہمیں سے بس یہ نادانی ہوئی

کوئی ہے جو ہمیں دو چار پل کو اپنا لے
زبان سوکھ گئی یہ صدا لگاتے ہوئے

آنکھوں میں تیری دیکھ رہا ہوں میں اپنی شکل
یہ کوئی واہمہ یہ کوئی خواب تو نہیں

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ متذکرہ الفاظ کو شہریار نے بار بار کیوں استعمال کیا اور ان الفاظ کی عدم موجودگی میں زندگی کے تصور کو کیوں ادھورا سمجھا ہے۔ کہیں زندگی کے بھید انہی لفظوں میں پوشیدہ تو نہیں، یہ سوچنے کی بات ہے۔

شہریار کے یہاں پانی، پیاس، دشت، قافلہ، شام، منزل، مسافر، خیمہ، تلوار وغیرہ کی حیثیت فقط الفاظ کی نہیں ہے بلکہ ان سے معنیاتی جہات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ سامنے کے تعلیقے ضرور ہو سکتے ہیں لیکن ان کی نئی نئی معنیاتی جہات سے انکار ممکن نہیں۔ عصر رواں سے انسلاک پیدا کر کے ان الفاظ کو دیکھا جائے تو واقعۂ کربلا کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب 'سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ' میں اس حوالے سے تفصیلی گفتگو کی ہے۔ شہریار نے واقعۂ کربلا کو بھی اپنی شاعری میں بطور نشان (Sign) برتا ہے اور اسے بطور شعری استعارہ استعمال کیا ہے مثلاً یہ شعر:

حسینؓ ابن علی کربلا کو جاتے ہیں
مگر یہ لوگ ابھی تک گھروں کے اندر ہیں

شہریار کی شاعری کے کلیدی الفاظ جن میں پانی، ہوا، آگ اور مٹی بھی شامل ہیں۔ درحقیقت یہ عناصر اربع ہیں۔ یہ چار بنیادی اجزا ہیں جن کے بغیر زندگی سانس ہی نہیں لے سکتی۔ اسی طرح صبح، شام، دن، رات اور گھر بھی ان کے پسندیدہ الفاظ ہیں جو یوں تو اسم ظرف ہیں لیکن ان کی شاعری کے یہ بھی بلیغ استعارے ہیں جن سے زندگی اور کائنات کے اسرار و رموز منکشف ہوتے ہیں۔ پہلے پانی، ہوا، آگ اور مٹی کے حوالے سے چند اشعار

دیکھیے:

شدید پیاس تھی پھر بھی چھوا نہ پانی کو
میں دیکھتا رہا دریا تری روانی کو

تجلی چراغوں سے اہلِ وفا کو ہونا ہے
کہ سرفراز یہاں پھر ہوا کو ہونا ہے

بس ایک لمحے کی مہلت دے پیاسی آنکھوں کو
مرے بدن کی صراحی میں آگ بھر جائے

ہزار بار مٹی اور پائمال ہوئی ہے
ہماری زندگی تب جا کے بے مثال ہوئی ہے

اب کچھ اشعار صبح، شام، دن، رات اور گھر کے تعلق سے ملاحظہ کیجیے:

وصل کی صبح کے ہونے میں ہے کچھ دیر ابھی
داستاں ہجر کی کچھ اور بڑھا لی جائے

شام کی دہلیز تک آئی ہوا
اور پھر آگے نہ چل پائی ہوا

دن ڈھلے اور شام کو دیدار ہو پھر
کام دن بھر اس لیے اتنا کیا ہے

شام تک جب کوئی گھر آتا نہ تھا
چین دل کو رات بھر آتا نہ تھا

گھر کی تعمیر تصور ہی میں ہو سکتی ہے
اپنے نقشے کے مطابق یہ زمیں کچھ کم ہے

شہریار کی شاعری میں ہجر، پیاس، وحشت، شہر، دھوپ، شجر، سایہ کے پیکر کو مرکزیت حاصل ہے۔ مابعد جدید غزل میں ان لفظوں کا استعمال خوب ہوا ہے۔ اگر ہم ہجر کے کرب، پیاس کی شدت، وحشت کی دیوانگی، شہر کی طاقت، دھوپ کی تازگی، شجر کی خصوصیت اور سائے کے انمٹ رشتے کو محسوس کریں تو یہ اشعار ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں:

بچھڑنا ہے تو بچھڑ جا اسی دوراہے پر
کہ موڑ آگے سفر میں کہیں نہیں آتا

ایک مدت سے مری پیاس یہی سنتی ہے
انتظار اور سرچشمۂ لب کرنا ہے

وحشت میری کتنی راس آئی مجھ کو
اک عالم کی سیر کرا لائی مجھ کو

ہماری بے حسی پہ رونے والا بھی نہیں کوئی
چلو جلدی چلو پھر شہر کو جلتا ہوا دیکھیں

مانا کہ دھوپ سخت ہے میں سر برہنہ ہوں
بے حس شجر کے سائے میں کیسے پناہ لوں

شہریار کا ایک پسندیدہ لفظ 'بات' بھی ہے لیکن ان کے اس لفظ کی نشاندہی کم کم ہی کی گئی ہے۔ فیروز اللغات میں لفظ 'بات' کے 19 مفہوم دیے گئے ہیں۔ جو اس طرح ہیں۔ (1) آواز، (2) لفظ، قول، (3) کہاوت، (4) حال، (5) قصہ، (6) افواہ، (7) پیام، (8) شکوہ، (9) الزام، (10) سبب، (11) ساکھ، (12) نکتہ، (13) خوبی، (14) کام، (15) عہد، (16) مقصد، (17) راز، بھید، (18) ڈھنگ اور (19) موقع۔ نیز بات کے حوالے سے محاورے اور ضرب الامثال الگ۔ 'بات' کے ان تمام معنی پر غور کیا جائے تو شہریار کے اس لفظ کے بہت سے مطلب نکالے جا سکتے ہیں۔ یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا شہریار کے یہاں 'بات' کا مفہوم وہی ہے جو لغت میں درج ہے یا پھر یہ ایک رمزیاتی لفظ ہے یا یہ لفظ ان کی کوئی تخلیقی اور وجدانی قوت ہے جو شعوری اور غیر شعوری طور پر ان کے شعروں میں ڈھلتی چلی گئی ہے۔ یہ پہلو ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ چند اشعار اس تعلق سے ملاحظہ کیجیے:

نیرنگیٔ دل ہے کہ تغافل کا کرشمہ
کیا بات ہے جو تیری تمنا نہیں ہم کو

کیا کوئی نئی بات نظر آتی ہے ہم میں
آئینہ ہمیں دیکھ کے حیران سا کیوں ہے

خون میں جوش نہیں آیا زمانہ گزرا
دوستو آؤ کوئی بات نکالی جائے

کون سی بات ہے جو اس میں نہیں
اس کو دیکھے مری نظر سے کوئی

اک لمبی سنسان سڑک پر تنہا پھرتے ہیں
وہ آہٹ تھی، ہم کو نہ اس کی بات میں آنا تھا

یہ ایک بات نہیں جانتے جو ہم چپ ہیں
کہاں سکوت میں شامل صدا کو ہونا ہے

جہاں تک تراکیب کی بات ہے شہریار نے بہت کم استعمال کی ہیں اور جو تراکیب استعمال میں آئی ہیں ان میں سے بیشتر شاعر کے کلیدی الفاظ سے ہی مناسبت رکھتی ہیں۔ مثلاً حصارِ روز و شب، چراغِ آرزو، صدائے دل، صدائے درد، شاخِ شجر، ساعتِ غم، موجِ دریائے ہوس، آوازِ جرس، شب

ہجر، سنگِ دنیا، کارِ جنوں، اہلِ دل، حریفِ شکیبائی، اے راحتِ جاں، ساحلِ خواب، آغازِ سفر، راہِ وفا، اذانِ صبح، اہلِ جنوں، متاعِ جاں، شبِ تنہائی، وحشتِ دل، سرِ جادۂ دل، غرورِ تشنہ لبی وغیرہ۔

شہریار کی شاعری میں 'ہلکے طنز' کی آمیزش سے بڑی معنویت پیدا ہوجاتی ہے۔ مزید برآں آہنگ میں کہیں تھکن تو کہیں حرکت وسکون کا احساس ہوتا ہے۔ گویا ان کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جن پر تھکن کا گمان ہوتا ہے اور بہت سے ایسے اشعار بھی ہیں جن سے حرکت وسکون نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ ان کے یہاں کہیں بیزاری اور مایوسی ہے تو کہیں محرومی اور احساسِ زیاں بھی۔ شہریار کا لہجہ کہیں اتنا دھیما نظر آتا ہے کہ ان کے منشا کو سمجھا نہیں جاسکتا اور کہیں لہجہ اتنا سادہ اور سچا نظر آتا ہے کہ ان کے منشا کے ادراک کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ تراکیب کا وہ اتنا کم استعمال کرتے ہیں کہ کبھی کبھی قاری کو معنوی تہہ داری پر شک وشبہ ہونے لگتا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ غیر مصنوعی طرزِ اظہار اور تراکیب سے عاری اشعار سے ہی ان کی اصل شناخت ہوتی ہے۔ وہ اپنے پسندیدہ استعاروں اور تلازموں سے جس طرح اپنے شعروں میں رنگ آمیزی کرتے ہیں وہ ان کی خاص پہچان ہے۔ وہ خود پر تنقید بھی بڑے حوصلے اور شائستگی کے ساتھ کرتے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

ہلکا طنز:

ہوا سے اُلجھے کبھی سایوں سے لڑے ہیں لوگ
بہت عظیم ہیں یارو بہت بڑے ہیں لوگ

خود پر تنقید:

جنوں کے جتنے تقاضے ہیں بھولے جاتے ہیں
کہ ساتھ وقت کے لو ہم بھی بدلے جاتے ہیں

آہنگ میں تھکن:

تھکنا ہے، ٹھہرنا ہے بہر حال سبھی کو
جی اپنا بھی بھر جائے گا اک روز سفر سے

آہنگ میں حرکت وسکون:

عجیب چیز ہے یہ وقت جس کو کہتے ہیں
کہ آنے پاتا نہیں اور بیت جاتا ہے

محرومی اور احساسِ زیاں:

راتیں لوگو سنو بے کراں ہوگئیں
مشعلیں جتنی تھیں سب دھواں ہوگئیں

چٹانوں کی قید سے دریا اوبھ گئے
گاؤں جزیرے شہر بنے جاتے ہیں سب

شرمندہ دوست ہی سے نہیں شہریار ہم
دشمن سے بھی تو آج پشیماں ہیں بہت

لہجے میں عزم وحوصلہ اور رجائیت:

بڑی بھیانک ساعت آنے والی ہے
آؤ جتن کر دیکھیں شاید ٹل جائے

میں پھر کاغذ کی کشتی پر آتا ہوں
دریا سے کہلا دو ذرا سنبھل جائے

ایک دن آئے گا جب آنکھیں ہی آنکھیں ہوں گی
اور ہر آنکھ میں بیداری کی لذت ہوگی

شہریار کا استفہامیہ اندازِ بیان بھی خوب ہے۔ دراصل سوالیہ لہجے میں تغزل کی لے اور اس کی انفرادیت اور تازگی محسوس کرنے کی چیز ہے۔ چند اشعار خاطر نشان ہوں:

سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے

ہم نے تو کوئی بات نکالی نہیں غم کی
وہ زود پشیمان، پشیمان سا کیوں ہے

جب بھی ملتی ہے مجھے اجنبی لگتی کیوں ہے
زندگی روز نئے رنگ بدلتی کیوں ہے

وہ کون تھا وہ کہاں کا تھا کیا ہوا تھا اُسے
سُنا ہے آج کوئی شخص مر گیا یارو

مجموعی اعتبار سے جب ہم شہریار کے کم وبیش پچاس سالہ شعری سفر پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ بات روشن ہوجاتی ہے کہ 'اسمِ اعظم' سے شہریار کی شاعری کا آغاز سبک آہنگ اور سادگی اظہار سے ہوتا ہے۔ تاہم اضطراب اور جذبات کا عنصر بھی غالب ہے۔ خود اعتمادی اور جرأت اظہار بھی۔ مثلاً یہ ایک شعر دیکھیے:

مانا کہ دوستوں کو نہیں دوستی کا پاس
لیکن یہ کیا کہ غیر کا احسان لیجیے

دراصل 'اسمِ اعظم' کی یہ خوبیاں شہریار کی پوری شاعری میں مل جاتی ہیں۔ لیکن 'اسمِ اعظم' میں شہریار کا جو موہوم سفر ہے وہ ان کے دوسرے مجموعۂ کلام 'ساتواں در' میں بڑی حد تک واضح ہوجاتا ہے۔ اسمِ اعظم میں شہریار کو اپنی منزل کا کچھ پتا نہیں جبکہ 'ساتواں در' میں انھیں احساس ہوجاتا ہے کہ اندھیرا،

تنہائی اور اداسی ان کی منزل کا پتا ہے۔ لیکن اس منزل سے وہ سوال کناں بھی ہیں۔ پہلے 'اسمِ اعظم' کا یہ شعر دیکھیے جس میں شاعر کو اپنی منزل کا پتا نہیں:

کچھ نہیں کھلتا کہ کیوں میرے قدم جاتے ہیں
ایسی منزل کی طرف جس کا پتا کچھ بھی نہیں

اور اب 'ساتواں در' کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

جدھر اندھیرا ہے، تنہائی ہے، اداسی ہے
سفر کی ہم نے وہی سمت کیوں مقرر کی

لیکن یہاں بھی طرزِ استفہام نے ایک سوال تو قائم کر ہی دیا ہے۔

شہریار کے تیسرے مجموعہ کلام 'ہجر کے موسم' میں 'تنہائی'، 'خواب'، 'نیند'، 'شمع'، 'ہجر'، 'وصال' کی خاموش لہریں جو پہلے سست رو تھیں، ان میں رفتار آگئی ہے اور 'خواب کا در بند ہے' میں شہریار نفی سے اثبات کا سفر شروع کرتے ہیں اور جو نور کا منظر ان کی آنکھ میں ہے اس کی حفاظت کی بات کرتے ہیں۔ تاہم وہ اپنے ماضی کی یادوں کو بھی روشن رکھتے ہیں اور وہ یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان کے کمرے میں اب اتنی روشنی آگئی ہے کہ تمام چیزوں کو وہ دیکھ سکتے ہیں۔ شہریار کی شاعری 'نیند کی کرچیں' میں دھوپ اور روشنی سے پوری طرح ڈھل گئی ہے۔ 'نیند کی کرچیں' کی شاعری دراصل خود آگہی اور حقیقتِ حال سے آگاہی کی شاعری ہے۔ سبک بیانی اور نازک کلامی ان کا خاص لہجہ ہے اور جذبات کا عنصر کم کم دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنے قارئین کو چونکانے اور حیرانی میں ڈالنے کے لیے اپنے لب و لہجے کو کبھی بے لگام نہیں ہونے دیتے۔ یعنی انھوں نے لوگوں کو shock کرنے والے لہجہ کا استعمال نہیں کیا ہے۔ وہ سچے اور سادہ انداز میں اپنی بات کہتے ہیں۔ گنجلک اور پیچیدہ پیرایۂ اظہار سے گریز کرتے ہیں۔ گویا تکلف آمیز زبان و بیان ان کے یہاں نہیں ملتا۔ ان کے آہنگ اور موضوع میں تنوع اور فکر میں بڑی کشادگی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے فارسی تراکیب، بوجھل تراکیب اور غیر مانوس الفاظ سے بڑی حد تک احتراز کیا ہے۔ جبکہ شمس الرحمٰن فاروقی کا 'نیند کی کرچیں' کے 'پیش لفظ' میں سارا زور 'متکلم' پر ہے۔ متکلم کے ذاتی اظہار پر ہے۔ متکلم کے ڈرامائی لہجے پر ہے، متکلم کی تنہائی اور متکلم کے خود پر طنز و تنقید پر ہے۔ وہ کبھی متکلم کو 'تجربہ آشنا متکلم' اور کبھی 'سرد و؟ گرم چشیدہ متکلم' کہتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کہیں 'متکلم کی آنکھ' کا ذکر کرتے ہیں مگر باقی خوبیاں نہ جانے کیوں ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ دراصل نظریاتی حصار سے وہ باہر نہیں نکل سکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شہریار کی شاعری کو ہم نہ تو قدیم میزان تنقید پر پرکھ سکتے ہیں اور نہ ہی جدید میزان تنقید پر۔ ان کا موازنہ نہ میر و غالب سے بھی نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اقبال، فیض و فراق سے ہی ان کا تقابل ممکن ہوگا۔ انھیں روایت سے انحراف کا شاعر بھی نہیں کہا جاسکتا اور نہ ہی انھیں روایت سے کاٹ کر ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ انھیں نہ تو صرف قنوطی شاعر کہہ کر ان کی قدر و قیمت کو کم کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی صرف رجائی شاعر کہہ کر ان کی انفرادیت کو نمایاں کیا جاسکتا ہے۔ انھیں صرف بامقصد شاعر کہنا بھی مناسب نہیں اور نہ ہی انھیں خالص ہیئتی شاعر کا نام ہی دیا جاسکتا ہے۔ وہ نہ تو صرف داخلیت کے شاعر ہیں اور نہ خارجیت کے شاعر اور نہ ہی صرف مسرت اور بصیرت کے شاعر۔ بلکہ ان کے یہاں ہر طرح کی آمیزش دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ زمان و مکان اور زندگی اور زمین کے شاعر ہیں اور ان کے یہاں زندگی، فطرت اور جمالیات کے تمام شیڈس مل جاتے ہیں۔ کشادگی اور تازگی ان کی شاعری کے امتیازات ہیں۔ ان کے طرز تخاطب میں 'ہم لوگ'، 'لوگو'، 'یارو'، 'دوستو'، 'ہم سفرو'، 'اہلِ جہاں'، 'اہلِ وفا'، 'اے اہلِ جنوں'، 'اہلِ دل'، 'اے دلِ سادہ'، 'اے موجِ بلا' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ وہ میں، مجھ، مجھے، میرے، میری، تم، تیرے، تیری، وہ، اُسے، اُس، اپنا، ہماری' کا صیغہ تواتر سے استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ شہریار کی شاعری پر کسی لیبل کو چسپاں نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس شاعری کو وسیع تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ شہریار کی شاعری ہر دور اور ہر عصر کی شاعری ہے جسے قید و بند پسند نہیں۔ دراصل شہریار کی بہترین شاعری کی خوبیاں اور کمیاں جن کا ذکر غزلوں کے حوالے سے اوپر ہوا، وہ ان کی نظموں میں بھی اُسی شدومد سے ملتی ہیں۔ ساحر لدھیانوی کے شعری مجموعہ 'تلخیاں' کے آغاز میں ہی یہ شعر درج ہے:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

شہریار کی شاعری اس شعر سے آگے کی پرواز معلوم ہوتی ہے۔ یہ شاعری صرف دنیا کے تجربات و حوادث کو ہی آئینہ نہیں دکھاتی بلکہ تہذیب و اقدار، زندگی، فطرت اور جمالیات کے دوسرے گہرے متعلقات اور اسرار و رموز سے بھی ہمیں آشنا کراتی ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے شہریار والے اپنے مضمون کے اختتام پر بہت ہی عمدہ بات کہی ہے۔ وہ یہ کہ: "جہاں صنفِ غزل سے ہماری محبت کا پتا چلتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غزل بھی اس کے بدلے میں بڑی فیاضی سے کام لیتی ہے اور ہمیشہ ہماری محبت کو کئی گنا بڑھا کر ہمیں واپس کر دیتی ہے۔" اور مجھے یہاں یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ شہریار نے غزل کے اس genius سے بھرپور تخلیقی معاملہ کیا ہے اور اپنے شعری تفاعل سے معاصر اردو شاعری میں ایک ایسی شعری و معنیاتی جہت کا اضافہ کیا ہے جو شہریار اور فقط شہریار سے نسبت رکھتی ہے۔ ■■

نقد و نظر

کیفی اعظمی کی معنویت

آفاق عالم صدیقی

کیفی اعظمی ترقی پسند تحریک کے اکابرین شعرا میں سے ایک تھے۔ ان کی شاعری پر بات شروع کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کے پس منظر پر تھوڑی سی روشنی ڈالی جائے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا تبدیلی کے نئے امکانات سے روشناس ہوئی اور دنیا کی کئی حکومتوں نے اشتراکی نظام کو قبول کر لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سائنس و ٹکنالوجی کی برکت سے انسانوں کے سارے خواب سچ ہوتے نظر آنے لگے تھے۔ اس وقت ایشیا میں بھی بیداری کی لہر پیدا ہو چکی تھی۔ لیکن ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ گو کہ آزادی کی جد و جہد شروع ہو چکی تھی۔ لیکن اب تک کوئی واضح لائحہ عمل مرتب نہیں ہوا تھا۔ یوروپی قربت کی بدولت ہندوستان کے نوجوان دنیا میں برسرِ پیکار انقلابی تحریکات سے نہ صرف یہ کہ واقف ہو چکے تھے، بلکہ ذہنی طور پر ان تحریکات سے قربت بھی محسوس کر رہے تھے۔ لیکن عملی اقدام کا طریقہ کار ابھی تک متعین نہیں ہوا تھا۔ اس لئے کوئی راستہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایسی صورت حال میں گاندھی جی اپنے بے پناہ قائدانہ صلاحیت کے ساتھ ہندوستان کے افق پر نمودار ہوئے اور انہوں نے اہل وطن کو قومیت کا نعرہ دے کر اپنا آندولن شروع کر دیا۔ گاندھی جی اور ان کے رفقا کار کی کوشش سے دھیرے دھیرے ہندوستان میں آزادی کی تحریک ایک مثبت سمت میں پیش رفت کرنے لگی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک میں عام بیداری کی لہر پیدا ہو گئی۔ ادھر 1930 کے بعد ایک بار پھر فسطائی قوتوں نے زور پکڑ لیا اور قہرناکی کا وہ منظر پیش کیا کہ انسانیت درد سے کراہ اٹھی۔ اس وقت دنیا کے گوشے گوشے میں جہاں کہیں بھی امن، مساوات اور آزادی کے متوالے تھے، وہ صف آرا ہو گئے اور ثقافت بچاؤ کی مہم شروع ہو گئی۔ یہی وہ مہم تھی جس کی برکت سے دنیا کی تمام زبانوں میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔

جب ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو اس وقت ہندوستان آزادی کی جد و جہد میں لگا ہوا تھا اور اس کی ساری قوتیں آزادی کے حصول کی کوشش میں صرف ہو رہی تھی۔ ایسے حالات میں ادب و فن کا ان اثرات سے بچنا ناممکن تھا، چنانچہ اس عہد کا سارا ادب آزادی کی جد و جہد کا آئینہ بردار بن گیا۔ اس عہد کے زیادہ تر فنکار جاگیردارانہ نظام کے پروردہ تھے۔ اس لئے ان کی شخصیت اور مزاج میں بھی زندگی کی کیف آور رنگینی اور رومانیت رچی بسی ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسندی کے ابتدائی اعہد کے سارے فنکاروں کے یہاں رومانیت کا غلبہ پایا جاتا ہے۔ اگر ہندوستان میں ترقی پسندی کے اس جوش و خروش اور شوق و اخلاص سے پروان نہیں چڑھایا جاتا تو بہت ممکن تھا کہ اس عہد کے بیشتر فنکار رومانیت کے شکار ہو کر رہ جاتے اور فکری و عملی فراریت کا ایسا نمونہ پیش کرتے کہ خوش آئند زندگی کا خواب ہی رہ جاتا۔ یہ ترقی پسند تحریک کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے جاگیردارانہ نظام کے پروردہ رومانی فنکاروں کو زندگی کے حقیقی دھارے سے جوڑا اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو ارضی صداقت سے ہم آہنگ کر کے ملک اور عوام کے مسائل کا ترجمان بنایا۔

یہی رومانی فنکار جو اپنی تخلیقیت خیزی کی ساری قوتیں رومانی جذبات کی عکاسی میں صرف کر رہے تھے۔ جب پلٹ کر حب الوطنی کے ساز پر انقلاب و بغاوت کے رجز گانے پر آمادہ ہوئے تو جوش عمل کا ایسا ولولہ پیدا کر دیا گیا کہ انگریزی سامراجیت کے ایوان لرز اٹھے اور آخر کار انہیں ہندوستان چھوڑنا پڑا۔

کیفی اعظمی جد و جہد آزادی کے نغمہ سراؤں کے آخری سرتاج تھے۔ مخدوم اور سردار جعفری کی طرح کیفی اعظمی بھی ایسے فعال، نڈر، اور باحوصلہ شاعر تھے، جنھوں نے غریب و محنت کش انسانوں کی کسمپرسی اور جد و جہد میں نہ صرف یہ کہ عملی حصہ لیا بلکہ کئی محاذوں پر قائدانہ رول بھی ادا کیا۔ یہ اسی عملی اقدام کی حوصلہ مندی تھی جس نے انہیں تاحیات استقلال سے اپنے موقف

پر جمے رہنے کی قوت عطا کی۔

کیفی اعظمی کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ کلی طور پر ایک عوام دوست شاعر تھے۔ وہ عوام سے اٹھے اور تا عمر عوام ہی کی خدمت گزاریوں میں لگے رہے۔ ان کا اپنا ایک واضح نظریہ تھا۔ وہ تخلیق شعر کے لئے اپنا ایک معیار وضع کر چکے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خود اپنی وضع کردہ کسوٹی پر 'آوارہ سجدے' تک پہنچنے کے بعد ہی کھرے اترے۔ ان کی تخلیقی سوچ کے سارے سوتے مادیت اور رومانیت کے چشمے سے پھوٹے ہیں۔ لیکن ہم رومانیت کو ان کی تخلیق سے الگ کرنے کے بعد بھی (جسے انہوں نے خود بھی بعد میں الگ کر دیا تھا) یہ کہہ سکتے ہیں کہ تصوراتی اور رومانی افکار و خیالات سے مادی افکار و خیالات زیادہ مستحسن ہوتے ہیں۔ کیونکہ رومانیت خود تعیشی وخود فریبی اور نا آسودہ احساسات کی جھوٹی تسکین کا سبب بنتی ہے۔ وہ بھی آسودگی کی صورت میں۔ جبکہ مادی افکار سے قوم و سماج کے تمام تر سروکار کو تقویت ملتی ہے اور اس کی برکت سے سماج و معاشرے میں اصلاح و فلاح اور خوشحالی کی نئی راہیں نکلتی ہیں اور تہذیب و ثقافت کی ترقی کے نئے باب کھلتے ہیں۔ ساتھ ہی زندگی خوب سے ہے خوب تر کہاں کی جستجو میں شادکام ہوتی ہے۔ معین احسن جذبی کا ایک شعر ہے:

جب جیب میں پیسے بجتے ہیں جب پیٹ میں روٹی ہوتی ہے
اس وقت یہ ذرہ ہیرا ہے اس وقت یہ شبنم موتی ہے

اور سچ بھی یہی ہے کہ جہاں افلاس کی ستم کاری ہو، بھوک بیماری اور مارا ماری ہو اور بے روزگاری ہو، فرقہ وارانہ منافرت کی آتش باری ہو، استحصالی نظام کی شاطرانہ ریاکاری ہو۔ مفاد پرستوں کی زرخرید سیاست کی کینہ پرور مکاری ہو۔ ہر سو ظلم کی چکی میں پستی عوام کی آہ و زاری ہو، یعنی موت آسان اور زندگی بھاری ہو وہاں ہم ایک صحت مند، آسودہ، پر امن اور مہذب زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہی وہ صورت حال تھی جس کی وجہ سے امن، مساوات اور آزادی کے متوالے ترقی پسند فنکاروں نے داخلیت کی سطحی پکاروں پر کان دھرنے سے انکار کر دیا اور اپنی ساری تخلیقی توانائی عوام اور ادب کے رشتے کو اٹوٹ بنانے میں صرف کر دی۔ ادب اور عوام کا یہی وہ فطری رشتہ تھا، جس نے عوام کو حوصلہ مندی کی زمین پر لا کھڑا کر دیا، جس پر چل کر ہم آج زندگی کے بہترین خواب بُننے کے قابل ہوئے ہیں۔

کیفی اعظمی ایک زمیندار گھرانہ کے چشم و چراغ تھے۔ زمیندارانہ نظام کے پروردہ ہونے کی وجہ سے ان کے مزاج میں بھی رومانیت رچ بس گئی تھی۔ وہ اپنے ماحول اور عہد کے تناظر میں انیس و دبیر کی مرثیہ گوئی سے متاثر ہو کر جب شاعری کے میدان میں سرگرم عمل ہوئے تو ان ہی کے انداز میں خطیبانہ طنطنہ دکھانے لگے۔ اور پھر بہت جلد وہ رومانی شاعری کی نرم و گرم آغوش میں سما گئے۔ ان کی رومانی شاعری بڑی پر تاثیر اور دلکش ہے۔ اس میں بلا کی شعریت اور نغمگی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے حسن و عشق کے لوازمات کو اس خوبی اور دلکشی سے شعر میں ڈھالا ہے کہ اس کی اثر انگیزی دوبالا ہو گئی ہے۔ اب تک ان کی شاعری کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ 'جھنکار'، 'آخر شب' اور 'آوارہ سجدے'۔ 'جھنکار' میں جوش کا سا خطیبانہ لہجہ پایا جاتا ہے۔ جو شاعری کی نزاکت اور لطیف احساسات کی نفاست کو دبا کر شوریدگی، شعلگی اور جذبات کی برانگیختگی کی عکاسی کرتی ہے۔ جبکہ 'آخر شب' کی شاعری روایت، رومانیت اور شعریت کا ایسا دل پذیر اور شیریں آمیزہ ہے کہ پینے والا مدہوش ہو جاتا ہے۔ اس پر ایک خاص قسم کی سرمستی و سرشاری چھا جاتی ہے۔ اس شاعری میں اتنی دلکشی، رعنائی اور غنائیت ہے کہ یہ قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اگر ایک لمحہ کے لئے ہم ترقی پسند تحریک کے مقاصد کو بھلا دیں اور یہ بات ذہن سے نکال دیں کہ کیفی اعظمی کس قبیل اور کس رجحان کے شاعر ہیں تو بلا تکلف ہم 'آخر شب' کی شاعری کو ان کی تخلیقی زندگی کا بے بہا سرمایہ مان لیں گے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر ترقی پسندی والی شاعری امتداد زمانہ کے سبب مٹ گئی یا از کار رفتہ ہو گئی تو یہی شاعری کیفی اعظمی کو زندہ جاوید رکھنے کے لئے کافی ہوگی۔ کیونکہ اس قبیل کی شاعری میں ان کے یہاں بعض ایسی خوبصورت نظمیں پائی جاتی ہیں کہ ان کی مثال بھی مشکل ہی سے ملتی ہے۔ نقش و نگار، تصور، مجبوری، احتیاط، پشیمان، بوسہ، اندیشے، ملاقات، نرسوں کی محافظ، تم، اور اسی طرح کی بعض دوسری نظمیں ان کی رومانی شاعری کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان نظموں میں جو دلکشی، رعنائی، غنائیت، کیفیت، سراپا نگاری، تازگی اور خواب ناکی پائی جاتی ہے۔ وہ انہیں بہترین رومانی نظموں کے انتخاب میں شامل ہونے کا استحقاق فراہم کرتی ہے۔ کچھ نظموں کی جھلکیاں ملاحظہ فرمائیں۔

اے بنت مریم گنگنا اے روح نغمہ گائے جا
جیسے شگوفوں میں سما کر گنگناتی ہے ہوا
جیسے خلا میں رات کو گھونگھرو بجاتی ہے ہوا

نغمگی

حلاوتوں کی تمنا، ملاحتوں کی مراد
غرور کلیوں کا، پھولوں کا انکسار ہو تم
جسے ترنگ میں فطرت نے گنگنایا ہے

وہ بھیرویں ہو وہ دیپک، ہو وہ ملہار ہو تم

تم

کلی کا روپ پھول کا نکھار لے کر آئی تھی
وہ آج گلخزانہ بہار لے کر آئی تھی
جبین تابناک میں کھلی ہوئی تھی چاندنی
چاندنی میں عکس لالہ زار لے کے آئی تھی
تمام رات جاگنے کے بعد چشم مست میں
یقین کا رس امید کا خمار لے کے آئی تھی
گلابی انکھڑیوں کی سحر کاریوں میں خندہ زن
غرور فتح و رنگ اعتبار لے کے آئی تھی
وہ سادہ سادہ عارضوں کی شکریں ملاحتیں
ملاحتوں میں سرخی انار لے کے آئی تھی

ملاقات

یہ کس طرح یاد آ رہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو
کہ جیسے سچ مچ نگاہ کے سامنے کھڑی مسکرا رہی ہو
یہ جسم نازک، یہ نرم بانہیں، حسین گردن، سڈول بازو
شگفتہ چہرہ، سلونی رنگت، گھنیرا جوڑا، دراز پلکیں
نشیلی آنکھیں، رسیلی چتون، دراز پلکیں، مہین ابرو
تمام شوخی، تمام بجلی، تمام مستی، تمام جادو
ہزاروں جادو جگا رہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو

تصور

بند کمرے میں جو خط میرے جلائے ہوں گے
ایک اک حرف جبیں پہ ابھر آیا ہوگا
میز سے جب مری تصویر ہٹائی ہوگی
ہر طرف مجھ کو تڑپتا ہوا پایا ہوگا

اندیشے

یہ تتلیاں جنہیں مٹھی میں بھینچ رکھا ہے
جو اڑنے پائیں تو الجھیں کبھی نہ خاروں سے
تری طرح کہیں یہ بھی نہ بجھ کے رہ جائیں
تپش نچوڑ نہ اڑتے ہوئے شراروں سے

نرسوں کی محافظ

کیفی اعظمی کی رومانی شاعری سے یہ مثالیں صرف اسی لئے پیش کرنی ضروری نہیں تھی کہ ان کی شاعری کے لحن کی تبدیلی کا اندازہ لگایا جا سکے، بلکہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ وہ حضرات جو انہیں محض کمیٹڈ شاعر کہہ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں بھی اس طرف متوجہ کیا جا سکے۔ بعض ناقدان ادب بڑی بے رحمی سے یہ فرمان سنا دیتے ہیں کہ کیفی اعظمی اور اس قبیل کے دوسرے ترقی پسند شاعروں کی شاعری اسی عہد اور ماحول کے لئے موزوں تھی، جس میں وہ تخلیق ہوئی تھی۔ اب وہ فضا یکسر بدل چکی ہے۔ اس لئے ان کی شاعری کا جواز بھی ختم ہو گیا۔

میں اس قسم کی فکر رکھنے والوں سے یہ کہنا چاہوں گا کہ اگر آپ ادب کو روایتی جمالیاتی حسیات کی عینک کے بغیر دیکھنے کے روادار نہیں ہیں تب بھی آپ کیفی اعظمی کی شاعری کو ادب نکالا نہیں دے سکیں گے۔ کیونکہ وہ اپنی ابتدائی زندگی میں خاصی مقدار میں اس قسم کی شاعری کر چکے ہیں۔ ان کی متذکرہ بالا نظموں کے ٹکڑوں کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی شاعری میں صنف شاعری کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں، جن کی برکت سے شاعری کے رخسار پر جمالیات کا غازہ دمکنے لگتا ہے تو اس کے ہونٹوں پر لطف و انبساط اور دلربائی کی یاقوتی سرخی لہریں لینے لگتی ہے۔ نظموں کے ان ٹکڑوں پر توجہ کیجئے اور ان کی لفظیاتی و صوتی حسن و آہنگ کو محسوس کرنے کی کوشش کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان میں شاعرانہ الفاظ کی وہ بہتات ہے کہ اکثر شاعر اس پر رشک کر سکتے ہیں۔

روح نغمہ کا گائے جانا، ہوا کا شگوفوں میں سما کر گنگنانا، گھٹا کا خلا میں رات کو گھونگھروں بجانا۔ حلاوتوں کی تمنا میں ملاحتوں کی مراد کا پالنا، کلیوں کے غرور کا پھولوں کے انکسار میں ظہور پانا، فطرت کا ترنگ میں آ کر اس طرح نغمہ ریز ہونا کہ بھیرویں، ملہار اور دیپک کا سلگ اٹھنا، کلی کا روپ اور پھول کا نکھار لے کر گل خزانہ بہار بن کر آنا، جبین تابناک میں چاندنی کا کھلنا اور پھر اس چاندنی میں عکس لالہ زار کا مسکرانا، تمام رات جاگنے کے بعد بھی چشم مست میں یقین کے رس اور امید کے خمار کا لہریں لینا، گلابی انکھڑیوں کی سحر کاریوں میں محبوب کا خندہ زن ہونا، سادہ سادہ عارضوں کی ملاحتوں میں شکر کی حلاوتوں کا پایا جانا، ملاحتوں میں سرخی انار کا نمایاں ہونا اور پھر ایک قیامت سراپا محشر خیز حسن و انداز کی تصویر کا اس طرح مجسم ہونا کہ ایک ایک عضو کا حسن نمایاں ہو جائے اور جزئیات نگاری اس طرح ابلاغ پائے کہ طبیعت شوق دید میں تخیل کے جہان آباد کر لے۔ مثلاً جسم نازک، نرم بانہیں،

حسین گردن، سڈول بازو، شگفتہ چہرہ، سلونی رنگت، گھنیرا جوڑا، دراز گیسو، نشیلی آنکھیں، رسیلی چتون، دراز پلکیں، مہین ابرو اور ان تمام صفات وخوبی کا یکجا ہو کر محبوب کی صورت میں جلوہ گر ہو کر اپنی شوخی و مستی سے جادو جگانا اور پھر انجام کار عشق ناکام کی صورت میں بند کمرے میں خط کا جلایا جانا، اک اک حرف کا جبین ناز پر ابھر آنا، میز سے محبوب کی تصویر کا ہٹایا جانا اور پھر ہر طرف کمرے میں عاشق کے تڑپنے کا منظر اور اڑتے شراروں سے تپش نچوڑنے کا عمل، یہ سب کے سب الفاظ اور ان سے تخلیق ہونے والے امیجز کسی بھی شاعر کے کلام کو معتبر بنا سکتے ہیں۔

یہ تو ہوا کیفی اعظمی کی شاعری کا وہ پہلو جو انہیں ایک کامیاب شاعر بناتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کس طرح ان کی شاعری بتدریج ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی ترقی پسندی کی معراج تک پہنچی۔ کیفی اعظمی جب رومانیت اور شعریت کی دنیا سے نکل کر اشتراکیت اور ارضیت کی پکاروں کی حقیقی دنیا میں داخل ہوئے تو ان کا لہجہ بالکل بدل گیا۔

مرے مطرب نہ دے للہ مجھ کو دعوت نغمہ
کہیں ساز غلامی پر غزل بھی گائی جاتی ہے

فکری اور نظریاتی قبولیت کا یہی وہ بدلتا ہوا زاویہ تھا جس نے کیفی کی تخلیقی حسیات سے محبوب کے جمال کی رعنائی کو رخصت کیا اور ان کی تخلیقی روح کو ملک و قوم کی حالت زار کی عکاسی کا درس دیا۔ اور پھر کیفی اعظمی پوری زندگی عوامی بیداری، اشتراکیت کی بحالی، سوشلسٹ سماج کے قیام کے لئے عوامی ذہن کی آبیاری کرنے میں اس طرح جٹ گئے کہ خود کو بھی فراموش کر دیا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ افلاس و غلامی کے خلاف بغاوت کی علم برداری کرتے ہوئے ایک شاعر سے ایک جانباز سپاہی بن گئے۔ انہوں نے 'آوارہ سجدے' کے دیباچے میں خود ہی لکھا ہے:

''میری شاعری نے جو فاصلہ طے کیا ہے، اس میں وہ مسلسل بدلتی اور نئی ہوتی رہی ہے (بہت آہستہ ہی سہی) آج وہ جس موڑ پر ہے۔ اس کا نیا پن بہت واضح ہے۔ یہ رومانیت سے حقیقت پسندی کی طرف کوچ کا موڑ ہے۔''

یہ حقیقت ہے کہ ان کی شاعری میں تبدیلی رفتہ رفتہ آئی ہے۔ ان کے شروع کے حقیقت پسندانہ کلام پر بھی رومانیت کے سائے منڈلاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جس سے وہ رفتہ رفتہ چھٹکارا پانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے
گوشے گوشے میں سلگتی ہے چتا تیرے لئے
فرض کا بھیس بدل لیتی ہے قضا تیرے لئے
قہر ہے تیری ہر اک نرم ادا تیرے لئے
ہاں اٹھا جلد اٹھا پائے مقدر سے جبیں
میں بھی رکنے کا نہیں میں کبھی رکنے کا نہیں
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

عوامی بیداری اور عورت کی زبوں حالی کے پس منظر میں لکھی گئی کیفی اعظمی کی یہ نظم جس میں عورت کو بغاوت پر اکسایا جا رہا ہے، اتنی ٹھوس نہیں ہے جتنی عموماً ترقی پسند نظمیں ہوتی ہیں۔ اس نظم کے لہجہ میں شاعرانہ پن پایا جاتا ہے۔ اس نظم میں شعریت، لطافت اور بہت حد تک نزاکت بھی پائی جاتی ہے۔ مگر ان کا یہ شاعرانہ لہجہ ہر جگہ قائم نہیں رہتا ہے۔ وقت، حالات اور واقعات و حادثات کے تحت ان کے لہجے میں کرختگی، تلخی اور کسی حد تک برہنہ گفتاری پیدا ہو جاتی ہے اور وہ غزلوں کے اشعار میں بھی اپنے جذبات کو نہیں روک پاتے ہیں۔

بیلچے لاؤ کھودو زمیں کی تہیں
میں کہاں دفن ہوں کچھ پتہ تو چلے

کیفی اعظمی ایک سچے اور ایماندار اشتراکی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے اشتراکی ہونے پر تمام عمر فخر کرتے رہے۔ یہ اشتراکیت اور مارکسیت سے محبت ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ کبھی روس کی عظمت کا گیت گانے لگتے تھے تو کبھی اسٹالن کو ہیرو بنا دیتے تھے۔ وہ مارکسیت و اشتراکیت کے متوالوں کو اپنا آئیڈیل سمجھتے تھے اور روس و چین کو اشتراکی حکومت کو مثالی طاقت سمجھتے تھے۔ اسی زمانہ میں چین نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا، جس سے اشتراکیت کے متوالے ہندوستانیوں کو سخت صدمہ پہنچا۔ اس زمانہ میں کیفی فلم سے منسلک تھے۔ ان کا گیت

''کر چلے ہم فدا جان و تن ساتھیو
اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو

اسی زمانہ کی یادگار ہے۔ جب کمیونسٹ اکائی دو دھڑوں میں بٹ گئی تو کیفی اعظمی بھی ٹوٹ گئے اور ان کے سجدے آوارہ ہو گئے۔ اسی زمانہ میں انہوں نے 'آوارہ سجدے' جیسی نظم لکھی:

راہ میں ٹوٹ گئے پاؤں تو معلوم ہوا
جز مرے اور مرا راہ نما کوئی نہیں

کیفی اعظمی کمیونسٹ اور اشتراکی نظام کے حامی ایک مخلص، عوام دوست اور محب وطن انسان و شاعر تھے۔ فرقہ پرستی، تعصب زدگی، مذہبی انتہا پسندی اور منافقت کی کمینگی و کم بختی انہیں سخت ناپسند تھی، وہ بڑے یقین اور اعتماد

سے کہا کرتے تھے کہ:

''غلام ہندوستان میں پیدا ہوا، آزاد ہندوستان میں بوڑھا ہوا اور سوشلسٹ ہندوستان میں مرجاؤں گا۔''

ان کو پختہ یقین تھا کہ ہندوستان میں اشتراکیت کی شجر کاری جوں جوں بڑھتی جائے گی، ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی خوشبو پھیلتی جائے گی اور ایک دن تمام اہل وطن اس خوشبو کی سرشاری سے ایسے مست ہوجائیں گے کہ اشتراکیت اور مساوات کی پر بہار فضا پیدا ہوجائے گی۔

لیکن ان کا یہ خوبصورت خواب ان کی زندگی ہی میں ریزہ ریزہ ہوکر بکھر گیا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے مفاد پرست سیاست دانوں کو اشتراکیت پر مذہبیت کو فوقیت دیتے ہوئے دیکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اشتراکیت کا نوخیز پودا سوکھ گیا۔ اور امن وامان کے خواب سجونے والی زمین پر فسادات کے شعلے بھڑک اٹھے۔ ان واقعات وحادثات نے انہیں بہت گہرا صدمہ پہنچایا۔ اور وہ آوارہ سجدے، بہروپنی، اور موت جیسی نظمیں لکھنے پر مجبور ہوئے۔ ان کی طویل نظم 'خانہ جنگی' 1947 کے فساد کی منہ بولتی تصویر ہے جو کیفی کے جذبات واحساسات کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ یہ نظم آج کے فرقہ وارانہ ماحول کو بھی خوب درشاتی ہے:

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی
سوکھتی ہے پڑوسیوں سے جان
دوستوں پر ہے قاتلوں کا گمان
شہر ویراں ہیں بند ہیں بازار
رینگتا ہے سڑک پہ گرم غبار
رہزنی داخل جہاد نہیں
فطرت شرع میں فساد نہیں
کہہ کے تکبیر باندھ کے نیت
ماؤں بہنوں کی لوٹ لی عزت
گیت گاکے مہاتماجی کے
پیٹ ماؤں کے چاک کر ڈالے
لاش علم وادب کی حکمت کی
لاش کلچر کی آدمیت کی
اے وطن اس قدر اداس نہ ہو
اس قدر غرق رنج ویاس نہ ہو

کیفی اعظمی کے یہاں قنوطیت نہیں رجائیت پائی جاتی ہے۔ یہی وہ خوبی ہے جو انہیں منفعل ہونے سے بچاتی ہے۔ تخلیقی سطح پر کیفی اعظمی کا ادب میں یہ المیہ رہا ہے کہ انہیں کسی رجحان کے ناقد نے دل سے قبول نہیں کیا۔ حد تو یہ ہے کہ بعض اوقات ترقی پسندوں نے بھی ان سے عدم دلچسپی کا اظہار کیا۔ خود تنقیدی برادری کے بہت سے نقادوں نے اپنی تن آسانی کے لئے ان کی بعض ہنگامی نظموں کا سرسری جائزہ لے کر انہیں کمیٹڈ کا سرٹیفکیٹ پکڑا کر جان چھڑانے کی عاجلانہ کوشش کی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ ادبی رویہ تنقید کے کس خانے میں فٹ بیٹھتا ہے۔ ہم جان چکے ہیں کہ اگر وہ چاہتے تو اپنی 'آخر شب' کی شاعری کے ساتھ جی لیتے اور ادب میں وہ مقام پالیتے جو کسی بھی شاعر کے لئے معیاری اور منفرد ہوتا ہے۔ لیکن انہوں نے ملک وقوم کی حالت زار کے پیش نظر اپنے تمام تر رومانی رویے کو یکسر مسترد کردیا۔ تو کیا ہمیں عوامی ہمدردی اور وقت کی پکاروں کے حامل اس رویہ کی تکذیب پوری طرح ذہن نشین ہوجانی چاہئے کہ جمالیاتی اور رومانی احساسات سے کہیں زیادہ مشکل اور مفید سماجی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے سماجی شعور کو تخلیقی احساسات کی تہذیب میں حل کر کے وقت کے تقاضوں کی تکمیل کا حوصلہ مندانہ ثبوت فراہم کیا ہے جو سب کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ درست ہے کہ ان کی شاعری میں جب مقصدیت اپنی پوری شوریدگی کے ساتھ شامل ہوگئی تو ان کے یہاں سے شعریت، لطافت اور نزاکت رخصت ہوگئی۔

شاعری خطاب اور منشور بن گئی۔ اور ان کی بعض نظمیں سیاسی تجیم کا منظوم ترجمہ محسوس ہونے لگی۔ لیکن قومی دردمندی بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ اگر قومی دردمندی کی کوئی اہمیت ہے تو یقیناً ان کی اس قبیل کی شاعری کی بھی اہمیت ہے۔

لٹنے ہی والا ہے دم بھر میں حکومت کا سہاگ
لگنے ہی والی ہے جیلوں دفتروں تھانوں میں آگ
مٹنے ہی والا ہے خوں آشام دیوزر کا راج
آنے ہی والا ہے ٹھوکر میں الٹ کر سر سے تاج
چھٹنے ہی والی ہے ظلمت پھکنے ہی والا ہے صور

رفتہ رفتہ کیفی اعظمی نے تخلیقی سطح پر سنگلاخ زمینوں پر چلنے کی عادت ڈالی، وہ رومان پرور فضا سے باہر آ گئے۔ اب انہیں ہوا کا خلا میں گھونگھرو بجانا اتنا متوجہ نہیں کرتا ہے، جتنا زمین پر بسنے والے عوام کی دردانگیز کراہ متوجہ کرتی ہے۔ اب ان کی ساری توجہ اپنے آس پاس کی جیتی جاگتی دنیا اور اس میں آباد انسانوں پر مرکوز ہوگئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ان کی شاعری میں عام لوگوں

کا ہجوم ہمیں دور ہی سے نظر آتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہجوم کیفی کا دیوانہ ہے۔ جواُن کی معیت میں بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

الٹ کر ایک ٹھوکر میں ستم کا راج رکھ دیں گے
اٹھا کر اپنی پستی کو سرِ معراج رکھ دیں گے
وہ اک گل کی حکومت تھی کہ گلشن لٹ گیا سارا
ہم اب کے غنچے غنچے کی جبیں پر تاج رکھ دیں گے

چلو وادیو، ساحلو، دلدلو
چلو معدنو، کھیتیو، زلزلو
بغاوت کا پرچم اڑاتے چلو

نشانات ستم تھرا رہے ہیں
حکومت کے علم تھرا رہے ہیں
غلامی کے قدم تھرا رہے ہیں
غلامی اب وطن سے جا رہی ہے
اٹھو دیکھو وہ آندھی آرہی ہے

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اٹھیں میں بھی اٹھوں تم بھی اٹھو تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

سماجی شعور کی یہی بالیدگی اور آزادی کے لئے بغاوت کے لحن میں گایا گیا انقلاب کا یہی رجز اور حب الوطنی کی یہی سرشاری کیفی کی شاعری کا لہو اور ان کی زندگی کا مقصود ومنہاج تھا۔ ان کی طبیعت میں چونکہ شعریت رچ بس گئی تھی۔ اس لئے یہ استثنائے چند جب وہ پارٹی لائن کے لئے خالص مقصدی شاعری کرتے ہیں تب بھی ان کے یہاں شعریت پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ دوسری اہم اور خاص بات یہ ہے کہ دوسرے فنکاروں کی طرح اشتراکیت کیفی کے لئے محض ایک نظریہ نہیں تھا۔ اشتراکیت تو ان کی زندگی کا ماحصل بن گیا تھا۔ اشتراکی نظریہ کا یہی وہ فطری انجذاب تھا جس نے ان کی شاعری کو شعری تہذیب کے دائرہ سے خارج نہیں ہونے دیا۔

کیفی اعظمی نے جس اشتراکی ہندوستان کا خواب دیکھا تھا وہ پورا نہیں ہوا۔ اس پر سے ستم یہ ہوا کہ جس فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے انہوں نے اپنا خون جگر جلایا تھا، وہ بھی بیکار ہو گیا اور اپنی زندگی کے آخری ایام میں بابری مسجد کے انہدام کی شکل میں فرقہ پرستی کا ننگا ناچ بھی دیکھنا پڑا۔ انہوں نے بابری مسجد کی شہادت پر جو نظم لکھی ہے وہ بھی ان کی موضوعاتی نظموں میں ایک امتیازی پہچان رکھتی ہے۔

رقص دیوانگی آنگن میں جو دیکھا ہوگا
6 دسمبر کو شری رام نے سوچا ہوگا
اتنے دیوانے کہاں سے مرے گھر میں آئے
تم نے بابر کی طرف پھینکے تھے سارے پتھر
ہے مرے سر کی خطا زخم جو سر میں آئے
رام یہ کہتے ہوئے دوار سے اٹھے ہوں گے
راجدھانی کی فضا آئی نہیں راس مجھے
6 دسمبر کو ملا دوسرا بن باس مجھے

کیفی اعظمی ایک باعمل، باکردار اور سچے فنکار وشاعر تھے۔ وہ اپنی شاعری میں جن باتوں کا اعادہ کرتے تھے، ان پر خود بھی عمل پیرا ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری اور ان کی زندگی میں گہرا ربط پایا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں حتی المقدور اپنے عہد کی روداد کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ کیفی کے بعض ہم عصروں نے کیفی پر الزام لگایا ہے کہ کیفی بہت ہی موقع پرست اور بہت حریص انسان تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ کیفی اتنے چالاک اور ہوشیار تھے کہ انہوں نے شہرت اور اعزاز واکرام کے ساتھ ساتھ پیسے کمانے کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اگر ہم اس قسم کی باتوں کو سچ مان لیں تب بھی ان کی شخصیت پر کوئی حرف نہیں آتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے جو اعزاز واکرام اور شہرت حاصل کی ہے اس سے عوام ہی کو فائدہ پہنچایا۔ اگر وہ شہرت نہیں حاصل کر پاتے تو ان کا آبائی گاؤں مجواں دھول اور تاریکی سے باہر نکل کر ترقی وخوشحالی کی راہ پر نہیں آتا۔ اگر ہمارے تمام فنکار وشاعر کیفی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایک ایک گاؤں کو گود لے لیتے تو آج ہندوستان کا ماحول بہت کچھ بدل گیا ہوتا۔ یہ کیفی کی شہرت وعظمت ہی کی برکت ہے کہ اس نے مجواں گاؤں میں سڑکیں بنوا دیں، بجلی لگوا دی، اسپتال اور اسکول کی تعمیر کروا دی۔

رہی دولت کی بات تو کیفی شاید دنیا کے دوسرے اور ہندوستان کے پہلے شاعر ہیں، جنہوں نے ٹالسٹائی کی طرح اپنی تمام موروثی زمین غریب کسانوں میں تقسیم کر دی۔ اگر واقعی کیفی ایک حریص انسان ہوتے تو وہ ممبئی کی جگمگاتی دنیا کو چھوڑ کر مجواں جیسے پچھڑے گاؤں میں نہیں آتے اور نہ اس گاؤں کی ترقی کے لئے تکلیفیں اٹھاتے اور نہ اپنی زمین غریب کسانوں میں تقسیم کرتے۔ کیفی کا عملی اور تخلیقی کردار کم سے کم اتنا مضبوط تو ہے کہ وہ اس قسم کے اوچھے واروں کو مسترد کر کے اپنی انفرادیت کو قائم ودائم رکھ سکے۔ ■■

نقد و نظر

چھوٹی بحروں کا فسوں کار شاعر : خمار بارہ بنکوی

شفیق ندوی

خمار بارہ بنکوی کی شاعری میں دل کے معاملات سے لے کر کارِ جہاں وراز تک کے سارے رنگ و آہنگ موجود ہیں۔ کسی نے انھیں شہنشاہِ غزل کہا، تو کسی نے غزل کی آبرو، اور ہم آپ جیسے دلدادگانِ شعر و شاعری نے انھیں دیگر القاب و آداب سے یاد کرنا اپنے لئے باعث افتخار سمجھا۔ معروف ناظمِ مشاعرہ انور جلالپوری ان کا تعارف غزل کی شاہجہانی شخصیت جیسے الفاظ سے کرایا کرتے تھے، اور سچ مانئے تو یہ تعارف، خمار کی شخصیت پر من و عن چسپاں بھی ہوتا تھا۔ انھیں میں نے پہلی بار مئو کے ایک خاندانی مشاعرہ میں سنا تھا جہاں منجملہ اور غزلوں کے ضمن میں درج ذیل غزل سنائی تھی:

مجھ کو شکست دل کا مزہ یاد آ گیا	تم کیوں اداس ہو گئے کیا یاد آ گیا
برسے بغیر ہی جو گھٹا گھر کے کھل گئی	ایک بے وفا کا عہد وفا یاد آ گیا
حیرت ہے تم کو دیکھ کے مسجد میں اے خمار	کیا بات ہو گئی کہ خدا یاد آ گیا

یہی کوئی 1967 کا زمانہ تھا، اس وقت تک میں اردو فارسی کے نمائندہ ادب سے اس حد تک آ گاہ ہو چکا تھا کہ اردو مشاعروں، شاعری اور شاعروں کو چھوڑ، ملا بہاری کے مشہورِ زمانہ جملہ (سبحانہ ما اعظم شانہ) کی فلسفیانہ دیدہ ریزیوں کی غواصی میں مصروف درس نظامیہ کے فاضلان ذی وقار کی متکلمانہ گفتگو سے اپنے ذہن و فکر کو جلا بخش رہا تھا۔ ایک رات تھکا تھکایا مدرسے کی سیڑھیوں سے اتر کر خیالوں میں گم گھر لوٹ رہا تھا کہ راستے میں بنی نوع انسان کا ایک انبوہ جھومتا، گاتا بجاتا قمقموں کی روشنی میں مصروف سفر نظر آیا۔ پھر تو کیا تھا فضولیات پسند طبیعت پر شیطان نے اپنے ڈھول ڈھپوں کا ایسا رنگ جمایا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس بھیڑ کا حصہ بن گیا، اور جب ہجوم نے اپنا ڈیرا ڈنڈا ایک کھلے میدان میں ڈالا تو میں ایک شامیانے میں منعقد مشاعرے کے اسٹیج کے سامنے تھا۔ موقعہ تھا شہر کے ایک صاحب ثروت صنعت کار کے صاحبزادے کی شادی خانہ آبادی کا۔ بارات کے منجملہ لوازمات میں ایک عدد مشاعرہ بھی شامل تھا۔ شعرا کی تعداد بھی کوئی زیادہ نہیں تھی۔ نظامت پر ملک زادہ منظور حسب معمول جلوہ افروز تھے۔ ان دنوں مئو شہر میں ان کا ورودِ مسعود ایک عام سی بات ہوتی تھی۔ شبلی کالج اعظم گڑھ میں ہوا کرتے تھے۔ ہر ہفتہ کی شام (بارہ آنہ میں) مئو آ جاتے، اور اتوار کو (بارہ روپے جیب میں دبائے) اعظم گڑھ کو روانہ ہو جاتے۔ موضوعِ گفتگو مشاعرے میں شعرا کی صفوں میں پہلی بار میں نے خمار صاحب کے ساتھ ناظر خیامی کو بھی دیکھا تھا۔ یہ جناب محترم مزاح کے مشہور شاعر ساغر خیامی کے بڑے بھائی ہوتے تھے۔ آئے تو تھے مشاعرہ پڑھنے لیکن کسی نالے میں پڑے ملے۔ بمشکل تمام اٹھا کر لائے گئے۔ ابتدا میں سامعین پر ان کی یہ حالت کافی گراں ضرور گزری لیکن جب انھوں نے اپنی مشہور نظم 'غالب خدا کے حضور میں' سنائی تو سامعین کو ان کی ذہنی افتاد کا بخوبی اندازہ ہو گیا، اور جلد ہی ان کی بے اعتدالیاں کو انسانی کوتاہیوں کے زمرے میں ڈال کر، کلام کو داد و تحسین سے نوازا گیا۔ اور بایں طور سامعین کی کبیدہ خاطری، قلبی انشراح میں تبدیل ہو گئی۔ ان کی نظم کے اشعار تو بروقت یاد نہیں لیکن متفرق اشعار میں سے ایک شعر (فلمی اداکارہ مینا کماری کی شراب نوشی سے متعلق) ذہن کے گوشہ میں اب بھی محفوظ رہ گیا ہے۔ ضیافت طبع کے لئے حاضر خدمت ہے:

مینا شراب پیتی تھی رہتی تھی سب کے ساتھ
پاکیزہ بن گئی تو خدا نے بلا لیا

یہاں ایک بات کا اعادہ فائدے سے خالی نہیں ہوگا کہ ناظر خیامی لکھنؤ کے اجتہادی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان کی بے اعتدالیوں نے وقت سے بہت پہلے انھیں ہم سے چھین کر اردو شعر و ادب کے دامن کو ایک بلند پایہ مزاح نگار شاعر سے محروم کر دیا۔ مزاح کو فلسفیانہ رنگ دینے

پر جو قدرت ناظر خیامی کو تھی وہ پھر کسی اور مزاح نگار کے حصے میں نہیں آئی۔ اسی مشاعرہ میں اس وقت کے ابھرتے ہوئے افسانہ نگار موسیٰ مجروح کو بھی دیکھا تھا۔ایک افسانہ بھی انھوں نے سنایا تھا۔اس سے مشاعرہ کے معیار اور سامعین کی متانت و سنجیدگی اور ادبی ذوق کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔بعد کے دنوں میں نہ جانے محترم کہاں کھو گئے، نہ انھیں پھر کبھی دیکھا اور نہ کسی سے ان کا چرچا سنا۔اس مشاعرے میں پسند تو ہر شاعر کو کیا گیا لیکن ڈھیروں داد کا قرعہ فال جس شاعر کے نام نکلا وہ تھے خمار بارہ بنکوی۔یہ تھا میرا خمار صاحب اور ان کی شاعری سے پہلا تعارف۔قیام ندوہ کے زمانے میں انھیں لکھنؤ کے بیش تر اُن معیاری مشاعروں میں سنا جہاں ہم طلبائے ندوہ کو جانے کی اجازت مل جایا کرتی تھی۔ دیوہ شریف کے تاریخی مشاعرے میں تو وہ آتے ہی آتے تھے، بیرون لکھنؤ ممبئی رنگ محل کے ایک مشاعرہ میں ان کے ساتھ پڑھنے کا بھی اتفاق ہوا جہاں میں نے اپنی نظم احساس سنائی تھی جس کا ڈکشن کچھ یوں ہے:

وہ میں ہوں/ یا کبھی تم ہو/ ہوا کا سرد جھونکا ہو/ اکیلا چاند ہو/ یا شام کا تنہا ستارہ ہو/ وہ بوئے گل/ صبا کا ہاتھ ہو/ یا رقص شبنم ہو/ لب ساحل تماشا میں نے دیکھا آبگینوں کا/ قبیلہ مہ جبینوں کا/ ہوا کے دوش پر اڑتا ہوا آنچل حسینوں کا/ تمھاری یاد آئی/ آ گئے منظر نگاہوں میں/ اکیلا کوئی بیٹھا/ کھیلتا کوئی ہے باہوں میں/ اکیلی شمع کوئی جھکی جلتی خواب گاہوں میں/ وہ میں ہوں/ یا کبھی تم ہو/ تمھاری یاد آئی/ چھیڑتی ہے دل کے تاروں کو/ ہنساتی ہے/ رلاتی/ گدگداتی دل کے ماروں کو/ وہ میں ہوں/ یا کبھی تم ہو!!

مائک سے واپس اپنی نشست پر لوٹا تو انھوں نے شفقت آمیز پسندیدگی کا اظہار کیا۔مرنج و مرنجاں طبیعت کے مالک تھے، نہ کسی سے ان کو کوئی گلہ اور نہ کسی چیز کی انھیں طلب، ناقدین کی ہرزہ گوئی سے نہ پشیمان اور نہ قصیدہ خوانوں کی چاپلوسی پر شاداں، اگر ان خوبیوں کے ساتھ وہ نواب معظم جاہ بہادر شجیع کی شبانہ مجلسوں کے شرکائے باوقار میں شمار کئے جاتے تھے تو وہ بجا طور پر اس کے حق دار تھے۔ مزاج میں بلا کی انکساری، طبیعت میں سادگی، گفتگو میں رکھ رکھاؤ، تعلقات میں رواداری، چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کا احترام۔ یہ وہ عناصر تھے جو ان کی شخصیت کی تشکیل میں بہر نوع شامل تھے، اور اللہ جھوٹ نہ بلوائے یہ وہ خوبیاں تھی جو ہمیں ان کے پیش رو بزرگ استاد شعرا کی یاد دلاتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ علی گڑھ کے ایک مشاعرے میں خوف زدہ شکیل بدایونی کو جگر صاحب کی ہمت افزائی نے وہ خود اعتمادی بخشی کہ وہ مشاعروں کے دوش پر سوار ممبئی فلم نگری کے باقاعدہ ساکنان خلد آشیاں نشینوں میں شامل ہو گئے۔بے جا نہ ہوگا اگر اس حوالے سے ہم جگر صاحب کو خمار کا قابل تقلید آئیڈیل قرار دیں۔جگر کے تعلق سے خمار کا یہ شعر خاصا معنی خیز ہے:

غزل بعد جگر اک کشتی بے ناخدا کی سی ہے
اگر طوفان کوئی اے خمار آیا تو کیا ہوگا

خمار صاحب کی شاعرانہ شہرت میں جہاں ان کے ترنم کا عمل دخل کافی سے زیادہ ہے۔وہیں عالمی پذیرائی میں ان کے شعری آہنگ کا حصہ بھی کچھ کم نہیں ہے، خاص طور پر وہ غزلیں جن میں انھوں نے چھوٹی بحروں کا استعمال نفسیاتی الجھنوں اور اندرون ذات کشمکش کے بیان کے ساتھ استادانہ مہارت سے کیا ہے۔ اساتذہ میں جن بزرگان فن کو ان بحروں کے استعمال پر فنکارانہ قدرت حاصل تھی ان میں منجملہ اور شعرا کے غالب کا نام سرفہرست ہے۔ان کی بیش تر مشہور غزلیں ان ہی بحروں کے دائرے میں آتی ہیں:

درد منت کش دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے
وہ اور آرائش خم کاکل — میں اور اندیشہ ہائے دور دراز
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی — کیوں ترا راہگذر یاد آیا
چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد — گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

عہد حاضر کے شعری منظر نامے میں چھوٹی بحروں میں کہنے والوں کی بہتات ہے لیکن ان سب میں راحت اندوری کو قابل رشک حد تک چھوٹی بحروں میں ترسیل وابلاغ پر خلاقانہ قدرت حاصل ہے۔

ہنستے رہتے ہیں مسلسل ہم تم — ہوں نہ جائیں کہیں پاگل ہم تم
پیاس صدیوں کی لئے آنکھوں میں — دیکھتے رہتے ہیں بادل ہم تم
شہر کی حد ہی نہیں آتی ہے — کاٹتے رہتے ہیں جنگل ہم تم
جیسے دریا کسی دریا سے ملے — آؤ! ہو جائیں مکمل ہم تم

راحت کے پیشرو کے طور پر یہاں امیر قزلباش کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ ان کے کچھ اشعار درج ذیل ہیں:

ذہن میں اک افسانہ ہے — اور عنوان زمانہ ہے
جینے کے دن کب آئیں گے — کل تک تو مر جانا ہے
ایک حقیقت ہے ایسی بھی — جس کو خواب بنانا ہے
بستی میں سب خیر سے ہیں — یہ اخبار پرانا ہے

صحرا کے مزدور ہیں ہم دریا پار ٹھکانا ہے

ناقدین کا خیال ہے کہ چھوٹی بحروں میں اچھے شعر کہنا انتہائی صبر آزما کام ہے۔ بلکہ سچ مانیے تو چھوٹی بحریں شاعرانہ قدرت کی ادبی کسوٹیاں ہیں۔ محمد حسن عسکری نے کہیں اپنے ایک مضمون میں چھوٹی بحروں کے فنی امکانات پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: 'چھوٹی بحر میں دل کا معاملہ ایسی بے ساختگی سے کھلتا ہے کہ سارے تکلفات برطرف ہو جاتے ہیں، بڑی بحر میں تو ممکن بھی ہے کہ آدمی اپنا مزاج اور کردار چھپا لے جائے مگر چھوٹی بحر تو لوہے کا کولہو ہے، ادھر گلاب ڈالو، ادھر عطر گلاب اپنی تمام تر عطر بیزیوں کے ساتھ فضا میں محو رقص ہو جاتا ہے۔ یہاں آدمی کی اصلیت چھپائے نہیں چھپتی کیونکہ شاعر کو چھوٹی بحروں میں صرف اپنا تجربہ ہی نہیں بلکہ پوری شخصیت کا نچوڑ کر پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اظہار کے ہاتھوں اس قدر مجبور ہوتا ہے کہ جھوٹ بولنا بھی چاہے تو ممکن نہیں۔'

قدر دان خمار کے درمیان اس تعلق سے ایک حد تک اتفاق ہے کہ وہ چھوٹی بحروں کے استعمال میں اپنے معاصرین سعید شہیدی اور معظم جاہ بہادر شجیع سے کہیں زیادہ آگے نظر آتے ہیں:

حال دل ان کو سناتے جائیے گاہے گاہے مسکراتے جائیے
دشمنوں سے پیار ہوتا جائے گا دوستوں کو آزماتے جائیے
آپ کو جاتے نہ دیکھا جائے گا شمع کو پہلے بجھاتے جائیے
روشنی محدود ہو جن کی خمار ان چراغوں کو بجھاتے جائیے

خمار صاحب کا شعری سرمایہ نسبتاً بہت زیادہ نہیں ہے پوری شاعرانہ زندگی میں انھوں نے تین مجموعہ کلام شائع کئے جن کے نام حسب ترتیب یوں ہیں: آتش تر، رقص مے، شب تاب۔ 'آتش تر' 1964 میں پہلی بار شائع ہوا تھا۔ اس میں حرف آغاز کے زیر عنوان علی سردار جعفری نے خمار صاحب کی شاعرانہ قد و قامت کا بایں الفاظ تعارف کرایا ہے:

''غزل جس کا ہر شعر ہوا کے نرم لطیف جھونکے کی طرح آئے اور گذر جائے نیز دل میں تازگی کی ایک کیفیت پیدا کر جائے یہ ہے خمار کی شاعری۔ اس میں غزل کی کئی سو برس کی روایات کی تہذیب اور شائستگی ہے اسے ہم میر کے ہم عصروں کی روایت بھی کہہ سکتے ہیں۔''

چھ دہوں پر پھیلی ہوئی خمار صاحب کی شاعرانہ زندگی کا جائزہ اگر ان کے شعری سرمائے کے تناظر میں کیا جائے تو بجا طور پر انھیں کم گو شعرا کی صفوں میں شمار کرنا پڑے گا لیکن اس بزم میں وہ کوئی اکیلے نہیں ہیں۔ ان کے ہم سفر مجروح بھی ہیں اور ساتھ میں جذبی بھی۔ دبئی کے ایک مشاعرے میں انھوں نے اپنی اس کمزوری کا اعتراف سامعین کے سامنے درج ذیل الفاظ میں بذات خود کیا تھا کہ: ''میں اور مجروح صاحب کم کہتے ہیں اور کبھی کبھی تو چھ چھ مہینے کچھ نہیں کہتے لیکن جب طبیعت ترنگ میں ہوتی ہے تو غزل ایک ہی نشست میں مکمل ہو جاتی ہے۔''

باوجود اس حقیقت کے خمار صاحب اتنے بھی کم گو نہیں ہیں کہ انھیں مجروح اور جذبی کے پہلو بہ پہلو رکھا جائے۔ کیونکہ ان کا شعری سرمایہ معتد بہ حد تک ضخیم ہے اور بایں وجوہ ان کے تینوں مجموعہ ہائے کلام کو اگر کلیات کی شکل دی جائے تو یقیناً اس کی ضخامت اردو غزل کے اساتذہ شعرا غالب و مؤمن کے کلیات سے کچھ کم نہ ہوگی۔ ہاں ظفر علی خاں، ماہر القادری اور شورش کاشمیری کے کلیات کی طرح وہ یقیناً چٹان کی مانند بھاری بھرکم تو نہیں ہو سکتا۔ ویسے بھی کسی تخلیقی عمل کا ادبی تعین اس کی ضخامت اور حجم سے نہیں بلکہ تازگی اور پیرایہ بیان کی بے ساختگی سے ہوتا ہے۔ اردو ادب کا سنجیدہ قاری کیا اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ نظم طباطبائی صرف ایک نظم (گور غریباں) سے تاریخ اردو ادب میں جاوداں ہو گئے لیکن شورش کاشمیری کو بطور شاعر آج بھی کم ہی لوگ جانتے ہیں۔ قارئین کی دل چسپی کے لئے موضوع کی مناسبت سے اس بات کا تذکرہ مناسب ہوگا کہ خود خمار صاحب کو اس حقیقت کا احساس تھا، انھوں نے کسی سوال کے جواب میں کہا تھا: ''اگر آپ موجودہ دور کی شاعری چاہتے ہیں تو پھر میں دیوان کے دیوان لکھ دوں۔''

خمار صاحب کو عام طور غزل کے روایتی آہنگ کا امین شاعر تصور کیا جاتا ہے لیکن یہ بدگمانی اتنی صحیح نہیں جتنی کہ لگتی ہے۔ دراصل اس بدگمانی کا محرک ان کی وہ غزلیں ہیں جنہیں وہ تواتر کے ساتھ ملکی و غیر ملکی مشاعروں میں سنایا کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ ان کے فن کے تعلق سے یہ خام خیال ان کی شاعرانہ تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ کھلی ناانصافی ہے کیونکہ ان کے اشعار میں وجودی نیز نفسیاتی نمائندگی کے پہلو بہ پہلو عصری حسیت کا توانا اظہار بالکل اسی انداز اور مقدار میں ملتا ہے جیسا کہ ہم دوسرے اساتذہ شعرا کے یہاں دیکھتے ہیں:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے

رہنے تو ابھی ساغر و مینا میرے آگے
سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں
تھیں بنات النعش گردوں دن کے پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں

معمولی کوشش سے ہمیں خمار صاحب کے کلام میں ایسے اشعار بکثرت مل جائیں گے جنھیں بآسانی نفسیاتی وجودی نیز عصری حسیت کے دائرے میں سمیٹا جاسکتا ہے جیسے درج ذیل اشعار:

آج ہم ناگہاں کسی سے ملے — مدتوں بعد زندگی سے ملے
شمع کیا، چاند کیا، ستارے کیا — سلسلے سب کے تیرگی سے ملے
ہم پہ گذرا ہے وہ بھی وقت خمار — جب شناسا بھی اجنبی سے ملے

ایک آنسو کہہ گیا سب حال دل کا
میں نے سمجھا تھا یہ ظالم بے زباں ہے

ہیم طواف کوچہ جاناں کے دن گئے
پیروں میں چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رہی

نہ ہارا ہے دل اور نہ دنیا تھکی ہے
دیا جل رہا ہے ہوا چل رہی ہے

چراغوں کے بدلے مکاں جل رہے ہیں
نیا ہے زمانہ، نئی روشنی ہے

خمار صاحب کے موجودہ متداول حالات وکوائف زندگی میں ایسا کچھ نہیں ہے جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ وہ وسیع المطالعہ انسان تھے لیکن ان کے کلام سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری کے مختلف ادوار سے ان کی واقفیت خاصی تھی، ابتدائی کلام میں جگر کا رنگ غالب ہے جیسے ان کی یہ غزل:

کبھی شعر ونغمہ بن کے کبھی آنسوؤں میں ڈھل کے
وہ مجھے ملے تو لیکن، ملے صورتیں بدل کے
یہ وفا کی سخت راہیں، یہ تمھارے پائے نازک
نہ لو انتقام مجھ سے، مرے ساتھ ساتھ چل کے

یہ غزل پڑھتے وقت نہ جانے کیوں ہندوستان کے تیغ الہ آبادی اور پاکستان کے مصطفیٰ زیدی کی یاد آتی ہے جن کا ایک شعر یہ ہے:

ان ہی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

کہا جاتا ہے کہ 1945 میں خمار صاحب جگر کی رفاقت میں ممبئی کوئی مشاعرہ پڑھنے گئے تھے جہاں ان کا اے آر کاردار سے سامنا ہوگیا۔ نغمہ نگاری کی پیش کش ہوئی اور فلم صنعت سے نغمہ نگاری کی حیثیت سے وابستہ ہوگئے جہاں وہ 1947 تک رہے۔ فلم شاہ جہاں کے علاوہ مختلف دوسری فلموں (بارہ دری، مہندی، ساز اور آواز وغیرہ) کے گیت بھی لکھتے رہے۔ ان سے منسوب بعض مشہور گانوں کے کچھ ٹکڑے یوں ہیں:

چاہ برباد کرے گی ہمیں معلوم نہ تھا
روتے روتے ہی کٹے گی ہمیں معلوم نہ تھا

تصویر بناتا ہوں تصویر نہیں بنتی
اک خواب سا دیکھا ہے تعبیر نہیں بنتی

بھلا نہیں دینا، بھلا نہیں دینا
زمانہ خراب ہے دغا نہیں دینا

اپنے کیے پہ کوئی پشیمان ہوگیا
لو اور میری موت کا سامان ہوگیا

دل کی محفل سجی ہے چلے آیئے
آپ کی بس کمی ہے چلے آیئے

ایک زمانہ تک وہ حقیقی زندگی میں خود اپنے تخلص کی زندہ تصویر بنے رہے لیکن ترقی پسند حیدرآبادی شاعر عزیز قیسی کے چھوٹے بھائی احمد خاں کا بیان ہے کہ امریکہ آمد پر میں نے ان سے پوچھا تھا کہ یہاں آ کر آپ کو کیسا محسوس ہورہا ہے تو جواب میں خمار صاحب بولے: ''صحیح جگہ پر غلط عمر میں آیا ہوں۔''

آخر میں حضرت خمار کی ایک غزل درج کررہا ہوں جو بڑی حد تک ان کے شاعرانہ تخلیقی نشیب وفراز کی مکمل غماز ہے:

ہنسنے والے اب ایک کام کریں — جشن گریہ کا اہتمام کریں
ہم بھی کرلیں جو روشنی گھر میں — پھر اندھیرے کہاں قیام کریں
مجھ کو محرومی نظارہ قبول — آپ جلوے نہ اپنے عام کریں
اک گذارش ہے حضرت ناصح — آپ اب کوئی اور کام کریں

خمار صاحب نے اپنی اولین شعری تخلیقات سے اس غزل تک کا سفر پوری شاعرانہ ذمہ داریوں کے ساتھ نبھایا ہے۔ ان کی شاعری میں دل کے معاملات سے لے کر کار جہاں دراز ہونے تک کے سارے رنگ وآہنگ موجود ہیں، ضرورت ہے تو صرف سنجیدہ مطالعہ کی اور ساتھ میں کورانہ تقلید اور سستی خامہ فرسائی سے اجتناب کی۔ ■■

تحقیق و تفتیش

کیا مودودی کبھی نیاز فتح پوری کے شاگرد تھے

اسیم کاویانی

اسیم کاویانی کے تحقیقی و تنقیدی مضامین نے ادھر بہتوں کو چونکایا ہے۔ انھیں بھی جنھیں اردو میں تنقید و تحقیق کا حرف آخر سمجھا جاتا رہا ہے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور علامہ نیاز فتح پوری کے تعلق سے زیر نظر مضمون غالباً اس موضوع پر پہلا مضمون ہے جو انھوں نے 'ادب ساز' کو عنایت فرمایا ہے۔ ادارہ

سوال دل چسپ ہے اور اس کا جواب اثبات میں ہے!

مختصر مدت ہی کے لیے سہی پر ابوالاعلیٰ مودودی نے نیاز فتح پوری کی شاگردی اختیار کی تھی، یہ ایک حقیقت ہے۔

لیکن — یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا۔ ادب کی قلمروئے حسن و عشق (شاعری اور ادب لطیف) میں نیاز کا سکہ رواں تھا۔ اور ابوالاعلیٰ کا سبزہ آغاز تھا۔

بہتر یہ ہوگا کہ بات شروع کرنے سے پہلے مولانا مودودی کے ابتدائی حالات پر سرسری نگاہ ڈالتے چلیں۔ مولانا مودودی کے اپنے ایک خودنوشت سوانحی مضمون (مطبوعہ 'نقوش۔ آپ بیتی نمبر') کے بموجب وہ ستمبر 1903 میں اورنگ آباد (تب حیدرآباد میں شامل تھا، اب مہاراشٹر میں ہے) میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے بچپن ہی میں ان کے والد مولوی سید احمد حسن نے یہ ارادہ کرلیا تھا کہ وہ انھیں مولوی بنائیں گے۔ گھر ہی پر انھیں صرف و نحو، عربی و فارسی زبان و ادب اور فقہ کی تعلیم دی گئی۔ اس کے بعد انھیں مدرسہ فوقانیہ (اورنگ آباد) کی جماعت رشدیہ میں امتحان کی تیاری کے لیے داخل کیا گیا، لیکن جب امتحان ہوا تو ریاضی میں کمزور ہونے کے سبب وہ فیل ہو گئے۔ صدر مدرس ملا داؤد نے مہربانی فرمائی اور انھیں فیل ہونے کے باوجود 'مولوی' جماعت میں داخل کرلیا۔ 1914 میں انھوں نے مولوی کی سند درجہ دوم میں حاصل کی۔ اس دور میں ان کے والد اپنی صحت کی خرابی اور معاشی پریشانی کے سبب حیدرآباد منتقل ہو گئے اور وہاں انھیں 'مولوی عالم' کی تیاری کے لیے چھوڑ کر خود بھوپال چلے گئے۔ بھوپال میں آکر چھے ماہ ہوئے تھے کہ یہاں ان کے والد پر فالج کا سخت حملہ ہوا، مجبوراً ابوالاعلیٰ کو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر اپنی والدہ کے ساتھ بھوپال آنا پڑا۔ وہ اپنے والد کی خدمت گزاری میں مصروف ہو گئے لیکن وہ جانبر نہ ہو سکے۔ زندگی کے نامساعد حالات اور تلخ تجربات نے ابوالاعلیٰ کو فکر معاش پر مجبور کردیا۔ لکھتے ہیں:

''فطرت نے تحریر و انشا کا ملکہ ودیعت فرمایا تھا۔ عام مطالعے سے اس کو اور تحریک ہوئی۔ اسی زمانے میں نیاز فتح پوری سے دوستانہ تعلقات ہوئے اور ان کی صحبت بھی وجہ تحریک بنی... غرض ان تمام وجوہ سے یہی فیصلہ کیا کہ قلم ہی کو وسیلہ معاش قرار دینا چاہیے۔'' ص:1289، 'نقوش۔ آپ بیتی نمبر' دوم

انھوں نے نیاز فتح پوری کے ذکر میں اپنے تعلقات کی تفصیل سے گریز کیا ہے، اور جو ان کہی کہانی چھوڑی ہے، اپنے اس مضمون میں ہم اسی کے سرے ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے، اس کے علاوہ انھوں نے اپنے شوق انشا پردازی کا تذکرہ تو کیا ہے، لیکن یہ نہیں بتایا کہ نیاز کے یہاں وہ خراد پر چڑھی تھی، جو کہ اس دور میں اپنی انشا کے خاص رنگ کی وجہ سے مقبول ہو چکے تھے۔ مولانا نے یوں لکھا ہے:

''1917 میں بھوپال میں قیام ہوا، اور عام مطالعے کے ساتھ انشا کا شوق ایسا دامن گیر ہوا کہ اب شاید مرنے کے پہلے پیچھا نہ چھوڑے گا۔'' ص:1292، ایضاً

نیاز فتح پوری بھوپال میں 1915 میں آچکے تھے، اس سے قبل زمیندار، تمدن، نقاد، اور الہلال، میں ان کا کلام، افسانے اور انشائیے چھپتے رہے تھے اور ادبی دنیا میں ان کا شہرہ تھا۔ 1916 میں [1] جب اُن کی اور ابوالاعلیٰ مودودی (بعمر 13 سال) کی ملاقات ہوئی تو اس وقت نیاز بھوپال کے سررشتۂ اوقاف میں مہتمم تھے، جس کا دفتر مودودی کے گھر کے قریب ہی تھا۔

جملۂ معترضہ کے طور پر عرض ہے کہ بھوپال میں ابوالاعلیٰ کے ذوق قلم آزمائی کے لیے نیاز کی صحبت 'وجہ تحریک' بنی، اس سے چند برس پہلے ابوالاعلیٰ کے اورنگ آباد ہی کے زمانے میں ان کے ایک عزیز اشفاق احمد زاہدی ان کی زبان کی موچ نکال چکے تھے، اور اس وقت مودودی کی عمر محض نو سال کی تھی۔

ایک بار اشفاق احمد زاہدی نے مودودی برادران (ابوالاعلیٰ اور ابوالخیر) کو عجب امتحان میں ڈال دیا تھا، جب انھوں نے دونوں بھائیوں کو حکم دیا کہ 'فرض کرلو تم کسی لڑکی پر عاشق ہو گئے ہو۔ اب اس خیالی معشوق کے نام اپنے جذبات محبت اور ہجر کی صعوبتوں کے بیان میں ایک خط لکھو۔' یہ دلچسپ قصہ مولانا مودودی نے یوں بیان کیا ہے:

''یہ ایک ایسا مضمون تھا جس سے ہم بلکل نابلد تھے اور کم از کم میری عمر تو ایسی تھی کہ میرے ذہن میں عشق و معشوق اور محبت و ہجر کے تصور کی گنجائش ہی نہ تھی۔ مگر اس زمانے میں 'گلستاں' 'بوستاں' پڑھ چکا تھا اس سے صرف اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ عشق کوئی مرض ہے جو کسی عورت کو دیکھ کر ہو جایا کرتا ہے، اور اس مرض سے دل کے اندر آگ لگ جایا کرتی ہے جو صرف اس کے ملنے سے بجھتی ہے، اور جب تک وہ نہ ملے اس وقت تک وہ غریب بے چارہ جلتا رہتا ہے اور اسی حالت کا نام ہجر ہے۔'' ص: 1292، ایضاً

دونوں بھائیوں نے اپنے اپنے اشہب خیال کو دوڑایا اور اس مضمون کا لمبا چوڑا خط لکھ کر پیش کر دیا۔ زاہدی مرحوم ان کے خطوں کو دیکھ کر پھڑک گئے۔ ابوالاعلیٰ کے خط نے خاص طور پر داد پائی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف 'گلستاں' 'بوستاں' کا مطالعہ دلچسپی سے کیا تھا بلکہ 'گلستاں' کے باب پنجم کا مطالعہ کچھ زیادہ ہی دل جمعی سے کیا تھا اور وہ اس مضمون سے یکسر نابلد نہ تھے۔

خیر، ہم پھر سے بھوپال میں مودودی برادران کی نیاز سے ملاقات کی طرف رخ کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ابوالخیر مودودی نے سلسلہ جنبانی کی تھی، جنھیں غالباً قمرالحسن (جو کہ بعد میں نیاز کے داماد ہوئے) سے نیاز حاصل تھا۔ ابوالخیر نے نیاز کو رقعہ لکھا تھا ''نیاز صاحب، آپ سے ملنے کا بے حد مشتاق ہوں۔ آپ تشریف لائیے یا مجھے وقت دیجیے۔'' اس ملاقات اور اس کے بعد کے تعلقات کا حال ابوالخیر مودودی نے چند سطروں میں یوں سمیٹ لیا ہے:

''نیاز صاحب بے تکلف چلے آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب 'گیتانجلی' کا مترجم ادبی فضا پر چھایا ہوا تھا، اور رقعہ لکھنے والا محض طفلِ مکتب تھا اور آج بھی وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ خوانندگانِ نیاز اس سے نیاز کے 'انا' اور ان کی شخصیت کو سمجھ سکتے ہیں۔ میں نے ان میں تبختر نہیں پایا۔ تعلقات بڑھے، لیکن یہ تعلقات دوستانہ نہیں خوردانہ و بزرگانہ تھے۔ میں نے ان کی صحبت میں بے پڑھے بہت کچھ پڑھا اور انھوں نے مجھے بے سکھائے بہت کچھ سکھایا۔'' ص: 605، نیاز فتح پوری: نقوش۔ شخصیات نمبر، اول

یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ امیر جماعت اسلامی نے اپنا سوانحی مضمون لکھتے وقت نیاز سے اپنے تعلقات کو 'دوستانہ' سے کم درجے کا بتانا گوارا نہ کیا، جب کہ مولانا مودودی کے برادر بزرگ ابوالخیر نے نیاز سے اپنے تعلقات کو خوردانہ و بزرگانہ نوعیت کا تسلیم کیا ہے۔ مودودی برادران کی عمروں سے نیاز کی عمر کا فرق دیکھتے ہوئے بھی ابوالخیر ہی کا بیان مناسب نظر آتا ہے۔

اپنے مذکورہ بالا مضمون میں ابوالخیر نے اپنے بھائی ابوالاعلیٰ کی اپنے دوستوں کے ساتھ جمی اس محفل کا ذکر بھی کیا ہے، جس میں عبدالرحمان بجنوری شریک تھے۔ نیاز کی آمد پر سب ان کے مضمون 'رقاصہ' کی تعریف و تحسین کرنے لگے تھے اور بجنوری مرحوم کی درخواست پر نیاز بھی مسکرا کر شریک محفل ہو گئے تھے، لیکن جب بعد میں ایک کم عقل انجینئر نے یہ احمقانہ سوال کیا کہ 'آخر اس رقاصہ کا فن کیا تھا؟' تو نیاز اسے ایک stunning جواب دیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور محفل درہم برہم ہو گئی تھی۔

لیکن ابوالخیر مودودی کا یہ مضمون بھی ہمیں ابوالاعلیٰ کی سوانح کے چھوڑے ہوئے خلا کو بھرنے میں کوئی خاص مدد نہیں دیتا۔ انھوں نے خوردی و بزرگی کے لحاظ کے ساتھ نیاز سے اپنے رسمی استفادۂ علم کا ذکر تو کیا ہے، لیکن اس پر نہ کھلے کہ مولانا مودودی نے نیاز سے اکتساب فیض کیا تھا یا نہیں؟ اگر کیا تھا تو اس کی نوعیت و کیفیت کیا تھی اور کتنی مدت تک یہ سلسلہ چلا!

دراصل یہ جس زمانے کی بات ہے، نیاز کی عمر 28۔27 سال کی تھی اور ابوالاعلیٰ کی 13 برس۔ دونوں جادۂ حیات کے خوش فکر مسافر تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ قضا و قدر نے ایک کو داعی اسلام جماعت کا امیر اور دوسرے کو عقلیت پسندی کا سالار بنانا طے کر رکھا ہے۔ ابوالخیر کی محولہ بالا تحریر کے وقت تک پل کے نیچے سے بہت پانی بہہ چکا تھا۔ ایک طرف ادبی دنیا میں 'نگار' کا جادو لوگوں کے سر چڑھ کر بول رہا تھا تو دوسری طرف مذہب پرستوں کا انبوہ جماعت اسلامی پر فدا تھا، اس لیے اپنے بھائی کی شہرت و مرتبے کو گزند پہنچنے کا اندیشہ ابوالخیر کے آڑے آ گیا تھا۔

بھوپال میں اپنے بارہ سالہ قیام میں نیاز نے ابتدائی دو برس کا عبوری دور محکمہ اوقاف اور محکمہ پولیس کی ملازمت میں گزارا۔ اس کے بعد مستقل طور پر 'دفتر تاریخ' میں تالیف و ترجمے کے آزادانہ فرائض انجام دینے لگ گئے۔ وہیں ان کے جوہر کھلے اور ان کی ابتدائی کتابیں 'گہوارۂ تمدن'، 'تاریخ الدولتین'، 'مصطفا کمال پاشا'، 'تاریخ اسلام ابتدا سے حملۂ بابر تک'، اور 'صحابیات' شائع ہوئیں۔ اس 'دفتر تاریخ' میں ابوالاعلیٰ بھی (بعمر 14 سال) مختصر مدت کے لیے نظر آتے ہیں۔ غالباً ماتحتوں یا معاونوں کے زمرے میں۔

1963 میں جب فرمان فتح پوری نے 'نگار پاکستان' کا 'نیاز نمبر' شائع کرنے کا اعلان کیا تو انھوں نے اس بات کی بڑی کوشش کی کہ وہ ابوالخیر مودودی سے اس دور کے مزید حالات معلوم کریں۔ یوں بھی اس وقت تک نیاز کے اس دور کے حالات کی شاہد گنتی کی ہستیاں رہ گئی تھیں۔ فرمان کی فرمائش کے جواب میں ابوالخیر نے انھیں لکھا تھا۔

''جی ہاں، نیاز اور بھوپال پر لکھنے والا ایک یہی نافرجام رہ گیا ہے۔ کاش ..قمر کو مرحوم ہوئے ایک زمانہ بیت گیا۔ ابوالاعلیٰ 'بعد از خدا خدائے بزرگ' ہوگئے اور یہ نافرجام ع ہمہ حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا! ایک وہ جس نے قلم پکڑنا حضرت نیاز کی حاشیہ نشینی میں سیکھا۔ جس نے ادبی ورک نیاز صاحب کی صحبتوں میں حاصل کیا اور جس نے حضرت نیاز کو ادیب سے زیادہ ایک اعلاقسم کا انسان پایا۔ یہ اس کی بدبختی ہوگی اگر وہ امتثال فرمان سے قاصر رہے۔''[2]

یہاں انھوں نے نیاز سے تحصیل علم کرنے کا واضح طور پر اعتراف کیا ہے، اور مولانا مودودی کی شہرت و مرتبے کو 'بعد از خدا، خدائے بزرگ' کی طنز تلیح سے نسبت دی ہے۔ ان کی اس طنز تلیح کے پردے میں مولانا مودودی کے سلسلے میں کھل کر کچھ نہ لکھ سکنے کی بے بسی کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وعدہ کرنے کے باوجود وہ مضمون نہ لکھ سکے، اور 'نیاز نمبر' حصہ اول چھپ کر آگیا۔ جس وقت حصہ دوم تیاری کے مراحل میں تھا تو اتفاق سے ابوالخیر کراچی میں فرمان فتح پوری کے محلے ہی میں آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنا مضمون 'نیاز آخرالزماں...' لکھنا شروع کیا تھا کہ اپنی ذاتی الجھنوں کی وجہ سے انھیں پنڈی لوٹنا پڑا۔ وہ اپنا ادھورا مضمون اس وعدے کے ساتھ فرمان صاحب کے سپرد کر گئے کہ اس کا باقی حصہ ڈاک سے بھیج دیں گے، لیکن وہ اپنا باقی مضمون مکمل نہ کرسکے اور فرمان نے مجبوراً ان کا ادھورا مضمون ہی 'نگار پاکستان' کے ستمبر 1963 کے شمارے میں شائع کردیا۔ ابوالخیر مودودی کی یہ تحریر بہرحال ہمارے مضمون کے سرنامے کے سوال کا بڑی حد تک جواب فراہم کردیتی ہے۔ یہ آپ پڑھ ہی چکے ہیں کہ ابوالخیر مودودی نے اشتیاق ملاقات ظاہر کیا تھا تو نیاز بے تکلف ان کے گھر چلے گئے تھے جو کہ سررشتہ اوقاف کے دفتر کے قریب تھا۔ اس کے بعد کا حال ابوالخیر نے یوں لکھا ہے:

''میں کوئی رسالہ پڑھ رہا تھا۔ شاید 'معارف' یا 'نقاد'۔ نیاز صاحب نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے چونکایا "یہ کیا پڑھ رہے ہو! 'ساقی نامہ' پڑھو، 'ابر گہربار' پڑھو" اور بات فارسی کلاسکس کی چل نکلی ..'یہ کیا پڑھ رہے ہو!' کیا پڑھا سب تحلیل ہوگیا کتابوں کے بغیر کتابوں کی سیاحت، ادبی بات چیت میں لاہوت سے ناسوت تک کبھی کچھ اور یہ سب کچھ اس حسن مراعات کے ساتھ جس کے اقتضائے مجاز کو حقیقت میں ملفوف کیا گیا تھا، اور یوں ملاقات کے ساتھ ہی رو ورسم خسروانہ نیاز مندی اور بزرگانہ شفقت میں ڈھل گئی۔ بزرگی میں دوستی کا دل کش امتزاج، بے تکلفی میں ایک تکلف، تکلف میں ایک بے تکلفی!

یہ خصوصیت کچھ میرے ساتھ ہی نہیں تھی۔ قمرالحسن (مرحوم) سے ملاقات ہوئی تو ان کے ساتھ بھی یہی حسن تادیب تھا۔ ابوالاعلیٰ سے ملاقات ہوئی تو ان کے ساتھ بھی۔ قمر قدیم داستانی ادب کے رسیا تھے۔ پورب دیس کے لوک گیت کہانیاں ان کو بہت یاد تھیں۔ ان کی آمد سے ادبی سیاحت میں ایک اور افق پیدا ہوا۔ ابوالاعلیٰ کو کلامیات سے شغف تھا، مساحت کا دائرہ اور وسیع ہوا۔ ہماری شامیں نیاز صاحب کی خواجہ تاشی[3] میں گزرتی رہیں۔ پھر نیاز نے ہمیں لکھنے پر ابھارا۔ ''صرف باتیں ہی نہیں؟ کام بھی ہونا چاہیے۔ تم لوگ لکھو اور پڑھ کر سنایا کرو۔ ہر مہینے کم از کم ایک مضمون۔'' ہم تینوں کے لیے حسب ذوق موضوع بھی مقرر کیے۔ لکھنا اور سنانا اٹل تھا۔ مجھے نیاز صاحب ملک الموت نظر آنے لگے، لیکن زجر مشفقانہ سے مفر بھی نہ تھا۔ گھاس کاٹنی پڑی۔ مستعدی سے ہر مہینے صرف ابوالاعلیٰ ہی لکھتے اور سناتے۔ یہ لکھنا سنانا ان میں ایسا رچا کہ سنانے کی طرح پڑھنا (لکھنا!) ان کی عادت تحریر بن گیا۔'' مضمون 'نیاز آخرالزماں۔ چند یادیں، چند تاثرات' از: مولانا ابوالخیر مودودی

مولانا مودودی کی تحریروں میں جو بول چال کا انداز پایا جاتا ہے، اس کی تہ میں نیاز کی کرائی گئی مشقوں کا بھی کچھ اثر تو ضرور ہوگا، اور اگرچہ وہ اس تکون (ابوالاعلیٰ، ابوالخیر اور قمرالحسن) کے سب سے مستعد شاگرد تھے، پھر بھی ممکن ہے کبھی کبھی ابوالاعلیٰ کو نیاز کی زجر مشفقانہ سے بھی سابقہ پڑا ہو۔ اگر ابوالخیر مودودی اپنا مضمون مکمل کرلیتے تو اور بھی تفصیلات مہیا ہوجاتیں، لیکن وہ ع تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل! کا پیغام دیتے ہوئے اپنا مضمون ادھورا چھوڑ گئے، لیکن ہمیں اپنے موقف کی حمایت میں ایک اور معتبر وساطت حاصل ہے، جس سے مولانا مودودی کے تلمیذ نیاز ہونے کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے۔ آپ اور ہم اچھی طرح واقف ہیں کہ مولانا مودودی نے اپنی زندگی کے کئی برس سرگرم صحافت میں بھی گزارے تھے۔ وہ پہلے 'تاج' (جبل پور)، اور پھر 'مسلم' (دہلی) نامی اخبارات کی ادارت کرنے کے بعد جمعیۃ علمائے ہند کے اخبار 'الجمعیۃ' کے اڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔ مشہور ہے کہ 'کام سے کام بنتا جاتا ہے' یعنی ایک کام میں لگ جانے سے آدمی کا کام سدھرتا ہے یا اُسے اپنا مقصد حاصل ہوتا ہے۔ پر ہمیں تو یہاں یہ کہنا ہے کہ مجنوں نے نیاز ہی کے دبستاں میں لام الف لکھنا سیکھا تھا۔[4] یعنی مولانا مودودی نے

صحافت کی ابجد نیاز فتح پوری سے سیکھی تھی۔

بھوپال میں ابوالاعلیٰ کی نوشت و خواند کی مشق کرانے اور ان کی طلاقت لسانی کو سان پر چڑھانے کا زمانہ 17-1916 میں تقریباً دو برس پر محیط رہا تھا، جب کہ صحافت کا عملی درس دینے کی بات 1919 سے تعلق رکھتی ہے، جس کی مدت تین ماہ رہی۔ اور ہماری اس خبر کا مبدا ملا واحدی دہلوی کی مشہورِ زمانہ کتاب 'میرے زمانے کی دلی' ہے، اور اسی کتاب کے بعض مطالب کی وضاحت پر واحدی مرحوم کا مضمون 'نیاز اور دلی' بھی ہمارے پیش نظر ہے۔ ملا واحدی کے خلوصِ نیت اور ان کی کتاب کی معتبریت سے شاید ہی کوئی انکار کر سکے گا۔ وہ رقم طراز ہیں:

(1) ''میں نے اس اخبار کی چیف اڈیٹری کے لیے جناب نیاز فتح پوری کو بلا لیا تھا۔ حاجی ریاض الدین بریلوی وغیرہ 'رعیت' کے معاون اڈیٹر تھے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھنے کی ابتدا اعزازی طور پر 'رعیت' کے اڈیٹوریل اسٹاف میں شامل ہو کر کی تھی۔'' 'میرے زمانے کی دلی' ص 172

(2) ''1919 میں مجھے نیاز صاحب کی دوبارہ[5] ضرورت پڑی۔ سردار دیوان سنگھ مفتوں کا روزانہ 'رعیت' بھیا احسان الحق نے اور میں نے لیا تھا۔ نیاز صاحب سے درخواست کی گئی کہ چھٹی لے کر آ جائیں، اور 'رعیت' کی چیف اڈیٹری سنبھالیں، چنانچہ نیاز صاحب آ گئے۔ اس دفعہ نیاز صاحب کا دلی میں فقط تین مہینے قیام رہا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے جو اب امیر جماعت اسلامی ہیں، اخبار 'رعیت' ہی کے سلسلے میں نیاز صاحب کی شاگردی اختیار کی تھی۔ مودودی صاحب 1919 میں اٹھارہ انیس برس (مولانا مودودی کی خود کی بیان کردہ تاریخ پیدائش کے حساب سے سولہ سترہ برس) کے ہوں گے نیاز صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ 'یہ اخبار نویسی سیکھنا چاہتے ہیں۔ تنخواہ نہیں لیں گے۔ بس ایک میز اور کرسی کی ضرورت ہے۔'' 'نیاز اور دلی' ص 80 'نگار پاکستان نیاز نمبر حصہ اول

اس زمانے میں ابوالاعلیٰ اپنی قلم کاری کے ابتدائی نقوش میں کہیں کہیں نیاز کی تحریروں کے حوالے یا اُن کی سند پیش کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً جریدہ 'تمدن' (جولائی 1919) میں 'انشا' کے قلمی نام سے کسی کی تحریر 'حسنِ ادا' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ ابوالاعلیٰ نے اُس پر تنقید کی تھی، اور اس مضمون کو 'اپنے اہمال میں اختراع فائقہ' قرار دیتے ہوئے رسالے میں اُس کی اشاعت کو سخت شرمناک بتایا تھا۔ انشا نے ایک جگہ لکھا تھا:

''... ہاں کون ہے وہ جو نرم جبین اور گلابی ہونٹوں کی خشکی کو دیکھے اور سر نہ دُھنے۔'' اس پر مودودی نے لکھا تھا ''سبحان اللہ کس قہر پر سر دُھنوایا ہے۔... ہم تو شگفتہ گلاب کو پسند کرتے ہیں... مگر معلوم ہوا کہ آپ کے نزدیک گلاب میں دل کشی اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ اُس کی پتیاں زرد ہو جاتی ہیں اور وہ مرجھا کر گر پڑتا ہے۔ اب تک تو میں یہ سمجھتا تھا کہ نیاز صاحب نے لبوں کی تعریف میں یہ شعر کہہ کر اُن کو بے نیاز تعارف کر دیا ہے۔

پھر کسے لب کہو، اگر چھن جائے
تازگی مے کی اور گلاب کا رنگ

لیکن مدتوں کی تلاش و جستجو کے بعد آج ادیبوں کے ایک ایسے گروہ کا پتا چلا ہے، جس کے نزدیک لبوں میں حُسن پڑیاں جمنے کے بعد پیدا ہوتا ہے، اور اس گروہ کے صدر جناب انشا ہیں۔'' 'مضمون 'حسن ادا اور ادب' از ابوالاعلیٰ مودودی مشمولہ 'الناظر' لکھنؤ، اکتوبر 1919

نیاز نے اپنا جریدہ 'نگار' آگرے سے فروری 1922 میں جاری کیا تھا۔ اس کی 1924 کی فائل میں ہمیں مولانا مودودی کے یہ مضامین نظر آتے ہیں (1) مصطفیٰ کمال پاشا (2) ہندستان کا صنعتی زوال (دو قسطوں میں) اور 1925 کی فائل میں ابوالخیر مودودی کے مضامین (1) 'بصریات میں حکمائے اسلام کے اکتشافات' اور (2) 'بصریات اور علمائے اسلام' ملتے ہیں۔ ان مضامین کا شمار مودودی برادران کی ابتدائی تحریروں میں کیا جا سکتا ہے، گرچہ 1920 میں مولانا مودودی ہفت روزہ 'تاج' جبل پور کے مدیر بن چکے تھے۔

دونوں بھائیوں کے ذوقِ طبیعت کے فرق کو واضح کرتے ہوئے نیاز نے ایک بار 'نگار' میں چھپے ایک مضمون کے فٹ نوٹ میں یوں اظہار خیال کیا تھا۔

''... میں مودودی صاحب کو اُس وقت سے جانتا ہوں جب وہ صاجزدگی کے عالم میں بھوپال آئے تھے اور یہ اور ان کے بڑے بھائی ابوالخیر مودودی دونوں میرے پاس گھنٹوں بیٹھتے تھے... یہ دونوں بھائی بہت ذہین تھے، لیکن دونوں کی ذہنیتوں میں بڑا فرق تھا۔ ابوالخیر میں ادبیت اور ادبیت میں لچک تھی اور ابوالاعلیٰ میں مذہبیت اور مذہبیت میں تقشف۔''[6]

1963 میں جب 'نگار' کے 'نیاز نمبر' کا اعلان کیا گیا تو 1916 میں شروع ہوئے اس قصے کو تقریباً نصف صدی کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس دوران میں نیاز نے اس موضوع پر کبھی کچھ لکھا نہ کہا اور نہ اسے کوئی اہمیت دی تھی۔ فرمان فتح پوری نے انھیں اس نمبر کے متوقع قلم کاروں کی فہرست دکھائی تو اس میں مولانا مودودی اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے نام شامل دیکھ کر نیاز نے فرمان سے کہہ دیا تھا کہ ان دونوں سے وہ کوئی توقع نہ رکھیں، کیوں کہ 'یہ دو مذہبی حضرات ہیں، جن کے حضور میں انھیں' کافر مطلق' اور 'نگار' کو 'صحیفہ الحاد' سمجھا جاتا رہا ہے۔ 'نگار' کے ملاحظات (اگست 1963)

میں پہلی بار انھوں نے اپنی یادوں کے نہاں خانے سے مولانا مودودی کے ساتھ اپنے تعلقات کی ایک دل کش تصویر پیش کی ہے، اور نصف صدی کے حجاب کو الٹ دیا ہے۔ ان کی اس تحریر سے نہ صرف ہمارے سوال (مولانا مودودی کی نیاز سے شاگردی) کا حتمی جواب مل جاتا ہے بلکہ بعض دلچسپ تفصیلات بھی فراہم ہو جاتی ہیں:

"وہ (مودودی) بھی مجھے کافر و ملحد سمجھتے ہیں... حالاں کہ اب سے تقریباً نصف صدی پہلے کی بات ہے کہ ابوالاعلیٰ اور ان کے بڑے بھائی ابوالخیر دونوں کا طویل زمانۂ تعلیم (جب دام ہمرنگ زمیں بوَد) اسی کافر و ملحد کی صحبت میں بسر ہوا ہے اور سب سے پہلے 'نگار' ہی نے انھیں روشناسِ خلق کیا۔ ہوسکتا ہے کہ بھوپال کی وہ رنگین شامیں جب تاج محل کے تالاب میں وہ اور میں دونوں ایک ہی کشتی میں بیٹھ کر پانی سے کھیلتے ہوئے گزر جایا کرتے تھے، انھیں فراموش ہوگئی ہوں اور شب و روز کے علمی و ادبی مذاکرات جن سے ان کے ذہن کی تعمیر ہو رہی تھی، ان کے دل سے محو ہو گئے ہوں، لیکن میں اس لطیف زمانے کی یاد کبھی نہیں بھلا سکتا اور اس وقت بے اختیار مجھے مومن کی ایک مشہور غزل یاد آ رہی ہے۔ (ابوالاعلیٰ کو یاد ہو کہ نہ یاد ہو!) مجھ کو ابوالاعلیٰ (مولانا مودودی نہیں) اب بھی عزیز ہیں، اور غالباً ہمیشہ رہیں گے۔" 'نگار' ملاحظات، ص: 5، جولائی۔ اگست 1963

اگرچہ نیاز نے ابوالاعلیٰ کا ذکر بڑے محبت بھرے پیرائے میں کیا ہے، لیکن شاید انھوں نے بھی احساس کیا ہوگا کہ ان کے درس میں کہیں کوئی کمی رہ گئی تھی، ورنہ ابوالاعلیٰ، مولانا مودودی کبھی نہیں بنتے!

درسِ وفا اگر بود زمزمۂ محبتی
جمعہ بہ مکتب آورد طفل گریز پائے را

پس نوشت: کہا جاسکتا ہے کہ آگے چل کر مودودی اور نیاز نے فکری اعتبار سے ایسی دوری اختیار کی کہ گویا ایک نے کعبے کی راہ لی تو دوسرے نے ترکستان کی۔ پھر بھی نیاز نے جریدہ 'نگار' میں مودودی یا اُن کی جماعت کو تنقید کا نشانہ بنانے سے اعراض کیا۔ 'نگار' کے 'ملاحظات' میں ملکی سیاست پر بحث میں کبھی ضمناً جماعتِ اسلامی کا ذکر آ بھی گیا تو بحیثیت ایک سیاسی جماعت کے اُس کی کارکردگی پر نقد و تبصرہ کرنے پر اکتفا کیا گیا۔ البتہ 1946 میں پروفیسر شوکت سبزواری نے مولانا مودودی کے مسئلہ امارت پر اور اُن کے سیاسی عزائم کے تحت اسلامی روایات و فقہی اصطلاحات کو نیا رنگ دینے کی روش پر ایک تنقیدی مقالہ 'مودودی نظریۂ امارت۔ اسلام کے نقطۂ نگاہ سے' لکھا تھا، اور جب جماعت کے جریدے 'ترجمان القرآن' نے اُس کی اشاعت سے انکار کر دیا تو وہ مقالہ 'نگار' کے مئی 1946 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ وہ مقالہ ایک سنجیدہ بحث کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا، اور اس سلسلۂ بحث کے مندرجہ ذیل مضامین 'نگار' میں شائع ہوئے:

- ابوالاعلیٰ مودودی کا اسلامی نظریۂ سیاست (قسط اول) از: سید اختر علی تلہری۔ جون 1946
- ابوالاعلیٰ مودودی کا اسلامی نظریۂ سیاست (قسط دوم) از: سید اختر علی تلہری۔ جولائی 1946
- ابوالاعلیٰ کی تحریک عقلی نقطۂ نظر سے۔ از: اسماعیل رفیعی۔ اگست 1946
- مودودی اسکول کے تربیت یافتہ نقاد۔ از: پروفیسر شوکت سبزواری۔ اکتوبر 1946
- مسئلہ امارت سنت کی روشنی میں۔ از: پروفیسر شوکت سبزواری۔ دسمبر 1946
- مودودی اسکول کے تربیت یافتہ نقاد۔ از: جلیل احسن ندوی اعظمی۔ دسمبر 1946
- مودودی اسکول اور مسئلہ امارت (قسط اول) از: پروفیسر شوکت سبزواری۔ اپریل 1947
- مودودی اسکول اور مسئلہ امارت (قسط دوم) از: پروفیسر شوکت سبزواری۔ مئی 1947

نیاز نے اس بحث میں شامل ہونے کا عندیہ تو ظاہر کیا تھا (دیکھیے 'نگار' جون 1946 فٹ نوٹ ص: 48) لیکن نہ جانے کیوں انھوں نے خود کو اس مباحثے سے الگ ہی رکھا۔ شاید ابوالاعلیٰ کی محبت مودودی کی زجر و توبیخ کی راہ میں حائل ہو گئی تھی۔ (اسیم)

حواشی:

1۔ ابوالخیر مودودی نے اپنی اور ابوالاعلیٰ کی نیاز سے پہلی ملاقات کا یہی سال لکھا ہے۔
2۔ 'نگار' ستمبر 1963
3۔ خواجہ تاش بھی ایک آقا کے غلام، مجازاً ایک استاد کے شاگرد
4۔ 1918 میں ابوالخیر مودودی 'مدینہ' بجنور سے وابستہ ہوئے تھے اور بعد میں انھوں نے ابوالاعلیٰ کو بھی وہاں بلا لیا تھا، لیکن خود ابوالخیر کی 'مدینہ' کی ملازمت دو مہینے کی رہی، اور ابوالاعلیٰ کا ان کا ساتھ چند ہفتوں کا، اور دونوں ہی بھائیوں نے ایک ساتھ 'مدینہ' چھوڑ دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ابوالاعلیٰ نے اس مختصر قیام میں بھلا کیا سیکھا ہوگا۔
5۔ پہلی بار کی تفصیل یہ ہے کہ جب 1914 میں حکیم اجمل خان کے اپنے خاندان کے بچوں کے لیے قائم کردہ اسکول میں نیاز ہیڈ ماسٹر بن کر گئے تھے تو سال بھر تک ملا واحدی کے یہاں قیام کیا تھا اور ان کے ہفت روزہ اخبار 'خطیب' میں لکھتے رہے تھے۔
6۔ مقالہ 'مودودی کا نظریۂ امارت' اسلام کے نقطۂ نگاہ سے، از: پروفیسر شوکت سبزواری، مشمولہ 'نگار' مئی 1946، فٹ نوٹ: 31

ماخذ: ○ 'نقوش' (لاہور) 'شخصیات نمبر' حصہ اول، جنوری 1955 ○ 'نقوش' (لاہور) 'آپ بیتی نمبر' حصہ دوم، جنوری 1964 ○ 'نگار پاکستان' 'نیاز نمبر' حصہ اول 1963 ○ 'نگار پاکستان' جولائی، اگست 1963 ○ 'نگار پاکستان' ستمبر 1963 ○ 'میرے زمانے کی دلی'، از ملا واحدی (مطبوعہ گلڈ، انجمن کتاب گھر، کراچی۔) وغیرہ

اسیم کاویانی، ممبئی۔ ای میل آئی ڈی: aseemkavyani@gmail.com

اردو تاریخ کا ایک گم شدہ ورق

پہلا انڈو جرمن شاعر : فراسو

راحت ابرار

اینگلو یوروپین شعرا میں فرانس گادلیب کوئن 'فراسو' Francois Gotlieb Farasoo کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ وہ اٹھارھویں صدی عیسوی کا پہلا انڈو جرمن شاعر تھا۔ وہ نہ صرف اردو اور فارسی کا ممتاز شاعر تھا بلکہ اسے ہندی پر بھی عبور حاصل تھا۔ فراسو کے والد جان آگسٹائن گوٹلی کوئن پولینڈ جرمنی کے باشندے تھے اور والدہ فرانسیسی تھی جس سے 15 مارچ 1777 میں کٹرہ بیگم اندرونِ چاندنی چوک دہلی میں فرانس کوئن پیدا ہوا۔

فرانسیسی شاعر جارج پیش شور George Puech Shor نے اپنے نانا فراسو کے حالات قلم بند کیے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ شور نے نانا کے انتقال کے بعد موضع ہر چند پور تحصیل پرگنہ کھیکوا ضلع باغپت میں فراسو کا مقبرہ تعمیر کرایا تھا جس پر ایک تختی نصب کی تھی۔ شور نے لکھا ہے کہ فراسو کا انتقال ہیضہ اور پیچش کے مرض میں 1861 میں چوراسی سال کی عمر میں ہوا۔ باغپت سے صرف چھ کلو میٹر کے فاصلے پر ہر چندر پور کی اس حویلی کے باہر فراسو کی پختہ قبر کے نشان آج بھی موجود ہیں۔ البتہ مقبرہ اور قبر کا کتبہ اب موجود نہیں ہے۔ قبر کے نزدیک ایک بہت پرانا کھرنی کا درخت بھی موجود ہے۔ حویلی کا صدر دروازہ آثار قدیمہ کا کوئی کھنڈر معلوم ہوتا ہے۔ آج کل اس حویلی پر گاؤں والے قابض ہیں۔

فرانس کوئن فراسو کی تربیت اس کے خالو لوئی بالتھرزین ہارٹ عرف نواب ظفریاب خاں صاحب کی نگرانی میں ہوئی جو خود بھی جرمن تھا۔ ظفریاب مسلمان رئیسوں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا اس لئے اس کے مصاحبین میں اردو اور فارسی شعرا کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ فراسو نے شاہ نصیر سے تلمذ حاصل کیا تھا اس کی تائید فراسو کے ایک شعر سے ہوتی ہے:

تجھ کو حاصل ہے فراسو فیضِ اصلاحِ نصیر
شاعرانِ شہر میں تو اہلِ دیواں بن گیا

فراسو کا قلم ہر صنفِ سخن پر رواں تھا۔ اس نے لاتعداد قصیدے بھی کہے اور مثنویاں بھی لکھیں۔ غزل اور ہزل پر بھی اسے دسترس حاصل تھی۔

فرانس کوئن فراسو کو زبان و بیان پر کتنی قدرت حاصل تھی، اس کا اندازہ اس کے ایک منظوم خط سے لگایا جا سکتا ہے جو اس نے فی البدیہہ لکھ کر اپنی چھوٹی سالی کو بھیجا تھا۔ فراسو لکھتا ہے:

عزیز از جان عزیزہ اور پیاری
ہمیشہ ہے تمہاری یادگاری
وہ دہلی میں ہمیں پہنچا تھا نامہ
ثنا اس کی نہیں لکھ سکتا خامہ
ضرورت کا بت ہم کو جو تھا کام
گئے تھے بھول ہم گڑیوں کا پیغام
تمہاری بہن بھی لکھتی دعا ہے
تمہاری دید اس کا مدعا ہے
جو یاں دونوں تمہاری بھانجی ہیں
تو وہ لکھتی ہزاروں بندگی ہیں

ان ہی لڑکیوں میں سے ایک کا نام میڈلا کوئن تھا جو آگے چل کر فرانسیسی ادیب اور شاعر جارج پیش شور کی والدہ ہوئیں۔ رام بابو سکسینہ اپنی مشہور تصنیف 'یوروپین اینڈ انڈو یوروپین پوئٹس آف اردو اینڈ پرشین' میں کلیات فراسو کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ اس کا ایک مخطوطہ لالہ سری رام کے کتب خانے میں موجود تھا۔ دیوان کا نام 'گنبد گیتی نما' تھا۔ اس میں فراسو کا اردو، فارسی اور ہندی کا تمام کلام محفوظ ہے۔ 'شمس الذکا' کے نام سے فراسو نے ایک تذکرہ بھی لکھا تھا جس میں اس کے خالو ظفریاب کے درباری شعرا کے سوانح اور انتخاب کلام دیا ہوا ہے جس کے پایۂ تکمیل کو پہنچنے کا سنہ 1792 ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے فراسو کے کلام کا انتخاب اپنے رسالے اردوئے معلیٰ کے ضمیمے میں شائع کیا تھا۔ اسی کا انتخاب رام بابو

سکینہ نے اپنی مذکورہ بالا تصنیف میں دیا ہے۔ پیارے لعل شاکر میرٹھی نے 1939 میں ادبی دنیا (لاہور) کے سالنامے میں اس شاعر کے متعلق ایک مضمون سپردِ قلم کیا ہے۔ اردو کے ممتاز محقق ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی نئے اور پرانے چراغ کے عنوان سے پرویز بک ڈپو دلّی سے شائع اپنی کتاب میں اردو کا جرمن شاعر فراسو اور اس کی تصنیفات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

کھیکڑا ڈگری کالج کے سابق پرنسپل اور باغپت کے بزرگ مورخ پروفیسر ایم این شرما نے اپنی انگریزی کتاب 'دی لائف اینڈ ٹائمز آف بیگم سمرو آف سردھنہ (1830 - 1750)' میں بیگم سمرو کے میر منشی گوکل چند کی مشہور تصنیف 'زیب تواریخ' کے حوالے سے لکھا ہے کہ اینگلو انڈین شاعری میں فراسو کو ایک ممتاز مقام حاصل تھا اور اس دور میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ فراسو بیگم سمرو کا درباری شاعر بھی تھا اور وہ بیگم سمرو اور اس کے بیٹے کی شان میں قصیدے لکھتا تھا اور بیگم سمرو کے دربار سے اسے دو سو روپیہ ماہانہ پینشن ملتی تھی۔ وہ بڑوت کا تحصیل دار بھی رہ چکا تھا۔

پروفیسر شرما کی تصنیف کے مطابق فراسو کی کلیات 'گنبد گیتی نما' میں زیادہ تر قصائد ہیں جو بیگم سمرو اور ظفر کی شان میں کہے گئے ہیں اور اس کلیات کی ضخامت 240 صفحات پر مبنی ہے۔ ان کا دوسرا شعری مجموعہ 'جام جمشید نما' میں ید بیضا میں وہ بچوں کی تعلیم کی اہمیت و افادیت، عشق افزا میں وہ عشق و محبت کی کہانیوں کو بیان کرتا ہے، مقالاتِ تعالیٰ میں وہ صوفی ازم اور خدا کی برتری بیان کرتا ہے، عصائے موسیٰ کے عنوان سے وہ بزرگوں سے مخاطب ہوتا ہے، اس کے علاوہ وہ نظمِ انشاءٔ اور نسیم دلکشا کا بھی مصنف ہے۔ اس نے چودہ مثنویاں تصنیف کی تھیں اور لاتعداد ہندی دوہے بھی کہے ہیں جو مختلف موضوعات پر ہیں۔ دیوانِ فارسی، انتخاب فارسی، نظم دیوانِ ہزلیات، نظم دیوانِ غزلیات کے ساتھ ساتھ اس کی ایک طویل نظم بھی ہے جو بھرت پور کے قلعے کو فتح کرنے کی خوشی میں لکھی گئی ہے۔ سردھنہ دربار میں شامل ہونے والے شعراء کے کلام کا مجموعہ 'شمس الذکا' کے عنوان سے اس نے ترتیب دیا تھا جس کا سنہ اشاعت 1799 ہے۔ منشی گوکل چند کا یہ مخطوطہ 1824 کا ہے جس میں فراسو کی ادبی سرگرمیوں پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔

فراسو اردو کا ماہر اور مصنف تھا۔ چنانچہ اس کی مثنوی 'دہلی مرحوم' اور دوسرے کلام سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس نے اردو زبان کی ضخیم لغات لکھ کر یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ وہ اردو لغت کا بھی ماہر تھا۔ مصنف کا منشا ایک طرح کی اردو انسائیکلو پیڈیا تیار کرنا تھا۔ اس میں سب زبانوں کے تمام اہم الفاظ، اصطلاحات، محاورات و امثال جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فراسو کی بعض تصانیف پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں پنڈت برج موہن دتاتر کیفی کی عطا کردہ ہیں۔

فراسو کو مفتیوں، قاضیوں اور ملاؤں کی کہانیوں سے خاص دلچسپی تھی۔ جنسی اور شہوانی قسم کے لطیفے اور غلیظے بھی اس کی کتاب میں موجود ہیں۔ اس نے عشرت النسا کے عنوان سے ایک رسالہ بھی لکھا تھا جس میں ہندوستان کے مختلف صوبوں اور قوموں کی عورتوں کے حسن کی تعریف و توصیف بیان کی گئی ہے۔ فراسو کی جدت پسند طبیعت اردو کی شاعری بلکہ سارے ادب میں نئی راہیں پیدا کرنے کے لئے بے تاب نظر آتی ہے۔

فراسو اس عہد کا شاعر ہے جب دہلی کے مشاعروں میں شاہ نصیر اور ان کے معاصرین مثلاً حکیم ثناءاللہ فرقان، حکیم قدرت اللہ قاسم، مرزا عظیم بیگ، شیخ ولی محب اور حافظ عبدالرحمٰن احسان، طویل غزلوں، سنگلاخ زمینوں اور ناقابلِ عبور قوافی کے ذریعہ قوت آزمائی کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فراسو کے یہاں 17 اور 22 اشعار کی غزلیں بکثرت موجود ہیں۔

فرانس گادلیب کوئن فراسو 1857 کے انقلاب کا بھی عینی شاہد ہے۔ 1857 کے ہنگامے میں جب انقلابیوں نے دلّی پر قبضہ کر لیا تو بہت سے انگریز افسران اپنی جان بچا کر فراسو کی حویلی ہر چندر پور میں چھپے تھے اور

فرانسیسی شاعر جارج پیش شور George Puech Shor نے اپنے نانا فراسو کے حالات قلم بند کئے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ شور نے نانا کے انتقال کے بعد موضع ہر چند پور تحصیل پرگنہ کھیکڑا ضلع باغپت میں فراسو کا مقبرہ تعمیر کرایا تھا جس پر ایک تختی نصب کی تھی۔ شور نے لکھا ہے کہ فراسو کا انتقال ہیضہ اور پیچش کے مرض میں 1861 میں چوراسی سال کی عمر میں ہوا۔ باغپت سے صرف چھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہر چندر پور کی اس حویلی کے باہر فراسو کی پختہ قبر کے نشان آج بھی موجود ہیں۔ البتہ مقبرہ اور قبر کا کتبہ اب موجود نہیں ہے

فراسو نے 1857 کے غدر کی منظوم تاریخ 'فتح نامہ' کے عنوان سے لکھی تھی جس کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ اور دوسرا مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی میں موجود ہے۔ فراسو کا نواسہ جارج پیش شور بھی اردو اور فارسی کا شاعر اور ادیب تھا جو خود بھی 1857 کے واقعات کا عینی شاہد تھا۔ اس نے اردو زبان میں ایک روزنامچہ 'وقائع حیرت افزا' تحریر کیا جس میں دلی، میرٹھ، علی گڑھ اور ہاتھرس کے حالات و واقعات کو قلم بند کیا ہے۔

فراسو نے جو اس علاقہ کا رئیس تھا نہ صرف ان انگریزوں کو پناہ دی بلکہ بہت سے انقلابیوں کو قتل بھی کرایا جن میں سب سے معتبر نام شاہ مل جاٹ کا ہے۔ انقلابیوں نے کئی مرتبہ فراسو کے محل پر حملہ بھی کیا تھا مگر اس نے بہت سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ہر طرح کا لالچ دے کر انہیں اپنے حلقے میں شامل کرلیا اور انقلاب کی ناکامی کے بعد حکومتِ برطانیہ نے اس کو تین گاؤں بھی تحفہ میں پیش کئے۔ فراسو آخری دن تک اپنی اس حویلی میں ہی رہا۔ اس حویلی کا صدر دروازہ آج بھی 1857 کے خونی انقلاب کا گواہ ہے۔ گاؤں میں اس کے محل کے نقش و نگار اب بھی باقی ہیں اور اس کے خاندان کے ایک فرد نے 1990 میں اس محل کو مع تمام باغات کے فروخت کردیا تھا اور اب یہ خاندان دوسو سال بعد پھر فرانس واپس چلا گیا ہے۔

فراسو نے 1857 کے غدر کی منظوم تاریخ 'فتح نامہ' کے عنوان سے لکھی تھی جس کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ اور دوسرا مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی میں موجود ہے اور اس منظوم تاریخ کا عکس مضمون نگار کے پاس بھی موجود ہے۔ فراسو کا نواسہ جارج پیش شور بھی اردو اور فارسی کا شاعر اور ادیب تھا۔ جارج خود بھی 1857 کے واقعات کا عینی شاہد تھا۔ اس نے اردو زبان میں ایک روزنامچہ 'وقائع حیرت افزا' بھی تحریر کیا ہے جس میں دلی، میرٹھ، علی گڑھ اور ہاتھرس کے حالات و واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ یہ روزنامچہ ایک مخطوطہ کی شکل میں مضمون نگار کے پاس محفوظ ہے۔ شور کی تصنیفات میں اردو کے چھ دیوان اور ایک مثنوی (سوانح عمری)، ایک دیوان فارسی کا اور ایک نثری کارنامہ 'وقائع حیرت افزا' کے نام سے شامل ہیں۔

جارج پیش شور، ایامِ غدر میں اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ کر میرٹھ منتقل ہوگئے تھے مگر اپنے نانا فراسو کی وفات کے بعد پھر ہر چندر پور چلے آئے تاکہ نانا کی جائیداد کا انتظام سنبھال سکیں۔ فراسو نے ایک ہندو عورت بختی بائی کو اپنی داشتہ بنالیا تھا۔ خود فراسو نے اپنے ایک شعر میں اس کا ذکر بھی کیا ہے:

لگ گیا جس سے فراسو دل وہی محبوب ہے
عشق میں کب پوچھتا ہے کوئی نیکو ذات پات

فراسو نے اپنے انتقال سے قبل اپنی تمام جائیداد اپنی داشتہ بختی بائی کے نام وصیت کردی تھی۔ وہ عورت اپنے عزیز کو جائیداد منتقل کرنا چاہتی تھی، اس لئے جارج پیش شور سے اس کی مقدمہ بازی بھی ہوئی۔

جارج پیش کا دیوان (1872) جو مطبع چشمہ علم بے خزاں، میرٹھ سے شائع ہوا ہے اس میں مسماۃ بختی بائی صاحبہ کے انتقال پر قطعہ تاریخ وفات درج ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا انتقال 1865 میں ہوگیا تھا اور تبھی سے وہ اپنے نانا کی جائیداد کے مالک بن گئے اور ان کا شمار صاحبِ حیثیت لوگوں میں ہونے لگا۔ وہ لکھتے ہیں:

ندائے غیب سن کر شور نے تاریخ یہ لکھی
ہوا باغِ ارم بھی خلد آباد مدت میں

ایک جرمن ہونے کے باوجود فراسو کو اردو زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی۔ اس کے اشعار میں شگفتگی، روانی اور آمد کی جلوہ گری ہر جگہ نمایاں ہے۔ اس کی شاعری میں کہیں کہیں جذبات کی کارفرمائی بھی اپنی شان دکھاتی نظر آتی ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں تاکہ فراسو کی ادبی حیثیت متعین کی جاسکے:

درد ہے، غم ہے، ناتوانی ہے — مرگ کا نام زندگانی ہے
قصر تعمیر کر چکے ہیں بہت — منزلِ گور اب بنانی ہے
گر پختہ مزاج ہو تو سمجھو — ہے رشتہ خام زندگانی
یہ صبح سے حال ہے تو کیونکر — ہوگی تا شام زندگانی
آنے کی خبر ہے تیرے لیکن — آتا نہیں ہے اعتبار دل کو
گردش نے تری توجہ سے کھویا — اے گردشِ روزگار دل کو
قلم بھی جان پر روتا ہے میری — یہ آنسو ہیں نہ سمجھو تم سیاہی
فراسو تم سے وہ ہوتا جدا کیوں — تمہارا کچھ بھی گر ہوتا ذرا پاس

■■

Dr Rahat Abrar, AMU Aligarh-202001

گوشۂ معاصرین

فکشنی شاعری

مظہر الزماں خان: علامتوں کا قلزم

محمد تاتار خاں

مظہر الزماں خان اردو فکشن کا ایک معروف نام ہے۔ یہ علامتی اور ایک مشکل پسند افسانہ نگار ہیں۔ ان کی کہانیوں اور ناولوں میں اشارے، استعارے، علائم اور فلسفہ ایک عجیب وغریب انداز میں دکھائی دیتے ہیں۔ جملوں کی ساخت بھی دوسرے لکھنے والوں سے منفرد ہے۔ ذیل کے چند جملے شاید اس بات کی گواہی دیں گے:

''میں مظہر الزماں خاں اپنے تعلق سے ایک اہم اعلان کرتا ہوں کہ نہ میں کہانی کار ہوں نہ ناول نگار ہوں، نہ سوانح نگار ہوں اور نہ ہی ڈراما نگار ہوں۔ میں تو صرف اور صرف کراماً کاتبین ہی ہوں اور زمینوں، موسموں، انسانوں اور جانوروں کے اعمال اور حالات ہی قلم بند کرتا ہوں کیونکہ کہانی کار ناول نگار اور ڈراما نگار تو وہ ہوتے ہیں جو کہانیوں، ناولوں اور ڈراموں میں ہر جگہ موجود ہوتے ہیں اور زمینوں، زمانوں، انسانوں، جانوروں اور موسموں سے وہی کچھ کرواتے ہیں جو وہ چاہتے ہیں کہ وہ دراصل کٹھ پتلیوں کا کھیل کھلانے والے ہوتے ہیں۔ بہرحال میں ایک بار پھر یہ عرض کردوں کہ میں نہ کہانی کار ہوں نہ ناول نگار ہوں، نہ ڈرامہ نگار ہوں اور نہ مصنف ہوں میں تو صرف اور صرف کراماً کاتبین ہوں۔''

مذکورہ بالا اشارتی تعارف اس بات کا غماز ہے کہ مظہر الزماں خان کی تخلیقات میں اشارے، استعارے، علائم مختلف نوع سے ظاہر ہوتے ہیں۔ شاید اسی بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے وزیر آغاز نے لکھا ہے کہ ''مظہر الزماں خان کا فن مہابیانیہ کے زمرے میں آتا ہے۔ اس لیے کہ وہ ایسے انوکھے اور منفرد تجربات کو سامنے لا رہا ہے جس کے ذائقہ سے شاید ہی اردو کا کوئی اور ناول نگار یا افسانہ نگار اتنی شدت کے ساتھ آشنا ہوا ہے۔''

مظہر الزماں خان کی اب تک سات کتابیں شائع ہوکر مقبولیت کا درجہ پا چکی ہیں۔ ان کا پہلا افسانوں کا مجموعہ 'ہارا ہوا پرندہ' 1976 میں شائع ہوا جس کا پیش لفظ معروف نقاد شمس الرحمن فاروقی نے لکھا تھا۔ اس مجموعہ میں جملہ بارہ افسانے شامل ہیں، جن میں چیونٹی، ہارا ہوا پرندہ، شہر ملامت، شہر آشوب، صلیب پر ننگا سمندر اور اداس صدی کا کرب وغیرہ شامل ہیں۔ 'اداس صدی کا کرب' ڈراما کی شکل میں آل انڈیا ریڈیو کے ڈراما فیسٹول میں شریک ہوا تھا۔

اس کے پورے دس سال بعد ان کا ناول 'آخری زمین' 1986 میں شائع ہوا تھا جو اپنے اسلوب، ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے منفرد تھا۔ اس ناول میں سردار کا کردار ایک منفی انداز میں پیش ہوا تھا۔ ایک سفاکانہ لیکن ذہین، چالاک، مکار قائد کے طور پورے ناول میں پھیلا ہوا تھا وہ اس قدر زہریلا بتایا گیا تھا کہ اسے ڈسنے کے بعد سانپ مرجاتا ہے۔ وہ پوری قوم کے خوابوں کو جلاتا رہتا ہے۔ یہ ناول آج کے بلکہ ہر دور کے سیاسی قائدین پر ایک زبردست طنز ہے۔

ناول 'آخری زمین' کے بعد ان کا دوسرا ناول 'آخری داستان گو' (نئی الف لیلیٰ) 1994 میں شائع ہوا جو پہلے ناول سے زیادہ مقبول ہوا۔ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس ناول نے اردو کے چند گنے چنے ناولوں میں اپنا مقام بنایا۔

شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں ''مظہر الزماں خان کا ناول 'آخری داستان گو' کا عمومی مزاج شاعرانہ نثر کا سا ہے۔ ان کی نثر زیادہ شگفتہ، ڈرامائی، استعاراتی اور گتھی ہوئی ہے۔ یعنی مظہر الزماں خان کی نثر میں شدت (Urgency) ہے۔ تاثر کا فطری پن ہے اور طرز بیان زیادہ چونچال۔ ناول 'آخری داستان گو' میں مسلسل کچھ نہ کچھ ہوتے رہنے کے باعث قاری کی توجہ ناول سے ہٹتی ہی نہیں۔ پیکروں اور آوازوں کی فراوانی اور تکرار میں نظم کی سی کیفیت ہے۔ بنیادی طور پر میں اس غیر معمولی ناول کو فکشن نگاری کی تمثیل قرار دیتا ہوں۔ یہ ہمارے المیوں کی ایک موثر داستان ہے، عہد حاضر کا المیہ لکھنا آسان نہ تھا لیکن بیانیہ کو تمثیل بنا دینا غیر معمولی کارنامہ ہے۔''

انگریزی کے مشہور ناول نگار، نقاد، کہانی کار، شاعر، پدما بھوشن پروفیسر شیو کے کمار آخری داستان گو کے تعلق سے لکھتے ہیں ''مظہر الزماں خان کا ناول انوکھے، منفرد حالات کو بیان کرتا ہے۔ ان کا ایک ایک جملہ پڑھنے والوں کے اندر تیر کی طرح اتر جاتا ہے۔ اردو ناول 'آخری داستان گو' کو انگریزی ناولوں کے مدمقابل رکھا جاسکتا ہے۔''

مظہر الزماں خان کے ناول ہوں یا افسانے کسی بھی تخلیق کو پڑھیے ایک پر اسراریت قاری کے ساتھ چلتی رہتی ہے اور قاری عرشی وفرشی نظریات، وقت، حالات انسانی وجود، اصول وافکار اشاروں میں کائنات اور اس کے وجود کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے اور اسے یوں لگتا ہے کہ یہ کائنات اور اس میں بسنے والی تمام اشیا ایک خواب کی صورت لیے ہوئے ہیں۔ یہ ایک ایسا خواب ہے جس میں قوس قزح کی رنگینی بھی ہے زمین اور موسموں کی بو باس بھی۔

جہاں تک ان کے افسانوں کا تعلق ہے چند ایک کا مختصر تجزیہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ قاری، مظہر الزماں خان کے فن کو سمجھنے میں وقت محسوس نہ کریں۔ ان کا ایک افسانہ 'زمین پر ٹھہری ہوئی رات' ہے۔ اس افسانے میں مظہر الزماں خان نے لکھا ہے کہ ''ہمارے ملک اور پڑوسی ملک دونوں کو آزادی آدھی رات کو ملی اور اس کی صبح آزادی کے کئی سال کے باوجود دونوں زمینوں کے رہنے بسنے والوں کو نصیب نہیں ہوئی۔'' اس افسانے میں مظہر الزماں خان نے مرغ کی بانگ، صبح کی آمد، پرندوں کی چہچہاہٹ، ناخن کا کھوجانا، تھوہڑ کے درخت سے زخمی بلی کی چھلانگ اور دور سے بین کرنے کی آوازوں کو کچھ اس قدر موثر انداز میں بیان کیا ہے کہ ساری کہانی دکھائی دینے کے باوجود اس وقت تک نظر نہیں آتی جب تک اس کہانی کے باطن میں اتر کر کہانی کو کھلی آنکھوں سے دیکھا نہیں جاتا۔

ان کی ایک اور کہانی 'سوانح حیات' ہے۔ اس کہانی میں انہوں نے پورے مسلم معاشرے کو ایک اونٹنی کی زندگی کے طور پر پیش کیا ہے یعنی ساری قوم اس اونٹنی کی طرح ہے جو خود سے غافل اپنے معاشرے، اپنی تہذیب اپنے زمانے، اپنے حالات، اپنی زندگی، اپنی روایات اور نہ صرف لمحہ موجود سے ناواقف ہے بلکہ خود اپنی موت سے بھی غافل ہے۔ اونٹنی کا استعارہ پوری مسلم دنیا کا استعارہ بن گیا ہے۔

'ہارا ہوا پرندہ' کرب انگیز وجود کی ایک داستان ہے جو فرد واحد کے کرب کو پورے انسانی وجود کے طرز پر بیان کرتی ہے۔ یہ افسانہ یہ بتاتا ہے کہ ہر انسان اپنے تئیں دنیا کے اس پر اسرار جنگل میں اپنے ضمیر کی روشنی میں

'سوانح حیات' میں انہوں نے مسلم معاشرے کو اونٹنی کی زندگی کے طور پر پیش کیا ہے جو خود سے غافل اپنے معاشرے، اپنی تہذیب اپنے زمانے، اپنے حالات، اپنی زندگی، اپنی روایات اور نہ صرف لمحہ موجود سے ناواقف ہے بلکہ خود اپنی موت سے بھی غافل ہوتی ہے۔ اونٹنی کا استعارہ پوری مسلم دنیا کا استعارہ بن گیا ہے۔

'ہارا ہوا پرندہ' کرب انگیز وجود کی ایک داستان ہے جو فرد واحد کے کرب کو پورے انسانی وجود کے طرز پر بیان کرتی ہے۔ یہ افسانہ بتاتا ہے کہ ہر انسان دنیا کے اس پر اسرار جنگل میں اپنے ضمیر کی روشنی میں گھوم رہا ہے۔

گھوم رہا ہے۔ دھوپ کا چلکا، ضمیر کی وہ روشنی ہے جو انسان کے ازلی وجود میں شامل ہے اور جو اس روشنی کو حاصل کر لیتا ہے وہ اپنے اصل کو حاصل کر لیتا ہے۔ اس افسانے میں تصوف کی راہیں اور سلوک کا راستہ پوشیدہ ہے۔

'زمین اے زمین' ایسے دو بھائیوں کی کہانی ہے، جو ایک جان دو قالب ہیں۔ ان میں سے ایک بھائی صوف صفت ہے جو توکل باللہ ہے۔ دنیاوی چیزوں کو حقیر سمجھتا ہے۔ وہ کچھ نہ کھا کر بھی توانا نظر آتا ہے۔ اس کی نظر اپنے قلب پر رہتی ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے اپنے قلب میں دیکھتا ہے۔ تمام دنیاوی راستے اس کی کوشش کے باوجود اس کے اندر نہیں اتر سکتے صرف باہر رہتے ہیں۔ ہوائیں، موسم، زمین، حالات، ماحول اس کے ظاہر کو چھو کر گزر جاتے ہیں۔ گویا وہ آخری یقین کی منزل پر نظر رکھتا ہے۔

دوسرا بھائی اپنے بڑے بھائی کا عقیدت مند ہے اور اسے اپنے اندر رکھتا ہے۔ جب وہ ایسی زمین پر پہنچتا ہے جس کی تاریخ دنیا کی نظر میں مسخ ہے، دفعتاً اس کے سارے نظریات، عقائد، اصول اور محبت یک لخت ختم ہوجاتے ہیں۔ وہ اپنے بڑے بھائی پر برہم ہوجاتا ہے اور بھائی کی وہ گٹھری جو اپنے سر پر اٹھائے رکھتا ہے پھینک دیتا ہے۔ یہاں مظہر الزماں خان نے زمین کے مزاج کو پیش کیا ہے کہ بعض زمینوں کا مزاج ہی ایسا ہے۔

'کوفہ پھیل رہا ہے' میں مظہر الزماں خان نے ان گذری ہوئی صدیوں کو بیان کیا ہے، جو شہادت کے بعد کے واقعات اور حالات کو بیان کرتی ہیں۔ امام حسینؓ کی شہادت کے بعد زمین سے خیر و برکات اٹھالی گئی ہیں۔ آدمیوں میں

محمود ہاشمی لکھتے ہیں" مظہر الزماں خان کا فکشن، داستان، اسطور اور علامتی اظہار کے امتزاج سے ایک ایسی تخلیق کو مجسم کرتا ہے جس میں روشنی اور مفاہیم کے بے پناہ سرچشمے موجود ہوتے ہیں۔ فکشن کو عام نثری بیان سے مختلف بنانے کے لیے اسی معیاری اسلوب کی ضرورت ہے جو آج کے تقریباً سبھی افسانہ نگاروں کی دسترس سے نکلتا جارہا ہے... مظہر الزماں کے افسانوں میں جو زبان و اسلوب ہے وہ واضح کرتا ہے کہ فکشن میں لسانی اظہار کی سطح کیا ہونی چاہیے۔ اور تہہ نشین مفاہیم کو کس طرح سطح آب پر لانے بغیر تحیر، طلسم اور تمثیل کی روایت کا حامل بنایا جائے۔"

اجنبیت پیدا ہوگئی ہے۔ ان میں تمیز اور پرکھنے کی صلاحیت عنقا ہوگئی ہے۔ تجارت، ظاہری نفع میں تبدیل ہوگئی ہے۔ 'توشہ' جو آخرت اور ان کی زندگی کی استعارہ ہے وہ خون ہوگیا ہے کیونکہ توشہ کا خون ہوجانا مسلمانوں کی تاریخ کا ایک بلیغ اشارہ ہے جو ازل اور عہد حاضر کے ایک چھپے ہوئے اور ظاہر دونوں کے وقت کو بیان کرتا ہے۔

مظہر الزماں خان کے افسانوں میں وقت اور زمینوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے اور ہر زینے پر وہ وقت کو اس کی اپنی تاریخ کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی کہانیاں وقت کی سیڑھیوں پر ہوا کے قدموں کی طرح سفر کرتی ہیں۔

مظہر الزماں خان کے افسانوں میں جو علائم، اشارے اور استعارے ہیں وہ نہ صرف فکر انگیز ہیں، بلکہ ان علائم کے اندر ایک جہانِ معنی پوشیدہ ہے جو عام قاری کے لیے کچھ مشکل ضرور واقع ہوتا ہے۔

مظہر الزماں خان کے اکثر افسانوں میں ظاہر اور غیب کی دونوں تصویریں موجود ہیں، اور غیب اور ظاہر دونوں ایک دوسرے میں ضم ہیں۔ دیگر صورت میں اسے یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر ظاہر موجود نہیں تو غیب کی موجودگی کا احساس بھی ممکن نہیں اگر غائب ناموجود ہے تو ظاہر کے وجود میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مظہر الزماں خان کا کہنا ہے کہ 'فکشن' میں ایک دھند کا ہونا ضروری ہے۔ اور اس دھند کو ایک ذہین قاری ہی ہٹا سکتا ہے کہ اس کی آنکھیں دھند میں پوشیدہ چیزوں کو تلاش کر کے آئینہ کردیتی ہے۔ چنانچہ مظہر الزماں خان کے فکشن میں دھند کی چادر جب صاف ہوتی ہے تو خیال، موضوع، امیجری، استعارہ اور علائم اپنی اپنی شکل میں نمودار ہوجاتے ہیں اور پورا افسانہ اپنی اصل صورت کے ساتھ حاضر ہوجاتا ہے۔

محمود ہاشمی لکھتے ہیں "مظہر الزماں خان کا فکشن، داستان، اسطور اور علامتی اظہار کے امتزاج سے ایک ایسی تخلیق کو مجسم کرتا ہے جس میں روشنی اور مفاہیم کے بے پناہ سرچشمے موجود ہوتے ہیں۔ فکشن کو عام نثری بیان سے مختلف بنانے کے لیے اسی معیاری اسلوب کی ضرورت ہے جو آج کے تقریباً سبھی افسانہ نگاروں کی دسترس سے نکلتا جارہا ہے۔" آگے لکھتے ہیں "مظہر الزماں خان کے افسانوں میں جو زبان اور اسلوب ہے وہ واضح کرتا ہے کہ فکشن میں لسانی اظہار کی سطح کیا ہونی چاہیے۔ اور تہہ نشین مفاہیم کو کس طرح سطح آب پر لائے بغیر تحیر، طلسم اور تمثیل کی روایت کا حامل بنایا جائے۔"

محمود ہاشمی، مظہر الزماں خان کے فن کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "مظہر الزماں خان کے افسانے ہمارے عہد میں جدید افسانوی تہذیب اور تخلیقی تحریک کا ایسا اظہار ہیں، جن پر اردو فکشن کی تاریخ کو آج بھی ناز ہے اور آنے والے عہد میں مظہر الزماں خان کے یہ افسانے ہمارے ادبی تاریخ کا مایہ ناز سرمایہ بنے رہیں گے۔"

مظہر الزماں خان کی اکثر تخلیقات میں مسلسل تحریک اور حرکت کا عمل جاری وساری رہتا ہے اور یہ تحریک اپنے ساتھ حال، ماضی مستقبل کی تصویروں کے ساتھ ساتھ مناظر، خیال اور پیکروں کی شکل میں ڈھل کر پھیل جاتی ہے۔

حقانی القاسمی لکھتے ہیں: "مظہر الزماں خان کا ذہن ایک محشر خیال ہے ان کے یہاں موضوعات اور وسائل کا اژدہام ہے۔ مظہر الزماں خان کی بہت سی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ ان کی تخلیق میں تحریک کی پراسرار مگر تابناک فضا ہوتی ہے۔ ان کا ہر لفظ تابندہ اور بہت کچھ بولتا ہوا لگتا ہے۔ لاروش فوکو کے فقروں کی طرح ہر فقرے میں ایک جہانِ تمثال تہ نشین ہے۔ ان کے لفظوں میں جو لہریں ہیں وہ زماں و مکاں سے ماورا ساعت بیکراں کے سمندروں سے ملاتی ہیں... ان کے جملوں کے دریچوں سے بھی بہت سے فلسفہ، ونظریات، معانی ومقامات منکشف ہوتے ہیں۔"

مظہر الزماں خان نے ریڈیو اور اسٹیج کے لیے بھی ڈرامے تحریر کیے۔ افسانے اور ناول سے ہٹ کر یہ بڑا مشکل فن ہے کیونکہ ان دونوں اصناف

میں سامعین اور ناظرین کو باندھے رکھنا پڑتا ہے۔ ان کا افسانہ 'اداس صدی کا کرب' اتنا مقبول ہوا کہ اسے ریڈیو اور اسٹیج پر پیش کرنے کی گنجائش تھی کیونکہ اس افسانے میں اتنے علائم موجود نہیں تھے، جتنے ان کے دوسرے افسانوں میں نظر آتے ہیں۔ 'روشنی' اور 'لحاف' دو ایسی علامتیں تھیں جو سارے افسانے میں پھیلی ہوئی تھیں، روشنی پیسہ کی اور لحاف عورت کی علامت ہے۔ اس افسانے میں 'ایک شخص' اور اس کا 'ضمیر' دو اہم کردار تھے۔ اس شخص کی کمزوری اور اس کے منفی رویہ سے اس کا اپنا ضمیر اس سے الگ ہو جاتا ہے۔ الگ رہتے ہوئے بھی وہ اس شخص کو صحیح راہ پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس شخص کا یہ معمول تھا کہ وہ سرد رات کے اندھیروں میں اپنی جیب میں روشنی (پیسہ۔ جو جیب کو گرم رکھتا ہے) کی خاطر لحاف (یعنی عورت جو گرمی مہیا کرتی ہے) کو بیچتا رہتا ہے۔ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب وہ اپنی عورت کو ایک ایسے اجنبی شخص کے حوالے کرتا ہے جس کے ہاتھ اور پیر کی انگلیاں نہیں تھیں اور وہ سر سے پاؤں تک عجیب وغریب بدبو کے ساتھ بدنما ہو چکا تھا۔

'اداس صدی کا کرب' ریڈیائی اور اوپن اسٹیج کی شکل میں پیش کیا گیا۔ ان دونوں میں راقم الحروف نے 'ضمیر' کا کردار ادا کیا تھا۔ مظہر الزماں خان کے دو افسانے 'ارض حال' اور 'آخری دستخط' کے ایک اقتباس سے ان کے اسلوب کا اندازہ ہوتا ہے۔

"لاکھوں کروڑوں انسانوں اور جانوروں کے مسلسل رونے کی آوازوں سے چونک کر جب میں ایک جھرجھری لے کر گہرے لمبے خواب سے بدک کر بیدار ہوا تو رونے اور بین کرنے کی ساری آوازیں یک لخت غائب ہو گئی تھیں کہ سب چراغ بجھ گئے تھے اور بھیگی بھیگی فجر میرے سرہانے کی آہنی کھڑکی سے آہستہ آہستہ اتر رہی تھی۔" (ارض حال)

"وہ سب کی سب چادریں چھینی ہوئی بوسنیا کی عورتیں تھیں جو اپنی کھرچی ہوئی رانوں اور اپنے ورم زدہ گھٹنوں کے درمیان 'اپنے' حیادار سر ڈال کر اپنی اپنی شرمیلی زمینوں پر ابلیسوں کی جبراً تخم ریزی کو زیر وزبر کرنے کے لئے اپنی اپنی کوکھ سے چاروں سمتوں کو بلا رہی تھیں۔ لیکن چاروں سمت کے خود ساختہ سفید زادے اپنی اپنی ننگی مسندوں پر بیٹھے ڈھولک بجا بجا کر مراثیوں کی طرح لہک لہک کر مسلسل گیت گانے میں مشغول تھے کہ ہمارے عشرت کدے، ہمارے نیفوں میں چھپے ہوئے ہیں اور ہم اپنے نیفوں سے باہر نکل نہیں سکتے کہ ہمیں اپنے نیفے عزیز تر ہیں کہ ہم اپنے پاؤں میں بھنور باندھ نہیں سکتے۔"

شمس الرحمٰن فاروقی، وزیر آغا، گوپی چند نارنگ، وارث علوی، باقر

وہ سب کی سب چادریں چھینی ہوئی بوسنیا کی عورتیں تھیں جو اپنی کھرچی ہوئی رانوں اور اپنے ورم زدہ گھٹنوں کے درمیان 'اپنے' حیادار سر ڈال کر اپنی اپنی شرمیلی زمینوں پر ابلیسوں کی جبراً تخم ریزی کو زیر و زبر کرنے کے لئے اپنی اپنی کوکو سے چاروں سمتوں کو بلا رہی تھیں۔ لیکن چاروں سمت کے خود ساختہ سفید زادے اپنی اپنی ننگی مسندوں پر بیٹھے ڈھولک بجا بجاکر مراثیوں کی طرح لہک لہک کر مسلسل گیت گانے میں مشغول تھے ... آخری دستخط

مہدی کاشمیری، قاضی افضال حسین، انور سدید، مغنی تبسم، شمیم حنفی، مہدی جعفر وغیرہ جیسے ناقدین نے مظہر الزماں خان کے فن کو سراہا ہے۔

مہدی جعفر نے صحیح لکھا ہے کہ عصر حاضر کے افسانہ نگاروں کے درمیان مظہر الزماں خان کا فن پکار اٹھتا ہے۔ اس کا نیا پن چیخ اٹھتا ہے کہ مظہر الزماں خان کا علامتی بیانیہ زمان ومکاں کو عبور کر لیا جاتا ہے۔ لمحہ موجود، لمحہ موجود سے مل کر آگے کی تاریخ سازی کرتا ہے۔ چنانچہ 'میری تاریخ' کے عنوان سے مظہر الزماں خان اپنی کتاب 'شوریدہ زمین پر دم بخود شجر' میں لکھتے ہیں۔ "میں برسوں سے خود کو تلاش کر رہا ہوں لیکن اپنے آپ سے مل نہیں رہا۔ سال پیچھے چلا گیا تو وہاں میرے 'میں' نے مجھے بتایا کہ تم مزید ایک سو دس سال پیچھے جاؤ!!"

اس طرح 'میں' انہیں مزید پیچھے لے جاتے ہوئے ہزار سال تک پہنچا دیتا ہے۔ اور پھر یہ کیفیت رونما ہوتی ہے۔

"تب اچانک میرا 'میں' مجھ سے کہتا ہے تم اپنے آپ کو کسی ایک زمین پر کیوں تلاش کر رہے ہو تم مکہ میں پیدا ہو، مدینہ میں پیدا ہو، امریکہ اور ایران میں بھی پیدا ہوئے ہو، ہندوستان وفرانس اور افغانستان میں بھی پیدا ہوئے تو پھر ایک مقام پر خود کو کیوں تلاش کر رہے ہو کہ تم کسی ایک مقام پر پیدا نہیں ہوئے بلکہ زمین کے ہر خطہ پر پیدا ہوئے ہو۔ اب تم ایسا کرو کہ ہزاروں سال آگے جا کر خود کو تلاش کرو اور پھر مل کر دیر تک بلکہ صدیوں تک باتیں کرو۔ فکر انگیز باتیں کچھ گزری ہوئی صدیوں کی اور کچھ آنے والی صدیوں کی کیونکہ تمہارا تعلق گزری ہوئی اور آنے والی تمام صدیوں سے ہے۔ چنانچہ میں آنے والی صدیوں میں خود کو تلاش کرنے کے لئے نکل چکا ہوں۔ اب تم مجھے آنے والی صدیوں میں ڈھونڈو۔ میں تمہیں ضرور ملوں گا۔" ■■

Dr Mohd Tatar Khan,

شاعر قلندر

پروین کمار اشک کی غزلوں میں زندگی کی کلیت

مناظر عاشق ہرگانوی

پروین کمار اشک بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں کیفیت اپنی ساخت خود لے کر آتی ہے، روابط اور رشتوں کی نوعیت سے سوچ کا نظام بدلتا ہے اور اظہار کے پابند پیمانے سامنے آتے ہیں۔ وہ رومانی نظریے کی تراوٹ سے کنواری برف توڑتے ہیں اور فکری افق کی آہٹ سے چراغ روشن کرتے ہیں۔

مشاہدہ، تجربہ اور دریافت نئے ڈائمنشن دیتے ہیں۔

پروین کمار اشک نئے لب و لہجے کے اختراعی عمل کے اظہار پر قدرت رکھتے ہیں، وہ اپنی جاں کی بوباس اردو غزل کی مٹی میں اتارتے ہیں اور فکری زمین کے لئے آسمان تک کی اڑان بھرتے ہیں۔ وہ جس ماحول میں جی رہے ہیں وہاں بے بسی اور کس مپرسی کی شدت ہے، کرب و احساس کی آگ میں جلتے اور جھلستے دن رات ہیں۔ لیکن تلخیوں نے انہیں بددل اور بدظن نہیں کیا ہے بلکہ آمدِ فصل بہار کے لئے اور زندگی کی حرارت قائم رہنے کے لئے دعا گو ہیں۔ یہ دعا اپنی ذات اور اپنے وجود کے لئے نہیں ہے بلکہ پوری انسانیت کے لئے ہے۔ اظہار کا پیرایہ دیکھئے:

زمیں کو اے خدا وہ زلزلہ دے
نشاں تک سرحدوں کے جو مٹا دے
محبت میں بدل جائے سیاست
خدا! لاہور دلی سے ملا دے
سجدہ کرتا بھی بزرگوں کو
سارے بچوں کو تو دعا دینا
دے دے اشک کو تازہ ہوا سے وصل کے کوئی دو اک سانس
توڑ دے سنگ و آہن والی جیل خدایا رحم ذرا
مرے خدا تری مخلوق سب سلامت ہو
دعا یہ مانگوں جب اخبار سامنے آئے

کچھ دعا کا خیال رکھا کرو
دل کی مسجد اجال رکھا کرو

پروین کمار اشک نے زندگی کو لکھنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں صحت مند علامت ہے اور لفظی بت تراشی ہے۔ زیادہ سے زیادہ تاثر ہے اور انفرادی ردعمل کے اظہار کا وسیلہ ہے۔ ان کی غزلوں میں لفظی تصویر شعری زبان کا جوہر ہے۔ زبان کو دو خانوں میں بانٹا گیا ہے۔ ایک ترسیل کی زبان اور دوسری شاعری کی تخلیقی زبان۔ علامت کا اصول زبان کو صوفیانہ بلندی تک لے جاتا ہے جہاں ہر لفظ Word of Logos ہے۔ شعری زبان Raradox کی زبان ہے اور یہ کم شعری زبان میں طنز Irony کشاکش Tension، متضاد کی ہم آہنگی Concordia Discourse ابہام Ambiguity اور اشاریت Implications کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ لیکن پروین کمار اشک نے میڈیم، ادراک، الفاظ میں نہاں لفظی وثوق اور شعری زبان کے Connotative کو نئی ذہانت سے غزل کا حصہ بنایا ہے:

وہ پیش رو ہے مگر راستا نہیں دیتا
بزرگ ہو کے بھی دیکھو دعا نہیں دیتا
خوشی اک بے وفا لڑکی ہے پیارے!
یہ شے گھر میں نہ رکھ بازار والی!
بچپن کس دہلیز پہ مجھ کو چھوڑ گیا
یہ کہہ کر ٹھہرو! میں کھلونے لاتا ہوں
یاد ہے؟ ایک کبوتر تیری چھت پر آیا کرتا تھا
کچھ دن پہلے کسی نے گولی مار دی اس کے سینے پر
سیب تو کب کا پکا ہوا ہے
باغ میں کرفیو لگا ہوا ہے

کیا آتا مسجد میں خدا
دعا کے ہاتھ میں چاقو تھا

باغ انگور کے چھوڑ آیا تھا سرحد پار جوانی میں
پاگل بوڑھا پل پل کشش کشش کرتا رہتا ہے

سنہری مچھلی کو جس دن سے گھر میں لائے ہیں
ہمارے شہر کا ہر مرتبان روشن ہے

پروین کمار اشک کی غزلوں میں موضوعات کا تنوع ہے۔ انانیت اور انفرادیت پر فتح ان کی غزلیں معانی کی تہہ داری، پیچیدگی اور اسلوب کی علاقیت کی آئینہ دار ہیں۔ وہ اپنے عہد کی رو کو محسوس کرنے کے جذبے سے آشنا ہیں اسی لئے ماحول کی سنگینی، ان کا تجربہ اور مشاہدہ بن جاتی ہے جو کرب واندوہ کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی فکر زمانے کے ساتھ چلتی اور دھوپ چھاؤں کو اپنے احاطے میں لیتی ہے:

محبت کو سنا ہے دل کے بدلے
عجائب گھر میں رکھا جا رہا ہے

ندی دامن چھڑا کر جا رہی ہے
کہ دریا خشک ہوتا جا رہا ہے

بچے اشک کو پاگل کہہ کر بھاگ گئے
وہ پریوں کی کتھا سنانے والا تھا

ہمارے شہر میں اک ایسا کنبہ ہے جس میں
ترقی دیکھ کے بچوں کی باپ جلتا ہے

آنسو، بادل، دریا سبھی سیاسی ہیں
جلتا شہر بچانے والا کوئی نہیں

جہاں پرکھوں کے سجدوں کے نشاں ہیں!
وہ گلیاں خون سے کیوں دھو رہے ہو

وہ میرے گھر میں آ کر چھپ گئی تھی
میں جس لڑکی کا پیچھا کر رہا تھا

پروین کمار اشک کے لہجے میں شمع کی دھیمی دھیمی لو کی شدت ہے جس کی وجہ سے ان کی سوچ نرم نرم آنچ میں سلگتی محسوس ہوتی ہے۔ انسانی فطرت ہفت رنگ کیفیات کی حامل ہے جو رزم و بزم، جلوت وخلوت، ناز و نیاز، ہجر و وصال غرض ہر میدان اور ہر مقام پر علیحدہ عمل کی عکاس ہے۔ اشک کا یہ وصف ہے کہ وہ ہر چیز کو اور ہر عمل کو ایک

پروین کمار اشک نئے لب ولہجے کے اختراعی عمل کے اظہار پر قدرت رکھتے ہیں۔ وہ اپنی جاں کی بوباس اردو غزل کی مٹی میں انکرتے ہیں اور فکری زمین کے لئے آسمان تک کی اڑان بھرتے ہیں۔ وہ جس ماحول میں جی رہے ہیں وہاں بے بسی اور کس مپرسی کی شدت ہے، کرب واحساس کی آگ میں جلتے اور جھلستے دن رات ہیں۔ لیکن تلخیوں نے انہیں بد دل اور بدظن نہیں کیا ہے بلکہ آمد فصل بہار کے لئے اور زندگی کی حرارت قائم رہنے کے لئے دعا گو ہیں

پروین کمار اشک نے زندگی کو لکھنے کی کوشش کی ہے جس میں صحت مند علامت ہے اور لفظی بت تراشی ہے۔ زیادہ سے زیادہ تاثر ہے اور انفرادی رد عمل کے اظہار کا وسیلہ ہے۔ ان کی غزلوں میں لفظی تصویر شعری زبان کا جوہر ہے۔

نئے پہلو سے دیکھتے ہیں انوکھے زاویے سے پرکھتے ہیں اور دلفریب انداز میں بیان کرتے ہیں:

بزرگوں کو سکھاتے ہیں سیاست
یہ بچے ہو گئے شیطان بھائی

ہیں اک ہی ماں کے دو گم گشتہ بچے
یہ ہندوستان پاکستان بھائی

دل ملاؤں گا کیا منافق سے
ہاتھ تک بھی نہیں ملاتا ہوں

کئی برسوں سے عرضی زندگی کی گم ہے دفتر میں
کبھی افسر نہیں ہوتا کبھی بابو نہیں آتا

جا پڑوسی کے گھر کی آگ بجھا
آگ کا کچھ پتا نہیں ہوتا

پروین کمار اشک کی غزلوں میں مقصدیت، امنگ اور رجائیت کے ساتھ ساتھ تلاشِ حقیقت کا اضطراب اور ولولہ ہے۔ فکر و اسلوب کا امتزاج ہے، رنگ و آہنگ کی وسعت اور نقطہ نگاہ کی جامعیت تقریباً ہر

کچھ اشعار 'دعا زمین' سے !

سینے پر رکھ ہجرت کا پتھر چپ چاپ
گھر میں رہ اور چھوڑ دے اپنا گھر چپ چاپ

میں سب سامان چھوڑے جا رہا ہوں
کہ گاڑی مل گئی اس پار والی

یہ سارے شور بن جائیں گے سرگم
وہ اک آواز دے گا پیار والی

تو نے میری گاگر ریت سے بھر دی میرا دوش تھا کیا
میں تو پانی میں اترا تھا دریا تیرے کہنے پر

ہر رستے پر چل کر میں نے دیکھ لیا
ہر اک رستہ تیرے گھر کو جاتا ہے

دشتِ ہجر میں آنے والا کوئی نہیں
ہم کو گھر لے جانے والا کوئی نہیں

باپ نہ ماں نہ بیوی بچہ سائیں میرا کوئی نہیں
سارا گھر ہے سائیں میرا، سائیں میرا کوئی نہیں

وہ مل جائے تو آنکھیں پیش کر دوں
جسے دیکھے زمانہ ہو گیا ہے

غزل میں نظر آتی ہے:

میں تیرا ہمسایا ہوں پیارے آیا جایا کر
ملنا ہو تو اندر کے دروازے سے آیا کر

خوش لباسوں کی صحبتوں میں میاں
اپنی چادر سنبھال رکھا کرو

چڑیوں کے زخمی بچے بندوق مانگتے ہیں
جو عطر بانٹتے تھے بارود بیچتے ہیں

بزرگوں کو خدایا بھیج فوراً دعا کو خوں زمیں نے کر دیا ہے

مرے وکیل کی غداریاں عیاں ہوں گی
سنا ہے کورٹ میں میرا بیان بھی ہوگا

پروین کمار اشک کے پاس حرف کا عرفان ہے اور غزل کہنے کا ان کا اپنا لہجہ ہے۔ وہ اپنے آپ کو یخ بستہ کرنے کے عادی نہیں ہیں بلکہ برف کی ناؤ پر بیٹھ کر ان پانیوں کی تلاش میں نظر آتے ہیں جو زندگی کی حدت و حرارت عطا کر سکیں۔ اشک جفا اور وفا کا تذکرہ شبنمی طریقے سے کرتے ہیں۔ نرم، سبک اور نزاکت و رعنائی سے بھرپور انداز دیکھئے:

میں اس لڑکی پہ عاشق ہو گیا ہوں
جسے میں نے کبھی دیکھا نہیں ہے

وہ جو اک پیڑ ہے صندل کا کسی کے گھر میں
اس کی خوشبو سے رہا ہے کبھی رشتہ میرا

کسی پتھر کو خدا کی طرح پوجا تھا جہاں
آج تک روتا ہے اس شہر میں سجدا میرا

وہ جب بھی روتا ہے میں ساتھ ساتھ روتا ہوں
مزے کی بات ہے اس کو پتا نہیں ہوتا

اشک کی غزلوں میں نفسیاتی کیفیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس میں نئی توانائی اور نئی بصیرت کا ارتعاش دیکھا جا سکتا ہے:

کچھ پل ٹھہرا، پھوٹ کے رویا، آہ بھری پھر لوٹ گیا
جانے فقیر نے کس کو دیکھا شہر کے اونچے بنگلے پر

دودھ کی خالی بوتل سے بھی بچے کا ہے عشق عجیب
تھک جاتے ہیں ہونٹ مگر وہ کاوش کرتا رہتا ہے

میرے شہر میں ستر سال کا اک بوڑھا
بچوں کے گھر میں دیوار اٹھاتا ہے

وہ لڑکی تو کب کی مر گئی یاد آیا
میں کس کو آواز لگانے والا تھا

اس نے بھی آنکھوں میں آنسو روک لئے
میں بھی اپنے زخم چھپانے والا تھا

یہ غم کا بچہ میری انگلی چھوڑتا ہی نہیں
کہیں بھی جاؤں مرے ساتھ ساتھ چلتا ہے

لڑکی میلے میں تنہا تھی
سوچ کے دل بیٹھا جاتا ہے

کھلونے دیکھتا ہے چیختا ہے
وہ بچپن ہی میں بوڑھا ہو گیا ہے

غزلوں میں ماحول کی فضا بندی پروین کمار اشک خوب کرتے ہیں۔ روز بروز گذرتی زندگی کی کلیت کے ساتھ جو رنگ و نشان انہوں نے بکھیرے ہیں ان کی پرتیں معنی خیز ہیں۔ ■■

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، کوہسار بھیکن پور 3، بھاگل پور۔ 812001 (بہار)

اردو میں دلت شاعری

جینت پرمار :دلت تخلیقیت کے آتش فشاں کا پھول

اجے مالوی

اکیسویں صدی کے مابعد جدیدیت سے نئے عہد کی تخلیقیت کے تناظر میں جینت پرمار اولین دلت شعلہ نوا شاعر ہیں۔ جو روایتی ترقی پسندی اور جدیدیت پسندی کی موت (؟) کے بعد ابھرنے والی نئی نسل سے وابستہ ہیں۔ جنھوں نے اپنی فنی اضافی تخلیقیت، معنویت، عصریت اور فقیت سے اُردو ادب میں ایک نئی تبدیلی کا سیلاب برپا کر دیا۔ جینت پرمار نے اپنی نظمیہ شاعری میں ایک ایسے محروم اور پامال طبقہ کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا، جو ہندو سماج میں دلت کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ دلت سماج ہمیشہ سے اعلیٰ اور برتر طبقہ کے سماجی بے انصافی اور غیر انسانی ظلم وستم کا شکار ہوتا تھا۔ ان کی بے بسی، مجبوری، سادہ لوحی اور مظلومیت کو نظمیہ اشعار کے پیکر میں ڈھال کر عوام کے سامنے ان کی حقیقی الم انگیز انسانی صورتِ حال کو جینت پرمار نے نہایت فنی اور جمالیاتی لطافت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے جینت پرمار کی نظمیہ شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار جینت پرمار کے شعری مجموعہ 'پنسل اور دوسری نظمیں' کے دیباچہ میں یوں کیا ہے:

"جینت کے یہاں نہاں خانۂ دل کی آنچ تصویری حرکیت کے ساتھ ساتھ برابر محسوس ہوتی ہے۔ انھوں نے سماجی بے انصافی کے زہر کو چکھا ہے اور شبدوں کے رنگوں سے اسے امرت میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ دلت رشتوں کی وجہ سے مقتدر رسوم ورواج کا چاقو کس طرح ہڈی سے گزر جاتا ہے، یہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اُردو یوں بھی اقلیت کی تہذیبی آواز ہے، مگر جینت پرمار تو اقلیت کے اندر اقلیت ہے۔ یہ Subaltern کے اندر Subaltern یعنی صحیح معنوں میں حاشیائی روح کی آواز ہے۔ درد کی کلونس میں دھنسی یہ سسکی بھی پت جھڑ کی آواز اور سورج، تتلی، سرخ گلاب کے ساتھ ساتھ ابھرتی ہے۔ رنگوں کی جھلا جھل میں 'ماں' کے معنیاتی احساس کی نظمیں ایک شاک کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔" (ص:10)

جینت پرمار سے قبل اُردو نظمیہ شاعری میں دلت مخاطبہ (Dalit Discourse) کی نشاندہی نہیں ہوتی ہے۔ چونکہ جینت پرمار بذاتِ خود دلت ہیں، انھوں نے دلتوں کے دکھ، درد اور کرب کو خود جھیلا ہے۔ اُس کو محسوس کیا ہے۔ بھوکے، پیاسے، ننگے اور میلے کچیلے کپڑے میں لپٹے لوگوں کو انھوں نے اپنے گرد و پیش میں دیکھا ہے۔ اُن کے دکھ کو جھیلا ہے۔ انھوں نے آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر پیش کیا ہے۔ اُس میں اُن کی صدیوں کی وراثتی حسیت وبصیرت کے ساتھ ساتھ اُن کا عصری ماحولیاتی شعور اور تواریخی آگہی بھی کار فرما رہی ہے۔ جو اُن کی اپنی نجی زندگی کے مقدس آتش کدہ میں تپ کر کندن ہوئی ہے۔ ان کی نظر میں دلت شاعر ہی دلت سماج کی حقیقی تصویر کو پیش کر سکتا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے نعمان شوق سے رسالہ 'آج کل' کے اپریل 2009 کے شمارہ میں ایک انٹرویو میں ارشاد فرمایا:

"میں دلت ہوں۔ اس لیے بھی میری شاعری کی بنیاد میں دلت مسائل پیوست ہیں۔ یہ میرا کمٹ منٹ بھی تھا۔ میں پہلے گجراتی میں بھی لکھتا تھا۔ گجراتی زبان میں بھی میری بہت ساری چیزیں ہیں۔ بحیثیت دلت جو مظالم سہے گئے ہیں۔ پہلی بار ان کا اظہار اُردو میں ہوا ہے۔ اگر کسی اور نے لکھی ہو تو کم از کم میں لاعلم ہوں، لیکن میں تو یہ مانتا ہوں کہ جو پیدائش سے (By Birth) دلت ہیں اور وہ لکھتے ہیں تو اُن کا لکھا ہوا دلت ادب ہے۔...

"ترقی پسند تحریک نے دلتوں کا الگ سے کوئی ذکر نہیں کیا کیوں کہ ان کا ماننا تھا کہ انسان مرکز میں ہونا چاہئے۔ وہ تو ہر شاعری میں مرکز میں ہوتا ہے لیکن خاص 'شودر' کے لیے کچھ نہیں کیا۔ کسی بھی تحریک نے نہیں کیا۔ دلت تحریک Black Literature کے توسط سے مراٹھی ادب میں آئی۔ مراٹھی کے بعد 1978 میں گجراتی میں یہ سلسلہ چلا اور آج بھی گجراتی میں اچھی دلت شاعری ہو رہی ہے۔ مجھے خیال آیا کہ اُردو میں ایسی شاعری تو ہے نہیں۔ دلتوں کے سکھ دکھ میری ذات کا حصہ ہیں۔ ایسا نہیں کہ میں نے دانستہ کوئی تجربہ کرنے کی غرض سے دلت موضوعات کو شاعری کے لیے استعمال

کیا۔ ہندوستان کی ہر زبان میں دلت شاعری ہو رہی ہے اور سب سے پاورفل شاعری یہی ہے۔'' (ماہنامہ 'آج کل' اپریل 2008 ص 4)

جینت پرمار منو کی ورن ویوستھا کی سخت لہجہ میں مخالفت کرتے ہیں۔ قدیم دور میں دلت سماج کے اُوپر برتر طبقہ نے جو ظلم وستم ڈھائے ہیں۔ وہ سارے ظلم وستم اور اُن کے نشانات آج بھی اُن کے جسم کے اندر نقش ہیں۔ منو نے اپنی تصنیف 'منوسمرتی' میں صفات اور اعمال کے حساب سے چار حصّوں میں عوام کو تقسیم کیا تھا۔ برہمن کی پاکیزہ فطرت سے مذہبی فرائض، ضبطِ نفس، ریاضت، عبادت، روحانی سکون، سادگی، علم، معرفت اور برہم پر ایمان ہوتا ہے۔ کشتریوں کی فطرت میں بہادری، جلال، استقلال، ہوشیاری، خیرات اور عوام پر حکومت کرنے کی خصوصیت پائی جاتی تھی۔ ویشیوں کی فطرت میں کھیتی کرنا، گوؤں کی حفاظت کرنا اور تجارت کرنا منوسمرتی میں درج ہے۔ اسی طرح شودروں کے میراث اور ماحول کی وجہ سے ان کا طبعی رجحان خصلت اور مزاج ایسا ہوتا تھا جس کی وجہ سے منو نے ان کو ایک مخصوص فطرت کا حامل پایا اور اس سے پیدا خصوصی صفت اور عمل کو دیکھتے ہوئے طے کیا کہ وہ تینوں اعلیٰ اور برتر طبقہ کی خدمات بجا لائیں کیوں کہ ان کی جسمانی اور ذہنی صلاحیت اچھی طرح سے ان خدمات کو ادا کر سکنے کے اہل تھی۔ اس آہن پوش منو کی ضابطہ پسندی اور نظام پسندی کے خلاف ہی دلت تحریک وجود میں آئی۔ اس ضمن میں نظام صدیقی اپنے مقالہ 'اردو نظم کی تہذیبی تخلیقیت کی نیوکلیائی فوق متی تنقید' میں نہایت بے رحم سفاک حقائق کا انکشاف کرتے ہیں :

''جینت پرمار بیک وقت برہمنی ثقافت کے چاندی سونے کے ہودے پر سوار جھانجھ مجیرا بجانے والے دانشوروں کے خلاف اسی طرح خم ٹھوک کر فکر سخن کرتے ہیں جیسے کہ ڈاکٹر امبید کر نے 1927 میں عوامی اجلاس میں پہلی بار سیاسی افق پر طلوع ہوتے ہی برہمنی صحیفہ 'منواسمرتی دھرم شاستر' کو نذر آتش کر کے ہندوستانی تہذیب کے ٹھہرے ہوئے پانیوں میں سطح پر ہلچل مچا کر ایک بڑا انقلاب آفریں کارنامہ انجام دیا تھا۔ اکیسویں صدی کے اردو ادب میں رفیع تر شعری اور تہذیبی آگ بڑی کفائت لفظی اور نت نئی تصویر آفرینی جینت پرمار روشن کر رہے ہیں...'' ('استعارہ' شمارہ اکتوبر/نومبر/دسمبر 2000 ص 92)

جینت پرمار اس غیر منصفانہ سماجی تقسیم کے خلاف حقیقی انسانی انصاف کے لیے نہ صرف احتجاج بلکہ بغاوت اور براہِ راست مقاومت کرتے ہیں۔ چونکہ وہ سماجی نابرابری، ذہنی نابرابری اور طبقاتی نابرابری کے خلاف ہیں۔ اُن کی نظمیہ شاعری سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ برہمن، کشتری اور ویشیہ سماج کے لوگوں کے خلاف اُن کے دل میں غصہ اور نفرت کی آگ دھدھک رہی ہے۔ یہ آگ فوری طور پر پیدا نہیں ہو گئی ہے بلکہ برسوں انھوں نے برتر طبقہ کے مظالم کو اپنے گرد پیش میں دیکھا ہے۔ محسوس کیا ہے۔ انھوں نے دلت سماج کے طبقہ کی مظلومیت کو دیکھا، پرکھا، جانا، سمجھا، جھیلا اور بھوگا ہے تب جا کر انھوں نے اُردو ادب میں ایسی دلت شاعری کو اپنے اندر جنم دیا ہے جو مابعد جدید تخلیقیت پرور شعری ادب میں ایک بے بہا اضافہ ہے۔ یہ دلت شاعری ان کے جسم و روح میں اُترتی چلی گئی اور اُن کی زندگی اور پہچان کا ایک حصّہ بن گئی۔ اس ضمن میں اپنے معنی خیز خیالات و تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے اپنے مضمون 'قلم، دوات اور مَیں' میں لکھتے ہیں :

''میری شاعری کا اسلوب کہیں Absurd، کہیں سرریئل، کہیں نکڑ پر بیٹھے ہوئے عام آدمی کا ہے، تو کہیں گالی گلوچ کا بھی۔ شائد اسی لیے میری دلت نظمیں رسائل کے مدیران کرام کی ردّی کی ٹوکری میں دفن ہو گئیں۔ جب کہ مجھے اپنے اطراف یہی لہجہ ملا تھا۔

''ایک حساس انسان جب اپنی سطح سے اتر کر ایک عام انسان کی طرح سرل ہو جاتا ہے، اس کے اندر شاعری جنم لیتی ہے۔ پاش، چرابندراجو، لانگسٹن ہغس (Langston Hughes)، مائکل انجلو (Michelangelo) تلوار پر چلنے والے لوگ ہیں۔ اِسٹالن اتہاس میں دب گیا ہے۔ پرانا اُخماتوا کی 'رکوئیم' نظم کا ماحول آج بھی میرے ساتھ زندہ ہے۔ نازیوں کے کانسنٹریشن کیمپ میں ہوئے ظلم کی خبر دینے والے دستاویز آج پُرانے ریکارڈ روموں میں دھول کھا رہے ہیں۔ پرمکلوش رودنیتی، ڈین پیکس کی نظمیں آج بھی میرے لہو میں چیختی ہیں۔ نام دیو ڈھسال، یشونت منوہر کی نظمیں میری آنکھوں میں چنگاریاں بھر دیتی ہیں۔ تنہائی میں انھیں پڑھتے ہوئے میں عجیب تکلیف، بے بسی اور انسان میں زندہ رہنے کی خواہش شدّت سے محسوس کرتا ہوں۔

ہزاروں سال سے بھوگے ہوئے Caste System کی تیزابی زندگی، Anti Reservation کی یاتنائیں برسوں میرے بھیتر جمی رہیں اور جب نظم بن کر پھوٹیں تو صرف واقعات کا تجزیہ / اینالسس نہیں تھیں۔ میرے لیے صرف چیزوں سے گزرنا نہیں تھا بلکہ ان کے جواز Justification کی جانچ بھی تھی۔ چھاتی کے پنجرے میں جمی ہوئی یہ یادیں حساب لینا چاہتی تھیں۔ انھیں ٹرانسفارم کرنا چاہتی تھیں۔ شائد یہی سنگھرش ہے شاعری کا میرے لیے!'' (ماہنامہ 'آج کل' اپریل 2008 ص 6)

جینت پرمار کی نظم ''منو تری قسمت ہے کالی'' میں دلت ذہنیت، حسیت اور بصیرت کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ منو کے نظامِ کائنات کی بابت جینت پرمار نے اعلیٰ اور برتر طبقہ کے لوگوں کو کھلا چیلنج دیا ہے جو قدیم روایت و تہذیب اور آج

کے بدلتے ہوئے منظر نامہ کی حقیقی تصویر کو پیش کرتا ہے۔ ان کی آنکھوں میں آگ کے شعلے ہیں، جو دقیانوسی روایت اور تہذیب کو جلا کر خاکستر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ دلت سماج پر ہوئے ایک ایک ظلم کا حساب مانگتے ہیں اور سماج میں تبدیلی کی توقع کرتے ہیں اور مظلوموں اور بے کس انسانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ "منو، تری قسمت ہے کالی" میں جینت پرمار لکھتے ہیں :

منو
کبھی گردن پہ کلڑی
پیٹھ پہ جھاڑو لٹکا کر نکلا ہے کہیں؟
کانوں نے چکھا ہے کبھی کیا
ذائقہ جلتے سیسے کا !
تیری ماں کو سرِ عام ننگا کر کے
چابک سے اس کی رانوں کو
لہولہان کیا ہے کسی نے ؟
منو
تو سوتا ہے پھولوں کے بستر پر
میرے نصیب میں لکھا ہے
شمشان گھاٹ کا سناٹا
تو تو نہاتا ہے مندر میں
دودھ اور گنگا جل سے
جب کہ مجھے مرنے کے لیے بھی
چلو بھر پانی نہ ملا !
منو تری قسمت ہے کالی
دُکھ کا بھی احساس نہیں ہوتا تجھ کو
تری رگوں میں گرم خون ہے!
یا پانی!!

جینت پرمار کی نظم 'پیٹھ' میں بے رحم سچائی کا انکشاف ہوا ہے۔ انھوں نے برتر طبقہ کے اُوپر طنز بھی کیا ہے۔ ان کے یہ نظمیہ اشعار تخلیقیت افروز اور زندگی پرور ہیں۔ اس نظم میں زندگی ہے، تنوع ہے، وسعت ہے، معنویت ہے، عصریت ہے، فنّیت ہے اور حسن کا امتزاج بھی ملتا ہے۔ ان کی نظمیہ شاعری کا حسن یہ ہے کہ وہ بڑی فنّیت سے سیدھی سادی اور حقیقی تصویر صفحۂ قرطاس پر روشن کرتے ہیں۔ وہ کھلی آنکھوں سے بے درد اور بے رحم سماج کی ننگی تصویر دکھاتے ہیں۔

عمر نہیں تھی پہاڑ دُکھ کے
پیٹھ پہ اپنے ڈھونے کی
منو کی ورن ویوستھا کا اک بارِ گراں
پیٹھ پہ ڈھوتی ہے پھر بھی
اس پر بھی تم
رعب جماتے ہو چابک کا
اُف تک منہ سے نکلی نہیں
اور چابک کے غصّے میں
سرخ ہو گئی میری پیٹھ
جس پر سینکتے ہو تم روٹی
اپنے بھرے پیٹوں کے لیے !

اکیسویں صدی کے تناظر میں جینت پرمار کی دلت نظمیہ شاعری اُردو ادب میں ایک نئے فنّی اور جمالیاتی نظام کی تخلیق کرتی ہے۔ جینت پرمار کی دلت نظمیہ شاعری میں ماورائے حقیقت نگاری کے نقوش ملتے ہیں۔ جس کو انھوں نے اپنے فنّی اسلوب، استعارے، علامت، فنّی لطافت اور ذہانت سے پیش کیا ہے۔ جینت پرمار کو الفاظ کے برتنے کا سلیقہ خوب آتا ہے۔ وہ الفاظ کے ذریعہ ایک سچّی اور حقیقی تصویر بناتے ہیں۔ مصوّری کے نقوش ان کی نظمیہ شاعری میں جا بجا ملتے ہیں۔ جس سے ان کی نظموں میں آہنگ اور تسلسل ملتا ہے۔ ان کی نظمیہ شاعری دوسرے شعرا سے مختلف ہے۔ ان کی نظمیہ شاعری کی زبان اور اسلوب میں کہیں کہیں Absurd اور گالی گلوج تک کی صورتِ حال پیدا ہوتی نظر آتی ہے۔ جینت پرمار کی دلت شعری تخلیقیت میں خارجی اور داخلی دونوں پہلو نمایاں نظر آتے ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ تخلیقیت کے متعلق اپنے معنی خیز خیالات و تاثرات کا اظہار اپنے مضمون 'مابعد جدیدیت: عالمی تناظر میں' یوں کیا ہے:

"نطشے ہر سطح پر تخلیقیت کے 'جشنِ جاریہ' کا قائل ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہر سچّی تخلیق پرانے نظم کو بدلتی ہے اسی لیے نئے کی نقیب ہوتی ہے۔ نطشے ذہن کی اس نڈر اور بے باک کشادگی پر زور دیتا ہے جو نئے کو لبیک کہتی ہے، بدلنے سے بھڑکتی نہیں اور اگر ضروری ہو تو سابقہ موقف سے ہاتھ اُٹھا لینے میں بھی عار نہیں سمجھتی۔ تخلیقیت کسی ایک مقام پر رکتی نہیں، یہ ہر لحظہ جواں، ہر لحظہ جرأت آزما، ہر لحظہ تازہ کار اور ہر لحظہ تغیر آشنا ہے... مابعد جدید عالمی مفکرین کا رویہ بالعموم یہ ہے: If Marx isn't true then nothing is اُن کا کلیت پسندی، مرکزیت، یا نظریہ بندی کے خلاف ہونا، نیز تکثیریت، کثیر الوضعیت، مقامیت، بوقلمونی یا سب سے بڑھ کر تخلیقیت پر اصرار کرنا

اسی راہ سے ہے۔'' ('جدیدیت کے بعد' ص :29)

جینت پرمار اپنی دلت نظمیہ شاعری سے عوام کو جھنجھوڑتے ہیں۔ اُن کے تیور میں تلخی ہے۔ نفرت اور بدلے کی آگ اُن کی زندگی کا حصّہ ہے۔ یہی اُن کی شاعری کا جوہر اصل ہے۔ نفرت اور بدلے کی آگ اُن کی نظم 'میری جنگ روٹی کی نہیں' میں صاف طور پر دکھائی دیتی ہے:

بھوکا برہمن
بھوکا کھشتریہ
بھوکا ویشیہ
لڑتا ہے روٹی کے لیے
چاندی اِک روٹی کے لیے
اس کا سپنا روٹی ہے
اچھوت ہوں مَیں
میرے سائے سے بھی تم کتراتے ہو
مَیں ہوں تمہاری بستی باہر
جہاں تم ہگتے ہو وہاں پر
ٹاٹ کی میری جھگّی ہے
کنویں سے لے کر مندر تک
تم نے بنائی ہیں دیواریں
منو کی اونچی دیواریں !
میرے حصّے میں تو ملا ہے
اپنے لوگوں کا اپمان !
اور نفرت کی آگ !!
مری جنگ اُس کے خلاف
جو روٹی سے بڑھ کر ہے
میری جنگ روٹی کی نہیں !

جینت پرمار کی دلت نظمیہ شاعری کا اسلوب بیان اچھوتا اور نرالا ہے۔ انھوں نے عام روش سے ہٹ کر دلتوں کے مسائل، دکھ، درد، رنج والم، بھوک وافلاس، بے بسی، مجبوری، لاچاری اور قدیم دور سے ان کے اُوپر ہوئے ظلم و ستم کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ وہ بڑی بے باکی اور چابک دستی سے Absurd الفاظ کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ وہ الفاظ ان کی نظمیہ شاعری کا حصہ بن گئے ہیں اور جس کی بنا پر ان کی دلت شعری تخلیقیت زندگی پرور اور جمالیت افروز ہوگئی ہے۔ یہ Absurd الفاظ شاعر کے پیدا کردہ الفاظ نہیں ہیں بلکہ برسوں کے جھیلے ہوئے اپنوں کے دکھ، درد اور گاؤں میں برہنہ گھمائی گئی عورتوں کی تصویریں ان کے دل میں آج بھی پیوست ہیں۔ جن کی چنگاری سے یہ الفاظ شعلے بن کر اُبھرتے ہیں۔ برتر طبقہ اور جاگیردارانہ نظام کے ظلم وستم کی حقیقی تصویر جابجا ان کی نظمیہ شاعری میں ملتی ہے۔

اکیسویں صدی کا مابعد جدید عہد نئی تبدیلیوں کا دور ہے۔ جینت پرمار کی نظم 'ذات۔ا' اس سلسلے کی اہم کڑی ہے:

بدن کی کالی مٹی پر
پھٹی پرانی میلی قمیص
اور نیندوں میں
خواب سنہرے دیکھتا ہوں
خواب میں اکثر ہوتا مَیں
جاگیردار کا ایک لڑکا
سارے گاؤں پہ رعب جمایا کرتا ہے
میرے نام پہ ساری گلیاں
جھک جاتی ہیں پاؤں میں
وگڑو سے میں دیا پرساد
خواب میں کتنا خوش ہوتا ہوں

لیکن اس کے ٹوٹتے ہی کیوں
سب کچھ زیروزبر ہوتا ہے
نام بدل کر شہر بدل کر
بچ نہ سکا میں ذات سے اپنی
لکھی ہوئی تھی جنم جنم سے
میری جبیں پر!

نظمیہ شاعری میں تصویر کشی جینت پرمار کی شاعری کا اصل جوہر ہے۔ وہ اپنے فن سے نظمیہ شعری تخلیقیت میں جمالیاتی نقش گری کرتے ہیں۔ جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک تصویر چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے۔ زندگی کے حادثات، تجربات، مشاہدات اور دل کے درد و کرب کی حقیقی تصویر پیش کرتے ہیں۔ جس سے پڑھنے اور سننے والے کی آنکھوں میں استعجاب، نفرت، غصہ اور درد کا احساس ہوتا ہے۔ اس ضمن میں جینت پرمار کی نظم 'ذات۔۲' میں زندگی پرور اور سماج میں تبدیلی کا دور کارفرما ہے۔

میرے اجداد نے

لہو رستے ہاتھوں سے رکھی تھی بنیاد اسکول کی
اسکول کی ایک اک اینٹ میں
ہے انہی کے لہو کی سگندھ
وہ تھے ان پڑھ گنوار
مجھ کو داخل کیا تھا اسی اسکول میں
تا کہ پڑھ لکھ سکوں
مگر میرے ٹیچر نے
داخل نہ ہونے دیا کلاس باہر کڑی دھوپ میں
جانور کی طرح مجھ سے برتاؤ ہوا
مَیں اندر ہی اندر یوں گھٹتا رہا
خواب کا ایک اک پھول مرجھا گیا
بہت غصہ آیا
میری ذات پر، کھُر درے ہاتھ پر
اسکول کی ایک اک اینٹ پر
ہے مرے ہی لہو کی سگندھ

'نرک کنڈ کی باس' جینت پرمار کی بہت ہی مشہور نظم ہے۔ اس نظم میں انھوں نے دلت سماج کی حقیقی تصویر پیش کی ہے۔ ان کی یہ نظم ان کے باطنی عمل کا حصہ ہے۔ وہ اپنے اس نظم میں دلت سماج کے دکھ، درد اور کرب کو نہائت ہی فنی جمالیت اور لطافت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

نرک کنڈ کی باس
مرے اسکول تلک آتی تھی
دھوپ کی چھتری کے نیچے
ننگے پاؤں اُترتی تھی
نرک کنڈ میں !
جانوروں کے چمڑے کو
نمک اور پانی میں بھگو کر
اپنے مریل پاؤں سے کر دیتی تھی صاف
بدلے میں وہ
گوشت کے ٹکڑے لے آتی تھی میرے لیے !!
آج بھی جب میں
آفس جانے سے پہلے اپنے جوتے کو
چیری پالش کرتا ہوں تب
اُس کی چمک میں
ماں کا چہرا دکھتا ہے
نرک کنڈ کی باس
مرے آفس تک آتی ہے!

مابعد جدید دور میں اگر جینت پرمار پہلے دلت شاعر ہیں تو آشا پربھات اُردو ادب میں اولین دلت شاعرہ ہیں جو عالمی، قومی اور مقامی تہذیبی منظر نامہ پر اچھی شاعری کر رہی ہیں۔ جینت پرمار کا یہ کہنا کہ دلت شاعر یا ادیب ہی دلت ادب کو پیش کر سکتا ہے۔ جس نے یہ کرب جھیلا ہے وہی اس کے ساتھ انصاف کر سکتا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ پریم چند کے متعدد ناول اور افسانہ میں دلت Discourse کو پیش کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر پریم چند کا افسانہ 'کفن' ہے۔ جس میں دلت سماج اور اُن کے مسائل پر پریم چند نے حقیقی تصویر پیش کی ہے۔ کفن اُردو ادب کا شاہ کار افسانہ ہے۔ اسی طرح پریم چند کا ناول گودان اُردو ناول نگاری میں شاہ کار کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے اہم کردار ہوری اور دھنیا ہیں جن کے ارد گرد پوری کہانی گھومتی ہے۔ یہ دلت سماج کے زندہ اور امر کردار ہیں جن پر پریم چند کی گہری پکڑ ہے۔ اسی طرح کرشن چندر کا افسانہ کالو بھنگی ہے۔ اس میں بھی افسانہ نگار نے دلت Discourse کو نہایت ہی فنی لطافت اور ذہانت سے پیش کیا ہے۔ اسی طرح متعدد لوگوں نے دلت سماج کی تہذیبی رنگا رنگی زندگی کو اپنے افسانے اور ناولوں میں پیش کیا ہے۔ کیا دلت ادب کی فہرست بناتے وقت پریم چند اور کرشن چندر جیسے تمام ادیبوں کو اُردو ادب سے خارج کر دیا جائے گا؟ جنھوں نے پوری زندگی اُردو ادب کی خدمت کی۔ میرے خیال سے اُردو ادب میں فرقہ واریت کی ہمیشہ تردید ہوتی رہی ہے۔ خواہ وہ فرقہ واریت کسی بھی نوعیت کی ہو۔ دلت فرقہ واریت ہو، مسلم فرقہ واریت ہو، سکھ فرقہ واریت ہو یا برہمنی فرقہ واریت ہو، وہ قابلِ مذمت اور قابلِ ردّ ہے۔ ہم کو ہر حالت میں سچی اور کھری انسانیت اور آدمیت کی مشعل کو روشن رکھنا چاہئے۔ ادیبوں کا کام ہے فرقہ پرست طاقتوں کا مقابلہ کرنا۔ نہ کہ فرقہ واریت اور تعصب کو بڑھاوا دینا۔ کوئی بھی شاعر یا ادیب جو دلت Discourse کو پیش کر رہا ہے، وہ دلت ادب ہے۔ اس کے لیے شاعر یا ادیب کا دلت ہونا کوئی ضروری شرط نہیں ہونی چاہئے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ کتنی گہرائی اور سچائی سے غوطہ لگاتا ہے اور کتنے موتی اُس کے فکر و فن کے نصیب میں آتے ہیں۔ ■■

Dr Ajay Malviya,
1278/1 Malviya Nagar Allahabad-211003

استقامتِ شعری

شاہد ماہلی کی شاعری

سلیمان اطہر جاوید

عصرِ حاضر میں اردو شاعری کی ایک فہرست بنائیے، اور پھر مختصر کرتے جائیے۔ مختصر، مختصر اور مختصر... اس مختصر ترین فہرست میں بھی ایک نام شامل رہے گا اور وہ نام ہے، شاہد ماہلی!... شاہد ماہلی کا اہم وصف یہی ہے کہ وہ شاہد ماہلی ہیں، اور کچھ نہیں، صرف شاہد ماہلی!... بیشتر شاعر اپنی رو میں نکل جاتے ہیں۔ ہنس کی چال چلتے ہیں اور خود اپنی ہی چال بھول جاتے ہیں۔ شاہد ماہلی پہلے بھی اپنی ہی چال چل رہے تھے اور آج بھی اپنی ہی چال چل رہے ہیں۔ ان کی شعری کائنات اُن کی اپنی شعری کائنات ہے۔ ان کا نظامِ شمسی، اُن کے اپنے سورج کے اطراف گردش کرتا ہے۔ راہ میں کیا کچھ آئے وہ اپنی دُھن میں ان سب سے بے نیازانہ گزرتے رہے، اپنی شعری کائنات کی تزئین کرتے رہے۔ ترقی پسندی اور جدیدیت سے ان کا سامنا بھی ہوا، واسطہ بھی پڑا۔ وہ ان سے متاثر بھی ہوئے لیکن اس قدر بھی نہیں کہ اُن کی چھاپ قبول کر لی ہو۔ ان کا چربہ اور کاربن کاپی نظر آنے لگے ہوں۔ انہوں نے مشاہدات، ذاتی تاثرات اور محسوسات کا سودا نہیں کیا بلکہ اپنے محسوسات اور تاثرات کو یوں تپایا کہ وہ ان کے معاشرے اور معاشرت کی تصویر کا حصہ بن گئے۔ شاہد ماہلی کے یہاں آپ کو ایسی تبدیلی نظر نہیں آئے گی پر اب تک تو فلاں تحریک ٫رجحان کے زیر اثر شعر کہہ رہے تھے اور اب اپنی سمت و رفتار کو بدل دیا اور دوسری لے کو اپنانے لگے۔ شاہد ماہلی کے ہاں موضوعات وہی ہیں جو اُن کے بیشتر ہمعصروں کے ہیں لیکن پیرایۂ اظہار اور طرز و اسلوب ایسا کہ آپ پڑھتے ہوئے اچانک یہ کہہ دیں گے کہ ارے، یہ تو شاہد ماہلی ہیں۔ شاہد ماہلی نے زندگی کو دیکھا۔ برتا، سوچا، سمجھا، کچھ جیتا بھی، کچھ ہارا بھی، لیکن زندگی سے اپنے رشتے کو برقرار رکھا۔ عصری صداقتوں کو تسلیم کیا اور حقائق کا سامنا کیا۔ آج ہمارا معاشرہ، ہمارا وطن عزیز کن شب و روز اور نشیب و فراز سے دوچار ہے۔ کتنی ابتری، بے حسی، خود غرضی، منفی انا۔ جدھر دیکھئے پیراہن تار تار اوروں پر کم نظر، اپنی صلیب آپ اٹھائے، اپنی نوحہ گری آپ کرتے ہوئے۔ شاہد ماہلی نے زندگی کے اس انتشار و اختلال کی ترجمانی نہایت عمدگی کے ساتھ کی ہے۔ یہ اشعار:

چار سو دشت میں پھیلا ہے اُداسی کا دھواں
پھول سہمے ہیں، ہوا ٹھہری ہے، منظر چپ ہیں

غم کی تہذیب ، اذیت کا قرینہ سیکھیں
آؤ اس شہر میں جینا ہے تو جینا سیکھیں

ہوئی ہے صبح سے کس طرح شام، شام سے صبح
جو میری جان پہ گذری ہے کوئی کیا سمجھے

ہر ایک راہ ہے سنسان ہر گلی خاموش
یہ شہر، شہر خموشاں ہے کوئی بولے کیا

ٹوٹا یقین، زخمی امیدیں، سیاہ خواب
کیا لے کے آج سوئے سحر جائے گی یہ شام

لاشوں کے سوا شہر میں ہر چیز ہے مہنگی
اس وقت نہ آؤ کہ یہاں قحط پڑا ہے

عجیب رنگ کدورت دلوں کے اندر ہے
گلاب ہاتھ میں ہے آستیں میں خنجر ہے

ایسا نہیں ہے کہ صرف ہمارا ملک ہی ان بحرانوں کی زد میں ہے۔ یہ المیہ تو ساری دنیا کا ہے۔ سونے، گیس، پٹرول اور ڈیزل وغیرہ کی قیمتوں سے مغربی ممالک کے عوام بھی پریشان ہیں اور ہم اہل مشرق بھی۔ اشیائے ضروری کی قیمتیں، دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں افزوں نہ ہو رہی ہوں۔ زمین کی قیمتیں تو ہر جگہ آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ شاہد ماہلی کی حسیت تو بڑی جاگتی اور ایک وسیع اور کشادہ منظر نامہ پر نظر رکھتی ہے۔ بین الاقوامی سیاست پر بھی ان کی برابر کی نگاہ ہے اور ایک انسان دوست کی حیثیت سے انہوں نے عالمی مسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔ ویت نام کی صورتِ حال کو

ذہن میں رکھیے اور یہ شعر سماعت فرمائیے:

ناکامیوں کی صبح نہ مایوسیوں کی شام
جلتا ہے مدتوں سے مرے دل کا ویت نام

'منظر پس منظر' شاہد ماہلی کی ایک طویل اور متاثر کرنے والی نظم ہے۔ عصر حاضر کا ایک رزمیہ کہیے۔ اس میں انہوں نے گندی بستیوں، پٹرول کی مہنگائی، ننگے بھوکے چہروں، ٹھٹھرتے ہوئے جسموں، بھیانک سکوت، دھند میں ڈوبے ہوئے گاؤں، ٹوٹی ہوئی قبروں، پھٹے ہوئے قمیص، گھروں سے اُٹھتے ہوئے دھویں، ڈراؤنی آوازوں اور چاروں طرف پیلی ریت کی مرقع کشی کی ہے۔ فلم کی ریل کی طرح ساری تصویریں یکے بعد دیگرے نگاہوں کے سامنے آتی ہیں۔ شاعر کے دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے جکڑے ہوئے ہیں اور اس کا جسم کسی سفید آندھی کا منتظر ہے۔ شاعر کی نظر افغانستان اور چیچنیاں کی طرف اُٹھتی ہے وہ اس عالمی دہشت گردی کی تاب نہیں لاسکتا وہ چیخ اٹھتا ہے۔ یوں تو ساری نظم ہی دلسوز ہے لیکن خاص طور پر یہ مصرعے:

ایک بے پناہ بھیڑ ہے
جو گاؤں اور قصبوں سے
ٹڈی دل کی طرح
ہمارے شہر کی جانب بڑھ رہی ہے
چیچنیا اور افغانستان کی چیخوں سے
ہم چونک اٹھتے ہیں
مگر ہمیں اپنے ہی شہر کی بھیڑ کا
اندازہ نہیں ہے

حرمت الاکرام نے شاہد ماہلی کے بارے میں قطعی درست لکھا ہے:
''آپ کی شاعری کے آئینے میں ماحول کی تلخ ناکامیوں اور تاریکیوں، امروز و فردا کی آویزشوں اور اُن مختلف عوامل کو دیکھا جاسکتا ہے جو حیات انسانی کی باطنی کشمکش کا ثمرہ ہیں۔ اس میں بکھرتے اور ٹوٹتے لمحوں اور اُن میں پنہاں متضاد کیفیتوں کا تموج ملتا ہے۔'' سنہری اداسیاں، ص 134

اور پھر یہ سب کچھ آج سے نہیں تاریخ انسانی کے ابتدائی اوراق اس کے شاہد ہیں۔ نیز ہر دور میں تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہی۔ زندگی کے ان شب و روز کو دیکھتے ہوئے کربلا اور اس کے تلازمات مل جاتے ہیں:

یہ کیسی جنگ تھی دشتِ بلا میں یتیم و بیوہ و بیمار آئے
ایک اک شہر، شہرِ کوفہ و شام اب کہاں دشتِ کربلا جائے
ادھر ہے پیاس سیرابی ہے اُس سمت ثواب و قہر کا دریا الگ ہے
کہیں تو شب کا حصار ٹوٹے کوئی تو آئے امام بن کر

اس پس منظر میں فرد کی فکر پر حزن و یاس کی کیفیات کا ابھر آنا فطری ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ شاعر یاسیت کا شکار ہے بلکہ یہ کہ حالات اس قدر ناموافق اور صورت حال ایسی ناروا ہو چکی ہے کہ فن اور فنکار دونوں پر بن آئی ہے۔ شاہد ماہلی کے ہاں حزن و یاس اور ناامیدی و شکستہ پائی کا احساس ہے لیکن یہ اُن کے مزاج کا حصہ نہیں۔ فانی کی طرح نہ وہ موت کی تمنا کرتے اور اسی کو نامرادوں کی مراد قرار دیتے ہیں اور نہ موت کا جشن مناتے ہیں۔ اس زاویے سے دیکھیں تو ان اشعار کی تہہ داری ابھر آئے گی کہ حالات اتنے ناموافق تھے شاعر حالات سے نبرد آزما رہا لیکن حالات سے فرار حاصل نہیں کی۔ چند اشعار:

شامِ الم نہ ہو کہ کبھی صبحِ غم نہ ہو
خوابوں کے درمیان کوئی ایسی شب نہ تھی
شہرِ بتاں میں رنگارنگ مناظر تھے
ذہن و دل پر پھر بھی چھایا سناٹا
ادھر تو ہے اندھیرا ہی اندھیرا اجالے سب پسِ دیوار آئے
کبھی خوشی بھی ملی ہے تو درد کے ہاتھوں
مسرتوں نے دیا ہے متاعِ رنج و محن

نظم 'کہیں کچھ نہیں ہوتا' بھی اسی نوعیت کی ہے۔ یہ نہیں کہ شاعر نے ہمت ہاری ہو۔ وہ نشیب و فراز اور واقعات کے زخمی زخمی لمحوں کا تجزیہ کرتا ہے اور صرف یہی سوچنے اور یہی نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہے کہ کہیں کچھ نہیں ہوتا۔ چند مصرعے:

دماغوں میں اجالے ہیں
اور دلوں میں خوف ہے
گلیوں میں دھواں ہے
اور گھروں میں بھوک ہے
اب نہ کوئی جنگل جنگل بھٹکتا
نہ کوئی پتھر کاٹ کاٹ کر
نہریں نکالتا ہے
کہیں کچھ نہیں ہوتا

شاہد ماہلی کی اور بعض نظموں میں بھی یہی فضا ملے گی۔ نظمیں فنی اعتبار ہی سے پختہ نہیں، پُر تاثیر بھی ہیں۔ موضوعات اور ادبی کسوٹی پر بھی پوری اُترتی ہیں۔ شاہد ماہلی کا کمال یہ ہے کہ وہ لفظیات کے استعمال میں موضوع اور مواد کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ جیسے، ایک نظم، ہم زاد، ممبئی کی ایک رات، اور

'نئے مکان کی نظمیں' اپنے موضوعات سے لفظی ہم آہنگی کے باعث نہایت خوبصورت اور عالی معیار ہو جاتی ہیں اور پڑھتے ہوئے قاری کچھ دیر کے لیے خود کو بھی اسی ماحول میں پاتا ہے۔ لفظ 'کرفیو' سے دہشت، ڈر اور خوف کی فضا اور سراسیمگی پیدا ہوتی ہے اس کو ہمارے کئی شاعروں نے محسوس اور منظوم کیا ہے۔ ان میں بعض تو واقعی دل کو چھوتیں اور بے اندازہ متاثر کرتی ہیں۔ شاہد ماہلی کی نظم 'کرفیو' پڑھیں انہوں نے خونیں ہواؤں، نفرتوں کے ابر، وحشتوں کے اندھیروں، چیختی شاہراہوں اور خونی درندوں کی ترکیبوں سے کام لیتے ہوئے ایک بھیانک فضا تخلیق کی ہے۔ احساس ہوتا ہے کہ ہم نظم نہیں پڑھ رہے ہیں کسی کرفیو زدہ ماحول میں زیست کر رہے ہیں! یہ نظم اس موضوع پر اردو کی چند منتخبہ منظومات میں شمار ہوگی۔ شاہد ماہلی کی نظر تیز اور تجزیاتی ہے۔ نظم ملاحظہ ہو، اندازہ ہوگا:

آج شب باہر نہ نکلو
چل رہی ہیں ہر طرف خونی ہوائیں
نفرتوں کے چھا گئے ہیں ابر ہر سُو
وحشتوں کا ہے اندھیرا
کھڑکیوں کو بند کر دو
ان پہ احساسات کے پردے چڑھا دو
میز سے اخلاق کے کاغذ ہٹا دو
پھاڑ دو انسانیت کی سب کتابیں
علم کی شمع بجھا دو
بند کر لو انگلیوں سے کان اپنے
شاہراہیں چیختی ہیں
ہر گلی کوچے سے آہیں آ رہی ہیں
پھر رہے ہیں ہر طرف خونی درندے
اپنے کمرے کو خود اپنی قبر سمجھو
آج شب باہر نہ نکلو

تنہائی آج کے انسان کو اس کے معاشرے کی دین ہے۔ انسان میلوں، ٹھیلوں میں رہتا ہے۔ جلسوں جلوسوں میں وقت گزارتا ہے، بھیڑ میں زندگی بسر کرتا ہے، ہجوم میں سانس لیتا ہے لیکن پھر بھی اکیلا ہے۔ وہ دوسروں کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی نہیں ہے۔ معاشرہ کا حصہ ہوتے ہوئے بھی معاشرہ کا حصہ نہیں۔ اس بھری پُری دنیا میں تنہا اکیلا اکیلا ہے۔ یہ تنہائی فنکار کی اختیاری نہیں حالات کی لادی ہوئی ہے۔ وہ مجبور ہے خود کو تنہا پانے پر۔ اس کو تھوڑا بہت جدیدیت کا اثر بھی کہہ لیں۔ شاہد ماہلی نے آج کی نسل کی اس تنہائی کو اپنے کئی اشعار میں جاذبِ نظر پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ تنہائی جو آج کے معاشرے میں زہر بن کر پھیل رہی ہے، پھیل چکی ہے۔ تنہائی کے کئی پہلو ان اشعار میں جلوہ دکھاتے ہیں:

رگ رگ میں پھیل جائے گا تنہائیوں کا زہر
چپکے سے مرے دل میں اُتر جائے گی یہ شام

بہت قریب سے دیکھا تو میرا سایہ تھا
جسے گلے سے لگائے ہوئی تھی تنہائی

کانپ جاتا ہے صدائے دل سے صحرائے سکوت
اور اپنے پاؤں کی آہٹ سے بھی اب ڈر لگے

چھوڑ گئے ہیں تنہا مجھ کو روز و شب کے ہنگامے
سونے پن سے ناتا ہے اب رشتہ ہے تنہائی سے

اور یہ تنہائی کا زہر کچھ ایسا ہے کہ فرد سماج میں رہتے ہوئے بھی خود کو موہوم پاتا ہے اور اس کی شخصیت بتدریج معدوم ہونے لگتی ہے۔ تشبیہیں ترکیبیں اپنا مفہوم گم کر دیتی ہیں۔ الفاظ بے معنی ہو جاتے ہیں۔ حروف تہجی آڑی ترچھی لکیروں کے سوا کچھ نہیں ہوتے۔ بکھر بکھر جاتے، اپنی ترتیب اور ہیئت کھو دیتے ہیں۔ کوئی کسی کا پرسان حال نہیں ہے حالات کی کتنی حقیقت پسندانہ عکاسی ہے۔ کوئی عدد اپنی قدر نہیں رکھتا، صفر ہو جاتا ہے۔ اس بے معنویت اور لایعنیت کا شکار کون نہیں۔ یہ فرد کا زیاں نہیں، معاشرہ کا بھی نہیں، قوم بلکہ ساری انسانیت کا زیاں ہے۔ شاہد ماہلی اس آس پاس پھیلی ہوئی بے معنویت کی تصویر کشی کرتے ہیں:

وہ آندھی آئی کہ بکھرے پڑے ہیں سارے حروف
ملی نہ میم کہیں مجھ کو لام کے آگے

کس کی یاد میں، اپنا پن بھی بھول گیا ہوں
کون مرے بستر پر آ کر لیٹ گیا ہے

شاہد ماہلی کی شاعری ایک حساس شخصیت کی فکر کی ترجمانی کرتی ہے اور ایسے معاشرہ کی جو معاشی، تہذیبی، سیاسی اور فکری بحرانوں کی زد میں ہے۔ ایسے معاشرہ کی ترجمانی کے لیے خود شاعر کو اپنی ذات، اپنے فن پر اعتماد ہونا چاہیے۔ شاہد ماہلی کو اپنی ذات اور اپنے فکر و فن پر اعتماد ہے۔ اسی اعتماد کے ساتھ انہوں نے اپنے تین شعری مجموعے 'منظر پس منظر'، 'سنہری اداسیاں' اور 'کہیں کچھ نہیں ہوتا' پیش کیے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اپنے ہمعصروں میں ان کا قد اونچا ہے اور وہ اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ ■■

شاعرِ شور انگیز

رؤف خیر: چشمۂ دانش وسخن

خالد یوسف

تجھے خبر بھی ہے کیا کیا خیال آتا ہے
کہ جی ترے سخن ملتوی سے خوش نہ ہوا

یہ شعر ارضِ دکن کے خوش فکر شاعر رؤف خیر کا ہے اور ان کے خوبصورت شعری مجموعے 'سخن ملتوی' کے سرورق کی زینت ہے۔ محبوب کے ہزار ناز و غمزے برداشت کرنے کے باوجود کوئی بھی سچا عاشق بشمول رؤف خیر اور ہم، اس کے سخن ملتوی سے خوش نہیں ہوتا لیکن اس سخن ملتوی کی بات ہی کچھ اور ہے جس میں اک گلزار کیف ونشاط اور جہان معنی پنہا ہے۔ ان کے ہاں تصوف اور رومان ہاتھ پکڑے ساتھ ساتھ چلتے نظر آتے ہیں مثلاً یہ اشعار:

ہم کسی اور کی صورت کے روادار نہیں
جتنے دروازے ہیں سب تیری طرف کھلتے ہیں

بے اثاثہ میں سہی تو تو اثاثہ ہے مرا
رات آنکھوں میں تجھے اپنی چھپا کر سو گیا

آتا نہیں یقین کہ وہ بدگمان ہیں
میرا خیال ہے کہ انھیں خط نہیں ملا

ان کے فن کا دامن غمِ جاناں ہی نہیں بلکہ دوراں کو بھی اپنے حصار میں رکھتا ہے اور بین الاقوامی حالات کے زیر اثر ایسے اشعار بھی ان کے ہاں نظر آتے ہیں:

ہمارے حلق میں پھنستا رہا نوالہ تر
ہماری آنکھ میں صومالیہ رہا پیہروں
دلادی قتل کے فتوے نے شہرت
دعا سلمان دے ایرانیوں کو

رؤف کے افکار پر مذہب کی چھاپ گہری ہے۔ جس میں غالباً جناب مصلح الدین سعدی کی صحبت کا اثر ہے جنھیں انھوں نے 'پیر خیر' کے لقب سے یاد کیا ہے اور جو جماعت اسلامی کے متاثرین میں سے تھے۔ اپنی کتاب 'دکن کے رتن اور ارباب فن' میں رؤف خیر خود رقم طراز ہیں "سعدی بھائی نے کوئی کتاب بھلے ہی نہ چھوڑی ہو، میں ان کی کتاب ہوں۔"

رسول کرمؐ سے والہانہ عشق ہی نے ان سے واقعہِ طائف کی تصویر کشی کرتے ہوئے ایسی خوبصورت نظم (نعت) تخلیق کروائی جس کا مطلع ہے:

سنگ طائف کے بچوں کے ہاتھوں میں تھے آپ نے اُف نہ کی
پاؤں نعلین میں خون سے جم گئے آپ نے اُف نہ کی

یہ الگ بات ہے کہ رؤف خیر کا مذہب نفرت وفساد کا پرچار کرتے پھرتے روایتی ملا کا مذہب نہیں بلکہ اس میں فلسفیانہ افکار کی گہرائی، انسانیات کی اعلیٰ وارفع اقدار پر یقین کامل اور ایک مردِ مومن کی عظمتِ کردار کی جھلکیاں نظر آتی ہیں جو ان کے مندرجہ ذیل اشعار سے واضح ہے:

کردار سے بہتر کوئی ہتھیار نہیں ہے
مومن کو ضرورت ہی نہیں تیر وتبر کی

رؤف خیر بھلا تم سے کیسے خوش ہوگا
وہ مولوی جو کسی مولوی سے خوش نہ ہوا

بلوالو شیخ کو بھی پئے فاتحہ ضرور
کہنا کہ میکدے میں نیاز شراب ہے

اور یہاں ہمیں پاکستان کے انقلابی شاعر حبیب جالب مرحوم یاد آجاتے ہیں جنھوں نے کہا تھا:

بہت میں نے سنی ہے آپ کی تقریر مولانا
مگر بدلی نہیں اب تک مری تقدیر مولانا

رؤف خیر کی نظر میں زندگی لائق قدر واحترام اور عالم اسلام میں گمراہ ملاؤں کے بہکانے پر خودکش حملوں کے بڑھتے ہوئے رجحان اور انسانی جانوں کی ارزانی پر ان کا دل خون کے آنسو روتا ہے:

حیات کا مرتبہ شہادت سے بھی ہے اونچا
یہ ماننے میں کوئی تامل نہ باک کرنا

یہ کیسی دشمن سے دشمنی ہے کہ خود شکن ہو
ہے اک تماشہ ہلاک ہونا ہلاک کرنا

مضطر نے رؤف خیر کو وہابی شاعر قرار دیا ہے شاید اس لئے کہ وہ دنیائے اسلام کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی فضول رسومات بے ہنگم بدعتیں اور اوہام پرستی کے مخالف ہیں۔ اگر چہ وہ اقبال کے مداح ہیں مگر وہ ان کی طرح سب کو خوش کرنے کے ہرگز قائل نہیں۔ بقول ان کے اقبال سے تو:

بدعتی اور خبیث بھی خوش تھے
ان سے اہل حدیث بھی خوش ہیں

بدعت شکن اور اوہام شکن یہ اشعار دیکھئے:

شہ رگ سے بھی قریب ہے وہ اس کے باوجود
قائل رؤف خیر وسیلے کے لوگ ہیں
جو خانقاہ کے قائل نہ بارگاہوں کے
قصیدے وہ تری چوکھٹ پہ سر سے لکھتے ہیں
جویائے حق کا دین تو دین حنیف ہے
باطل پرست حامل دین ضعیف ہے

رؤف خیر کی اب تک آٹھ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ جن میں چار شعری مجموعوں، اقرا، ایلاف، شہداب، سخن ملتوی، کے علاوہ ایک تحقیقی مقالہ 'حیدر آباد کی خانقاہیں' اور تنقیدی مضامین بہ عنوان 'خط خیر'، اقبال کے 163 فارسی قطعات 'لالہ طور' کا منظوم اردو ترجمہ بنام 'قطعات' اور تذکروں اور کوائف کی کتاب 'دکن کے رتن اور ارباب فن' شامل ہیں۔ ان کے علاوہ تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ 'بچشم خیر' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ صبیحہ سلطانہ نے حیدر آباد یونیورسٹی سے ایم فل کے مقالے کے لئے ان کی سوانح حیات مرتب کی ہے جو 'متاع خیر' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ میدان ادب میں یہ کارہائے نمایاں رؤف خیر کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ وہ خود بھی اس معاملے میں بے حد پر اعتماد ہیں اور تنقید نگاروں کی موشگافیوں کو چنداں خاطر میں نہیں لاتے۔ اس ضمن میں ان کے یہ اشعار دیکھئے:

نمو کا جوش سلامت میں بے نشان نہیں
کمال یہ ہے کہ ہر خاک نم ہے میرے لئے
ہم شعر کہا کرتے ہیں وجدان کے بل پر
کچھ لوگوں کو زعم فعلاتن بھی بہت ہے

رؤف خیر نے ہجرت کو کبھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا اور اسی لئے دشمن کو بھی ہجرت کا مشورہ نہیں دیا۔ یہ شعر دیکھئے:

مہاجرین سے انصار خوش نہیں ہوتے
تو پھر کہاں کی یہ ہجرت برائے بھارت کیا

ہماری بھی اگر بھارت سے پاکستان ہجرت کرنے سے پہلے ان سے ملاقات ہو جاتی تو ہم کبھی ہجرت کرنے کا نہ سوچتے۔ اگر چہ یہ ملاقات ممکن نہیں تھی۔ ایک تو اس لئے کہ 1949 میں جب ہم نے پاکستان ہجرت کی تو اُن کی عمر کوئی آٹھ ماہ ہوگی (یاد رہے ان کا یوم پیدائش 5 نومبر 1948 ہے یعنی ان کا برج عقرب ہے جو علم نجوم میں عموماً تحقیق، سراغ رسانی، روحانیت یا پھر جنسیات کا برج سمجھا جاتا ہے کہ اس روز کوئی چار سو سال قبل ایک شخص گائی فاکس نے بارود کے دھماکے سے پارلیمنٹ کو تباہ کرنے کی ناکام کوشش کی تھی) دوسرے یہ کہ اگر ہم دکن ان سے مشورہ کرنے چلے جاتے، وہاں ان کی نظر میں 'شمالئے' ٹھہرتے جن کے بارے میں وہ اپنی یک مصرعی نظم میں پہلے ہی کہہ چکے ہیں:

بہت سرافراز ہو گئے تھے شمالئے سب دکن میں آکر

یاد رہے کہ اس سے برسوں قبل فانی بدایونی نے کہا تھا:

فانی دکن میں آکے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستان میں رہتے ہیں ہندوستان سے دور

رؤف خیر نے ہیئت شعری اور اصناف سخن میں کئی چونکا دینے والے تجربے کیے ہیں۔ یک مصرعی نظموں کے تو وہ موجد ہیں۔ غزلوں، پابند و آزاد نظموں، نعتوں، منقبتوں اور حمدوں کے علاوہ انہوں نے بہت سی تکونیاں، سانیٹ، ہائیکو اور ترائیلے (آٹھ مصرعوں کی فرانسی صنف سخن) تخلیق کیے ہیں جو ان کی فکر کی گہرائی اور دانش و بینش کے مظہر ہیں اور ان میں ان کے نظریہ زندگی، نظریہ ادب اور سماجی شعور کی بھرپور عکاسی نظر آتی ہے۔ ان کی خوبصورت نظموں میں رکھشا بندھن، ٹیپو کی نذر، دین ضعیف، چلو سب خداؤں کو غرقاب کردیں، صبح کاذب، دوردرشن میں اپنی آواز کھو رہا ہوں، بے اثاثہ، (والد مرحوم کی نذر)، چھاؤں (والدہ مرحومہ کے نام) اور 'ماں / باپ کی قبر پر' شامل ہیں۔

انہوں نے اسلامی تاریخ سے معنی خیز تلمیحات اور استعاروں سے اپنی نظموں کو آراستہ کیا ہے۔ نعت نگاری میں وہ بے حد احتیاط کے قائل ہیں کہ بعض نعت نگار مدح رسول میں اس قدر غلو کر جاتے ہیں کہ بات کفر کی حدوں کو چھونے لگتی ہے۔

رؤف خیر نے غزل میں بھی تجربے کیے ہیں مگر وہ آزاد غزل کے مخالف ہیں۔ ان کے خیال میں ابھی آزاد نظم بھی اردو ادب میں اپنا صحیح مقام نہیں

بنا سکی ہے تو غزل کے ساتھ یہ کھلواڑ جائز نہیں۔ غزل میں ان کا تجربہ مندرجہ ذیل اشعار میں دیکھا جاسکتا ہے جس میں تمام اشعار کے مصرع ہائے اولیٰ دوسرے اشعارے کے اولین مصرعوں سے ہم قافیہ ہیں:

حروف ہیں تو بہت حرف مختصر ہی الگ
کہ وہ لکھا ہے جو لکھا ہوا نہیں دیکھا
ہے راستہ ہی الگ اپنا اور سفر ہی الگ
ہمیں کسی نے بھی بھٹکا ہوا نہیں دیکھا

اس طرز غزل کی پذیرائی ذرا مشکل ہی نظر آتی ہے کہ شعرا کی جدید نسل ہیئت میں نئی پابندیاں بھلا کیوں برداشت کرے گی جبکہ وہ موجودہ قیود سے بھی گریزاں ہے۔

اپنی روایتی شاعری کی مانند غیر روایتی شاعری میں بھی رؤف خیر نے دانش وحکمت کے موتی بکھیرے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی تکونیاں خصوصیت سے اظہار رائے کی بے باکی اور ان کی علمی بصیرت کی دلیل ہیں۔ مثلاً اقبالئے حضرات کے بارے میں ان کا کہنا ہے:۔

جن کی پہچان کچھ نہیں تا حال ان کی پہچان ہوگئے اقبال

ترقی پسندوں کے بارے میں ان کا کہنا ہے:[1]

کھلا کہ ان کا جو فلسفہ تھا شکم سے اوپر نہ اٹھ سکا تھا

جدیدیوں کے بارے میں وہ کہتے ہیں:[2]

بس ایک بار ادب نہیں تھا وگرنہ جھولی میں ان کی سب تھا

انہوں نے اپنی تکونیوں میں کیلے اور کریلے کا دلچسپ مقابلہ کروایا ہے اور ابطور مبصر بڑے پتے کی باتیں کی ہیں: مثلاً

تم اگر چاہتے ہو شہرت ہو ہر بڑے آدمی کو گالی دو

یک مصرعی نظم: •سکوں حضر میں ہے لذت مگر سفر میں ہے
•ہر سند سے بڑی سفارش ہے

ہائیکو: دانش نیچے رکھ/ بینش اس سے بھی نیچے/ خواہش پیچھے رکھ
:قصہ گو کا نام/ لمبے چوڑے قصے کا/ اتنا سا انجام

ماہیے: جھانسہ تھا بلا سودی/ اصل ہی کھا بیٹھے/ ایسے بھی تھے بیوپاری

رؤف خیر نے اپنے ابتدائی دور میں بچوں کے لئے بھی شاعری کی ہے اور ماہ نامہ 'کھلونا' جیسے معیاری رسالے میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہی ہے۔ ان کی نظمیں 'جب میں اسکول جانے لگتا ہوں' اور 'ہمالیہ' مہاراشٹر اور آندھرا پردیش کے اسکولوں کے نصاب میں داخل ہیں۔ سبق آموز کہانیاں نقشی کٹورا، دھوکا، ٹیوشن اور مضامین، بستہ، اور محلے کا تل مختلف جریدوں میں شائع ہوچکے ہیں۔

رؤف خیر نے ترجمے کے میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ علامہ اقبال کے 163۔ فارسی قطعات کا جو 'لالۂ طور' کے نام سے موسوم ہیں اردو میں اتنا خوب صورت ترجمہ کیا ہے کہ اصل کا دھوکا ہونے لگتا ہے جو ان کی فارسی زبان پر بھی مکمل دسترس کی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ عجم کی افتتاحیہ دعا اور نظم تنہائی کا منظوم اردو ترجمہ اور غلام علی آزاد بلگرامی کی چار فارسی غزلوں کا بھی دلکش منظوم اردو ترجمہ کیا ہے۔ مشہور نو مسلم شاعرہ کملا ثریا کی انگریزی نظم 'یا اللہ' کو بھی انہوں نے اردو کے منظوم قالب میں ڈھالا ہے۔

رؤف خیر تذکرہ، تنقید کے میدان کے بھی شہ سوار ہیں۔ میں نے سب سے پہلے ان کا کلام بریڈفورڈ کے ہفتہ روزہ 'راوی' میں پڑھا جو مجھے ایک تازہ وتوانا لہجہ محسوس ہوا۔ اس کے بعد برصغیر اور برطانیہ کے مختلف ادبی جریدوں میں ان کی شعری اور نثری نگارشات پڑھتے رہنے کا سلسلہ تا حال جاری ہے اور طبیعت ہے کہ سیر ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ نقد ونظر کے ضمن میں ان کی معرکتہ الآرا کتاب 'دکن کے رتن اور ارباب فن' ہے۔ جس میں انہوں نے کھل کر اپنی پسند اور ناپسندیدگی اور ادبی نظریات کا اظہار کیا ہے مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ کسی آبگینے کو ٹھیس نہ پہنچے۔ اس کتاب میں انہوں نے جن اہل قلم اور اہل دانش کے حیات وفن پر روشنی ڈالی ہے ان میں خورشید احمد جامی، مخدوم محی الدین، شاذ تمکنت، سلیمان اریب، اقبال متین، ابن احمد تاب، مصلح الدین سعدی، سالار جنگ سوم، قلی قطب شاہ، میر غلام علی آزاد بلگرامی، محمد علی جوہر، حکیم منظور کشمیری، عرفان صدیقی، تاج بھوپالی، خواجہ میر درد، فضا ابن فیضی، محمد احمد سبزواری، بدیع الزماں، اقبال، رابندر ناتھ ٹیگور، راجہ رام موہن رائے اور سردار پٹیل شامل ہیں۔ کتاب کے آغاز ہی میں ادب سے اپنی سنجیدہ وابستگی کو واضح کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

''میں نے ادب سے متعہ نہیں کیا ہے بلکہ یہ میرا عشق اول ہے اور میرے حرم میں داخل ہے۔''[3]

رؤف خیر غزل کو اردو کی ایک منفرد صنف سخن قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں:
''محض نظم گوئی پر تکیہ کرنے والے شعرا تو وہ حنوط شدہ لاشیں ہیں جن کا مسالہ کچھ ہی دن میں دم دے جاتا ہے۔''[4]

اس ضمن میں ان کا یہ شعر قابل غور ہے:

مجروح کو غزل نے گلے سے لگا لیا
نظموں کے بیچ اختر الایمان پھنس گئے

رؤف خیر ایک اچھے شاعر کے لئے بنیادی شعری جوہر کی موجودگی کو ضروری

قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں "نیاز فتح پوری زندگی بھر جوش وجگر کے خلاف لکھتے رہے لیکن خود ان کی طرح ایک شعر نہ کہہ سکے... تفنن طبع کے طور پر اختیار کردہ صنف سخن کبھی سرخ رو نہیں کرتی۔ جگر لہو کرنے ہی سے چہرے پر نور آتا ہے۔"

مولانا محمد علی جوہر کے ذکر میں ان کے ایک تجزیے سے مجھے اختلاف ہے وہ کہتے ہیں "مولانا محمد علی جوہر کے جذبات کو دھکا اس وقت لگا جب خود ترکی کمال اتاترک نے انگریزوں کی غلامی خوشی خوشی قبول کرتے ہوئے ترکی کو انگریزوں کے ہاتھ بیچ دیا۔" میرے خیال میں کمال اتاترک نے ترکی کو کسی کے ہاتھ نہیں بیچا بلکہ اپنی جرائت مردانہ سے اسے یورپ کی جارحانہ طاقتوں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھا اور ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے اس کے وجود کو یقینی بنایا۔ البتہ اس ضمن میں محمد علی جوہر کی سیاسی دور اندیشی کئی سوالات کو جنم دیتی ہے۔

محمد احمد سبزواری کے تذکرے میں رؤف خیر نے حیدر آباد سے ان کے مراعات یافتہ ہونے کے باوجود شاکی رہنے کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "میر عثمان علی خان نظام دکن کے دور میں بھی مرعوبیت کا یہ عالم تھا کہ ہر اعلی عہدے پر کسی نہ کسی شمالئے Upian کا تقرر ہوتا تھا۔"[5] میرے خیال میں رؤف خیر جیسے وسیع النظر اور آفاقی سوچ رکھنے والے مرد مومن دانشور کو اس طرح تنگ نظری کے خارزاروں میں نہیں الجھنا چاہیے۔

فضا بنا فیضی کے تذکرے میں وہ کہتے ہیں کہ حمد ونعت کہنے والے پر مولوی کا لیبل چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ "کیا حمد ونعت کہنا ترقی پسندی کی نفی ہے؟ جبکہ ترقی پسند شعرا مرثیے اور نوحے کہتے رہے ہیں بلکہ اشعار میں بھی وہی کربلائی علائم برتنا فخر سمجھتے ہیں۔" میرے خیال میں رؤف خیر کی یہ شکایت برحق ہے کہ محمد عربیؐ سے بڑا ترقی پسند کون ہوگا جس کا لایا ہوا نظام اپنے وقت کا سب سے زیادہ ترقی پسند فلسفہ تھا۔ جب پہلی بار زمین پر بادشاہوں کے بجائے اللہ اور اس کے بعد محنت کش کسان کی حاکمیت تسلیم کی گئی اور خواتین کو باوقار حقوق سے نوازا گیا۔

رؤف خیر کے پسندیدہ شعرا میں خورشید احمد جامی، شکیب جلالی اور یگانہ کے علاوہ غالب، اقبال، فیض، جوش، بہادر شاہ ظفر اور ظفر اقبال شامل ہیں۔ وہ پرخلوص اور بامقصد شاعری کے علم بردار ہیں مگر پروپیگنڈہ فن کو صرف صحافت کیلئے موزوں گردانتے ہیں۔ ان کے خیال میں بہتر سماج کا خواب دیکھنے والا ہی بہتر ادب پیدا کر سکتا ہے اور میں ان کی اس رائے سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔ وہ ادب برائے ادب، جدیدیت، ترقی پسندی اور مابعد جدیدیت کی کسی تھیوری سے متاثر نہیں کہ ان کے خیال میں فن کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔

رؤف خیر اردو کے رسم الخط کی تبدیلی کے مخالف ہیں اور اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ وہ کہتے ہیں "جب تک مذہب اسلام روئے زمین پر باقی ہے اردو بھی رہے گی۔"[6] اور میں ان کے ان خیالات سے متفق ہوں۔ ترقی پسندی سے رؤف خیر کا اجتناب البتہ میری سمجھ سے بالاتر ہے کیونکہ ایک طرف وہ ملائیت اور اوہام پرستی کے مخالف ہیں اور ان کے افکار اسلامی فکر میں رچے بسے ہیں جس کی روشنی کے آگے تمام ترقی پسند فلسفے ماند نظر آتے ہیں۔ کہیں اقبال کے نطشے والا حال تو نہیں جس کے بارے میں انہوں نے کہا تھا کہ اس کا دل مومن مگر دماغ کافر ہے۔ جب وہ اس ظلم وستم اور رنج وآلام سے لبریز سماج کو بدلنے کی بات کرتے ہیں تو اپنے آپ ترقی پسند بن جاتے ہیں اور ان کا اسلام تو مزید نکھر کر سامنے آجاتا ہے کہ ہم نے بھی کہا تھا:

میری نظر میں داخل اسلام ہو گیا
جس کی زباں پہ حق وصداقت کی بات ہے

بہر کیف رؤف خیر نے جو کچھ بھی لکھا اپنی بھرپور توانائیوں اور بڑے خلوص سے لکھا اور ارض دکن ان پر جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔ میری دعا ہے کہ وہ اسی طرح اپنے علم وفن کی روشنیاں بکھیرتے رہیں اور گیسوئے اردو کی تابنا کی میں اضافہ کرتے رہیں۔ آخر میں اپنا ایک شعر ضرور ان کی نذر کرنا چاہوں گا:

جنگ محنت اور سرمایہ ہے جنگِ خیر وشر
خیر کا جو ساتھ دے خالد وہ سچا انقلاب

■■

'ادب ساز' کی رائے

1، 2: رؤف صاحب سے منسوب کیے گئے ان دونوں جملوں سے 'ادب ساز' کو اختلاف ہے۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کی تحریکوں کو اتنے ہلکے پن سے لینا، خطیب کی کوتاہ بینی اور اور اس کی فکر کے سطحی ہونے کی دلیل ہے۔

3: یہ حوالہ درست ہے تو اردو کے ایک مشہور لطیفے سے استفادہ کرتے ہوئے کہنا پڑے گا، رؤف صاحب نے قادر الکلام اور پرگو ہونے کے باوجود اردو ادب کے ساتھ وہی سلوک کیا ہے جو کسی حرم یا کنیز کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

4: اردو کے نظم گو شعرا کے لیے دیا گیا رؤف صاحب کا یہ مبینہ بیان بھی صاف طور پر اعلان کرتا ہے کہ ن م راشد اور اختر الایمان جیسی اردو ادب کی عظیم شخصیتوں کی تخلیقات کے سنجیدہ مطالعے اور فہم سے تو وہ محروم ہیں ہی میراجی، عمیق حنفی، وحید اختر، قیوم نظر اور منیب الرحمن کا انھوں نے شاید نام بھی نہیں سنا ہوگا جو صرف نظموں کے شاعر ہیں۔ یہ جملہ صرف 'حنوط شدہ لاشوں' کی لفظی ترکیب استعمال کرنے اور زبردستی کی قابلیت جھاڑنے کی کوشش سے زیادہ کچھ نہیں۔

5۔ اس جملے میں رؤف صاحب کا علاقائی تعصب عروج پر ہے، اور یہاں یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ مسلکی تعصب جہاں بنیاد میں ہو وہاں آپ کسی سطح پر بھی شریفانہ خیالات کی توقع نہیں کر سکتے۔

6۔ اردو کو مذہب سے جوڑنے کی یہ ایک ایسی کوشش ہے، جس پر اپنا نہیں بلکہ کہنے والے کا سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔ افسوس تو یہ ہے اس جملے میں چھپے ہوئے زہر کو مضمون نگار نے بھی نگل لیا۔

نئی نسل کی آوازیں

محمد شاہد پٹھان: غنائی لب ولہجے کا شاعر

اسما مسعود

محمد شاہد پٹھان نئی نسل کے معتدل مزاج اور غنائی لب ولہجے کے شاعر ہیں۔ غزل کے علاوہ انہوں نے نعت، سلام اور ماہیہ وغیرہ اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ شاہد نے باقاعدہ کسی سے اصلاح نہیں لی بلکہ اپنے فطری ذوق اور مطالعے کی روشنی و رہنمائی میں اپنا شعری سفر طے کیا ہے۔ شاہد کا تعلق نویں دہائی کی غزل گوئی سے ہے۔ معاصر غزل آج کی برہنہ حقیقتوں سے آنکھیں ملاتی ہے۔ داخلی موضوعات کے دوش بدوش ہمارے معاصر غزل گویوں نے آج کے عصری آشوب کو ذاتی اور شخصی رنگوں میں رنگ کر غزل میں اس طرح پیش کیا کہ اس کا دامن بہت وسیع ہو گیا۔

شاہد کی غزل نئی زندگی اور اس کی جزئیات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کی تہہ دار علامتوں، استعاروں اور تلمیحات نے آج کی زندگی اور اس کے عطیات کو پوری شدت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ دور حاضر کا کرب، سماجی اور سیاسی رویوں کی ناہمواری، اقدار کی شکست، انسان کی بے بسی، فسادات اور مذہبی جنون کے جنون کے علاوہ، خوف اور جذباتی لاتعلقی جیسے وجودی مسئلوں کی تصویر کشی نے شاہد کو آج کی غزل کے مزاج سے قریب کیا ہے۔ لیکن شاہد کی تخلیقی توجہ ان خارجی موضوعات کو اپنے ذاتی رنگ میں بیان کرنے پر ہے، ان کی غزلوں کا خمیر گردوپیش کے حالات اور حقائق سے تیار ہوتا ہے:

ہر طرف موجِ ستم رقصِ شرر باقی ہے
خیر معدوم ہے اس دور میں شر باقی ہے

کون گزرا ہے قیامت کو جلو میں لے کر
شہر در شہر ابھی خوف وخطر باقی ہے

اب کسی اور ہی سیارے پہ ممکن ہے کہیں
اس زمیں پر تو اقامت نہیں ملنے والی

اس عہدِ جفا میں ہم جیتے ہیں کہ ذہنوں سے
نادیدہ بلاؤں کا خدشہ بھی نہیں جاتا

اٹھتا رہتا ہے بستیوں سے دھواں
جلتے رہتے ہیں شہر میں افراد

ان اشعار میں محسوسات کی رنگارنگ تصویریں موجود ہیں جو عصری حقیقتوں کے مرتعش جلووں کو ذہن پر نقش کر دیتی ہیں۔ شاہد اپنے عہد کے سماجی اور سیاسی مسائل کا گہرا شعور رکھتے ہیں:

فضائے امن میں فتنے جگا رہا ہے کوئی
ہر ایک شہر کو مقتل بنا رہا ہے کوئی

جنہیں اڑان کا سودا بہت زیادہ تھا
انہیں کے کاٹے ہیں لوگوں نے بال وپر اکثر

میں ہوں کہ شکستہ در و دیوار سنبھالوں
طوفاں ہے کہ ہر بار ہی گزرے مرے گھر سے

شاہد پٹھان اردو شاعروں میں غالب، اقبال، اور فیض سے متاثر ہیں۔ ان کے متعدد اشعار میں مذکورہ شعرائے کرام کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ شاہد اپنے اندرون میں لبے ہوئے غم اور اداسی کی تصویر کشی کرتے ہیں تو ان کا قوی اور اک ایسی دلکش اور توانا تصویریں تخلیق کرتا ہے:

بیگانہ وار رکھتا ہے آشوبِ آگہی
خود سے بھی آشنائی کی فرصت نہیں مجھے

کہاں تک سلسلۂ غم کا کہاں تک کرب انگیزی
الٰہی اب تو کشتِ آرزو کو بخش زرخیزی

رکھ لے مرے خدا مری کشتی کی آبرو
طوفاں سے التماس کی عادت نہیں مجھے

کہاں مٹی ابھی رسمِ یزیدیت شاہد
فضائے شہر نظر آئی نوحہ گر اکثر

لہو سے تر ہیں ورقہائے داستانِ حیات
ہزار غم ہیں غزل میں کریں رقم کیا کیا

غزل کی تخلیق کے لئے احساس کی شدت اور تخیل کی بلندی کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر غزل، قافیہ پیمائی بن کر رہ جاتی ہے۔ شاہد کے نکتۂ نظر کے مطابق غزل کے فن پر عبور حاصل کرنے کیلئے 'تکلم کا قرینہ' آنا چاہئے۔ رمز و ایما سے غزل میں معنی کی نئی نئی جہتیں کھلتی ہیں۔ شاعر کے دل کا درد و غم غزل کے فن کو سنوارتا ہے۔ حقیقت میں غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس میں نفاست، لطافت اور زبان کا ستھرا پن ہونے کے ساتھ ساتھ رگِ شعر میں فنکار کا دل بھی پیوست ہونا ضروری ہے۔ اپنی غزل میں شاہد کہتے ہیں:

رمز و ایما سے سنورتا ہے غزالِ معنی
ہو تکلم کا قرینہ تو غزل ہوتی ہے
رقص کرتا ہے رگِ شعر میں فنکار کا دل
خون بنتا ہے پسینہ تو غزل ہوتی ہے

نئی زندگی کے عطیات یعنی تہذیب، معاشرت اور اخلاق کی کھوکھلی ہوتی ہوئی جڑیں اور ان کے نتیجے میں ذہنی انتشار جدید شاعری کے اہم موضوعات ہیں۔ خصوصاً اخلاقی اقدار اور جذباتی ناآسودگی پر ہمارے جدید شاعروں نے کثرت سے لکھا۔ شاہد نے بھی ان موضوعات و مسائل کو شدتِ احساس کے ساتھ اپنی غزل میں پیش کیا ہے۔ آج کے انسان کو درپیش اندیشے، خوف، جذباتی لاتعلقی اور رشتوں کی پامالی اور صنعتی تمدن کے فروغ کے نتیجے میں بدلتی ہوئی انسانی فطرت پر سیکڑوں متاثر کن اشعار ان کے یہاں دیکھے جاسکتے ہیں۔ آباد بستیوں میں بھی آج کے انسان کی تنہائی کے المیے اور انسانی رشتوں میں بڑھتی ہوئی سرد مہری کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

تعلقات نبھانے کی کس کو فرصت ہے
لہو کے رشتے ہی نبھ جائیں تو غنیمت ہے
ڈھلتے جاتے ہیں لوگ پتھر میں
ہوتے ہوتے ہیں دل غبار آلود

اپنے عہد کی سفاکیت کا شعری اظہار اس طرح سے کیا ہے:

جدھر بھی دیکھئے بے چین ہے حیات بہت
الٰہی درد میں ڈوبی ہے کائنات بہت
ہمارے دور میں بھی کچھ وہی رسمِ سیاست ہے
کہیں ظلمِ یزیدی اور کہیں ہے جورِ چنگیزی

عام طور پر وقتی اور ہنگامی موضوعات، شعر کے تخلیقی حسن کو مجروح کر دیتے ہیں اور اس قسم کی شاعری میں ایک گونہ کرختگی پیدا ہو جاتی ہے، لیکن شاہد کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کی شاعری اسلوب کی تازگی اور فنی رچاؤ کی آئینہ دار ہیں۔ سماجی مقاصد کو نبھانے کے باوجود شاہد کی غزلوں کا تخلیقی و فنی حسن برقرار رہتا ہے۔ ان کے لہجے میں غنائیت ہے جس نے خارجی موضوعات میں بھی تغزل کو برقرار رکھا ہے۔ یہ اشعار دیکھئے:

دلوں میں کس نے تعصب کی طرح ڈالی ہے
تمام شہر نے رسمِ وفا اٹھا لی ہے
یہ کس کے رمز سے ہر سمت قتل و غارت ہے
یہ کون لایا ہے رقصِ شرار کا موسم
چھپا سکی نہ تبسم کی موج بھی شاہد
شگفتہ چہروں پہ رنگِ ملال ایسا تھا
ارمان، آشناؤں کے نکلے کہاں ہنوز
پتھر ہماری سمت مکرر بھی آئے گا
شرارت، شوخیاں، موجِ تبسم چھین لی کس نے
یہ بچے ہر گھڑی رہتے ہیں کیوں سنجیدہ سنجیدہ

شاہد نے اپنے شعری اظہار کے لئے خاص طور سے مترنم اور موسیقیت آمیز بحور کا استعمال کیا ہے۔ 'غنائیت' شاعری کا جزو لاینفک ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ولی دکنی سے لے کر فیض، فراق، ناصر کاظمی اور احمد فراز ایسے بڑے اور سنجیدہ شعرا کی شاعری میں ہمیں شاعرانہ خصائص کے ساتھ ہی ساتھ 'غنائیت' کا عنصر بھی لازمی طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ مختصر بحروں کی بھی اپنی نغمگی، تاثیر اور انفرادی خصوصیت ہوتی ہے جو کبھی کبھی شاعر کی تخلیقی صلاحیتوں کی آزمائش بھی کرتی ہے۔ شاہد نے مختصر بحروں میں متعدد غزلیں کہی ہیں۔ اطمینان کی بات یہ ہے کہ ان مختصر و مترنم بحروں میں بھی شاہد تخلیقی مشاقی کا ثبوت دیا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار دیکھے جاسکتے ہیں:

چلتی ہے تلوار بہت — کٹتے ہیں کردار بہت
حق والوں کو یہ دنیا — دیتی ہے آزار بہت
شاہد میر کشتی سے — برہم ہے منجدھار بہت
قریہ قریہ یزید ہیں شاہد — شہر در شہر کنس کے اوتار
زیرِ خنجر بھی شان سے نکلا — حرفِ حق ہی زبان سے نکلا
وہ تھے دانا تو ہم بھی دیوانے — راستہ درمیان سے نکلا
شاید دھوپ کا مارا ہے — سائے سے جو ڈرتا ہے
ہر غنچے کی آنکھ ہے نم — اترا اترا چہرہ ہے

قتل پہ میرے اب شاہد   قاتل بھی شرمندہ ہے

ان شعری تصویروں میں بے تکلفی اور تڑپ ہے۔ صوری دلکشی اور معنوی بلندی ہے۔ شاہد کے موضوعاتِ شعری روایتی اور دوراز کار نہیں۔ انہوں نے اپنے کلاسیکی شعری الفاظ، استعارات اور علامات وتلمیحات سے تخلیقی استفادہ کیا ہے مگر موضوعات ومسائل ان کے اپنے عہد اور ماحول سے مطابقت ومانوسیت رکھتے ہیں۔ کسی بھی تخلیق کار کے سامنے جب کہنے کیلئے بہت کچھ موجود ہوتو وہ اپنے اظہار وبیان کے لئے تمام وسائلِ فن کا استعمال مستحسن سمجھتا ہے۔ شاہد نے بھی اپنے احساسات کے اظہار کے دوران حسب ضرورت کلاسیکی ڈکشن کا استعمال کیا ہے مگر ان کا رجحان طبع، جدید لفظیات، نئے استعارات وعلامات کے تخلیقی استعمال کرنے ہی کا رہا ہے۔ انہوں نے روایتی موضوعات سے یکسر انحراف کرتے ہوئے اپنے زمانے کے مختلف النوع مسائل حیات کے موثر اظہار کے لئے تازہ کار ڈکشن کو بخوبی اپنایا ہے۔ شاہد کے درج ذیل اشعار اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

سیاست کی چالوں سے مارے گئے
پرندے جو اونچی اڑانوں کے تھے

کتنا بدلا ہے مرے عہد کا اندازِ نظر
شہر کے بچوں نے خنجر کو کھلونا لکھا

نہیں پتھر بھی اس کے گھر میں شاہد
جو اک مدت سے پتھر کاٹتا ہے

سبز کھیتوں میں مہکتا ہے پسینہ میرا
ان بہاروں میں ہے شامل میرے ایثار کا رنگ

لہو کا رنگ ہی حرف ونوا سے ابھرا تھا
غزل کی شکل میں جو کچھ لکھا وہ نوحہ تھا

حاکم وقت کہاں کس کا بھلا کرتے ہیں
حق بھی خیرات کی مانند دیا کرتے ہیں

ہے تیری مملکت میں آدمی غربت زدہ یارب!
تری مخلوق کی تجھ کو شکایت لکھ رہا ہوں میں

زندگی کے تلخ حالات وحقائق سے مکمل آگہی رکھنے اور وقت کے جابرانہ رویے کا ہدف بننے کے باوجود شاہد کے یہاں شاعرانہ سطح پر مایوسی، دل شکستگی، خود ترحمی اور بے یقینی جیسے عناصر سخن رونما ہو سکے ہیں، اس کے بجائے ان کے یہاں ایک گونہ یقین افزا، زندگی آمیز اور رجائیت سے بھرپور شعری رویہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ زندگی کے تئیں یہ مثبت اور رجائی انداز نظر دراصل فنکار کے صحت مندی فکر کا ضامن ہے جو حالات زمانہ کے گہرے مشاہدے کی بدولت ہی پیدا ہوسکتا ہے۔ شاہد کے شعری سرمایے میں ہمیں زندگی اور معاملاتِ زندگی پر دیدہ ورانہ غور وفکر کی روشن مثالیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ ان کے یہاں سفاک موسموں کے گزرنے اور نئی رتوں کی آمد کا یقین ہمیں زندگی سے محبت کرنے اور اس کے کیف وکم سے ہم آہنگ ہونے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ ان اشعار میں ہمیں امید، یقین، حوصلہ اور آرزوئے حیات کی توانائی محسوس ہوتی ہے:

سہانی رتیں لوٹ کر آئیں گی   یہ سفاک موسم گزر جائیں گے
بلندی کے منظر بکھر جائیں گے   جو ڈوبے ہوئے ہیں ابھر جائیں گے

موجودہ زندگی کی حقیقتوں کو پورے فنی رچاؤ کے ساتھ پیش کرنے کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ان کی فکر پر زمانے کے آشوب کا غلبہ ہے۔ شاہد کو قریب سے جاننے والے لوگ ان کے مزاج کی شگفتگی سے واقف ہیں لیکن اسے حالات کی سنگ دلی ہی کہی جائے گی کہ شگفتہ مزاج کے شاعر کی غزلوں میں 'ساز' نہیں سوز ہی سوز ہے۔ خود ان کی ذاتی زندگی کی جدوجہد کو بھی اس میں بڑا دخل ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ شاہد کی شاعری میں زندگی کے دل کش پہلوؤں کی تصویر کشی کی کمی ہے۔

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ محمد شاہد پٹھان ایک ایسے جدید شاعر ہیں جنہوں نے اپنی شاعری میں نئی زندگی کی حقیقتوں کے اظہار میں فنی روایت اور غنائیت سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔ وہ نئے عہد کی تلخیوں کی پیشکش میں کلاسکی فنی نظم وضبط کا احترام بھی رکھتے ہیں اور الفاظ کے صوری حسن کا خیال بھی۔ شاہد کی بڑائی اس میں نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے عصر کی روح کو غزل میں سمویا بلکہ ان کی بڑائی اس میں ہے کہ انہوں نے عصری مسائل کو غزل کے فنی تقاضوں سے ہم آمیز کرتے ہوئے، اس کے اندازِ بیان کی سادگی وصفائی، لہجے کی مٹھاس اور گھلاوٹ کو مفکرانہ زاویۂ نظر سے ہمکنار کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

زندگی کے حسین اور رنگین پہلوؤں کی تصویر کشی کی کمی کا احساس شاہد کی غزل میں ہوتا ہے لیکن اس کی صوری دلکشی اور معنوی بلندی، شاہد کی غزل کو آج کی شاعری میں الگ مقام عطا کرتی ہے۔ شاہد پٹھان میں اعتماد اور تخلیقی اپج کی کمی نہیں ہے اس لئے ان سے آئندہ بہت سی امیدیں وابستہ ہیں:

اس کی سوچوں کے دائرے ہیں وسیع
اس کا اسلوب بھی انوکھا ہے

■■

بابِ غزل

سید امین اشرف کے نام

ساقی فاروقی

اپنے محتاج پیالوں کو لبالب کر لے
جاں کنی جبر ہے آنکھوں کو مہذب کر لے
حوصلہ ہو تو اسے رام کر اپنے اندر
صبر سے کام لے سر معرکہ رب کر لے
رات بھر اس کے لیے گوش بر آواز نہ رہ
صبح کی چاپ نہ سن خواب کو مذہب کر لے
اس سے پہلے کہ پلٹ آئے وہی عہد سکوت
کوئی آواز کی تاریخ مرتب کر لے
موت کی طرح دبے پاؤں مری سمت نہ آ
ایک ہی جست میں طے مرحلۂ شب کر لے

رات اسکول سے نکلی ہوئی دوشیزہ ہے
جس کے ہاتھوں میں ستاروں سے بھرا بستہ ہے
جرم شعلوں کی طرح دھیان میں لہراتے ہیں
دور جنگل میں کوئی جلتا ہوا خیمہ ہے
آج اک خوف کے قدموں کے نشاں دیکھے ہیں
میری سہمی ہوئی آنکھوں میں کوئی رستہ ہے
خاک اڑتی ہے محبت کے شبستانوں میں
شہر اپنی ہی طرح شام سے افسردہ ہے
اس اچنبھے سے یہ بنتی ہوئی دیوار نہ دیکھ
دیکھ اس میں کوئی کھلتا ہوا دروازہ ہے!

عبداللہ جاوید

سمندر بات کرنے جب لگے گا
تو موجِ آب میں بھی رب لگے گا
مجھے بھی ایک میلہ گھومنا ہے
وہ میرے دل کا میلہ کب لگے گا
ستارو جاتے جاتے یہ بتاؤ
کہاں اب کاروانِ شب لگے گا
سبھی کے نام لب پر آگئے ہیں
مگر وہ نام زیرِ لب لگے گا
ہم جب دید کے سامان ہوں گے
شجر سولی کا شاید تب لگے گا
کھلے گی آخری تہہ زندگی کی
تو مرجانا بھی با مطلب لگے گا
گماں کی نیند سے آنکھیں تو کھولو
جدھر دیکھو گے حکمِ رب لگے گا
بھٹکتا پھر رہا ہوں ماورا میں
کہیں تو جستجو کا ڈھب لگے گا
رواں ہوں 'اب' میں لیکن سوچتا ہوں
کہاں جاکر یہ میرا 'اب' لگے گا
جیے تم عرصۂ محشر میں جاوید
یہ سوچا اب لگے گا، اب لگے گا!

مسافرت نہیں، گٹھری سنبھالتے پھرنا
سفر وہ ہوگا جو اسباب کے بنا ہوگا
زمیں میں گاڑ دیا جائے گا بدن لیکن
بدن میں قید جو تھا، قید سے رہا ہوگا
مری شناخت کہیں اور بن رہی ہوگی
مرا بدن کہیں مٹی میں مل رہا ہوگا
کہیں تو ہوگا اک ایسا مقام میرے لئے
میں سر بسجدہ، مرے سامنے خدا ہوگا
میں ہاتھ اٹھائے ہوئے ہوں کسی دعا کے بغیر
یقیں ہے وہ مرا سب حال جانتا ہوگا
مرے وجود کو اس کی رضا سے مطلب ہے
مرا وجود یہی بھیک مانگتا ہوگا
یہاں تو چار طرف برف کا سمندر ہے
اس ایک صبح کے سورج سے کام کیا ہوگا
تو بندگی میں تو ناکام رہ گیا جاوید
فقیر بننے میں شاید ترا بھلا ہوگا

ورِ دل پر ہوا، چپ چاپ سی ہے
ہوا کو کیا ہوا، چپ چاپ سی ہے
کوئی آتو رہا ہے دل کی جانب
مگر آوازِ پا، چپ چاپ سی ہے
ہے دل میں آج کل بے نام موسم
دھڑکنے کی ادا چپ چاپ سی ہے
یہ کس نے کس سے کی ہے بے وفائی
وفاؤں کی فضا چپ چاپ سی ہے
ردائیں پھر سروں سے کھنچ رہی ہیں
زمینِ کربلا چپ چاپ سی ہے
تھی پہلے تیز یہ موجِ ہوا...اب
مٹا کر نقشِ پا، چپ چاپ سی ہے
اب ایسی بھی نہ تھی قیدی کی حالت
یونہی زنجیرِ پا چپ چاپ سی ہے
کرو ہو کس سے باتیں آپ جاوید
سنو دل کی صدا، چپ چاپ سی ہے

عالم خورشید

در و دیوار کی زنجیر سے آزاد ہو جانا
جنوں اب چاہتا ہے دشت میں آباد ہو جانا
نئی آشفتگی ہے ایک دن خود ہی سمجھ لے گی
بہت آساں نہیں ہے عشق میں فرہاد ہو جانا
محبت! خوب یہ انجام ہے اہلِ محبت کا
تجھے آباد کرنا اور خود برباد ہو جانا
کسی کا حق طلب کرنا تجھے اچھا نہیں لگتا
ہمیں آتا نہیں ہے کاسۂ فریاد ہو جانا
ستم کے موجدوں کو کیوں بھلا حیران کرتا ہے
کسی مظلوم کا اک دن ستم ایجاد ہو جانا
ازل سے دل کی بستی کا یہی معمول ہے شاید
کبھی ویران ہو جانا، کبھی آباد ہو جانا
نئی تہذیب ہے اب فون پر اتوار کو عالم
کسی کو یاد کرنا اور کسی کو یاد ہو جانا

مرحلہ سخت سہی ہم سفراں اور بھی ہیں
چڑھتے دریا میں سرِ آب رواں اور بھی ہیں
آ گئے ہیں ترے در پر تو بہت ناز نہ کر
کوچہ اہلِ صنم، کوئے بتاں اور بھی ہیں
ایک ہم ہی تو نہیں ہیں تری وحشت کے اسیر
دیکھ اے موجِ بلا! رقص کناں اور بھی ہیں
عشق اب ایک ہی معشوق سے منسوب نہیں
خوش بدن اور بھی ہیں ماہ رخاں اور بھی ہیں
صرف تجھ کو نہیں قامت کی بلندی کا گماں
خودستاں شہر میں کوتاہ قداں اور بھی ہیں
ختم ہوگا نہ ابھی سلسلۂ مکر و فریب
ناخدا اور بھی ہیں، راہبراں اور بھی ہیں
شعر گوئی بھی عبادت ہے ہماری عالم
ورنہ دنیا میں کئی کارِ زیاں اور بھی ہیں

کن سرابوں نے کیا اب کے گرفتار ہمیں
یاد بھی آتے نہیں ہیں در و دیوار ہمیں
اک عجب خواب کی آغوش میں مدہوش ہیں ہم
کوئی تعبیر بھی کرتی نہیں بیدار ہمیں
سب سجائے ہوئے بیٹھے ہیں دکانیں اپنی
ساری دنیا ہی نظر آتی ہے بازار ہمیں
کچھ نظر آتا نہیں اپنی ضرورت کے سوا
زندگی لگنے لگی درہم و دینار ہمیں
ایک غنچہ بھی نہیں کھلتا ہمارے لب پر
گھیر کر بیٹھے ہیں اس طرح سے آزار ہمیں
جب کمر باندھ کے ساحل پہ چلے آئے ہیں ہم
کوئی آواز بلاتی نہیں اس پار ہمیں
ڈوبنے لگتی ہے کشتی جو بھنور میں عالم
ناخدا سونپ دیا کرتا ہے پتوار ہمیں

اوم پربھاکر

جو نہیں ہے اسی کھلے در کو
جا رہا ہوں میں چھوڑ کر گھر کو

اپنی دہلیز سے میں تا منزل
ڈھونڈتا ہی رہا ہوں رہبر کو

کیا کروں، جا کے قبر میں لیٹوں
کیسے بھولوں میں موت کے ڈر کو

تو بھی آتا ہے ساتھ ساتھ کہ جب
یاد کرتا ہوں اپنے دلبر کو

جا رہی ہے خزاں پہنچنے سے
چھوڑ کر دامن معطر کو

یاد کرتا ہے رات بھر انبر
تیر کھائے پرند کے پر کو

غلام مرتضیٰ راہی

ہے وہ بیتا ہوا اک پل اب تک
نہ ہوا آنکھ سے اوجھل اب تک

خرچ دولت ہوئی اور صرف دماغ
پر معمہ نہ ہوا حل اب تک

اب بھی قانون وہی جنگل کا
وہی جنگل میں ہے منگل اب تک

چھاؤں ویسی ہی گریزاں سر سے
دور ہاتھوں سے وہی پھل اب تک

راستہ ویسا ہی مسرور مرا
وہی کیچڑ وہی دلدل اب تک

جوڑی بیلوں کی سلامت اب بھی
ان کے کاندھوں پہ وہی ہل اب تک

وہی غراتے ہوئے آرے ہیں
وہی سہمے ہوئے جنگل اب تک

وہی آنکھیں وہی آنسو ان میں
وہی بہتا ہوا کاجل اب تک

وہی گستاخ ہواؤں کا چلن
وہی اڑتا ہوا آنچل اب تک

صاف شفاف آئینہ صحرا
کیا ہے صحرا میں ماسوا صحرا

ہر خطرناک تجربے کے لئے
اک سمندر ہے دوسرا صحرا

نام کو رہ گیا شریک سفر
ادھر آیا ادھر گیا صحرا

کچھ تعلق نہ رکھا دنیا سے
خود میں ایسا سمٹ گیا صحرا

بیچ میں آ گیا سراب ایسا
سامنے پھر نہیں پڑا صحرا

تیرے دیوانے اب کہاں جائیں
ہو رہا ہے ہرا بھرا صحرا

میں نے رکھا قدم تو آخر تک
آگے پیچھے مرے رہا صحرا

بستیاں اپنی اپنی خیر منائیں
اپنی حد میں نہیں رہا صحرا

ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہمیں راہی
ہو گیا خود ہی لاپتا صحرا

ابراہیم اشک

میں جب تنہائی میں ان کا تصور باندھ لیتا ہوں
تو یوں لگتا ہے جیسے سارے منظر باندھ لیتا ہوں

دل بیتاب سے جب بے خودی کی موج اٹھتی ہے
میں اپنی موج میں سارے سمندر باندھ لیتا ہوں

اڑاتا ہوں غضب کی خوشبوئیں سارے زمانے میں
خیال و فکر میں اپنے گلِ تر باندھ لیتا ہوں

سحر ہوتے ہی مجھ کو جستجو ہوتی ہے منزل کی
مری جب آنکھ کھلتی ہے تو بستر باندھ لیتا ہوں

بہت لمبا سفر ہے زندگی میں یہ سرابوں کا
لبوں سے اپنے ان ہونٹوں کے ساغر باندھ لیتا ہوں

مجھے تو عزم و ہمت سے بلندی پر پہنچنا ہے
ضرورت کیا مجھے پر کی کہ میں پر باندھ لیتا ہوں

عجب ہے رنگ میرا شہر جاناں میں مچلنے کا
کبھی زنجیر پاؤں میں کبھی سر باندھ لیتا ہوں

نہ جانے کتنے مہر و ماہ و اختر باندھ لیتا ہوں
سفر کے واسطے جب اپنی چادر باندھ لیتا ہوں

ہنر سیکھا ہے میں نے اشک ایسا معنویت کا
غزل کا شعر کہتا ہوں تو دفتر باندھ لیتا ہوں

ہر قدم پر ہنر میں رہتی ہے
زندگی یہ سفر میں رہتی ہے

ہاں وہ نمرود سے نہیں ڈرتا
آگ جس کے جگر میں رہتی ہے

تم جسے کائنات کہتے ہو
وہ مری رہگزر میں رہتی ہے

جس کو کہتے ہیں سرحد افلاک
وہ مرے بال و پر میں رہتی ہے

جستجو بھی ہزار صدیوں کی
بارہا لمحہ بھر میں رہتی ہے

کسی الجھن ہے یہ محبت کی
جو مرے درد سر میں رہتی ہے

جو بھی کشتی ہے عشق والوں کی
وہ ہمیشہ بھنور میں رہتی ہے

معنویت ہے جس کے شعروں میں
وہ غزل میرے گھر میں رہتی ہے

سنسان راستوں پہ سفر میرا چاہئے
دستِ جنوں کو خون جگر میرا چاہئے

تیرے لب و رخسار کی باتیں ہیں سب بجا
پر کائنات کو بھی ہنر میرا چاہئے

تجھ سے نظر ملا کے اسے کیسے بھول جاؤں
دنیا کو اک انداز نظر میرا چاہئے

وہ لوگ جو کھڑے ہیں کسی کی تلاش میں
ان کے لئے بھی رنج سفر میرا چاہئے

زخموں کو جن کے کوئی بھی مرہم نہیں ملا
ان کے لئے دعا میں اثر میرا چاہئے

اب ظلمتوں کی شب سے گذرتا ہے کارواں
رنگِ سحر کو پہلا گجر میرا چاہئے

وہ دل کہ جن میں کوئی بھی شعلہ نہیں جگا
ان کے لئے بھی رقص شرر میرا چاہئے

آبادیوں میں رہنے کی عادت نہ تھی مجھے
بربادیوں میں کوئی تو گھر میرا چاہئے

راہِ وفا کا دار و رسن تک ہے سلسلہ
اے اشک اس گلی سے گذر میرا چاہئے

ظالم کی ہر اک بات پہ راضی بھی نہیں ہیں
ہم لوگ ستم سہنے کے عادی بھی نہیں ہیں

حق مانگنے نکلے ہیں سر بزم جہاں ہم
انصاف کے دیوانے ہیں باغی بھی نہیں ہیں

تلوار نہیں ہاتھ میں، رکھتے ہیں قلم ہم
اے حرف غلط ہم تیرے حامی بھی نہیں ہیں

ہر روز گزرتے ہیں کسی کرب بلا سے
ہے شکر کہ ہارے کوئی بازی بھی نہیں ہیں

یہ امن تو تلوار پہ ہم نے ہی لکھا ہے
ہم سے تو بڑے امن کے حامی بھی نہیں ہیں

وہ لوگ جو وحشت کی کیا کرتے ہیں باتیں
انسان تو کیا ہیں وہ سماجی بھی نہیں ہیں

اک عمر سے غفلت میں جئے جاتے ہیں لیکن
اس سوچ میں مت رہنا کہ غازی بھی نہیں ہیں

احساس محبت سے ہے پرنور سراپا
پر درد ہیں ہم درد سے خالی بھی نہیں ہیں

اے بزم سخن آ تجھے آباد کریں ہم
نغمے وہ سنائیں جو خیالی بھی نہیں ہیں

کوئی غالب کہ میر کہلایا
عشق ہی کا اسیر کہلایا

بادشاہوں سے جو بڑھا آگے
وہ جہاں میں فقیر کہلایا

جس نے سمجھا ہے درد عالم کا
وہ ہی روشن ضمیر کہلایا

جس نے ٹھکرا دیا امیروں کو
وہ ہی مفلس امیر کہلایا

جس کے سر پر دعائیں ماں کی ہیں
منزلوں کا سفیر کہلایا

وہ جو مذہب سے اٹھ گیا اونچا
سنت وہ ہی کبیر کہلایا

بن کے نادان جو رہا دانا
ساری دنیا کا پیر کہلایا

رہزنوں سے بھی سچ کہا اس نے
اس لئے دستگیر کہلایا

اشک الہام کی صدا ہے جو
شعر وہ بے نظیر کہلایا

تمہارا عشق جو دلدل صفت ہے تھوڑا سا
کہ میرا دل بھی یہ پاگل صفت ہے تھوڑا سا

یونہی خلا میں بھٹکنا پرانی عادت ہے
مزاج اپنا بھی بادل صفت ہے تھوڑا سا

ذرا سا چھو لے کوئی تو مہک مہک جائے
بدن تمہارا یہ صندل صفت ہے تھوڑا سا

ہر ایک لمس میں احساس گدگدانے کا
تمہارا ہاتھ بھی مخمل صفت ہے تھوڑا سا

عجب ہے دیدہ نمناک کا نظارہ بھی
ہر ایک اشک ہی جل تھل صفت ہے تھوڑا سا

لگے جو ٹھیس تو آنکھوں میں پھیل جاتا ہے
یہ درد اپنا بھی کاجل صفت ہے تھوڑا سا

سفر میں دشت کے تسکین دیتا رہتا ہے
ترا خیال بھی چھاگل صفت ہے تھوڑا سا

ان سے ملنے کا ارادہ رکھنا
پر نہ امید زیادہ رکھنا

عشق میں چلتی نہیں، ہشیاری
اپنا انداز بھی سادہ رکھنا

زخم کھاتا ہیں زمانے بھر کے
دل کو ہر وقت کشادہ رکھنا

پیاس ہونٹوں کی بڑھاتے ہیں سراب
لذت درد کا بادہ رکھنا

بادشاہی کا تقاضا ہے یہی
ساتھ اپنے کوئی پیادہ رکھنا

یوں ہی دشمن کئی بن جاتے ہیں
صبر شہرت سے زیادہ رکھنا

عظمت فن کو بچانے کے لئے
اشک جینے کا ارادہ رکھنا

ابراہیم اشک بی۔ 3/302، الانصار ملت نگر، اندھیری

سوہن راہی

ہر برگِ گل پہ ایک چتاؤں کا شہر ہے
کیا داغ داغ رنگیں قباؤں کا شہر ہے
روشن تھا جس کے نور سے ایک حسن کائنات
جو جل بجھا وہ میری وفاؤں کا شہر ہے
شاخوں پہ سبز رنگ کے گہنے بھی کیا کریں
اپنے چمن کی حد میں خزاؤں کا شہر ہے
اک بے رخی نے پی لئے نغموں کے قافلے
اب خامشی کی زد میں صداؤں کا شہر ہے
کیا ذکر اشک و آہ کے موسم کا ہم کریں
پانی کی تہہ میں ایک ہواؤں کا شہر ہے
کیا آدمی؟ کیا آدمی کی ذات ہے یہاں
لندن میرا انا کے خداؤں کا شہر ہے

بھوکی ننگی تہذیبیں جب ہاتھ اٹھا کر گاتی ہیں
صدیوں سے روشن چہروں پر کالک سی مل جاتی ہیں
اتنے آنسو، اتنی آنکھیں، کون کسی کو آنچل دے
چپکے چپکے خود ہی رو کر اپنے کو سمجھاتی ہیں
سر سے لے کر پانوں تلک خاموش ہیں ساری تصویریں
غور سے دیکھو! یہ تصویریں بجلی بھی لہراتی ہیں
پہراوں میں تن من نا ہیں، پہراوے پہراوے ہیں
ان پہراوں میں تو زندہ لاشیں ہی بل کھاتی ہیں
اک چندا آکاش میں ابھرے سو سو تارے ٹوٹتے ہیں
جب جیون دکھیاری یادیں روم روم دہکاتی ہیں

جینے کا احساس ہے میری آنکھوں میں
خوابوں کا بن باس ہے میری آنکھوں میں
وہ آنکھیں جو مجھ کو مجھ میں ڈھونڈتی ہیں
ان آنکھوں کی پیاس ہے میری آنکھوں میں
دیکھو! پاگل پت جھڑ پھر سے چیخ اٹھا
تیرا تن مدھو ماس ہے میری آنکھوں میں
بس دن انسوون جال سا بنتی رہتی ہیں
شاید ستلج پیاس ہے میری آنکھوں میں
تم نے کیسے جان لیا میں بھول گیا
رشتوں نے کیسے جان لیا میں بھول گیا
موسم موسم جیون جن سے ناچ اٹھیں
ان کلیوں کی باس ہے میری آنکھوں میں
کچھ پل بندیا ماتھے پر تو رہنے دو
پل دو پل ہی سواس ہے میری آنکھوں میں

پیت رنگ کو انگ باندھ کے پروانے جل جاتے ہیں
روپ خزاں کے شیش محل کو تانڈو ناچ نچاتے ہیں
زخموں کے تارے اگتے ہیں نت نظروں کے بولوں سے
مورکھ لوگ مرے ہونٹوں پہ جھوٹے جال بچھاتے ہیں
اس دھرتی کے پت جھڑ، ساون، ایک برابر ایک سمان
نت بجلی پائل چھنکائے، نت بادل لہراتے ہیں
شاید اجلے موسم کی تہذیب ابھرنے والی ہے
پنچھیوں کے سُر، سوئے سورج تڑکے آن جگاتے ہیں
میری مٹی دور اجالوں کے مندر میں روتی ہے
میری کایا کے بوڑھے سائے من کو تڑپاتے ہیں
راہی کی راہوں میں کانٹے بونے والے کیا جانیں
راہی ان کانٹوں کے کارن ہی سب پھول کھلاتے ہیں

میں اک ایسا جگنو ہوں یا ویراں گھر کا ایک دیا
جس نے اپنا خون جلایا جس نے اپنا خون پیا
خوابوں میں شعلے برسائے، چلتی پھرتی ایک چتا
دن کے صحرا پی جاتے ہیں، آنکھوں سے گھنگھور گھٹا
جس دن پریم کلا کا جوبن کی وادی سے گیت سنا
اس سے اگلے روز تھا ہم نے شعلوں کا اک جال بنا
نغموں کا دربار سہانا، گیتوں کا اک برندابن
تیری میٹھی میٹھی مسکانوں نے ہم کو آج دیا
مستی مہکیں، اگنی، چندن، مدھ ماتی، غزلیں، سنگیت
تیرے تن کی ہریالی محرابوں میں کیا کیا نہ ملا
ہم نے مٹی کے بدلے ہی صوت کے ہیرے بیچے ہیں
لیکن جگ والوں نے ہم سے بات بات کا مول لیا

مختار شمیم

ہمیں بھی یاد ہے صاحب! ہمارا بھی زمانا تھا
وہی لیلیٰ دوانی تھی، وہی مجنوں دوانا تھا
سیاحت ان کے پیروں میں، مسافت اپنے کاندھوں پر
کسی کو لطف سامانی، کسی کو بوجھ اٹھانا تھا
بڑی نخوت سے پالا تھا ہری شاخوں نے کلیوں کو
انھیں خوشبو کہاں لے جائے گی یہ کس نے جانا تھا
کبھی تم سیر کو آتے تو عقدہ کھلتا جانِ من!
کھلے تھے باغ میں گل یا ہوا کا تازیانہ تھا
جو سچا شعر تھا سو رنگ میں وہ آپ نکھرا ہے
غزل کی چاندنی میں فکر کی کیا خاک اڑانا تھا
نہیں معلوم جاناں! زندگی کی اس کشاکش میں
تجھے کب یاد آنا تھا، مجھے کب بھول جانا تھا
وہ جادوگر پرانا ہے اسے اردو سے کیا مطلب
اسے تو ڈگڈگی کی تال پر محفل جمانا تھا
یہی کچھ تھا ہماری عشق پرور داستانوں میں
کہ بس کردار تھے جاں باز گو قصہ پرانا تھا
وہ آئینے کہ جن پر گرد ہے گزرے زمانے کی
انھیں آئینوں میں مختار کوئی عکس پانا تھا

پھول زخموں کے کھلے ہیں، دل سا ویرانہ بھی ہے
وحشتِ جاں نے سجایا اپنا کا شانہ بھی ہے
جیسے دل میں ایک سناٹا صدا دیتا ہوا
جیسے میرے گھر میں اک آباد ویرانہ بھی ہے
آئینہ خانہ میں ہم کیا کیا سنورتا دیکھتے
ہجر کی زلفِ دراز اور یاد کو شانہ بھی ہے
رونق بازارِ جاں دل ہے کہ شہرِ بے طلب!
آشنا خود سے ہوا تو خود سے بے گانہ بھی ہے
دیکھیے! اپنے دریچوں کو کھلا رکھیے ذرا
آپ کی بستی میں صاحب! ایک دیوانہ بھی ہے

شورشِ غم نئی تصویر دکھاتی ہے ہمیں
دشت میں آبلہ پائی کو بلاتی ہے ہمیں
پھر وہی رقصِ جنوں ہے، وہی زنجیر کی لے
جیسے پازیب کی جھنکار بلاتی ہے ہمیں
پھر اسی سمت سے مہکی ہوئی آتی ہے ہوا
پھر وہ پردیس میں گھر یاد دلاتی ہے ہمیں
دشتِ تنہائی میں اک عمر گزاری ہے شمیم
اس کی محفل ہی سہی راس کب آتی ہے ہمیں

گھر میں وحشت تھی کہیں اور ٹھکانہ نہ ہوا
صحن گھر کا ہوا حق میں مرے صحرا نہ ہوا
چاند کے سینے میں روشن تو ہوا داغ الم
شب ہجراں کے مقدر میں اُجالا نہ ہوا
بجھ گیا چاند کہیں اور کہیں تارہ ٹوٹا
تیرہ بختی کا کوئی اور تقاضا نہ ہوا
یوں تو ہر سر پہ تھی دستارِ فضیلت لیکن
اک مری بے خبری کا ہی مداوا نہ ہوا*
یوں بھی صیقل ہوا اعجازِ سخن سے جوہر
اور آئینہ ادراک بھی دھندلا نہ ہوا
خوب اے وضعِ حیات! اس میں کوئی رمز حیات
میں نے چاہا جو کیا گرچہ جو سوچا نہ ہوا
کس کے گھر جاتے کہ تنہائی کا رونا روتے
کوئی مختار شمیم آپ سا تنہا نہ ہوا

* خلیل الرحمن اعظمی کے شعری مجموعہ میں ایک شعر اسی موضوع پر ہے۔ یہ ایک اتفاق ہے۔ تو اردو کے لئے ادب نوازوں سے معذرت! (م ش)

مہدی پرتاپ گڑھی

ہوگئی ہے جو معدوم سی اس روایت کا آثار میں
زندگی تری مثبت سی اقدار کا ہوں طرفدار میں

آج بیمار ذہنیں کار دہشت گری میں ملوث ہوئیں
لاکھ ہوں خیر خواہ وطن پھر بھی ان کی نظر میں گنہ گار میں

ساری بستی اندھیرے کی آغوش میں سو چکی ہے مگر
اپنے روشن خیالوں کو کرتا ہوا مجتمع ایک بیدار میں

اس طرف صالح قدروں کا ہے اک نمائندہ وہ
دوسری سمت اندھی قدامت پرستی سے بیزار میں

لے رہا ہوں قلم سے ہیں تیشے کا کار نمایاں ابھی
کر رہا ہوں دلوں کی کثافت کے ٹیلوں کو ہموار میں

جیب خالی سہی، لب پہ لفظوں کی موتی تو ہیں
اہلِ دل کے لئے مغتنم اور عوامی نگاہوں میں نادار میں

اس کا اعمال حسنہ پہ تکیہ ہے جنت کا طالب ہے وہ
خوف و امید اللہ سے ہے مجھے ایک ایسا گنہگار میں

یہ وراثت جو پرکھوں کی ہے، جانثاری، وطن دوستی
ان چراغوں کو دوں گا لہو، بن کے ان کا نگہ بہ دار میں

مدتوں سے دبے کچلے انسان کو وقت نے اب نوازا تو ہے
کرتی قسمت اگر یاوری بنتا ان کا مددگار میں

تنگ ہے آج مجھ پر جہاں، جس کی وسعت پہ نازاں رہا
مہدی آغا مجھے دیکھ تو لے کے شانوں پہ نکلا ہوں گھربار میں

وہ جو ہے تیشہ بدست اس آدمی کو دیکھئے
پتھروں میں سانس لیتی شاعری کو دیکھئے

دشمنی کے اس طرف انسانیت ہے نغمہ زن
مسکراتی کھلکھلاتی زندگی کو دیکھئے

اک طرف مخمل کے بستر پر ہے ناآسودہ زیست
اک طرف پتھر پہ سوتے آدمی کو دیکھئے

روکھی سوکھی کھا کے بھی آسودہ ہیں مسرور بھی
میرے ان نادار بچوں کی ہنسی کو دیکھئے

بنا ماضی ہو چکا تاریخ کے صفحوں میں گم
اب باہیں حسرت اترتی دھوپ ہی کو دیکھئے

خود تو پیاسا ہے مگر اکرام ہے اس کو عزیز
غیر پہلے پی لے اس دریا دلی کو دیکھئے

آگیا پردیش سے بیٹا تو ماں ہے مطمئن
اس کے چہرے پر اگی آسودگی کو دیکھئے

پڑھتا رہتا ہے وہ مستقبل کا چہرہ روز و شب
آیئے اس شخص کی دیدہ وری کو دیکھئے

کل جو گذری تھی سو گذری دیکھئے اب اس کا حال
جاگی جاگی چہرے پر آسودگی کو دیکھئے

جس سے تھی امید دلداری کی مہدی اس کی آج
بالا دستی دیکھئے اور کج روی کو دیکھئے

میرے ذہن پر خونِ تمنا نے کچھ نقش بنائے تو
لیکن ان مبہم شکلوں کو دل ہی سمجھ نہ پائے تو

بنجر دھرتی پر کاوش کے بیج تو ہم نے بوئے ہیں
ریت کے بطن سے کوئی انکر سری اٹھا نہ پائے تو

دیدۂ شوق پہ قدغن لگنا ایسا کچھ آسان نہیں
بے پردہ وہ حسنِ مجسم بزم میں جب آجائے تو

دعوتِ نظارہ دیتا ملبوس میں بھی وہ چاند بدن
ہوش ہی بجلی گر جائے، دل بے قابو ہو جائے تو

ہر جذبے کو تخن کریں، یہ عزم تو دل میں رکھتے ہیں
نکتہ چینوں کی محفل میں لفظ ہی ہاتھ نہ آئے تو

ہر و غریب کے آگے ہے کس کو تاب تخن وری
لیکن اس گلفام کی چاہت پر لمحہ کی جائے تو

کل پازیب کی جھنکاروں پر سلطنتیں قربان ہوئیں
آج شراب و شباب ہم کو پھر وہ راہ دکھائے تو

راہِ سحارت ناکامی کی تاریکی نے کی حدود
کوئی آس کا جگنو آئے ہم کو راہ دکھائے تو

دیش کے منظر نامے پر کچھ نئے دستخط ہیں مطلوب
ذہنی بیداری کا مہدی پرچم کوئی اٹھائے تو

28، اسکول وارڈ، پرتاپ گڑھ، یوپی۔ 230001

عزیز احمد عزیز

شکستہ دل بھی نہیں ہوں شکستہ پا بھی نہیں
مرے حساب میں باقی کوئی سزا بھی نہیں
جو غم ملا اسے رکھا سنبھال کر میں نے
اجیر غم کے لئے اور کچھ روا بھی نہیں
کسے غرض ہے کہ میں کون ہوں، طلب کیا ہے
کسی کے سامنے دستِ طلب کھلا بھی نہیں
یہ کون ہے جو مجھے داغ داغ کرتا ہے
ہے کس کی صورتِ گل پوش، جانتا بھی نہیں
اگر خفا ہے چلیں بات کرکے دیکھتے ہیں
ہے میرا اپنا ہی ہمزاد، ماورا بھی نہیں
کوئی خلوص سے آکر ملے سر آنکھوں پر
اگر نہ آئے تو اس کا کوئی گلا بھی نہیں
جو بات بن نہ رہی ہو، وہی ہے کام کی بات
اگر وہ بن نہ سکے زیست کا مزا بھی نہیں

شمعِ بزم عوام ہوجاتے
رابطِ خاص و عام ہوجاتے
اس پہ اٹکے رہے کہ تو کیا ہے
سارے شکوے تمام ہوجاتے
تم نے سمجھا نہیں اشارے کو
ہم تمہارے غلام ہوجاتے
شیخ گذرے نہیں ادھر سے ابھی
سارے مباح حرام ہوجاتے
مقتدی بن سکے نہ صدیوں بھی
ان کو ضد ہے امام ہوجاتے
رام کا نام دامنِ راون میں
کیوں نہ یوں بے مرام ہوجاتے
تولتے گر نیت کو سکوں میں
شیخ عالی مقام ہوجاتے
خون ریزی کی کیا ضرورت تھی
خون سوزی سے کام ہوجاتے
روشنی کو سلام کرلیتے
دل اندھیروں کے رام ہوجاتے
بھول جاتے معاف کردیتے
زیرِ لب ہم کلام ہوجاتے
آپ بھی پیش رفت کرلیتے
کچھ ہمارے بھی کام ہوجاتے
رک گئے راہ میں ابھی چلتے
محوِ رقصِ خرام ہوجاتے
فیض وہ ہے رہے جو صدیوں تک
ارضِ معنی دوام ہوجاتے

اکیسویں صدی کی غزل

ظلمتِ شب سے روشنی میں چلیں
صبحِ نورس کی تازگی میں چلیں
مرحلہ سخت ہے، مذاق نہیں
سوچ لیں کیوں روا روی میں چلیں
قتلِ ناحق کا خوں بہا نہ سہی
سر بکف خون کی ندی میں چلیں
بے خطر ہاتھ میں چراغ لئے
کیوں نہ ظلماتِ خسروی میں چلیں
عشق والوں کی حسرتوں کا خراج
سر پہ رکھ کر اسی گلی میں چلیں
بھر کے دامن میں سرخ سرخ گلاب
اک نئے کوئے عاشقی میں چلیں
نغمۂ و رقص بن کے اڑ جائیں
پھر کسی بزمِ اُردوی میں چلیں
اختراعاتِ نو بہ نو کے لئے
علم و دانش کی رہبری میں چلیں
عفو و انصاف ہوں نہ صرف نظر
دائماً امن و آشتی میں چلیں
دھوپ میں جل رہے ہیں سبزۂ و گل
ماہ و انجم کی پیروی میں چلیں
چھوڑ کر تنگیٔ محیطِ زمیں
وسعتِ جوزا وجدی میں چلیں
ہاتھ میں ہاتھ جانِ جاں کا لے
پھر اسی باغِ سرمدی میں چلیں
بھول کر بیسویں صدی کی غزل
چلئے اکیسویں صدی میں چلیں

ارمان نجمی

خزاں آلود کو گل زار لکھنا
نہ آیا حرفِ گو ہر بار لکھنا

ہر اک جانب وہی دشتِ کشادہ
تو کیسے سایۂ اشجار لکھنا

کہا جاتا ہے اس کو حسنِ اظہار
جو ڈوبے ہوں انہیں اس پار لکھنا

یہاں کی یہ روایت ہے پرانی
جو سوئے ہیں انہیں بیدار لکھنا

اگر پیاری نہیں ہے اپنی گردن
تو پھر تلوار کو تلوار لکھنا

سلیقہ چاہیے سچ بولنے کو
عیاں کو بھی پسِ دیوار لکھنا

گھروں کی تیرگی کو بھول جانا
اجالوں سے بھرے بازار لکھنا

تمہیں جو زندۂ جاوید کر دے
کوئی ایسا بھی اک شہکار لکھنا

نہ دینا آمدِ طوفاں کا مژدہ
فضا میں حبس کے آثار لکھنا

نہ کہنا اپنی خوں ریزی کا قصہ
زمیں کو دور تک گل نار لکھنا

فضائے جبر کی ہے یہ علامت
ہوا کو در پئے آزار لکھنا

سخن کو مختصر کرنا بھی فن ہے
بیاں کا عیب ہے طومار لکھنا

گزر جائیں جہاں الفاظ سر سے
وہاں لکھنا ہے کچھ بے کار لکھنا

سبھی کچھ لکھ کے حرفِ آخری میں
وہی ہے حسرتِ اظہار لکھنا

بھروسا کچھ نہیں ارماں کا اب تو
اسے گرتی ہوئی دیوار لکھنا

ورق پہ رنگوں کی تعمیر کرنے والا ہوں
ترے خیال کو تصویر کرنے والا ہوں

محبتوں کو عناں گیر کرنے والا ہوں
یہ جان و دل تری جاگیر کرنے والا ہوں

لگے وہ زخم تری روح پر جو بھر نہ سکے
میں اپنے جذبوں کو شمشیر کرنے والا ہوں

یہ ابر و باد کا موسم یہ تیری ہم سفری
گزرتے وقت کو زنجیر کرنے والا ہوں

یہ ہاتھ رہنے دے کچھ دیر میرے ہاتھوں میں
میں اپنے درد کی تفسیر کرنے والا ہوں

حقیقتوں کو فسانوں کا رنگ دوں کیسے
سیہ سفید پہ تحریر کرنے والا ہوں

بسا ہے جو مری آنکھوں میں اس کو دیکھ تو لے
میں اپنے خوابوں کی تشہیر کرنے والا ہوں

خالد رحیم

شب کے سینے پہ مجھے ہنر لگتا ہے
چاند رستا ہوا اک زخمِ جگر لگتا ہے
چاندنی ہے کہ دھواں دھار اجالا کوئی
سوچتا ہوں تو سلگتا ہوا گھر لگتا ہے
اپنے کمرے میں کوئی بالب جلاؤں کیسے
اپنی پرچھائیں سے ملتا ہوں تو ڈر لگتا ہے
کھل رہے ہیں تری یادوں کے شگوفے لیکن
جانے کیوں آج بھی ویران سا گھر لگتا ہے
صرف خوابوں کے سہارے میں کہاں تک جاؤں
تم چلے آؤ کہ بے رنگ سفر لگتا ہے
لوگ کہتے ہیں کہ یہ شہر میرا خالد
مجھ کو گلیوں سے گزرتے ہوئے ڈر لگتا ہے

میں سایہ بن کے زمیں پر گرا ہوں برسوں سے
یہ سر پہ دھوپ اٹھائے کھڑا ہوں برسوں سے
میں اپنی کھوج میں پھرتا رہا ہوں برسوں سے
مگر، میں خود سے کہاں مل سکا ہوں برسوں سے
کھنگالتا ہوں شب و روز اپنے ہی اوراق
میں اپنی ذات میں الجھا ہوا ہوں برسوں سے
یہ کس خیال نے مجھ کو سمیٹ رکھا ہے
یہ رات دن، یہ کیسے سوچتا ہوں برسوں سے
کوئی بھی چہرا سجتا نہیں ہے اب مجھ میں
اک آئینہ ہوں کہ ٹوٹا پڑا ہوں برسوں سے
جسے بجھا نہ سکا بارشوں کا موسم بھی
اک ایسی آگ میں جلتا رہا ہوں برسوں سے
نہ جانے کون سی منزل مرا ٹھکانہ ہو
رہِ حیات میں چلتا رہا ہوں برسوں سے
مجھے منانے کی کوشش ہے رائیگاں خالد
میں اپنے آپ سے روٹھا ہوا ہوں برسوں سے

ہر اک منظر سہانا لگ رہا ہے
ہمارا دل دیوانہ لگ رہا ہے
کسی کے واسطے آنسو بہانا
کوئی قصہ پرانا لگ رہا ہے
خوشی رخصت ہوئی اب شہرِ دل سے
غموں کا شامیانہ لگ رہا ہے
اٹھا رکھے ہیں لوگوں نے جو پتھر
ہمارا سر نشانہ لگ رہا ہے
مروت کی فصلیں ڈھ چکی ہیں
جو اپنا ہے بیگانہ لگ رہا ہے
بدلتی جا رہی ہے رنگ جدت
نیا جو تھا پرانا لگ رہا ہے
کہانی تم نے جو اپنی کہی تھی
وہی میرا فسانہ لگ رہا ہے
کسی کا نام کیوں لاؤں زباں پر
مرا دشمن زمانہ لگ رہا ہے
تمہارے شہر سے میرا بھی خالد
اٹھا ہے آب و دانہ لگ رہا ہے

خالد رحیم، خانساماں لین، منی ساہو چک، بخشی بازار، کٹک۔ 753001 اڑیسہ

پی پی سریواستو رند

وہ جو سرپھری سی ہوائیں تھیں کئی راستوں سے گزر گئیں
نئے موسموں کی صدائیں تھیں نئی منزلوں سے گزر گئیں
لہو چاٹتی ہوئی ساعتیں تو ساعتوں سے الگ رہیں
وہ جو زخم اوڑھے قبائیں تھیں کئی حادثوں سے گزر گئیں
وہی سوندھی سوندھی سی خوشبوئیں وہی سردرات کی مستیاں
وہ جو جان لیوا ادائیں تھیں کئی مرحلوں سے گزر گئیں
جو لہولہان تھیں دھڑکنیں وہ اذیتوں کا نصیب تھیں
وہ جو آنسوؤں کی گھٹائیں تھیں کئی قہقہوں سے گزر گئیں
وہی شہر تھا وہی لوگ تھے وہی کھیل تھے وہی راستے
وہ جو فتنہ ساز فضائیں تھیں، وہ کئی گھروں سے گزر گئیں
کئی بستیوں نے جنم لیا، جو فصیلِ شہر کو توڑ کر
وہ جو مقبروں کی ہوائیں تھیں وہی مقبروں سے گزر گئیں
میرے دل پہ آج بھی نقش ہیں، وہی بچپنے کی کہانیاں
وہ جو جھوٹی سچی کتھائیں تھیں کئی حاشیوں سے گزر گئیں
کبھی چاند شرم سے چھپ گیا کبھی رند اس میں گہن لگا
وہ جو اجلی اجلی شعائیں تھیں کئی زلزلوں سے گزر گئیں

میں اپنے آپ سے بیزار ہوں بچاؤ مجھے
پڑھا ہوا کوئی اخبار ہوں جلاؤ مجھے
میں بھیڑ کا انسان اجنبی مخلوق
آجاؤ شہر کا تہوار ہوں مناؤ مجھے
عجیب وقت سے اپنے ہی گھر کے آنگن میں
میں خشک پیڑ ہوں بیکار ہوں جلاؤ مجھے
برہنہ تلخ حقیقت سے آشنا ہو جاؤ
میں ایک ریت کی دیوار ہوں، گراؤ مجھے
روایتوں کا مقدر ہوں یا سماج کا زخم
اجڑتی شام کا بازار ہوں، اٹھاؤ مجھے
عجیب کرب سے، زخمی پڑی ہے تنہائی
میں ایک لمحہ بیکار ہوں بچاؤ مجھے
مذاقِ تیرہ شبی کی نئی علامت ہوں
کہ روشنی کا طلب گار ہوں، بتاؤ مجھے
پہاڑیوں سے پھسلتا ہوا آبشار ہوں رند
ندی کی ملتی ہوئی دھار ہوں، بہاؤ مجھے

مناظر عاشق ہرگانوی

میں نے کھائی ہے بہت گردشِ حالات کی چوٹ
دن ہی بتلائے گا کچھ ہوتی ہے کیا رات کی چوٹ
گاہے آتی ہے خوشی موجِ صبا کی صورت
اور رہ جاتی ہے صدیوں کبھی لمحات کی چوٹ
کتنے شہہ زور کو کمزور بنا دیتی ہے
دل میں اک حشر جگاتے ہوئے جذبات کی چوٹ
رات دن جن کا رہا رنج والم سے رشتہ
وہ بتا سکتے ہیں کیا ہوتی ہے نغمات کی چوٹ
ایسے دشمن سے تو دشمن کا بھی پالا نہ پڑے
ہونے دیتی نہیں جاں بر کبھی صدمات کی چوٹ
اہلِ غیرت کے لئے موت سے کچھ کم بھی نہیں
ایک کم ظرف کی بھیجی ہوئی سوغات کی چوٹ
اچھے ہوتے نہیں بیمار مناظر جن کو
چشمِ مظلوم سے پہنچی ہو جو برسات کی چوٹ

مناظر عاشق ہرگانوی

زندگی بن گئی اب بارِگراں کی صورت
ناتواں دوش پہ ہے لاش جواں کی صورت
چل کے صحرا ہی میں ڈھونڈیں بھی کوئی جائے پناہ
اب تو گلشن میں نہیں کوئی اماں کی صورت
بچ کے جائیں گے کہاں شہر سے عیاروں کے
جس طرف دیکھیں وہ ہے دامِ نہاں کی صورت
رہبر و راہ محبت ہی کو کام آئیں گے
نقش پیچھے میں نے وہ چھوڑے ہیں نشاں کی صورت
زندگی ہوتی ہے دشوار کسی کی اس دم
دل کا ہر ایک یقیں جب ہو گماں کی صورت
کھاتے آئے ہیں سبھی اہلِ محبت یہ فریب
جانِ جاں بھی ہے لگے دشمن جاں کی صورت
دل میں کچھ ایسی بھی باتیں ہیں مناظر اپنے
جن کو حاصل بھی نہیں کوئی بیاں کی صورت

ہر موسم میں پھول کھلانے والا میں
پھولوں سے آنگن مہکانے والا میں
رات ڈھلے تک مست، اکیلا، آوارہ
گلی گلی اکثر چکرانے والا میں
آنکھیں جس کو ڈھونڈیں پردے کے پیچھے
منظر منظر چھپ کر آنے والا میں
اپنے پر بھی تو دل کھول کے ہنستا ہوں
کبھی کسی پہ سب کو ہنسانے والا میں
دوں نہ تری آواز پہ دھیان تو غم مت کر
اپنی صدا پہ چونک سا جانے والا میں

اشہر ہاشمی

آتی جاتی ریل دیکھتا رہا
دوریوں کے کھیل دیکھتا رہا
جھاگ ہو رہا تھا ریت میں فنا
اک عجیب میل دیکھتا رہا
زد میں آ کے اڑ گئے طیور سب
میں لئے غلیل دیکھتا رہا
تھی بلند کس قدر فصیلِ شب
گھوم پھر کے جیل دیکھتا رہا
نام و در پہ جھومتی تھی کس طرح
دیکھی جو وہ بیل دیکھتا رہا
کھیل اپنی ساری ہار جیت کا
درد کے طفیل دیکھتا رہا

عقیل شاداب

کبھی قرآن ہوتا ہے کبھی انجیل ہوتا ہے
خدا سے لے کے بندے تک یوں ہی ترسیل ہوتا ہے

ہمارے ذہن پر تو راستوں کا سحر طاری ہے
ہمیں منزل نہیں ہوتا ہے سنگِ مل ہوتا ہے

برسنا ہے یہ بادل ایک دن اپنے ہی دریا پر
یہ ذرہ صحرا ہوتا ہے یہ قطرہ جھیل ہوتا ہے

یہی بنیاد ہے میری یہی معراج ہے میری
الگ تصویر سے ہوکر مجھے اک کیل ہوتا ہے

رگڑنا ہے مجھے بھی ایڑیاں صحرائے ہستی میں
مری قسمت میں بھی اک روز اسماعیل ہونا ہے

یہ راہ عشق ہے اس میں کوئی منزل نہیں ہوتی
یہاں جو کچھ بھی ہوتا ہے بنا تاویل ہوتا ہے

مفصل کچھ نہیں ہوتا غزل کی بارگاہوں میں
اشاروں اور کنایوں میں ہی سب تحلیل ہوتا ہے

ہم ایسے ہیں ہم ایسے ہی رہیں گے آخری دم تک
وہ اپنا راستہ پکڑے جسے تبدیل ہونا ہے

مجھے معلوم کیا اتریں گی کیسے آیتیں مجھ پر
کسے اللہ ہوتا ہے کسے جبریل ہوتا ہے

غزل شاداب بیٹھی ہے حویلی کی بلندی پر
نہ ایسی مٹی ہوتا ہے نہ ایسی چیل ہوتا ہے

کون وحشت گرد ہے
مرد یا نامرد ہے

خوف ہے ہر اک طرف
چہرہ چہرہ زرد ہے

گرم ہے اس کا مزاج
اور رویہ سرد ہے

بخت ہے اپنے خلاف
وقت ہی بے درد ہے

راستہ ہے پر خطر
اور منزل گرد ہے

فکر رسا شاداب کیوں
آورد ہی آورد ہے

ہر طرف شور دعا کا کیسا
حادثے نے ہمیں تاکا کیسا

بیچ رستے میں یہ ٹھوکر کیسی
بہتے پانی میں چھپا کا کیسا

لٹ گئی زیست کی پونجی کیسے
پڑ گیا ہم پہ یہ ڈاکا کیسا

آنکھ میں کیسی یہ بجلی کی لپک
اور کانوں میں چھنا کا کیا

کیسے نکلیں گے یہاں سے شاداب
سامنے سوئی کا ناکا کیسا

کیا فصاحت ہے کیا بلاغت ہے
کتنی پختہ مری امارت ہے

زندگی کیا ہے کچھ نہیں معلوم
سانس لینا تو میری عادت ہے

وہ ہی منکر ہیں میری بیعت سے
جن پہ لاگو مری شریعت ہے

اہل دانش سے پوچھ کر دیکھو
کتنی پر معنی میری لکنت ہے

سانس لینا محال ہے مجھ کو
میری دشمن یہ میری شہرت ہے

ہوتا ہے ہر نفس مجھے الہام
شاعری ہی مری نبوت ہے

ہیں وہی میری جان کے دشمن
فرض جن پر مری امامت ہے

میں مہاجر ہوں بے اماں میری
کوئی ہجری نہ کوئی سمت ہے

ماں کے قدموں سے ہوں لگا بیٹھا
یہی جنت یہی عبادت ہے

شعر ہوتے ہیں صرف اچھے برے
کیا روایت ہے اور کیا جدت ہے

روز ہوتی ہے کب غزل شاداب
شعر گوئی کی کس کو فرصت ہے

درد چاپدانوی

صف ادیب سے کیا رشتہ ادیب نما
کہ عندلیب نہیں ہوتا عندلیب نما
یہ کون جانے مجھے کیسے دن دکھائیں گی
لکیریں جو مرے ہاتھوں میں ہیں نصیب نما
یہ ختم کیسے کرے گا کسی کی گمراہی
خطیب وقت ہے اے دوستو خطیب نما
خدا ہی جانے کہ میرا مآل کیا ہوگا
مری حیات کا ہر موڑ ہے صلیب نما
نہ ٹوٹ جائے کہیں اس سے دوستی کا بھرم
امین جذبۂ اخلاص ہے رقیب نما
خودی نے رکھ لیا پردہ مری غریبی کا
غریب ہوتے ہوئے بھی نہیں غریب نما
کرے نشان دہی کون ایسے قاتل کی
ہر ایک حال میں لگتا ہے جو طبیب نما
قضائے درد مجھے راس آگئی اے درد
ہر ایک غم نظر آیا غمِ حبیب نما

وطن کا کیسا قصیدہ سخن سخن میں ہے
اداس طائر جاں بھی بدن بدن میں ہے
یہ کس مقام پہ لے آئی زندگی مجھ کو
گرفتہ سانسوں کا موسم تھکن تھکن میں ہے
یہ اور بات کہ اٹھنے سے ہے قدم قاصر
دگر نہ مژدۂ منزل پون پون میں ہے
عجب نہیں کہ یہ ہوں قتل گاہ کی لاشیں
یہ کیا کہ خون کی سرخی کفن کفن میں ہے
یہ کس کے نام کبوتر پیام لایا ہے
بہشت امن کی خوشبو پون پون میں ہے
ہے جس کا نور مہ و مہر و کہکشاں سے عیاں
اسی کے جلوے کا پرتو کرن کرن میں ہے
گلوں کی بزم ہے یا جلوہ زار خندہ لبی
ہمارے زخموں کا عالم چمن چمن میں ہے
اشارہ میری تباہی کا جیسے پوشیدہ
تری جبیں کی غم افزا شکن شکن میں ہے

غصہ اپنا تھوک دے پیارے خون جلے کیوں غصے میں
ہنس ہنس کر بھی بات کریں کچھ وقت ڈھلے کیوں غصے میں
پاس تعلق ناممکن تھا ملتے گلے کیوں غصے میں
ان سے کوئی یہ بات تو پوچھے آپ جلے کیوں غصے میں
قدر وفا کی کچھ بھی نہ سمجھے یہ بھی کوئی بات ہوئی
چھوڑ کے یہ منظر بھی آخر آپ چلے کیوں غصے میں
بربادی پر بہنے والے آنکھوں سے آنسو پونچھ دیے
دیکھ کے یہ منظر بھی آخر آپ ڈھلے کیوں غصے میں
ان سے میرا کیسا رشتہ کیسا ناطہ کیسا لگاؤ
کیوں ہو پشیماں اپنے کئے پر ہاتھ ملے کیوں غصے میں
ساقی سے تقسیم مئے پر کیا کوئی تکرار ہوئی
میخانے سے میکش نکلے رات ڈھلے کیوں غصے میں
خوش فہمی اور امیدوں کی شمعیں روشن مت کرنا
ناکامی کا دیکھ کے منظر زیست ڈھلے کیوں غصے میں
درد اگر احساس ہے تم کو اہل چمن سے یہ پوچھو
غنچہ و گل کو روند رہے ہو پاؤں تلے کیوں غصے میں

احتشام اختر

لبوں پر سرخیاں تھیں اب کہاں ہیں
ہری سب کھیتیاں تھیں اب کہاں ہیں
یہاں اک باغ تھا کچھ روز پہلے
حسیں کچھ تتلیاں تھیں اب کہاں ہیں
کنارے پر گھروندے ریت کے تھے
ندی تھی کشتیاں تھیں اب کہاں ہیں
بلا کا شور ہے اب گھر میں میرے
کبھی خاموشیاں تھیں اب کہاں ہیں
چچا کے گھر میں رونق تو بہت تھی
بہو تھی بیٹیاں تھیں اب کہاں ہیں
خزانہ تھا کبھی دریا میں اختر
گہر تھے سیپیاں تھیں اب کہاں ہیں

پیار کی وہ زندگی اچھی لگی
ساتھ اس کے ہر گھڑی اچھی لگی
رہگذر ویران تھی اس کے بغیر
ہم سفر سے راہ بھی اچھی لگی
آدمی تو وہ نہیں اچھا مگر
مجھ کو اس کی شاعری اچھی لگی
راہ کی ویران وادی میں مجھے
ایک پیاری سی ندی اچھی لگی
ساتھ چلتی بھیڑ کے اس شور میں
مجھ کو اپنی خامشی اچھی لگی
میں پھسل کر گر گیا تو راہ میں
چھوٹے بچوں کی ہنسی اچھی لگی
آگئے پنچھی کبھی اک پیڑ پر
مجھ کو ان کی واپسی اچھی لگی

احسن امام احسن

خیال وہ بھی مرے ذہن کا مکان میں تھا
جو آج تک نہ کسی آدمی کے دھیان میں تھا
نگاہ اٹھتی تھی اس کی بس آسماں کی طرف
'چھپا ہوا وہ پرندہ جو سائبان میں تھا'
میں اپنے آپ کو کیسے بچاتا سورج سے
صدا کی شکل میں چپ خود میں آسمان میں تھا
خود اپنے آپ سے اک دن کرے گا سمجھوتہ
یہ خطرہ پہلے سے ہر شخص کے گمان میں تھا
ترے سوال کا کیسے جواب دیتا میں
کہ جب میں کھویا ہوا فکر کی اڑان میں تھا
وہی تو آگ لگاتا پھرا گلستاں میں
جو احسن اہلِ چمن میں نہ باغباں میں تھا

ساتھ کچھ اس طرح چلا سورج
مجھ کو رستہ دکھا گیا سورج
صبح ہوتے ہی روشنی لے کر
میرے آنگن میں آگیا سورج
تازگی روشنی ہمیں دے کر
صبح سے شام تک جلا سورج
اس کے تیور، تھے شعلہ بار بہت
دشت میں مجھ سے جب ملا سورج
رات کی بھینی بھینی خوشبو میں
دفعتاً یاد آگیا سورج
بات کیا ہے کہ سرد موسم میں
احسن اکثر ستا گیا سورج

سید شکیل دسنوی

مابعد قیامت کی ایک غزل

شکستہ خواب کی پرچھائیاں رہ جائیں گی باقی
کچھ سوچا، تری تنہائیاں رہ جائیں گی باقی
یہ طول وارض، یہ گہرائی جو رکھتے ہیں فنا ہوں گے
مگر کچھ بے رخی سچائیاں رہ جائیں گی باقی
یہ سورج چاند تارے ایک دن بے نور بھی ہوں گے
شب تاریک کی گہرائیاں رہ جائیں گی باقی
رداوالے گواہوں کے تو شعلہ پوش بھی ہوں گے
وہاں اعمال کی پرچھائیاں رہ جائیں گی باقی
گناہوں کے سلگتے چیختے پیکر کی صورت میں
تری مخلوق کی رسوائیاں رہ جائیں گی باقی
بکھر جائے گا ہر منظر کسی کی جنبش لب سے
خموشی کی گھنی گہرائیاں رہ جائیں گی باقی
کہانی مختصر، بس ایک روشن باب ہے سید
جمال یار کی رعنائیاں رہ جائیں گی باقی

تخلیق کائنات سے روز محشر تک کے احوال الہامی کتابوں میں مذکور ہیں، مگر مابعد قیامت کیا صورت حال ہوگی، اس کا اشارہ نہ آسمانی صحیفوں میں ملتا ہے نہ فلسفیوں اور شاعروں کی تیسری آنکھ عدم آگہی کے دبیز پردوں کے اس پار کچھ دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مابعد قیامت کی اس غزل میں اسی تصور کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سید شکیل دسنوی۔

تو ہی نہیں ہے وقت کا شہکار میں بھی ہوں
تو ہے ہزار رُخ تو اداکار میں بھی ہوں
صدیوں کی کشمکش ہے، اصولوں کی بات ہے
فرمان تو اگر ہے تو انکار میں بھی ہوں
میرے بغیر کب ہے مکمل ترا جہاں
بازی کہہ حیات کا کردار میں بھی ہوں
تو توڑتا بہت ہے سلیقے سے سارے خواب
میں خواب جوڑتا ہوں، کلاکار میں بھی ہوں
بازیچہ فریب میں مت شعبدہ دکھا
کب مجھ سے جیت پائے گا فنکار میں بھی ہوں
آنکھیں تمہاری کرتی ہیں خوابوں کا کاروبار
دل کے عوض ملے تو خریدار میں بھی ہوں
آگے نکل ہی جائے گی عمر رواں شکیل
کیسے رکوں کہ وقت کی رفتار میں بھی ہوں

اگلے وقتوں میں میر تھا، کیا تھا
فن کے پیروں کا پیر تھا، کیا تھا
خود کو ڈھونڈے ہے جیسے لفظوں میں
سحر فن کا اسیر تھا، کیا تھا
اک خلش سی کہیں ہے سینے میں
کوئی نفرت کا تیر تھا، کیا تھا
کون قدموں کو دے گیا راہیں
کوئی قصوں کا پیر تھا، کیا تھا
دل میں کس کے اتر گئے اشعار
عہد حاضر کا میر تھا، کیا تھا
کس کی باتوں میں آ گئے سید
کوئی پہنچا فقیر تھا، کیا تھا

C/12، بیگٹر۔6، سی۔ڈی۔اے کالونی، بیڑاناسی، کٹک۔753014 (اڑیسہ) فون:0671-2363672

عمر بچھرایونی

کچھ کمی پائی اس جہان میں کیا
ڈھونڈتے ہو پھر آسمان میں کیا
ہر قدم اک نئی قیامت ہے
زندگانی ہے امتحان میں کیا
مطمئن ہوں ہر اک مصیبت پہ
کہ گیا کوئی میرے کان میں کیا
بے جھجک کوئی بے وفا کہہ دے
ہے یہ لازم تمہاری شان میں کیا
تم جو مجھ سے خفا سے رہتے ہو
ہے کوئی اور درمیان میں کیا
سخت باتیں بھی لطف دیتی ہیں
رس بھرا ہے تری زبان میں کیا
پوچھتی ہیں یہ حسرتیں دل سے
کوئی رہتا ہے اس مکان میں کیا
جب سے بچھڑے ہیں وہ عمر مجھ سے
ہے مرے واسطے جہان میں کیا

حربہ اغیار اس پر کار گر کیسے ہوا
وہ تو مجھ میں تھا مجھی سے بے خبر کیسے ہوا
تونے تو عرشِ معلیٰ پر لکھا تھا میرا نام
یہ بتا، پھر میرا مسکن خاک پر کیسے ہوا
آپ تھے اور صرف میں تھا دست قاصد بھی نہ تھا
میرا دشمن میرے خط سے باخبر کیسے ہوا
آہٹیں قدموں کی تھیں اور دھڑکنیں سمجھا تھا میں
دل تو میرا تھا، تمہاری رہگزر کیسے ہوا
شک نہیں اس میں کہ دو ٹوٹے ہوئے دل جڑ گئے
مار کر ہو تو گیا لوگو مگر کیسے ہوا
درسِ استقلال جو دیتا تھا ہر لحہ ہمیں
اس کا استقلال پھر زیرو زبر کیسے ہوا
عمر بھر لکھا تھا اوراق تخیل پر جسے
اے عمر وہ قصہ غم مختصر کیسے ہوا

بناوٹوں کے طریقے اصول کیوں رکھوں
میں پھول دان میں کاغذ کے پھول کیوں رکھوں
میں انتظار میں، اس درجہ طول کیوں رکھوں
وہ آ نہ پائے، تو پھر دل ملول کیوں رکھوں
یہ جانتا ہوں کہ مجھ کو لحد میں سونا ہے
تو خواہشات کو اتنا فضول کیوں رکھوں
کسی کی زلف کی زینت بنیں تو بہتر ہے
امیر شہر کی تربت پہ پھول کیوں رکھوں
ہوں راہ گیر مجھے بھی زمیں پہ چلنا ہے
کسی کی راہ میں خار ببول کیوں رکھوں
ہر ایک چہرے کو شفاف دیکھنا ہے مجھے
تو اپنے قلب کے شیشے پہ دھول کیوں رکھوں
جو انتخاب شدہ تھے، وہ رکھ لئے ہیں عمر
کوئی بھی شعر غزل میں فضول کیوں رکھوں

جمال اویسی

پر ہول دشت میں تو مرا ہم نوا نہ پوچھ
رستے کو دیکھ راہبر و رہنما نہ پوچھ
پتھر بنے ہوئے ہیں بدن انتظار میں
کب ختم ہوگی ساعتِ فردا نما نہ پوچھ
افتادِ آسمان تو پہچانتا نہیں
جو مل رہا ہے صبر کر اچھا برا نہ پوچھ
مقدور بھر سمیٹ لے سامانِ زندگی!
کیوں ڈوبنے میں لگ گئے ارض وسما نہ پوچھ
کیوں گل رہی ہے آہنی دیوار دم بہ دم
کہسار کیوں پگھلتے ہیں بہر خدا نہ پوچھ
حالاتِ حاضرہ کی لگائی ہے شرط جب
میری غزل نہ دیکھ تو میرا کہا نہ پوچھ

وہ ساتھی کہاں ہیں شب وروز الم کے
تمنائی تھے مشترک بیش وکم کے
یہاں سے وہاں سے ابھرتی ہے آواز
نہ جانے کہاں تک دفینے ہیں غم کے
سلگ اٹھتے ہیں مل کے مژگاں سے باہم
چھلکتے نہیں جام اس چشم نم کے
عجب کس مپرسی کے عالم میں ہے اب
اٹھائے تھے جس نے مزے زیر و بم کے
پڑا ہے جواں مرگ اخلاق اعظم
نہیں لوگ پرسان غم محترم کے

رضوان الرضا رضوان

ذہن کو حاضر و ناظر بھی بہت رکھتے ہیں
خود کو ہر ایک پہ ظاہر بھی بہت رکھتے ہیں
پیش منظر کے علاوہ ہیں پسِ منظر بھی
اور نظروں میں مناظر بھی بہت رکھتے ہیں
کم نہیں ہے یہ مری بے سروسامانی بھی
یوں تو سامان مسافر بھی بہت رکھتے ہیں
ہے نظر محوِ تحیر تو تعجب کیسا
درسِ عبرت یہ مظاہر بھی بہت رکھتے ہیں
ہر قدم پر رہے احساس وفاداری کا
ہم یہ جذبہ تری خاطر بھی بہت رکھتے ہیں
مال و اسباب و زر و سیم بظاہر رضواں
کچھ نہیں رکھتے ہیں ہم پھر بھی بہت رکھتے ہیں

اک رسم ہے جو لوگ ادا کرتے رہتے ہیں
باقی تمام فرض قضا کرتے رہتے ہیں
شاید کسی کو کوئی کرامت دکھائی دے
ہم روز کھیل ایک نیا کرتے رہتے ہیں
وہ بادشاہِ وقت سے بھی ہو نہ پائے گا
جو کام اس کے در کے گدا کرتے رہتے ہیں
تھوڑی بہت وہ آنکھ بھی اٹھتی ہے اس طرف
تھوڑی بہت تو ہم بھی حیا کرتے رہتے ہیں
اظہارِ کائنات ہے اظہارِ ذات میں
سب پر ہم اپنے آپ کو وا کرتے رہتے ہیں
کھولے ہوئے دریچہ کبھی اور سر کبھی
ہم انتظارِ بادِ صبا کرتے رہتے ہیں
دیکھا تو وہ بھی پائے گئے مبتلائے درد
رضواں جو درد دل کی دوا کرتے رہتے ہیں

مسعود جعفری

یہ کس نے آدھی رات مری نیند اڑا دی
اور خواب کی جلتی ہوئی قندیل بجھا دی
تو ہے کہ اترتا ہی نہیں ایک بھی زینہ
میں نے ہی مری جان کی بازی بھی لگا دی
جو اشک مری آنکھ میں ٹھہرا تھا سر شام
پلکوں کے جھروکے میں وہی بوند چھپا دی
گونگوں سے کئی سال رہا محو تکلم
بہروں کو مری داستاں میں نے ہی سنا دی
گم ہو گئے اوسان وہیں اہل ستم کے
فریاد کی لے جب بھی غریبوں نے بڑھا دی
اک نور کا سیلاب امنڈنے ہی لگا تھا
راہوں میں ترے حسن نے اک دھوم مچا دی
یوسف کے خریدار بڑے پیار بھرے تھے
اپنی متاع بیش بہا سب نے لٹا دی
میں آ گیا طوفان کی باہوں سے نکل کر
اللہ کے بندوں نے مجھے اور دعا دی
جس شخص کو لوگوں نے کہا جعفری اچھا
اس نے ہی مری آرزو سولی پہ چڑھا دی

گھور سناٹا آس پاس بہت
آج کی رات ہے اداس بہت
یاد آتا رہے گا صحرا میں
ہم کو تیرا حسیں لباس بہت
جانے کس موڑ پہ ہے وہ دریا
بھر گئی ہے لبوں میں پیاس بہت
کیسے لکھے گا یہ قلم تجھ پر
نہیں الفاظ میرے پاس بہت
بے یقینی میں انتظار ترا
نامرادی میں ایک آس بہت
اس کی باتیں کہاں حقیقی ہیں
اس کی باتوں میں ہے قیاس بہت
خوں رلاتا ہے آج بھی مسعود
اس کہانی کا اقتباس بہت

عطا عابدی

سب کو ہماری زیست کا نذرانہ چاہیے
جینے کو آج ہمت مردانہ چاہیے
کیونکر نہ لکھوں میں انہیں ممتاز ومحترم
دور از حقائق ان کو تو افسانہ چاہیے
گلشن کے پھول پھول سے قیس جدید کو
صحرانشین ہونے کا ہرجانہ چاہیے
ہیں مانگے کے اجالے پہ کچھ لوگ مفتخر
اور اس پہ یہ کہ داد کا نذرانہ چاہیے
غیرت وفا کی چیخ چیخ مرتی رہے، مگر
شمع ہوس کو ہر گھڑی پروانہ چاہیے
ہر انقلاب داعی صد انقلاب ہے
سردار کو تو آج بھی سلطانہ چاہیے
گلشن میں پھول کھلتے ہیں لیکن مرا نصیب
صحبت کو ایک پھول کی ویرانہ چاہیے
مطلوب وقت عاشق ومعشوق ہے مگر
شہر سخن کو شاعر فرزانہ چاہیے
مدت ہوئی لبوں پہ تبسم لئے ہوئے
دنیا کو بالیقیں کوئی دیوانہ چاہیے
حیرت ہے گھونٹ بھر پہ عطا آپ شاد ہیں
اس شہر میں تو لوگوں کو میخانہ چاہیے

معین شاداب

بوجھ خوابوں کا ان آنکھوں سے بہت ڈھویا تھا
اور پھر میں بھی نتیجے میں لہو رویا تھا
دکھ میں شرکت کا یقیں ہو بھی اسے تو کیسے
دل سے رویا تھا میں آنکھوں سے نہیں رویا تھا
دیکھ کر فصل اندھیروں کی یہ حیرت کیسی
تو کھیتوں میں اجالا ہی کہاں بویا تھا
گم اگر سوئی بھی ہو جائے تو دل دکھتا ہے
اور ہم نے تو محبت میں تجھے کھویا تھا
جیت اس بار بھی کچھوے کی ہوئی حیرت ہے
دوڑ میں اب کے تو خرگوش نہیں سویا تھا
جسم ناسوروں سے بچنا ہی تھا تم نے شاداب
پٹیاں دھوئی تھیں زخموں کو کہاں دھویا تھا

صرف پرکھوں کے حوالوں سے نہیں چلتا ہے
کام مانگے کے اجالوں سے نہیں چلتا ہے
تم شرافت کہاں بازار میں لے آئے ہو
اماں یہ سکہ تو سالوں سے نہیں چلتا ہے
بعض اوقات اندھیروں کی طلب ہوتی ہے
کام ہر وقت اجالوں سے نہیں چلتا ہے
عشق کے بیچ میں تو عقل کہاں لے آیا
یار بزنس یہ دلالوں سے نہیں چلتا ہے
میاں شاداب سنو! شعر و سخن کا شعبہ
صرف محبوب کے گالوں سے نہیں چلتا ہے

زخموں کی دکانوں پہ خریدار بھی آئے
بازار ہے تو رونق بازار بھی آئے
شانوں پہ یہاں سر کی جگہ کاسے لگے ہیں
گر سر کی بحالی ہو تو دستار بھی آئے
لو حق کے لیے اپنی جڑیں چھوڑ دیں ہم نے
اب گھر سے نکل کر کوئی انصار بھی آئے
کوشش کا یہ چاک اور گھماؤں گا میں کب تک
جیون پہ مرے اب کوئی آکار بھی آئے
کام آئیں گے یہ چاک گریباں کے رفو میں
کچھ غم نہیں حصے میں اگر خار بھی آئے

یوں سمجھنے کو تو پوری داستاں سمجھا تھا میں
وہ جو حرف آگہی تھا وہ کہاں سمجھا تھا میں
آخرش آوارگی ہی سود کی ضامن بنی
وائے نادانی اسے کار زیاں سمجھا تھا میں
دل کی بستی راکھ میں تبدیل ہوتے ہی کھلا
دور تک اک آگ تھی جس کو دھواں سمجھا تھا میں
رات سناٹے میں تھا وہ گریۂ شائستگی
پانچویں درویش کی کوئی فغاں سمجھا تھا میں
یہ ہے سب حسن قناعت میری کوتاہی نہیں
چند کلیوں کو مکمل گلستاں سمجھا تھا میں
اس نوا پر یہ سر تسلیم خم کرنا ہی تھا
اس نوا کو مسجد دل کی اذاں سمجھا تھا میں
اس کی خاکی شرٹ پر تمغے نظر آتے ہیں جو
پرچم انصاف و حق کی دھجیاں سمجھا تھا میں

یوں اس کو زندگی کا پتہ مل نہیں رہا
وہ درس گاہ عشق میں داخل نہیں رہا
موجوں کا یہ کرم تھا کہ سر پر اٹھا لیا
پھر میں رہین منت ساحل نہیں رہا
محفل سے وہ تو جا چکا اب یہ شمار کر
سینے میں کتنے لوگوں کے اب دل نہیں رہا
باتیں تو ہو رہی ہیں بہت اتفاق کی
مسلک سے اپنے کوئی مگر ہل نہیں رہا
جس پر بخارا اور سمرقند ہو نثار
اب عارض جمال پہ وہ تل نہیں رہا
دنیا کے اس تماشے میں نسوانیت گئی
اب تو حجاب ناز بھی حائل نہیں رہا

جب بھی کوئی کتاب لکھوں گا
تیرے نام انتساب لکھوں گا
دل تو کہتا نہیں مگر اس کو
مصلحت سے جناب لکھوں گا
ہاتھ تو چھوڑ گردش دوراں
اس کے خط کا جواب لکھوں گا
آئینے پر تو میرا زور نہیں
میں تجھے لاجواب لکھوں گا
تیرا حق ہے تو جو کہے مجھ کو
میں تو تجھ کو گلاب لکھوں گا
آئے گی جب 'بسنت پورنما'
میں کسی کا شباب لکھوں گا

جعفر ساہنی

بے چین خیالوں میں بہت گرم ہوا تھی
آباد مگر ہونٹ پہ برفاب دعا تھی
اک شوق کبھی وجہ بنا دردِ جگر کا
خوشیوں سے پریشان کبھی جانِ وفا تھی
محدود تبسم میں نظر آیا گلستاں
خوشبو کے صحیفے میں لکھی موج فنا تھی
لمحوں کے سفر میں جہاں مصروف رہا دن
بادل سے الجھ کر کے وہیں دھوپ خفا تھی
اک سوچ تھی مصروف گھٹاؤں کے نگر میں
اک یاد میں کمٹی ہوئی کرنوں کی قبا تھی
ہر موڑ پہ موجود تھی طوفان کی آہٹ
لیکن مرے ارمان میں معصوم صبا تھی
جب شوخ تمنا کا تھا مسرور دریچہ
محراب میں آنچل کی بجی شرم و حیا تھی
وہ کون مری شب کا نگہبان تھا جعفر
کس نام سے موسوم رفاقت کی صدا تھی

روشنی کے شہر میں منظر نیا کچھ بھی نہ تھا
اس میں راحت کا گماں دل کو ہوا کچھ بھی نہ تھا
بادلوں کے آنسوؤں میں چاند تارے بہہ گئے
رات کی محراب میں جگنو نما کچھ بھی نہ تھا
کل اثاثہ زندگی کا خواب رنگیں تھا مرا
پیار سے ہو کر جدا دل میں بچا کچھ بھی نہ تھا
غیظ کی آہٹ سے رشتہ تھا نہیں رکھنا مجھے
آپ نے کیا کچھ کہا میں نے سنا کچھ بھی نہ تھا
سوچ پڑھنے کا سلیقہ خوب آتا تھا مجھے
میری آنکھوں سے فسانہ چھپ سکا کچھ بھی نہ تھا
دن کی محفل آفتابی شان کا عنوان تھی
رات میں مہتاب جیسا دل رہا کچھ بھی نہ تھا
اس کی آمد سے فضا پُرنور سی لگنے لگی
گرچہ گھر کے طاق پر جلتا دیا کچھ بھی نہ تھا
ہر طرح کی ناز برداری ہمیشہ تھی عزیز
اس کے تیور سے مجھے جعفر گلہ کچھ بھی نہ تھا

پال کر روگ وہ عداوت کا
ڈھونڈتا ہے جہاں رفاقت کا
جاگ جاتی ہے چاہ بادل کی
سلسلہ دیکھ کر تمازت کا
اک تبسم کی یاد آتی ہے
ذکر ہوتا ہے جب قیامت کا
'کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے'
دل میں پودا اُگا عبادت کا
ایک امید اب بھی ہے باقی
وقت مل جائے گا فراغت کا
پھول کے ساتھ خار کو رکھنا
ہے ہنر یہ بڑی مہارت کا
جیت کر دل کسی کا ملتا ہے
پُرسکوں راستا عنایت کا
ساہنی کو ذرا بتا دینا
آج بھی مول ہے صداقت کا

ہم کبھی بھول پائے نہ وہ خامشی جو عنایت کی تہہ میں عداوت سی تھی
بے سبب تو گلے سے لگایا نہیں وقت نازک میں اس کی ضرورت سی تھی
شہر جاں کی درخشاں خوشی کے لئے اور تمنا کی آسودگی کے لئے
سرد لمحوں کا ارماں تناور ہوا دھوپ میں ہر طرف جب تمازت سی تھی
حسب توفیق، محرم ستم ڈھا گئے اجنبی بے تعلق کھڑے رہ گئے
زخم دل مسکرانے میں مشغول تھا مسکرانے کی اس کو جو عادت سی تھی
رنگ، خوشبو، صبا، چاند، تارے، کرن، پھول، شبنم، شفق، آبجو، چاندنی
یاد ان سب کی دلشاد رحمت سی تھی مضطرب ساعتوں میں عبادت سی تھی
رات بھر آسماں کا سراپا حسیں ماہتابی اشاروں پہ رقصاں رہا
آفتابی کرن کو لپیٹے ہوئے جب زمیں چلچلاتی حقیقت سی تھی
مرحلے سخت بھی نرم پڑنے لگے کشمکش کی فضا دل نشیں دیکھ کر
عاجزانہ تبسم نے جادو کیا تیور عشق میں اب صداقت سی تھی
دل کو احساس آخر عطا ہو گیا بھاگتے وقت کی تیز رفتار سے
مضمحل سے تنفس میں کمٹی ہوئی چاہتوں کے لئے اک عقیدت سی تھی
لاکھ چاہا کہ کھل کر مخالف بنے نفرتوں سے لگاوٹ کو آواز دے
آبدیدہ وہ ہو کر مگر رہ گیا چشمِ تر کے سخن میں محبت سی تھی
پیار کی روشنی دور تک دیر تک ظلمت شب کے آنگن میں ٹھہری رہی
تلخ لہجے میں بھی آپ کے ساہنی پُرسکوں گفتگو کی متانت سی تھی

سید صفدر

وہ مہرباں ہے ذرا کم خفا زیادہ ہے
یہ ہم سمجھتے ہیں کیا کم ہے کیا زیادہ ہے
بھویں تنی ہوئی دونوں شکن ہے ماتھے پر
عتاب اس میں ہے تھوڑا ادا زیادہ ہے
جنابِ والا کے دم سے ہے زینتِ اخبار
کیا کرایا صفر ہے چھپا زیادہ ہے
خود اشتہار نہ لکھا تو کچھ نہیں لکھا
پڑھا اگرچہ زیادہ لکھا زیادہ ہے
کسی کو چاہا تھا دل نے خلاف ہے دنیا
مرا قصور ذرا سا سزا زیادہ ہے
عدو غبارے اڑاتا ہے کیا ڈرے صفدر
وزن تو کچھ بھی نہیں ہے ہوا زیادہ ہے

بڑی آفت میں ڈالا چاہتی ہے
تمنا اب اجالا چاہتی ہے
مرے بھیتر ہے اک شیشے کی چڑیا
بہت اونچا اچھالا چاہتی ہے
اندھیرا سب طرف ٹھہرا ہوا ہے
نگہ میری اجالا چاہتی ہے
وہی ڈر تاک میں بیٹھا ہوا تھا
وہ خواہش سر نکالا چاہتی ہے
اسی گردن کو پھندے ڈھونڈتے ہیں
وہ مرا ورید مالا چاہتی ہے
مری تابِ سخن بے تابِ دنیا
مرے ہونٹوں پہ تالا چاہتی ہے
جنوں کو مصر کے پیارے بہت ہیں
خرد آفت کو ٹالا چاہتی ہے
مرا گھر یا نوعی زنجیر صفدر
مری ہمت ہمالا چاہتی ہے

الفاظ استعارے اشارے ہمارے اپنے ہیں
اندازِ شعر گوئی کے پیارے ہمارے اپنے ہیں
اس فہم پر تھا ہم کو بھروسہ چلے تھے جب گھر سے
گرداب دشمنوں کے کنارے ہمارے اپنے ہیں
تنہائیوں میں رات بھی کیا کیا فریب دیتی ہے
معشوق غیر اور ستارے ہمارے اپنے ہیں
ہمسائیگی بھی آئے میسر ہمارے اپنے کی
ویسے مہ و نجوم تو سارے ہمارے اپنے ہیں
اس مظہرِ طلسم سے نزدیکیاں نہیں صفدر
قائم نہیں دوریاں تو ہمارے ہمارے اپنے ہیں

ہمارے نام کو روشن ستارہ تو ہو
بھلے دنوں کا فلک سے کوئی اشارہ تو ہو
شکستہ سلسلے نسبت کے روک سکتے نہیں
ٹھہر ہی جاؤں کسی نے مجھے پکارا تو ہو
ابھارتی ہے مرے حوصلوں کو گردشِ آب
میں ڈوب جاؤں بھنور میں کہیں کنارا تو ہو
ہماری ذات میں اک بت نمود چاہتا ہے
ہمارے نام سے منسوب اک ادارہ تو ہو
اگرچہ یوں نہ سہی، یوں رکھو کوئی نسبت
ہمارے تم نہ ہوئے ہوں کوئی تمہارا تو ہو

رئیس الدین رئیس

کون ہے آخر بتا میرا وہ ہوتا کون ہے
کشتیاں میری سمندر میں ڈبوتا کون ہے
زخم دیتا ہے تو کاری زخم دیتا ہے مجھے
ہاں مگر تیزاب سے زخموں کو دھوتا کون ہے
کوئی بھی ویراں جزیرے میں نہیں میرے سوا
پھر بکھر کر ٹوٹ کر یہ مجھ میں روتا کون ہے
خارزاروں سنگ زاروں میں بجز میرے بتا
ایسی میٹھی اور گہری نیند سوتا کون ہے
جلتے صحرا ہی فقط تعبیر ہوتے ہیں رئیس
رات بھر آنکھوں میں تخم خواب بوتا کون ہے

رات پھر ایک نظم لکھی گئی
زندگی مثلِ زخم لکھی گئی
قیدِ تنہائی میں بھی میرے نام
ایک خوابوں کی بزم لکھی گئی
تھک گئی دھوپ جب جلا کے مجھے
چاندنی مجھ پہ گرم لکھی گئی
اوس کی بوند پنکھڑی سے اڑی
جب کرن اس پہ نرم لکھی گئی
میری تقدیر کے نوشتے میں
غمِ دوراں سے رزم لکھی گئی
اور ہم کس ہنر میں کامل تھے
عاشقی ہم پہ ختم لکھی گئی
ہجر کو وصلِ یار لکھنا پڑا
محض رسماً یہ رسم لکھی گئی

عارضِ سرخ پر نمی سی ہے
برف شعلے پہ کچھ جمی سی ہے
شہر والے ہیں کچھ عجب مخلوق
شکل میں پھر بھی برہمی سی ہے
گاؤں نے کی سکوں پذیرائی
شہر میں پھر بھی برہمی سی ہے
نا مکمل ہے زندگی شاید
ابھی آفات میں کمی سی ہے
کوئی طوفاں رئیس اٹھے گا
نبضِ دوراں تھمی سی ہے

ہم جیسا سمجھتے ہیں ویسا دراصل نہیں ہوتا کوئی — کچھ فرق یقیناً رہتا ہے ہم شکل نہیں ہوتا کوئی
چھت بیٹھی ستوں بھی ٹوٹ گئے دیوار گری سب کچھ اجڑا — اس گھر سے لیکن کیوں اب بھی بے دخل نہیں ہوتا کوئی
ہم اس کو لہو سے سینچتے ہیں ہر لحہ حفاظت کرتے ہیں — کیوں دل دھرتی پر سبز کبھی اک نخل نہیں ہوتا کوئی
سب منصف و نصف بے مصرف سب عادل وادل بے معنی — یہ سب باتیں بے کار کی ہیں یہاں عدل نہیں ہوتا کوئی
یہ مسئلے روزی روٹی کے کسے فرصت عشق محبت کی
اب ہجر زدہ یاں کوئی نہیں اب وصل نہیں ہوتا کوئی

راشد انور راشد

وہ تو اس بار بھی آیا ہی نہیں وادیٔ گل
اب کسی رُت پہ بھروسہ ہی نہیں وادیٔ گل
لوگ خوشبو کی تجارت میں ہیں مصروف مگر
یہ ہنر ہم نے تو سیکھا ہی نہیں وادیٔ گل
اس علاقے میں بھی آسکتی ہے پت جھڑ کی صدا
ہم نے اس بارے میں سوچا ہی نہیں وادیٔ گل
چھپ گیا ہے کسی کہسار میں سورج میرا
کتنے یگ بیتے نکلتا ہی نہیں وادیٔ گل
لوگ آتے ہیں، چلے جاتے ہیں، لیکن اپنا
کھرچ کرنے کا ارادہ ہی نہیں وادیٔ گل
صرف اک بار نظر آئی یہاں سبز پری
پھر کسی اور کو دیکھا ہی نہیں وادیٔ گل
اس نے جاتے ہوئے آنکھوں کو بشارت دی تھی
کوئی منزل یہاں بدلا ہی نہیں وادیٔ گل
ہر گھڑی دھڑکا لگا رہتا ہے انہونی کا
دل بھی سینے میں وہ دھڑکتا ہی نہیں وادیٔ گل

سکوت ٹوٹا، پگھلنے لگی پہاڑ کی برف
پھر آبشار میں ڈھلنے لگی پہاڑ کی برف
بدن جزیرے کی چنگاریوں سے تنگ آ کر
وہ اپنے جسم پہ ملنے لگی پہاڑ کی برف
حسین چہروں کی تعبیر دیکھ لی جب سے
حدوں سے اپنے نکلنے لگی پہاڑ کی برف
اداس چہروں پہ چھانے لگی تھی قوسِ قزح
غضب کا رنگ بدلنے لگی پہاڑ کی برف
پرندے گانے لگے، لوریاں سنانے لگے
ہوا کی گود میں پلنے لگی پہاڑ کی برف
نہ کوئی آندھی، نہ طوفان، پھر یہ کون آیا
کہ آہٹوں سے دہلنے لگی پہاڑ کی برف
تمام آب و ہوا پل میں ہوگئی تبدیل
یہ کس کو دیکھ مچلنے لگی پہاڑ کی برف
گلے جو ملنے سمندر سے میں چلا اک دن
تو میرے ساتھ ہی چلنے لگی پہاڑ کی برف

سفر میں اب کے ہوا اطمینان، ریگستان
سنائی دیتی ہے مجھ کو اذان، ریگستان
ہوا کی ضد ہے کہ تجھ کو تباہ کردے گی
دکھادے اپنی انا، آن بان، ریگستان
کس طرح سے اگر آگیا سمندر بھی
مٹا نہ پائے گا میرا نشان، ریگستان
سلگتی ریت میں ہی تربیت جنوں کی ہوئی
یہ تو ہے مری وحشت کی شان، ریگستان
کوئی میں رت ہو نتیجہ نہیں نکلتا ہے
میں دے رہا ہوں عجب امتحان ریگستان
ہرے بھرے جو علاقے تھے، ہیں سرِ فہرست
ادا ہے کرنا تجھے بھی لگان، ریگستان
وہ ٹولی روندنے نکلی ہے تیری وسعت کو
کہ اب سنبھال لے تیر اور کمان، ریگستان
میں ڈھونڈھتا ہوں کہ پھر کھو گیا ہے برسوں سے
یہیں کہیں پہ مرا خاندان، ریگستان
گھنے درختوں کے سائے میں بیٹھو شوق سے تم
رہے گا اپنا سدا سائبان، ریگستان
تو ہر نگاہ میں، ہر دل میں ہے مگر کب سے
تری تلاش میں ہے اک جہان، ریگستان
اگر وجود کی وادی بھی ہوگئی معدوم
تو سوچ لینا ہے وہم اور گمان ریگستان
جو میرا دل تھا وہ ہے سنگدل کے قبضے میں
نثار کرتا ہوں تجھ پر یہ جان، ریگستان

بھٹکتا پھرتا ہے کیوں بے قرار جنگل میں
بچھڑنے والے کو دل سے پکار جنگل میں
خدا کے واسطے جانے دو، کر رہا ہے کوئی
کئی یگوں سے میرا انتظار، جنگل میں
درخت سوکھ گئے تھے چہار سمت، مگر
غضب کے پھول کھلے بے شمار جنگل میں
تمام شہر بدن کے سراب میں گم ہے
پرندے روح کے کرتے ہیں پیار جنگل میں
جماعتوں کی جو وحشت اسے ستائے گی
پلٹ کے آئے گا بے اختیار جنگل میں
اب اپنے اپنے ٹھکانوں کو لوٹ چلتے ہیں
سنا کہ آیا ہے پھر سے نکھار جنگل میں
ذرا سا شعلہ ہی ابھرا تھا پھر تو اگلے پل
تمام پھیل گیا انتشار جنگل میں
اگر شکاری نہیں ہے تو کس لئے آخر
دکھائی دیتا ہے وہ بار بار جنگل میں

کاوش عباسی

چند رکھوں کے دوار پر اہل دل کا شور خموش
دیوانوں کی ذات میں کالے تل کا شور خموش
ہر چہرے پر جاگ اٹھتی آس ایک اچٹتی پیاس
ہر دل پر آجانے والے دل کا شور خموش
ناکامی پر ناکامی کا کچھ تو اثر ہوتا ہے
یعنی اب اس دل میں ہے منزل کا شور خموش
روشن، ادھ روشن کمروں میں ایک دبیز غبار
گلی کوچوں میں بھی قاتل، قاتل کا شور خموش
کتنی دیر سے تو نے یہاں اک حشر اٹھا رکھا تھا
کتنی جلدی ہوا تری محفل کا شور خموش
کیسے لوگ ہیں یوں جیتے ہیں جیسے نہیں جیتے
آنکھیں گھور خرابے ان کی، دل کا شور خموش
طوفاں سے جو کھیل رہے ہیں ان کو کیا پرواہ
موج میں ہے کاوش کہ لب ساحل کا شور خموش

مرے روزانہ کے معمول میں طوفان بھر جائے
ہو کچھ ایسا کہ جس سے میرا دل پھر سے بھر جائے
کبھی سیماب سا رہتا تھا میں تھکتا نہ تھمتا تھا
اور اب ہلکی سے اک جنبش مجھے ہلکان کر جائے
مجھے بے حال کر رکھا ہے میری غم پسندی نے
کوئی آئے تجھے اس خول سے آزاد کر جائے
میں بے تحریک ہوتا جا رہا ہوں آہستہ آہستہ
کوئی پھر سے میری جوانیوں میں آگ بھر جائے
ہوں ساکن تو ہوا بھی دل کو سرزا کر گزرتی ہے
لگے ٹھوکر کوئی ایسی کہ دل سے جاں کا ڈر جائے
یہ یاسیت، یہ ویرانی، یہ میری بے کسی کاوش
میری بیوی کو بھی اکثر جو دل افتادہ کر جائے

(ق)

مرے ماحول میں پلتا ہے میرا چاند سا بیٹا
میں ڈرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو وہ باپ پر جائے

آخری دو شعر جن میں پہلا مقطع ہے قطعہ بند شعر ہیں: ک ع

جو بے رخ اتنا ہے تم اس پہ مرنا چھوڑ دو بھی
وہ جھوٹا یار ہے یہ جھوٹا ناطہ توڑ دو بھی
برس ہی بیتے چٹانوں میں تم گھسٹتے ہو
اب ان چٹانوں کو، یا اپنا سر ہی، پھوڑ دو بھی
وہ قول کھیل تھا اس کا، کوئی قرار نہ تھا
اڈ پڑے ہی تم، اب سیل دل کو موڑ دو بھی
سبب ہیں اس کے تو کوئی سبب تمہارا بھی ہو
کبھی تو تم بھی ہٹو اس سے، اس کو چھوڑ دو بھی
بس اک جھلک ہے وہاں پر کوئی وجود نہیں
بنو نہ وحشی، ادھر، اس قدر نہ دوڑ دو بھی
وہ کار بند جہاں، دل سے اس کو کیا مطلب
خیال کاوش بسمل تم اس کا چھوڑ دو بھی

جو بے وفائیاں ہم سے ہوئیں وہ کرنی نہ تھیں
ہم ان میں رہتے تو وہ بستیاں اجڑنی نہ تھیں
وہ تھیں ہمارے ہی کھیلوں سے دوستانوں سے
نہ ہم نکلتے تو گلیاں ہماری مرنی نہ تھیں
تمام عمر جو روتی رہیں ہمارا فراق
وہ آنسوؤں سے بھی آنکھیں ہمیں وہ بھرنی نہ تھیں
گھروں میں ڈھلتی ہیں ہم بن وہ شامیں برسوں سے
جو ایک دن بھی ہمارے بغیر اترنی نہ تھیں
جدا ہی ہم سے جو جیتے رہے، جو مر بھی گئے
سلاخیں ان میں غم مستقل کی بھرنی نہ تھیں
ہے تھوڑا سچ بھی بہت جھوٹ ہے مرے اندر
میں سچ ہی ہوتا تو سوچیں مری بکھرنی نہ تھیں

تم آپ اپنی سزا فیصلہ کرو کاوش
جفائیں تم نے جو کیں کیا تمہیں وہ بھرنی نہ تھیں

مراق مرزا

اتر رہا ہے ستاروں کا کارواں مجھ میں
کہ بن رہا ہے کہیں کوئی آسماں مجھ میں

وہ اک سوال جو صدیوں سے اس زمین پہ ہے
جواب اس کا ہے شاید کہیں نہاں مجھ میں

میں اس زمیں کا مسافر ہوں روز اول سے
تلاش کیجئے کچھ وقت کے نشاں مجھ میں

مرا وجود ہے دنیا کی سرحدوں سے الگ
الگ زمین مری ہے الگ جہاں مجھ میں

مری نظر میں مری فکر اک دیا بھی نہیں
دکھائی دیتی ہے دنیا کو کہکشاں مجھ میں

مراق چاہنے والوں کی بھیڑ بڑھنے لگی
ہے کیا کہیں کوئی پوشیدہ شایگاں مجھ میں

ہے فکر کا یہ مقام وقت رواں میں سورج بکھر رہا ہے
پگھلنے والی ہے اب زمیں آسماں میں سورج بکھر رہا ہے

جو زندگی کا پیامبر تھا مزاج اس کا بدل گیا ہے
عجب تغیر ہے ابر کے کارواں میں سورج بکھر رہا ہے

فضا کے دامن سے مٹ نہ جائے کہیں یہ قوس قزح کی خوشبو
ہر اک سماں ہے دھواں دھواں کہکشاں میں سورج بکھر رہا ہے

تمام منظر سمٹنے والے ہیں ایک منظر کے دائرے میں
اندھیرے غالب ہیں ہر طرف کن فکاں میں سورج بکھر رہا ہے

میں ایسی دھرتی پہ آ گیا ہوں جو روشنی سے سجی ہوئی ہے
سفر ہے شاید بقا کا یہ شہر جاں میں سورج بکھر رہا ہے

تلاش ہے اک نئے فلک کی مراق اس یگ کے آدمی کو
کہ اس زمیں پر حیات کے ہر نشاں میں سورج بکھر رہا ہے

بادل کی تصویر پہ بنائیں صحرا میں
آؤ کچھ قندیل جلائیں صحرا میں

سورج کی فطرت ہے شعلے برسانا
ہم تم مل کر چاند اگائیں صحرا میں

جوڑیں ابر کا رشتہ خشک زمینوں سے
اک دن کوئی جھیل بنائیں صحرا میں

جگنوؤں سے فکر کی آرائش کر لیں
تاروں کی بارات سجائیں صحرا میں

جنگل میں کچھ پھول اجالوں کے رکھ دیں
خوشبو کی کچھ شاخ اگائیں صحرا میں

رات کی وسعت میں ڈھونڈیں خورشید مراق
خوابوں کا اک شہر بسائیں صحرا میں

شارق عدیل

طلب کے ساتھ میسر وصال بھی آئے
پھر اس کے بعد بدن پر زوال بھی آئے

ہم اپنے عہد گذشتہ کو پڑھ رہے ہیں ابھی
کمندیں زیرِ فلک لوگ ڈال بھی آئے

سرابِ عمر میں کب سے بھٹک رہا ہوں میں
کوئی تو لمحہ سمندر مثال بھی آئے

جواب لکھنے میں ہم کو حجاب آنے لگا
کچھ امتحان میں ایسے سوال بھی آئے

ترے خیال سے ڈھونڈوں مفر کا رستہ بھی
ترا جو ذکر کہیں ہو تو حال بھی آئے

کہ تو نے جن کو بنایا تھا پستیوں کا امیں
وہ آسمان کو تیرے کھنگال بھی آئے

شام ڈھلے چلے کہاں وقت بہت خراب ہے
کوئی سڑک نہیں رواں وقت بہت خراب ہے

ساری فضا کے جسم پر ناگ رہے ہیں راکھش
قہر و غضب، خموشیاں وقت بہت خراب ہے

ٹھہری ہوئی ہے زندگی تیز روی کے باوجود
کوششیں ساری رائیگاں وقت بہت خراب ہے

پانی کی بوند بوند کو دشت ترس ترس گئے
بدلا نہ رنگِ آسماں وقت بہت خراب ہے

وقت کی تیز آندھیاں ہونے لگیں ہیں خیمہ زن
دھرتی، گگن کے درمیاں وقت بہت خراب ہے

جن سے خلوص و مہر کے سلسلے تازہ رہتے تھے
خود سے بھی ہیں وہ بدگماں وقت بہت خراب ہے

شارق اپنے کرب کو کس پہ یہاں عیاں کروں
کوئی نہیں ہے مہرباں وقت بہت خراب ہے

ایک ادھورا شاعر ہوں میں کرتا ہے اظہار مجھے
فن کا علم نہیں ہے لیکن فن کا ہے اقرار مجھے

دیر و حرم کی جنگ کے منظر بانجھ نہ کردیں ذہنوں کو
گنگا جمنی تہذیب اپنی کرنی ہے بیدار مجھے

اپنی مٹی سے کٹ کر کیوں ایک مہاجر کہلاؤں
جانا تھا پر اب نہیں جانا سرحد کے اس پار مجھے

مجھ کو ٹوٹ کے چاہنے والے واقف تھے اس راز سے بھی
چھوٹی موٹی دل کی ضربیں کردیں گی خوددار مجھے

پا نہ سکا گہرائی میری جب تک میں بے چین رہا
اب وہ شناور ڈھونڈ رہا ہے کر کے بے منجدھار مجھے

نیند میں سوچ بڑھا دیتا ہے، بیداری میں دردِ دل
چین سے کب رہنے دیتا ہے اندر کا فنکار مجھے

طاہر عدیم

وہ ہو خدا یا کوئی فرشتہ یا حور اُترے
جسے اُترنا ہے تختِ دل پر ضرور اُترے

ہر ایک شاخِ بدن تو پھولوں سے لد گئی ہے
الٰہی سوچوں کی ٹہنیوں پر بھی بُور اُترے

وہ نظم ہو یا غزل، کسی پر میں جب بھی لکھوں
فقط تمہارا ہی عکس بین السطور اُترے

میں آج پھر اپنی چھت سے مایوس لوٹ آیا
کہ اُس کے جو بھی قافلے تھے وہ دُور اُترے

جو باوفا ہوں اگر ہے تو دلیل کوئی
ہے گر کہیں پر کوئی تو میرا قصور اُترے

میں صبح جاگا تو روشنی سے بھرا ہوا تھا
کہ میرے خوابوں میں رات میرے حضور اُترے

وہ چاند دل میں بسا ہے طاہر عدیم جب سے
لکھوں تو نوکِ قلم سے کاغذ پہ نور اُترے

یہ مسکراتے تمام سائے ہوئے پرائے تو کیا کرو گے
ہوا نے جب بھی مرے بدن کے دیے بجھائے تو کیا کرو گے

تمہاری خواہش پہ عمر بھر کی جدائیاں بھی قبول کر لوں
مگر بتاؤ! بغیر میرے جو رہ نہ پائے تو کیا کرو گے

وہ جن میں میرے عذاب تیرے سراب اُبھرے یا خواب ڈوبے
وہ سارے لمحے ہماری جانب پلٹ کے آئے تو کیا کرو گے

بغیر در کے کسی بھی گھر میں گھرے ہوئے ہو یہ فرض کر لو
اور ایسے عالم میں مل سکے جو نہ میری رائے تو کیا کرو گے

ابھی تو میرے غلاف ہاتھوں میں مطمئن ہیں پہ بعد میرے
جو آندھیوں میں چراغ اپنے یہ تھرتھرائے تو کیا کرو گے

تمہاری آنکھوں میں عکس میرا اگر نہ ہو گا تو کیسا ہو گا
سماعتوں کے شجر پہ پنچھی نہ چہچہائے تو کیا کرو گے

کرو گے کیا جو مرے بدن سے دھوئیں کی اک دن لکیر اُٹھی
لکیر سے پھر ہزار چہرے نکل کے آئے تو کیا کرو گے

وہ جن خیالوں میں رہ کے تم سے مری بھی پہچان کھو گئی ہے
انہی خیالوں کے سب مسافر ہوئے پرائے تو کیا کرو گے

یہ سوچتے ہو — چلا گیا وہ تو چھت پہ جاؤ گے کس لیے تم
کہ اب کے ساون کی بارشوں میں جو سب نہائے تو کیا کرو گے

ہے دسترس میں ابھی بھی طاہر اُٹھا کے اب اس کو پی بھی ڈالو
مشاہدوں میں ہی ہو گئی گر یہ ٹھنڈی چائے تو کیا کرو گے

یہ گھڑی ہی زندگی بھر کا ہے حاصل دیکھنا
وار ہلکا ہو نہ کانپیں ہاتھ قاتل دیکھنا!

ڈوبنے کا لطف یارو! بے مزہ رہ جائے نہ
چل کے آتا ہے مری جانب کو ساحل دیکھنا

جو بھی دل میں ہے وہ کہنے کو تو کہہ دوں میں مگر
جرأتِ دل پر دہل جائے نہ یہ دل دیکھنا

یوں نہ ہو کہ چاٹ ڈالے چاندنی کو تیرگی
رُوٹھ جائے مہر نہ اے ماہِ کامل دیکھنا

جھانکنا اُس پار سے اِس پار کا بحرِ گراں
اور پھر اس عمرِ لاحاصل کا حاصل دیکھنا

دیکھنا جو حال میرا ہے تمہارا بھی نہ ہو
آ نہ جائیں تم پہ بھی ایسے مراحل دیکھنا

میں بھی طاہر سانس لیتا ہوں جب اوروں کی طرح
کٹ رہی ہے کیوں مرے سینے کی یہ سِل دیکھنا

ظفر اقبال ظفر

جب صبح خوش القاب کی بنیاد پڑی ہے
گھر گھر میں نئے خواب کی بنیاد پڑی ہے

خونِ جگر و دل سے کر افزائش خاراں
صحرائے جنوں تاب کی بنیاد پڑی ہے

اک رنگِ شفق صبح سے تا شام ہے موجود
کس منظرِ خو متاب کی بنیاد پڑی ہے

دن رات ابلنا در و دیوار سے نغمات
تنہائی میں مضراب کی بنیاد پڑی ہے

پرچھائیں میں پرچھائیں بدن میں ہے بدن ضم
مہتاب میں مہتاب کی بنیاد پڑی ہے

پتوں کی طرح اڑنے لگے رنگ فضا میں
کس موسم شاداب کی بنیاد پڑی ہے

ہوجائے گی تعمیر عمارت بھی کسی دن
مانا کہ ابھی خواب کی بنیاد پڑی ہے

یہ عشق عجب عشق ہے جھپکی ہیں جب آنکھیں
قصرِ دلِ بیتاب کی بنیاد پڑی ہے

طوفان میں کشتی کا ظفر گھومتے رہنا
ہر موج میں گرداب کی بنیاد پڑی ہے

غم کا احساس جو ملا ہے ہمیں
خود کو اس میں ہی ڈھالنا ہے ہمیں

آئینہ بن کے ٹوٹ جائیں گے
یہ تماشا بھی دیکھنا ہے ہمیں

کبر و نخوت کی ہے عجیب سی بو
یہ لبادہ اتارنا ہے ہمیں

کوئی جھونکا ادھر سے بھی گذرے
یہ دریچہ بھی کھولنا ہے ہمیں

بولئے آپ کیا خریدیں گے
اپنا پندار بیچنا ہے ہمیں

کر رہا ہوں نباہ دینا سے
وہ دعا ایسی دے گیا ہے ہمیں

اپنے چہرے پہ کس کا چہرہ ہے
آئینے سے یہ پوچھنا ہے ہمیں

غصہ کرتا ہے بات، بات پہ وہ
اس کے لہجے میں بولنا ہے ہمیں

رشتہ بادل سے کھوجتا ہوگا
تم نے صحرا بنادیا ہے ہمیں

اس کو کہنا ہے الوداع ظفر
آنسوؤں کو بھی روکنا ہے ہمیں

باغوں میں چڑیوں کا شور
گھر میں ہے بچوں کا شور

سنتا ہوں ساحل پہ میں
کشتی اور موجوں کا شور

کیسے آئے غزل کاغذ پہ
ذہن میں ہے لفظوں کا شور

اس کی جدائی کیسے کٹے
قاتل ہے لمحوں کا شور

ختم سماعت ہو نہ جائے
کان میں ہے صدیوں کا شور

ذہن میں ہو یکسوئی کیا
گھر میں ہے رشتوں کا شور

ہوگا عالمگیر کبھی
شہروں اور قصبوں کا شور

کان پڑی آواز نہ آئے
ٹمپو اور کاروں کا شور

کیسے سنوں میں دل کی بات
حائل ہے سوچوں کا شور

170 نجیلدار، فتح پور، یوپی۔ 212601

رؤف خیر

بچھا ہوا ہے زمیں رنگ جال سا کوئی
ہے آسمان بھی ہم پر وبال سا کوئی

کہیں سے لاؤ ہمارے مثال سا کوئی
ہماری طرح کا آشفتہ حال سا کوئی

وہ کر رہا ہے مسلسل دلوں پہ بمباری
دلا رہا ہے ہمیں اشتعال سا کوئی

لگا ہوا ہے ازل سے مرے تعاقب میں
کبھی عروج سا کوئی زوال سا کوئی

جو خوش جمال بھی ہے اور ہم خیال بھی ہے
مرے لئے تو ہے مال ومنال سا کوئی

ہمیں گزند پہنچنے کبھی نہیں دیتا
ہے ایک ہاتھ جو بنتا ہے ڈھال سا کوئی

ادھر ادھر کی حکایات بے سند نہ سنا
سخن سنا تو سہی حسب حال سا کوئی

رؤف خیر ہمارا کمال چبھتا ہے
پڑا ہے یاروں کی آنکھوں میں بال سا کوئی

اب اس سے پہلے کہ تن من لہو لہو ہو جائے
لہو سے قبل شہادت چلو وضو ہو جائے

قریب دیدہ و دل اس قدر جو تو ہو جائے
تو کیا عجب تری تعریف میں غلو ہو جائے

بھلے ہی ہوتی ہے دنیا تمام ہو، ہو جائے
خدانخواستہ میرے خلاف تو ہو جائے

میں اپنا فون کبھی بند ہی نہیں رکھتا
نہ جانے کب اسے توفیق گفتگو ہو جائے

تمہاری چشم کرم ہی سے ہے بھرم دل کا
وہ دن نہ آئے کہ یہ جام، بے سبو ہو جائے

ملے ملے نہ ملے فرصت و فراغت پھر
چلو یہیں کہیں کچھ دیر ہاؤ ہو جو جائے

دماغ اس کا سنا ہے کہ آسمان پہ ہے
مری زمیں پہ چل کر لہو لہو ہو جائے

رؤف خیر کسی پر کبھی نہیں کھلتا
جو آج یار ہے ممکن ہے کل عدو ہو جائے

بے عیب اب کسی کی غزل تو نہیں کوئی
میری غزل بھی تاج محل تو نہیں کوئی

نیت میں کھوٹ سر میں خلل تو نہیں کوئی
وہ حیلہ جوئے جنگ وجدل تو نہیں کوئی

دنیا تمام یوں تو بڑی مہربان ہے
تیری عنایتوں کا بدل تو نہیں کوئی

میری گزر بسر ہے دلیل وجواز پر
اس رہ گزر میں لیت ولعل تو نہیں کوئی

اوروں کو مارنے کے لئے مر رہا ہے وہ
اس کے دماغ کا یہ خلل تو نہیں کوئی

تو نے تو زیر کرنے ہیں دریا پہاڑ دشت
اب چیونٹی غریب مسل تو نہیں کوئی

کیسی عمارتیں تھیں جو ڈھانچے میں ڈھل گئیں
کردار اس میں نذر اجل تو نہیں کوئی

مظلوم ہو رہے ہیں تو ہوتے رہیں شہید
یہ دیکھنا ہے رد عمل تو نہیں کوئی

اہل قلم ہیں خیر سے نایاب آج بھی
ہوگا رؤف خیر سا کل تو نہیں کوئی

سیفی سرونجی

سایہ ملے ان کو یہ مقدر نہیں ہوتا
بنجاروں کا دنیا میں کوئی گھر نہیں ہوتا

کوشش تو بہت کرتا ہوں چھولوں میں فلک کی
قد میرا مگر اس کے برابر نہیں ہوتا

منزل بھی اسی کی ہے یہ رستہ بھی اسی کا ہے
جس دل میں مرے دوست کوئی ڈر نہیں ہوتا

لایا ہے کوئی کھینچ کے اس موڑ پہ مجھکو
پانی بھی جہاں مجھ کو میسر نہیں ہوتا

بنتا نہ تماشا میرا یوں شہر میں آکر
ہاتھوں میں اگر آپ کے پتھر نہیں ہوتا

شعروں میں مرے تازگی ہوتی نہیں پیدا
آنکھوں میں حسین کوئی جو منظر نہیں ہوتا

اپنی قسمت میں نہیں شاید کوئی اچھا سفر
ہو مبارک آپ کو مکے مدینے کا سفر

عمر بھر سوتے رہے تم پھر کہاں دیکھا سفر
پوچھیے ہم سے ماں کس نے کیا کیسا سفر

مدتیں گذریں ہمیں اس کا وطن دیکھے ہوئے
ایسا لگتا ہے مگر جیسے ہو یہ کل کا سفر

عمر ساری کاٹ دی ہم نے یونہی چلتے ہوئے
ختم ہونے کو نہ آیا پھر بھی یہ اپنا سفر

دو قدم چل کر نہ آیا کوئی اپنے ساتھ میں
عمر بھر کرتے رہے دنیا میں ہم تنہا سفر

تجربہ اس کا یقیناً اور بھی گہرا ہوا
عمر بھر جس نے کیا اے دوستو لمبا سفر

موت سر پہ آ کھڑی سیفی تمہاری گھات میں
اور باقی رہ گیا اے زندگی کتنا سفر

محمد صدیق عالم

کیا لکھیے روز و شب کے حسابوں کو آج کل
پڑھتا نہیں ہے کوئی کتابوں کو آج کل

کانٹوں کا خوف ہے کہ کوئی اور بات ہے
چھوتا نہیں ہے کوئی گلابوں کو آج کل

تعبیر کے دکھوں کی میں تفصیل کیا لکھوں
آنکھیں تلاش کرتی ہیں خوابوں کو آج کل

کس سمت لے چلیں ہیں یہ مغرب کی آندھیاں
بچے بھی پی رہے رہیں شرابوں کو آج کل

برسات کا مزاج بھی کتنا بدل گیا
دریا ترس رہے ہیں حبابوں کو آج کل

عالم! یہ دولتوں کا کرم ہے کہ بے حسی
عزت سے دیکھتے ہیں خرابوں کو آج کل

ڈاکٹر سیفی سرونجی، مدیر سہ ماہی انتساب، سرونج، مدھیہ پردیش

محمد صدیق عالم

غزل کے نام سے صدمات لکھتے رہتے ہیں
ہم اپنے عصر کے حالات لکھتے رہتے ہیں

کسان آنکھوں سے بچھڑے ہوئے تمام آنسو،
زمینِ خشک پہ برسات لکھتے رہتے ہیں

وہ جن کی راتیں گزرتی ہیں ادھڑی سڑکوں پر
وہ دن خواب عمارت لکھتے رہتے ہیں

کبھی تو پڑھنے کی کوشش کریں یہ صدیاں بھی
جو لوحِ وقت پہ لمحات لکھتے رہتے ہیں

ہمارے شہر کی پُرامن سی فضاؤں پہ
ستم پرست فسادات لکھتے رہتے ہیں

کسی کی یادوں کے سائے میں بیٹھ کر عالم
ہم اپنے دل کی ہر اک بات لکھتے رہتے ہیں

یہی گلی یہی بستی یہ ٹھکانہ تھا
پرانے شہر میں میرا بھی آنا جانا تھا

نہ جانے کیا ہوا بے چین ہوگی دنیا
ابھی تو وقت کی آغوش میں زمانہ تھا

تمہارے ساتھ میں چلنا تو پیچھے رہ جانا
مجھے تو دور بہت دور آگے جانا تھا

پھر اس کے بعد وہ مجھ کو نظر نہیں آیا
رہا وہ ساتھ میں جب تک کہ آب ودانہ تھا

میں تم سے دور ہوا ہوں تو یاد آتا ہے
تمہارے شہر میں میرا بھی اک ٹھکانہ تھا

شاہد عزیز

آتے رہے ہیں شہر میں جاتے رہے ہیں ہم
ان راستوں کو اپنا بناتے رہے ہیں ہم

چھپتا نہیں ہے راز چھپانے سے فائدہ
کچھ اس لئے بھی سب کو بتاتے رہے ہیں ہم

اس راستے میں دوستوں اس درجہ بھیڑ ہے
لیکن سبھی سے بچتے رہے ہیں ہم

اجڑے ہوئے دیار کی صورت بدل گئی
گلشن میں ایسے پھول کھلاتے رہے ہیں ہم

یوں تو کبھی کسی کے لئے کچھ نہیں کیا
پر زندگی کے کام تو آتے رہے ہیں ہم

ویسے تو لڑتے بھڑتے رہی ہے یہ زندگی
لیکن کسی طرح سے نبھاتے رہے ہیں ہم

شاہد میر

ہاتھ ہو پتوار ہو گرداب ہو منجدھار ہو
اور اپنی خواہشوں کا نشہ دریا پار ہو

دل اندھیروں کا نگر پوشاک جلوہ بار ہو
یوں ہی جینا ہے تو پھر اس کے لئے تیار ہو

ہر کسی جھاڑی میں الجھا پیرہن کا تار ہو
عمر کا پر خار جنگل یوں بھی شاہد پار ہو

آنکھ ڈوبی ہی رہی سپنوں کی گہری جھیل میں
روشنی کہتی رہی بیدار ہو بیدار ہو

زندگانی کی ضمانت ہیں ادھوری خواہشیں
موت ہے آنکھوں کی گر سپنا کوئی ساکار ہو

کچھ نہ کچھ تو پاس ہو سورج نکلنے کی دلیل
دھوپ کی کرنیں نہ ہوں تو پیرہن کا تار ہو

مشتاق احزن

جب کبھی میری امیدوں کا شجر جلتا ہے
مجھ میں کچھ ٹوٹ کے احساس کا پر جلتا ہے

وہ تو رہتا ہے مرے پیکر اشعار میں گم
ہاں اسی واسطے سوچوں کا سفر جلتا ہے

وہ اندھیروں کو نگل جاتا ہے بن کر سورج
جہد کی آنچ سے جو شام و سحر جلتا ہے

سرد لہروں سے بھڑک اٹھتے ہیں دل میں شعلے
کیا قیامت ہے کہ برسات میں گھر جلتا ہے

روز و شب ظلم کے سائے میں جہاں کھلتے ہیں
ایسی جگہوں میں تو آہوں کا ثمر جلتا ہے

دل کے منصب پہ بٹھاتا تو کوئی جرم نہیں
کیوں کوئی شہر میں یوں بکنے خبر جلتا ہے

وہ عداوت میں مٹاتے رہے خود کو احزن
اور میں ہوں کہ محبت میں جگر جلتا ہے

تیرے کوچے سے لئے میں دل مضطر نکلا
غم رہا مجھ کو مگر ایک نہ خوگر نکلا

دور تک اس کو سرابوں نے پریشاں رکھا
تشنگی اپنی بجھانے جو سمندر نکلا

جب ڈھلی شام تو سائے بھی چھوڑا دامن
دھوپ دیوار سے اتری تو یہ منظر نکلا

شیشۂ دل میں کون عکس ابھاروں کیسے
گرد آلود ہی جب اس کا مقدر نکلا

اشک مجبور ہتھیلی پہ گرا ہے جب جب
اک اک قطرہ سمندر کے برابر نکلا

پا لیا میں نے وفاؤں کا بدل ایسے جب
میرا ہمدرد ہی قطروں کو بچا کر نکلا

کیفیت غم کی تمہیں معلوم ہے کیا
مختصر لمحہ بھی صدیوں کے برابر نکلا

بے غرض جھک کے جو ملتا تھا سبھی سے احزن
ہاں وہی شخص مفادات کا پیکر نکلا

عمران راقم

کسی کے دل پہ مرا اختیار کیا ہوگا
مرے بغیر کوئی بے قرار کیا ہوگا
ہزار جان فدا اس پہ کر بھی دوں لیکن
مری وفا پہ اسے اعتبار کیا ہوگا
زمیں کو تنگ کیا ہے فلک نشینوں نے
امیر شہر کو مفلس سے پیار کیا ہوگا
ملیں گے چاہنے والے تجھے بہت لیکن
مری طرح سے کوئی جاں نثار کیا ہوگا
تمام رات تو آنکھوں میں کاٹ دی میں نے
اب اور کر کے ترا انتظار کیا ہوگا
ہم اپنے جسم پہ تو خاک خود ہی ملتے ہیں
ہمارے جیسا کوئی خاکسار کیا ہوگا
جہاں کی جتنی مصیبت ہے مجھ پہ ٹوٹی ہے
کبھی بھی دل یہ مرا خوش گوار کیا ہوگا
بدن پہ رکھنے کو مرہم جگہ نہیں باقی
ہمارے زخم کا تم سے شمار کیا ہوگا
مرا ہی حال برا اس کے غم میں ہے راقم
مرے فراق میں وہ سوگوار کیا ہوگا

تجھ سے بچھڑے تو کئی قسطوں میں بٹ کر روئے
کبھی دیوار کبھی در سے لپٹ کر روئے
توڑ کر باندھ کبھی، آنکھ سے دریا نکلا
ہم تری یاد کے ساحل پہ سمٹ کر روئے
ہم کو یہ دن بھی دکھائے ہیں جنوں نے اکثر
تیری تصویر سے لپٹے کبھی ہٹ کر روئے
مجھ سے منہ پھیر لیا توڑ کے جب رشتۂ دل
کس لئے آپ میری سمت پلٹ کر روئے
پھول کی طرح الگ ہو کے ترے گلشن سے
موسمِ گل میں بھی ہم گرد میں اٹ کر روئے
پھر وہی شامِ بلا پھر وہی زخموں کی چبھن
شدت درد سے ابھرے کبھی گھٹ کر روئے
پیچھا چھوٹا ہی نہیں باب محبت سے کبھی
یہ سبق ہم کبھی بھولے کبھی رٹ کر روئے
جس پہ لکھا تھا کبھی نام ہمارا راقم
ہم اسی ریت کے پرتوں کو الٹ کر روئے

محمد ظہیر علی خاں

وہی صحرا میں پیاسا تھا
کہ جس کا دل ذرا سا تھا
ہوا کے زور سے شاید
وہ مجھ پر کچھ کھلا سا تھا
کبھی یوں تو ستم گر ہیں
وہ ظالم کچھ بھلا سا تھا
جو پچھلا کچھ نہ یاد آتا
یہی سب کچھ نیا سا تھا
بہت ہی تنگ دل تھا وہ
مگر گھر تو بڑا سا تھا
امیر شہر ہو کر بھی
وہی ہاتھوں میں کاسہ تھا
عبادت گاہیں الٹی تھیں
کوئی مجھ پر جھکا سا تھا

زارا فراز جمشید پوری

سدا یادوں کی بستی میں اسی کی ذات ہوتی ہے
مری ہر بات کے پیچھے اسی کی بات ہوتی ہے
اسی کی جیت ہوتی ہے اسے انعام ملتا ہے
یہ میری بدنصیبی ہے جو میری مات ہوتی ہے
میری بانہوں میں رہتی تھی مرے پہلو میں سوتی تھی
قضا اب لے گئی اس کو، اکیلی رات ہوتی ہے
بہت شاداب تھا گلشن اسی کی ذات کے دم سے
نہ کوئی پھول کھلتا ہے نہ اب برسات ہوتی ہے
کبھی دن میں بھی سورج کی کرن اتری نہ آنگن میں
میری قسمت کی نگری میں ہمیشہ رات ہوتی ہے
اجالا صبح کا ڈستا ہے احساس محبت کو
مگر جب رات ہوتی ہے وہ میرے سات ہوتی ہے

بھارت ہیلتھ سینٹر، مین روڈ آزادنگر، جمشید پور۔ 8321101

پارس ناتھ

جسے تو آئینہ دکھلا رہا ہے
وہ سب کو رات دن جھٹلا دیا ہے
کبھی اچھا برا سوچا نہیں تھا
نتیجہ سامنے اب آرہا ہے
اجالوں کی حدیں جھوٹی ہیں کتنی
اندھیرا دور تک بھرا رہا ہے
ادھر اک شخص نے بدلا ہے چولا
ادھر اک شخص دھوکا کھا رہا ہے
کہاں اس نے سنی ہیں دل کی باتیں
'ذہن' چالاکیاں دوہرا رہا ہے
مسیحا ہے ہمارے دور کا وہ
جسے سولی پہ تو چڑھوا رہا ہے
بھلا انصاف کیسے ہو سکے گا
گواہوں کو کوئی دھمکا رہا ہے
کبھی تم غور سے خود کو بھی دیکھو
کوئی اہلِ نظر سمجھا رہا ہے

قیصر عباس

روتے روتے آنکھ ہنسے تو ہنسنے دو
ہونٹوں پر مسکان کبھی تو رہنے دو
خوشیوں کی رت پر بھی ان کے پہرے ہیں
بے موسم کے پھول کھلیں تو کھلنے دو
کتنا گہرا سناٹا ہے ساحل پر
لہروں سے طوفان اٹھے تو اٹھنے دو
جانے کب وہ ایک مسافر آپہنچے
چوکھٹ پر ایک دیپ جلا کر جلنے دو
جن خوابوں میں اس کی خوشبو پھیلی ہے
ان خوابوں کو دل میں زندہ رہنے دو
لوگوں سے کہہ دو امیدیں زندہ ہیں
قیصر آنسو پلکوں سے مت گرنے دو

معظم علی خاں

اگر ہو دیدۂ فکر و نظر میں تاریکی
دکھائی دیتی ہے شمس و قمر میں تاریکی
نقاب رخ سے نکھرتا ہے حسنِ پاکیزہ
سحر کا حسن ہے قدرے سحر میں تاریکی
ردائے مہر منور کی مہربانی ہے
دکھائی دیتی نہیں جو قمر میں تاریکی
اب اس کے بعد بصد شان دوپہر ہوگی
ہے روشنی کی علامت سحر میں تاریکی
نگاہِ دیدہ وراں کے لئے برابر ہے
کوئی چراغ ملے یا سفر میں تاریکی
افق کے شوخ اجالے ابھی خوب ہیں لیکن
سکون نواز ہے شاخِ شجر میں تاریکی
دیے جلا کے معظم خوش آمدید کہو
ہے ایک رات کی مہمان گھر میں تاریکی

نصیر ناداں

یہ کس خطا کی سزا ملی ہے محبتوں میں
ضمیر صدیوں سے آج تک ہے ملامتوں میں
نظر ملائی ہے چڑھتے سورج سے ہم نے جب سے
پڑا ہوا ہے خلل ہماری بصارتوں میں
وہ مجھ کو گمنامیوں کی دوزخ میں ڈال آئے
مری بدولت جو پہنچے شہرت کی جنتوں میں
ترے کرم کی فضا بھی مجھ کو نہ راس آئی
اسیر میرا پر ندجاں ہے ہلاکتوں میں
وہ جلوہ اے کاش عکس ریزی پہ ہوتا مائل
حیات گم ہے فضائے تیرہ کی وسعتوں میں
رہے گا قرطاسِ جاں پہ اس کا ہی نام روشن
یہ چاند سورج رہیں گے جب تک سماعتوں میں
یہ اس کی آواز ہی کہ جادوگری ہے ناداں
گھلا ہوا ہے جو رس ہماری سماعتوں میں

محمد عابد علی عابد

نذر شمس الرحمن فاروقی

مقابلہ کرے اس کا کسی میں ہے دم کیا
فروغِ شمس کے آگے وجودِ شبنم کیا
ہیں یوں تو چاند سرِ آسماں کئی موجود
ہے ان میں کوئی سوا شمس سے معظم کیا
جدیدیت کا لب ولہجہ 'شعر شور انگیز'
ادب کو اور کسی نے کیا فراہم کیا
ادب نواز، وفا آشنا، کشادہ ذہن
یہ سب صفات ہوں یکجا کسی میں ہے کم کیا
عمل کا دائرہ ہے شمس کا وسیع بہت
مخالفین اسی بات سے ہیں برہم کیا
سبھی نے مل کے زبان و ادب کی خدمت کی
اٹھائے پھرتا اکیلے ہے غیر پرچم کیا
ادب میں جس کی تصانیف کم سے کم ہیں پچاس
اسے کرے گی فراموش نسلِ آدم کیا
ضیائے شمس سے عابد جہان روشن ہے
کہ کسب نور کیا سب نے آپ کیا ہم کیا

معظم علی خاں 4/8 زہرہ باغ، علیگڑھ۔ 202002
موبائل: 9219188478، 9997734696

ملک زادہ جاوید

چھوٹی چھوٹی بات پر تکرار ہے
اس قبیلے کا کوئی سردار ہے
زنگ میں ڈوبی ہوئی تلوار ہے
اس کا آخر کون ذمے دار ہے
چھین لیتے ہیں وہ چہرے سے ہنسی
مرنے والوں کا کوئی کردار ہے
ہر نوازش ہر عنایت ہے فضول
وہ ہمارا حاشیہ بردار ہے
اک کہانی سر اٹھائے گی مگر
آگہی کو وقت کچھ درکار ہے
ایک لمحے کی خوشی کے واسطے
وقت کی دہلیز پر اخبار ہے
شاعری جاوید کی ہے منفرد
اس حقیقت سے کسے انکار ہے

سب کو اس کی خامشی اچھی لگی
حاشیے پر زندگی اچھی لگی
جن کے چہروں پر تھی دن بھر کی تھکن
ان کو بچوں کی ہنسی اچھی لگی
وقت پر جس کو نہیں ہے اعتماد
اس کلائی پر گھڑی اچھی لگی
لگ گیا جب چاند کو پورا گہن
روشنی کی بے بسی اچھی لگی
اس دیے کی لو میں تھا میرا وجود
قربتوں کو روشنی اچھی لگی
جدتیں جاوید ہیں ہر شعر میں
سب کو تیری شاعری اچھی لگی

Malikzada Javed, 30-D, Neelgiri, Sector-34, NOIDA-201301

ناصر عظیم

میں ہوں اک بنجارہ لکھ
دل ہے ٹوٹا تارہ لکھ
بکھرے رنگ جو کاغذ پر
خوابوں کا سیارہ لکھ
بوڑھے باپ کے کندھوں پر
بچے ہیں ناکارہ لکھ
برس، برس کر اڑ جائے
بادل کو آوارہ لکھ
چاہ کے بھی جو کر نا سکے
اُس کو تو بیچارہ لکھ
تلواروں کی چھاؤں میں
کس کو کون پکارا لکھ
اپنی شکستہ کہانی میں
میرا نام دوبارا لکھ
قلم سے اپنے تو ناصر
سچائی کا نعرہ لکھ

نور محمد یاس

قیاس پر بھی عقیدے جواز لانے لگے
سراب میں بھی سفینے چلائے جانے لگے
تصورات بھی اب جسم و روح پانے لگے
یہ واقعات بھی دنیا میں پیش آنے لگے
وہ حبس تھا کہ چٹانوں کے پھٹ گئے سینے
پہاڑ پگھلی ہوئی آگ میں نہانے لگے
یہ سہمے سہمے سے رہنے لگے ہیں جذبے کیوں؟
یہ دشتِ دل میں شکاری کہاں سے آنے لگے
وہ دھوپ کیوں ہو کہ سوچوں کے پنکھ جلنے لگیں
وہ چھاؤں کیا کہ خیالوں کو نیند آنے لگے
تہہ زمیں بھی سبیلیں سفر کی ملنے لگیں
ہم آسماں پہ بھی پگڈنڈیاں بنانے لگے
وہ کیا بہارِ تخیل، وہ کیا نشاطِ نفس!
جو پھول پھول سے خوشبو نہ کھنچ کے آنے لگے

تشنگی ہے، سبیل نکلے گی
ریت کی تہہ میں جھیل نکلے گی
منزلت پائیں گے مکاں سے کہیں
قد سے اونچی فصیل نکلے گی
سائے بے رنگ ہوں خیال نہ تھا
دھوپ اتنی بخیل نکلے گی
اس سے کیا بحث کس نے کیا سوچا
بات ہو تو دلیل نکلے گی
دن کا جاہ و جلال کہتا ہے
شب حسین و جمیل نکلے گی

مسرت انجم

کوئی تازہ گل کھلائے گا لبِ اظہار پھر
خواب کے پہلو بہ پہلو ہے دلِ نادار پھر
کون سمجھے گا مری ان جاگتی آنکھوں کے راز
رات کر جائے گی مجھکو نیند سے بیدار پھر
فکر کی ان وادیوں سے لوٹ تو جاؤں مگر
اپنے ہی اوپر گرے گی سوچ کی دیوار پھر
چھوڑ جائے گی مجھے جو میری تنہائی کے ساتھ
اُس جدائی کے مجھے دکھنے لگے آثار پھر
روشنی سے ڈر لگے گا اب بہت دن تک مجھے
کر رہا ہے وہ مری پرچھائیوں پر وار پھر

مسرت انجم، 153۔ سیکنڈ فلور گلی نمبر 22 ذاکر نگر،
اوکھلا نئی دہلی۔ 110025 موبائل: 09212239239

مشرف حسین محضر

ہم رہِ مہر و مروت پہ چلے ہیں اب تک
اس لئے سب کی نگاہوں میں کھٹکے ہیں اب تک

ہوتی آئی ہے یہاں برسوں سے شعلہ باری
کیوں مکانات ہمارے ہی جلے ہیں اب تک

شہر کے ایسے امیروں میں نہ کر میرا شمار
جن کے احسان غریبوں کو کھلے ہیں اب تک

اے شب تار! بھڑک کر نہ وہ شعلہ بن جائیں
جن کے دل شمع کی مانند جلے ہیں اب تک

ہر قدم پر مجھے دھوکے ہی ملے ہیں ان سے
میری ہی بھیک پہ جو لوگ پلے ہیں اب تک

کہیں ایسا نہ ہو گھبرا کے یہ ظالم بن جائیں
ظلم کے سائے میں جو لوگ پلے ہیں اب تک

کس لئے اہلِ خرد ہم سے ہیں نالاں محضر
ہم مگر دل کے اشاروں پہ چلے ہیں اب تک

ثناءاللہ شاد وگھری

میں اپنی بازی پلٹ گیا ہوں
تمہارے رستے سے ہٹ گیا ہوں

میں کرب رشتوں کا سہتے سہتے
'خود اپنے اندر سمٹ گیا ہوں'

وہ ایک رشتہ ہے جس کی خاطر
تمام رشتوں سے کٹ گیا ہوں

چہار جانب کی آندھیوں میں
چراغ کی طرح ڈٹ گیا ہوں

ہے اب بھی خورشید مجھ میں پنہاں
اگرچہ ذروں میں بٹ گیا ہوں

مصالحت اس سے کر تو لی ہے
مگر میں قد سے بھی گھٹ گیا ہوں

ثنا میں صحرا ہوں مشکلوں کا
غبار سے میں بھی اٹ گیا ہوں

وریندر قمر بدرپوری

تو نہ تھا، تو اور کچھ تھی، اب ہوا کچھ اور ہے
تیرے ہونے سے ہی میرا مرتبہ کچھ اور ہے

چھوڑ بھی اے چارہ گر اس کی دوا کچھ اور ہے
یہ جو دل میں اٹھ رہا ہے دردسا، کچھ اور ہے

تم نہ سمجھو گے، تمھیں احساسِ الفت ہی نہیں
ناقدو اردو سے اپنا رابطہ کچھ اور ہے

تیرے دل میں اور کچھ ہے میں نے ٹھانی اور کچھ
تیری منزل اور میرا راستہ کچھ اور ہے

جس پہ ہو جائے سیاست کا اثر اے دوستو
سوچتا کچھ اور ہے وہ بولتا کچھ اور ہے

تشنہ لب ہوں میں ابھی تک، اور ہے بے فکر تو
ساقیا کچھ اور لا، کچھ اور لا، کچھ اور ہے

رہ کے تنہایوں ہی خود سے بات کرتا اے قمر
یہ فقط عادت نہیں ہے مسئلہ کچھ اور ہے

آزاد اکیڈمی علی گڑھ، یوپی

سید تصنیف حیدر

(وسیم بھائی کے نام)

کمالِ ضبط کی ساری کہانیاں بھی گئیں
تمہارے ساتھ تمہاری نشانیاں بھی گئیں
ابھی تو دامنِ دل پر کوئی شکن بھی نہ تھی
ابھی سے دوست تری چھیڑ خانیاں بھی گئیں
ہوا جو ختم مری سخت جانیوں کا سفر
نہ جانے کیسے تری مہربانیاں بھی گئیں
گیا جو ہاتھ سے ترکِ وفا کا اندیشہ
حصولِ خواب کی سب لن ترانیاں بھی گئیں
خیالِ ہجر کے موسم تو کٹ گئے لیکن
شبِ فراق کی شبنم فشانیاں بھی گئیں
تمہارے چہرے کے وہ نقش بھی نہیں باقی
ہمارے شعر کی جادو بیانیاں بھی گئیں
کچھ اس طرح سے تعلق کا سلسلہ ٹوٹا
یقیں تو دور تری بدگمانیاں بھی گئیں

زخم خوردہ کے لیے مرہمِ جاں ہو جیسے
شدتِ درد میں احساسِ اماں ہو جیسے
مری جلتی ہوئی آنکھوں میں کوئی چہرہ ہے
دامنِ ریگ پہ اک نہر رواں ہو جیسے
خواہشِ فکر کی منزل کا پتہ ہے وہ بھی
جادۂ فن میں کوئی سحر بیاں ہو جیسے
غم کے اِس دور میں اکثر مجھے لگتا ہے کہ وہ
مری آشفتہ سری کا نگراں ہو جیسے
حوصلہ بن کے مرے ساتھ رہا وقتِ سفر
بے یقیں راہ پہ منزل کا گماں ہو جیسے
تیرگی میں بھی اُن آنکھوں کا ہُنر کافی ہے
شب کی آغوش میں آوازِ اذاں ہو جیسے
وہ اگر ساتھ ہے میرے تو مجھے لگتا ہے
مجھ سے کچھ دور ہر اک سنگِ گراں ہو جیسے

اب کہاں ٹھہرے گی نظر جاناں
ختم پر آگیا سفر جاناں
ہوگئی بھول عشق میں ہم سے
تجھ کو کرنی نہ تھی خبر جاناں
اتنی شدت بری ہے الفت میں
اور پھر وہ بھی اس قدر جاناں
آج بھی ہے ہمارے ہونٹوں پر
تو ہی بس حرفِ معتبر جاناں
عمر گزری تجھے بھلانے میں
پھر بھی آیا نہ یہ ہنر جاناں
تو نے دیکھا ہے اس طرح اب کے
ہوگیا عشق کارگر جاناں
میں ہی تیری امید کی منزل
تو ہی میری خیال گر جاناں

خالد رحیم

ہاتھ میں رکھو قلم لکھتے رہو
اپنے اپنے شہر کے لوگوں کا غم لکھتے رہو
ایک اک چہرے کو پڑھ کر غور سے
زندگی کے پاس کتنے ہیں، الم لکھتے رہو
رات کے اوراق پر کچھ چاندنی کے حرف سے
تنہائی میں
ان کے وعدوں کا بھرم لکھتے رہو
آتے جاتے موسموں کی داستاں
بیش و کم لکھتے رہو
پڑھنے والے پڑھ رہے ہیں
ہے یہی موقع کہ تم بھی معتبر الفاظ میں
ظلم و ستم لکھتے رہو
زرد پتوں کی طرح پھرتے ہو کیوں
تیز آندھی میں رہو ثابت قدم لکھتے رہو

چھین کر ساری خوشی لے جائے گی
توڑ کر سنگِ تعلق زندگی لے جائے گی
ایک دن سورج کو ہوگی جستجو
بند کمروں سے ہمیں بھی روشنی لے جائے گی
اور جب دہلیز پر یہ وقت رکھ جائے گا دھوپ
رات اپنے ساتھ اپنی تیرگی لے جائے گی
کیا خبر تھی ایک دن میرے ہی ہاتھوں کی
لکیروں تک مجھے
خواہشوں کی سادگی لے جائے گی
ساتھ میں لے جاؤں گا ناکامیوں کا سلسلہ در سلسلہ
بے بسی جب بھی کبھی لے جائے گی
اور کتنے زرد چہرے دیکھنے کو آئیں گے
اور کتنی چوکھٹوں تک یہ گلی لے جائے گی
لاش خود اپنی اٹھائے ایک دن
دیکھنا یہ زندگی لے جائے گی
ساتھ میں لے جاؤں گا خالد جو اپنی تشنگی
پھر سرابوں تک مجھے یہ چاندنی لے جائے گی

نذیر فتح پوری

میرے ہونے سے اظہار کو راستہ مل گیا
یعنی افکار کو راستہ مل گیا
ضبط کے باندھ سب بہہ گئے
تم جو آئے تو بیمار کو راستہ مل گیا
چاند بے پردہ روشن ہوا
آج آنکھوں کو دیدار کا راستہ مل گیا
میری کمزوریاں میرے دشمن پہ روشن ہوئیں
اس کو یلغار کا راستہ مل گیا
گھر پہ قبضے کی کوشش کرے گا نذیر
میری غربت کو زردار کا راستہ مل گیا

خالد رحیم، خان ساماں لین۔ منی ساہو چک، بخشی بازار، کٹک۔ 753 001

نصرت ظہیر

کھڑا ہوں بھیڑ میں تنہا اور اس خیال میں ہوں
کوئی تو پوچھنے آئے گا کیسے حال میں ہوں
میں اپنے آپ کو نکلا تھا ڈھونڈنے اک دن
اور آج کتنی ہی شخصیتوں کے جال میں ہوں
نتیجہ یہ ہے ہر اک سمت کے تعاقب کا
کہ گھر جنوب میں ہے اور میں شمال میں ہوں
گروں گا نیچے ہی گو زندگی کے ہاتھوں میں
میں اک پتنگ کی مانند ابھی اچھال میں ہوں
کہیں ٹھہرنے کی حسرت میں مر ہی جاؤں گا
میں اک زمانے سے مصروف انتقال میں ہوں
کوئی جواب نہ دے پر زبان تو کھولے
کہ میں چھپا ہوا صدیوں سے ہر سوال میں ہوں

بادل آئے، گرجے، برسے
پھر بھی دل بارش کو ترسے
مسلے کچلے پھول پڑے ہیں
شائد تم گزری ہو ادھر سے
اپنی عاشق ہو جاؤ گی
خود کو دیکھو میری نظر سے
چاند ستارے چن لایا ہوں
آج بھی تیری راہگزر سے
یاد ترے رخسار بھی آئے
بات چلی تھی خونِ جگر سے
اس کے سوا ہر در پہ صدا دی
پہنچایا پیغام ہنر سے
تم بھی نہیں تھیں میں بھی نہیں تھا
کون تھا بستر پر شب بھر سے

ایک پتھر کی عبادت چاہتا ہے
دل مرا مجھ سے بغاوت چاہتا ہے
جھوٹ لگتی ہے مری ہر بات اس کو
اور پھر اُس میں صداقت چاہتا ہے
یاد بھی رکھتا ہے دل ہر وقت اس کو
بھول جانے کی بھی عادت چاہتا ہے
مجھ کو جبراً چھین لایا ہے وہ مجھ سے
اب نہ جانے کیا اجازت چاہتا ہے
یوں تو سنجیدہ بہت رہتا ہے لیکن
روز مجھ سے اک شرارت چاہتا ہے
قید کر رکھا ہے مجھ کو اپنے دل میں
جانے کتنی اور قربت چاہتا ہے
خوب واقف ہے مری بے چینیوں سے
پھر بھی اقرار محبت چاہتا ہے
پال رکھی ہے زبردستی کی چاہت
اس فسانے میں حقیقت چاہتا ہے
کیا عجب ہشیار دیوانہ ہے لوگو
قاتلوں سے ہی جراحت چاہتا ہے

بابِ افسانہ

سلام بن رزاق کے نام

فرار

جتیندر بلو

جانے میں نے اپنا گلاس کہاں رکھ چھوڑا تھا؟ یاد نہیں آرہا تھا؟ اندر سے آواز آئی "آہستہ پیو اور کم بھی۔ تمہارے دل کی شریان برابر کام نہیں کررہی ہیں؟ کہیں اسٹیلا کو ایمبولینس نہ طلب کرنی پڑ جائے؟" میں نے جھجٹ سے اپنی نبض کو ٹٹولا۔ اس کی رفتار اتنی سست نہ تھی کہ شب بھر کے لئے گلاس سے ناطہ توڑ لیا جاتا۔ میرا اور اس کا سمبندھ تو اتنا پرانا، اتنا گہرا تھا کہ میں نے اس کی بدولت نہ صرف اپنے باطن کو سمجھا تھا، بلکہ خارجی زندگی کی حرکات کو بھی جانا تھا۔ لاؤنج کشادہ تھا۔ جدید اور وکٹورین فرنیچر سے آراستہ۔ ایک کونے میں نیم دائرے میں پھیلا ہوا مختصر سا بار تھا، جہاں بہترین سے بہترین شراب موجود تھی۔ کاؤنٹر کے قریب تین چار آشنا چہرے بیٹھے ہوئے دکھائی دیئے، وہ آپسی بات چیت اور پینے پلانے میں اتنے ڈوبے ہوئے تھے کہ انہیں علم ہی نہ ہوا کہ میں کب ان کے قریب آن بیٹھا ہوں۔ معاً مجھے خیال آیا کہ دو تین پیگ پی کر پیشاب کا دباؤ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ فوراً ہی میں نے گلاس خالی کر کے کہیں رکھ چھوڑا تھا اور خود کو سنبھالتا ہوا سیدھا ٹائلٹ کی طرف بڑھ گیا تھا۔ بلیڈر خالی کرنے پر کتنا اطمینان، کتنا سکون ملا تھا مجھ کو۔ کتنا ہلکا محسوس کیا تھا میں نے۔ لیکن ٹائلٹ کی دیوار پر جڑے آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر میرے پاؤں وہیں تھم گئے تھے، گویا کہ فرش نے میرے پاؤں پکڑ لئے ہوں۔ میں نے خود کو نہایت قریب سے اور نہایت غور سے دیکھا تھا۔ ایک آنکھ تو مدت ہوئی، اپنا سیاہی مائل رنگ بدل کر سبز رنگ اختیار کر چکی تھی۔ اب دوسری آنکھ بھی رنگ بدلنے کی فکر میں تھی؟ میں سخت پریشان تھا۔ مگر یہ کسی نہ کسی دن ہونا ہی تھا۔ ماحول بدلتا ہے تو سوچ بدلتی ہے۔ سوچ بدلتی ہے تو شخصیت بھی بدلتی ہے اور انجام کار شناخت کا مسئلہ آن کھڑا ہوتا ہے، جو دماغ کی نسوں کو بھی خشک کر ڈالتا ہے۔ مارے غصے کے میرے بدن کا سارا لہو مٹھیوں میں آن جمع ہوا تھا۔ جی چاہا کہ آئینے کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں؟ یا زندگی بھر اس میں اپنی صورت نہ دیکھوں؟ لیکن میرا اٹھا ہوا ہاتھ جہاں تھا، وہیں رک گیا اور میں کوئی فیصلہ کئے بغیر ٹائلٹ سے چلا آیا۔

بار میں داخل ہو کر میں نے نیا گلاس تیار کیا۔ قریب بیٹھے ہوئے اشخاص کو میں اندر باہر سے جانتا ہوں۔ میں نے بارہا بات چیت کے دوران ان لوگوں کو کُریدا ہے۔ ان کے سماجی رتبہ کے ساتھ، ان کا پس منظر بھی جانتا ہے۔ وہ صاحب ثروت ہیں اور صاحب حیثیت بھی۔ ان کو زندگی کی ہر نعمت حاصل ہے سوائے ایک کے، وہ کمی میری بھی ہے۔ بلکہ یہاں موجود ہر شخص کی وہ کمی مشترکہ رہی ہے۔

ہم تمام لوگ ہر ماہ کسی کے مکان پر اکٹھے ہوتے ہیں۔ یہ سلسلہ طویل عرصے سے جاری ہے۔ وہاں ہر مرد کے ساتھ اس کی بیوی کا ہونا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ ورنہ صرف مرد کے لئے میزبان کا در وا نہیں ہوا کرتا، خواہ وہ کتنے بھی عذر کیوں نہ پیش کرے۔ پھر بھی خوشگوار شام کو رنگین بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ خوب قہقہے لگاتے ہیں۔ دل کھول کر ہنگامہ کرتے ہیں بے پناہ گھریلو، ذاتی اور دنیاوی باتیں کرتے ہیں۔ پیٹ بھر کر کھانا کھاتے ہیں۔ زور شور سے ناچتے ہیں۔ اتنے گلاس خالی کرتے ہیں کہ ہر کسی کے ہونٹوں پر سچ کے علاوہ کوئی دوسرا حرف نہیں ابھرتا۔ گو کہ یہ عمل بڑا خطرناک ہے۔ بعض دفعہ ناراضیاں اس حد تک بڑھ جاتی ہیں کہ گریباں چاک ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہم سب کو صدمہ پہونچنے کی بجائے خوشی ہوتی ہے کہ ذہن کا مکمل برہنہ ہونا شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ اس وقت ہم ایسے آئینے بن جاتے ہیں کہ ان کے آرپار دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ ہر حقیقت اپنے آپ واضح ہونے لگتی ہے اور بعض کے کردار واغدار نظر آتے ہیں۔

میں نے لبوں سے گلاس ہٹایا ہی تھا کہ کاؤنٹر پر کھڑی مجھے ایک فربہ اندام عورت دکھائی دی۔ وہ گنگنا کر اپنا گلاس تیار کر رہی تھی۔ لگا کہ وہ میری پہلی اور آخری بیوی ہے۔ مگر یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ لاؤنج میں آئے، میرے قریب سے گزرے اور مجھ سے بات کئے بغیر آگے بڑھ جائے؟ اس فربہ عورت کو

دوبارہ دیکھنے پر میری آنکھوں نے یقین دلایا کہ میری بیوی اتنی بے ہنگم، بے ڈول اور بدزیب نہیں ہے۔ اس کا بدن ضرور پھیل چکا ہے۔ وہ اپنی عمر سے کہیں بڑی بھی دکھائی دینے لگی ہے۔ لیکن اس کے بدن میں اب بھی بلا کی کشش اور جاذبیت ہے۔ جبکہ اس بھاری بھرکم عورت کو دیکھ کر کسی چٹان کا گمان گزرتا تھا۔ وہ گلاس تھامے گنگناتی میرے پاس سے گزری تو اس کی فربہ ٹانگوں پر نیلی اور ہری رگوں کا الجھا ہوا جال دیکھ کر سخت کراہت ہوئی۔ میں نے جھٹ سے منہ پھیر لیا۔ مگر میری بیوی ہے کہاں؟ اس خیال کے ساتھ میں نے اطراف میں نگاہ دوڑائی۔ لاؤنج میں مزید مہمان جمع ہو چکے تھے۔ لیکن میری بیوی ان میں شامل نہیں تھی۔ یقیناً وہ صاحبہ خانہ کے ساتھ گپ کرتے ہوئے، دونوں ہاتھوں سے پلیٹیں صاف کر رہی ہوگی۔ اسے کھانے پینے کا بے حد شوق ہے۔ لذیذ کھانے اس کی کمزوری ہیں۔ وہ ان کے خاطر ہر طرح کا سمجھوتہ کر سکتی ہے۔ لیکن کوئی زمانہ تھا وہ اپنی غذا کے متعلق کس قدر پابند، کس قدر محتاط رہا کرتی تھی۔ ناپ تول کر خوراک کھانا اس کا شیوہ تھا۔ منہ اندھیرے طرح طرح کی کسرت کرنا اس کا روز کا معمول تھا۔ جم Gym کی رونق بڑھانا بھی اس کے روزمرہ میں شامل تھا۔ اسے دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں اس کا کسا ہوا بدن اپنی صورت نہ کھو بیٹھے۔ وہ میرا کم، اپنے بدن کا زیادہ خیال رکھا کرتی تھی۔ جسمانی مشقت کرنا اس کے واسطے لازم بھی تھا کہ اس کی روزی روٹی اور شہرت اس سے جڑی ہوئی تھی۔ ہوش ربا بدن ہی اس کا ہتھیار تھا اور ہتھیار بھی ایسا کہ کسی ذی ہوش کا اس سے بچ نکلنا محال تھا۔ میں بھی اسی کا شکار ہوا تھا۔ وہ فیشن کی دنیا کی مقبول ترین ماڈل تھی۔ وہ ایک نشست کے منہ مانگے دام طلب کیا کرتی تھی اور تجارتی لوگ اسے ہنس ہنس کر ادا کیا کرتے تھے۔ لیکن وقت کی مار سے کون بچ پایا ہے، جو وہ بچ پاتی؟ وقت نے کروٹ لی اور اسے کیا سے کیا بنا ڈالا؟ گلاس کے گرد میری انگلیاں سخت ہوتی چلی گئیں، گلاس ٹوٹتے ٹوٹتے بچا اور میری گردن سینے کی طرف ڈھلک گئی، لیکن اس کا تراشا ہوا بدن میری آنکھوں میں اٹک کر رہ گیا۔ میں تڑپ اٹھا۔

مہمان چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ چکے تھے۔ پینا پلانا زوروں پر تھا۔ ہر طرف ہنسی مذاق، قہقہے اور لطیفے تھے، لیکن میں ان سے دور کہیں اور ہی کھویا ہوا تھا۔ مجھے وہ شام یاد آ رہی تھی، جب بے موسم کی ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ مجھے اپنے فوٹوگرافر دوست کے ہاں پہنچنا تھا جو کئی بار میرے وطن میں میرا مہمان بھی رہ چکا تھا۔ راستوں سے واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے میں اس کی رہائش گاہ پر اتنی دیر سے پہنچا تھا کہ وہ میرے آنے کی امید ہی کھو بیٹھا تھا۔ لیکن مجھے اپنی دہلیز پر کھڑا پا کر وہ بے حد خوش ہوا تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے اپنے دوستوں سے میرا تعارف کرایا تھا۔ ان میں اسٹیلا بھی شامل تھی۔ اس کے بدن کا ہر انگ میرے حواس پر گہرا تاثر چھوڑتا جا رہا تھا۔ ایک تو کسا ہوا متناسب بدن، اس پر گورا چٹا رنگ جو بچپن سے میری کمزوری رہا تھا۔ بارہا میری نظریں اس کے بدن کے ہر حصے پر پھیل رہی تھیں۔ لیکن وہ میرے رویئے سے ذرا بھی پریشان نہ تھی۔ بلکہ انتہائی دل جوئی سے میرے فوٹو گرافر دوست گریگری کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ ماحول بڑا رومانی تھا۔ اسٹیلا کا سر گریگری کے کندھے پر تھا اور اس کے لب اسٹیلا کے بالوں کو چھو رہے تھے۔ جانے کیوں میرے دل میں طاقت ور خواہش پیدا ہوئی کہ میں اسٹیلا کے بدن کو چھوؤں؟ اسے قریب سے محسوس کروں اور وقت آنے پر خود کو فراموش کر ڈالوں۔

کچھ دیر کے بعد میں نے اسے اپنے ساتھ رقص کرنے کی دعوت دی تو وہ چونک اٹھی۔ میں تڑپ اٹھا، "کیا تم کسی اجنبی کے ساتھ ناچنا پسند نہیں کرتیں..."

"ایسا مت کہو۔" اس کا لہجہ قدرے سخت تھا۔ "میں تو کبھی انکار نہیں کرتی۔"

"پھر...؟"

"اکثر میں نے دیکھا ہے تمہارے دیش کے لوگ ناچنے سے شرماتے ہیں... میں بہت سوں کو اپنے ساتھ ناچنے کی دعوت دے چکی ہوں۔ کوئی یہ کہہ کر الگ ہو جاتا ہے کہ اسے رقص نہیں آتا اور کوئی یہ کہتا ہے کہ اس کی ٹانگ میں درد ہے۔"

"لیکن مائی ڈیئر... میری دونوں ٹانگیں برابر ہیں اور میں ناچنا بھی جانتا ہوں... میں تم کو مایوس نہیں کروں گا؟"

اس نے گردن اٹھائی تو وقت تھم گیا تھا۔ زمین کی گردش رک گئی تھی۔ لیکن اگلے ہی پل وقت سرکا، زمین نے گردش کی اور اس کا نرم ہاتھ میرے گرم ہاتھ میں تھا۔ موسیقی کی لے پر ہم ناچ رہے تھے۔ موڑ کاٹتے ہوئے یا دائرہ مکمل کرتے وقت میں چور نظروں سے اپنے فوٹوگرافر دوست کو ضرور دیکھ لیا کرتا۔ وہ بے فکری سے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے خوش نظر آ رہا تھا۔ لیکن موقع ملنے پر تصویریں کلک کرتا ہوا ہمیں کیمرے میں قید کر رہا تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"تمہارے ساتھ ناچ رہا ہوں۔"

"نہیں نہیں میرا مطلب کچھ اور ہے۔" اس نے میری برجستگی کا لطف اٹھا کر کہا۔

"تم میرے ملک میں کیا کر رہے ہو؟"

میں حسب وعدہ استیلا کے فلیٹ میں داخل ہوا تو وہ اپنے چنندہ دوستوں میں گھری ہوئی کسی سنجیدہ موضوع پر بات کر رہی تھی۔ ان میں میرا دوست گریگری بھی شامل تھا۔ وہ معاملہ شناس شخص تھا۔ تیز آنکھ کے ساتھ تیز دماغ بھی رکھتا تھا۔ تب ہی کیمرے کا بٹن دبایا کرتا۔ جب اسے یقین ہوجاتا کہ Object کے پیچھے تھرکتی ہوئی زندگی بھی موجود ہے

''میں جرنلسٹ ہوں۔''

''جانتی ہوں۔''

''نوکری کی تلاش ہے۔''

''تمہیں نوکری جلد مل جائے گی۔''

''یہ اندازہ تم نے کیسے لگا لیا؟''

''تم میری زبان بہت اچھی بولتے ہو۔''

''یہ زبان اب تمہاری نہیں رہی۔'' میں نے پاؤں بدل کر کہا۔ ''یہ زبان اب انٹرنیشنل بن چکی ہے۔''

''جانتی ہوں۔''

''لیکن جن جن ملکوں میں تم نے اپنے پاؤں جمائے تھے۔ وہاں کئی لوگ تمہیں ایسے مل جائیں گے۔ جو تم سے بہتر اب یہ زبان بولتے ہیں۔''

میرے انکشاف سے اس کی گردن اونچی ہوگئی تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ احساس دلا رہی تھی کہ دنیا کے جس خطے پر اب وہ حکمران نہیں رہے تو کیا؟ ان کی زبان تو وہاں حکومت کر رہی ہے۔ میں نے فوراً سرگوشی کی۔ ''میں نے تمہارا ذہن پڑھ لیا ہے۔''

''اچھا کیا... ورنہ تم میں اور ایک عام آدمی میں کوئی فرق نہ تھا۔''

میں پھر سے چونک اٹھا تھا۔ ایک تو ہوش ربا بدن، اس پر تیز دماغ، ایسا سنگم تو شاذونادر ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ ورنہ کہیں بدن پُرکشش تو دماغ خس، اور کہیں دماغ سلجھا ہوا تو بدن غیر متناسب۔ لیکن وہ جو میرے ساتھ رقص کر رہی تھی، سر سے پاتک مکمل تھی۔

ان دنوں میرے ستارے صحیح معنوں میں میرا ساتھ دے رہے تھے۔ میں فلیٹ اسٹریٹ کے ایک ممتاز ترین اخبار میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اسٹیلا کے ساتھ میری دوستی، باہمی سمجھ بوجھ بڑھ کر پسندیدگی اور انجام کار اپنائیت کی حدود کو چھو رہی تھی۔ ہم نے دنیا کو ایک دوسرے کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ اب دنیا ہمیں حسین، رنگین اور اجلی اجلی دکھائی دیتی۔ میں اس کے کسے ہوئے پُر پیچ بدن کا دیوانہ تھا اور اسے پانے کی تڑپ مجھ میں زندہ تھی، وہ میری مشرقی ذہانت سے اتنی مرعوب تھی کہ مجھ سے برملا کہا کرتی تھی:

''تم نہایت سلجھا ہوا اور متوازن ذہن رکھتے ہو... مخلص ہو... ریاکاری تمہارے قریب سے نہیں گزری۔ بلکہ وہ گزرتے وقت شرم کھاتی ہے۔''

وہ ہمیشہ مجھ کو اپنے دوستانہ حلقے میں دانشور ثابت کرنے پر مصر رہا کرتی۔ اس کے یار دوست بظاہر مجھ کو پسند بھی کرتے تھے میرے نظریات اور خیالات کی قدر بھی کیا کرتے۔ لیکن پورے دل سے مجھے قبول کرنے سے ہچکچایا کرتے۔ وجہ میں جانتا تھا۔ صدیوں پرانا دنیا کے ہر براعظم پر حکومت کرنے کا احساس ان کے لہو اور رگ وپے میں شامل تھا۔ اس سے جلد الگ ہونے پر وہ آمادہ نہ تھے۔ میں بارہا ان سے الجھتے الجھتے رہ جاتا کہ کہیں میں اسٹیلا اور اس کے دوستوں کی صحبت سے محروم نہ رہ جاؤں؟ اسٹیلا ان تمام حقائق کو سمجھتی تھی، محسوس بھی کرتی تھی، مگر خاموش رہا کرتی، جس کا مجھے افسوس بھی رہتا۔

اور ایک سرد شام، جو موسمی اعتبار سے دل کو اداس کر دینے والی شام تھی۔ میں حسب وعدہ اسٹیلا کے فلیٹ میں داخل ہوا تو وہ اپنے چنندہ چنندہ دوستوں میں گھری ہوئی کسی سنجیدہ موضوع پر بات کر رہی تھی۔ ان میں میرا دوست گریگری بھی شامل تھا۔ وہ معاملہ شناس شخص تھا۔ تیز آنکھ کے ساتھ تیز دماغ بھی رکھتا تھا۔ تب ہی کیمرے کا بٹن دبایا کرتا، جب اسے یقین ہوجاتا کہ Object کے پیچھے تھرکتی ہوئی زندگی بھی موجود ہے۔ وہ جان گیا تھا کہ میں اور اسٹیلا اس مقام پر پہونچ چکے ہیں، جہاں سے لوٹنا اب ہمارے واسطے ممکن نہیں رہا۔ وہ اسٹیلا کو قدم قدم پر احساس دلانے لگا تھا کہ وہ کبھی اس کے عشق میں گرفتار تھا ہی نہیں۔ اگر ان کے درمیان کچھ تھا بھی تو وہ محض Infatuation تھی۔

گفتگو برطانوی معاشرے کے متعلق چل رہی تھی۔ لب لباب یہ تھا کہ موجودہ معاشرہ کس نوعیت کا ہے؟ چالیس پچاس برسوں میں وہ کون سی شکل اختیار کرے گا...؟ سفید نسلیں اب اور تب کیا محسوس کریں گی؟

چائے کے خالی پیالے میز پر دھرے تھے۔ مجھے چائے کی سخت طلب ہو رہی تھی؟ جی چاہا کہ کچن میں جا کر خود ہی چائے بنالوں۔ لیکن اسٹیلا کے

دوستوں کی موجودگی میں آزادی حاصل کرنے سے میں ہچکچایا، جانے کیوں؟ سب کی نظریں مجھ پر گڑھی ہوئی تھیں۔ میں نے سگریٹ سلگا کر دو تین جان دار کش لئے اور فضا کو مزید بوجھل بنا دیا۔ بحث فکر انگیز تھی اور معنی خیز بھی۔ گریگری ایک نظر مجھ کو دیکھ کر اسٹیلا سے مخاطب ہوا۔

''میرا خیال ہے چالیس پچاس برسوں میں ہماری سوسائٹی ہر اعتبار سے ملٹی کلچرل ہوگی... لیکن اینگلو سیکسن قوم کو بہت زیادہ نقصان اٹھانا ہوگا... ممکن ہے ہماری قوم کی پاکیزگی ختم ہو کر رہ جائے؟''

سبھی چونک اٹھے تھے، اس نے بات ہی کچھ ایسی کہی تھی کہ میں بھی چونک اٹھا تھا۔ سبھی حیرت زدہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ عجب سا خوف ہمارے چہروں پر امڈ آیا تھا۔ اسی کیفیت کے تحت اسٹیلا نے دریافت کیا۔

''یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہماری قوم کی پاکیزگی قریب قریب ختم ہو کر رہ جائے گی؟''

گریگری نے کہا ''آج ہمارے ہاں امیگرانٹز Immigrants سات فی صد ہیں... گورے، کالے، رنگدار، مگر چالیس پچاس برسوں میں ان کی تعداد بائیس فی صد ہوگی۔ ممکن ہے زیادہ بھی ہو... یہ اعداد و شمار ماہرین کے ہیں، میرے نہیں۔'' ہر کوئی ہمہ تن گوش تھا۔ گریگری نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''جس رفتار سے باہر سے آنے والے لوگوں کے ہاں اولاد پیدا ہو رہی ہے۔ وہ تشویش ناک ہے... ہزاروں کی تعداد میں رنگدار بچے ہر ماہ پیدا ہو رہے ہیں۔''

ایڈی، جو اسٹیلا کی قریبی دوست تھی۔ بول اٹھی ''دوغلے بچے مجھ پر اچھا تاثر نہیں چھوڑتے۔ وہ ہمارا کلچر قبول نہیں کرتے۔ وہ ہماری سوسائٹی میں مس فٹ Misfit ہیں۔''

''یہ پرابلم تمہاری ہے میری نہیں۔'' گریگری نے نرمی سے کہا۔ لیکن میں جب رنگدار بچوں کو انگریز بچوں کے ساتھ دیکھتا ہوں تو یہ سوال مجھے پریشان کرتا ہے کہ میری قوم کا کیا بنے گا؟ اس کی پاکیزگی اور عظمت برقرار رہے گی یا نہیں؟'' جملے کا آخری حصہ اس نے مجھے دیکھ کر ادا کیا تھا۔ جملہ مکمل کرنے پر بھی وہ مسلسل مجھے دیکھتا رہا۔ گویا میں ہی اس کی قوم کی پاکیزگی کو ختم کرنے والا شخص ہوں۔ اسٹیلا اس کی سخت نظروں کا مطلب کچھ کچھ بھانپ گئی تھی۔

''گریگری دل پر کس نے قابو پایا ہے... ہر آدمی آزاد ہے۔ وہ جس سے چاہے شادی کرے... ہم اس پر پہرے تو بٹھا نہیں سکتے؟''

''میں مانتا ہوں... لیکن اپنی برادری سے باہر شادی کر کے وہ اپنی قوم کو جو نقصان پہونچاتا ہے اس پر کبھی غور کیا ہے تم نے؟''

''گریگری دل پر کس نے قابو پایا ہے... ہر آدمی آزاد ہے۔ وہ جس سے چاہے شادی کرے... ہم اس پر پہرے تو بٹھا نہیں سکتے؟''

''میں مانتا ہوں... لیکن اپنی برادری سے باہر شادی کر کے وہ اپنی قوم کو جو نقصان پہونچاتا ہے اس پر کبھی غور کیا ہے تم نے؟''

جملہ براہ راست اسٹیلا کی ذات پر تھا، جو اپنے ساتھ کئی معنی، کئی پرتیں لئے ہوئے تھا مگر وہ سخت مٹی کی بنی ہوئی تھی۔

جملہ براہ راست اسٹیلا کی ذات پر تھا، جو اپنے ساتھ کئی معنی، کئی پرتیں لئے ہوئے تھا۔ مگر وہ سخت مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ اس کا ٹوٹ کر بکھرنا تو در کنار، اس پر آنچ تک نہ آئی تھی۔ نہایت تحمل سے بولی۔

''گریگری عشق تم نے بھی کیا تھا مگر عشق کے معنی نہیں سمجھے... جس روز سمجھ جاؤ گے اس طرح کی باتیں نہیں کرو گے؟''

مگر گریگری کہاں خاموش ہونے والا تھا۔ اس نے براہ راست مجھ سے جاننا چاہا کہ اس سلسلے میں میں کیا رائے رکھتا ہوں۔

''کمار! اب تم یہاں سیٹل ہو چکے ہو... سوسائٹی کے ہر پہلو کو خوب سمجھتے ہو... ایک امیگرانٹ ہو کر اس مسئلے کے بارے میں تمہاری سوچ کیا کہتی ہے؟''

میں نے ایک نظر اسٹیلا اور اس کے دوستوں کو دیکھا۔ وہ سب مجھ کو یوں دیکھ رہے تھے، گویا میرے بیان سے ہی اس مسئلے کا کوئی حل نکل پائے گا۔ قدرے سوچ وچار کے بعد میں نے کہا۔

''تم لوگ دنیا کے ہر خطے میں کئی دہوں تک حکمران رہے ہو... میرے دیش میں تو دو سو برسوں تک رہے ہو... اب اگر وہاں سے اور دوسرے ملکوں کے لوگ یہاں آ کر آباد ہو رہے ہیں تو تم کو بُرا نہیں لگنا چاہئے... رہا تمہاری قوم کی پاکیزگی کا سوال...؟ تو اب دنیا کی کوئی بھی قوم پاک نہیں رہی... یہاں تک کہ یہودی اور پارسی قوم کے جوان لڑکے لڑکیاں بھی اپنی برادری سے باہر شادی کر رہے ہیں۔''

اسٹیلا کی آنکھیں روشن ہو گئی تھیں۔ لیکن گریگری پر اوس پڑ گئی تھی۔

رات لیک آئی تھی۔ اندھیرا گہرا ہونے سے پہلے مہمان رخصت ہو گئے تھے۔ صرف میں وہاں اکیلا رہ گیا تھا۔ خاموش، اداس، بجھا بجھا سا، یہ سوچتے ہوئے کہ آدمی نفرت کی آگ میں جل کر اپنی سوچ کا توازن کیوں کھو بیٹھتا

میں اپنے معمول سے زیادہ پی گیا تھا۔ اسٹیلا بھی ساتویں آسمان پر تھی۔ لیکن میں تو سبھی آسمانوں کو عبور کئے، شیطان اور فرشتوں کے ساتھ مکالمہ کرنے پر آمادہ تھا۔ میری ہر الٹی سیدھی دلیل، سوچ کا ہر زاویہ اور منطق اسٹیلا کے نزدیک ناقابل برداشت تھی۔ وہ سخت پریشان تھی۔ مجھے سنبھالنے کی ہر ممکن کوشش اس نے کی تھی۔ لیکن بے سود...

ہے؟ وہ تصویر کا دوسرا رخ دیکھنے کی زحمت کیوں نہیں کرتا؟ وہ اپنے کہے کو مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔ کیوں گردانتا ہے؟ اگر گریگری نے کالونیل ازم (نوآبادیات) کی تاریخ پر غور کیا ہوتا تو اسے خود بخود جواب مل جاتا کہ ان کی سابق نوآبادیوں سے وہاں کے عوام یہاں آکر کیوں آباد ہو رہے ہیں؟ میں اپنی وچار دھارا میں کھویا ہوا تھا کہ لگا میں کمرے میں اکیلا نہیں ہوں، کوئی دوسرا بھی موجود ہے، جو نہایت غور سے مجھ کو دیکھے جا رہا ہے۔ اسٹیلا شب خوابی کا لباس پہنے میرے روبرو کھڑی تھی۔ منزل دو ہاتھ کے فاصلے پر تھی۔ صرف مجھ کو اٹھ کر اسے اپنی بانہوں میں بھرنا تھا۔ میری آنکھوں کی روشنی اتنی تیز ہو گئی تھی کہ پوری کائنات جگمگا اٹھی تھی، اور اس رات میں نے اپنی منزل کو پا لیا تھا۔

''اوئے... کہاں کھو گئے ہو تم؟''

اسٹیلا کی آواز مجھے ماضی سے کھینچ کر حال میں لے آئی تھی۔ اس کی آواز کتنی بدل چکی تھی۔ ڈھلتی عمر نے اس کی مٹھاس اور سریلے پن کو ختم کر ڈالا تھا۔ لیکن میرے کان تو نیم مردانہ اور نیم کرخت آواز کے عادی ہو چکے تھے۔ گلاس دیر سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ گھونٹ بھر کر بولا ''اسٹیلا... مجھے وہ شام یاد آرہی تھی، جب پہلی بار ہم ملے تھے۔''

''اس کے بعد بھی تو ہم ہزاروں بار مل چکے ہیں؟''

''ہاں! مگر اس شام کی بات ہی الگ تھی۔ اس کا نشہ آج بھی مجھ پر قائم ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' وہ قدرے دکھ کے ساتھ بولی ''وہ نشہ آہستہ آہستہ کم ہوتا چلا گیا... اور اب... محض بیتے دنوں کی یاد بن کر رہ گیا ہے۔''

اس کے چہرے پر کرب تھا اور بے چارگی کی جھلک بھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر میز سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا۔ دو سگریٹ بیک وقت سلگائے اور ایک میری طرف بڑھا کر کہا: ''میں تمہارے دکھ کو خوب سمجھتی ہوں... میں بیوی ہو کر بھی تم کو وہ نہ دے سکی جس پر عورت ناز کرتی ہے۔''

''اس میں تمہارا کوئی دوش نہیں... قدرت کے رنگ، اس کے اصول بڑے انوکھے ہیں۔ ان کو سمجھنا اتنا آسان نہیں... اسی واسطے ہم آج بھی اکٹھے ہیں اور زندہ ہیں۔'' وہ سرد آہ بھر کر رہ گئی تھی۔ میں نے بھی چپ سادھ لی تھی۔ لیکن ہمارے خاموش دل محرومیت کو نہایت قریب سے محسوس کر رہے تھے۔ یقیناً یہی ہمارا مقدر تھا اور اسی کے سہارے ہمیں باقی ماندہ زندگی بسر کرنی تھی۔

''یہ کون سا گلاس ہے تمہارا؟''

''شاید چوتھا۔''

''سنبھل کر پینا... بعد میں مایوسی نہ ہو؟''

اس کا مختصر سا جملہ مجھ کو کاٹتا چلا گیا۔ میرے ہاں دبا ہوا احساس ندامت از سر نو جاگ اٹھا تھا۔ پچھلی مرتبہ جانے کس کے گھر پر یہی ہنگامہ تھا۔ کم و بیش یہی لوگ جمع تھے۔ میں اپنے معمول سے زیادہ پی گیا تھا۔ اسٹیلا بھی ساتویں آسمان پر تھی۔ لیکن میں تو سبھی آسمانوں کو عبور کئے، شیطان اور فرشتوں کے ساتھ مکالمہ کرنے پر آمادہ تھا۔ میری ہر الٹی سیدھی دلیل، سوچ کا ہر زاویہ اور منطق اسٹیلا کے نزدیک ناقابل برداشت تھی۔ وہ سخت پریشان تھی۔ مجھے سنبھالنے کی ہر ممکن کوشش اس نے کی تھی۔ لیکن بے سود۔ اسے جب یقین ہو گیا کہ میں پارٹی میں Nuisance بن چکا ہوں اور تمام مہمان مجھ پر ہنس رہے ہیں تو اس نے مجھے موٹی موٹی گالیوں سے نوازا تھا اور میرے آگے رکھا ہوا گلاس اٹھا کر کسی دوسری میز پر رکھ چھوڑا تھا۔ قدرے توقف کے بعد میرا نشہ قدرے ہرن ہوا تو میرا سر ندامت سے جھک گیا تھا۔ میں کئی دنوں تک اس سے آنکھ نہیں ملا پایا تھا۔

کمرہ تمام آشنا چہروں سے بھر گیا تھا۔ یوں تو کمرہ کشادہ تھا، لیکن سولہ اشخاص کی موجودگی میں اس کے در و دیوار سکڑ کر رہ گئے تھے۔ آٹھ عورتیں تھیں اور اتنے ہی تعداد میں مرد بھی تھے۔ ہر کوئی گلاس تھامے چہک رہا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ جوں جوں 'وقت' کی سوئیاں اپنے مخصوص دائرے میں گھومیں گی، توں توں یہ چہکنا یہ خوشی غائب ہو جائے گی۔ پھر پارٹی اس مقام پر پہونچ جائے گی۔ جب ہر چہرے سے بے چارگی، آنکھوں سے محرومی اور باتوں سے تلخی ٹپکے گی، کہ ہزار پردوں میں چھپا ہوا آدمی بھی کہیں نہ کہیں سے بول اٹھتا ہے۔

شور درجہ بدرجہ بڑھ رہا تھا۔ اس شور میں صرف مرد ہی نہیں، عورتیں بھی برابر کی شریک تھیں۔ میرے دائیں ہاتھ میں چند عورتیں نیم دائرہ بنائے ذاتی مسائل پر تبادلہ خیال میں مصروف تھیں۔ اسٹیلا ان کی پردھان بنی بیٹھی تھی۔ اس کے ہر خیال کو اہمیت بھی دی جا رہی تھیں۔ عورتوں میں سے کسی ایک نے کہا:

''اس جھنجھٹ میں کون پڑے... پہلے اپنا پیٹ کاٹ کر بال بچوں کی پرورش کرو... ان کی ہر الٹی سیدھی مانگ پوری کرو۔ پھر جب وہ بالغ ہو کر اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں تو وہ ماں باپ کی ذرا فکر نہیں کرتے... بڑھاپے میں یوں آنکھیں پھیر لیتے ہیں، گویا کبھی واسطہ نہ تھا... پھر ان کے لئے اپنا وقت، پیسہ اور جذبات کیوں ضائع کئے جائیں؟''

لیکن اسٹیلا مختلف تھی، اس کا نقطہ نظر بھی الگ تھا۔ وہ ان سے الجھ گئی تھی۔ آدمی کی زندگی کا حاصل اس کی اولاد ہی تو ہے... اگر وہ بے اولاد ہی مر جائے تو اس کی دنیا میں آنے کا مقصد پورا نہیں ہوتا؟''

''یہ خیال تمہارا ہے، ہمارا نہیں... ہم تو بس اتنا جانتے ہیں، آدمی دنیا میں اکیلا آتا ہے، اکیلا ہی جدوجہد کرتا ہے اور اکیلا ہی چلا جاتا ہے... پھر وہ اپنا جیون دوسروں کے واسطے برباد کیوں کرے؟''

اسٹیلا نے فوراً ہی جواب دیا ''اولاد کے لئے قربانی دے کر ماں باپ کو روحانی تسکین بھی تو ملا کرتی ہے... وہ جب ان میں اپنی صورت دیکھتے ہیں تو ان کو زمین پر آنے کا مقصد سمجھ میں آتا ہے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟ تمہیں ابھی تک یہ تجربہ حاصل نہیں ہوا؟''

''ہاں یہ میری بدنصیبی ہے۔ لیکن میں نے تمہاری طرح Pills کھا کھا کر فطری دھارے کو روکا نہیں ہے؟''

''یہ ایک الگ بحث ہے... فی الحال بات اولاد کی ہو رہی ہے، Pills کی نہیں؟'' اسٹیلا کٹ کر رہ گئی تھی۔

میرا ہاتھ گلاس کے گرد مضبوطی سے پھیل گیا تھا، وہ ٹوٹتے ٹوٹتے بچا۔ میں نے اسے اٹھا کر ہونٹوں کی طرف بڑھایا تو اس کی تلچھٹ میں چند بوندیں ہی رہ گئی تھیں، جو میری زبان میں جذب ہو کر حلق تک بھی نہ پہونچ پائی تھیں۔ لیکن صاحب خانہ بڑا ہوشیار آدمی تھا۔ فوراً بھانپ گیا کہ میں کس کیفیت سے دوچار ہوں۔ نیا گلاس بنا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ چند گھونٹ بھر کر میرا ذہن ایک مرتبہ پھر پیچھے کی طرف دوڑنے لگا۔ میں نے اسے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن ذہن تو پھر ذہن ہے آدمی کی پکڑ میں کہاں آتا ہے؟ وہ تو بچھڑے ہوئے گھوڑے کی طرح ہے چاروں سمت دوڑنے پر آمادہ رہتا ہے۔ وہ کئی سال پھلانگ کر مجھے اس کمرے میں لے آیا، جہاں اسٹیلا اندھیرے میں بیٹھی، گہری فکروں میں ڈوبی، سگریٹ کے کش پہ کش لئے جا رہی تھی۔ میں نے داخل ہو کر روشنی کرنا چاہی تو اس کی آواز نے میرا ہاتھ روک لیا۔ ''بتی مت جلانا... میں تم سے جو کہنی چاہتی ہوں، وہ روشنی میں نہ کہہ پاؤں گی؟''

میرے ہاتھ میں شام کا اخبار تھا۔ چند کاغذات بھی تھے۔ گرفت ڈھیلی پڑتے ہی وہ سب غالیچے پر پھیل گئے۔ اندر سے آواز آئی کہ آج بعد دوپہر ڈاکٹر نے اسے جو فیصلہ سنایا ہے وہ اس کے حق میں یکسر نہیں ہے اور وہ سر سے پیر تک چیخ کر رہ گئی ہے۔ کہیں سے لرزتی ڈوبتی آواز تاریکی میں ابھری۔

''آج میرے پاس کیا نہیں ہے...؟ سوچو تو؟ کامیابی، شہرت، سماجی رتبہ، بے پناہ دولت، بے شمار چاہنے والے... لیکن صرف ایک ہی شے کی کمی ہے؟''

میں ایک عورت کی محرومیت کو شدت سے محسوس کر رہا تھا۔

وہ ضرورت تمہاری بھی ہے... مگر میری کہیں زیادہ... بدقسمتی سے ہم زندگی بھر اس کا منہ نہ دیکھ پائیں گے؟''

ہم دیر تک بے حس و حرکت اپنے اپنے دماغ میں بند رہے۔ مجھے اپنی دنیا ویران ہوتی ہوئی دکھائی دی۔ غالباً یہی میرا مقدر تھا۔ میں نے جھٹ سے ہاتھ بڑھا کر بتی جلا دی۔ کمرہ روشن ہوتے ہی اس نے آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔ احتجاجاً تیزی سے بول اٹھی۔

''میرا صدمہ اتنا معمولی تھا کہ تم کو روشنی کی ضرورت پڑ گئی؟''

''نہیں یہ بات نہیں۔''

''تو پھر...؟''

''مجھے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔ میں نہیں چاہتا وہ تمہیں بھی کھا جائے۔''

اس کی آنکھیں تین گنا پھیل گئی تھیں۔ وہ اٹھ کر میری طرف لپکی اور مجھ سے لپٹ کر بلک بلک کر رونے لگی تھی۔

وہ رات ہم پر بڑی گزری تھی۔

اسٹیلا ہر طرح کے فطری اور غیر فطری علاج معالجے سے گزری تھی۔ اس نے ملک کے نامور ڈاکٹروں سے رجوع کیا تھا۔ پانی کی طرح پیسہ بہایا تھا۔ لیکن ڈاکٹر کی آخری رپورٹ نے ہمارا گھر ماتم کدے میں بدل ڈالا تھا۔ ہم دونوں منہ لٹکائے ماتم کر رہے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ہم نے سیاہ لباس نہیں پہن رکھے تھے۔ اسٹیلا کو صدمہ اتنا گہرا ہوا تھا کہ وہ قریب قریب اپنے حواس ہی کھو بیٹھی تھی۔ مجھ پر بھی اثر کم نہ ہوا تھا۔ یہ احساس ہی میرے لئے تکلیف دہ تھا کہ میرے کان 'پاپا' یا 'ڈیڈ' جیسا لفظ سننے سے ہمیشہ محروم رہیں گے؟ اور اتنے بھرے پرے گھر میں کبھی کوئی بچہ رینگتا ہوا یا کلکاریاں مارتا ہوا دکھائی نہیں دے گا؟ ہمیں ایک دوسرے کی شکل دیکھ دیکھ کر ہی ساری زندگی بسر کرنی ہوگی۔ ہمارے ستاروں نے یقیناً ہمارے ساتھ بھیانک مذاق کیا تھا۔ برابر والے کمرے سے اسٹیلا کی ہچکیاں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہاں قدم رکھنے پر میں واقعی ڈر گیا تھا۔ اس کا اجاڑ ویران چہرہ، سوجی

ہوئی انگارہ آنکھیں، سرخ ناک اور نتھنوں سے بہتا پانی دیکھ کر میں نے اسے بانہوں میں سمیٹ کر دلاسا دینا چاہا۔

''اسٹیلا ہمیں ہر حال میں زندہ رہنا ہے؟''

''ہاں مانتی ہوں... پر میری ایک بات کا جواب دوگے؟''

''کہو''

''کیا اس دنیا میں خدا ہے۔''

یکبارگی میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے تھے اور میں برف بن گیا تھا۔ میرے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ اس کی سوچ یوں پلٹا کھائے گی کہ وہ خالق کائنات پر اپنا اعتبار کھو بیٹھے گی۔ غیر شعوری طور پر میرے لبوں سے چند الفاظ اس نوعیت کے ادا ہوئے کہ مجھے خود پر سخت تعجب ہوا۔

''کل تک تمہارا میرا خدا ہمارے ساتھ تھا... لیکن آج وہ ہم سے الگ ہوگیا ہے... اور اب وہ الگ ہی رہے گا۔''

''جب کہ ہمارا کوئی قصور ہی نہ تھا؟''

میں نے بھاری دل کے ساتھ ہاں میں گردن ہلا کر اسے بھینچ کر خود میں کھونا چاہا۔ میری آنکھیں بھی نمناک ہو چکی تھیں۔

ہم 'وقت' کی راکھ تلے دب چکے تھے۔ اس نے ہمارے جذبات پر ہی نہیں، دلوں پر بھی گہرا اثر چھوڑا تھا، اور جب ہم جھاڑ پونچھ کر اس سے ملکت ہوئے تو ہماری شکلیں کتنی بدل چکی تھیں۔ ہم اپنی عمروں سے کتنا آگے نکل گئے تھے۔ اسٹیلا کا بولتا بدن اپنی رعنائی کے ساتھ کشش بھی کھو رہا تھا۔ اس کا صبح سویرے کسرت کرنا اب سرد پڑتا جا رہا تھا۔ اس نے اتنی مقدار میں کھانا پینا شروع کر دیا تھا کہ آئے دن اس کا وزن بڑھ رہا تھا۔ یقین سے باہر تھا کہ یہ وہی بدن ہے، جس کی ایک جھلک پانے کو عوام ترسا کرتے تھے۔ سڑکوں پر بھیڑ جمع ہو جایا کرتی تھی۔ وہ جوان نسل کی رول ماڈل Role Model قرار پائی تھی۔ لیکن اب اس کی زندگی کا زاویہ نظر ہی بدل چکا تھا۔ منع کرنے پر بھی اس کے ہاتھ پلیٹ سے الگ نہیں ہوا کرتے تھے اور وہ بے دریغ کھایا کرتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟ آدمی اندر سے خالی ہو، اس کے تمام رنگ ماند پڑ جائیں اور اس کی دلی خواہش بھی پوری نہ ہو تو وہ نہ اپنی پرواہ کرتا ہے اور نہ ہی دنیا کی۔ من مانی کرنے میں ہی اسے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ جہاں تک میرا تعلق تھا تو بڑھاپا میری سوچ میں ضرور شامل ہو چکا تھا، مگر وہ میری صورت پر اثر انداز نہیں ہو پایا تھا۔ میں زیادہ تر اپنے ذہن کی تنہائی میں زندہ رہا کرتا۔ لیکن خیال موقع بے موقع مجھے اکثر پریشان کرتا کہ شاستروں میں لکھا کتنا سچ ہے کہ ''پرش اگر اپنی سنتان میں اپنا روپ نہ دیکھ پائے تو اس کی جون پوری نہیں ہو کرتی۔ اس کا دھرتی پر آنے کا ارتھ بھی نہیں نکلتا'' میں اندر سے ٹوٹ کر رہ جاتا۔

پانچ کمروں پر پھیلا ہوا مکان ہمیں اجڑا ہوا مقبرہ دکھائی دیتا، جس کی دیکھ بھال ہم دو مجاور کر رہے تھے۔ ہم گھنٹوں اپنے اپنے کمرے میں خاموش بیٹھے رہتے۔ سناٹا دلوں کو چیرا کرتا۔ میرے اندر جو خلا پیدا ہو چکا تھا، وہ کیوں کر دور ہوگا؟ اسٹیلا جانتی تھی کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے؟ اور کس اذیت سے میں دوچار ہوں؟ لیکن وہ چپ تھی۔ میں بھی خاموش رہا کرتا۔ زندگی جوں توں گزر رہی تھی۔ بظاہر کوئی گلہ، کوئی شکوہ شکایت نہ تھی۔ لیکن ہمیں شدید احساس تھا کہ جو کمی ہمارے ہاں پیدا ہو چکی ہے، وہ دوری کا پیش خیمہ ہے اور ہم جلد ہی ایک دوسرے سے دور ہو جائیں گے۔

اور ایک شب ہم لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جاڑا کڑاکے کا پڑ رہا تھا۔ برف باری بھی جاری تھی۔ تمام شہر سفید براق چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ میں کھڑکی میں کھڑا آکاش سے اترتی برف کا نظارہ کر رہا تھا کہ مجھ میں اور موسم کے رنگوں میں فرق ہی کیا ہے؟ وہی اتار چڑھاؤ، وہی گرمی سردی، وہی پت جھڑ اور بہار۔ وہی اداسی اور شگفتگی۔ میں قدرت کے سرمائے سے ہم آہنگ ہو رہا تھا کہ کہیں سے اسٹیلا کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی ''کمار... ذرا یہاں تو آؤ۔''

پلٹ کر مجھے مدھم روشنی میں اس کا پھیلتا ہوا بدن ہی دکھائی دیا۔ چہرہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا، جسے دیکھنے کو میں ترس گیا تھا۔ اس کے نزدیک پہونچ کر میں نے میز سے گلاس اٹھا کر ایک دو مختصر گھونٹ لئے۔ مگر اتنا سنجیدہ میں نے اسے کبھی نہیں پایا تھا۔ میں از حد محتاط ہو گیا تھا۔

''میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں؟''

''ج... جانتا ہوں''

''کیا...؟''

''یہی کہ میں... تم کو چھوڑ دوں... اور خود کو آزاد کر لوں۔''

''ہاں... ہم یوں... اس طرح زندگی نہیں جی سکتے؟''

اس نے سچ کو بہت قریب سے محسوس کر لیا تھا اور اب وہ میرے حق میں بات کر رہی تھی۔

''میں اندر سے بالکل خالی ہو چکی ہوں... تمہیں کچھ نہیں دے سکتی؟ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم مجھ کو چھوڑ دو... اور آگے کی سوچو۔''

''یہ سوال میں خود بھی کئی بار پوچھ چکا ہوں۔''

کیا جواب ملا ہے تم کو؟''

میں اس کے بالکل قریب لگ کر بیٹھ گیا۔ اس یادگار لمحے میں ہماری زندگیاں، ہمارا مستقبل اور ہماری دنیائیں اٹکی ہوئی تھیں۔ سوچ کر میں نے بے ربطی سے کہا:

''اسٹیلا میں... میں تم کو نہیں چھوڑ سکتا۔''

وہ پتھرائی ہوئی ایک مورت بنی مجھ کو تکتی رہی۔ اس کا چہرہ پھول چکا تھا۔

''شروع شروع میں میں تمہارے بدن کا دیوانہ تھا... اسے پانے کو میں نے کیا کیا جتن نہیں کئے تھے۔ کیا کیا خواب نہیں دیکھے تھے۔ مگر وہ خود بخود مجھ کو نصیب ہو گیا تھا... پھر میں اس عورت کو چاہنے لگا جو تمہارے اندر زندہ ہے... اور اب میں...'' یک بارگی میری زبان رک گئی تھی۔

''رک کیوں گئے؟ آگے کہو؟''

''اور اب میں اس عورت کو اپنی ذات سے بڑھ کر چاہتا ہوں۔''

''مگر وہ عورت تم کو کچھ نہیں دے سکتی؟''

''جانتا ہوں... لیکن اسے چھوڑنے میں میری شکست ہے اور شکست کھانا مجھے منظور نہیں۔'' اس کے چہرے کا رنگ بدلا تو وہ کہیں دور نکل گئی تھی۔ مجھے مکمل یقین ہو چکا تھا کہ وہ میری سوچ، میرے جذبات اور میرے رویے سے مطمئن نہیں ہے۔ لیکن جلد ہی اس کے ہاں سب کچھ بدل کر رہ گیا تھا۔ دلکش مسکراہٹ احساس دلانے لگی تھی کہ راکھ مٹ چکی ہے اور ہم پھر سے جوان ہو گئے ہیں۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''تم میرے ہو، مگر بے وقوف ہو۔''

میں کیا جواب دیتا۔ سرشار ہو کر اپنا سر اس کی گود میں ڈال کر اپنا ماضی، حال اور مستقبل بھلا بیٹھا۔

برسوں بعد ہم نے ایک ہی چھت کے نیچے دوسرا جنم لیا تھا۔ وہ میری ہر چھوٹی بڑی بات کو اپنی ذات سے زیادہ اہمیت دینے لگی تھی۔ میں بھی اس کی ہر مانگ کا احترام کرنے لگا تھا۔ حتیٰ کہ میں ان پارٹیوں میں بھی شرکت کرنے لگا تھا، جن کا مجھ سے، میرے ذات سے گہرا تعلق نہ تھا۔ البتہ وہاں جا کر میں وہاں کے ہنگاموں میں اکثر کھو جایا کرتا۔ وہ ہنگامے میرے من کو بھایا بھی کرتے، میری تیسری آنکھ بھی وا ہو جایا کرتی۔ پہلی مرتبہ وہاں قدم رکھنے پر میں نے نوٹس لیا تھا کہ مجھ جیسے ادھیڑ عمر لوگ چھوٹے چھوٹے گروپ بنائے بیٹھے ہیں۔ تعداد میں اتنے ہی مرد تھے، جتنی کہ عورتیں، کسی نے اپنا سر کسی کے کندھے پر ٹکا رکھا تھا تو کسی کی باہیں کسی کے گلے میں جھول رہی تھیں۔ ان کو آس پاس کا کوئی ہوش نہ تھا۔ کوئی شخص سر تھامے خود میں کھویا ہوا تھا تو کوئی گلاس میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں ابھی مکمل طور پر سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ ایک دبلا پتلا دراز قد شخص میری طرف گلاس بڑھا کر بولا۔

''Welcom to the Club... تم بھی ہماری طرح ہو؟''

اس کا طنز میں لپٹا ہوا جملہ ایک معمے سے کم نہ تھا۔ میں حیرائی سے دیکھتا ہی رہ گیا۔ لیکن اس نے ہمدردی جتا کر کہا ''حیران ہونے کی ضرورت نہیں... ہم ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں۔''

میری حیرائی کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی تھی۔ اس نے اپنا گلاس میرے گلاس سے ٹکرایا۔ پھر بامعنی مسکراہٹ لئے میری آنکھوں میں اتر گیا۔ بولا ''یہاں جتنے بھی لوگ موجود ہیں، وہ سب ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں۔ ہمارا ناخدا ہمارا مقدر ہے۔'' اس کے اشارے کنایوں سے واضح تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے؟ اتنے میں وہ پھر سے بول اٹھا۔

''عجیب اتفاق ہے کہ ہم ایک ساتھی زمین پر مل رہے ہیں... ورنہ کبھی نہ مل پاتے؟''

''اور اگر ملتے بھی تو ہاتھ ملا کر، نام جانے بغیر آگے بڑھ جاتے۔''

''واہ کیا بات کہی ہے تم نے... اکثر ایسا ہوتا ہے۔'' وہ چونک اٹھا تھا۔ پھر مجھ کو اوپر سے نیچے تک دیکھ کر مخاطب ہوا۔ ''تمہاری شادی ہوئے تو عرصہ بیت چکا ہے؟''

''ہاں... مگر تم کو کیسے پتہ؟''

''اسٹیلا کو کون نہیں جانتا... وہ اپنے وقت کی بیوٹی تھی... کریز تھی... کیا فیگر پائی تھی اس نے؟''

اور اب وہ صرف یاد بن کر رہ گئی ہے۔ میں نے اپنے دماغ میں سوچا۔

''پھر ایک روز دیش کے تمام اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ مشہور ماڈل اسٹیلا باروے نے کسی رنگ دار شخص سے شادی کر لی ہے... یقین جانو بہت سے دل ٹوٹ گئے تھے... میں بھی ان میں شامل تھا۔ لیکن آج میں تم سے مل کر بے حد خوش ہوا ہوں... میرا نام ڈیرک بش ہے... پارٹی میں آنے کا شکریہ۔ اب ملاقاتیں ہوتی رہیں گی؟''

''تمہاری شادی ہوئے تو عرصہ بیت چکا ہے؟''

''ہاں... مگر تم کو کیسے پتہ؟''

''اسٹیلا کو کون نہیں جلتا... وہ اپنے وقت کی بیوٹی تھی... کریز تھی... کیا فیگر پائی تھی اس نے؟''

اور اب وہ صرف یاد بن کر رہ گئی ہے۔ میں نے اپنے دماغ میں سوچا

گلاس خالی ہو رہے تھے۔ ماحول گرم ہوا جا رہا تھا۔ موسیقی کبھی تیز، کبھی ہلکی سروں میں اپنا جادو جگا رہی تھی۔ کہیں جاندار قہقہے پھوٹ رہے تھے تو کہیں سے کھوکھلی ہنسی سنائی دے رہی تھی۔ دو تین جوڑے وقت کی قید سے آزاد ناچ رہے تھے۔ مہمان تالیاں پیٹ رہے تھے۔ کمرے کی روشنی گل کردی گئی تھی۔ صرف رنگدار ڈسکو لائٹ گھوم رہی تھی۔ وہ چہروں پر پھیل کر الگ ہو جایا کرتی۔ عجب منظر تھا۔ آنکھ میں کھب جانے والا اور دل کو اداس کردینے والا۔ میں وہاں موجود تمام لوگوں سے مل چکا تھا۔ ان ہی کے اصرار پر میں پیے بھی جا رہا تھا۔ ان کے متعلق میں نے ایک ہی تاثر قائم کیا تھا کہ کوئی بھی خود سے خوش نہیں ہے اور نہ ہی مطمئن۔ اسٹیلا کچھ زیادہ ہی خوش نظر آرہی تھی۔ چہرے پر رونق، آنکھوں میں چمک اور لبوں پہ دل آویز مسکراہٹ لئے ہر کسی سے چہک چہک کر ہم کلام تھی۔ مدت بعد میں نے اسے اس کیفیت میں پایا تھا۔ وہ بازو پھیلائے میری طرف بڑھی۔

''آج میں تم کو کھلے بندوں آزاد کرتی ہوں...اس پل کے بعد تم پر کوئی پابندی عائد نہ ہوگی۔ چاہے تم کیسا بھی قدم کیوں نہ اٹھاؤ؟''

میں ہکا بکا رہ گیا۔

''جانتے ہو، میں تم کو یہاں کیوں لائی ہوں؟''

''اس کا جواب بعد میں دوں گا۔'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''تم نے مجھے کھلے بندوں آزاد کیوں کر ڈالا ہے؟ کیوں...؟ کس لئے...؟''

وہ سنجیدگی سے میری آنکھوں میں اتر گئی بولی ''ہم عمر کے اس موڑ پر کھڑے ہیں، جہاں ایک ہی خیال دن رات ہم کو تنگ کیا کرتا ہے کہ ہم خود کو کس طرح فراموش کریں...؟ کیا تم ایسا محسوس نہیں کرتے؟''

میرا گلاس میز پر دھرا تھا۔ دو تین گھونٹ بھر کر کہا۔

''تمہارا پیغام مجھ تک پہونچ گیا ہے...تمہارا سوال یہ تھا کہ تم مجھ کو یہاں کیوں لائی ہو؟'' اس نے کھل کر مردانہ قہقہہ لگایا۔ کبھی مہمان ہونٹوں پر سوال لئے ہمیں تکنے لگے۔ اسٹیلا نے خوشنودی سے میرے سینے پر گھونسا مارا اور قہقہے کا گلا گھونٹ کر کہا۔

''تم شیطان ہو اور حرامی بھی...کچھ نہیں بھولتے۔''

''تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ تم زندگی کی بوریت سے فرار پانے کی خاطر یہاں آئی ہو...اور مجھ کو بھی ساتھ لائی ہو؟''

''ہاں میں خوش ہو کہ تم یہاں لوگوں سے جلد گھل مل گئے ہو...کیسے ہیں یہ لوگ؟''

''بالکل ہماری طرح...اندر سے خالی، ٹوٹے ہوئے، ادھورے اور بکھرے ہوئے۔''

''ہاں وہ تو ہے...مگر جب یہ لوگ مل بیٹھتے ہیں تو ہر فکر سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ہم یہاں آئے ہیں کہ...''

''رہی سہی زندگی کا لطف اٹھا پائیں؟''

''ہاں! خوب کھائیں پئیں، ناچیں، دل کھول کر باتیں کریں۔ مذاق کریں اور اتنے قہقہے لگائیں کہ خود کو بھول جائیں...اور اگلی صبح اٹھیں تو زندگی سے کوئی شکایت نہ ہو۔''

اس نے میرا گلاس اٹھا کر لمبا سا گھونٹ بھرا اور پھر سے رواں ہوگئی۔

''دیکھ لینا...یہ برادری ہمارے جینے کا سہارا بنے گی...ہم زندگی میں کوئی کمی محسوس نہیں کریں گے؟''

اس شب کئی جام میرے حلق سے اترے تھے۔ میں نے جذب کے عالم میں رقص بھی کیا تھا...بے شمار باتیں کی تھیں...ڈھکے چھپے مذاق کئے تھے...ننگے قہقہے لگائے تھے اور میں واقعی وقتی طور پر خود کو بھول گیا تھا۔ صبح اٹھا تو دنیا مجھ کو بدلی بدلی سی، مگر حسین لگ رہی تھی۔

چند پارٹیوں کے بعد اگلی پارٹی ڈیرک بش کے عالیشان ولا Villa پر قرار پائی تھی۔ وہ مکان کم تھا، بھول بھلیاں زیادہ۔ کوئی شخص وہاں گم ہو جائے تو پتہ ہی نہ چلے کہ وہ کس جہاں میں کھو گیا ہے۔ میزبان کے ساتھ مہمان بھی اسے کھوجتے پھریں اور وہ مشکل سے ہاتھ آئے۔ اس رات بھی میں نے کئی جام خالی کئے تھے۔ قریب قریب ہر عورت کے ساتھ رقص بھی کیا تھا اور کافی تھک بھی چکا تھا لیکن میں خوش تھا کہ ہمیشہ کی طرح میں نے نسلی امتیاز کا عنصر نہ پایا تھا اور نہ ہی کسی آنکھ میں میرا سانولا رنگ کھٹکا تھا۔ ماحول میرے دل کے مطابق تھا اور دل کے ساتھ تھا۔ میں مستی میں برابر جھوم رہا تھا کہ اچانک صاحبہ خانہ مسز بش نے مجھے اپنے ساتھ ناچنے کی دعوت پیش کی۔ میں انکار نہ کر پایا کہ وہ بھرے بھرے بدن کی پُر وقار عورت تھی۔ ڈھلتی عمر میں بھی اس نے اپنا حسن سنبھال کر رکھا تھا۔ ہم ناچنے لگے۔ اس کی چمکدار آنکھوں میں احساس برتری کا غرور تھا۔

ویسا ہی غرور میرے ہاں بھی ابھر آیا تھا۔ گانا مائیکل جیکسن کا چل رہا تھا۔ "The way you make me feel" اس کی لے اور سُر آہستہ آہستہ تیز ہو رہے تھے۔ ہم پلکیں جھپکائے بنا ناچے جا رہے تھے۔ خطرناک حد تک ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں اتر گئے تھے۔ اس نے تیزی سے ناچنا شروع کیا تو میں نے بھی رفتار بڑھا دی تھی۔ میرا پورا جسم حرکت میں تھا۔ ہر طرف سے تالیوں کا شور اٹھ رہا تھا۔ مہمان جملوں کا سہارا لئے ہمیں مزید تیز ناچنے پر اکسا رہے تھے۔ ہمارے بدنوں کا انگ انگ

پھڑک رہا تھا تھرک رہا تھا، مقابلہ زوروں پر تھا اور ہم ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں تھے کہ اچانک موسیقی رک گئی۔ ہم بھی رک گئے۔ ہم پسینے میں تر بتر تھے، میں نے اس سے الگ ہوکر اپنی نشست کی طرف بڑھنا چاہا تو اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ میں حیران رہ گیا۔ اس نے بڑے چاؤ سے کہا" آؤ میں تم کو اپنا گھر دکھاؤں۔ تم خوش ہو جاؤ گے۔"

میں انکار نہ کر پایا اور اس کے ساتھ ہو لیا۔ اس کے پاؤں راہداریوں اور دو تین کمروں سے ہوکر اپنی خواب گاہ میں آ کر رک گئے۔

اگلی صبح میں نے خود کو آئینے میں دیکھا تو خود کو پہچان نہ پایا۔ میری دائیں آنکھ اپنا رنگ بدل چکی تھی۔ میرے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات بھی بدل گئی تھی۔ میں وہ شخص نہیں رہا تھا جو پچھلی رات ہنستا کھیلتا، پیتا پلاتا بڑھ چڑھ کر پارٹی کے ہنگاموں میں حصہ لے رہا تھا۔ میرے اندر بہت کچھ مر چکا تھا اور مجھے خود سے نفرت ہوئی جا رہی تھی۔

میں شرمسار، ایک گنہگار کی طرح گردن جھکائے اسٹیلا کے برابر کار میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ نہایت اطمینان سے گاڑی چلا رہی تھی اور کار گھر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر، کوئی ردعمل نہ تھا۔ البتہ کن انکھیوں سے مجھے ضرور دیکھ لیتی کہ میں کہاں ہوں، کس حالت میں ہوں۔ لیکن مجھے تو چپ سی لگ گئی تھی۔ حالانکہ میرے اندر طوفان برپا تھا۔ ایک ہی خیال گھوم پھر کر مجھ کو پریشان کر رہا تھا کہ مجھ میں اور ایک جگلو Gigolo یا ایک اسٹڈ Stud میں فرق ہی کیا ہے؟ جو پیسوں کی خاطر اپنا جسم بیچ ڈالتے ہیں۔ لیکن مجھ میں اور ان میں فرق صرف اتنا ہے کہ میں نے پیسوں کی خاطر شب باشی نہیں کی تھی۔ جنسی تجربے کے لالچ میں اپنی راہ سے میں گمراہ ہو گیا تھا۔ کوشش کے باوجود میں خود سے چھٹکارا نہیں پا رہا تھا۔ اسٹیلا نے مجھے بے حد سنجیدہ پایا تو بول اٹھی۔

"اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں... میں تو کب سے تم کو آزاد کر چکی ہوں؟" لیکن میں یکبارگی چلا اٹھا۔"میں آزاد ہونا نہیں چاہتا۔ میں تم سے جڑا رہنا چاہتا ہوں۔"

اس نے ایکسیلریٹر زور سے دبایا تو گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ لیکن میں نہ تو ہوا کے ساتھ تھا، نہ اپنے ساتھ اور نہ ہی اسٹیلا کے ساتھ۔ میں تو بس ایک بے جان سی شے بن کر رہ گیا تھا، جس کی کوئی قیمت، کوئی اوقات نہیں ہوتی۔ میری گردن اپنے آپ اسٹیلا کی طرف اٹھ گئی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں سچ تھا اور سچ بھی اتنا سنگین کہ مزید پوچھنے کی گنجائش ہی نہ ہو۔ لیکن میں باز نہ آیا، پچھتاوے کے ساتھ کہا۔

"ہم کتنے خود غرض ہیں اور موقع پرست بھی... خود ہی اصول بناتے ہیں اور خود ہی توڑ ڈالتے ہیں... کل رات جو بھی ہوا... بہت برا ہوا۔"

یہ سننا تھا کہ اس نے کار کی رفتار اور بڑھا دی۔ منہ اندھیرے شہر کی سنسان سڑکوں پر گاڑی بے تحاشا دوڑنے لگی۔ ایک خطرناک موڑ کاٹ کر اور گاڑی کو سنبھال کر وہ بول اٹھی۔

"اچھا کیا ہے اور برا کیا ہے؟ اس کا جواب کس کے پاس ہے؟ تمہارے پاس...؟ میرے پاس یا وقت کے پاس؟"

"مگر زمانہ اسے ٹھیک نہیں سمجھتا اس کے نزدیک یہ گناہ ہے؟"

"مت بھولو کہ زمانہ ہم سے ہے، ہم زمانے سے نہیں... ہم نہ ہوں تو زمانے کی کوئی اہمیت نہیں۔"

"تمہاری بات میں کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں... مگر ضمیر پر جو بوجھ رہ جاتا ہے، وہ قبر تک ساتھ رہتا ہے۔"

اس نے فوراً بریک لگایا۔ گاڑی سڑک کا سینہ چیرتی ہوئی ایک خطرناک '.' کے ساتھ رک گئی۔ پیڑوں کی شاخوں پر نیم خوابیدہ پرندے اپنا رین بسیرا چھوڑ کر فضا میں اڑنے لگے اور 'چیں چیں' کی آواز سارے میں گونج اٹھی۔ اسٹیلا نے انتہائی پیار سے مجھ کو دیکھ کر احساس دلایا کہ میں ہی اس کی زندگی کا محور ہوں اور اس کی دنیا مجھ سے شروع ہوکر، مجھ پر ہی ختم ہوتی ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سنجیدہ ہو بیٹھی بولی۔

"مت بھولو کہ ضمیر اقدار سے، روایات سے اور اصولوں سے بنتا ہے... لیکن زمانے میں قدریں بدلتی رہتی ہیں... روایتیں مٹ جاتی ہیں اور اصول بدلتے رہتے ہیں... پھر کون سا اصول غلط ہے یا صحیح... اس کا فیصلہ کون کرے گا؟"

"لیکن میں آزاد ہونا نہیں چاہتا۔ تم سے جڑا رہنا چاہتا ہوں... صرف تم سے، ہاں صرف تم سے۔"

وہ نہایت گہری اور با معنی نظروں سے مجھ کو دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ سے بولی۔

"میں خوش ہوں تمہارے فیصلے سے... کل رات میں جو تجربہ میں نے کیا اچھا نہیں تھا... لگا کہ میں اپنی انفرادیت، پاکیزگی اور عزت نفس کھو بیٹھی ہوں... میں نے اپنے ساتھ تم کو بھی گمراہ کیا۔ یہ میری بھول تھی۔"

اچانک منظر فریز ہو گیا تھا۔ لیکن ہمارے دماغ روشن ہو چکے تھے اور وہ اپنی جگہ خوش بھی تھے۔

گاڑی چھلانگیں مارتی گھر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ■■

Jatinder Billu, London , Ph.442087926000

نیاگرا

شہناز خانم عابدی

اس دن موسم بہت خوشگوار تھا۔ آسمان پر ابر چھایا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ وہ کاؤنٹر سے کافی لے رہی تھی۔ میں لے چکا تھا۔ گورا رنگ، گہری نیلی آنکھیں، بھورے بال، گلابی لانگ اسکرٹ اور گلابی ہیٹ میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ میں اس کے نزدیک گیا اور بولا۔

''ہائی''

اس نے نظریں اٹھائیں، ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی۔ اس کو ہی مسکراہٹ کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ اس نے ہلکے سے 'ہائی' کہا یا 'ہائی' کہنے کے انداز میں ہونٹوں کو حرکت دی۔ اس کی آنکھوں میں تعجب تھا۔ نجانے کیوں میرا دل چاہا اس کی جھیل جیسی آنکھوں میں ڈوب جاؤں۔

''مجھے ہیری کہتے ہیں۔ ہیری جیکسن۔'' ہم دونوں ایک ساتھ باہر نکلے۔

''کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟''

''کیتھرین۔ کیتھرین مرفی۔'' اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

شاید وہ حیران ہو رہی تھی کہ میں کیوں اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ پُر وقار چال چلتے ہوئے وہ ساحل کے کنارے بیٹھے ہوئے اپنے لوگوں میں پہنچ گئی۔ پورا ساحل لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ دور دور تک لوگ ہی لوگ نظر آرہے تھے۔ اس موسمِ گرما کا یہ پہلا ویک اینڈ تھا۔ یوں لگتا تھا پورا شہر ساحل پر امنڈ آیا ہے۔ بے شمار مرد، عورت، لڑکے، لڑکیاں، اور بچے پانی کے مزے لوٹ رہے تھے، کشتی رانی ہو رہی تھی، چند ایک نوجوان سرف رائیڈنگ SurfRiding میں مصروف تھے۔ کچھ لوگ چہل قدمی کر رہے تھے، تو کچھ جاگنگ۔ کچھ لوگ کھڑے ہوئے تھے، کچھ بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ لوگ لیٹے تھے۔ بچے ریت کے گھروندے بنانے اور توڑنے میں مصروف تھے۔ قدرے بڑے لڑکے اور لڑکیاں سائیکلیں دوڑا رہے تھے۔ ایک جانب رسیوں سے احاطہ سا بنا ہوا تھا جس کے اندر تیراکی کے لباس میں لڑکیاں بیچ والی بال میچ کھیل رہی تھیں۔

کچھ شوقین مرد اور عورتیں میچ دیکھ رہے تھے۔ ایک صاحبہ اپنے کتے کو لئے دوڑ رہی تھیں۔ دو ایک کتے اپنے مالکوں کے ساتھ ساحل کی تفریح میں مصروف تھے۔ کچھ لوگ کرسیاں رکھ کر ساحل کے نزدیک بیٹھے ہوئے تھے۔ ساحل کے اکلوتے ریسٹورنٹ میں بھی کافی گہما گہمی تھی۔ بہت سے لوگ ساحلِ سمندر پر کھانے پینے کا لطف اٹھا رہے تھے۔

اس گہما گہمی اور شور و پکار میں وہ مجھے سب سے جدا، سب سے الگ لگی۔ میں اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی بات کرتا اس نے کہا'' ہماری فیملی میں لڑکیاں اجنبی لڑکوں سے بات نہیں کرتی ہیں اور نہ ہی ملتی ہیں''

''او۔'' میرے منہ سے ایک دم نکلا۔ کیونکہ میرے لئے یہ بات بڑی عجیب تھی۔ پھر میں نے دیکھا اس فیملی کی لڑکیاں علیحدہ بیٹھی تھیں اور لڑکے علیحدہ۔ تھوڑی بڑی عمر کے لوگ علیحدہ ایک جگہ بیٹھے تھے، کچھ گپ شپ کر رہے تھے، کچھ تاش کھیل رہے تھے، اور کچھ شطرنج میں مصروف تھے۔ اتنے میں کیتھرین کا بھائی جارج آیا شاید اس نے مجھے اس کے نزدیک بیٹھے دیکھ لیا تھا۔

''کیتھرین تم یہاں کیا کر رہی ہو تمہیں موم بلا رہی ہیں۔'' جارج کیتھرین کو مجھ سے دور کرنے کے لئے بولا اور وہ فوراً کھڑی ہوگئی میں جارج کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا'' ہیری جیکسن۔''

جارج نے مجھے غور سے دیکھا۔ تھوڑے توقف کے بعد اس نے ہاتھ بڑھایا اور بولا۔ ''جارج مرفی''۔ جارج وہیں میرے قریب بیٹھ گیا اور ہم دونوں باتیں کرنے لگے۔ پھر اس نے مجھے اپنے خاندان کے کچھ اور لوگوں سے ملوایا۔ رات تک میں ان لوگوں کے ساتھ ہی رہا۔ مگر کیتھرین سے میری بات نہ ہوسکی۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ سبھی لوگ بہت تھک گئے تھے۔ پورا دن ساحل پر گزارنے کے بعد آہستہ آہستہ لوگ اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو

رہے تھے۔ اب اتنا ہجوم بھی نہیں رہا تھا۔ کیتھرین کی پوری فیملی سے میری اچھی خاصی جان پہچان ہو چکی تھی۔ ہم سب لوگ اپنی گاڑیوں کی طرف جا رہے تھے۔ پارکنگ ایریا وہاں سے کافی فاصلے پر تھا۔ کیتھرین اپنی ماں اور بہن (این) کے ساتھ چل رہی تھی۔ میں اس کے دونوں بھائیوں جارج اور رابرٹ کے ساتھ تھا لیکن میری نظریں بار بار کیتھرین کا تعاقب کر رہی تھیں۔ ایک دفعہ کیتھرین نے بھی میری طرف دیکھا، مجھ سے نظریں ملتے ہی اس نے جھینپ کر دوسری طرف نگاہ کر لی۔

میں گاڑی چلا رہا تھا لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں خود کو کیتھرین کے پاس چھوڑ آیا ہوں۔ گھر پہنچتے پہنچتے بہت دیر ہو گئی تھی۔ بھوک بھی نہیں تھی جیسے تیسے لباس تبدیل کر کے لیٹ گیا۔ صبح دیر سے آنکھ کھلی وہ بھی اس طرح کہ میرا ایک دوست آ دھمکا۔ وہ مجھے ریسٹورنٹ لے گیا وہاں ہم دونوں نے برنچ کیا۔ پھر وہ مووی پر چلنے کی ضد کرنے لگا۔ اگرچہ میرا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا مگر اس کی خاطر جانا پڑا۔ مووی چل رہی تھی مگر میں کہیں اور تھا...

میں سوچنے لگا یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ زندگی میں بہت سی لڑکیاں آئیں مگر میں کبھی کسی لڑکی سے متاثر نہیں ہوا۔ آخر کیتھرین میں ایسی کیا بات ہے کہ اس کا تصور، اس کا خیال، میرے ذہن و دل پر چھایا ہوا ہے۔ میرے دوست نے بھی میری طبیعت کی تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا شاید میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس نے مجھے گھر پر چھوڑا اور آرام کرنے کے لئے کہہ کر چلا گیا۔ صبح جاب پر جانا تھا۔ جلدی سونے کی کوشش کی۔ مگر نیند تو جیسے کوسوں دور تھی۔۔۔ نہ جانے کب آنکھ لگی۔ صبح ہڑبڑا کر اٹھا، آٹھ بج رہے تھے، رات الارم لگانا بھی بھول گیا تھا۔ جلدی سے تیار ہو کر آفس بھاگا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ مجھے آفس کے کام سے پندرہ دن کے لئے فوری طور پر مشی گن جانا ہے۔ آفس سے گھر پہنچا۔ ضروری سامان پیک کیا اور مشی گن کے لئے روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچتے ہی کام میں بری طرح مصروف ہو گیا۔

مشی گن سے واپسی پر میں بہت خوش تھا۔ میرے ذمہ جو کام تھا وہ خوش اسلوبی سے ختم ہوا تھا۔ میں یہ سوچ کر بھی خوش ہو رہا تھا کہ شکاگو پہنچ کر کیتھرین سے ملوں گا... مگر کیسے...؟ میرے پاس تو ان لوگوں کا پتہ بھی نہیں تھا۔ اچانک یاد آیا جارج نے مجھے اپنا کارڈ دیا تھا جس میں اس کے گھر کا فون نمبر بھی تھا۔ کارڈ کہاں ہو سکتا ہے...؟ میں نے اپنے ذہن پر زور دیا۔ میں نے گاڑی کی رفتار کم کر دی۔ ٹریفک جیسے تھا ہی نہیں۔ دور دور تک کوئی گاڑی نہیں تھی۔ میں نے اپنا پرس نکالا، کارڈ پرس میں سے جھانکنے لگا۔ میری خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ گھر پہنچ کر فون کرنے سے بمشکل اپنے آپ کو روکا کیونکہ رات زیادہ ہو گئی تھی۔ دوسرے دن جاب سے آتے ہی میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ جارج کا نمبر ملایا۔

''ہلو'' دوسری طرف سے نسوانی آواز آئی

''میں ہیری جیکسن بول رہا ہوں، جارج کا دوست۔ آپ کون...؟'' میں نے ایک ہی سانس میں سب کہہ ڈالا۔

''جی میں کیتھرین بول رہی ہوں۔'' دوسری طرف سے آواز آئی ''بھائی گھر پر نہیں ہیں'' تھوڑے توقف کے بعد کیتھرین بولی۔

''کیا میں تم سے بات کر سکتا ہوں۔'' میں نے کہا

''جی۔'' اس کی ہلکی سی آواز آئی۔

''کیتھرین میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ تم سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت بھی خدا نے میری سن لی۔ میں تم ہی سے بات کرنا چاہتا تھا۔''

''یہ ناممکن ہے ہماری کمیونٹی میں لڑکیاں غیر مردوں سے ملتی جلتی نہیں ہیں... میں بھائی کو بتا دوں گی کہ آپ نے کال کی تھی۔'' اس نے کہا اور پھر ''بائی'' کہہ کر فون رکھ دیا۔

رات میں جارج کا فون آیا۔ اس سے بہت ساری باتیں ہوئیں۔ اس نے ملنے کے لئے کہا اور یہ طے ہوا کہ میں ہفتے کی رات ڈنر اس کے گھر کروں۔ مارے خوشی کے میرا دل حلق میں آ گیا۔ لیکن جارج پر میں نے ظاہر ہونے نہیں دیا۔ اور ہفتہ کی رات کا وعدہ کر لیا۔

''آج بدھ ہے ابھی تو پورے تین دن باقی ہیں۔'' میں نے سوچا۔ یہ تین دن تین سال کی طرح گزرے۔ خدا خدا کر کے ہفتے کا دن آیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد میں اس جگہ پہنچا جہاں سے یہ آبادی شروع ہوتی تھی۔ درختوں میں گھرے بڑے بڑے مکانات۔ جس طرف نظر ڈالو خوبصورت پھول پودے۔ لان ایسے جیسے سبز قالین۔ جگہ جگہ چشمے، چھوٹے چھوٹے آبشار۔ تھوڑی دیر تک تو میں اس علاقے کی خوبصورتی میں کھو گیا۔ پھر مجھے خیال آیا مجھے گھر تلاش کرنا ہے۔ زیادہ وقت نہیں ہوئی۔ دو تین گلیوں کے بعد مجھے وہ مکان نظر آ گیا۔ گھر پر خوبصورت تختی لگی ہوئی تھی جس پر لکھا تھا 'جوزف مرفی لیگل کنسلٹینٹ'۔ مکان کا نمبر وہی تھا جو جارج نے بتایا تھا۔ میں نے بیل بجائی، دروازے پر جارج ہی آیا۔ وہ مجھے اندر لے گیا، لونگ روم میں بٹھایا۔ وہاں پر رابرٹ (جارج کا چھوٹا بھائی) اور جارج کے والد مسٹر جوزف بھی موجود تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

''گھر تلاش کرنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوئی۔''

اس علاقے کی عورتوں کا لباس ایسا ہوتا جس سے پورا جسم ڈھک جائے۔ زیادہ تر لمبے اسکرٹ ان کا لباس ہوتے۔ جب یہ باہر نکلتیں تو ان کے بال ڈھکے ہوئے ہوتے تھے۔ بڑوں کا ادب، چھوٹوں سے محبت۔ اٹھنے بیٹھنے میں، کھانے، پینے میں تہذیب اور اخلاق...

میں یہ سب دیکھ کر بہت حیران تھا کہ یہ لوگ کون ہیں...؟

"بہت زیادہ نہیں۔" مسکراتے ہوئے کہا۔

کافی دیر تک گپ شپ کے بعد ہم لوگ ڈائننگ روم میں پہنچے۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ کھانے کی میز پر گھر کے سارے لوگ موجود تھے۔ ورنہ میں تو سوچ رہا تھا کہ آج کا آنا تو بے کار ہی جائے گا۔ کھانے کے دوران بھی باتیں ہوتی رہیں۔ سب ہی باتوں میں حصہ لے رہے تھے۔ یہاں تک کہ کیتھرین کی نانی ہیلری جانسن بھی بول رہی تھیں۔ کیتھرین نے بھی گفتگو میں حصہ لیا لیکن بہت کم۔ اس کی بڑی بہن این بہت بول رہی تھی۔ میری نگاہیں بار بار کیتھرین پر جا کر ٹک جاتیں۔ وہ مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے نروس ہو جاتی۔ پورا وقت میں یہی سوچتا رہا کہ کیتھرین سے مل کر کیسے اپنے دل کی بات کہوں۔

میں اس وقت لونگ روم میں تنہا بیٹھا تھا کہ سامنے راہداری سے کیتھرین کو گزرتے ہوئے دیکھ کر میں تیزی سے اٹھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" میں نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔

"اگر کسی نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو میری شامت آجائے گی۔" اس نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ جب تک تم میری بات نہیں سنو گی۔" میں نے کہا۔

"کل میرے اسکول کے گیٹ پر دو بجے۔" یہ کہہ کر وہ بھاگ گئی۔

دوسرے دن وہ اپنی دوست حنا کے ساتھ گیٹ پر موجود تھی۔ میں گاڑی نزدیک لے گیا۔ وہ اپنی دوست کے ساتھ گاڑی میں پیچھے بیٹھ گئی۔ تھوڑی دور ایک پارک تھا اس کے نزدیک گاڑی روکی اور ہم لوگ پارک میں گئے۔

حنا نے ہم کو تنہا چھوڑ دیا اور خود تھوڑی دور جا کر بنچ پر بیٹھ گئی۔

"بولئے کیا بات ہے۔" کیتھرین نے معصومیت اور شوخی سے کہا۔

"مجھے اس قسم کی باتیں کرنی نہیں آتیں اس لئے میں تم سے صاف صاف کہوں گا... تم ہر وقت میرے سامنے رہتی ہو اور میں بہت ڈسٹرب ہوتا ہوں۔" اتنا کہہ کر میں رکا۔ ایک نظر اس کی جانب ڈالی۔ وہ اپنی ہتھیلی کو دیکھ رہی تھی۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے اپنی نظریں اٹھائیں۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھیں ایک دم سے جادوئی ہو گئیں۔ اس کی پتلیوں میں نیلی روشنیاں چمک اٹھیں۔ میں نے ان نیلاہٹوں میں جھانکتے ہوئے اپنی بات پوری کی۔

"جب سے تمہیں دیکھا ہے، سمجھ میں نہیں آتا مجھے کیا ہو گیا ہے...؟"

میری دوبارہ خاموشی نے اسے بولنے پر مجبور کر دیا

"تو میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں..."؟ اس نے سادگی اور بھولے پن سے کہا۔

"میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" میں ایک دم بول گیا۔

میرے اس اظہار مدعا سے اس کے ہونٹ کانپنے لگے جیسے وہ بولنے کے لئے الفاظ ڈھونڈھ رہی ہو۔

"ہمارے گھر میں یہ فیصلے والدین کرتے ہیں۔" اس نے ایک بار پھر ہتھیلی پر نظریں جما کر کہا۔

پھر ہم نجانے کیا کیا باتیں کرتے رہے، وقت کا ہوش ہی نہیں رہا۔ حنا نے نزدیک آ کر کہا۔ "چار بجے بس آجائے گی۔"

دل تو نہیں چاہ رہا تھا مجبوراً ہم لوگوں کو چلنا پڑا۔

وقت گزرتا رہا۔ میرا کیتھرین کے گھر آنا جانا جاری رہا۔ اس کے دونوں بھائیوں جارج اور رابرٹ سے میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ کھانا ہم لوگ اکثر ساتھ ہی کھاتے اس کے بعد عورتیں فیملی روم میں اور مرد لونگ روم میں... اس سے پہلے میں نے اس طرح کی پابندیاں کہیں نہیں دیکھی تھیں۔ یہ پورا علاقہ ایسے ہی رسم و رواج رکھنے والے لوگوں کا تھا۔ کیتھرین نے اسے بتایا تھا کہ اس پورے علاقے میں ایک گھر بھی کسی اور کا نہیں ملے گا سوائے ہمارے لوگوں کے۔

اس علاقے کی عورتوں کا لباس ایسا ہوتا جس سے پورا جسم ڈھک جائے۔ زیادہ تر لمبے اسکرٹ ان کا لباس ہوتے۔ جب یہ باہر نکلتیں تو ان کے بال ڈھکے ہوئے ہوتے تھے۔ بڑوں کا ادب، چھوٹوں سے محبت۔ اٹھنے بیٹھنے میں، کھانے، پینے میں تہذیب اور اخلاق...

میں یہ سب دیکھ کر بہت حیران تھا کہ یہ لوگ کون ہیں...؟

اتنی پابندیوں کے باوجود میں اکثر کیتھرین سے تھوڑی بہت بات کرنے کا موقعہ نکال لیتا۔ اور کبھی یوں بھی ہوتا کیتھرین مجھے اپنی دوست حنا کے گھر بلا لیتی اور مختصر مختصر ملاقاتیں چرالی جاتیں۔ کیتھرین دوست بنانے میں بہت کنجوس تھی۔ اس کی صرف ایک ہی دوست تھی، حنا۔ وہ ایک مسلم لڑکی تھی اور بہت اچھی فیملی سے اس کا تعلق تھا۔ حنا اور کیتھرین کی فیملی میں خاندانی مراسم تھے۔ ہر تقریب میں دونوں خاندان ضرور اکٹھا ہوتے۔ کیتھرین کی وجہ سے حنا کے سارے گھر والے مجھ سے اچھی طرح واقف ہو گئے تھے، بلکہ میری حیثیت اس گھر کے ایک فرد جیسی تھی۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ حنا اور کیتھرین کے اسکول کی تعلیم کا سلسلہ ختم ہوا اور انھی دنوں این کی شادی بھی ہو گئی۔ شادی میں مجھ کو بھی دعوت نامہ دیا گیا تھا۔ اس سے مجھے دوہری خوشی ہوئی۔ ایک، اس چھوت چھات والے خاندان میں میری باعزت رسائی اور دوسرے یہ کہ این کی شادی سے کیتھرین کی شادی کے لئے راستہ کھلا تھا۔ کیتھرین نے مجھے بتایا تھا ''جب تک این کی شادی نہیں ہو جاتی میری شادی کے متعلق سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ ہمارے یہاں بڑی بیٹی کی شادی پہلے ہوتی ہے۔''

کیتھرین ماں کے کاموں میں ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ اس کی تعلیم ختم کر دی گئی تھی۔ حنا کے گھر والوں نے اسے یونیورسٹی میں داخلہ دلوا دیا تھا۔ ہمارے ملنے میں اب بڑی رکاوٹیں تھیں۔ ایک طویل وقفے کے بعد ہم نے ایک ملاقات چرالی۔ حنا کی مہربانی سے... میں آپے سے باہر ہو گیا میں نے کیتھرین کو لپٹا لیا، اس نے بھی جیسے اپنے آپ کو میرے سپرد کر دیا۔ حنا نے سپردگی کے اس لمحے کو اس طرح طول دیا کہ کچھ دیر کے لئے وہ لونگ روم سے اندر کی طرف چلی گئی، ہم دونوں کے لئے جوس لانے کے بہانے... اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر میں نے کیتھرین سے کہا۔ ''اب تو این کی شادی ہو گئی میں تمہارے والدین سے اپنی اور تمہاری شادی کی بات کرتا ہوں۔'' کیتھرین نے ''ہاں'' میں گردن ہلائی۔

دوسرے دن میں جارج سے ریسٹورنٹ میں ملا اور اس سے بولا۔

''جارج تم میرے دوست ہو اس معاملے میں تم ہی میری مدد کر سکتے ہو ...میں اور کیتھرین ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

جارج نے میری طرف دیکھا پھر تھوڑے توقف کے بعد بولا۔

''ہیری ہم لوگ شادی بیاہ صرف اپنی کمیونٹی کے اندر ہی کرتے ہیں۔ پھر بھی میں موم اور ڈیڈ سے بات کروں گا۔''

اور پھر جو کچھ ہوا وہ ہماری توقع کے بالکل خلاف... کیتھرین کو شاید اس کا اندازہ تھا مگر مجھ کو نہیں۔ جارج نے مجھے بتایا۔

''ہیری میں نے بہت کوشش کی موم اور ڈیڈ کو بہت سمجھایا لیکن وہ نہیں مانے۔ ایک تو تم ہماری کمیونٹی سے باہر ہو، دوسرے تمہارا فیملی بیک گراؤنڈ۔''

جارج یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

میں نے ہی تو ان کو بتایا تھا کہ جب میں چار سال کا تھا تو میرے موم ڈیڈ علیحدہ ہو گئے تھے اور پھر دونوں نے علیحدہ علیحدہ شادیاں کر لی تھیں۔ میں کبھی موم کے پاس رہتا تھا اور کبھی ڈیڈ کے پاس... میری سوتیلی ماں کو بھی میرا رہنا پسند نہیں تھا اور میرا سوتیلا باپ بھی نہیں چاہتا تھا کہ میں اس کے گھر رہوں۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے ہائی اسکول کے بعد گھر چھوڑ دیا تھا۔ جو کچھ بھی میں تھا اور جیسا بھی تھا خود تشکیل کردہ (Self made) تھا۔

جارج کے جواب نے میرا دل توڑ دیا تھا۔ وہ میرے دل کی حالت سمجھ رہا تھا۔ اس نے مجھے دلاسہ دیا۔ ''تم بہت اچھے لڑکے ہو تمہیں کیتھرین سے اچھی لڑکی مل جائے گی...'' وغیرہ وغیرہ... لیکن میں تو جیسے ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر وہ اٹھا محبت سے اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور خاموشی سے چلا گیا۔ میں بھی اس وقت تنہا رہنا چاہتا تھا۔ جارج کے جانے کے بعد میں نے یہ بات فون پر کیتھرین کو بتائی۔ وہ ایک دم خاموش ہو گئی... شاید رو رہی تھی پھر اس کی سسکیاں صاف سنائی دیں اور فون بند ہو گیا۔ سنا تو میں نے بھی تھا Calvinist کیلوینسٹ لوگ سب سے الگ تھلگ سوچ رکھنے والے ہوتے ہیں، اب دیکھ بھی لیا۔

میں نے حنا سے مدد چاہی... دو تین دن خاموشی سے گزر گئے۔ میں بہت بے چین تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں...

ایک ہفتے کے بعد حنا کا فون آیا۔ اس نے کہا کہ اس شام کیتھرین کو اس نے اپنے گھر بلایا ہے میں وہیں پہنچ جاؤں۔

کیتھرین مجھ سے لپٹ کر بہت روئی... اس نے بتایا کہ اس کے گھر والوں نے اس کی بات آئن (Ian) سے طے کر دی ہے۔ اور بہت جلد کسی تاریخ کا فیصلہ کر کے اس کی منگنی ہو جائیگی۔ آئن انھی کی کمیونٹی کا تھا۔ میں اس سے این کی شادی میں ملا بھی تھا۔ بہت اچھا لڑکا تھا۔ حال ہی میں اس نے اپنی تعلیم ختم کی تھی۔ میری اس سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔

تھوڑی دیر ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے... کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا... پھر میں نے کیتھرین سے کہا۔

''ہمارے سامنے ایک ہی راستہ ہے۔ کیتھی تم میرے ساتھ نکل چلو...''

اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا... پھر شاید اس کی سمجھ میں آ گیا۔

حنا نے ہمارے اس طرح بھاگنے کی مخالفت کی... لیکن پھر وہ خاموش ہو گئی۔ کیونکہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ ہی نہ تھا۔

میں نے جاب چھوڑی، اپارٹمنٹ چھوڑا اور ایک رات ہم شکاگو سے ڈیٹرائٹDetroid کی طرف چل دیئے۔ میرے کہنے کے مطابق کیتھرین نے اپنے چار جوڑے کپڑے، اسناد، اور ضروری کاغذات ساتھ لئے۔ کوئی قیمتی چیز یا زیور وغیرہ نہیں لیا سوائے اس کے نام کے لاکٹ کے جو اس کی خوبصورت گردن میں ہر وقت جھلملاتا رہتا تھا۔ یہ لاکٹ اس کے موم ڈیڈ نے اس کی ایک سالگرہ پر اس کو دیا تھا۔ جب ہم ہوٹل پہنچے تو ہم دونوں بہت تھکے ہوئے تھے... سو گئے... سو کر اٹھے نہا دھو کر نیچے ہال میں آئے۔ برنچ کیا اور فوراً چرچ گئے۔ اس چرچ سے ہم کو صحیح جواب نہیں ملا۔ البتہ دوسرے چرچ میں انتہائی سادہ طریقے سے ہم نے شادی کر لی۔ اس سے قبل ہم قانونی شادی کی شرط سے فراغت حاصل کر چکے تھے۔ کیتھرین اس تمام دوران زیادہ تر خاموش ہی رہی۔ میں نے اس سے کہا بھی کہ "اگر تمہیں ایسا لگتا ہے کہ یہ ہمارا غلط فیصلہ ہے تو ہم واپس چلتے ہیں۔ تمہارے والدین سے معافی مانگ لیں گے..." مگر اس نے انکار کر دیا۔

شادی کے بعد فادر نے ہماری اچھی زندگی کے لئے دعائیں کیں اور ہم دونوں کے سر پر ہاتھ رکھا تو کیتھرین رو پڑی۔ میں سمجھ سکتا تھا اس وقت اس کے جذبات کیا ہوں گے... اسے اپنے گھر کے سبھی لوگ بے حد یاد آ رہے ہوں گے۔ خاص طور پر موم اور ڈیڈ۔ میں نے اس کے لئے دلہن کا ڈریس، ایک چھوٹا سا گولڈ کا سیٹ اور ایک ڈائمنڈ رنگ خریدی تھی۔ لباسِ عروسی میں وہ آسمان سے اتری ہوئی کوئی حور لگ رہی تھی۔ میں اس پر دوبارہ عاشق ہو گیا ... ہم دونوں نے خاوند اور بیوی کے طور پر حلف اور عہد کے الفاظ ادا کئے۔ پھر فادر کے کہنے پر میں نے کیتھرین کا پہلا بوسہ لیا۔ وہ بوسہ اب بھی میرے ہونٹوں پر تازہ ہے...

رات کو ہم دونوں نے ڈنر کیا۔ کوئی اور جاننے والا تو تھا نہیں جو ہمارے ساتھ ڈنر میں شریک ہوتا... بس ہم دونوں ہی تھے۔ سامنے کی ٹیبل پر ایک عمر رسیدہ جوڑا بیٹھا تھا وہ ہمارے پاس آیا اور اس نے ہمیں مبارکباد دی۔ ہم نے ان سے کہا وہ ہمارے ساتھ ڈنر میں شریک ہوں... وہ راضی ہو گئے۔ دونوں میاں بیوی بہت خوش مزاج تھے۔ خوب گپ شپ ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ دونوں میں سے کسی نے بھی کوئی پرسنل بات نہیں کی۔ البتہ چلتے وقت دونوں نے کیتھی کو باری باری لپٹایا اور دعائیں دیں۔

میں نے جاب کی تلاش شروع کر دی اور فوری گزارے کے لیے ایک گیس اسٹیشن کے اسٹور میں جاب کر لی۔ رات کی جاب تھی جو ایک نئے شادی شدہ جوڑے کے لئے ناپسندیدہ ہونی ہی تھی۔ لیکن اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ میں دن میں اپنے فیلڈ کی جاب تلاش کرنے کے لئے آزاد تھا۔ ہوٹل کے کمر توڑ خرچ سے بچنے کے لئے گیس اسٹیشن کے نزدیک ہی ایک کمرے کا اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیا۔

اس چھوٹے سے اپارٹمنٹ سے ہماری نئی شادی شدہ زندگی کا آغاز ہوا۔ ہم دونوں بہت خوش تھے۔ کیتھی نے اس چھوٹے سے اپارٹمنٹ کو بہت خوبصورت طریقے سے سجایا تھا۔ جب میں جاب سے اس چھوٹے سے خوبصورت گھر میں آتا، کیتھی کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا کھاتا، اس کی محبت بھری باتیں سنتا، اس کی نیلی سمندر جیسی گہری آنکھوں میں چراغ جھلملاتے دیکھتا تو سوچتا... جنت شاید یہی ہے...

کبھی کبھی کیتھی بہت دکھی سی ہو جاتی تھی۔ شاید اس کو اپنی موم کی یاد ستاتی ہو... یا پھر ڈیڈ کو صدمہ پہنچانے کی کھٹک... وہ ایک باضمیر اور حساس ہستی تھی۔ میرا دل اس کے لئے احساسِ جرم کا بوجھ اٹھائے پھرتا تھا۔ یہ میں ہی تھا جس نے اس کو اس کے خاندان سے کاٹ دیا تھا۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ بہت جلد اس کو ایک خوبصورت سا بڑا سا گھر لے کر دے دوں، دنیا کا سارا عیش اس کے قدموں میں ڈال دوں۔ ہم دونوں اگرچہ پریشانی کی زندگی گزار رہے تھے لیکن پھر بھی بہت خوش تھے۔ کیتھرین کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی بے حد خوش ہو جاتی تھی۔ اس نے مجھے کبھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ اپنی عیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر میرے ساتھ تکلیف کی زندگی گزار رہی ہے۔ اس کی کمیونٹی میں عورتیں جاب نہیں کرتیں۔ لیکن اس نے میرا حوصلہ بڑھانے کے لئے خود جاب کرنے کی پیشکش کی۔ میں نے مسکرا کر ٹال دیا۔ جلد ہی مونٹریال سے ایک جاب کا آفر آیا۔ انٹرویو سے قبل ہم لوگ ٹورانٹو گئے۔ وہاں نیاگرا فال کے ایک موٹیل میں قیام کیا۔ یہاں سے فال بالکل صاف نظر آتا تھا۔ کیتھرین فال دیکھ کر بچوں کی طرح خوشی سے اچھلنے لگی۔

یہاں پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہر قسم کے لوگ۔ ہر قوم کے لوگ۔ مختلف رنگ و نسل کے لوگ۔ مختلف ملکوں کے لوگ۔ لوگ ہی لوگ۔ سیاح۔ مقامی۔ طرح طرح کے لباسوں میں ملبوس۔ کچھ جیسے بے لباس۔ سب اپنے اپنے طریقے سے جینے کے مزے لوٹ رہے تھے۔ گھوم پھر رہے تھے۔ جب چلتے چلتے تھک جاتے تو بیٹھ جاتے، پھر چلنے لگتے۔ ہم دونوں بھی گھوم رہے تھے۔ ہم نے آئس کریم کھائی، ایک ہوٹل میں ناشتہ کیا۔ اس ہوٹل میں ناشتہ صبح سے

دوپہر تک ملتا تھا۔ ناشتہ کر کے ہم فال کی طرف روانہ ہوئے۔

نیاگرا سے میرا پہلی بار سامنا نہیں ہوا تھا۔ لیکن کیتھی نے اس سے قبل نیاگرا اپنی موم کی گود میں دیکھا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد کیتھی نے پہلی مرتبہ نیاگرا کو اپنے مقابل پایا۔ پانی کی بوندوں کی بوچھاڑ سے اس کا چہرہ بھیگ گیا۔ پانی اس کی آنکھوں میں بھی بار بار جا رہا تھا اور آنکھوں کو ہاتھ سے صاف کرنے کی ضرورت پڑ رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''کیتھی ڈارلنگ آنکھوں کو بھیگی رہنے دو اور دیکھو ہمارے سامنے نیاگرا کھڑا ہے۔ بہتے اور گرتے پانی کی بڑی سی چادر لئے... عظیم نیاگرا... وسیع و عریض نیاگرا... ایک زندہ اور متحرک وجود جو اوپر آسمان اور نیچے چٹانوں سے بنی ہوئی زمین پر ایک جانب سے دوسری جانب تک پھیلا ہوا ہے...'' میرے الفاظ پتہ نہیں اس کے کانوں میں جا رہے تھے یا وہ نیاگرا فال کی آواز سن رہی تھی...

نیاگرا کی اپنی ایک آواز تھی... ایسی آواز جو سماعتوں کے لئے نہیں ہوتی بلکہ وجودوں کے لیے ہوتی ہے... ایک وجود سے دوسرے وجودوں میں داخل ہو کر ان کو اپنی لپیٹ میں لینے والی... ان کے اندر گردش کرنے والی... اس آواز سے ہم رشتہ آواز جو تخلیق کائنات کا آغاز کر کے ختم نہیں ہوتی بلکہ زمان و مکان کی ہر چھوٹی بڑی اکائی میں موجود ہے... دراز سے دراز تر... وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی ہے... میں نے کیتھی کو، کیتھی کے سارے وجود کو، نیاگرا کے وجود سے ہم آہنگ ہوتے دیکھا۔ ساتھ ہی مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ نیاگرا پہلی بار مجھے دکھائی بھی دیا اور سنائی بھی دیا... کیتھی کے وجود کے ذریعہ۔

اور جب ہم دونوں نے ایک ساتھ سَت رنگی دھنک کی کمان پر نظر ڈالی جس کی جانب ساری دیکھنے والی آنکھیں انگلیوں سے اشارہ کر کے دیکھ رہی تھیں اور اپنے ساتھیوں اور پیاروں کو دکھا رہی تھیں تو شاید ہم دونوں کو ایک سا احساس ہوا... خالق کے جلال سے جمال کا احساس... ذہن اور روح کو ہلکا کرنے والا... طفلانہ حیرانی کا... معصوم مسرت اور طمانیت کا احساس۔

دوسرا دن ہم نے لیک شور Lakeshore میں اس جگہ گزارا جہاں ہسکروں Huskers نے میلہ لگا رکھا تھا۔ وہاں ٹکٹ وغیرہ کی جھنجھ نہیں تھی۔ ہر شو کے بعد ہیٹ کو چکر دلواتے اور لوگ اس ہیٹ میں پیسے پھینک دیتے۔ وہاں لوگوں کا زبردست ہجوم تھا... شانے سے شانہ چھلتا تھا۔ کیتھرین نے وہاں سے اپنے لئے ایک ہیٹ خریدا اور میرے لئے ٹائی پن اور کفلنگ کا ایک سیٹ لیا۔ پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ایک ہیومن اسٹیچو کے سامنے لے گئی۔ ایک جوان خوبصورت عورت، وشنگ فیئری، کیسینڈرا Cassandra کا

نیاگرا کی اپنی ایک آواز تھی... ایسی آواز جو سماعتوں کے لئے نہیں ہوتی بلکہ وجودوں کے لیے ہوتی ہے... ایک وجود سے دوسرے وجودوں میں داخل ہو کر ان کو اپنی لپیٹ میں لینے والی... ان کے اندر گردش کرنے والی... جو زمان و مکان کی ہر چھوٹی بڑی اکائی میں موجود ہے...

مجسمہ بنی بیٹھی تھی۔

'' تم بھی کوئی خواہش Wish کرو۔ ضرور تمہاری خواہش پوری ہوگی۔'' کیتھرین بولی۔

میں نے آنکھ بند کر کے دعا کی، میرے بعد کیتھی نے دعا کی۔

''کیا مانگا؟'' کیتھی نے پوچھا

''تمہاری خوشیاں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اور تم نے؟'' میں نے کہا۔

''تمہاری خوشیاں، تمہارا ساتھ...'' اس نے جواب دیا۔

میں نے محبت سے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

ہوٹل پہنچے تو کافی رات ہو چکی تھی۔ اور ہم تھک بھی بہت گئے تھے۔ لیٹتے ہی سو گئے۔

صبح آنکھ دیر سے کھلی۔ ناشتہ کرتے ہی ہم مونٹریال کے لئے نکل گئے۔ دوسرے دن میرا انٹرویو تھا۔

انٹرویو بہت کامیاب رہا... ایک ہفتے کے بعد مجھے جوائن کرنا تھا۔ ہم دونوں مونٹریال میں گھومتے رہے خاص طور پر پورٹ کا علاقہ اور قدیم شہر... سترہویں سے لے کر انیسویں صدی کے فن تعمیر کی یادگار عمارتیں... اور پرانی وضع کی اینٹوں سے بنی ہوئی سڑکیں... آج کی دنیا میں رہتے ہوئے پرانی دنیا میں سانس لینے کا احساس... مونٹریال قدیم انگلینڈ اور خاص طور پر فرانس کی بازیافت کا شہر... ہم دونوں تاریخ کی کتاب کے اوراق الٹے بغیر تاریخ کا مطالعہ بلکہ مشاہدہ کر رہے تھے۔ شاید ہم اس بازیافت میں گم سے ہو گئے تھے۔

اس نے کہا یہ وہی شہر ہے جس میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان فیصلہ کن جنگ ہوئی تھی اور انگریزوں کو کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ ہم دونوں کو یہ شہر راس آیا یا شاید اس شہر کو ہم پسند آئے تھے۔ یہ شہر ان لوگوں کو کھلے دل

سے قبول کرتا ہے جو فرانسیسی زبان بول سکتے ہوں، یا بولنے کی کوشش کرتے ہوں۔ ہم دونوں گھر سے باہر فرنچ بولنے لگے۔ کچھ عرصہ مونٹریال میں ایک اپارٹمنٹ میں رہے اس کے بعد میں نے ایک ایسے گھر کی تلاش شروع کر دی جو کیتھی کے شکاگو کے گھر سے زیادہ سے زیادہ مشابہہ ہو۔ شومیڈی لاوال Chomedy laval میں ہمیں ایک ایسا ہی گھر مل گیا... بڑا سا... کھلا کھلا... بڑا سا خوبصورت بیک یارڈ... سامنے پھول پودوں سے ڈھکا ہوا ہرا بھرا لان۔ پڑوسی ملن سار تھے۔ یہ ایک نئی آبادی تھی، بے حد صاف ستھری۔ یہ سوسائٹی جدید طرز میں پلان کی گئی تھی... ایک دائرے کے اندر۔ بالآخر کیوبک نے ہم بے گھروں کو گود لے لیا تھا۔ ہم جلد ہی گھر والے ہی نہیں بلکہ خاندان والے بن گئے۔ البتہ ایک کانٹا ابھی تک کھٹک رہا تھا۔ ہم کیتھرین کے خاندان سے ابھی تک روابط استوار کرنے میں ناکام رہے تھے۔ پھر بھی ہم اپنے دو بچوں پال اور میری کے ساتھ بہت خوش تھے۔ کیتھرین بچوں اور گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی۔ ویک اینڈ پر ہم گھومنے پھرنے نکل جاتے۔ یہاں ہمارے دوستوں کا اچھا خاصا حلقہ بن گیا تھا۔

حنا (کیتھی کی دوست) سے ہمارا رابطہ تھا۔ اس کی شادی ہو چکی تھی اور وہ شکاگو ہی میں رہ رہی تھی۔ اپنے شوہر کے ساتھ وہ اکثر چھٹیوں میں ہمارے گھر آجاتی۔ کیتھرین کی بہن این لندن میں رہتی تھی۔ اس کا شوہر ان ہی کی کمیونٹی سے تھا۔ اس لئے اس نے این کو کیتھرین سے تعلقات رکھنے سے منع کر رکھا تھا۔ لیکن پھر بھی ہر سال این کرسمس پر اپنے شوہر سے چھپ کر کیتھرین کو ضرور فون کرتی۔ کیتھرین نے اپنی نانی کی وفات کی خبر ملنے پر بہت سوگ منایا تھا... حنا نے بتایا تھا کہ مرتے وقت کیتھرین کو اس کی نانی نے بہت یاد کیا تھا۔ وہ ملنے کے لئے بھی بہت تڑپتی رہی تھیں... جارج سے میری دوستی قائم تھی۔ شروع میں وہ مجھ سے بہت ناراض رہا، لیکن آہستہ آہستہ اس کی ناراضی کم ہوگئی۔ جب میں نے اس کو فون پر پال کی پیدائش کی اطلاع دی تھی تو وہ بے حد خوش ہوا تھا۔ فون پر اس کی بیوی بھی کبھی کبھی بات کر لیتی۔ جارج پال کی دوسری سالگرہ پر اپنی بیوی اور ننھی سی بیٹی کے ساتھ آیا تھا۔ اس دن کیتھرین کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی کیتھی کو اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔

کیتھی میری چھوٹی سے چھوٹی خوشی کا بے حد خیال رکھتی تھی لیکن کبھی کبھی اچانک اداس ہو جاتی اپنے گھر اور اپنے لوگوں کی باتیں کرتے سے ...دن، ہفتے، مہینے، اور برس گزر رہے تھے۔ لیکن ہماری خوشیوں کے گلاب میں کانٹا بدستور کھٹک رہا تھا۔ کیتھرین آہستہ آہستہ جیسے ٹوٹتی جا رہی تھی۔ وہ جلد تھکنے لگی تھی اکثر کھوئی کھوئی رہتی۔ میں نے سوچا شاید اس پر بچوں کی وجہ سے کام کا بوجھ بڑھ گیا ہے۔ میں نے خود کو اس کے کاموں میں داخل کرنا شروع کر دیا۔ اس کے سامنے یوں ظاہر کرتا جیسے میں اپنے شوق سے یہ سب کام کر رہا ہوں۔ اس کے علاوہ مہینے میں دو مرتبہ گھر کی صفائی کے لئے ایک خادمہ کا انتظام کر دیا تھا۔ ادھیڑ عمر کی جولیا اسٹیل بے انتہا مستعد اور محنتی خاتون تھیں، پورے گھر کو آئینے کی طرح چمکا دیتی تھیں۔ یہ سب کرنے کے باوجود میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کسی پرانی عمارت کی مانند ڈھیے جا رہی تھی۔ یا وہ ایک شاخِ گلاب تھی جس پر پھپھوند آگئی تھی... افسوس میں اپنی کیتھی کے لئے پھپھوند جیسا لفظ استعمال کر گیا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ کیتھی میرے سینے میں گلاب کی طرح کھلی تھی، اور ہمیشہ مہکتی، دمکتی رہے گی۔ میں کیتھی کے لئے بہت فکر مند تھا۔ لیکن جب میں نے کیتھی سے ڈاکٹر سے مشورہ لینے کی بات کی تو وہ حیران سی ہوگئی۔

''کیوں مجھے کیا ہوا ہے؟'' وہ حیرانی سے بولی۔

''تمہیں کچھ نہیں ہوا ہے ڈارلنگ لیکن ڈاکٹر سے مل لینے میں کیا حرج ہے۔'' میں نے جواب دیا

''پھر بھی... میں ڈاکٹر سے کیا کہوں گی۔'' اس کے اس سوال نے مجھے لاجواب کر دیا۔

وہ بہت بھولنے لگی تھی۔ میں اسے Bills دے کر جاتا کہ Pay کر دینا ... جب آکر پوچھتا تو کہتی ''کون سے Bills۔ تم نے مجھ سے کب کہا تھا بل پے کرنے کے لئے...؟''

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کھانا کھانے کے کچھ دیر بعد وہ کہتی ''ابھی تک ہم نے کھانا نہیں کھایا۔''

میں اسے یاد دلاتا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ہم نے کھانا کھایا ہے۔ مگر وہ نہیں مانتی اور کہتی۔ ''تمہیں نہیں کھانا ہے تو نہ کھاؤ۔'' اور خود کھانا کھانے بیٹھ جاتی۔

بالآخر میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے میں کامیاب ہوگیا... اس کے کئی ٹیسٹ ہوئے۔ ایک ٹیسٹ جسے Neuro Imaging Test نیورو امیجنگ ٹیسٹ کہتے ہیں وہ بھی ہوا۔ اس کے علاوہ حافظے سے متعلق اور بھی ٹیسٹ ہوئے۔ ڈاکٹرز کے ساتھ ہماری میٹنگز Meetings ہوئیں۔ تقریباً دو ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر ایک دن ڈاکٹرز نے بتایا کہ کیتھرین الزیمر Alzheimer کی ابتدائی اسٹیج میں ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے بہت ساری ہدایات دیں۔ پابندی سے دوائیاں کھلانے کے لئے کہا اور تسلی دی کہ وہ بہت جلد اچھی ہو جائے گی۔

میں نے کیتھرین کو کچھ نہیں بتایا۔ صرف یہ کہ کمزوری ہے۔ کچھ وٹامنز ڈاکٹرز نے دیئے ہیں... البتہ ایک خادمہ کا انتظام کیا کہ جب تک میں آفس میں رہوں وہ کیتھرین اور بچوں کی دیکھ بھال کرے۔ بچوں کو اسکول چھوڑنے اور لانے کی ذمہ داری بھی میں نے خود ہی سنبھال لی۔ کیتھرین کبھی کبھی خود ہی ہر کام کرنے کو کہتی... میں یہ کہہ کر کہ پہلے تم پوری طرح صحت یاب ہو جاؤ... ڈاکٹرز نے تمہیں آرام کرنے کے لئے کہا ہے... اسے کام کرنے سے روک دیتا۔ اس کی دوائیاں جاری تھیں۔ ڈاکٹرز بھی بہت حوصلہ دیتے کہ کیتھرین جلد صحت یاب ہو جائے گی۔

اتوار کا دن تھا۔ موسم بہت خراب تھا۔ ساری رات برف برستی رہی تھی۔ میں نے کیتھرین کو دیکھا وہ سو رہی تھی۔ وہ دیر تک سوتی رہی۔ میں نے ناشتہ تیار کیا... کیتھرین کو اٹھایا۔ وہ مشکل سے جاگی اور دیر تک اپنی خوبصورت انگلیوں سے آنکھیں ملتی رہی... ایسا ہماری شادی شدہ زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ وہ تو بستر سے ایسے اٹھتی جیسے چھلانگ لگائی جاتی ہے۔ میں نے اسے ایسا کرنے پر ٹوکا بھی تھا۔ اس کا اس طرح بستر پر بیٹھے رہنا اور آنکھیں ملتے رہنا میرے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔ میں بستر کے پاس کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ عجیب سی آنکھیں تھیں... آنکھوں کی پتلیوں کا نیلا رنگ بھورا ہو گیا تھا۔ اس کے اندر کی جادو بھری... رنگ اور نور کو ملا کر تیار کی ہوئی تجلی غائب تھی۔ میں اس کے اور زیادہ قریب ہو گیا... اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آواز دی... ''کیتھی... کیتھی ڈارلنگ...'' مگر ان آنکھوں میں کوئی ہلچل نہیں ہوئی... وہ مجھ کو دیکھ کر بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ کیتھرین مجھے پہچان ہی نہیں رہی تھی... وہ ماحول کو بھی نہیں پہچان رہی تھی۔ وہ ہماری دنیا سے کسی اور دنیا میں چلی گئی تھی۔ میں نے دونوں بچوں کو اس کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اس نے ان کو بھی نہیں پہچانا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی کہ کیتھرین کے والدین ہم لوگوں سے اپنی ناراضی ختم کر دیں۔ ان سے یہ امید بھی ظاہر کی مبادا کیتھی ان سے مل کر ہماری اور ان کی دنیا میں واپس آجائے اور نارمل ہو جائے۔ اس کی والدہ تو رونے لگتی تھیں۔ لیکن والد ملنے پر رضامند نہ ہوئے۔ ایک دن فون پر میں نے رو رو کر اور گڑگڑا کر ان کو بہت راضی کرنے کی کوشش کی تو وہ بے اختیار رو پڑے لیکن راضی نہ ہونا تھا نہ ہوئے۔ فون بند کرنے کے بعد میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا اور روتے روتے میری آنکھ لگ گئی۔ نیند میں مجھ کو یہ احساس ہوا کہ میں کیتھی کے ساتھ نیاگرا کے بالکل مقابل کھڑا ہوں اور نیاگرا ہم دونوں سے باتیں کر رہا ہے اپنی مخصوص آواز میں... دوسری رات بھی ایسا ہی کچھ ہوا۔ تیسری رات میں بھی نیاگرا ہمارے سامنے تھا اور کیتھرین نارمل حالت میں اس سے مصروفِ گفتگو تھی...

تیسری رات کے اس خواب یا حیران کن وژن نے میرے اندر زبردست تحریک ڈال دی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ کیتھی کو ساتھ لے کر نیاگرا کا سامنا کروں گا۔ تاکہ تین راتوں میں جو کچھ دیکھا، یا مجھے دکھایا گیا ہے اس کو حقیقت کا روپ دے سکوں۔ میں جانتا تھا کیتھی کو اس حالت میں ساتھ لے کر سفر کرنا آسان نہ ہوگا۔ مگر میرے اندر مجھے کوئی اس اقدام پر مجبور کر رہا تھا۔ میرے ذہن کے کسی کونے میں یہ خطرہ بھی موجود تھا کہ کہیں میں کیتھی کو ہمیشہ کے لئے کھو نہ دوں۔ کیتھی کے ڈاکٹر نے بھی مجھے وارننگ دی تھی کہ تم کیتھی کو کسی بڑے خطرے میں مبتلا کرنے جا رہے ہو۔ میں نے دونوں بچوں کو اپنے دوست کے پاس چھوڑا اور بالآخر کیتھی کو نیاگرا فال لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔

کیتھی وہیل چیئر پر تھی اور میں اس کی چیئر تھامے کھڑا تھا۔ نیاگرا اپنی پوری شان کے ساتھ ہمارے مقابل موجود تھا۔ اس کی آواز ہمیں اور ساری کائنات کو اپنے سحر میں لئے ہوئی تھی۔ میں چیخ چیخ کر رو رہا تھا اور نیاگرا سے مخاطب تھا... لوگوں کا ہجوم ہم دونوں کو گھیرے میں لے رہا تھا اور آہستہ آہستہ ان کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ نیاگرا کی پھوار... اور خود میرے آنسوؤں سے میرا چہرہ تر بتر ہو رہا تھا۔ کیتھی کی آنکھیں بھی نیاگرا کے پانی سے بھیگ رہی تھیں۔ میں نیاگرا سے مخاطب تھا اور چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ ''نیاگرا... او... نیاگرا... تو نے ہمیں بلایا ہے۔ میں اور کیتھی تیرے سامنے ہیں۔ جس خدا نے تجھے اتنا عجیب، اتنا وسیع، اتنا عظیم بنایا ہے اس خدا سے میں اپنی کیتھی کی تندرستی مانگتا ہوں... یا خدا! میری کیتھی کو مجھے واپس دیدے...'' میں اور نہ جانے کیا کیا بکتا رہا... چیختا رہا... روتا رہا... اچانک کیتھی کے بازو میری ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس دوران وہ کرسی سے اتر رہی تھی، جیسے ہی میں کرسی کے سامنے آیا وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میرے گیلے چہرے پر اپنے پیارے پیارے ہاتھ پھیرنے لگی۔ میں نے جھک کر اسے گود میں اٹھا لیا۔ اس کے چہرے کو، اس کی آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے چھوا... اس کی آنکھوں میں نیلی روشنیاں جھلملانے لگی تھیں... میری کیتھی واپس آچکی تھی۔ مجمعے نے جب ہم دونوں کو ایک دوسرے سے لپٹتے اور پیار کرتے دیکھا تو ان کا گھیراؤ خود بخود ختم ہو گیا۔ سب ہنس رہے تھے۔ کسی نے آواز لگائی ''کریزی۔'' ان میں سے کسی کو بھی اصل معاملے کی خبر نہیں تھی۔ ان میں سے کسی کو یہ پتہ نہیں تھا کہ میں کریزی نہیں بلکہ دنیا کا سب سے خوش نصیب آدمی ہوں... ■■

Shahnaz Khanam Abidi, 7180 Lanternfly Hollow
Mississauga ONT CANADA- L5W 1L6

سانسوں کے درمیان

گلشن کھنہ

رچرڈ جانسن جب سوئس ائیر کی فلائٹ سے دوپہر دو بجے واپس لندن پہنچا تو جہاز سے باہر آتے ہی پولیس نے اسے گرفتار کرلیا۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے اپنی پچپن سالہ بیمار والدہ کو خودکشی کرنے میں مدد کی تھی۔ یعنی اس تڑپتی ہوئی زندگی کو زیورخ (سوئزرلینڈ) کے ایک ہسپتال میں لے جاکر ڈاکٹروں کے ایک مہلک انجکشن سے ہلاک کرڈالا تھا۔ برطانوی قانون کے تحت کسی بھی خودکشی کرنے یا خودکشی کرنے میں مدد کرنے کی اجازت نہیں ہے کیونکہ یہ ایک نہایت غیر فطری، غیر اخلاقی اور سنگین جرم ہے۔

حکومت کی طرف سے رچرڈ جانسن پر مقدمہ دائر کردیا گیا اور سنٹرل کریمینل کورٹ، اولڈ بیلی کے کورٹ نمبر تین میں مقدمے کی سماعت تھی۔ رچرڈ ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا تھا۔ جج صاحب اپنی نشست پر اور جیوری کے ساتھ ممبران جیوری باکس میں خاموشی سے بیٹھے تھے۔ عدالت کا کمرہ ایسے مقدمات سے دلچسپی رکھنے والے ڈاکٹروں، مذہبی رہنماؤں اور عوام سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ سرکاری وکیل اور وکیل صفائی اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے مقدمے کے شروع ہونے کا انتظار کررہے تھے۔ جب مجسٹریٹ نے مقدمے کی کاروائی شروع کرنے کا حکم دیا تو سرکاری وکیل اپنی نشست سے اٹھ کر بڑی رعب دار آواز میں بولنے لگا:

''یور آنر! آج کا مقدمہ ایک تھرڈ ڈگری مرڈر کیس ہے۔ ملزم رچرڈ جانسن نے بڑی چالاکی سے تیار کی گئی ایک سکیم کے مطابق اپنی پچپن سالہ مدر کو زیورخ کے ایک ہسپتال میں مہلک انجکشن لگوا کر صرف اس لئے موت کے گھاٹ اتار ڈالا کہ وہ اس کی ساری جائیداد اور دولت کا مالک بن سکے۔ یور آنر! یہ شخص جو اس وقت بڑی معصوم صورت بنائے ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا ہے ایک نہایت سنگین جرم کا مرتکب ہوا ہے۔ یہ گنہگار ہے۔ قصوروار اور ایک شاطر مجرم ہے۔ اسے کڑی سے کڑی سزا ملنی چاہئے۔''

''آبجکشن یور آنر! مائی لارڈ! ابھی تک یہ ثابت نہیں ہوسکا کہ میرا موکل رچرڈ جانسن قصوروار یا گنہگار ہے۔ اس لئے اسے مجرم کہنا سراسر ناانصافی ہوگی۔'' وکیل صفائی نے سرکاری وکیل کی بات کو رد کرتے ہوئے کہا۔

''ثابت ہوچکا ہے یور آنر! ثابت ہوچکا ہے۔ ملزم رچرڈ نے خود اقبال جرم کرتے ہوئے پولیس کو یہ بیان دیا ہے کہ اس نے اپنی مدر کو زیورخ کے ایک ہسپتال میں لے جاکر اس کا مرڈر کروادیا۔ جب ملزم نے خود اقبال جرم کرلیا ہے تو اس سے زیادہ اور کس ثبوت کی ضرورت ہوسکتی ہے۔'' سرکاری وکیل نے بلند آواز میں کہا۔

''یور آنر! بڑے افسوس کی بات ہے کہ سرکاری وکیل میرے موکل پر ایک گھناؤنا اور شرمناک الزام لگا رہے ہیں۔ میرے موکل نے نہ تو کوئی غیر قانونی حرکت کی ہے اور نہ ہی پولیس کو ایسا کوئی بیان دیا ہے، جس سے اس کو قاتل یا گنہگار کہا جاسکے۔ رچرڈ جانسن تو ایک نہایت شریف النفس انسان ہے۔ اس نے ہمیشہ اپنے والدین کی خدمت کی ہے۔ اپنی والدہ کی بیماری کے دوران جن مشکل اور نامساعد حالات سے اسے گزرنا پڑا وہ میں ہی جانتا ہوں۔ رچرڈ کی المناک کہانی میں سن چکا ہوں۔ یور آنر! میری عدالت سے درخواست ہے کہ میرے موکل کو اپنی روداد پیش کرنے کی اجازت دی جائے تاکہ اسے سماعت فرما کر آپ اس مقدمے کا صحیح طور پر فیصلہ کرسکیں۔''

''آبجکشن یور آنر! میں...'' سرکاری وکیل ابھی اپنا جملہ ختم بھی نہیں کرپایا تھا کہ مجسٹریٹ نے اسے ٹوک دیا۔

''مسٹر رابرٹس آپ کا آبجکشن مسترد کیا جاتا ہے۔ مسٹر رابرٹس، عدالت ملزم کی روداد ضرور سننا چاہے گی۔ ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ ملزم نے کن حالات سے مجبور ہوکر یہ گناہ کیا۔ اس کے سب حالات سن کر ہی یہ عدالت مقدمے کا فیصلہ کرسکے گی۔ رچرڈ جانسن کو اپنی کہانی پیش کرنے کی اجازت ہے۔''

عدالت کا حکم پاتے ہی رچرڈ نے کہنا شروع کیا۔ ''یور آنر! میں عدالت کے سامنے جو کچھ کہوں گا بالکل سچ کہوں گا۔ سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔ مائی

لارڈ! اب سے کوئی چار برس قبل جب میرے فادر کا انتقال ہوگیا تو ہمیشہ خوش رہنے والی میری مدر بڑی پریشان اور اداس رہنے لگی تھی۔ اس کے سر میں ہر وقت درد رہتا تھا اور وہ سر درد کی کوئی گولی کھالیتی تھی مگر جب یہ درد مسلسل رہنے لگا تو ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔ معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ مدر کو ہائی بلڈ پریشر کی شکایت تھی۔ اس نے دوا تجویز کردی تھی۔ مدر وہ دوا لینے لگی تھی مگر کچھ ڈرگ دے کر اس کے دکھوں سے آزاد کردیا جائے تو وہ یہ نہیں کرسکتے تھے۔ کیونکہ ڈاکٹر کا کام زندگی دینا ہوتا ہے لینا نہیں اور پھر گزشتہ کئی برسوں کے بحث مباحثہ کے باوجود ہمارے ملک میں یوتھانیزیا اور Merciful Killing سنگین جرم ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس بارے میں عوام میں بہت اضطراب ہے۔ لوگ چاہتے ہیں کہ دائمی مریضوں کی بھلائی کے لئے ایسے قانون سے پابندی ہٹالی جائے مگر ابھی تک یہ ہو نہیں سکا کیونکہ قانون داں، ڈاکٹر، علما اور مذہبی رہنما اپنے اپنے مفاد کے لئے اس بات سے اتفاق نہیں رکھتے اس لئے اس قانون سے پابندی ہٹائے جانے کا کوئی امکان نہیں۔ ہاں وہ یہ کرسکتا تھا کہ ہماری مدر کو مزید تفتیش اور علاج کے لیے کنگ کراس ہسپتال میں بنائے گئے ماڈرن طرز کے Palliative Care Unit میں ٹرانسفر کردے۔ وہاں پر مریض کی اچھی دیکھ بھال بھی ہوگی اور ہوسکتا تھا کہ کچھ عرصہ بعد Palliavtive Drugs یعنی تسکین افزا ڈرگس دینے سے وہ آرام محسوس کرے۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ قدرت کے چمتکار سے مریض صحت یاب بھی ہوجائے۔"

"کیا ایسا ممکن ہوسکتا ہے ڈاکٹر؟"

"ضرور ہوسکتا ہے۔ میں نے فرانس میں بنے اس طرح کے ایک سینٹر میں ایسے چمتکار دیکھے ہیں۔"

"اگر آپ کو یقین ہے کہ اس یونٹ میں ٹرانسفر کرنے سے میری مدر شفا پاسکتی ہے تو آپ اسے وہاں شفٹ کردیں۔"

اس پر ڈاکٹر نے مجھ سے کہا تھا کہ ٹرانسفر کے لئے ہسپتال کو ہماری اجازت چاہیے تھی۔ ہم نے ہسپتال کے فارم پر دستخط کرکے انہیں اجازت دے دی تھی اور ڈاکٹروں نے مدر کو کنگز کراس کے پلی ایٹو کیر سینٹر میں بھیج دیا تھا۔

ہم میاں بیوی مدر کی مزاج پرسی کے لئے ہر روز سینٹر میں جاتے تھے۔ وہاں پر اس کی دیکھ بھال جدید دواؤں سے ہورہی تھی۔ مگر دو ماہ گزر جانے کے بعد بھی اس کی حالت میں کوئی Improvement نظر نہیں آئی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ ماڈرن ڈرگس کے زیر اثر سکون سے سوئی رہتی تھیں۔ مگر کچھ دیر بعد جب وہ علاج بھی بے اثر ہوجاتا تھا تو وہ شدید درد کے باعث اسی طرح روتی۔ اور چیختی دکھائی دیتی تھی اور مرنے کی دعائیں مانگتی تھی۔ جب بھی درد کی شدت ناقابل برداشت ہوجاتی اور کوئی دوا کارگر ثابت نہ ہوتی تو وہ مارے درد کے بلند آواز میں چیخنے چلانے لگتی تھی۔ اس کی چیخیں اس قدر ہولناک ہوتی تھیں کہ ڈاکٹر، نرسیں اور ملحقہ وارڈ کے دوسرے مریض بھی سہم جاتے تھے۔ مدر نے کئی بار روتے روتے ڈاکٹروں سے منت سماجت کی تھی کہ وہ مرسی کلنگ کی بنیاد پر کوئی مہلک انجکشن لگا کر اسے اس تکلیف دہ زندگی سے نجات دلادیں۔ مگر اس کی فریاد کو کسی نے نہیں سنا تھا کیونکہ ڈاکٹر تو قانونی، اخلاقی، مذہبی اعتقادات اور اپنے پیشہ وارانہ اصولوں کے باعث ایسا نہیں کرسکتے تھے۔ مدر نے ایسی اذیت ناک زندگی کو موت پر ترجیح دیتے ہوئے کئی بار خودکشی کرنے کی بھی کوشش کی تھی مگر ڈاکٹروں نے ہر بار اس کی کوشش کو ناکام بنادیا تھا۔

"یور آنر! بڑے افسوس کی بات ہے کہ سرکاری وکیل میرے موکل پر ایک گھناونا اور شرمناک الزام لگارہے ہیں۔ میرے موکل نے نہ تو کوئی غیر قانونی حرکت کی ہے اور نہ ہی پولیس کو ایسا کوئی بیان دیا ہے جس سے اس کو قاتل یا گنہگار کہا جاسکے۔ رچرڈ جانسن تو ایک نہایت شریف النفس انسان ہے۔ اس نے ہمیشہ اپنے والدین کی خدمت کی ہے۔ اپنی والدہ کی بیماری کے دوران جن مشکل اور نامساعد حالات سے اسے گزرنا پڑا وہ میں ہی جانتا ہوں۔ رچرڈ کی المناک کہانی میں سن چکا ہوں۔ یور آنر! میری عدالت سے درخواست ہے کہ میرے موکل کو اپنی روداد پیش کرنے کی اجازت دی جائے تاکہ اسے سماعت فرماکر آپ اس مقدمے کا صحیح طور پر فیصلہ کرسکیں۔"

میں نے یسوع مسیح سے بات کرنی چاہی مگر وہ مزید کچھ بولے غائب ہوگئے اور ان کی جگہ وہاں پر ایک ایسی روشنی دکھائی دی جیسے دیکھ کر میری آنکھیں چندیاگئیں۔ میں اس وقت بہت گھبرا گیا تھا اور اسی وقت ایک چیخ کے ساتھ جاگ اٹھا۔ میری چیخ سن کر میری بیوی بھی بیدار ہوگئی۔ اس نے میری گھبراہٹ اور پریشانی کی وجہ پوچھی تو میں نے اسے اپنے خواب کے بارے میں بتادیا۔ اس وقت صبح پانچ بج رہے تھے۔ بیوی نے کہا'' یہ صبح کا خواب ہے ہمیں دن نکلتے ہی چرچ جاکر پادری سے اس کی تعبیر معلوم کرنی چاہئے۔'' ہم صبح ہوتے ہی چرچ چلے گئے

ایک شام جب ہم مدر کو دیکھنے ہسپتال گئے تو اس کی عجیب حالت تھی۔ بدن کے ساتھ ساتھ دماغ بھی ماؤف ہو چکا تھا۔ وہ ٹھیک طرح سے سانس بھی نہیں لے پارہی تھی۔ ہم بڑے دکھی ہوکر گھر لوٹے تھے۔ اسی رات میں نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ خواب میں خداوند یسوع مسیح آئے، وہ مجھ سے مخاطب تھے۔ ''تم کیسے بیٹے ہو، اپنی والدہ کے دکھ درد کا تمہیں کوئی احساس نہیں، اس کا جسم تو مر چکا ہے مگر وہ اس لئے زندہ ہے کیونکہ اس کی روح اس کے سانسوں کے درمیان اٹکی ہوئی ہے۔ اس روح کو آزاد کر دو تا کہ وہ زندگی کے بعد آنے والے سفر کی طرف روانہ ہو سکے۔''

میں نے یسوع مسیح سے بات کرنی چاہی مگر وہ مزید کچھ بولے غائب ہوگئے اور ان کی جگہ وہاں پر ایک ایسی روشنی دکھائی دی جیسے دیکھ کر میری آنکھیں چندیا گئیں۔ میں اس وقت بہت گھبرا گیا تھا اور اسی وقت ایک چیخ کے ساتھ جاگ اٹھا۔ میری چیخ سن کر میری بیوی بھی بیدار ہوگئی۔ اس نے میری گھبراہٹ اور پریشانی کی وجہ پوچھی تو میں نے اسے اپنے خواب کے بارے میں بتادیا۔ اس وقت صبح پانچ بج رہے تھے۔ بیوی نے کہا'' یہ صبح کا خواب ہے ہمیں دن نکلتے ہی چرچ جاکر پادری سے اس کی تعبیر معلوم کرنی چاہئے۔'' ہم صبح ہوتے ہی چرچ گئے تاکہ خواب کی تعبیر معلوم ہو سکے۔

ہمارے مذہبی رہنما نے ہمیں بتایا کہ خداوند کریم کی طرف سے یہ اشارہ ہے کہ تم اپنی سخت بیمار والدہ کی روح کو فوراً آزاد کرانے میں اس کی مدد کرو۔'' پھر یہ ساری بات میں نے اپنے رشتہ داروں کو بتائی تو سب نے یہ صلاح دی کہ مزید دیر کیے بغیر مدر کو اس کے دکھوں سے نجات دلا دینی چاہئے میرے کزن جیمز نے مشورہ دیا کہ میں اسے زیورخ کے ایک نامی ہسپتال Gignitas میں لے جا کر وہاں کے اسپیشلسٹ کو کنسلٹ کروں۔

''اپنے کزن کی صلاح پر میں نے کنگ کراس کے ہسپتال میں درخواست دی کہ میں اپنی مدر کو کسی پرائیویٹ میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں بھرتی کرانا چاہتا تھا۔ ان کی اجازت سے میں مدر کو وہیل چیئر میں ڈال کر گھر لے آیا اور پھر دوستوں اور رشتہ داروں کی مالی امداد سے میں اسے زیورخ لے گیا اور Dignitas Hospital سے رابطہ قائم کر کے مدر کو وہاں Admit کروایا۔ انہوں نے اسے Observation کے لئے چند روز ایک اسپیشل وارڈ میں رکھا مگر جب انہیں بھی امید کی کوئی جھلک نظر نہ آئی تو ڈاکٹروں نے مدر کا مرض لاعلاج قرار دے دیا۔ پھر ہسپتال کے ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ جن مریضوں کا مرض لاعلاج ہو ان کو اپنی مرضی سے موت کو گلے لگانے کا حق حاصل تھا یعنی A terminally ill patient had the right to die with dignity in that country اس فیصلے کے بعد ڈاکٹر نے مسز جانسن کی خواہش کے مطابق ضروری قانونی کاروائی کر کے انہیں ایک مہلک انجکشن لگادیا تھا۔ صبح جب میں اسے دیکھنے ہسپتال گیا تو وہ ابدی نیند سو رہی تھی۔ اس کی روح تو جسم سے پرواز کر چکی تھی مگر اس وقت وقت ایک ایسی مسکان تھی جو کسی فاتح کے چہرے پر ہوتی ہے۔

''یور آنر! میں نے کسی کو قتل نہیں کیا اور نہ ہی کسی کو خودکشی کرنے میں مدد کی ہے۔ میں نے صرف خداوند مسیح کے حکم کے مطابق سانسوں کے درمیان اٹکی ہوئی ایک بے قرار اور تڑپتی ہوئی روح کو چھٹکارا دلایا ہے یعنی آزاد کرایا ہے اور اگر پنجرے میں قید کسی بے بس پرندے کو آزادی کا سورج دکھانا کوئی جرم ہے، کوئی گناہ ہے تو میں خطاوار ہوں۔ گناہگار ہوں۔ آپ جو چاہیں مجھے سزا دے سکتے ہیں۔ یہ کہتے ہی وہ بے ہوش ہوکر کٹہرے کے فرش پر گر گیا۔ تمام حاضرینِ عدالت کے چہروں پر گہرے کرب اور تاسف کے آثار نمایاں ہوگئے تھے اور آنکھیں آنسوؤں سے پوری طرح بھیگ چکی تھیں۔ ■■

Gulshan Khanna, 98, Grove Road,
Hounslow, Tw3 3PT London UK

اندرخانے

حسن جمال

ساڑھے تین سو کے اسٹاف میں جمیل احمد آخری بندہ تھا، جو انصاف کے مندر اور بھگوان کے گھر سے ریٹائر ہو گیا۔ صابر کی موت اچانک ہارٹ فیل ہو جانے سے پچھلے سال ہو گئی تھی۔ اب بچی صابر کی بیوہ صابرہ بیگم اور ایک سبک دوش جج کا پوتا صداقت حسین۔ یہ دونوں چوتھے درجے کے ملازم تھے جن کا ہونا، نہ ہونا برابر تھا۔ آزاد بھارت میں جہاں منسٹر اور سیاسی پارٹیوں کے بڑے چھوٹے عہدے داروں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، وہاں چوتھے درجے کے ملازمین کے وجود کا کہنا ہی کیا؟ سرکاری نوکریوں میں مسلمانوں کے حصہ داری دس فی صد بھی نہیں ہے جب کہ پچھلے ساٹھ برسوں میں ان کی تعلیم وتربیت کافی صد بڑھا ہی ہے۔ اعلیٰ انتظامی عہدوں، فوج، پولیس، خفیہ ایجنسیوں، نیشنل سکیورٹی گارڈ، جہاں بھی نظر دوڑایئے، مسلمان خال خال نظر آتے ہیں۔ جب کہ اکثریت کے بعد اقلیت طبقوں میں سب سے بڑا طبقہ مسلمانوں کا ہے۔ مگر کیا کیجئے کہ اس نام نہاد سیکولر ملک میں مسلمانوں کے خلاف تعصبی رویہ اندرخانے جاری وساری ہے۔

جمیل احمد جب تک ملازمت میں تھا، ان ہی باتوں پر اکثر چراغ پا ہوتا رہتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ جب اس کی نوکری لگی تب نہرو دورِ دور تھا اور بھارت سیکولر قدروں کے رتھ پر ترقی کی رفتار سے گامزن تھا۔ اور بہت ممکن تھا کہ بہت جلد بھارت ایک مضبوط ملک بن کر ابھرتا۔ صحیح معنوں میں آج کی طرح 'شائننگ انڈیا' اور 'گروتھ ریٹ' کے بے توازن رتھ پر بیٹھ کر نہیں۔ وہ تو 90 کی دہائی میں جہادی دہشت گردی کی ایسی آندھی اٹھی کہ اپنے پرایوں کے بیچ خلیج بڑھتی چلی گئی۔

دراصل جو کچھ 90 کی دہائی میں شروع ہوا، وہ اس انصاف کے مندر میں ساتویں آٹھویں دہائی میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب انصاف کے مندر میں بڑے دیوتا مہاجن ہوا کرتے تھے۔ اور کالے کوٹ والے مہاجن پجاریوں کی تعداد دیگر پجاریوں سے کہیں زیادہ تھی۔ اس ہجوم میں جمیل اور صابر کی کیا اوقات کہ وہ اپنے تعلیم یافتہ بھائی بھتیجوں کو ملازمت دلا سکیں۔ وہ خود تھے، یہیں غنیمت تھی پھر دیکھتے ہی دیکھتے غالباً سیاست کی بدولت جاٹوں، وشنوئیوں اور چودھریوں کے گھوڑے سرپٹ دوڑنے لگے۔ پھر بھی اسٹاف میں برہمن ان پر بھاری تھے، وہ اس لئے کہ شومئی قسمت سے سب سے بڑے مندر کے سب سے بڑے دیوتا ایک برہمن آبرا جے۔ ان کے ساتھ ہی برہموں کا ریلا چلا آیا۔

جمیل احمد چونکہ عدلیہ میں آنے سے قبل کچھ عرصہ تک ایک اخبار کے دفتر میں کام کر چکا تھا دوسرے وہ اردو، ہندی اور انگریزی کے اخبارات اور رسائل سے شغف رکھتا تھا، اس لئے اس کا زاویۂ نگاہ کچھ اور تھا۔ اس کے برعکس صابر بہت تیز طرار اور دنیادار شخص تھا۔ مستقبل کے منصوبے رکھتا تھا۔ اپنے کام میں ماہر تو تھا ہی۔ ملازمت کے دوران اس نے ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کر لیں۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ قبل از وقت سبک دوش ہو کر وکالت کے میدان میں کود پڑے۔ یوں بھی اس کی جان پہچان کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ اکثر لوگ باگ قانونی مشوروں کے لئے اس کے پاس آیا کرتے تھے۔ وہ ان کو قانون پیروی کے ایسے ایسے نکتے بتاتا تھا کہ وکیل بھی دنگ رہ جاتے۔ وہ اکثر وبیشتر وکیلوں کے چیمبروں میں پایا جاتا تھا یا ان عدالتوں میں جہاں اس کے واقف کاروں کے مقدمے ہوا کرتے تھے۔ قانون قاعدوں کی بھرپور واقفیت تو رکھتا ہی تھا اس پر مستزاد اس کی زبان بڑی تیکھی تھی۔ وہ مسلمانوں میں بھی ارزل تھا یعنی دھوبی۔ اس کے لباس کو دیکھ کر لگتا تھا کہ تازہ تازہ لانڈری سے نکل کر آیا ہو۔ البتہ زبان پر گندگی رہتی تھی۔ ماں بہن کی گالی کے بغیر بات نہیں ہو سکتی تھی۔ اسٹاف والے اور کالے کوٹ والے اس سے سہمے ہوئے رہتے تھے۔ ججوں کو وہ اپنی اعلیٰ کارکردگی، خدمات اور جی حضوری سے پٹا کے رکھتا تھا۔ بہت ممکن تھا اگر وہ وکیل بنتا تو کامیاب وکیل بن کر ابھرتا اور ایک مثال قائم کر جاتا، کیونکہ اب تک کوئی کامیاب وکیل

اس شہر میں نہیں دیکھا گیا تھا۔ مسلمان موکل یہ سمجھتے تھے کہ مسلمان، وکیل کتنا ہی ہوشیار کیوں نہ ہو، وہ ان کا کیس نہیں جیت سکتا، کیونکہ ججوں سے اس کی سیٹنگ نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ چھوٹے سے چھوٹا مقدمہ بھی غیر مسلم وکیل کو سونپنے میں اپنی عافیت سمجھتے تھے اور یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اپنی قوم کے آدمی کو آگے بڑھانے میں کچھ خطرات بھی اٹھانے چاہئیں۔ جب کہ غیر مسلم وکیلوں میں اقربا پروری خوب سے خوب تر تھی۔

بہر حال صابر کے خواب دل کے جھٹکے میں یک دم ٹوٹ گئے۔ پہلی بیوی سے نباہ نہ ہوا تو دو بچوں کے باوجود اسے طلاق دے دی (یہ اور بات کہ اس نے طلاق مانی ہی نہیں اور اپنے بچوں کے ساتھ جداگانہ رہنے اور کھانے کمانے لگی) صابر کو اپنی تنہائی کا کہیں نہ کہیں علاج کرنا ہی تھا سو ایک بے وفا سے دل لگایا اور دل پر چوٹ کھائی اور یوں اپنی جان گنوائی۔ اس کے مرتے ہی پہلی بیوی عرضی نوکری حاصل کرنے آگئی۔ ادھر صابر کی دوسری بیوی صابرہ بیگم خود کو اصل دعوے دار سمجھ رہی تھی۔ بڑے جج صاحب نے دونوں عورتوں کا خیال رکھا۔ پہلی بیوی کو صابر کے واجبات میں ایک خطیر رقم دلا کر اس کا منہ بند کر دیا اور نوکری کی لاٹری صابرہ بیگم کے نام کھلی۔ صابرہ چونکہ تعلیم یافتہ نہیں تھی۔ اس لئے اسے چپراسی کی نوکری دی گئی۔

جمیل احمد ایک موٹی سی گنوار عورت کو پھدپھد کرتے اکثر عدالتوں میں آتے جاتے دیکھتا تھا۔ ایک روز اس کے متعلق دریافت کیا گیا۔ تو معلوم ہوا کہ وہ صابر کی بیوی ہے اور ایک قصبے میں تعینات ہے۔ یکا یک جمیل کے دماغ کی نس غم وغصہ سے تن تنانے لگیں۔ صابر ایسے تیز طرار، ہوشیار اور قانون یافتہ سابق ملازم کی بیوی کا یہ حشر! قسمت بھی کیسے کیسے کھیل دکھاتی ہے۔ آج صابر زندہ ہوتا اور وکالت کر رہا ہوتا تو اس عورت کو کیسا رتبہ ہوتا۔ چلو، معقول تعلیم نہیں تھی تو چپراسی ہی بنتا تھا۔ مگر ہیڈ کوارٹر سے باہر پھینک دینا کیا ظاہر کرتا ہے؟ یہی نہ، یہ بے سہارا ہے۔ اپنے حق کے لئے اس کے منہ میں زبان نہیں۔ اسٹاف میں کم از کم پندرہ بیس خواتین ملازمائیں تھیں، مگر ان کے تئیں نرم رویہ رکھتے ہوئے کبھی باہر تبادلہ نہیں کیا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب ایک عورت کو وہ بھی بیوہ اور سیانی بیٹیوں کی ماں کو اٹھا کر باہر پھینک دیا گیا۔

اپنی اوقات جانتے ہوئے بھی جمیل احمد دندناتا ہوا انتظامیہ سیکشن میں پہنچ گیا، لیکن فوراً اپنا سا منہ لے کر لوٹ آنا پڑا۔ جہاں دلیل کا کوئی دخل نہ ہو، جہاں آپ کی حیثیت کچھ بھی نہ ہو، وہاں دلائل اور یکساں سلوک کی توقع بھی فضول ثابت ہوتی ہے۔ یہ بتایا گیا کہ خالی جگہ باہر ہی تھی۔ پھر سرکاری بندوبست میں کسی بھی ملازم یا افسر کو کہیں بھی لگایا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے، جمیل احمد کو یہ جواب مبنی بر انصاف اور معقول نہیں لگا، کیونکہ وہ خود تعصبات اور غلط حرکات کا شکار تھا اور خدا خدا کر کے ملازمت کے دن گزار رہا تھا۔ بے حیثیت اور بے وسیلہ ملازموں کو سرکاری دفاتر میں کس کس طرح پریشان کیا جاتا ہے یہ وہ پچھلی تین دہائیوں سے دیکھتا آ رہا تھا۔

اس دن پہلی بار صابرہ سے اس کا مکالمہ ہوا۔ دونوں ایک دوسرے سے اب تک انجان تھے۔ جمیل نے صابر سے اپنی نزدیکیوں کا حوالہ دیا اور ناراضی بھی ظاہر کی کہ اسے پہلے کیوں نہیں بتایا گیا اور تبادلے کے لئے پُر زور کوشش کیوں نہیں کی گئی؟ صابرہ نے روہانسی ہو کر بتایا کہ وہ کئی درخواستیں گزار چکی ہے، مگر شنوائی نہیں ہوتی۔ جوان جہان بیٹیوں کو گھر پر اکیلی چھوڑ کر روز صبح ایک سو کلومیٹر دور قصبے میں ڈیوٹی کرنے جاتی ہے۔ کبھی کبھی دیر رات بھی ہو جاتی ہے۔ بڑے ارمان سے اس کے شوہر نے مکان بنوایا تھا، مگر اس جنم ذلیل عورت کے غنڈے بھائیوں نے پورے مکان پر قبضہ کر رکھا ہے۔ سر چھپانے کو محض ایک کمرہ اس کے پاس ہے۔ اکثر دھمکیاں ملتی ہیں کہ نکال باہر کریں گے۔ کیا کریں، ایک شخص کے چلے جانے سے سو مصیبتیں آن پڑتی ہیں۔

جمیل احمد نے اسے دلاسا دیا کہ وہ اس کے لئے کچھ کرے گا۔ انسان سچے دل سے ارادہ کرے، تو آپ ہی آپ کوئی راہ نکل آتی ہے۔ متصل عدالت میں ایک جج صاحبہ تعینات تھیں جن کے ماتحت صابر بھی پیشکار رہ چکا تھا۔ بھلی عورت تھیں۔ اگر وہ ضلع جج صاحب سے سفارش کر دیں، تو کام بن سکتا ہے۔ بے حیثیت جمیل کی اس نقار خانے میں کون سنے گا! جب کلیگ ہی نہیں سنتے۔ صابرہ کی دکھ بھری کہانی سن کر جج صاحبہ کا دل پگھل گیا۔ یوں بھی صابر کی کارکردگی سے بہت خوش تھیں اور اس کا احترام کرتی تھیں۔

اور کچھ ہی روز بعد صابرہ اپنے گھر آگئی۔ اس کے تبادلے کا حکم صادر ہوا اس وقت انتظامیہ کی مجبوریاں جانے کون سے بل میں گھس گئیں۔ یوں تو ہر سرکاری محکمہ میں فریادیوں اور ضرورت مندوں کو معمولی کاموں کے لئے ناکوں چنے چبوائے جاتے ہیں۔ خیر سے اگر وہ مسلمان، باریش اور ٹوپی والا ہو تو یکا یک رویہ بدل جاتا ہے اس لئے کہ نہ مسلمان خوشامد کا ہنر ٹھیک سے جانتا ہے نہ معقول واقفیت رکھتا ہے اور ہر غلط سلط بات پر بس ''جی جی! ہاں صاب'' کرتا رہ جاتا ہے۔

خود جمیل احمد کو انصاف کب ملا تھا؟ ملازمت کے پہلے دن ہی اسے باہر پھینک دیا گیا جب کہ اس کے ساتھ تقرر ہونے والے شخص کو ہیڈ کوارٹر پر رکھا گیا۔ منطق یہ کہ وہ شخص زیادہ قابلیت رکھتا ہے۔ ایک وہی نہیں، ایسے کئی

ملازم تھے، جنھوں نے کبھی باہر کی سزا بھگتی ہی نہیں۔ دراصل ہیڈ کوارٹر سے باہر پوسٹنگ کو عموماً سزا کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔ ہر کوئی اپنے گھر میں رہنا چاہتا تھا۔ جمیل احمد بھی اپنے گھر میں رہنے کی خواہش رکھتا تھا۔ تو کیا غلط تھا۔ ابھی اس کی مَسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ فقط بیس برس کا تھا۔ نیا نیا ہائی اسکول پاس کیا تھا۔ دنیاداری کے نشیب و فراز سے بے خبر تھا۔ وہ تو باپ کے طعنوں تشنوں سے عاجز آکر اس نے ملازمت کے لئے درخواست دے دی تھی ورنہ اس کی خواہش تعلیم جاری رکھنے کی تھی۔ مگر باپ اس کو خاندانی پیشے میں الجھانا چاہتے تھے جو اسے بالکل پسند نہیں تھا۔ خیال تھا کہ ملازمت ملے گی تو خاندانی پیشے سے نجات مل جائے گی۔ ہوا تو کچھ ایسا ہی، مگر اسے معلوم نہیں تھا، اس کچی عمر میں برسہا برس بن باس بھگتنا پڑے گا۔ چھوٹا سا قصبہ تھا کوئی اچھا سودمند سرکل نہ بن سکا۔ اس کے تمام خواب اور خواہشیں دو سال میں دم توڑ گئیں۔ شہر میں رہ کر کالج جاتا تو اس کا نالج بڑھتا۔ قصبہ میں وہ کنویں کا مینڈک بن کر رہ گیا۔ دس برس بعد لاتعداد درخواستوں اور سفارشوں کے بعد گھر لوٹنا نصیب تو ہوا، مگر تب تک وہ پورا، بابو بن چکا تھا۔ کام کی مار سے دوہری کمر اور نظر کے چشمے والا معمولی ملازم۔

جمیل احمد کے دل کی تمنا دل میں ہی رہی، کبھی اسے بھی ایسی سیٹ ملے جہاں وہ دو گھڑی ستا کر اپنے واپنے مستقبل کے بارے میں سوچ سکے۔ کچھ فیصلہ کر سکے۔ لیکن چالیس برس کی ملازمت میں وہ دن کبھی نہیں آیا۔ جہاں بھی رہا، کام کے بوجھ سے دبا رہا۔ اوور ٹائم ڈیوٹی کرتا رہا۔ صبح چائے ناشتے کے بعد کورٹ جاتا اور بقایا کام نبٹاتا۔ دن بھر گردن جھکی رہتی۔ کمر سیدھی کرنے کا موقع نہ ملتا۔ رات کو پھر مکمل سکوت میں بھوت کی طرح فائلوں سے جوجھتا رہتا۔ اس پر بھی تبادلے کی تلوار ہر وقت سر پر لٹکی رہتی۔ جج ناخوش رہتے۔ ساتھی کھنچے کھنچے۔ جمیل احمد! یہ 'میاں' یہاں کیوں ہے؟ ہٹاؤ اسے۔ جب بھی جمیل کو سن گن ملتی کہ تبادلوں کی فہرست تیار ہو رہی ہے تب وہ بری طرح گھبرا جاتا۔ دماغ سائیں سائیں کرنے لگتا۔ اس قدر محنت و مشقت کے باوجود کیا اسے پھر رختہ سفر باندھنا پڑے گا۔ اب تو وہ آبائی شہر کا عادی ہو چکا ہے۔ اس کے برعکس دیگر ملازمین بے فکر رہتے اور وہ بری طرح گھبرا اٹھتا۔ ججوں تک رسائی رکھنے والے اپنے سینئروں اور سفارشی وکلا کی خوشامد کرنے لگتا کہ اس دفعہ کسی طرح مجھے بچا لیجئے۔ بڑی مشکل سے اپنے ہاں سیٹل ہوا ہوں۔ بچیاں بڑی ہو رہی ہیں۔ ان کے رشتوں کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ اگر برادری سے دور نکل گیا تو رشتوں میں دقت آئے گی۔ بیوی بھی بیمار رہتی ہے اور میں وقت سے پہلے بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اولاد نرینہ ہے

جمیل احمد! یہ 'میاں' یہاں کیوں ہے؟ ہٹاؤ اسے۔ جب بھی جمیل کو سن گن ملتی کہ تبادلوں کی فہرست تیار ہو رہی ہے تب وہ بری طرح گھبرا جاتا۔ دماغ سائیں سائیں کرنے لگتا۔ اس قدر محنت و مشقت کے باوجود کیا اسے پھر رختہ سفر باندھنا پڑے گا۔ اب تو وہ آبائی شہر کا عادی ہو چکا ہے۔ اس کے برعکس دیگر ملازمین بے فکر رہتے اور وہ بری طرح گھبرا اٹھتا

نہیں، ورنہ اس سے امیدیں وابستہ کی جا سکتیں۔ اب جو کچھ کرنا ہے، مجھے ہی کرنا ہوگا۔ خاندان کے دیگر افراد اپنی اپنی الجھنوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ ان پر کب تک تکیہ کیا جا سکتا ہے! کاش! وہ کچہری کا ملازم نہ ہوتا۔ یہاں تو میرا سب کچھ نچڑ گیا۔ دماغ تک! اب میں کسی کام کا نہ رہا۔ دعا کرتا رہتا ہوں کہ بقیہ نوکری کسی طرح خیریت سے گزر جائے۔

کچھ برسوں تک عاجزیاں رنگ لاتی رہیں، لیکن جب وہ مکمل طور پر مطمئن ہو گیا کہ تبادلے کا خدشہ جاتا رہا ہے تب اچانک ستاروں کی گردش کی چپٹ میں آ گیا اور ایک بار پھر اسے اٹھا کر باہر پھینک دیا گیا۔ وہ بھی بڑی عدالت سے چھوٹی عدالت میں۔ چھوٹے سے دیہات میں۔ اب مسئلہ یہ کہ بیوی بچوں کو ساتھ رکھو یا پھر روزانہ اَپ ڈاؤن کرو۔ صبح کے نکلے رات گئے گھر لوٹو۔ صبح پھر گاڑی پکڑنے کی افراتفری۔ اس سے پہلے وہ اَپ ڈاؤن کا معنی تک نہ سمجھتا تھا۔ لیکن جب ریلوے کا ماہانہ پاس بنوانا پڑا تو اسے اَپ ڈاؤن پوری طرح سمجھ میں آ گیا۔ دو سال میں اس کی دماغی کیفیت یہ ہو گئی کہ ہمہ وقت اسے یہ احساس رہنے لگا کہ وہ ٹرین میں بیٹھا ہے یا اسٹیشن پر کھڑا ٹرین کا انتظار کر رہا ہے۔ ٹرین کی سیٹی اور گھڑگھڑاہٹ ہر وقت کانوں میں گونجتی رہتی تھی۔ کورٹ روم میں بھی اور راتوں کو بستر میں بھی۔ سردیوں اور بارشوں میں آمد و رفت کی دقتیں بڑھ جاتی تھیں۔ بلکہ ایسا بھی ہوا کہ شہر آنے والی ٹرین لیٹ یا رد ہو گئی تو بس یا جیپ کے ذریعہ لوٹنا پڑا۔ فضول صرفہ ہوا سو الگ۔

اس سب کا اثر اس کی صحت پر پڑنا ہی تھا۔ لیکن بیوی پر اس سے کہیں زیادہ پڑا۔ کمزور تو پہلے ہی تھی اب مسلسل بیمار رہنے لگی۔ شوہر کے طویل عرصے تک غیر موجودگی، تنہائی اور بچوں کی چک چک نے اسے توڑ کے رکھ

جمیل احمد بھی 'ملائم شکار' تھا۔ ابھی اس کے والد کو گذرے دو ماہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ اسے اپ ڈاؤن کے چکر سے نکال کر جج شپ کے آخری کنارے پر بھیج دیا گیا۔ جو ایک صحرائی وسرحدی علاقہ تھا۔ جسے ایک زمانے میں 'کالا پانی' کہاجاتا تھا۔ اپنی تمام درخواستوں کا یہ حشر دیکھ کر وہ بلبلایا، مگر بڑے جج صاحب اس کی آہ وبکا پر بھی نہیں پسیجے۔ پہلے جوائن کرو پھر دیکھیں گے

دیا۔ یہ وہی دن تھے جب جمیل احمد کے ماں باپ یکے بعد دگرے حادثوں کے شکار ہوکر ہڈیاں تڑوا بیٹھے اور ہمہ وقت بستر کے ہولئے۔ یوں تو بھرا پورا خاندان تھا، لیکن ہر کوئی حیلے بہانے سے بوڑھوں کی خدمت سے منہ چرانے لگتا اور بیچاری بیمار بیوی مروت میں جی جان سے لگی رہتی۔ کیونکہ ساس سسر کی زبان پر اکثر 'چھوٹی بہو' کا نام رہتا۔ کمزوری اور بیماری میں یہ خدمت اور دیکھ بھال کوڑھ میں کھاج ثابت ہوئی۔ لیکن وہ ہائے توبہ کرنے کے علاوہ کر ہی کیا سکتی تھی۔ جمیل احمد خود بھی کیا کرسکتا تھا۔ سوا تبادلے کے لئے چیخ پکار کرنے کے۔ مگر ملازمت میں تو یہ سب لازم وملزم ہے خواہ جمیل ہو خواہ جمال ہو۔ انتظامیہ اگر ماتحتوں کی سہولیات کا خیال رکھنے لگے تو ہو چکا کاروبار وفاتر! انتظامیہ کو حساس اور ہمدرد بنانے کی باتیں فقط باتیں ہی ہوتی ہیں، عملاً ان کی کوئی قیمت نہیں۔ یہاں تو افسر کا موڈ، فرمان اور دفتر کی کارگذاریاں ہی معنی رکھتی ہیں۔ نوکری کرنا ہے تو یہ سب جھیلنا ہی ہوگا۔ چاہے روکر چاہے ہنس کر۔

جمیل احمد کی پریشانی کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ شہر کا عادی ہو جانے، سنجیدگی اور فرض شناسی سے کام کرنے، کسی کو شکایت کا موقع نہ دینے اور اوائل میں ہی دس برس کا بنواس بھگت لینے کے باوجود اسے پھر باہر پھینک دیا گیا۔ بلکہ یہ تھی کہ لاتعداد لوگ تقرری کے دن سے ہیڈ کوارٹر پر جمع ہوئے تھے اور بعض کے پاس تو برسوں سے بالائی کمائی کے اچھے عہدے تھے۔ اگر سب کو ایک سسٹم کے تحت دو دو تین تین سال کے لئے باہر بھیجا جاتا تو سزا بھگتنے والوں کو شکایت نہ رہتی۔ وہ کسی طرح اس قید ملازمت کو برداشت کر لیتے، لیکن جانبداری سے انتظامیہ اکثر انہی ملازمان کا تبادلہ کرتا، جن کی کوئی سفارش نہ ہوتی یا جن کو 'ملائم شکار' سمجھا جاتا تھا۔

جمیل احمد بھی 'ملائم شکار' تھا۔ ابھی اس کے والد کو گذرے دو ماہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ اسے اپ ڈاؤن کے چکر سے نکال کر جج شپ کے آخری کنارے پر بھیج دیا گیا، جو ایک صحرائی وسرحدی علاقہ تھا۔ جسے ایک زمانے میں 'کالا پانی' کہا جاتا تھا۔ اپنی تمام درخواستوں کا یہ حشر دیکھ کر وہ بلبلایا، مگر بڑے جج صاحب اس کی آہ وبکا پر بھی نہیں پسیجے۔ پہلے جوائن کرو پھر دیکھیں گے۔

جمیل احمد کو بخوبی معلوم تھا کہ یہ جھوٹی تسلی ہے۔ ٹالنے کا بہانہ۔ جس کو کچھ کرنا ہو، وہ اپنے اختیار سے سب کچھ کرسکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی افسر انصاف اور انسانی ہمدردی کو بالائے طاق رکھنے کی ٹھان لے تو ماتحت ملازم کو بستر مرگ سے بھی اٹھا کر کہیں بھی تبادلہ کیا جاسکتا ہے۔ دراصل ملازمت میں ملازم اپنی محنت اور وقت کی ہی قربانی نہیں دیتا، بلکہ اپنے گلے میں از خود غلامی کا طوق ڈال لیتا ہے۔ اس کے سکھ، دکھ اس کی تمام تر پریشانیاں اور مشکلات، اس کی راحتیں اور سہولتیں۔ سب افسر کی نوک قلم پر رہتی ہیں۔ یہی نوکری کا اصل قاعدہ ہے۔

ملازمت کے چونکہ چند ہی برس باقی تھے۔ اس لئے جمیل احمد کو مجبوراً سرحدی شہر میں حاضری دینا پڑی۔ بیوی بچوں سے دور وہ وہاں اکیلا ہی رہتا تھا۔ اپ ڈاؤن میں یہ راحت تو تھی کہ رات کو منہ دکھانے چلے آتے تھے۔ اب تو کئی کئی ہفتوں کے لئے گھر سے دور۔ مجبوراً نہ کھانے کا پتہ، نہ رہنے کا ٹھکانہ۔ پاگل کی طرح گھومتے رہنا۔ امید کی ایک پتلی سی ڈور کے سہارے ایک برس گذر گیا اور اس ایک برس میں ماں بھی چل بسی اور بیوی نے بستر پکڑ لیا۔ بچوں کی بے راہ روی بڑھنے لگی۔ سب سے زیادہ فکر بڑی بیٹی کی تھی۔ بیوی نے کئی بار اشارتاً بتایا کہ اب بڑی کے ہاتھ پیلے کردینے چاہئیں۔ ہر ماں کو اپنی بیٹی کی صحیح وقت پر شادی کی فکر رہتی ہی ہے۔ ممکن ہے جمیل کی غیر موجودگی میں کچھ نازیبا رونما ہوا ہو یا بیوی کو لگا ہو کہ اب وہ نہیں بچے گی۔ بیوی صاف طور پر کچھ بتلاتی نہ تھی۔ جمیل جتنے روز گھر پر رہتا، بڑی لڑکی پر گہری نظر رکھتا۔ مگر اس کے اطوار سے کسی اندیشے کا پتہ نہیں چلتا تھا۔

جمیل احمد سرحدی شہر میں آدھا سا رہ گیا تھا۔ اس کی حالت اس غیر میعادی قیدی کی طرح ہو چکی تھی جس کو یہ احساس ہو چکا ہو کہ اب مرتے دم تک انہیں سلاخوں اور دیواروں کے پیچھے رہنا ہوگا۔ جس طرح موت کی سزا سنائے ہوئے قیدی کی رحم کی درخواست ہر قدم پر رد کی جاتی ہے اسی طرح اس کی ہر درخواست File کے نوٹ کے ساتھ دفن ہوجاتی رہی۔ تاہم ایک

موہوم سی امید کے سہارے وہ اپنے دن گزارتا رہا، یہاں تک کہ اس کی سبک دوشی کے دن قریب آ گئے۔ وہ قطعی مایوس ہو چکا تھا کہ یکا یک آسمان مہربان ہوا اور وہ اپنے شہر آ گیا۔

ان تبادلوں نے جمیل احمد کو حواس باختہ کر رکھا تھا۔ نوکری کی زیادتیوں سے زیادہ یہ احساس اسے ستاتا تھا کہ یہ سب اس کے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے؟ باقی سب مزے کر رہے ہیں۔ جب اس پر گھر گرہستی کا بار بڑھنے لگا تبھی اس پر یہ قیامت کیوں گزری، جس طرح پندرہ کروڑ لوگ چند لوگوں کے لئے 'غیر ضروری' ہیں، کیا اسی طرح سرکاری دفاتر میں بناؤ بیلے کے ملازمین غیر ضروری قرار دے دیئے جاتے ہیں۔ ان کو ان کے نگر سے اجاڑ کر دور دراز پھینک دینا محض آفس کے قانون قاعدے ہوتے ہیں یا اس کے پیچھے تعصب یا جانبداری کارفرما ہوتی ہے۔ وہ اکثر سوچتا، لیکن کسی نتیجے پر پہنچ نہیں پاتا تھا۔ وہ اپنے معاملے میں ہر حکم کو شک وشبہ کی نظر سے کیوں دیکھتا رہتا ہے۔ ملازمت میں تو ایسی باتیں لازم وملزوم ہیں۔ اپنے مسئلے پر ہر زاویے سے غور وفکر کرنے کے باوجود اس کے ذہن سے یہ شک جاتا نہ تھا کہ کہیں نہ کہیں کچھ گڑبڑ ضرور ہے جس کی صاف طور پر نشاندہی نہیں کی جا سکتی۔

ابھی وہ نئی پوسٹ پر ٹھیک طرح جما بھی نہ تھا اور بڑی بیٹی کے رشتے کے لئے نئے سرے سے تگ ودو شروع کی ہی تھی کہ ایک روز بڑے جج صاحب نے گہری نظر سے اسے گھورتے ہوئے چند غیر متوقع سوالات کر ڈالے۔ اتفاقاً اس وقت کورٹ روم خالی تھا۔ بس وہ ہی دو موجود تھے۔

کیا آپ اسٹاف میں سب سے سینئر ہیں؟ لا گریجویٹ ہیں؟ اس کورٹ میں کب سے ہیں؟ اب تک کہاں تھے؟ کس کس کے ماتحت کام کر چکے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ وہ ضلع جج شپ کی سب سے بڑی عدالت تھی اور جج صاحب کے ہاتھوں میں تبادلوں کے اختیارات تھے۔ جج صاحب کے تابڑ توڑ سوالات سے جمیل احمد کا دل زوروں سے دھک دھک کرنے لگا۔ یہ سب دریافت کرنے کا مطلب کیا ہے؟ ابھی آئے ہیں، دامن سنبھالا بھی نہیں کہ پھر خطرے کی گھنٹی! کیا پوجا پاٹ کرنے والے جج صاحب اپنے معاون کو مسلمان دیکھنا پسند نہیں کرتے یا اس کی کارکردگی سے خوش نہیں ہیں یا اصولاً اس بڑی کورٹ میں سب سے سینئر کو لانا چاہتے ہیں۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ لنچ کے وقفے میں اس نے ادھر ادھر سے معلومات کیں تو پتا چلا کہ کچھ کھچڑی پک رہی ہے! وہ بری طرح گھبرا گیا۔ تبادلوں سے وہ بہت گھبراتا تھا۔ یہ اس کی نفسیاتی کمزوری تھی۔ چارج لینے دینے کے چکر میں اسے چکر آنے لگتے تھے۔ پچھلی پوسٹ کی غفلتوں کو آناً فاناً چھپانے اور نئی پوسٹ پر سابق ملازم کی خامیوں کو دور کرنے میں اسے خوب خوب محنت کرنا پڑتی تھی۔ آخر کار وہ بھی ایک انسان تھا۔ ہاڑ مانس کا۔ عمر کی اس ڈھلان میں وہ بری طرح تھک چکا تھا اسی لئے اضافی بار سے بچنا چاہتا تھا، یہ فطری عمل تھا۔

اتفاق سے وہ جج ہی بدل گئے، جو اسے اتنا جلد بدل دینا چاہتے تھے۔ نئے جج سے تبادلے کا ڈر تو نہ لگا لیکن مزاج کے وہ بڑے سخت تھے۔ ان کی سختی تب دیکھنے میں آئی جب اس کے پینشن کے کاغذات دستخطوں کے ملنے ان کے سامنے رکھے گئے۔ صاف انکار کر دیا کہ پہلے Nodue سرٹیفکیٹ لو، پھر دستخط ہوں گے۔ جمیل چاہتا تھا کہ ڈیوٹی پر رہتے ہوئے اس کی پینشن کے کاغذات اپنی منزل تک پہنچ جائیں اور بعد میں اسے بھٹکنا نہ پڑے۔ چونکہ کورٹ سب سے بڑا تھا۔ اس لئے اس کی لائبریری بھی سب سے بڑی تھی۔ قانون کی ہزاروں کتب، گزٹ، سرکولر فائلیں، کتابیں ادھر ادھر جاتی آتی رہتی تھیں۔ کبھی کوئی وکیل لے جاتا، کبھی جج کے گھر پڑی رہ جاتی، کبھی دوسری عدالتوں میں ضرورتاً طلب کی جاتیں۔ اس کے لئے باقاعدہ رجسٹر تھا۔ مگر ایمرجنسی میں عموماً رقعوں اور رسیدوں سے کام لیا جاتا تھا۔ جمیل احمد نے جب لائبریری کا چارج سونپا تو بہت ساری کتابیں کم پائی گئیں۔ لہٰذا ان کی تلاش شروع ہوئی مگر بے سود۔ اس نے ان کتابوں کی رقم ادا کرنے کا ذمہ تحریری طور پر پیش کیا مگر انصاف کے مسیحا اصول پسند تھے۔ جو کہہ دیا، وہ پتھر کی لکیر۔ نتیجتاً دس ہزار روپوں کا چونا لگ گیا۔ اگر کچھ مہلت مل جاتی تو کچھ کتابوں کی حصولیابی غیر ممکن نہ تھی۔ خدا خدا کر کے پینشن کے کاغذات پر دستخط ہوئے اور فائل آگے بڑھی۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایسا ہر دفتر میں ہوتا ہے، اس میں مسلم کیا، غیر مسلم کیا؟ لیکن صابرہ بیگم کی بے وقت کی موت کو آپ کیا کہیں گے۔ وہ تو بیچاری دکھیاری سیدھی سادھی عورت تھی۔ شوہر نہ مرتا، تو کاہے کو جوان جہان بیٹیوں کو گھر پہ اکیلا چھوڑ کر نوکری کے لئے جھک مارنے آتی۔ ابھی دو تین برس ہی ہوئے تھے کہ بیچاری پر قیامت ٹوٹی۔ پنڈت مجسٹریٹ اس کے ہاتھ سے چائے پانی کیسے پئیں۔ ہٹاؤ، ہٹا کے لگاؤ کہاں؟ ایک دبنگ سردارنی اس کے لئے تیار ہوئی۔ میرے ہاں لگا دو۔ اکیلی رہتی تھی۔ یوں بھی نوکری کی سخت ضرورت تھی۔ جب سرکاری نوکرانی موجود ہے تو اپنے خرچے پر نوکر کیوں رکھیں! سردارنی مجسٹریٹ یوں تو اکیلے رہتی تھی، لیکن پنجاب سے مہمان خوب آتے تھے۔ سبھاؤ بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔ ذات پات کے نخرے بھی نہ تھے۔ پھر جانے کس نے کان بھر دیئے یا ماتھا گھوم گیا، لگی ستانے، بات

آخر صابرہ بیگم بھی عورت تھی۔ ایک عام گرہستن۔ نوکری کے تقاضے وہ کیاجانے! خود اپنا گھر تو اس کے لئے گویا سرائے بن گیا تھا۔ بچے الگ ہائے توبہ کرنے لگے تھے۔ پھر کیا تھا، ایک روز میم صاحب کو کھری کھری سنا دی۔ میم صاحب کے دماغ میں بنا مرد کے ساتھ کے یوں بھی گرمی چڑھی ہوئی تھی اور عہدے کا تکبر تو تھا ہی۔ سو اس ہلکی ذات کی عورت کو سبق سکھانے کا تہیہ کربیٹھی۔ جس عورت نے گھر کی دہلیز پار کرنے کا خواب وخیال میں نہ سوچا تھا وہ چوری کے الزام میں دھری گئی

بات میں ڈانٹ ڈپٹ، ڈبل ڈیوٹی۔ کورٹ میں بھی خدمات دو اور صبح وشام بنگلے پر بھی۔ کبھی کبھی دیر رات تک، چھوٹ پنجابی گالیاں۔ مہمانوں کے سامنے ذلت۔ آخر صابرہ بیگم بھی عورت تھی۔ ایک عام گرہستن۔ نوکری کے تقاضے وہ کیا جانے! خود اپنا گھر تو اس کے لئے گویا سرائے بن گیا تھا۔ بچے الگ ہائے توبہ کرنے لگے تھے۔ پھر کیا تھا، ایک روز میم صاحب کو کھری کھری سنا دی۔ میم صاحب کے دماغ میں بنا مرد کے ساتھ کے یوں بھی گرمی چڑھی ہوئی تھی اور عہدے کا تکبر تو تھا ہی۔ سو اس ہلکی ذات کی عورت کو سبق سکھانے کا تہیہ کر بیٹھی۔ جس عورت نے گھر کی دہلیز پار کرنے کا خواب وخیال میں نہ سوچا تھا وہ چوری کے الزام میں دھری گئی۔ مجسٹریٹ کا حکم اور پولیس کی مستعدی! پولیس کے لئے صابرہ کے قبضے سے زیورات اور سرداری کے شلوار قمیض برآمد کرنا کیا مشکل تھا! صابرہ کے لئے تھرڈ ڈگری کسی قیامت سے کم نہ تھی۔ اسے یاد نہیں، کبھی صابر نے اس پر ہاتھ اٹھایا ہو۔

جمیل نے ہی اس کے لئے وکیل کھڑا کیا تھا اور ضمانت پر آزاد کروایا تھا۔ صابرہ بیگم کو اس حادثے کا اس قدر صدمہ ہوا کہ اس نے دنیا سے ہی ضمانت کروالی۔ محلے کے کوئیں میں ڈوب مری۔ اس طرح عدالت میں ایک وکیٹ اور گرا۔ اب رہ گیا صداقت حسین، سیدھا سادہ شریف نوجوان، اس کے دادا جج تھے۔ اور وہ معمولی چپراسی، فی الحال وہ اس شعبے میں تھا جہاں اسامیوں کے سمن نوٹس وغیرہ تعمیل کے لئے آتے تھے۔ نظارت کے کمرے میں تمام مذکوری اپنے اپنے حلقے کے کاغذات لیے بیٹھے رہتے تھے۔ ان کا انچارج 'ناظر' میز کرسی لگائے نگراں کی طرح ان پر نظر رکھتا تھا۔ اس کے سامنے ایک بڑا سا رجسٹر پڑا رہتا تھا جس میں نوٹسوں اور سمنوں کا اندراج ہوتا تھا۔ یہ عدالتی کارروائی کا ایک خاص کام تھا۔ نظارت سیکشن کے ذریعے ہی اسامیوں کو بلایا جاتا تھا۔ مذکوریوں کی بلے بلے ہوتی تھی وہ چاہے جسے موجود ہوتے ہوئے، ناموجود کرسکتے تھے۔ یا کمرے میں بیٹھے بیٹھے، لینے سے انکار، کا نوٹ لگا سکتے تھے۔ 'گواہان' سے تصدیق شدہ اس کی رپورٹ عدالت عالیہ تک قبول ہوتی تھی بشرطیکہ کوئی اسے چیلنج نہ کرے۔ اس میں بالائی آمدنی خوب تھی۔

صداقت حسین اس کارگزاری سے دور رہنا چاہتا تھا اسی لئے ناظر اس سے خفا خفا رہتا تھا۔ اور اسے اپنے سیکشن سے نکالنے کے فراق میں تھا۔ صداقت کے ساتھی اس کے سیدھے پن کی وجہ سے جب تب اس کے ساتھ بے ہودہ مذاق کرتے رہتے تھے۔

اس دن عدالت اٹھ چکی تھی۔ نظارت کے کمرے سے نکل کر وہ لوگ کھلے میدان میں کھڑے تھے۔ دو چار گائیں اور سانڈ بھی کچرے میں منہ مارنے اور لگے ہاتھ 'ہلکا' ہونے کے لئے ہمیشہ کی طرح چلے آئے تھے۔ گویا ان کی بھی پیشی ہو۔ ایک مذکوری کو جانے کیا سوجھی کہ صداقت کی بغل میں دبا ہوا بیگ چھین کر ہوا میں اچھال دیا۔ ہنسی مذاق کے درمیان وہ بیگ کی چین لگانا بھول گیا تھا لہٰذا بیگ کے سارے کاغذات پرزوں کی طرح ادھر ادھر بکھر گئے۔ وہ گھبرا کر انہیں سمیٹنے کے لئے آگے بڑھا، تب تک کئی عدالتی پروانے گایوں اور سانڈ کے پیٹ میں پہنچ گئے تھے۔ یہ انہونی آناً فاناً ہوگئی تھی۔ ان میں کئی پروانے اگلے ایک دو روز کی شنوائی کے تھے اور بہت ضروری تھے۔ صداقت ان کی رسید ناظر کو دے چکا تھا لہٰذا تمام تر ذمے داری اسی کی تھی۔ سرکاری کاغذوں کو کھو دینا بہت بڑا جرم تھا۔ معطلی کا حکم صادر ہونا ہی تھا۔ یوں بھی اس کی نوکری ابھی غیر میعادی تھی۔

نتیجتاً کچھ عرصے بعد صداقت کو نوکری سے برطرف کردیا گیا۔ اس طرح انصاف کے مندر کو ملیچھوں سے پاک صاف کردیا گیا۔ کہہ نہیں سکتے یہ پاکی صفائی کب تک قائم رہے گی۔ شاید برسوں تک، شاید صدیوں تک، یا مذاہب اور ذات پات بنے رہیں گے۔ تب تک۔ آئین ہند کا منشا خواہ کچھ بھی ہو، عملی آئین یہی رہے گا جہاں بھی ہو، جیسے بھی ہو، سب اپنے ہوں! ''رگھوکل ریت سدا چلی آئی...'' ■■

حسن جمال، بزرد پنا نواس، لوہار پورہ، جودھپور 342002، راجستھان
موبائل: 09829314018

خوں آشام

محمد یحییٰ جمیل

شہر سے بہت دور واقع پرانے عیسائی قبرستان میں پچھلی سیکڑوں راتوں کی طرح آج بھی پُر ہول سناٹا طاری تھا۔ کلاک ٹاور نے بھی صرف ایک گھنٹی بجا کر خاموشی اختیار کر لی تھی، شاید ایک ہی بجا ہو۔

آسمان پر چاند بادلوں میں چھپنے لگا تھا اور ہوائیں تھم گئی تھیں۔ قبرستان کے پچھلے حصے میں جہاں برسہا برس پرانے درختوں کی سیاہ لاشیں کھڑی تھیں، ایک بوسیدہ قبر سے کثیف دھواں نکلنا شروع ہوا جو اوپر اٹھنے کے بجائے زمین پر ہی پھیلتا چلا گیا۔ فضا میں ناقابل برداشت بدبو پھیل گئی اور اسی وقت قبر سے ایک لرزتا ہوا ہاتھ باہر نکلا پھر دوسرا اور اس کے بعد ایک انتہائی خبیث اور مکروہ شکل نمودار ہوئی۔ اچانک کچھ چمگادڑیں چیختی ہوئیں ماحول پر اثر انداز ہوئیں۔ وہ بلا غراتی ہوئی قبر سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔ بہت دور کوئی کتا رونے لگا۔ اگلے چند منٹوں میں وہ پوری طرح باہر آ چکی تھی۔ اس کے شانوں پر چمگادڑ کی طرح دو پر بھی موجود تھے۔ اس نے ایک طویل انگڑائی لی۔ بے شمار چمگادڑیں آ کر اس کے پیروں سے لپٹ گئیں۔ اس نے غصے سے انھیں دھتکارا۔

''بھاگو پری صورتو!'' وہ چیخی۔ اس کی آواز پر چمگادڑیں لرزنے لگیں۔

''بھاگو'' وہ پھر چیخی۔ ''اور میری واپسی پر بھی اپنا منہ نہ دکھانا۔'' اس نے اپنے پر پھڑ پھڑاتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔ چمگادڑیں شور مچاتی ہوئیں غائب ہو گئیں۔ چند لمحوں بعد اس نے ایک زوردار چیخ ماری۔ چند چمگادڑیں جو شاید آس پاس کی جھاڑیوں میں چھپ گئی تھیں خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ وہ پوری قوت سے ایک جھرجھری لے کر قبرستان کے صدر دروازے کی سمت بڑھ گئی۔

یہ ویمپائر تھی... ڈراکیولا کی مانند ایک خوں آشام بلا، جو سوئے ہوئے انسانوں کا خون چوس لیتی ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ اس کا شکار مرنے کے بعد ویمپائر کی شکل اختیار کر لیتا جیسا کہ ڈراکیولا کے معاملے میں ہوتا ہے۔

ویمپائر کا رخ شہر کی جانب تھا اور کچھ دیر کے بعد وہ شہر کے راستوں پر تھی۔ اچانک اسے اپنے پیروں میں کچھ چپچپاہٹ محسوس ہوئی۔ ویمپائر اور اسے نہ پہچانے! وہ بڑی پھرتی سے جھکی اور اس کی وحشت ناک آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''آج پھر خون!'' اس نے حیرت سے غرا کر کہا۔

پچھلے ایک ہفتے سے وہ ہر رات تازہ خون شہر کی سڑکوں پر دیکھ رہی تھی جس سے بلاشبہ کئی ویمپائریں اپنی پیاس بجھا سکتی تھیں۔ لیکن اسے چاٹنا اس کی غیرت کے خلاف تھا۔ پچھلی رات اسے کوئی شکار نہیں مل سکا تھا کیوں کہ ویمپائر کی اولین دشمن بستی پر راج کر رہی تھی۔ آگ!

وہ کل کی ساری رات ادھر ادھر بھٹکتی رہی تھی اور آخر کار اسے پیاسا ہی لوٹنا پڑا تھا اس لئے آج اسے خون ہر حالت میں چاہئے تھا، ہر حالت میں۔ وہ اٹھی اور آگے بڑھ گئی۔ آج بھی لوگوں کا شور اسے سنائی دے رہا تھا۔ دور آتش زدہ مکانات بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ بری طرح جھنجھلا گئی۔

بہت دیر آوارہ گردی کے بعد ایک شان دار عمارت پر اس کی نظر پڑی۔ یہاں بڑا سکون تھا۔ اسے کچھ امید بندھی۔ اس نے تیزی سے اپنے پر پھڑ پھڑائے اور ایک ہی جست میں عمارت پر چڑھ گئی۔ پہلی منزل کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس نے اندر جھانکا، ایک موٹا تازہ آدمی دنیا و مافیہا سے بے نیاز خراٹے بھر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ویمپائر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے اپنے بھدّے ہونٹوں پر دو تین بار زبان پھیری اور دھیرے سے کمرے میں داخل ہو گئی۔

چہرے پر حیوانیت کچھ اور ابھر آئی تھی۔ حلق سے خرخراہٹ ابھر رہی تھی۔ خوفناک دانت مزید ابھر آئے تھے اور آنکھوں کی سرخی میں بھی قدرے اضافہ ہو گیا تھا۔ اور رال تھی کہ ٹپکی پڑ رہی تھی۔ وہ مخصوص انداز میں غراتے ہوئے اس پر جھک گئی۔ اس نے ہلکے سے اس کے ہونٹوں کا بوسہ لیا اور اگلے

ہی پل بڑے سرعت سے اپنے دانت اس کی گردن میں پیوست کر دیے۔

اس نے ہونٹ سیکڑ کر جوں ہی اس کا خون چوسنا چاہا اس پر بجلی گر پڑی۔ خون منتقل ہونا شروع ہو چکا تھا۔ ویمپائر بوکھلا گئی۔ خون وہ نہیں پی رہی تھی بلکہ اس کا خون اس آدمی کے جسم میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنے دانت نکالنے چاہے مگر ناکام رہی۔ اس نے اپنی پوری طاقت لگا دی لیکن اس کے دانت سر مو بھی باہر نہیں آ سکے۔ ویمپائر نے اپنے دونوں پیر پلنگ سے لگا دیے بعد ازاں ایک پیر اس شخص کے چہرے سے لگا کر بھی طاقت لگائی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ویمپائر کا خون اس آدمی کے جسم میں منتقل ہوتا رہا۔ اس کے حلق سے وحشت ناک کراہ ابھری، جو دب کر رہ گئی۔ وہ تڑپ رہی تھی لیکن خود کو آزاد کرانے میں ناکام تھی۔ یک بارگی اس نے خود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکل سکا۔ کچھ لمحے اور اسی جد و جہد میں گذر گئے۔ آخر اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ تبھی اسے ایک زوردار جھٹکا لگا اور وہ کسی گیند کی مانند دیوار سے جا ٹکرائی۔ اس کا مردہ جسم قیمتی قالین پر گر پڑا۔ آدمی نے کروٹ بدل لی۔

ایک نحیف کھٹمل کسی سوراخ میں بیٹھا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا بولا۔ ”بے وقوف ویمپائر، کاش تو جانتی کہ یہ ہندوستان کا ایک سیاست داں ہے۔“

”اور سونے پر سہاگہ یہ کہ حکومت وقت میں عہدۂ وزارت پر فائز بھی۔“ قریب ہی ایک بیمار سا مچھر بھی تھا۔

اب کمرے کی پراسرار خاموشی میں اگر کچھ تھا تو دونوں کی مری مری ہنسی اور بس۔ ■■

محمد یحییٰ جمیل، لیکچرر شعبۂ فارسی، شری متی کیشر بائی لاہوتی مہاودیالیہ، امراوتی۔444603

رتھ یاترا

مشتاق اعظمی

نجم الحسن جیسے ہی گھر میں داخل ہوا، بیگم نے کہا "بڑی دیر کر دی؟ ڈھائی بج رہے ہیں۔ کہاں رُک گئے تھے؟"

"میں لمحہ بھر بھی کہیں نہیں رکا۔ ڈیڑھ گھنٹے تک مسلسل چلتا رہا ہوں۔"
نجم الحسن پر تکان کا احساس غالب تھا۔

"مسلسل چلتے رہے! آفس کا کوئی کام تھا؟"

نجم الحسن نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا "نہیں بات دراصل یہ ہوئی کہ گوہا روڈ پر پیچھے سے آتا ہوا ایک اسکوٹر جس پر دو نوجوان سوار تھے، مجھ سے آگے نکلا۔ ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اچانک اس میں سے کتاب جیسی کوئی چیز سڑک پر آرہی۔ میں نے رُکو رُکو کا شور مچایا۔ لیکن سامنے سے آتی ہوئی بس کے ہارن نے میری آواز کو صدا بہ صحرا کر دیا۔"

"پھر — ؟"

"میں نے آگے بڑھ کر وہ چیز اُٹھالی۔ دیکھا تو راشن کارڈ تھے۔ سات کارڈ تھے! پہلے پر رگھوناتھ پرشاد ویسٹ کالونی لکھا تھا۔"

"میں سمجھ گئی — " بیوی نے قدرے خفگی سے کہا۔ "لیکن آپ تو گھر سے ہو کر کارڈ پہنچانے جا سکتے تھے؟"

"نہیں، تم نہیں جانتیں۔ آج کل راشن کارڈ امریکہ کے گرین کارڈ سے کم نہیں ہوا کرتے۔ یہ اناج بھی اٹھاتے ہیں اور سماج بھی نبھاتے ہیں۔"

"خوب! آپ تو شاعری کرنے لگے۔" بیگم نے فقرہ چست کیا۔

"ارے بھئی! شاعری بھی تو سماجی خدمت ہی کا ایک پہلو ہے۔" نجم الحسن نے بات جاری رکھی۔ "میں نے مناسب سمجھا کہ اناج اور سماج کے مسائل سے نبرد آزما کارڈوں کو اُن کے مالک تک جلد پہنچا دیا جائے۔ ویسٹ کالونی پہنچنے میں دقت ضرور ہوئی۔ لیکن رگھوناتھ پرشاد کا گھر آسانی سے مل گیا۔ گردوارہ اسٹریٹ پر۔ جین بھون کے بالکل سامنے! لیکن تم مجھے کھانا تو دو۔"

"کھانا تیار ہے۔ پہلے آپ ہاتھ منہ دھولیں۔"

لقمہ نگلتے ہوئے نجم الحسن کو کچھ یاد آیا۔ بولا "ہاں، رات تم کیا کہہ رہی تھیں؟"

"آپ کو تو کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔"

"بھئی، ایک بار پھر یاد دلا دو۔"

"کہہ رہی تھی کہ شکنتلا دیدی کے یہاں شادی ہے۔"

"ہاں ہاں، آج ان کے یہاں برات آنے والی ہے۔ چلیں گے، ضرور چلیں گے۔ تم نے ایک ساڑی کی بات کہی تھی نا۔ میں پورا سیٹ لے آؤں گا۔"

"لیکن کب؟ کیا شادی ہو چکنے کے بعد؟"

"نہیں، نہیں۔ میں ابھی نکلوں گا ابھی ———" نجم الحسن نے تولیہ سے منہ پونچھتے ہوئے کہا۔

نجم الحسن دروازے سے باہر نکلا تو بیگم نے پیچھے سے آواز دی۔ "سنیے! راستے میں رامو مل جائے تو کہیے گا کہ غسل خانے میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے۔ چار پانچ ڈول پانی دے جائے۔"

شام کے کوئی ساڑھے سات بجے نجم الحسن اپنی بیگم اور بچیوں کو ساتھ لیے 'انٹرنیشنل ہوٹل' پہنچ گیا۔ مقام تقریب یہی تھا۔

ہوٹل کا خوبصورت ہال، خواتین کے زرق برق ملبوسات کی سرسراہٹ، بچوں کے چہروں پر کھیلتی ہوئی شرارت آمیز مسکراہٹ اور عزیزوں اور دوستوں کی گل افشانئ گفتار سے آمد بہار کا منظر پیش کر رہا تھا۔

شکنتلا نے نجم الحسن کو دیکھا تو لپک کر آئی۔ ہاتھ جوڑ کر "بھیا نمستے" کہا۔ اس کے بعد زبیدہ کو گلے سے لگایا اور بچیوں کے سر پر ہاتھ رکھ کر شفقت کا اظہار کیا۔ اتنے میں سردار امرجیت سنگھ آ گئے۔ شکنتلا "ست سری کال" کہتی ہوئی ان سے مخاطب ہو گئی۔

نجم الحسن کی نظر ہال کے ایک گوشے میں براجمان سماجی اور پروفیسر

نجم الحسن کی نظر ہال کے ایک گوشے میں براجمان سنہا جی اور پروفیسر کاظمی پر پڑی تو وہ آداب ،آداب کہتا ہوا ان کی طرف لپکا۔ وہ کرسی کھینچ کر ان کے درمیان میں بیٹھ گیا۔ سنہا جی نے شکوہ کیا۔'' میں نے تو آپ کو اسی وقت نمستے کیا تھا جب آپ لان میں داخل ہو رہے تھے ۔ مگر بھابی کی موجودگی میں کسی سے رام سلام کرنے میں شاید آپ کو ڈر لگتا ہے ۔''

کاظمی پر پڑی تو وہ آداب، آداب کہتا ہوا ان کی طرف لپکا۔ وہ کرسی کھینچ کر ان کے درمیان میں بیٹھ گیا۔ سنہا جی نے شکوہ کیا۔'' میں نے تو آپ کو اسی وقت نمستے کیا تھا جب آپ لان میں داخل ہو رہے تھے۔ مگر بھابی کی موجودگی میں کسی سے رام سلام کرنے میں شاید آپ کو ڈر لگتا ہے۔''

'' ارے نہیں سنہا صاحب! میں نے آپ کو دیکھا ہی نہیں تھا۔'' نجم الحسن نے معذرت کی۔'' رہا ڈر کا سوال وہ تو خیر لگتا ہے۔ مگر مخاطب کوئی تو یہ حسن ہونا چاہئے۔'' قہقہوں کے پھول محفل میں بکھر گئے۔

''اماں کاظمی صاحب! نجم الحسن پروفیسر کاظمی سے مخاطب ہوا۔

''شادی کی اس مجلس کے بارے میں کچھ ارشاد فرمائیں۔''

'' بھئی ایسی مجلسوں کے بارے میں تو میں نے ہمیشہ ہی کہا ہے۔ محفل خوش انجام! مسرتوں کا اژدحام! حسن و عشق کا احترام اور تعمیر گلستاں کا پیغام!''

'' خاطر و مدارت کا انتظام! یہ پنکتی بھی جوڑ لیں۔'' سنہا جی نے اپنی خوش مذاقی کا ثبوت دیا۔

ایک بار پھر قہقہوں کی بارش ہوئی۔ پھر یہ قہقہے '' برات آگئی، برات آگئی'' کے دل نواز شور کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئے۔ ہال کی نغمہ ریز فضا کی لے تیز ہو گئی اور روشنی کی کرنوں کی رمق یکا یک دوگنی ہو گئی ——

رات دس بجے کے قریب ابتدائی تقریب ختم ہو گئی۔ مقامی مہمان کھاپی کر رخصت ہونے لگے تو نجم الحسن نے بھی بیوی بچوں کے ساتھ اجازت چاہی۔ شکنتلا نے اپنے ڈرائیور جمال کو بلایا اور انہیں گھر تک چھوڑ آنے کی ہدایت کی۔

نجم الحسن نے گھر پہنچ کر ابھی دروازہ کھولا ہی تھا کہ سامنے کی کھڑکی سے سردار درشن سنگھ کی بھاری بھرکم آواز نمودار ہوئی۔'' زیبا بیٹی! گوالہ شام کو دودھ دے گیا تھا۔ آ کر لے جاؤ۔''

سردار درشن سنگھ محلہ کے مربی لوگوں میں سے تھے۔ پچھتر برس کے بوڑھے۔ لیکن صحت قابل رشک۔ چھوٹے بڑے سب انہیں ادب سے چاچا جی کہتے تھے۔

زبیدہ دودھ لینے گئی تو چاچا جی بولے۔'' تم لوگ کچھ بتا کر بھی نہیں گئے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ پنکی دروازے پر کھڑی تھی۔ اس نے دودھ لے لیا اور چولھے پر رکھ کر کھولا بھی دیا ہے۔''

زبیدہ نے معذرت کی۔'' چاچا جی! ہم جلدی میں آپ سے کہنا بھول گئے۔ ہم لوگ شادی میں گئے تھے۔''

چاچا جی شفقت بھرے انداز میں ہنس کر بولے۔'' اچھا ٹھیک ہے۔ جاؤ اندر جا کر لے لو —— اور سنو!'' زبیدہ ایک لمحہ کے لئے رُک گئی۔'' آج کا 'اخبار مشرق' بھجوا دینا۔ آج ہاکر ہمارے یہاں اخبار دینا بھول گیا۔''

'' جی چاچا جی!'' کہتی ہوئی زبیدہ گرم دودھ کی دیگچی کچن سے اٹھا کر گھر لے آئی۔

رات کے کوئی بارہ بجے ہوں گے کہ چاچا جی کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ نجم الحسن نے جھانک کر دیکھا۔ وہ چاچا جی کا ڈرائیور مائیکل تھا۔

'' آج بڑی دیر کر دی تم نے؟'' چاچا جی نے دروازہ کھولتے ہوئے فکر مندی سے پوچھا۔

مائیکل بولا۔'' آرڈر میں تھا۔ سیدھا ہیرا پور سے چلا آرہا ہوں۔ صبح پانچ بجے پھر جانا ہوگا۔''

چاچا جی نے کہا'' پھر ایسا کرو کہ آج گاڑی، وہ سامنے سڑک کے اس پار، کشوری کی چائے کی دکان کے پاس لگا کر سو رہو۔ کشوری کو کہہ دینا، وہ صبح وقت پر تمہیں جگا دے گا۔''

'' اور اگر کشوری خود سویا رہ گیا تو؟'' مائیکل نے قدرے تشویش ظاہر کی۔

'' ارے نہیں بے وقوف!'' چاچا جی بولے۔'' کشوری ہر روز صبح کی اذان سنتے ہی اٹھ جاتا ہے۔ وہ تمہیں جگا بھی دے گا اور گرم گرم چائے بھی پلا دے گا۔ جاؤ بے فکر ہو کر سو رہو!''

نجم الحسن اگلے دن آفس پہنچا۔ وہ اس فرم میں چیف اکاؤنٹنٹ تھا۔

اسٹاف کے لوگوں کی زبانی یہ سن کر اسے افسوس ہوا کہ فرم کے مالک سیٹھ راج کمار اگروال آج بھی آفس نہیں آسکیں گے، کیوں کہ ان کی طبیعت

پوری طرح سنبھلی نہیں ہے — بلڈ پریشر ابھی تک نارمل نہیں ہوا ہے۔

نجم الحسن نے آفس کا کام تھوڑا بہت نپٹا دینے کے بعد سیٹھ جی کی عیادت کے لیے جانے کا فیصلہ کیا — اس نے ہیڈ کلرک بنرجی بابو اور کیشیر ونود شرما کو بھی ساتھ لے لیا۔

'اگروال ہاؤس' پہنچنے کے بعد سیٹھ جی کو ان کی آمد کا علم ہوا تو وہ اندر سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آگئے۔ بولے "ارے بھئی' یہ آپ لوگوں نے کیوں کشٹ کیا۔ میں بھگوان کی دیا سے اچھا ہوں۔ بس ڈاکٹر نے ریسٹ لینے کا مشورہ دیا ہے سو کام کاج سے ذرا الگ ہو گیا ہوں ——"

بنرجی نے پوچھا "دوا چل رہی ہے نا؟"

سیٹھ جی نے کہا "ہاں، پریشر کم کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے ٹیبلیٹ ہیں۔ دن میں دو بار لینا پڑتا ہے۔ بہت آرام ہے۔ کل نہیں تو پرسوں آفس پہنچ جاؤں گا۔"

"انشاءاللہ" ! نجم الحسن نے کہا۔

سیٹھ جی نے پوچھا۔ "نجمل! یہ شبد تم برابر بولتے ہو۔ آخر اس کا مطلب کیا ہے؟"

"اس کا مطلب ہے۔" نجم الحسن نے وضاحت کی۔ "اگر بھگوان نے چاہا تو آپ آفس ضرور پہنچ جائیں گے۔"

سیٹھ جی بولے "پھر تو یہ بڑے سندر شبد ہیں! بے شک بھگوان کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔"

ونود شرما نے کہا "ہاں! ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔"

سیٹھ جی آہستہ آہستہ کسی اشلوک کا جاپ کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد سیٹھ جی کو کچھ خیال آیا۔ وہ بنرجی بابو سے بولے۔

"حاجی سلیمان اینڈ سنس کا چیک آپ نے بھجوا دیا تھا۔"

"جی وہ تو دو دن پہلے ہی جا چکا ہے۔"

"اچھا کیا آپ نے۔ وہ بڑے نیک لوگ ہیں۔ ان کا کام رکنا نہیں چاہیے۔"

سیٹھ جی کے یہاں سے اٹھنے کے بعد تینوں آفس کی طرف چلے۔ نیتاجی سبھاش روڈ سے نکل کر تنگ گلیوں کو پار کرتے ہوئے وہ لٹن اسٹریٹ کی طرف مڑنے ہی والے تھے کہ ونود شرما نے کہا۔ "ادھر سے نہیں۔ آج شکروار ہے۔ بڑی مسجد میں اتنی بھیڑ ہو جاتی ہے کہ جمعہ کی نماز لوگوں کو سڑک پر پڑھنی پڑتی ہے۔ راستہ جام ہوگا — آئیے اُدھر سے نکلتے ہیں۔"

وہ سبزی منڈی ہو کر آفس چلے گئے۔

سیٹھ جی تیسرے دن یعنی سوموار کو آفس آئے تو یوں لگا جیسے آفس

"انشاءاللہ" ! نجم الحسن نے کہا۔

سیٹھ جی نے پوچھا۔ "نجمل! یہ شبد تم برابر بولتے ہو۔ آخر اس کا مطلب کیا ہے؟"

"اس کا مطلب ہے۔" نجم الحسن نے وضاحت کی۔ "اگر بھگوان نے چاہا تو آپ آفس ضرور پہنچ جائیں گے۔"

سیٹھ جی بولے "پھر تو یہ بڑے سندر شبد ہیں! بے شک بھگوان کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔"

ونود شرما نے کہا "ہاں! ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔"

کا وقار لوٹ آیا ہو۔ جیسے آفس میں زندگی نے نئی انگڑائی لی ہو۔ ہر کام میں تیزی آگئی۔

آرام چیئر پر دراز سیٹھ جی کاغذات دیکھ رہے تھے کہ یکایک فون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے ریسیور اُٹھایا۔ "ہلو — ہاں میں اگروال بول رہا ہوں۔ کہیے سوامی جی! کیسے ہیں؟"

سوامی جی : آج کا اخبار دیکھا آپ نے ؟

سیٹھ جی : نہیں۔ کیوں، کوئی خاص بات ہے؟

سوامی جی : بہت بری خبر ہے!

سیٹھ جی : کیوں! کیا بات ہوئی؟

سوامی جی : ایک بڑے نیتا رتھ یاترا پر نکلے ہیں۔

سیٹھ جی : کیوں؟

سوامی جی : یہی دیش بھگتی کا پرچار کرنے کے لیے۔ ان کی یاترا میں ہمارا شہر بھی شامل ہے۔

سیٹھ جی : اچھا —!

سوامی جی : رتھ دس تاریخ یعنی برہسپت وار کو یہاں پہنچ رہا ہے۔ اس لیے آج شام ٹیگور بھون میں ہم نے ایک ہنگامی میٹنگ رکھی ہے۔ آپ کو اس میں آنا ہے۔ اور سوچ بچار کر کے کوئی فیصلہ لینا ہے۔ دیش بھگتی کا اپدیش اچھی بات ہے۔ لیکن یہ کیسی دیش بھگتی —؟ چنتا جنک ہے! ■■

ڈاکٹر مشتاق اعظمی، اعظمی مینشن، 25 جی ٹی ستر اروڈ، کشوری گلی، آسنسول ۔ 713 301

موبائل: 9002140625

یاد کے بے نشاں جزیرے سے

رخشندہ روحی

شکیب کی سالانہ چھٹیوں کے انبار میں سے چند دن بچوں کے اصرار پر نکل ہی آئے۔

ہماری شادی کی پچیسویں سالگرہ دو دن بعد تھی۔ بچوں کو سالگرہ سے نہ معلوم کیوں اتنی خوشی ہوتی ہے کہ ان کا بس چلے تو گارڈن میں لگے پیڑ پودوں کی بھی سالگرہ جوش وخروش سے منا لیں۔ شادی کی سلور جبلی اور ۱۰۱۰۱۰ کے ہندسوں نے مجھے بھی کچھ جذباتی بنا دیا اور میں نے حامی بھر لی، کسی ہل اسٹیشن پر چلنے کی۔ اس شرط پر کہ اپنے پاپا کو وہ خود منائیں گے۔ بچوں نے گلے میں جھول کر، رونی صورت بنا کر، گولڈن جبلی سے پہلے کہیں نہ ساتھ چلنے کے پختہ وعدے کے ساتھ شکیب سے دارجلنگ کے ٹکٹ کی ای بکنگ کے لئے کریڈٹ کارڈ کا نمبر اگلوا ہی لیا۔ بھلا ہو 'ای ٹکٹ' کی آسانی کا کہ گھر بیٹھے دلّی سے دارجلنگ کے ٹکٹ منٹوں میں بک ہو گئے۔ بچے شکیب کو اپنے پروگرام کی تفصیلات ایک سے بڑھ کر ایک پرزور پرشور آوازوں سے بیان کرنے لگے۔ مگر فیض کے کلام سے ان کی نظر ہٹے تو وہ کچھ سمجھ پاتے۔ شکیب کو کتابوں سے اتنی رغبت ہے کہ انہیں کھانا پینا تو کجا سونا بھی یاد دلانا پڑتا ہے۔ آج میں نے جوان بچوں کی توانائی کو محسوس کیا اور ان کے ہاتھ سے ڈھیرے سے کتاب لے لی۔

اس بڑے شہر میں اتنی آپا دھاپی میں دن بھاگتے رہتے ہیں کہ کچھ کام ہمیشہ ملتوی کئے جاتے رہتے ہیں۔ کوئی لمبی چھٹی آئے تو انہیں کیا جائے۔ مگر وہ لمبی چھٹی... اچانک اتنی تنگ ہو جاتی ہے جہاں سے کوئی گنجائش کوئی ناپ تول ان کاموں کو مکمل نہیں کر پاتی۔ بچے ٹین ایج سے آگے کی سیڑھی پر چڑھ گئے ہیں۔ ان کے ذہن ہماری قدروں ہمارے اصولوں کو فرسودہ قرار دے کر ہمیں نئی روشنی نئی تہذیب کا باب ازبر کرانے کے لیے کوشاں ہیں۔ ہماری سمجھداری شائد اسی میں پوشیدہ ہے کہ ان کی جدید شاہراہوں کی، آلودگی سے پاک فضا میں کھل کر، پھیپھڑوں کو پھلا کر تازہ آکسیجن اپنے اندر بھر لیں اور زائد ہوا کو واپس چھوڑ دیں۔

کپڑوں کی، سوکھے ناشتے اور کھیل کی لسٹ تو آناً فاناً تیار ہوئی اور اس پر عمل درآمد شروع کر دیا گیا۔ شکیب نے بچوں کی سکڑتی ناکوں کی پرواہ کئے بغیر اپنی تجیم شجیم کتابیں ہینڈ بیگ میں بھر لیں۔ ٹیکسی راتوں رات فون پر آ کر دروازے کی گھنٹی بجانے لگی۔ کیا زمانہ ہے، سیل فون سے ایک کال کرو اور نصف گھنٹے میں ٹیکسی کے نام پر ایک خوش شکل ڈرائیور اور ایک اے سی کے دم پر من چاہے موسم والی من پسند کار باادب آ کر آپ کے حضور میں خم ہو جاتی ہے۔

صبح سویرے کی سبک گام ہوا کا مزا لینے کا خیال بالکل بے جا ہے۔ بچوں کی ناکیں اور سکڑ کر کہیں چہرے سے الگ نہ ہو جائیں۔ اس لیے دم مار کر اے سی کی خنکی سے ہی کار کے سیاہی مائل شیشوں کے دوسری طرف شفق کی، گلابی سے سرخ ہوتی لجائی سی رنگینی کو اپنے دل میں بھرتی رہی۔ رات کو آدھی رات بیتنے کے بعد سونا اور صبح کا نام ونشان مٹ جانے پر اٹھنا، شکیب کے ساتھ رہ کر بس ایک یہی کمی ہر رات اور صبح کھلتی۔ نہیں تو میری خوش نصیبی کی مثالیں دی جاتی رہیں۔ اور ہیں بھی ہم مثالی شادی شدہ جوڑا!

''مما... اسٹیشن۔'' احمر میرا کندھا ہلا رہا تھا۔

میں نے زیادہ سے زیادہ سامان اٹھایا اور ٹیکسی کے باہر نکل گئی۔

ریلوے اسٹیشن کے پبلک ایڈریس سسٹم پر نشر ہونے والا، اور اکثر سمجھ میں نہ آنے والا اعلان سنا... آج بھی کچھ نہ سمجھی۔ میں ہی نہیں وہاں موجود ہر فرد ایک دوسرے کا سوالیہ نشان کی طرح ٹیڑھا منھ دیکھ کر سمجھ گئے کہ کوئی کچھ نہیں سمجھا تھا۔ لیکن سب سمجھنے کی اداکاری کرتے رہے۔ قلی سے معلوم ہوا کہ ہماری ٹرین ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہے، کہرے کی وجہ سے اور لیٹ ہو سکتی ہے۔ ہم سب کی غصے بھری بے بسی کا شکیب نے اپنی کتابوں کی موجودگی سے مطمئن مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ویٹنگ روم کے دروازے کی ٹیک سے ایک ٹانگ پر اپنا توازن بنا کر مڑے ہوئے صفحے کا

کونا سیدھا کیا اور کتاب میں گم ہو گئے۔ رات اپنے آخری پہر کی سیاہی کو صبح کی نارنجی چادر میں لپیٹنے لگی۔ احمر اور نائمہ کولڈ کافی کی لذت اپنے ہونٹوں میں دبائے کانوں میں آئی پوڈ کی لہروں سے آنکھوں کو مچ مچارہے تھے۔

میں گرم چائے کے کلہڑ میں اپنی کھوئی مٹی کی مہک میں گم... مسافروں کی آنکھوں میں لاتعلقی اور بے حسی کے سائے دیکھ رہی تھی۔ کتنا اجنبی ہے یہ دور! بھینسوں، بیلوں کا جھنڈ... کیسے ایک دوسرے کی موجودگی سے یکسر انجان ہوا کرتا ہے۔ سڑک پر بیچوں بیچ صرف اپنے میں گم... کوئی کچھڑ جائے یا کوئی پولس کے ڈنڈے کھائے یا کوئی ٹرین کے سامنے کھڑا ہو جائے ... جہاں دل نے کہا چل دیے، جہاں کھانے کی شے نظر آئی، منھ مار دیا۔ کچھ ایسی ہی ہے آج کل کی جنریشن... کوئی لڑکی کسی کی ہوس کا شکار بنے یا کوئی کار کسی کے اعضا کو ٹکڑوں میں بانٹ ڈالے، راہ گیر اپنی راہ پر بھاگتا رہتا ہے... کسی کے گلے سے سونے کی چین، ہاتھ سے پرس لے اڑے... نہ کوئی پلٹتا ہے نہ کسی کو احساس ہوتا ہے... ٹھیک ہی تو ہے۔ کئی بار مداخلت پر جان تک گنوانی پڑ جاتی ہے تو ایسے میں کون کسی کے لیے آواز اٹھائے؟

ٹرین کی آمد نے اسٹیشن کا دل دہلا دیا۔ یہ ہماری منزل کو جانے والی ٹرین نہ تھی... ٹرین کی حرکت دھیمی پڑ گئی... ٹرین کے ادھ کھلے دروازے پر ایک دوسرے سے طاقت کا مظاہرہ خوب رہا... اترنے والے مسافر چیخ وپکار کرتے رہے... چڑھنے والے ان پر بھاری پڑے اور پیروں کا قیمہ بنا کر فاتحانہ چہروں کے ساتھ اپنے سامان کو کھڑکیوں سے کمپارٹمنٹ کے اندر پھینکنے لگے... پولس والوں نے مونچھوں پر تاؤ دے کر خالی چہروں سے اپنے ڈنڈے اپنی گول مٹول توند کے سہارے کھڑے کیے اور حالات سے لطف اندوز ہونے لگے۔

''پکڑو... پکڑو...'' ایک شور اٹھا... ایک آدمی سامنے والے پلیٹ فارم سے کودا اور... ٹرین کی پٹریوں پر بھاگنے لگا... ٹرین میں ٹھنسے تمام چہرے حرکت میں آگئے۔ پولس کے ٹھہرے ہوئے ڈنڈے ان کی گول مٹول توند کے زیر سایہ ڈگمگائے اور سست چال سے وہ معاملے کی تفتیش میں ٹرین کی پٹری کی طرف ٹہلنے لگے... شکیب کتاب بیگ پر ڈال کر دوڑ گئے... ان کے پیچھے کئی اور لوگ... ٹرین بے حد سستی سے رک گئی...

ٹرین کی پٹری پر... ایک لمبا دبلا وحشی نوجوان جس کے بکھرے بال چہرے کو ڈھکے ہوئے تھے، کئی ہاتھوں کے شکنجے میں جکڑا کھڑا تھا۔ پولس اب سمجھ گئی کہ کوئی آتنک وادی کسی شرپسندی کے ارادے سے ٹرین کی پٹری پر اتر پڑا ہے۔ لڑھکتے ہوئے پولس کے دو تین جوان جو کسی طرح بھی جوان نہ تھے بمشکل پٹری پر کودے۔ ان کے جسم اتنے ڈھیلے تھے، جیسے کئی بوتل نیند کی گولیاں کھائی ہوں۔ یا پھر مفت کی چڑھا لی ہو۔ اس درجہ فربہ جیسے کھلا پلا کر تیار کیا گیا چربی چڑھا قربانی کا بکرا۔ چربی کے بوجھ سے اس کی ٹانگیں رک رک کر چل رہی ہوں۔ چہرے جذبات سے عاری جیسے موت کی سزا پائے ہوئے مجرم۔ لوگوں کی گرفت سے اس کو جھپٹنے کے لیے، ان کے ڈھیلے جسم تنتنا نے لگے... اس کو گھسیٹ کر پلیٹ فارم پر لایا جا چکا تھا۔ میں نے ادھوری چائے کا کلہڑ ڈسٹ بن میں زور سے دے مارا۔ غصہ پولس کی حرکت پر تھا اور کلہڑ بے چارہ اپنی جان سے گیا ساتھ میں چائے بھی۔ احمر اور نائمہ اپنے آئی پوڈ کے ہیڈ فون اپنے ہاتھوں میں لیے کافی ناخوش لگ رہے تھے۔ انکے گانے یا پھر فلموں کے سین ڈسٹرب ہو گئے تھے۔

میں نے اشارے سے دونوں سے کہا کہ میں وہاں جا رہی ہوں۔ احمر نے مجھے روکنا چاہا اور نائمہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا ''مما پلیز اِٹس پولس کیس ہے۔''

میں نے گرم نظروں سے اسے دیکھا اور اپنا ہاتھ دھیرے سے چھڑا کر اسی طرف چل پڑی جہاں اب کافی بڑی بھیڑ جمع ہو چکی تھی۔

پولس اس کو ایسے دبوچے ہوئے تھی جیسے مرغ کو ذبح کیا جانے کے لیے اس کے پروں کو مروڑ کر ایک دوسرے میں اٹکا دیا گیا ہو۔ اس کا چہرہ اب بھی کالے سفید الجھے ہوئے بدرنگ بالوں میں چھپا تھا۔ وائرلیس پر مزید پولس اور تفتیشی اہل کار بلائے جا رہے تھے۔ وہ بالکل آرام سے سیدھا کھڑا تھا۔ شکیب بھیڑ کے اندر تھے اور میں بھیڑ کے گھیرے میں گھسنے کی کوشش کر رہی تھی... کہ ایک پولس والے نے اس کے بے ترتیب بالوں کو اپنے ڈنڈے سے بے دردی سے ہٹا دیا۔ اسی نوچ کھسوٹ میں اس کے چہرے کی گوری سفید جلد کئی جگہ سے ادھڑ گئی۔ میں بھیڑ میں شکیب کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ شکیب نے مجھے دیکھا اور پھر مجھے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ ایک بڑا افسر بھیانک سائرن کو بجا کر بھیڑ میں اپنے لیے ایک راہ داری بناتا ہوا اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اسے دونوں توندوالوں نے ایڑی بجا کر سلیوٹ مارا... اور 'آتنک وادی' کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ بڑے افسر نے اس کے گرہ گیر بالوں کی جھولتی لٹوں کو سمیٹ کر اس کی گردن پر ڈال دیا۔ اس کے چہرے پر اپنی چوڑی ہتھیلی سے بھرپور وار کیا... 'سڑاک' کی آواز پر مجمع میں ایک سسکی ابھری اور اسی پل خوف سے دم توڑ گئی۔ مگر وہ ہلے ڈلے بغیر اپنی جگہ پر کھڑا رہا...

''سالے دیش دروہی...'' گالیوں کا طوفان بے روک ٹوک اس کے

خاندان در خاندان کو نئے نام دے گیا۔

"ہاتھ آگے کرو۔" مضبوط مکا اس کی کمر پر پڑا... اس کی ٹانگیں لڑکھڑائیں اور اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ بھیڑ کا گھیرا تنگ ہونے سے وہ ہمارے کافی قریب آ گیا... پولس کو اب صرف یہ فکر لاحق تھی کہ اس درندے کو جلد از جلد حراست میں لے کر اپنی پہونچ سے دور پرموشن کو ایک ہی جھٹکے میں کیچ کر لیا جائے۔ کھینچ تان میں ہم اس کے قریب سے قریب تر ہوتے گئے... اس نے صرف میری طرف دیکھا، اور دوڑ کر میرے پاس آنے لگا۔ پولس آفیسر اس کے پیچھے بھاگا... مگر وہ بالکل میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں شکیب کی کمر سے لگ گئی... شکیب نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی کمر کی طرف کر کے مجھے باندھتے ہوئے جکڑ لئے۔ میرے ہاتھ میں پانی کی بوتل کانپنے لگی۔ وہ شکیب کے سامنے آ کر رک گیا...

"آپ مجھ سے ڈریئے نہیں... میری باجی! میرے دل میں جو خیال تھا اسے میں اب بھلا چکا ہوں... میرے سامنے آیئے... مجھ سے چھپئے نہیں... حنا باجی!"

شکیب نے مجھے اور زور سے کس لیا... وہ شکیب کے داہنی طرف کھڑا ہو گیا۔ میری آنکھیں پھٹ کر باہر نکل آنے کو تھیں...

"میں آپ کو کچھ نہیں کہوں گا... میری باجی... حنا باجی..." شکیب نے میرے ہاتھ سے پانی کی بوتل لے کر کہا۔ "پانی پیو گے۔"

وہ ملتجی نظروں سے شکیب کو دیکھ کر بولا "ہاں۔ ان سے کہو مجھے پانی پلا دیں... میری باجی ہیں نہ یہ... ان کے ہاتھ سے پیوں گا۔" پولس اس اچانک افتاد سے اور اپنے میڈل اور پرموشن پر پکڑ ڈھیلی ہوتے دیکھ کر سکتے میں کھڑی تھی۔ شکیب نے مجھے سنبھال کر اس کے سامنے کر دیا۔ بوتل میرے ہاتھ میں پکڑا دی۔ میں لکڑی کے ڈانواڈول لکشمن جھولے پر کھڑی تھی۔ شکیب نے میرا کانپتا ہاتھ تھام لیا۔ وہ چلایا... "میں کچھ نہیں کہوں گا... مجھ سے ڈریئے مت" شکیب نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ مجھے کوئی غیبی طاقت اس کی طرف بہا کر لے گئی۔ میں نے پانی کی بوتل اس کی طرف بڑھا دی۔ وہ گھٹنوں کے بل میرے سامنے جھک گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کا کشکول بنا دیا... اس کی سفید ہتھیلیوں پر سرخ دھانی ابھری ہوئی بدھیاں میرا منہ حسرت سے تاک رہی تھیں۔ میں نے پانی کی دھار اس کی دہکتی ہتھیلیوں پر ٹپکا دی۔ وہ جیسے جنم جنم کی پیاس بجھا رہا تھا...

... میرے گھر کے صدر دروازے سے تین گھر چھوڑ کر اس کا گھر تھا۔ ہمارے قصبے کے جانے مانے روحانی طبیب کا پوتا، خضر!

تلے اوپر چھ بچوں کے بعد بچا تھا وہ۔ دیسی گھی کی گرم بالوشاہیاں حلوائی بڑے کڑھاؤ سے اتار رہے تھا اور خدام پورے محلے میں خوشی خوشی بانٹ رہے تھے۔ میں امی کے ساتھ ننھے نازک سے منے کو دیکھنے گئی تھی۔ میں دو سال کی تھی امی کہتی تھیں کہ میں نے رو رو کر کہا تھا کہ امی منے کو گھر لے چلیں۔ یا مجھے دوسرا منا لا دیں۔ اور خدا نے میری دعا قبول کی۔ ایک سال کے اندر میرا چھوٹا بھائی آ گیا۔ میں اس میں ایسی کھوئی کہ اس ننھے نازک سے منے کو بھول گئی۔

وہ بے حد بیمار رہنے لگا اور تقریباً سات سال میں چلنا سیکھ پایا۔ بولنا دس سال میں شروع کیا۔ مگر سمجھنا... کبھی نہیں۔ گھر میں بند رہنے سے برسوں کسی نے اسے نہ دیکھا... اسی غم میں اس کے ابو اُسے امی کی ذمہ داری بنا کر بھیگی آنکھوں کو خاموشی سے بند کر گئے۔ خضر بیس سال کا ہو گیا... اور جب جب میرے گھر آیا... مجھ سے شادی کی خواہش کا اظہار علی الاعلان کرتا رہا۔ میں ہنستی تو وہ خاموشی سے سر جھکائے چلا جاتا۔ میری شادی کے بعد جب بھی آیا امی سے میرے آنے کا وقت پوچھتا۔ کبھی صحیح اور اکثر غلط وقت بتا کر امی اسے ٹال دیا کرتیں... کئی بار شکیب کے سامنے آیا اور دو تین بار بچوں کے سامنے بھی۔ مگر کہا کچھ نہیں... اور ایک دن اس کی امی بھی نہ رہیں۔ وہ گھر سے بھاگ گیا... اور آج اس طرح...

پانی کی بوتل میں ایک گھونٹ پانی بچا تھا... اس نے مجھے دیکھا... اس کے چہرے کی تڑخی ہوئی جلد میں سیرابی کی نمی چمکی... آنکھوں کی وحشت زدہ پیاس ملائم ہو گئی... بالوں کی گرہوں کی الجھن میں لچک پیدا ہوئی... طلوع ہوتے سورج کی نوخیز کرن اس کی ویران نگاہوں میں جگمگائی... مجھے دیکھتے دیکھتے... اس نے میرے ہاتھ سے بوتل چھین لی... اور... پوری قوت سے میری مخالف سمت دوڑ گیا... میں اس کی پشت پر بھیڑ کو بھاگتے دیکھتی رہی...

وہ رینگتی ٹرین میں چڑھ گیا... ٹرین نے رفتار پکڑ لی۔ پولس ٹرین کے دروازے کا ہینڈل پکڑتی رہ گئی...

"کرپیا دھیان دیجئے" میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔

میرے دونوں بچے مجھ سے چپٹے کھڑے تھے... شکیب میری آنکھوں میں پیار اور اطمینان سے دیکھ رہے تھے۔ سورج کی سنہری کرنیں پھیل چکی تھیں...

لاؤڈ اسپیکر پھر بیدار ہو گئے۔ شاید ہماری ٹرین کے آنے کا اعلان ہو رہا تھا... مجھے ہمیشہ کی طرح کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اناؤنسر نے کیا کہا... ■■

Rakhshanda Ruhi, A-115, Pocket A DDA Flats Sukhdev Vihar, New Delhi-110025, Email- ruhi1970@yahoo.co.in

تمل دلت کہانی

لڑکی جو دھنواں ہوگئی

باما

ترجمہ: بلقیس ظفیر الحسن

چنئی کے نزدیک واقع اتھیرامیرور کے ایک پرائمری اسکول میں پڑھانے والی باما کی نگارشات تمل زبان کے دلت ادب کی منفرد آواز مانی جاتی ہیں۔ ان کے دو ناول 'سنگتی' (2005) اور 'ورنم' (2002) ناقدین اور قارئین میں بہت سراہے گئے۔ 2001 میں ان کی 'بچپن کی یادیں' (کارکو) کو کراس ورڈ پرائز بھی دیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ ان کے افسانے کے انگریزی ترجمے 'دج گرل' پر مبنی ہے

''کام پر آنا ہے تو بچے کو ساتھ نہیں لانے کا''

'موتھالالی' (مالک) چلّا رہا تھا۔

''کیسے نہیں لاویں۔ دودھ مونہا بچہ ہے۔ گھر پر کیسے چھوڑ دیں۔'' کلی اما جواب میں کہہ رہی تھی۔ مرغ کی پہلی بانگ کے ساتھ کلی اماں یہاں آجاتی ہے۔ گوبر میں پانی ڈال کر اس نے ڈیوڑھی کی پتائی شروع کر دی۔ ''اپّاہ (ابّا) چوتا ہے اپی!''

''ہم نہیں جانتے۔ یہ تمہارا معاملہ ہے۔'' بے دردی سے کہا جا رہا تھا۔ ''تیرے گھر میں بڑی لڑکی ہے۔ اس کے حوالے کر کے آیا کر۔ کیا؟ اسکول جاتی ہے؟... ہونھ!... پڑھ لکھ کر کون سا تیر مار لے گی۔ یہ سب نہیں چلے گا۔ بچے کو کل سے کام پر لے کے نہیں آنا ہے۔ بس!!'' نادری حکم دے دیا گیا۔

دوسرے دن صبح صبح کلی اما نے گھڑے اٹھائے اور پانی لانے سڑک کی طرف چل پڑی۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ ''بھلا ہو ان کا جنھوں نے گلیوں گلیوں پائپ ڈال کے پانی ملنے کا اتنا اچھا انتظام کر دیا۔ نہیں تو اسی پانی کے لئے کتنے کنوئیں جھانکنے پڑتے تھے۔'' ایک گھڑا ابھر کے کمر پر دوسرا سر پر رکھتے ہوئے کلی اما نے سوچا۔ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی گھر پہنچی تو اس کا شوہر متھوکروپن بیٹھا مل گیا۔ ''کائے کرنے کا؟ موتھالالی بچہ نئی لانے کو بولا۔ رامائی پر چھوڑ کے آنے کو بولتا ہے۔ بول کائے کرنے کا۔''

''ہاں! میرے کو بھی بولا۔'' متھو سوچ میں پڑا بولا۔

''مگر پھر یہ پڑھنے کیسے جاوے گی؟''

''بچہ اسکول ساتھ لے جاوے؟ ہاں، ایساچ کرنے کا۔ پڑھائی بھی ہو جاوے گی اور بچہ بھی دیکھ لے گی'' ماں نے بیٹی کی طرف دیکھا۔ ''رامائی! کرے گی نا؟... لے پکڑ یہ دس پیسہ! رووے تو بسکٹ تھما دینا۔ اُدر کو کھانا ملتا چ ہے۔ بھائی کو اس میں سے کھلا دینا۔ تیرا اپا اور ممّی شام کو آ جاویں گے۔ پکڑ۔ 'کوزو' پکڑ! جلدی سے گٹک جا اور اسکول بھاگ۔ کام پر جانے میں دیری نکو۔'' آٹھ سال کی رامائی کو اسکول جانا ویسے بھی کون سا اچھا لگتا تھا۔ کہنے لگی ''اماں موتھالالی کے گھر چ نہ چلیں؟ نئی تو گھر میچ رہن دے۔ ہم اس کو سلا کے ''بچی اما کا ساتھ کھیتوں پر چلے جاویں گے۔ سب بول رہے تھے آج گوپالا سوامی کے کھیتوں کی کٹائی ہونے والے ہے۔ وہاں سے گرے پڑے دھان بٹور لاویں گے۔ نئی تو 'کمنا' (ندی) پر جاکے مچھلی پکڑیں گے۔''

'کمنا' پر جانے کا سنتے ہی متھوکروپن آگ بگولا ہو گیا۔ برافروختہ ہو کر چلانے لگا۔ ''کیا بولی؟ کمنا پر جاوے گی؟ اُدر جانے کا نئی! بالکل نئی جانے کا۔ ندی کا چڑھاؤ دیکھا ہے؟ گلے گلے پانی چڑھا ہے۔ مصیبت میں پڑ جاوے گی۔ کمنا پرنئی جانے کا۔ کبھی ممّی کیا بول رہا ہے؟ دیکھ تو! کیسے دیدے نکال کے دیکھ رہی ہے! ایک دن پھوڑ کے رکھ دیں گا میں تیرے دیدے۔ بھاگ یہاں سے۔ ماں جو بولا ویساچ کر! اسکول جا۔ کھانا ملے گا اُدر! اس کو بھی چٹا دینا تھوڑا۔''

باپ کے درشت لہجے سے سٹپٹائی رامائی نے جلدی جلدی کوزو حلق سے اتارا۔ بھائی کو کمر پر لادا کھانے کی پلیٹ پکڑی اور اسکول کی طرف چل پڑی۔ مطمئن ہو کر کلی اما اور متھوکروپن اپنے اپنے کام پر چلے گئے۔ طلوع آفتاب کے ساتھ گھر سے نکلے یہ لوگ رات گھرنے کے بعد ہی واپس آتے ہیں۔ موتھالالی کے یہاں کمر توڑ مشقت کے بعد باسی بھات کے ساتھ بچی کچھی سبزیاں کھانے کو دی جاتی ہیں، اور فصل کی کٹائی کے بعد دھان کی دو بوریاں اجرت کے طور پر ان کے لئے مقرر ہے۔ رامائی ان کی پہلی اولاد

ہے۔ اس کے بعد آٹھ سال تک ہر بار اسقاط حمل ہوتے رہنے کے بعد کہیں جا کے کروپا سوامی کا جنم ہوا ہے۔

اسکول پہنچتے ہی رامائی نے بھائی کو اپنے قریب فرش پر لٹا دیا اور دوسرے بچوں کے ساتھ پہاڑا پڑھنے میں شامل ہوگئی۔ ابھی تھوڑی دیر بھی نہیں ہو پائی تھی کہ اس کی ہم جماعت چنی امنا ایک دم سے کھڑی ہوگئی۔

''ایتھاں! رامائی! تمہارا بھائی! ہگ رہا ہے۔'' اور چلانے لگی۔ ''سار... رامائی کا بھائی... سار ٹٹی کر رہا ہے۔''

ماسٹر جی نے سنتے ہی ناک چٹکی میں دبالی۔ اور گرج کے کہنے لگے۔ ''بچے کو لائی؟ کیوں لائی؟ نکل باہر۔ باہر نکل!'' اور ماسٹر جی کی ڈپٹ سے بوکھلائی رامائی نے جھٹ بچے کو اٹھایا، باہر دوڑ گئی۔ زمین پر بھائی کو لٹا کے ریت سے اس کو صاف کیا۔ اندر آئی تو اسے دیکھتے ہی ماسٹر جی کے غصے کا پارا اپنی حدیں پار کرنے لگا۔ ویسے بھی وہ تیز لہجے میں بولیں تو رامائی کپکپانے لگتی ہے۔ ''بول! بچہ اسکول لے کر کیوں آئی؟ بتا!'' وہ چیخ کر بولے تو، رامائی سہم کر کہنے لگی۔ ''ماں بپا کام پر جاتے ہیں۔ موتھالالی بولا بچہ نئی لانے کا... ماں بولی... منی لے آئی...''

''بے وقوف، گدھیا! لے آئی! یہاں بدبو اور گندگی پھیلانے! واپس جا... گھر... واپس بھی!... فورا!...'' حکم دیتے ہوئے ماسٹر جی بچوں کو ساتھ لے کر باہر درختوں کی چھاؤں میں چلے گئے۔

رامائی نے کاغذ کا ٹکڑا اٹھا کے فرش صاف کیا بھائی کو اٹھا کے کمر پر لادا کھانے کی پلیٹ ہاتھ میں پکڑی اور کلاس روم سے باہر نکل گئی۔

چلی تو وہ گھر کی طرف ہی تھی۔ مگر راستے میں کمنا کا گھاٹ پڑتا ہے۔ اپنی گلی کے بچوں کو وہاں کھیلتے دیکھا تو اپنے آپ کو روک نہ سکی۔ اس کی دوست چپی امنا بھی وہیں کھڑی مل گئی۔ اور دونوں کمنا میں چھلانگ مار کے تیرنے لگ گئیں۔ تیرتے تیرتے بھی رامائی کی نگاہ بھائی کی طرف ہی لگی ہوئی تھی جسے اس نے کنارے پر لٹا دیا تھا۔

کمنا میں اتنا پانی کوئی آٹھ دس برس بعد آیا تھا۔ کسی نے باندھ کا تختہ اٹھا دیا تھا شاید! تاڑی کے نشے میں جھومتے لوگ جی بھر کر مچھلی کا شکار کر رہے تھے، ان دنوں گلی گلی مچھلیوں سے اٹا اٹ بھر گئی تھی۔ اور مچھلیاں بھی کیسی! پیروں اور بازوؤں جیسی لمبی بگڑی، 'جلیبی' اور 'کنڈا' مچھلیاں تو بالکل سمندری مچھلیوں جیسی مل رہی تھیں۔ کمنا کے گھاٹ پر دھوبی کپڑے دھو رہے تھے۔ بچے تیراکی میں مگن تھے۔ ان سے ذرا دور لوگ مویشیوں کو نہلانے میں لگے ہوئے تھے۔ جہاں جہاں پانی ٹھہرا نظر آتا لڑکے بالے مچھلی پکڑنے کے کانٹے ڈال کے بیٹھ رہے تھے۔ چھوٹی عمر والے لڑکوں کو چوکیداری کا کام سونپ دیا گیا تھا۔ کمنا میں ماہی گیری کا کانٹریکٹ لینے والا کسی کو مچھلی پکڑتے دیکھ لیتا تھا تو نہ صرف مچھلیاں بلکہ کانٹے اور ڈور تک ضبط کر لیتا تھا۔

تیرتے تیرتے رامائی نے اپنے باپ کو آتے دیکھ لیا۔ بیل گاڑی لئے اسے دھونے کمنا کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ رامائی جھٹ پانی سے نکل لہنگا باندھتی ہوئی اپنے بھائی کو اٹھانے لگی تو متھو کروپن کی نگاہوں کی زد میں آ گئی۔ دیکھتے ہی دہاڑنے لگا۔ ''اِدر کائے کو آئی تو! تیرنے کو نہیں آنے کو بولا تھا۔ کھلنڈری کہیں کی۔ کچھ سمجھ نئی! مار کھائے بنا بھیجا میں کچھ آتا ج نئی۔'' اور بیل گاڑی چھوڑ کر رامائی کو پکڑنے دوڑ پڑا جو اسکول کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ کمر پر بھائی کو لادے۔ کھانے کی پلیٹ مضبوطی سے پکڑے۔ متھو نے اسے اسکول میں داخل ہوتے دیکھ لیا تو اس کا تعاقب چھوڑ کر اپنے کام کی طرف لوٹ آیا۔ گائے اور بیلوں کو نہلانے کے بعد انھیں گئوشالے میں دودھ دوہنے کی جگہ پر باندھنے سے پہلے بیل گاڑی کو دھونے کا کام اسے انجام دینا تھا۔ اور ابھی تک اس نے ایک بیل کو بھی نہیں نہلایا تھا۔ جلدی جلدی نہلانے لگا تو دوسرا بیل اس کی نظر بچا کے پانی میں اتر گیا اور پلک جھپکتے ہی بیچوں بیچ پانی میں پہنچ گیا۔

''کِدر بھاگا جا رہا ہے رے تو!'' متھو چلایا۔ ''کیا سمجھتا ہے رے تو اپنے آپ کو! دوسرا گاڑی بیل سب اُدر کھڑا ہے کہ نئی؟ تو کہاں گھسا جا رہا ہے کمنا کا پیٹ میں! جا جا! کتی دور جائینگا۔ واپس بچ آنے کا ہے نا۔'' بیل کے ساتھ بندھی گاڑی بھی پانی میں ہچکولے کھا رہی تھی متھو دوسرے گاڑی بانوں سے اس پر نظر رکھنے کو کہہ کے دوسری گایوں اور بیلوں کو لانے دوڑ گیا۔

''اِنا لے... تو بیل گاڑی کیسے چھوڑ آیا۔ جا پہلے اسے لا کے یہاں باندھ۔ پھر دوسرے مویشیوں کو نہلا کے دودھ بھی نکالنا ہے تجھے۔ بھاگ یہاں سے۔ تو بیل گاڑی کیسے چھوڑ آیا۔''

''تا سوائی! ایک بیل کو نہلا کے پیڑ سے باندھ آیا ہے منی! دوسرا اوالا پانی میں گھس گیا گاڑی کا ساتھ! منی و دوسرا لوگ کو اُنے دیکھنے کو بول آیا ہے!'' یہ سن کے موتھالالی اور بھی خفا ہو گیا۔ ''بے وقوف! نکما! دو ہزار کی گاڑی کو پانی میں چھوڑ دیا؟ بھوسا بھرا ہے کیا تیری کھوپڑی میں! اسے کچھ ہو گیا تو؟ سمجھ لے تیرا کیا ہوگا۔ تو تو گیا! بھاگ! دوڑ جلدی! واپس جا۔ فوراً۔ کمینہ۔ کتا!'' بدحواس متھو کروپن واپس دوڑ گیا۔

بیل گاڑی ابھی تک پانی میں پڑی تھی۔ ایک منٹ ضائع کئے بغیر متھو پانی میں کود گیا اور ہچکولے کھاتے آگے اور آگے بڑھتی بیل گاڑی کو پکڑنے ہاتھ پیر مارتا بڑھنے لگا اور کب وہ کمنا کے بیچوں بیچ پہنچ گیا اسے اس کا پتہ ہی نہیں چلا۔ ایک بار نگاہ اٹھا کے کنارے کی طرف دیکھا تو اس کے حواس

جاتے رہے۔ چاروں طرف سے کنا سمندر کی غرانے مارتی لہروں کی طرح اس پر بڑھی چڑھی آرہی تھی۔ ان مہیب لہروں سے کیسے نکلنا ممکن ہوگا؟

اس کی ہمت جواب دینے لگی۔ گھبرا کے مدد کے لئے کنارے پر کھڑے لوگوں کی طرف ہاتھ ہلانے لگا۔ کنارے کے لوگوں نے دیکھ لیا اور اس کی مدد کے لئے تختے پھینکنے لگے کہ وہ انھیں پکڑ کر واپس آسکے۔ مگر تختے اس تک پہنچتے اس سے پہلے ہی متھو کروپن پانی میں غوطے کھا کھا کے ڈوب گیا۔

دیکھتے دیکھتے کنا کے گھاٹ پر لوگوں کی بھیڑ جمع ہوگئی۔ ناریل کے تنے اور تختے ڈالے جارہے تھے۔ زندہ یا مردہ، متھو کو پانا تو تھا۔

اسکول بند ہونے پر رامائی بھائی کو کمر پر لادے گھر جارہی تھی۔ گھاٹ پر جواتنے لوگوں کی بھیڑ دیکھی تو وہاں پہنچ گئی۔ ہیچی انا بھی وہیں کھڑی تھی۔

''ہیچی! کیا ہوا؟ اتنے لوگ کیوں ہیں یہاں؟'' وہ بھائی کو کنارے پر لٹا کے پوچھنے لگی۔

''اری تیرے بپا کا واسطے! پانی میں گیا تو باہر ہی نہیں آیا۔''

''ارے۔۔۔ اوہ! کوئی ڈرنے کا بات نہیں۔ پانی کنا گہرا ہو بپا کو باہر آنا آتا ہے۔'' رامائی نے کہا اور اطمینان سے سر جھلاتی کنارے کی طرف بڑھنے لگی جہاں عورتیں اس کی ماں کو پکڑے بیٹھی تھیں۔ کلی لتا چیخیں مار مار کے رورہی تھی۔ رامائی اس کے پاس پہنچی تو اس کی چیخیں دہاڑوں میں بدل گئیں۔

''پانچ بج چکے ہیں۔ ابھی تک اس کا پتا نہیں چلا۔''

''پانی بھی تو الغاروں بھر گیا ہے کنا میں۔ اسے پانا بہت مشکل ہے بھائی۔''

''لاش نہیں ملی تو کریا کرم کس کا کریں گے۔''

اسی طرح کی باتیں ہورہی تھیں تبھی شور ہوا۔ لاش مل گئی تھی۔ تختے پر اسے لاتے دیکھ لوگوں نے زوروں سے رونا شروع کردیا۔ نیم کے پیڑ کے نیچے متھو کا مردہ جسم دیکھ کے کلی لتا اپنے بچوں کے ساتھ اس پر گری جارہی تھی۔ اس کی آہ و بکا سن کے لوگوں کے کلیجے شق ہونے لگے جو گھاٹ سے اٹھ کے کھیتوں کے پار پہنچ رہے تھے۔

''اتنے برسوں سے رہ رہا ہوں یہاں۔ مگر ایسی بے وقت موت ابھی تک نہیں دیکھی تھی۔''

''ستیاناش ہو موتھالالی کا۔ ایک بیل گاڑی کے لئے!''

''موت کے منہ میں ڈال دیا غریب کو!''

''کبھی بھلا نہیں ہوگا اس کا دیکھ لینا۔''

''ارے ایک بیل گاڑی چلی جاتی تو کیا ہوتا۔ دوسری آجاتی۔ آدمی واپس لاسکتے ہیں کیا؟ گیا تو گیا۔''

''مار ڈالا اسے ظالم نے۔''

''ارے نہیں بھائی! اس کا کیا قصور ہے؟ اتنی چڑھی ہوئی ہے کنا۔ بھینٹ لئے بغیر شانت کہاں ہونے والی ہے۔ متھو کی جان لے لی۔''

''ہاں موت آجائے تو کہاں ٹلتی ہے۔ اسی طرح جانا لکھا گیا تھا اس کے لئے۔ کیسے بچ سکتا تھا؟''

''سوچو! کتنا اچھا تیراک تھا۔ اس کے ساتھ ایسا ہوگا۔ کیسے ہوگیا۔''

''اس کا وقت پورا ہوگیا تھا بھئی۔''

''مجھے تو لگتا ہے کسی پریت آتما کی چپیٹ میں آگیا۔ تبھی ہاتھ پیر بیکار ہوگئے اس کے! ڈر گیا ہوگا۔''

''کوئی پریت آتما واتما نہیں۔ کنا کے بیچوں بیچ بھنور ہے۔ خطرناک بھنور۔ اسی میں پڑ گیا ہوگا بیچارہ۔ بھنور میں کوئی پڑ جائے تو باہر کبھی آسکتا ہے کیا؟ یہی ہوا ہوگا اس کے ساتھ۔ اتنا اچھا تیراک ایسے کیسے ڈوب سکتا ہے؟''

''موتھالالی آیا تھا؟'' کسی نے پوچھ لیا۔

''موتھالالی؟ کیوں آئے وہ؟' چا کی لیا، لوگوں کے مرنے پر موتھالالی آتے ہیں کیا؟''

''لوگ بتانے گئے تو بولا۔ کیوں مرنے گیا تھا ادھر۔ بیل گاڑی بہتی بہتی واپس آہی جاتی۔''

'چا کی لیا' لوگ! ایسی باتیں کرتے کرتے شمشان گھاٹ پہنچے اور اسے جلا کے اپنے اپنے گھر واپس لوٹ گئے۔

اس کے بعد وہی ہوا جو ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ رامائی کا اسکول جانا بند ہوگیا۔ اب وہ ہر روز علی الصباح بھائی کو کمر پر لادے ماں کے ساتھ موتھالالی کے یہاں جانے لگی ہے۔ بھائی کی دیکھ بھال کے ساتھ وہاں کے کام بھی کرتی رہتی ہے۔ ایک دن کاموں سے نپٹ کر گھر واپس آنے کے بعد رامائی بھائی کو کمر پر لاد کر گلی میں کھیلنے پہنچی تو ہیچی انا کو دیکھتے ہی اچھل پڑی۔

''اتھا...! ہیچی! پتا ہے کیا ہوا! ہم دھنوان ہوگئے رے۔ دھنوان۔ موتھالالی سو روپیا دیا۔ پورا سو روپیا۔ ہم دھنوان ہوگئے رے۔'' خوشی سے پھولی نہیں سمائی رامئی مٹھی میں دبی گڑ کی ڈلی کتر کتر کے کھاتی ہوئی ہیچی انا کو بتارہی تھی۔ ''بپا پانی میں ڈوب کے مر گیا نا اس کے واسطے۔''

''ڈوب کے مرجانے سے... سو روپیا ملتا ہے؟'' ہیچی کو یقین لانا مشکل ہورہا تھا۔ ''اتھاوا! کیسی بدھو ہے تو! ڈوب کے مرنے سے تھوڑا ہی۔ بیل گاڑی دھوتے ہوئے ڈوب جائیں تبھی دیتے ہیں موتھالالی۔ سو روپیا...!'' اس نے گڑ کی ڈلی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اپنے منہ میں ڈال کے پوری ڈلی ہیچی لتا کو تھمادی۔

''ہم دھنوان ہوگئے رے... ہیچی انا... دھنوان ہوگئے...'' ■■

اڑیا کہانی

چت

گوپی ناتھ مہنتی

ترجمہ: کرامت علی کرامت

گوپی ناتھ مہنتی(1914تا1991) اڑیہ زبان کے مایہ ناز فکشن نگار ہیں اور فقیر موہن سینا پتی کے بعد انہیں اڑیہ زبان کا سب سے بڑا ادیب مانا جاتا ہے۔ 1973 میں انہیں گیان پیٹھ اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ 1981 میں پدم بھوشن کا خطاب دیا گیا اور 1993 میں ان کے ناول، ماٹی متالا(زرخیز زمین 1964) پر 1974 کا ساھتیہ اکادمی ایوارڈ حاصل ہوا۔انھوں نے ناول بھی لکھے ہیں اور افسانے بھی۔ چار ناول، پرجا، دانا پانی، لایابلایا اور دادی بڈھا مشہور ہیں جن کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ 24ناولوں کے علاوہ ان کے افسانوں کے دس مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ان کی تخلیقات میں قبائلی زندگی کا بڑا دردانگیز بیان ملتا ہے۔ادارہ

سگڑیا ساہی کا جگا پلائی جس روز بارابائی اسٹیڈیم میں منعقد کشتی کے مقابلے میں دربھنگا کے رام لاون پانڈے کو ہرا کے کُل ہند کشتی مقابلے کے آخری زینے میں پہنچ گیا، اس روز قلعہ کے میدان میں موجود ہزاروں ناظرین کی برانگیختہ مسرت کی گونج سے گویا آسمان پھٹ گیا تھا۔ ''جگا پلائی کی جیت نہیں ہوئی ہے، بلکہ اُڑیسہ کی جیت ہوئی ہے۔ اُڑیسہ نے بازی جیتی ہے''۔ چارسو یہی احساس کارفرما تھا۔ اُس وقت اُڑیسہ کے عوام کے دلی ارمانوں، امیدوں اور تمناؤں کو پورا کرنے کی علامت تھی اُس پہلوان کی شخصیت جو پہلے سے غیر معروف اور انجانا سا تھا۔ اس کے قریب جانے کے لئے چاروں طرف سے لوگوں کی بھیڑ اُمڈ آئی، انسانوں کے اُس سمندر میں مختلف سمتوں سے موجیں ابھر کر آپس میں ٹکرانے لگیں، کم از کم ایک آدمی گھائل ہو کر ہسپتال میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد اس غیر منضبط ہجوم میں ایسا ہنگامہ کھڑا ہوا کہ عوام پر قابو پانے کے لئے پولس اور فوج کو بلانے کی ضرورت پڑی۔

اُس روز جو لوگ گھر کو لوٹے تھے، ان میں سے کسی کی قمیص پھٹی ہوئی تھی، تو کسی کے جسم میں درد تھا۔ کسی کی گھڑی گم ہو گئی تھی تو کسی کا قلم کھو گیا تھا۔ لیکن ہر شخص کے سینے کے اندر بیدار تھا اُڑیا ہونے کا قومی شعور۔ اس کے علاوہ اور بھی کچھ تھا جسے کہا جا سکتا ہے ''ایک مردِ غازی کی سرشاری''۔ جیسے ہر شخص محسوس کرتا ہو کہ وہ ایک جگا پلائی ہے۔ اخبار میں اُس مشہور کشتی کی تصویر آئی۔ اُڑیا کا ہر اخبار جگا پلائی کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ 'اُڑیسہ کی مایۂ ناز ہستی جگا پلائی'، 'فخرِ اُڑیسہ جگا پلائی'، 'اُڑیسہ کا یکتا پہلوان جگا پلائی'، 'کٹک میں لاثانی کشتی کا مقابلہ'، 'ورزش کا بادشاہ جگا پلائی'، 'ناقابلِ تسخیر ملہر ورزش کا نیا کارنامہ'، اسی قسم کی بہت سی سرخیاں۔

اخبار گاؤں کے علاقوں میں پہنچنے کے بعد وہاں بھی ہلچل مچ گئی۔ کئی لوگ اپنی قسمت کو روئے کہ وہ لوگ اس واقعہ کو اپنی آنکھوں سے براہِ راست دیکھ نہیں سکے۔ ضلع کٹک کے ہمید ھرپاڑہ کے نزدیک کھیت سے چشمہ جاری ہونے پر چند دنوں تک جو تیرتھ کا میلا تھا، وہاں نہ پہنچنے پر جس طرح چند لوگوں کو افسوس رہ گیا، گو بندو وادی میں پوری نہ جا سکنے کی وجہ سے جس طرح بعض لوگوں کو تاسف رہا، اُسی طرح اس خبر نے بھی بعض لوگوں کے دلوں میں جذبۂ تاسف بیدار کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ آیا ہے مسرت آمیز احساس 'فخرِ اُڑیسہ کی جیت ہوئی ہے'۔ بہت سے لوگ اس بابت جذباتی ہو گئے۔

اس واقعہ کے بعد جو ہفتہ بھر گزرا اسے کہا جا سکتا ہے 'جگا پلائی کا ہفتہ'۔

ریل، بس، ہوٹل اور گاؤں کی بھاگوت منڈلی غرض کہ ہر جگہ پلائی کی کُشتی کا تذکرہ۔ خلا میں راکٹ کے ذریعہ انسان کو بھیجنے کی خبر، کانگو میں لومبا کی موت اور اس کے بعد کانگو کی سیاست میں روز بروز کا اتھل پتھل، پنچایت سمیتی ضلع پریشد کے انتخاب میں ہار جیت کی خبر، ملک کی بہت سی چونکا دینے والی خبروں پر حاوی ہوگئی جگا پلائی کی کُشتی۔ آئندہ سال بھر شادی کے لئے کوئی سعد تاریخ نہ ہونے کی وجہ سے اُسی پندرہ دن کے اندر سیکڑوں شادیاں منعقد ہوئیں۔ وہاں ایک دوسرے سے یہی سوال پوچھتا ''تم جگا پلائی کی کُشتی دیکھنے گئے تھے؟ کیسی لگی؟'' نہ دیکھنے پر بھی جواب دینا پڑتا ''بہت اچھی، بہت بڑھیا۔'' دیکھنے سے انکار کرنا گویا پوشیدہ جرم کے اقرار کرنے کے مترادف تھا۔

اُسی جگا پلائی ہفتہ کے درمیان دیکھا گیا کہ بھیڑ بھاڑ والے علاقے میں پانچ صفحوں پر مشتمل چھوٹی سی گیت کی کتاب بک رہی ہے۔ شاعر کا نام عابد ہے۔ قیمت دس نئے پیسے۔ کچہری کے آگے، ریلوے اسٹیشن میں، بس اسٹینڈ پر اور بڑے چوراہے کے قریب، ہارمونیم بجا کر اس گیت کو گاتے ہوئے ہاکر وہ کتابچہ بیچ رہے تھے۔ اس میں اسی کُشتی کا بیان تھا۔ شہر کی فوٹو دکانوں میں، حلوائی کی دوکانوں میں، چائے کی دکانوں میں اور پان کی دوکانوں میں اُسی کُشتی کی تصویر کانچ کے فریم میں لٹکتی ہوئی نظر آئی۔

الائنڈ و مبیلا منڈلی، اولنس یو یک منڈلی، گب بست گرام سماج، باکھی ساہی ٹو کرس کلب، گنگ نگر سانسکرتک سماج، اتربار گچھا، مینا منڈی، گھسری کا اوسر دنو دن سماج۔ اسی طرح مختلف اداروں نے جگا پلائی کے لئے مبارک باد کی قرارداد منظور کرکے اخباروں کو بھیجیں۔

اُس زمانے میں جگا پلائی کی مشہور کُشتی نے کئی مفکروں، فلسفیوں اور دانش وروں کے اندازِ فکر و نظر کو بھی متاثر کیا تھا۔

اسی مخصوص ہفتے کے اندر مچھیروں کی سوسائٹی کے سالانہ ادبی اجلاس میں پنڈت جی نے کالی داس کے ناٹک شکنتلا کے بارے میں تقریر کرتے ہوئے اپنے مخصوص لہجے میں کہا ''کلنگاہ ساہیکاہ'' اور اُڑیسہ کے بادشاہ کھار بیلا کی فتح مگدھ کے بارے میں تفصیلی بیان دینے کے بعد ٹیگور کے 'دو بیگھا زمین' سے 'بین کالے ہائے جمدوت پرائے' کا حوالہ دیتے ہوئے نہایت جذباتی ہوکر آنکھ پونچھتے ہوئے ابھگیان شکنتلم پر اپنی پُرمغز تقریر کا اختتام کیا۔ ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک اور مشہور مقرر نے 1803 کے بعد اُڑیسہ میں انگریزوں کے استحصال پر روشنی ڈالتے ہوئے، اس صوبے میں سنسکرت کی تعلیم کو کس طرح دھچکا پہنچا، اس پر اظہار افسوس کیا۔ اس وقت ایسا محسوس ہوا جیسے ان لوگوں کے دبے ہوئے جذبات پھر سے ابھر آئے ہیں۔ جیسے ان کے زخم پھر سے تازہ ہو گئے ہوں۔ لوگ آپس میں گفتگو کر رہے تھے سرئی کیلا، کھرسوان، میدنی پور، منجوسا، بستر جیسے اُڑیسہ سے بچھڑے ہوئے علاقوں کے بارے میں۔

ادھر جبکہ چاروں طرف جگا پلائی کا غلغلہ بلند تھا، اس وقت سگویا ساہی کا جگا پلائی اپنا پرانا پیشہ اختیار کرکے مال گودام میں بورے ڈھونے کا کام کررہا تھا، وہ پندرہ سال کی عمر سے یہ کام کرتا رہا ہے۔ یعنی اس وقت سے جب اس کا باپ اُدھب پلائی ایک دن برسات کے موسم میں مہاجن کی بیل گاڑی اس کے حوالے کرکے اپنے گھر میں چادر اوڑھ کر سو گیا۔ اس کے بعد کبھی نہیں جاگا۔

اُدھب پلائی کو نمونیا ہوگیا تھا۔ محمد یا بازار کے عامل چھوٹے میاں نے اُسے جھاڑ پھونک کیا تھا، ٹینکر ساہی کا گوبند گھڑائی کچہری کے احاطے میں مختلف قسم کی بیماریوں کے لئے طرح طرح کی دوا کی ٹکیاں سجا کے رکھتا ہے۔ تلخ، کسیلا، جھال اور نمکین اس طرح چار قسم کی ٹکیاں کھلائی تھیں۔ اس کے عوض اس نے سات چونیاں لی تھیں۔ تین گھیریا کے بابا جی کروتی گوسائیں نے بتایا تھا کہ بدھ کے دن سڑک میں گھومتے ہوئے، سانڈ کے آگے اٹھارہ گچھا ناڑا ڈال کے سڑک کی دھول پر اس کے پیر کے آگے گر جانے سے بیماری ضرور اچھی ہو جائے گی۔ ایسا ہی کیا گیا۔ لیکن اُدھب پلائی رکا نہیں۔ موت کا شکار ہوا۔ نمونیا سے نجات پانے کے لئے انسان نے کتنی دوائیں ایجاد کی ہیں، یہ جاننے کا اُسے موقع نہیں ملا۔

بڑا شہر، پالنے کے لئے باپ نہیں، کوئی پیسہ نہیں۔ پیسے کی کوئی بچت بھی نہیں۔ دو کمرے والے پھوس کے مکان اور تین کٹھے زمین پر اہل زر کی للچائی نظر۔ گھر میں بیوہ ماں، کم سن دو بھائی جگا اور کھگا، ان کے نیچے بارہ سال کی ایک بہن سرو۔ کچھ لوگ ہمدردی سے مشورہ دینے پہنچ گئے، بولے، اب یہ جگہ بیچ دو، کسی دوسری جگہ جا کر ستے میں ایک مکان بناؤ اور باقی پیسوں میں کاروبار کرو۔ ان کی منطق بھی متاثر کن تھی۔ یہ تو ذرا سا اندرونی علاقہ ہے۔ ورنہ تھوڑی ہی دور میں بڑی سڑک ہے۔ ایک کٹھے کی قیمت سات سو، دو کمرہ مکان کی قیمت شامل ہو تو تین ہزار روپے بھی مل سکتے ہیں۔ لیکن گوشالہ، تلسی پور، بیڑا ناسی یا اُتماپور کے علاقے میں زمین خرید کے گھر بنانے میں کیا اتنا خرچ آئے گا؟

پیچھے کی طرف کالے رنگ کی گندی نالی، دائیں جانب بلغم کی طرح بُھٹ بُھٹ کرتا ہوا سڑا تالاب، بائیں جانب دھوبی کا گھر اور اس سے متصل ایک لمبی بستی ہے۔ سامنے چھ سات ہاتھ چوڑائی والی گلی اور غریب داس

مہاجن کی دو منزلہ عمارت کا پچھلا حصہ۔ نالیوں میں سے کالے رنگ کا پانی بہہ کر سامنے کی اس چھ سات ہاتھ والی کھلی جگہ میں جمع ہوتا ہے۔ بڑھنے لگتا ہے، پھیلتا ہے اور بچھتا ہے۔

لیکن نہ اُدھب پلائی نے اپنی تین پشت کی جگہ کو بیچا نہ اس کے بیوی بچوں نے۔ بہی خواہوں کے مشوروں پر پانی پھر گیا۔

اُسی طرح بہی خواہ دوستوں نے مشورہ دیا تھا کہ اس گھر کے لوگ بھی اس دفعہ اپنے آپ کو بیچ دیں۔ کسی کے یہاں اس کی بیوی نوکرانی بن کر رہ سکے گی۔ ورنہ پیٹ بھرے گا کیسے؟ پندرہ سال کی عمر میں جگا کا چہرہ دیدہ زیب ہو گیا۔ بعض لوگوں نے اُسے بیل گاڑی ہانکنے کے لئے بلایا تو بعض نے لکڑی چیرنے کا فن سکھانے کی دعوت دی۔ بعض لوگوں نے اُسے دوکان میں نوکر رہنے کے لئے کہا۔ ایک صاحب نے اُسے پھسلا کے کہا کہ میرے گھر میں کام کر، بعد میں تجھے کہیں چپراسی کے کام میں لگا دوں گا۔ کسی اعلیٰ خاندانی کا ایک قریبی شخص بولا، تیری قسمت جاگ اٹھی رے، انھوں نے تجھے کیسے دیکھا کیا معلوم، انھوں نے خود کہلوا بھیجا ہے۔ کام وام کچھ نہیں، صرف ان کے ساتھ تو رہے گا۔ وہ جہاں بھی جائیں گے، ان کا معمولی حکم بجا لائے گا۔ کتنا کھائے گا، کتنا پائے گا۔ اس کے اوپر تنخواہ الگ۔ ارے، تیرا پیر زمین پر نہیں لگے گا۔ صرف کار اور ہوائی جہاز میں سیر کرے گا، گدی پر سوئے گا، قیمتی لباس پہنے گا، پیٹ بھر کے مزے دار چیزیں کھائے گا۔ کتنے خوشامدی لوگ تیری طرح طرح کی خوشامد کریں گے۔ تو کسی کو مارے گا تو کسی کو بچائے گا۔ تو بھی ایک طاقت ور انسان بن سکے گا۔ تجھے ان کی بات معلوم نہیں۔ انھوں نے جس کو بھی سہارا دیا ہے، اس کے لئے کیا کچھ نہیں کیا! ارے، وہ انسان ویسے ہی ہیں۔ پیسہ ان کی نظر میں کیا ہے؟ جیسے مٹی اور کنکر۔

جگا پلائی گم صم ہو کر سب کچھ سن رہا تھا۔ اس کے اندر جیسے کوئی شخص کہہ رہا تھا۔ ان سب باتوں پر کان نہ دے! جگا، آنکھ بند کر لے۔

نہیں، وہ نوکری نہیں کرے گا۔ کسی کے سہارے سے وابستہ نہیں ہو گا۔ کتے کو کتنا ہی بڑا کمرہ، موٹی دُم، بھاری بھر کم جسم، کھڑی مونچھیں اور بڑے بڑے دانت میسر ہوں، وہ تو آخر کتا ہی ہے۔ مالک کے بلانے سے فوراً دوڑ جاتا ہے، دُم ہلاتا ہے، جوتوں کو چاٹتا ہے۔ اس کے گلے میں زنجیر بندھی ہوتی ہے اور وہ کیل سے بندھا ہوتا ہے۔ کتا اپنے مالک کے ساتھ کار میں جاتا ہے، اپنے سر کو کانچ سے سٹا کر بڑی بڑی آنکھوں سے راستے کو دیکھتا رہتا ہے۔ اپنی جیبھ کو لپلپاتا ہے۔ لوگ اس کا ناز و انداز دیکھ کر کس قدر پسند کرتے ہیں۔ لیکن جو بھی ہو، کبھی کوئی کہتا نہیں کہ وہ کتے کے سوا اور کچھ ہے۔

پندرہ سال کے جگا پلائی کے ذہن میں جیسے اس کے خون میں رچا بسا ہوا یہ تصور منقش تھا۔ بیڑی کی مٹی بیٹر پر لادنے والے اس کے ماضی کے بے شمار آباؤ اجداد کے خیالات کی روایت نے اس کے خون میں جگہ محفوظ رکھی تھی۔ یک رُخی آن بان شان، شہر میں تین پشت کی رہائش اسے زنگ آلود نہیں کر سکی تھی۔

تمام ترغیبوں سے رخ پھیر کر اس نے اپنا لیا تھا بوجھ ڈھونے کا کام، روزانہ محنت و مشقت کرنے والے مزدور کا دھندا۔ اس کی ماں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ انھوں نے لڑکی کی مدد سے سامنے کے کمرے میں ایک دکان کھول کر بڑا، گلگلا، اینڈری پیٹھا وغیرہ بیچنا شروع کیا۔ جگا کی ماں کا پکوان بہت لذیذ ہوتا ہے۔ فروخت جاری رہی۔ کھگا گھوم گھوم کر مونگ پھلی اور چنا چور بیچنے لگا۔ اس کے بعد ایک بیڑی کے کارخانے میں کام کرنے لگا، بیڑی بنانے لگا۔ چار افراد پر مشتمل یہ خاندان کسی نہ کسی طرح بچ گیا، کوئی مرا نہیں۔ گھر بیچنے کی نوبت نہیں آئی۔ باہر سے سب کچھ جیسا تھا، ویسا ہی نظر آنے لگا۔ چاروں افراد کس طرح بھوک پیاس میں دن گزارتے رہے اور مزے دار چیزوں سے خود کو روکتے رہے، یہ بات باہر والے جان نہیں سکے۔

جگا کے اندر ایک جوش تھا، وہ تھا ورزش کرنے کا جوش اس سلسلے میں اس کی ہمت افزائی کی تھی سگو یا ساہی کے بوڑھے خلیفہ نے، جو اس کے باپ کے منہ بولے باپ کہلاتے تھے۔ پکے آم کی طرح سفید، نوجوانوں کی طرح جسم، سینے تک پھیلی ہوئی تھی سفید ڈاڑھی، چھوٹی چھوٹی نیلی آنکھوں میں بچوں کی سی معصوم نگاہ، سر پر ہرے چھینٹ کی پگڑی بچپن میں اس بوڑھے خلیفہ نے اس کے کاندھے کو ہلا کر کہا تھا، ارے لڑکے، تو ہمارے اکھاڑے میں کیوں نہیں شامل ہوتا؟ ارے اُدھب، اس کو میرے حوالے کر دے۔ اس کو پہلوان بنا دوں گا۔ اُدھب نے ہنستے ہوئے جواب دیا تھا "دے دیا، لے جا اُسے" اُسی روز سے یہ سلسلہ جاری ہے۔

بوڑھے املی کے پیڑ کے نیچے ڈیڑھ قد آدم اونچا احاطہ ہے۔ احاطہ کے آگے دو کمروں والا ایک بہت ہی پرانا مکان ہے۔ وہی ہے خلیفہ کے رہنے کی جگہ۔ بیوی بچے نہیں۔ کبھی تھے کہ نہیں، پتہ نہیں۔ زندگی میں ایک ہی شوق ہے، وہ ہے ان کا مشہور اکھاڑا۔ اکھاڑا قائم ہے اُسی احاطے میں۔

پو پھٹنے سے پہلے جگا اُس اکھاڑے کو جا کر وہاں ڈنڈ، بیٹھک اور مختلف قسم کی ورزش کرتا ہے، کشتی کرتا ہے، لاٹھی گھماتا ہے۔ اکھاڑے میں نہ جانے کتنے لوگ شامل ہوتے ہیں، کتنے لوگ اچانک آنا بند کر دیتے ہیں۔ لیکن اس دیوار سے گھرے ہوئے احاطے میں ایسا کوئی روز نہیں گزرتا جب

سورج کے نکلتے وقت اُس احاطے سے جگو پلائی ورزش ختم کر کے باہر نکلتا ہوا نظر آئے۔

شہر کے دوسرے اکھاڑوں میں کون کون سے لائق آدمی ہیں، ان سب کے بارے میں خلیفہ کو معلوم ہے۔ کسی دوسرے شہر سے کوئی پہلوان پہنچتے سے ان کو خبر ملتی ہے، اس کے بعد دعوت نامہ ملتا ہے، اس کے بعد زور آزمائی چلتی ہے۔ گزشتہ تین سال سے اسی طرح کے کئی مقابلوں میں جگا پلائی تواتر کے ساتھ جیتتا رہا ہے، کبھی ہارا نہیں ہے۔ اتنے بڑے شہر میں جو چند لوگ مقابلے میں اترتے ہیں یا کُشتی سے کچھ تعلق رکھتے ہیں، وہ لوگ جگا پلائی کے نام سے واقف ہیں۔ پوچھنے سے کہیں گے، اس نوجوان کا جسم فولاد کی طرح ہے، جس کو پکڑے گا چھوڑے گا نہیں، اس کی قوت زبردست ہے، اس کی رفتار بجلی کی طرح ہے۔ ان لوگوں میں سے کم ہی لوگ ہوں گے جن کا تعلق دفتر یا کچہری کے جانے پہچانے طبقے سے ہو۔ ان میں سے کسی کی پان کی دوکان ہے تو کسی کی پھل کی دوکان۔ کسی کی چاول دال کی دوکان ہے تو کسی کی سبزی کی دوکان۔ کوئی درزی ہے تو کوئی قصاب۔ کوئی ڈرائیور ہے تو کوئی بڑھئی۔ کسی کا کوئی دوسرا پیشہ ہے۔ اپنے اپنے دھندوں میں وہ لوگ مصروف رہتے ہیں، اشتہار بازی ان کا شیوہ نہیں۔ علاوہ ازیں خلیفہ کی طرف سے بھی چند پابندیاں ہیں۔ اکھاڑے کی پابندیوں کا احترام بھی لازمی ہے۔ اس لئے پہلوان لوگ اپنی قوتِ بازو دوسروں کو دکھاتے نہیں۔ کمزور لوگوں کی بانہیں موڑتے نہیں، سینہ پھلا کے چلتے نہیں۔ دوسروں کی اذیت کے لئے یا پروپگنڈا کے لئے اپنی قوت صرف کرتے نہیں۔ یہی ان کا مشہورہ ہے۔ صرف دسہرے اور محرم کے موقع پر لاٹھی کا کھیل دکھانے کی روایت کو روا رکھا ہے۔ البتہ کبھی کبھار وہ لوگ مقابلوں میں شرکت کرتے ہیں۔

اکھاڑے میں مشق و مزاولت جاری رکھتے ہوئے ایک تنومند پہلوان ہونے کے درمیان میں جگا پلائی نے اور بھی کئی پیشوں کی پیش کش کو ٹھکرایا تھا۔ چوکیداری کے لئے کئی جگہوں سے بلاوا آیا تھا۔ مخصوص لباس پہن کے بندوق یا لاٹھی پکڑ کے کسی کے دروازے پر پہرہ دینے کا کام۔ اچھی تنخواہ۔ دوسری تجویز بھی اور زیادہ چونکا دینے والی تھی۔ خوراکی کے علاوہ ماہانہ تنخواہ الگ۔ اس کے علاوہ مخصوص کام کے لئے خصوصی معاوضہ۔ کام بھی بہت پرانے زمانے کا —— داداگری، جسے آج کل کہتے ہیں غنڈہ گردی۔ دادا اپنی بانہوں کی قوت سے بڑا بادشاہ بن سکتا ہے۔ مختلف پیشوں اور کاروبار میں ایک نئی مملکت کا دروازہ کھل گیا ہے۔ اس کے لئے داداؤں کی ضرورت ہے۔ دشمن کون ہے، یہ بات مالک ہی بتا دے گا۔ آنکھ نکالنے سے لے کر پیر

اُس روز کُشتی ختم ہونے کے بعد جب تھوڑی ہی دور میں لوگ اس کے قریب آنے کے لئے دھکم دھکا ہو رہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ بہت سے اجنبی لوگ اس کو گھیرے ہوئے ہیں۔ کئی سمتوں سے اس پر جگ مگ روشنی پڑرہی ہے اور مختلف زاویوں سے لوگ اس کے جسم کی تصویر لے رہے ہیں۔ اس کے بعد اس پر سوالوں کی بوچھار ہونے لگی۔ ایک سوال کان سے ٹکرایا۔ اس کا جواب مکمل ہونے سے پہلے دوسرا سوال —آپ کتنے سال سے کشتی کر رہے ہیں؟ آپ کے استاد کون ہیں؟ ایں؟ عمر خلیفہ؟

کو لنگڑا کرنا، سر پھٹانا، زبردستی کسی کو گھر کے اندر بند کر کے تالا ڈال کے مخصوص وقت تک روکے رکھنا، رات کو کسی کے گھر میں ڈھیلا پھینکنا، راستے میں کسی کو پکڑ کے بے عزت کرنا۔ اسی قسم کا طرح طرح کا کام۔ کیس چلنے سے مالک ہی مدد کرے گا چاہے وہ خود پکڑا نہ پڑے۔ وکیل لڑیں گے، مقدمہ جاری رہے گا۔ ایک اور تجویز بھی گھر داماد ہو کر سسرال کی جائداد حاصل کرنے کی۔ اس کی صحت اور خوبصورتی دیکھ کر اوپر منزلہ کے جھروکوں سے کوئی اس پر فریفتہ ہے۔ لیکن اس تجویز کو بھی اس نے ٹھکرا دیا تھا۔

صرف وہی پرانا کام۔ لکڑی کے ریزوں اور سمنٹ کے ذروں سے اٹے ہوئے جسم کو لے کر بوروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ تک ڈھونا۔ فی بورا اُجرت متعین تھی۔

اُس روز کُشتی ختم ہونے کے بعد جب تھوڑی ہی دور میں لوگ اس کے قریب آنے کے لئے دھکم دھکا ہو رہے تھے، اس نے دیکھا کہ بہت سے اجنبی لوگ اس کو گھیرے ہوئے ہیں۔ کئی سمتوں سے اس پر جگ مگ روشنی پڑ رہی ہے اور مختلف زاویوں سے لوگ اس کے جسم کی تصویر لے رہے ہیں۔ اس کے بعد اس پر سوالوں کی بوچھار ہونے لگی۔ ایک سوال کان سے ٹکرایا۔ اس کا جواب مکمل ہونے سے پہلے دوسرا سوال — آپ کتنے سال سے کُشتی کر رہے ہیں؟ آپ کے استاد کون ہیں؟ ایں؟ عمر خلیفہ؟ اس سے قبل آپ

خلیفہ کے پاس سے لوٹ کر کسی کو کچھ نہ کہہ کے وہ مندر کو چلا گیا. وہاں کچھ دیر ٹھہر کر جھانجھر کی آواز سے دلی سکون حاصل کر کے گھر لوٹتے وقت سنا. دوکان میں ریڈیو سے وہی کُشتی کی خبر نشر کی جارہی ہے. کچھ دیر کے بعد اخبار کے ہا کر جس وقت اخباروں کے پلندے بغل میں دبائے چلاتے ہوئے دوڑ رہے تھے. تو اس وقت بھی اُسی خبر کو بار بار دھراتے ہوئے سنا گیا. اس کے سر میں جھائیں جھائیں ابھر نے لگی. وہ گھر نہ لوٹ کر سیدھے چلا گیا کاٹھ جوڑی کے ساحل کی طرف.

نے کسی سے جیتا تھا؟ فہرست بتایئے۔ آپ کو کون کون سے انعامات ملے تھے؟ آپ کیا کیا کس مقدار میں کھاتے ہیں؟ آپ شادی شدہ ہیں کہ نہیں؟ آپ کے کتنے بچے ہیں؟ اپنے آپ کو صحت مند رکھنے کے لئے آپ کون کون سے اقدام اٹھاتے ہیں؟ آپ کے خیال میں انسان کو صحت مند رہنے اور لمبی عمر پانے کے لئے کن کن چیزوں کی ضرورت ہے؟

بھیڑ میں سے کوئی چلانے لگا ''صحت کو ترو تازہ رکھنے کے لئے بناسپتی گھی بہت مفید ہے یہ بات آپ مانتے ہیں کہ نہیں؟ ایں! آپ نے کبھی اسے استعمال نہیں کیا۔ نہیں نہیں، ایسی بات آپ نہ کہئے۔''

اور بھی چند سوالات۔ آپ روزانہ کتنی بار چائے پیتے ہیں؟ بالکل پیتے نہیں؟ غلط بات، کہئے نا حضور!

آپ کون سی بیڑی استعمال کرتے ہیں؟

کون گزا کو استعمال کرتے ہیں؟

آپ کس سیاسی پارٹی کے حامی ہیں؟

ہمارے ملک میں جو نئی تبدیلیاں آرہی ہیں، ان کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ کس وقت آپ کے یہاں جانے سے ملاقات ہوگی؟ آپ کی تصویر، اس کے نیچے ہمارے مصنوعات پر آپ کی رائے اور اس کے نیچے آپ کے دستخط، اس طرح ہم شائع کریں گے۔ سنیما میں سلائڈ دیں گے۔ پیسے کوڑی کی لین دین کا معاملہ بعد میں طے ہوگا۔ اس میں کیا دشواری ہے؟

حضور، ذرا دستخط، آپ کا آٹوگراف۔ تھیلم ٹھیلا، گہنی کے ٹہوکے اور دھکم دھکا شروع ہونے کے بعد بہت سے سوالوں کا خود بخود حل نکل آیا، کیونکہ کوئی بھی سوال کرنے والا لمحے بھر سے زیادہ اپنے مقام پر کھڑا نہیں رہ سکا۔ جگا پلائی کو بڑی بے چینی محسوس ہوئی۔ وہ گم صم کھڑا رہا۔ اس کے بعد ہاتھ جوڑ کر معذرت چاہی۔ اس کی بھی تصویر اٹھائی گئی۔ اس کے بعد ایک طرف کو مڑ کر بھیڑ کو چیرتے ہوئے دوڑ بھاگا۔ ڈر لگتا تھا کہ وہ لوگ کہیں اس کا پیچھا نہ کریں۔

سب سے پہلے گیا اپنے استاد خلیفہ کے نزدیک۔ پیروں کو چھوا۔ اس کو اٹھا کر، اس سے بغل گیر ہو کے اور اس کی پیٹھ میں اپنی ڈاڑھی گھستے ہوئے خلیفہ نے کہا ''واہ پٹھے، تو نے میرا نام بلند کیا ہے، بیٹا۔''

باقی جتنے لوگوں نے اس کی تعریف کی تھی، اس کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ جو کچھ سنا، ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیا۔ ایک آدمی جیتتا ہے تو دوسرا ہارتا ہے۔ اسی طرح دوسرا شخص ہار گیا، وہ جیت گیا۔ اس واقعہ سے اس نے صرف اتنا ہی مطلب سمجھا تھا۔

خلیفہ کے پاس سے لوٹ کر کسی کو کچھ نہ کہہ کے وہ مندر کو چلا گیا۔ وہاں کچھ دیر ٹھہر کر جھانجھر کی آواز سے دلی سکون حاصل کر کے گھر لوٹتے وقت سنا، دوکان میں ریڈیو سے وہی کشتی کی خبر نشر کی جارہی ہے۔ کچھ دیر کے بعد اخبار کے ہاکر جس وقت اخباروں کے پلندے بغل میں دبائے چلاتے ہوئے دوڑ رہے تھے، تو اس وقت بھی اسی خبر کو بار بار دہراتے ہوئے سنا گیا۔ اس کے سر میں جھائیں جھائیں ابھرنے لگی۔ وہ گھر نہ لوٹ کر سیدھے چلا گیا کاٹھ جوڑی کے ساحل کی طرف۔ بہت دیر سے رات کو گھر لوٹا تو دیکھا کہ گھر والوں نے اس کے لئے بڑے اہتمام سے کھانا سجا رکھا ہے۔

یعنی چاول، دال، آلو کا بھرتا، اس کے ساتھ تلا ہوا بیگن اور مچھلی کا شوربا۔ ان لوگوں نے اسے اپنے سینوں سے لگا کے اور تعریفیں کر کے اپنے اپنے انداز سے اس کا استقبال کیا۔ چند بستی والوں کے سوا اس سے اور کوئی ملنے نہیں آیا۔ اس نے ذرا سکون کی سانس لی۔ اس کے دوسرے روز وہی ورزش کا سلسلہ اور اس کے بعد وہی بورے ڈھونے کا کام۔

روپے پیسے یا ذاتی زندگی کے بارے میں اس نے اور کسی سے کچھ نہیں کہا۔ اخبار والوں نے صرف اتنا ہی چھاپا تھا کہ وہ ایک مزدور ہے۔

اس کے بعد اس کا تعارف کیسے مشہور ہو گیا تھا، یہ اسے نہیں معلوم۔ لیکن مال گودام کے جس علاقے میں وہ بوجھ اٹھاتا ہے، روزی کماتا ہے، اس کی تعریف گھنے کہرے کی طرح وہاں بھی پھیل گئی تھی۔ اس کے کاموں

میں دخل اندازی کرکے وہاں بھی لوگ اس کے بارے میں اوراس کی کشتی کے بارے میں دریافت کرنے لگے۔ ان لوگوں نے اس کی ستائش کی تھی۔ ہندوستان بھر میں کشتی کے میدان میں اس کا مقام کتنا بلند ہے اور اُسی کی وجہ سے اُڑیسہ کا نام کتنا بلند ہوا ہے، یہ بات لوگ اس کو سمجھانے لگے۔ اس کے تصور میں اس کے مستقبل کا نقشہ کھینچتے ہوئے بتایا تھا کہ اس کے بعد اگر وہ آخری مقابلے میں کامیاب ہو جائے گا تو وہ اس سے بھی زیادہ تعریف وتوصیف کا حق دار قرار دیا جائے گا اور اسے اُڑیسہ سے باہر تو کیا ہندوستان سے باہر بھی کشتی کے لئے جانے کا موقع ملے گا۔ ایسی صورت میں وہ جائے گا سری لنکا، سنگاپور، منگولیا، پیکنگ، جاپان، روس، جرمنی، امریکہ، افریقہ اور بہت سے دیگر ممالک کو۔ بے انتہا عزت و دولت حاصل کرنے کا وقت آگیا۔ ذرا کوشش کرکے 'نی وا کو پرے' کی آخری کشتی میں اُسے کامیاب ہونا ہی پڑے گا۔

ان لوگوں نے اُسے مشورہ دیا کہ غذا، صحت اور کشتی کی مشق کے سلسلے میں زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ پھل، گوشت، دودھ، وٹامن، اس طرح بہت سی مقوی غذائیں کھانی پڑیں گی۔ ہشیار باش۔ اُڑیسہ کا نام رکھنا پڑے گا، اس کے بعد ہندوستان کا نام بلند کرنا پڑے گا۔

ان مشوروں کو سنتے سنتے اس نے ایک لمبی سانس لی۔ گوشت کے ساتھ اس کی ملاقات ہوتی ہے سرراہے گاہے۔ اس کے حق میں دودھ نایاب ہے۔ پھل سے وہ سمجھتا ہے صرف کیلا اور ناریل۔ اس کی خواہش ہے روزانہ ایک سیر چوڑا چبانے کی، لیکن گھر کا بجٹ آدھے سیر سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتا۔ سب کچھ تنگی سے چل رہا ہے۔

اس کے کچھ دنوں کے بعد دکن کے علاقے سے بورے ڈھونے والے بہت سے مزدور اپنے تمام اہلِ خاندان کے ساتھ پہنچ گئے۔ وہ لوگ پیڑوں کے نیچے رہتے ہیں۔ کھلے آسمان کے تلے سوتے ہیں۔ کسی نہ کسی طرح تھوڑا بہت روزگار کرکے اس سرزمین سے منسلک رہنے کی ان کی بڑی خواہش ہے۔

بوروں کو ڈھونے کی اجرت میں کمی آگئی۔ ایک دن جگا کا چھوٹا بھائی کھگا اپنے کاموں سے نمٹ کر بیڑی کمپنی سے لوٹ رہا تھا کہ ایک کار آکر اس سے ٹکرا گئی۔ اس کا ایک پیر ٹوٹ گیا۔ بدن زخمی ہوا۔ اس کو ہسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ اس کی آمدنی بند ہو جانے کی وجہ سے گھر میں پیسے کی تنگی ہوئی اور جگا کے دن بڑی فکر وتردد میں گزرنے لگے۔

بستی کے ایک سرے پر کسی شخص نے ایک ہوٹل کھولا۔ وہاں پیازی، دوسا، اڈلی بکنے لگیں۔ ان کے علاوہ بہت ساری مٹھائیاں۔ اڈلی کے ساتھ سالن اور چٹنی۔ کھانے کی چیزیں چمکتے ہوئے برتنوں میں پیش کی جاتیں۔ بیٹھنے کے لئے وہاں بینچ کا انتظام ہے۔ سر پر بجلی کا پنکھا گھومتا ہے اور کھاتے وقت کان سے ٹکراتے ہیں ریڈیو کے گیت۔ جگا کی ماں کی دوکان سے گاہک کم ہو گئے۔ اس لئے چاروں طرف سے عسرت اور تنگ دستی اُسے ڈسنے لگی۔

پھر بھی جگا پلائی نے اپنی ورزش کا سلسلہ جاری رکھا۔ چوڑے کا استعمال آدھ سیر سے پاؤ سیر ہو گیا۔ موڑھی چار آنے کی۔ ناریل تین دن میں صرف ایک بیچ والے بھات کے ساتھ پائیں میں اُگے ہوئے پوئی ساگ اور پوئی کے تنے کو اکٹھے ابال کر پیٹ بھرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن پھر بھی بھوک ستاتی رہی۔

جس وقت بورے ڈھونے کا کام نہیں رہتا یا جگا کے پاس کوئی مزاج پرسی کے لئے نہیں آتا تو جگا اس وقت گم صم ہو کر فکر وتردد میں ڈوبا رہتا۔ اس کو لگتا جیسے وہ نہایت اکیلا ہے، اس کا کوئی سہارا نہیں، کوئی دوست نہیں۔ اُس کشتی کے تھوڑے ہی دنوں بعد کسی نے اس کے بارے میں کوئی ذکر نہیں چھیڑا۔

تین مہینے گزر گئے۔ تب آیا اس کی آخری آزمائش کا دن۔ پنجاب کے دلیپ سنگھ کے ساتھ اُڑیسہ کے جگا پلائی کی کشتی۔ اخبار میں اس مقابلے کے نتیجے پر بحثیں شائع ہوئیں۔ سب لوگوں نے اقرار کیا کہ تنومند اور قوی ہیکل دلیپ سنگھ کے ساتھ کشتی کے مقابلے میں جگا پلائی نے قوت وہنرمندی کا جو مظاہرہ کیا تھا، وہ نہایت اعلیٰ پیمانے کا تھا۔ ہر لمحہ محسوس ہوتا تھا کہ دلیپ سنگھ اس دفعہ چت ہو جائیں گے، لیکن بالآخر دلیپ سنگھ ہی نے بازی جیتی۔

دلیپ سنگھ کا تعارف اخبار میں نکلا تھا۔ بہت دنوں سے بڑے بڑے لوگ اس کے سرپرست ومعاون رہے ہیں۔ وہ مختلف اقسام کی غذا کھاتے ہیں۔ ہر روز ان کا وزن لیا جاتا ہے۔ اسی طرح کی بہت ساری باتیں۔

جگا پلائی چت ہوا۔

پھر ریل، موٹر اور دیگر بھیڑ بھڑکوں میں اس کے بارے میں بحث جاری رہی۔ بعض لوگوں نے اس کے خلاف تنقید کی کہ اُڑیسہ کی عزت مٹی میں مل گئی۔ بہت سے لوگ مایوس ہو گئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اُسے بھی لوگوں نے بھلا دیا...

لیکن کشتی کے دوسرے دن جگا پلائی حسب معمول گیا تھا ورزش کرنے کے لئے اور اس کے بعد بورے ڈھونے کے لئے۔ ■■

پروفیسر کرامت علی کرامت۔ موبائل: 9132321694

تخلیق / آسیب / اقبال حسن آزاد

تجزیہ / شبیر حسن / 186

کھادی کا سفید کرتا پاجامہ، فیروزی رنگ کی ایک ہاف سوئٹر اور دوپلی ٹوپی زیب تن کیے یتیم میاں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ دبلی پتلی کایا، درمیانہ قد، پوپلا منھ، رخسار پر کانٹے دار داڑھی اور بڑی بڑی آنکھیں... یا یوں کہیے کہ پھٹی پھٹی آنکھیں... گویا اپنے حلقوں سے نکلنے کے لئے بیتاب... عجیب سی وحشت ان کے بشرے سے ٹپک رہی تھی۔ ایک پل کو بھی چپ ہو گئے۔ جیسے link فیل ہو جانے پر ٹی وی چلتے چلتے اچانک disconnect ہو جاتا ہے۔ پھر وہ جیسے کمرے میں داخل ہوئے تھے، ویسے ہی اُلٹے قدموں لوٹ گئے۔

''یہ بڑے میاں کون ہیں؟'' آصف صاحب نے ایک طویل سانس کو سینے سے آزاد کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہمارے خاندانی نوکر ہیں۔ ابا جان کے ساتھ حویلی میں رہا کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد میں نے انہیں اپنے پاس بلا لیا ہے۔ بے چارے بالکل تنہا ہیں۔'' رحمت حسین نے تفصیل بتائی۔

''آپ لوگوں نے ان کی آنکھیں دیکھیں... کیسی وحشت ناک تھیں... جیسے آسیب زدہ ہوں۔'' آصف میاں نے ایک جھرجھری لے کر کہا۔

''آسیب واسیب کچھ نہیں ہوتا ہے۔ یہ سب دماغ کا وہم ہے۔'' رشید صاحب اپنی روشن خیالی کا ثبوت دیتے ہوئے بولے۔

یتیم میاں ڈرائنگ روم سے نکل چکے تھے مگر ایک لفظ ان کے کانوں میں پڑ ہی گیا۔ وہ بدبدا کر رہ گئے۔

''آسیب!'' اور ان کی آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا گئی اور اس دھند میں دھندلی دھندلی یادیں ان کے ذہن کے پردے پر اُبھرنے لگیں۔

''ماشا اللہ بہت ذہین ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ زندگی میں بڑی کامیابیاں حاصل کرے گا۔'' ماسٹر صغیر اکثر ان سے کہتے۔ بیٹے کی تعریف سن کر کون باپ ہوگا جس کا سینہ فخر سے نہ پھول جاتا ہو۔ سو یتیم میاں بھی پھولے پھولے پھرتے مگر کسے معلوم تھا کہ... انہوں نے ایک سرد آہ کھینچی اور نگاہوں کے سامنے ہنستا کھیلتا انور آ گیا۔ ایک دفعہ انور کی ماں نے کہا۔

''اک ذری پیر صاحب سے تعویذ دلوا دیجئے۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔''

اور وہ ننھے انور کی انگلی تھامے پیر صاحب کی درگاہ جا پہنچے تھے۔ شہر سے باہر ایک نیچی پہاڑی پر احاطہ سے گھری درگاہ انور میاں کو بڑی پر اسرار معلوم ہوئی۔ ان کی بڑی بڑی ذہین آنکھیں حیرت اور ایک نامعلوم خوف سے چونکی سی دکھائی دینے لگیں۔ پھر دونوں باپ بیٹا لکڑی کے بڑے گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔ پیر صاحب کی درگاہ کے سامنے جم غفیر تھا۔ زمانے بھر کے ستائے ہوئے ننگے بُچے لوگ، پریشان حال، سر بہ گریباں پیر صاحب کی جانب امید بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے جو ایک اونچی کرسی پر فروکش اپنی نیلی آنکھوں سے حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ درمیان میں ایک نوجوان، بے ترتیب داڑھی، الجھے میلے بال، آدھے بدن سے ننگا آنکھیں بند کئے زمین پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کا بوڑھا باپ روتا جاتا تھا اور کانپتا جاتا تھا۔

''حضور! اب کیا ہوگا؟ میرا ایک ہی لڑکا ہے۔ حضور میں تو برباد ہو گیا، لٹ گیا۔'' اور پھر وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

باپ کی انگلی تھامے ننھے انور میاں نے یہ سارا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اتنے سارے لوگوں کا جماوڑا اور اس پر سے بڈھے کا رونا۔ انور میاں ذرا گھبرا سے گئے۔ انہوں نے اپنے باپ کی انگلیاں کس کر تھام لیں۔ یتیم میاں نے ایک نظر ان پر ڈالی۔

''ابا! گھر چلیے۔''

یتیم میاں نے ان کا ہاتھ دھیرے سے دبایا گویا انہیں تسلیاں دے رہے ہوں۔ پھر انہوں نے درگاہ کے ایک خادم سے دریافت کیا۔

''اس شخص کو کیا ہوا ہے؟'' خادم نے جواب دیا۔

''آسیبی کیفیت ہے۔''

''اب کیا ہوگا؟''

''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ بعض آسیب جلد پیچھا نہیں چھوڑتے، جان لے کر ہی ٹلتے ہیں۔'' اتنا کہہ کر خادم پیر صاحب کی جانب بڑھ گیا تھا۔

کچن سے شاہدہ نے انہیں آواز دی تو وہ حال میں لوٹ آئے۔ دونوں گھٹنوں پر زور دیتے ہوئے اٹھے اور کچن کے دروازے سے جھانکا۔

''کیا بات ہے، بہو؟''

شاہدہ کچن میں چائے بنا رہی تھی اس نے ذرا نیچی آواز میں کہا۔

''ذرا دیکھ آیئے تو! کتنے لوگ ہیں؟''

''میں دیکھ آیا ہوں۔ کل پانچ آدمی ہیں۔'' یتیم میاں نے کہا۔ شاہدہ نے کمال چابک دستی سے پانچ کپ چائے بنائی اور ایک ٹرے پر لوازمات کے ساتھ انہیں تھماتے ہوئے بولی۔

''ذرا پہنچا دیجئے۔ کم بخت شرفو بازار گیا تو وہیں ست گیا۔''

یتیم میاں نے ٹرے سنبھالی اور بلی کے قدموں سے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ ایک لمحے کو پھر خاموشی چھا گئی۔ یتیم میاں نے سلیقے سے ٹرے میز پر رکھی اور بے آواز قدموں سے واپس مڑے۔ خدمت گزاری کا سلیقہ انہوں نے وکیل صاحب کی حویلی میں سیکھا تھا۔ وکیل صاحب کے جد اعلیٰ سید حمایت علی خاں اپنے علاقے کے چھوٹے موٹے زمیندار تھے۔ 1857 میں جب غدر مچا اور انگریز افسران اپنی جانیں بچا کر ادھر ادھر بھاگنے لگے تو انہوں نے ایک افسر کو پناہ دی چنانچہ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد جب ایک جانب سرفروشان وطن کو پھانسیوں پر لٹکایا جا رہا تھا تو دوسری جانب نمک خواروں کو سرفراز کیا جا رہا تھا۔ سید حمایت علی بھی انگریزوں سے وفاداری کے صلے میں خان بہادر کے خطاب سے نوازے گئے۔ باون گاؤں کی عملداری ان کے حصے میں آئی اور موصوف نواب سید حمایت علی خاں کے نام نامی اسم گرامی سے مشہور ہوئے۔ نوابی ملی تو عیش و عشرت کے دروازے بھی کھل گئے۔ انہوں نے شہر سے باہر ایک پرفضا مقام پر ایک عالیشان حویلی بنوائی۔ لق و دق حویلی اچھی خاصی بستی معلوم ہوتی تھی۔ شہر کی حد جہاں ختم ہوتی تھی وہاں پر ایک پتلی سی ندی تھی۔ ندی کیا تھی بس ایک بڑا سا نالہ سمجھ لیجئے۔ اس نالے کے اوپر ایک نیچا پل تھا... یہی کوئی دس بارہ فٹ لمبا۔ ندی کے اس پار حویلی تھی۔ شہر کے لوگ اسے پار ندی کہتے تھے۔ حویلی کے کئی حصے تھے... مردان خانہ، زنان خانہ، نوکر پیشہ وغیرہ۔ علاوہ ازیں مچھلیوں سے بھرا تالاب اور ایک ہرا بھرا باغ بھی تھا جس میں آم، لیچی، امرود، شریفہ، آڑو اور گابھ کے درخت تھے۔ نواب صاحب کو گابھ کا حلوہ بے حد پسند تھا۔ کہا کرتے تھے کہ یہ پھل اسم با مسمّیٰ ہے۔ اس کے کھانے سے مرد کے اندر عورت کو گابھن کرنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے اور اس کے استعمال سے خلوت کی رعنائیوں میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی نواب صاحب خلوت اور جلوت دونوں جگہ مقبول تھے۔ ہر شام مردان خانے رقص و موسیقی میں محفل سجتی۔ طرح طرح کی ضیافتیں ہوتیں۔ ہر دن عید تھا اور ہر رات شب برات تھی۔ کبھی فیض آباد کی چلبلی منھی جان بلائی جاتیں تو کبھی لکھنؤ سے توبہ شکن زہرہ بائی کو دعوت دی جاتی اور پھر منہ کا مزہ بدلنے کے لئے حویلی کی خادمائیں بھی موجود تھیں:

بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا

اور واقعی خدا اس خاندان پر مہربان تھا۔ اس ہنگامے کے دو سال بعد ان کے فرزند ارجمند نواب وجاہت حسین خاں نے اس جہان آب و گل میں آنکھیں کھولیں۔ جب وجاہت حسین سن شعور کو پہنچے تو ملک میں امن قائم ہو چکا تھا اور راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد انہوں نے اپنے والد ماجد کی روایت کو آگے بڑھایا اور خاندان کا نام روشن کیا۔ حویلی ہر وقت چھما چھم کرتی، در و دیوار کھنکتے اور یہ کھنکتی ہوئی آواز جب گنبد نیلگوں سے ٹکراتی تو چپ کھڑا آسمان آنے والے وقت کا خیال کر کے کانپ سا جاتا۔

بیسویں صدی کا آغاز ہوا تو ملک میں تبدیلی کی تیز لہر چلنے لگی اور آنے والے انقلاب کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ وجاہت حسین نے خود تو اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کی لیکن اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی انہیں بڑی فکر تھی۔ خدا نے انہیں تین بیٹے اور ایک بیٹی سے نوازا تھا۔ بڑے شرافت حسین، منجھلے صولت حسین، چھوٹے کفایت حسین اور سب سے چھوٹی نفیسہ بیگم عرف بانو۔ بھی بچے مولوی سید منظر الحق کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا کرتے تھے۔ مولوی صاحب مظفر پور کے رہنے والے تھے۔ تلاش معاش میں گھومتے گھامتے نواب صاحب کی حویلی تک آ پہنچے تھے۔ عربی اور فارسی پر قدرت کاملہ تھی۔ الفاظ کی ادائیگی میں حرکت اور سکون کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اونچا لمبا قد، کشادہ پیشانی، چشمے کے پیچھے بڑی بڑی روشن آنکھیں اور بلند آواز کے مالک مولوی صاحب زبان کے معاملے میں بڑے سخت تھے۔ ادھر زیر زبر گڑبڑایا ادھر ان کی چھڑی زیر سے زبر ہو گئی۔ نواب صاحب کا حکم تھا کہ تعلیم کے معاملے میں حویلی کے بچوں کے ساتھ کوئی رعایت نہ برتی جائے۔ ایک دفعہ صولت میاں نے شعر پڑھا:

قطع نہ کیجئے تعلق ہم سے
گر نہیں عشق عداوت ہی سہی

شعر سنتے ہی مولوی صاحب بھڑک اٹھے۔

''میاں! قطع قطع کیا بولتے ہیں۔ قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے۔ قاف کے اوپر زبر ہے۔ قطع بمعنی کاٹنا۔ سمجھے۔''

کبھی سمجھاتے۔ ''شمع نہیں شمع کہئے: شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک سحر بمعنی جادو اور سحر بمعنی صبح..... اسی سے سحری بنا ہے۔ سمجھے؟''

اس وقت یتیم میاں کے والد جمن میاں نواب صاحب کی خدمت پر مامور تھے۔ انہیں مولوی صاحب کے پڑھانے کا انداز بے حد پسند تھا چنانچہ جب مولوی صاحب بچوں کو پڑھانے کے لئے بیٹھتے تو وہ کسی نہ کسی بہانے آس پاس ہی گھومتے رہتے اور اپنی اصلاح کرتے رہتے۔ اب وہ نواب صاحب سے دریافت کرتے کہ حضور سحری کے لئے کیا بناؤں؟ نسبین کبھی کبھی ان کی نستعلیق اردو سے چڑھ جاتی مگر جمن میاں تو مولوی صاحب کے مرید تھے اور صحیح تلفظ کے ساتھ اردو بولنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ آج مولوی صاحب ہوتے تو نہ معلوم نئی نسل کی زبان سے بگڑی ہوئی اردو سن کر ان کے دل پر کیا گزرتی۔ اب تو غلط سلط اردو بولنے والے بھی مل جائیں تو غنیمت ہے۔

شرافت حسین سارے بھائی بہنوں میں سب سے زیادہ ذہین تھے۔ جب انہوں نے امتیازی نمبروں سے اسکول کی تعلیم مکمل کر لی تو مولوی صاحب کے مشورے سے انہیں زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے علی گڑھ بھیجا گیا ۔شرافت حسین خاں جب نئے نئے علی گڑھ میں وارد ہوئے اور کلاس میں پروفیسر صاحب نے ان کا تعارف جاننا چاہا انہوں نے بڑی شان کے ساتھ کہا۔

''نواب زادہ سید شرافت حسین خاں۔''

پروفیسر صاحب نے ہنس کر کہا۔''واہ! سید بھی اور خان بھی۔ایک ہاتھ میں قلم اور دوسرے میں تلوار۔''

نواب زادہ سید شرافت حسین خاں نے برجستہ کہا۔

''خان بہادر کا خطاب انگریز بہادر کی جانب سے ہمارے خاندان کو ملا ہے۔بندہ بیک وقت سید بھی ہے اور خان بھی...ٹھیک اسی طرح جس طرح سر سید احمد خاں۔'' اور پروفیسر صاحب ہنس کر چپ ہو رہے۔

شرافت حسین نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔مگر عالمِ بےعمل کی مانند زندگی بھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔بیسویں صدی اختتام پذیر ہوئی اور ایک نئی صدی طلوع ہوئی۔ادھر جیسے جیسے بیسویں صدی کا سورج اوپر اُٹھتا گیا ویسے ویسے انگریزی حکومت کا آفتاب ڈھلنے لگا۔پورے ملک میں ایک نئی لہر چل پڑی اور گاندھی جی کی قیادت میں آزاد ہندوستان کا خواب دیکھنے والے جانباز سر سے کفن باندھ کر سڑکوں پر اتر آئے۔مگر نواب صاحب کی حویلی ان باتوں سے لاتعلق سی تھی۔آنے والے وقت کی دھمک سنائی تو دیتی تھی مگر اس پر کان دھرنے کی انہوں نے کبھی ضرورت ہی نہ سمجھی۔نواب وجاہت حسین کے زمانے والی بات تو نہ رہی تھی مگر ظاہری شان وشوکت میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔درخت اوپر سے تو گھنا اور بڑا دکھائی دیتا تھا مگر اندر ہی اندر کھوکھلا ہو چکا تھا۔پھر بھی مرا ہاتھ سوا لاکھ کا۔شرافت حسین انگریزی تہذیب کے دلدادہ تھے اور سر سید کے ہم خیال۔ٹیبل کرسی پر بیٹھ کر چھری کانٹے سے ماحضر تناول فرمایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر مسلمانوں کو اس ملک میں سر اُٹھا کر جینا ہے تو انہیں جدید تعلیم سے آراستہ ہونا ہوگا۔ان کی تین اولادیں ہوئیں۔شفقت حسین، شوکت حسین اور عنایت حسین۔انہوں نے نواب کا دم چھلا ہٹا دیا تھا البتہ نام کے آگے خان لگایا کرتے تھے۔دن مزے مزے میں کٹ رہے تھے مگر ستم پیشہ آسمان کو کچھ اور ہی منظور تھا۔1946 میں جب جگہ جگہ فسادات کی آگ بھڑکی تو جمن میاں بھی اس آگ میں جل مرے ۔اس وقت یتیم میاں مادرِ شکم ہی میں تھے۔بےچارے پیدائشی یتیم تھے لہٰذا ان کا نام ہی یتیم میاں پڑ گیا۔نواب صاحب کو ان سے خاصی ہمدردی تھی۔انہوں نے بہت کوشش کی یتیم میاں بھی حویلی کے بچوں کے ساتھ چار حرف پڑھ لیں مگر یتیم میاں کے خون میں وفاداری اور تابع داری کی موجیں لہریں مار رہی تھیں چنانچہ جب انہوں نے ہوش سنبھالا تو نواب صاحب کی جوتیاں سیدھی کرنے لگے۔ہمہ وقت ان کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے۔شرافت حسین کی نظرِ عنایت بھی ان پر تھی اور وہ انہیں بےحد عزیز رکھتے تھے۔

اس وقت بہار رخصت پذیر تھی۔سامان سفر بندھ چکا تھا۔پت جھڑ کی چاپ سنائی دینے لگی تھی اور درختوں سے پتے جھڑنے شروع ہو چکے تھے۔ پہلے تقسیم کا سانحہ پیش آیا، پھر زمینداری ختم ہوئی۔لوگوں نے جُوق در جُوق ہجرت کی تو حویلیاں اُجڑ گئیں۔کہیں راجیہ ٹرانس پورٹ کا آفس کھل گیا اور کہیں جیون بیمہ نگم کا دفتر قائم ہو گیا۔بقول شخصے جہاں چنچل ناریاں رہا کرتی تھیں وہاں انچل ادھیکاری نواس کرنے لگے۔چونکہ شرافت حسین نے پاکستان کے نظریئے کو سرے سے خارج کر دیا تھا لہٰذا پار ندی والی حویلی اب تک قائم تھی۔گابھ، چھوہارے اور انڈے کا حلوہ اب بھی بنتا تھا ۔ضیافتیں بھی ہوتی تھیں اور کونڈہ بھی۔شرافت حسین کے دوست یار، خاص طور پر مرزا اطہور علی، جو کھلی موٹر میں آتے تھے اور ترکی ٹوپی زیب تن کیا کرتے تھے، اب بھی قدم رنجہ فرمایا کرتے تھے۔شرافت حسین کو خوب گرم چائے پسند تھی۔کہا کرتے تھے کہ عورت ہو یا چائے...گرم ہی اچھی لگتی ہے۔چنانچہ ایک بڑے سماور میں پانی گرم کر کے رکھ دیا جاتا تھا اور پیالیاں اس میں ڈبو دی جاتی تھیں۔ گرم پیالیوں میں چائے زیادہ دیر تک گرم رہتی تھی بالکل اسی طرح جس طرح اگلے وقتوں کے لوگوں کے جسم میں زیادہ عمر تک جوانی کی گرمی رہا کرتی تھی۔حویلی کے پاس والی ندی سوکھ چکی تھی اور گندی نالی کا کام دیتی تھی مگر چند مٹی مٹی نشانیاں اب تک موجود تھیں۔پل کے اس پار ایک قدیم لیمپ پوسٹ تھا۔ ہر شام لیمپ جلانے والا ایک سیڑھی ہاتھوں میں لئے آتا دکھائی دیتا۔وہ سیڑھی کو لیمپ پوسٹ سے ٹکا کر اوپر چڑھتا، لیمپ کا شیشہ ایک جانب ہٹاتا، لیمپ روشن کرتا اور رات کی گہری ہوتی ہوئی تاریکی میں گم ہو جاتا۔مگر تاریکی اس وقت اور گہری ہو گئی جب شرافت حسین میدانِ سیاست میں کود پڑے۔ کانگریس پارٹی جوائن کی اور اسمبلی کا الکشن لڑا۔اس وقت کانگریس پارٹی کا انتخابی نشان دو بیلوں کی جوڑی تھا۔مخالفین نعرہ لگاتے:

دو بیلوں کی جوڑی ہے

اک اندھا اک کوڑھی ہے

اس انتخاب میں شرافت حسین کی ضمانت ضبط ہو گئی تھی اور کمیونسٹ پارٹی کے امیدوار رام چرن کامیاب رہے تھے۔شرافت حسین کو اپنی ہار کا قلق نہیں تھا مگر اس بات کا افسوس ضرور تھا کہ الکشن کے اخراجات پورے کرنے کے لئے انہیں حویلی سے ملحق زمینوں کو فروخت کرنا پڑا تھا اور اس کے خریدار وہی لوگ تھے جن کے پروج کبھی نواب صاحب کی ڈیوڑھی پر بڑا سا پگڑ باندھے، ہاتھ میں ڈنڈا تھامے اکڑوں بیٹھے رہتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ''حجور! تو ہار کھکھار ہمار اُدار۔''

اس وقت شرافت حسین کے بڑے صاحبزادے عنایت حسین بیس سال کے ہو چکے تھے اور مقامی کالج میں بی اے کے طالب علم تھے۔ شفقت اور شوکت اسکول میں تھے۔ یتیم میاں انہی دنوں حویلی کی ایک کنیز سے رشتہ ازدواج سے منسلک کردئے گئے۔ شادی کے اگلے ہی سال جب جب انور میاں نے اس دنیا میں قدم رکھا تو یتیم میاں کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ جب وہ کچھ بڑا ہوا تو اسے ماسٹر صغیر کے حوالے کردیا گیا۔ اور جس سال عنایت حسین نے لا کالج سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی تو اسی برس انور نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اس کے ایک سال بعد نواب شرافت حسین نے دنیا سے پردہ کیا۔ انور اب کالج کا طالب علم تھا۔ یتیم میاں اسے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ وہ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھا، دل کا سکون تھا، وہ ان کے لئے روح افزا تھا، وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا بھی ان کی طرح نوکر بن کر رہے لہٰذا انہوں نے اس کے اندر خدمت گذاری کا جذبہ ہی نہیں پیدا ہونے دیا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ دنیا میں سر اٹھا کر جئے اور ان کا بھی سر اونچا کرے مگر ہائے افسوس...

عنایت حسین نے ڈسٹرکٹ کورٹ میں پریکٹس شروع کردی۔ وکیل صاحب روز صبح کالا کوٹ پہن کر جاسوسی دنیا سنبھالتے اور رکشے پر سوار ہو کر کورٹ جا پہنچتے۔ دن بھر پان سے شوق فرماتے، چائے پیتے اور جاسوسی دنیا میں کھوئے رہتے۔ کبھی کبھار کوئی بھولا بھٹکا کلائنٹ ان کے پاس آجاتا تو کچھ آمدنی ہو جاتی ورنہ دن یوں ہی گزر جاتا۔ ان کے منجھلے بھائی شوکت حسین نے جب اپنی تعلیم مکمل کرلی تو انہیں HEC رانچی میں سپروائزر کی نوکری مل گئی۔ مگر نوکری کے دوسرے ہی سال وہاں تاریخ کا بدترین فساد ہوا۔ شوکت میاں کسی طرح جان بچا کر بھاگ آئے مگر ایک بار جو آئے تو پھر پلٹ کر نہیں گئے۔ انہوں نے حویلی میں اپنا حصہ فروخت کردیا اور پٹنہ جا کر آباد ہو گئے۔ مگر چھوٹے بھائی شفقت حسین اتنے خوش نصیب ثابت نہ ہوئے۔ انہیں جمشید پور میں ملازمت ملی تھی۔ اور جب وہاں فساد ہوا تو وہ مع اہل و عیال شہید کردئے گئے۔

آزادی کا سورج طلوع ہوئے کافی عرصہ گزر چکا تھا اور برادران وطن اس کا خوب خوب فائدہ اٹھا رہے تھے۔ پرانے پتے جھڑ چکے تھے اور نئی تہذیب کی کونپل پھوٹ چکی تھی۔ آنکھ کا پانی مر چکا تھا اور دل سے مروت ختم ہو چکی تھی۔ ایک دفعہ معمولی سے واقعہ کو لے کر جب شہر کا ماحول بگڑ گیا تو آس پاس کے مسلمان وکیل صاحب کی پناہ میں آگئے گرچہ اس وقت تک وکیل صاحب خود بے پناہ ہو چکے تھے۔ لوگ ساری رات جاگتے رہے تھے۔ ایسے میں ایک منچلا نوجوان گنگنا اٹھا تھا:

آج کی رات بچیں گے تو سحر دیکھیں گے

اگر اس وقت مولوی صاحب موجود ہوتے تو فوراً ٹوک دیتے کہ میاں سحر نہیں، سَحَر بولو۔

اب بہار رخصت ہو چکی تھی۔ باغ ویران تھا اور مالی سر بہ زانو۔ ماسٹر صغیر حویلی چھوڑ کر جا چکے تھے۔ گابھ کا درخت تیز آندھی کی تاب نہ لا کر زمین بوس ہو چکا تھا۔ حویلی کا بیشتر حصہ فروخت ہو چکا تھا۔ سارے نوکر چاکر ڈوبتے ہوئے جہاز کے چوہوں کی طرح ایک ایک کر کے رخصت ہوتے گئے۔ حویلی کے اردگرد نئے لوگ آباد ہو گئے۔ دن رات لاؤڈ اسپیکر پر بھجن کیرتن ہوتا رہتا اور وکیل صاحب زیر لب دعائیں پڑھتے رہتے اور جب بابری مسجد کے انہدام کے بعد جب ملک کی فضا بگڑی تو انہیں صاف لفظوں میں دھمکی دی جانے لگی کہ اگر جان کی خیر چاہتے ہیں تو حویلی کا باقی ماندہ حصہ بھی اونے پونے بیچ کر کہیں اور جا بسیں مگر عنایت حسین بھی خان بہادر کی اولادوں میں سے تھے لہٰذا اپنی جگہ ثابت قدم رہے۔

اکیسویں صدی کا آغاز ہوا تو وکیل صاحب کی بیگم داغ مفارقت دے گئیں اور پھر چند ماہ بعد یتیم میاں کی بیوی بھی گزر گئیں۔ اب صرف حویلی کا مردان خانہ بچا تھا جس کی رنگ و روغن کے لئے ترستی ہوئی دیواروں کو یہ دو نفوس سہارا دئے ہوئے تھے۔ انور گجرات کی کسی فیکٹری میں سپروائزر لگ گیا تھا اور وکیل صاحب کے تینوں بیٹے مختلف شہروں میں ملازمت کرنے لگے تھے۔

وہ نومبر کا ایک اداس دن تھا جب رحمت میاں کو فون پر خبر ملی کہ ان کے والد صاحب اس جہانِ فانی سے گزر گئے۔ سارے بھائی اپنی فیملی کے ممبران کے ساتھ اس آسیب زدہ حویلی میں یکجا ہوئے اور چہلم کے بعد یہ بچا کھچا حصہ بھی فروخت کردیا گیا اور اس طرح ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا۔

رحمت میاں کے دوست چائے کی ہلکی ہلکی چسکیوں کے ساتھ محو گفتگو تھے۔ یتیم میاں ڈرائنگ روم کی دیوار سے لگے بیٹھے تھے۔ اندر سے پھر رشید صاحب کی آواز آئی۔ وہ کسی وکیل کی طرح جرح کرنے کے انداز میں کہہ رہے تھے۔

''میں پھر کہتا ہوں، آسیب واسیب کچھ نہیں ہوتا۔ یہ سب دماغ کا وہم ہے۔'' اچانک یتیم میاں اندر داخل ہوئے۔

''کیا کہتے ہو بابو! آسیب ہوتا ہے، ضرور ہوتا ہے۔'' یتیم میاں ویران آنکھوں سے خلا میں گھورتے ہوئے بولے۔ پھر انہوں نے نہایت پراسرار انداز میں کہا۔

''پہلے تو صرف اکا دکا لوگوں پر آسیب سوار ہوتا تھا۔ آج تو پوری قوم پر آسیب سوار ہے۔ پورب سے پچھم تک اور اتر سے دکھن تک۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ لوگ؟''

یتیم میاں کے کانوں میں ایک دلدوز چیخ گونجی اور نگاہوں کے سامنے خون میں تربتر لاشہ سڑک پر تڑپتا دکھائی دیا۔

یتیم میاں کی زبان سے ایک آہ نکلی۔ ''ہائے میرا انور۔''

ڈرائنگ روم میں ایک آسیب زدہ خاموشی چھانے لگی تھی اور یتیم میاں لرزتے قدموں سے باہر نکل گئے۔ ■■

تجزیہ/شبیر حسن

اقبال حسن آزاد کے افسانوں کے دو مجموعے 'قطرہ قطرہ احساس' (1987) اور 'مردم گزیدہ' (2005) شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانوں میں readability ہے، thrill کے ساتھ سماجی مسائل پر خیالات کا اظہار ہوتا ہے اور زندگی کے جیتے جاگتے مرقعے بھی پائے جاتے ہیں۔

جناب اقبال حسن آزاد کا افسانہ 'آسیب' (مطبوعہ 'ادب ساز' شمارہ نمبر 12۔11، نئی دہلی) اپنی عصری حسیت کی وجہ سے نہایت اہم ہے۔

'آسیب' ایک زمیندار خاندان کی کہانی ہے اور یتیم میاں اُس خاندان کے ملازم ہیں۔ افسانہ نگار نے پہلے ان کو ہی قارئین سے متعارف کرایا ہے۔ یتیم میاں پر جو بیتی یا انہوں نے جو مشاہدہ کیا ہے، اس سے، ان کی شخصیت کی ایک مخصوص شناخت بن گئی ہے، جسے دیکھ کر لوگ انہیں آسیب زدہ قرار دیتے ہیں۔ افسانہ نگار کے الفاظ میں، اُن کا خاکہ ملاحظہ فرمائیں:

''دبلی پتلی کایا، درمیانہ قد، پوپلا منہ رخسار پر کانٹے دار داڑھی اور بڑی بڑی آنکھیں۔ یا یہ کہئے کہ پھٹی پھٹی آنکھیں۔ گویا اپنے حلقوں سے نکلنے کے لئے بیتاب۔''

یتیم میاں کو دیکھنے والے ایک جھرجھری سی محسوس کرتے ہیں۔

''آپ لوگوں نے ان کی آنکھیں دیکھیں۔ کیسی دہشت ناک تھیں۔ جیسے آسیب زدہ ہوں۔''

یتیم میاں کا اپنا دکھ تھا۔ ان کا جوان بیٹا انور، جو اُن کے لئے راحت جاں تھا، عین جوانی میں مارا گیا تھا۔ افسانہ نگار نے یتیم میاں کو شروع میں شاید اس لئے پیش کیا ہے کہ ان کے ہی بیان پر یہ افسانہ ختم ہوتا ہے۔ لیکن اس کا ذکر آگے آئے گا۔

یتیم میاں کے تعارف کے بعد افسانہ نگار نے ایک خاندان کی کہانی بیان کی ہے جس کی زمیندارانہ حیثیت پہلی جنگ آزادی یعنی 1857 کے انقلاب کے وقت قائم ہوتی ہے۔ وکیل صاحب یعنی عنایت حسین کے جد اعلیٰ سید حمایت علی خاں نے اس وقت انگریزوں کی مدد کی تھی جب 1857 کے انقلاب کے وقت ان کے لئے ہندوستان میں زمین تنگ ہو رہی تھی۔ اس صلے میں انہیں انگریزوں نے زمینداری عنایت کی تھی۔ یہی خاندان ملک کے بدلتے ہوئے حالات مشاہدہ کرتا ہوا بلکہ کسی حد تک مجاہدہ کرتا ہوا اپنے رکن رحمت حسین کی نمائندگی میں موجودہ وقت کی دہلیز پر کھڑا ملتا ہے۔

افسانے کا قصہ کچھ اس طرح ہے۔ سید حمایت علی خاں کے بڑے صاحبزادے شرافت حسین ہیں اور شرافت حسین کا سلسلہ بڑھ کر عنایت حسین اور عنایت حسین کے بعد یہ سلسلہ بڑھ کر رحمت حسین تک پہنچتا ہے۔ حمایت حسین نے بڑی شان و شوکت سے زمینداری کی۔ شرافت حسین نے اعلیٰ تعلیم تو ضرور پائی لیکن ملازمت کرنا گوارہ نہیں کیا اور اپنی حویلی کی چہار دیواری میں اپنی زندگی تمام زمیندارانہ مصروفیتوں کے ساتھ تمام کر دی جب کہ عنایت حسین نے وکالت کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ڈسٹرکٹ کورٹ میں وکالت شروع کی۔ عنایت حسین تو کسی طرح اپنی حویلی میں قائم رہے اور زمیندارانہ خو بو کو باقی رکھنے میں کسی حد تک کامیاب رہے لیکن ان کے بچے روزگار کی تلاش میں ادھر ادھر بکھر گئے۔ جب سید عنایت حسین کا انتقال ہو گیا تو ان کے وارثین کے لئے اب قصبے میں رنگ و روغن کو ترستی حویلی کو بچائے رکھنا مشکل ہو گیا۔ لہٰذا تمام وارثین اکٹھا ہوئے اور حویلی کی باقیات فروخت کر کے اپنے اپنے معاش کی طرف واپس ہو گئے۔ اس طرح ایک تاریخی خاندان آغاز، عروج اور زوال کی کہانی مکمل کر کے وقت کے بھنور میں گم ہو گیا۔ اس خاندان نے 1857 کا غدر دیکھا۔ بیسویں صدی کی تحریک آزادی آزادی کا سویرا، تقسیم وطن، فرقہ وارانہ فسادات اور ہجرت کی المناک تصویریں دیکھیں۔ آزادی کے بعد زمینداری کا خاتمہ، ہندوستانی مسلمانوں کی بے کسی، سقوط مشرقی پاکستان، بابری مسجد کی شہادت اور گجرات کے شرمناک فسادات جیسے سانحات ان نسلوں کی آنکھوں کے سامنے سے گزرے۔ گویا یہ افسانہ محض ایک زمیندار خاندان کی زندگی بسر کرنے کی روداد نہیں ہے بلکہ یہ گردش دوراں کا نوحہ ہے۔ اس میں بدلتے ادوار اور موت و زیست کی کہانیاں پوشیدہ ہیں۔

افسانہ نگار نے اس افسانے میں ایک طویل دور کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ یہ دور 1857 سے شروع ہو کر گجرات کے فسادات تک یعنی تقریباً ڈیڑھ سو برسوں کی طویل مدت پر محیط ہے۔ اس طویل مدت میں بہت سارے مختلف ادوار شامل ہیں۔ الگ الگ اقتصادی اور سماجی کیفیات ہیں۔ الگ الگ حادثات اور الگ الگ صورتیں ہیں۔ افسانہ نگار نے اس

طویل دور کو، جو ایک ناول کی وسیع زمین کا متمنی ہے، اپنے افسانے میں اس طرح بیان کیا ہے کہ مذکورہ ادوار کی بدلتی ہوئی تصویریں اُجاگر ہوتی ہیں۔ یہ افسانہ ایک نئے تجربے سے بھی گزرتا ہے۔ چلتے پھرتے انسان محض افسانے کے کردار نہیں رہ جاتے ہیں بلکہ وہ اکثر و بیشتر منجمد ہو جاتے ہیں اور زمانہ بقا کے لبادے میں متحرک ہو کر کردار بن جاتا ہے۔ افسانے کے کرافٹ میں جگہ جگہ زمانہ کس طرح جسم و جاں کی طرح ہم آہنگ ہو کر رونما ہوتا ہے، یہ منظر انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ زمینداروں کی حویلیوں کی عام صورت کو افسانہ نگار نے خوبصورت نثری پیرائے اظہار میں یوں بیان کیا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

''ہر شام مردان خانے میں رقص و موسیقی کی محفل سجتی۔ طرح طرح کی ضیافتیں ہوتیں۔ ہر دن عید تھا اور ہر رات شب برات تھی۔ کبھی فیض آباد کی چلبلی منھی جان بلائی جاتیں تو کبھی لکھنؤ سے توبہ شکن زہرہ بائی کو دعوت دی جاتی اور پھر منہ کا مزا بدلنے کے لئے حویلی کی خادمائیں بھی موجود تھیں: بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا۔''

حویلی کی ایک اور تصویر افسانہ نگار نے یوں پیش کی ہے۔

''حویلی ہر وقت چھما چھم کرتی۔ در و دیوار کھنکتے اور یہ کھنکتی ہوئی آواز جب گنبد نیلگوں سے ٹکراتی تو چپ کھڑا آسمان آنے والے وقت کا خیال کر کے کانپ جاتا۔''

19ویں صدی کے خاتمے کے بعد بیسویں صدی کی تصویر افسانہ نگار نے کچھ اس طرح پیش کی ہے:

''ادھر جیسے جیسے بیسویں صدی کا سورج اوپر اٹھتا گیا ویسے ویسے انگریزی حکومت کا آفتاب ڈھلنے لگا۔ پورے ملک میں ایک نئی لہر چل پڑی اور گاندھی جی کی قیادت میں آزاد ہندوستان کا خواب دیکھنے والے جانباز سر سے کفن باندھ کر سڑکوں پر اتر آئے۔ مگر نواب صاحب کی حویلی ان باتوں سے لاتعلق سی تھی۔''

ملک کی آزادی کے لمحے نزدیک تر آئے تو جگہ جگہ فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔ بہت سارے بے قصور ہندو، مسلم اور سکھ ان فسادات میں مارے گئے۔ پنجاب، اتر پردیش، بنگال، بہار اور دہلی ان فسادات کے خاص مراکز تھے۔ افسانہ 'آسیب' میں ان واقعات کو اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

''1946 میں جب جگہ جگہ فسادات کی آگ بھڑکی تو جمن میاں بھی اس آگ میں جل مرے۔ اس وقت یتیم میاں مادرِ شکم ہی میں تھے۔ بے چارے پیدائشی یتیم تھے۔ لہٰذا ان کا نام ہی یتیم میاں پڑ گیا۔''

یہ افسانہ ایک نئے تجربے سے بھی گزرتا ہے۔ چلتے پھرتے انسان محض افسانے کے کردار نہیں رہ جاتے ہیں بلکہ وہ اکثر و بیشتر منجمد ہو جاتے ہیں اور زمانہ بقا کے لبادے میں مُتحرک ہو کر کردار بن جاتا ہے۔ افسانے کے کرافٹ میں جگہ جگہ زمانہ کس طرح جسم و جاں کی طرح ہم آہنگ ہو کر رونما ہوتا ہے...

اس موقع پر قارئین کو یتیم میاں کا مزید تعارف حاصل ہوتا ہے کہ وہ اس زمیندار خاندان کے خاندانی ملازم جمن میاں کی اولاد ہیں۔ انہوں نے اپنے والد کی محبت نہیں پائی اور نہ ہی اپنی اکلوتی اولاد کا سکھ دیکھ سکے۔ یتیم میاں کا بیٹا انور گجرات ملازمت کے سلسلے میں گیا تھا اور وہاں ہونے والے State Sponsored فرقہ وارانہ فسادات میں مارا گیا تھا۔ اپنے بیٹے کے متعلق یتیم میاں جس خواب کی اپنے ذہن میں پرورش کر رہے تھے، اسے افسانہ نگار نے نہایت فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے:

''ان کی خواہش تھی کہ وہ دنیا میں سر اٹھا کر جیے اور ان کا بھی سر اونچا کرے مگر ہائے افسوس...''

اس ''ہائے افسوس'' سے قاری کے ذہن میں کچھ خدشات اور اندیشے پیدا ہوتے ہیں لیکن افسانہ نگار نے مزید کچھ نہیں لکھا ہے۔ افسانے کے آخر میں بس وہ ایک انفارمیشن دیتا ہے۔

''انور گجرات کی کسی فیکٹری میں سپروائزر لگ گیا تھا۔''

یتیم میاں گو کہ زمینداروں اور نواب زادوں کی جھرمٹ میں ایک حقیر سا کردار ہیں پھر بھی ان کا حوصلہ دیکھئے کہ وہ اپنے ذاتی رنج و محن کو فراموش کر کے پورے معاشرے کی فکر کرتے ہیں اور اسے آسیب زدہ، دکھی، مایوس اور گرفتار بلا قرار دیتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ فرقہ واریت کے آسیب نے نہ صرف انہیں دکھی کیا ہے بلکہ ہزاروں لاکھوں مسلمان اس بلا کی گرفت میں ہیں۔ بقول فیض احمد فیض: یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر

یعنی صبح آزادی، برطانوی استعمار اور ہندوستانی سیاستدانوں کی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے عوام کے لئے رحمت جاں کے بجائے نہ جانے کتنے معصوم لوگوں کے لئے آفت جاں ثابت ہوئی۔ ہندوستانی علاقے میں مقیم مسلمان

افسانہ فلیش بیک سے شروع ہوتا ہے۔ یتیم میاں رحمت حسین کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ وہاں اس کو دیکھ کر حاضرین انہیں آسیب زدہ قرار دیتے ہیں۔ پھر آسیب پر بحث چھڑتی ہے۔ یتیم میاں 'آسیب' کے حق میں اپنی رائے دیتے ہیں لیکن ان کا آسیب فرد واحد کا آسیب نہیں ہے جس سے وہ رو برو ہیں۔ آسیب ان کی نظر میں ملک میں بڑھتی ہوئی فرقہ واریت ہے

بطور خاص مصیبت زدہ تھے۔ بقول افسانہ نگار:

"اس وقت بہار رخصت پذیر تھی۔ سامانِ سفر بندھ چکا تھا۔ پت جھڑ کی چاپ سنائی دینے لگی تھی اور درختوں سے پتے جھڑنے شروع ہو چکے تھے۔ پہلے تقسیم کا سانحہ پیش آیا، پھر زمینداری ختم ہوئی۔ لوگوں نے جوق در جوق ہجرت کی تو حویلیاں اُجڑ گئیں۔"

افسانہ نگار نے آزادی کے بعد، ملک میں ابھرتی ہوئی اشتراکی تحریک کا بھی نوٹس لیا ہے۔ اقتصادی طور پر دبا کچلا طبقہ ایک نئے پرچم کے نیچے یکجا ہونا شروع ہو چکا تھا۔ اقبال حسن آزاد رقم طراز ہیں۔

"مگر تاریکی اس وقت اور گہری ہو گئی جب شرافت حسین میدان سیاست میں کود پڑے۔ کانگریس پارٹی جوائن کی اور اسمبلی کا الیکشن لڑا۔ اس وقت کانگریس پارٹی کا انتخابی نشان دو بیلوں کی جوڑی تھا۔ مخالفین نعرہ لگاتے "دو بیلوں کی جوڑی ہے۔ ایک اندھا اک کوڑھی ہے۔" اس انتخاب میں شرافت حسین کی ضمانت ضبط ہو گئی تھی اور کمیونسٹ پارٹی کے امیدوار رام چرن کامیاب رہے تھے۔"

ملک آزاد ہوا۔ فیض کے مصرعے 'یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر' کو یوں ضرب المثل کی مقبولیت حاصل ہوئی لیکن فیض جیسے لوگوں نے بھی آزادی کی حقیقت کو تسلیم کر لیا۔ پھر بھی آزادی کا ثمر آزادی کے بعد برسوں بعد بھی ملک کے عوام میں مساوی طور پر تقسیم نہیں ہوا۔ خاص طور مسلمان، جنھوں نے جنگ آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا اور بے پناہ قربانیاں دی تھیں، فریب کے شکار ہوئے۔ اقتصادی پسماندگی کے ساتھ روز روز کے فرقہ وارانہ فسادات ان کے وجود کے لئے سوالیہ نشان بن گئے۔ گویا صورت حال، بقول افسانہ نگار، کچھ اس طرح کی ہو گئی۔

"آزادی کا سورج طلوع ہوئے کافی عرصہ گزر چکا تھا اور برادران وطن اس کا خوب خوب فائدہ اٹھا رہے تھے۔ پرانے پتے جھڑ چکے تھے اور نئی تہذیب کی کونپل پھوٹ چکی تھی۔ آنکھ کا پانی مر چکا تھا اور دل سے مروت ختم ہو چکی تھی۔ ایک دفعہ معمولی سے واقعے کو لے کر جب شہر کا ماحول بگڑ گیا تو آس پاس کے مسلمان وکیل صاحب کی پناہ میں آ گئے۔ گرچہ اس وقت تک وکیل صاحب خود بے پناہ ہو چکے تھے۔ لوگ ساری رات جاگتے رہے تھے۔ ایسے میں ایک منچلا نوجوان گنگنا اٹھا تھا۔ "آج کی رات بچیں گے تو سحر دیکھیں گے"

یہ آخری جملہ، "آج کی رات بچیں گے تو سحر دیکھیں گے" کتنا با معنی ہے اس کا اندازہ ہندوستانی مسلمانوں کو ہے۔ اس تجربے سے ہر مسلمان زندگی میں کم از کم ایک دو بار ضرور گزر چکا ہے۔ جب فسادات کے اندیشوں سے رات گراں ثابت ہوتی ہے اور امید سحر مبہم۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اس تجربے کو افسانہ نگار نے جس حوصلے اور حسن و خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے وہ لائق تحسین ہے۔

واقعات کی پیش کش کے لحاظ سے زندگی کے اس ڈرامے کا پردہ گرنے والا ہے۔ تقسیم ملک کے وقت مذکورہ زمیندار خاندان نے پاکستان ہجرت کرنا گوارہ نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی حویلی اور اپنے قصبے میں ڈٹا رہ گیا تھا۔ گو کہ حالات بڑی تیزی کے ساتھ ناگوار ہوتے چلے گئے تھے۔ مالی حالت خراب ہو گئی تھی۔ خوش حالی کی کرنیں ناپید تھیں۔ امید کی خوشی بھی زندگی سے خارج ہو چکی تھی اور اس پر روز افزوں فرقہ واریت کا بڑھتا ہوا دباؤ۔ افسانہ نگار نے ان حالات کو اس طرح رقم کیا ہے۔

"حویلی کے اردگرد نئے لوگ آباد ہو گئے۔ دن رات لاؤڈ اسپیکر پر بھجن کیرتن ہوتا رہتا اور وکیل صاحب زیر لب دعائیں پڑھتے رہتے اور جب بابری مسجد کے انہدام کے بعد ملک کی فضا بگڑی تو انہیں صاف لفظوں میں دھمکی دی جانے لگی کہ اگر جان کی خیر چاہتے ہیں تو حویلی کا باقی ماندہ حصہ بھی اونے پونے بیچ کر کہیں اور جا بسیں۔"

چنانچہ ان ناسازگار حالات کی وجہ سے وہ دیر تک اپنی جگہ ثابت قدم نہ رہ سکے۔ پورا خاندان زمیندار طبقے سے محنت کش طبقے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ پھر ایک دن ایسا آیا کہ ماضی کی وراثت اور خاندانی شناخت کا وسیلہ یعنی قدیم حویلی بھی فروخت کر دینی پڑی۔ افسانہ نگار رقم طراز ہے۔

"اکیسویں صدی کا آغاز ہوا تو وکیل صاحب کی بیگم داغ مفارقت دے گئیں اور پھر چند ماہ بعد یتیم میاں کی بیوی بھی گزر گئیں۔ اب صرف حویلی کا مردان خانہ بچا تھا جس کی رنگ و روغن کے لئے ترستی ہوئی دیواروں کو یہ دو نفوس

سہارا دیئے ہوئے تھے۔ انور گجرات کی فیکٹری میں سپر وائزر لگ گیا تھا اور وکیل صاحب کے تینوں بیٹے مختلف شہروں میں ملازمت کرنے لگے تھے۔"

افسانہ کے بالکل آخری حصے میں افسانہ نگار نے لکھا ہے۔

"وہ نومبر کا ایک اداس دن تھا جب رحمت میاں کو فون پر خبر ملی کی ان کے والد صاحب اس جہان فانی سے گزر گئے۔ سارے بھائی اپنی فیملی کے ممبران کے ساتھ اس آسیب زدہ حویلی میں یکجا ہوئے اور چہلم کے بعد یہ بچا کچھا حصہ بھی فروخت کر دیا گیا اور اس طرح ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا۔"

یہ افسانہ فلیش بیک سے شروع ہوتا ہے۔ یتیم میاں، رحمت حسین کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ وہاں اس کو دیکھ کر حاضرین انہیں آسیب زدہ قرار دیتے ہیں۔ پھر آسیب پر بحث چھڑتی ہے۔ یتیم میاں 'آسیب' کے حق میں اپنی رائے دیتے ہیں لیکن ان کا آسیب فرد واحد کا آسیب نہیں ہے بلکہ پورے زمانے کا آسیب ہے۔ جس سے وہ روبرو ہیں۔ آسیب ان کی نظر میں ملک میں بڑھتی ہوئی فرقہ واریت ہے۔ یتیم میاں افسانے کے آخر میں کہتے ہیں:

"پہلے تو صرف اکا دکا لوگوں پر آسیب سوار ہوتا تھا۔ آج تو پوری قوم پر آسیب سوار ہے۔ پورب سے پچھم تک اور اتر دکھن تک۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ لوگ؟"

افسانہ ایک طویل بیانیہ پر محیط ہے اور تقریباً 1857 کے وقت سے گجرات کے فسادات تک کے شب و روز کو بیان کرتا ہے۔ آسیب کی بات تو چند جملوں میں ختم ہو جاتی ہے لیکن اس کا اثر تا دیر قائم رہتا ہے۔ ایک وقت تو ایسا احساس ہوتا ہے کہ یہ آسیب صرف یتیم میاں کی ذاتی زندگی پر طاری نہیں ہے بلکہ پورے زمانے اور مکمل عہد پر چھایا ہوا ہے۔ افسانہ نگار نے آسیب کی بحث کے ساتھ زمانے کے ایک طویل وقفے کو اجاگر کیا ہے اور زندگی کے نشیب و فراز کو یوں بیان کیا ہے کہ ایک پورا ماحول بالکل جادوئی انداز میں نظر کے سامنے گردش کرنے لگتا ہے۔ بہت سارے کردار ہیں جو وقت کے تلاطم میں، منجدھار کے اتار چڑھاؤ میں میں گرفتار ہیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ نہ تو آسیب کی کرشمہ سازیاں ہیں اور نہ ہی افراد کی بدنصیبی کا ماجرا۔ بلکہ سب کچھ تغیرات زمانہ کے ہاتھوں انجام پا رہا ہے۔ سامراجیت ملک کو غلام بناتی ہے۔ قومی تحریک کا آغاز و عروج ہوتا ہے۔ ملک آزاد ہوتا ہے لیکن شر پسندوں کے ہاتھوں تقسیم اور فرقہ واریت کا ناپاک کھیل کھیلا جاتا ہے۔ جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ ہوتا ہے۔ حویلیاں ویران ہو جاتی ہیں۔ حویلیوں سے متعلق تہذیبیں اور افراد تبدیلی کا شکار ہوتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ وارد ہوتا ہے اور زمانے کو زیر و زبر کر جاتا ہے۔

زمانہ دراصل ایک بڑا اسٹیج ہے۔ جس پر زندگی کا ڈراما اسٹیج ہوتا رہتا ہے۔ اس اسٹیج پر کہانی کے کردار آتے جاتے رہتے ہیں اس اسٹیج کے پس منظر میں زمانہ ایک پر شور دریا کی مانند تیز رفتاری کے ساتھ بہتا جا رہا ہے اور حالات کے بھنور میں اقبال حسن آزاد کے کردار، مثلاً سید حمایت حسین خاں، وجاہت حسین خاں، شرافت حسین، صولت حسین کفایت حسین، عنایت حسین، رحمت حسین، جمن میاں، یتیم میاں اور انور وغیرہ ڈوبتے ابھرتے نظر آتے ہیں۔

یہ افسانہ ایک طویل زمانے کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے اور اس کے بدلتے حالات کو بخوبی اجاگر کرتا ہے۔ یہ افسانہ گزرے زمانے کا ایک مختصر دستاویز ہے جسے ادبی پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ افسانہ نگار ایک راوی یا قصہ گو کی طرح سامنے آتا ہے اور افسانوی پیرائے میں پورے ڈیڑھ سو سال کی بدلتی تاریخ کو بیان کرتا ہے۔ تاریخ وتہذیب کس طرح ادب بن جاتی ہے اس کو دیکھنا ہو تو بڑے پیمانے پر شمس الرحمٰن فاروقی کے شہرہ آفاق ناول 'کئی چاند تھے سر آسماں' کو پڑھنا چاہیے اور اس موضوع کے مطالعہ کے لئے محدود پیمانے ہی پر سہی لیکن اقبال حسن آزاد کا افسانہ 'آسیب' بھی ایک قابل مطالعہ تخلیق ہے۔ اقبال حسن آزاد کے اس افسانے میں زبردست انسانی دردمندی پائی جاتی ہے۔ یہ افسانہ گزرے ہوئے زمانے کا دردمندانہ اظہار ہے جسے پڑھتے وقت بعض مقامات پر طبیعت مضطرب ہو جاتی ہے۔ زمانہ کتنا ظالم ہے کہ وہ بدلتا ہے تو اس بے دردی کے ساتھ کہ گزرے زمانے کے کردار تاریخ کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں جیسے کہ دریا گاؤں کے گاؤں کو کاٹتا ہوا گزر جاتا ہے۔ سماجی تبدیلی کے اس عمل میں کیا ایسے لوگوں کے ساتھ کسی ہمدردی کی گنجائش ہے جو گزشتہ عہد سے وابستہ رہے ہیں اور اپنے دور کی شکست و ریخت اور خاتمے کے ساتھ ختم ہو جانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کیسے کیسے لوگ ہوں گے؟ کس طرح کے ان کے جذبات رہے ہوں گے؟ کیا کوئی ان باتوں پر غور کرنے کے لئے تیار ہے؟ اقبال حسن آزاد نے اپنے افسانے 'آسیب' میں ایک خاندان کی کہانی کے ذریعہ قارئین کو ان گم ہو چکے چہروں کی جانب متوجہ کیا ہے اور ساتھ ہی ملک میں بڑھتی فرقہ واریت کے آسیب کی نشاندہی بھی کی ہے۔

بہر حال یہ ایک کامیاب افسانہ ہے اور اس کے لئے تخلیق کار کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ افسانہ ایک ایسے بہتے ہوئے پرسکون دریا کی مانند ہے، جس کی تہہ میں، نہ جانے کتنی پر شور موجیں مچل رہی ہیں۔ ■■

ڈاکٹر شبیر حسن، ریڈر و صدر شعبہ جاتیات
آر ڈی اینڈ ڈی جے کالج، مونگیر، بہار

بابِ نظم

صلاح الدین پرویز کے نام

صلاح الدین پرویز

ولادت: 9 فروری 1952 الہ آباد، وصال: 27 اکتوبر 2011 علی گڑھ

ایک منفرد زندگی کا کولاژ

■ صلاح الدین پرویز، جس کا اصل نام صلاح الدین پرویز قریشی ہے...

◆ ''بچپن سے لے کر آج تک شاعری میرا جنون ہے۔ ایک عشق تھا کہ میں لفظوں کو اس طرح لکھوں کہ اس سے شکل بن جائے یعنی Painting بن جائے۔ لفظوں سے چونکہ میں بہت چھوٹا سا تھا تو میری خواہش تھی کہ میں Painting بناؤں جس کے لیے کینوس اور رنگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وقت ہمارے پاس پیسے نہیں ہم یہ سب چیزیں نہیں خرید سکتے تھے بس سوچ سکتے تھے۔ کبھی کبھی پالش سے پینٹنگ بناتے تھے تو غریبی میں جو ایک احساس ہوتا ہے کہ ہم پینٹنگ نہیں بنا سکتے تو رنگوں کی Water Colour بجائے ہمارے پاس قلم تھا۔'' انٹرویو سے

---

13 شعری مجموعے: دھوپ سمندر سایہ، جنگل محمد، دھوپ سرائے، صلاح الدین پرویز کے خطوط، نگیٹو، لوریاں، کنفیشن، سبھی رنگ کے ساون، آتما کے نام پرماتما کے پتر، دشت تجیرات، کتاب عشق، بنام غالب۔ **6 ناول**: نمرتا، سارے دن کا تھکا ہوا پرش، ایک دن بیت گیا، آئیڈنٹیٹی کارڈ (ساہتیہ اکادمی ایوارڈ) دی وار جرنلس، ایک ہزار دو راتیں۔

◆ ''میں علی گڑھ میں پیدا ہوا میرے باپ تو گاؤں نہیں جاتے تھے۔ میں کبھی کبھی جاتا تھا۔ گاؤں کے قریب ہی نیپال تھا۔ عجیب فضا تھی۔ مزدور کام کرتے ہوئے آرہے ہیں، جارہے ہیں، وہ پہاڑ، دھوپ، کہرا، ہمالیہ یہ سب میرے وجود کا حصہ بن گئے...'' انٹرویو سے

■ پہلی نظم 'پھول کھلے ہیں' ماہنامہ 'صبا' حیدرآباد دکن میں 1964 میں شائع ہوئی جس کے یہ مصرے صلاح الدین کو یاد رہے:

ایک بھرے گھر کے آنگن میں
گھاس کھلی ہے پھول اُگے ہیں
گھر کے دو مینار کپاسی
جانے کب سے دیکھ رہے ہیں
سپنوں کے شہزادے کو

■ صلاح الدین پرویز نے دو فلمیں بھی بنائیں: 'جنبش' اور 'یادوں کے موسم' — دونوں باکس آفس پر ناکام رہیں!

■ ''پرویز کی سب سے مختلف اور محبوب شخصیت وہ ہوتی ہے جب وہ اپنے عزیزوں کے درمیان ہوتے ہیں — بہنوں سے چھیڑ چھاڑ، بچوں سے مذاق اور بزرگوں سے عقیدت — خاص طور پر بہنوں کے لیے، ہر جملے میں دنیا جہاں کی مسرتوں کا نذرانہ سمیٹے ہوئے — محبتوں سے سرشار القابوں سے پکارتے ہوئے — پیاری آپا — ثریا بہن — آپا بی — رضیہ آپی۔ جان سے پیاری باجی — ان محبت بھرے جملوں کے علاوہ وہ اپنے عزیزوں کو اپنا سب سے بڑا ناقد تصور کرنا۔ اپنی نظمیں سنانا۔ ان سے داد وصول کرنا اور ان کو اپنا بہترین سامع اور قاری تصور کرنا — کتنی عجیب بات ہے نا — اپنی شاعری کو سب کے ساتھ مل جل کر پڑھنا اور سنانا۔ خود جاگنا۔ دوسروں کو جگانا... صلاح الدین پرویز اب تک شب زندہ داری کی وہ رسم نبھا رہے ہیں۔ ان کی نیندوں پر عشق رسول کی بیداریاں حاوی ہیں اور وہ بدستور جاگ رہے ہیں — جاگ رہے ہیں اور لکھ رہے ہیں — لکھ رہے ہیں اور سنا رہے ہیں۔''

منھ بولی بہن ثریا سعید (ثریا ہاشمی) کی ایک تحریر سے۔

ترتیب و پیش کش: ادارہ

صلاح الدین پرویز کی نظمیں

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا

حضور اکرمؐ کی مدینہ آمد پر، بنونجار کی معصوم لڑکیوں نے جو گیت گایا تھا اس سے متاثر ہو کر یہ نظم تخلیق کی گئی ہے۔ سن تخلیق 1976

چھتیں ہوئی ہیں ایسی مبارک جن پہ چڑھ کے دیکھیں
اک دوجے کو ہٹا ہٹا کے، گرا گرا کے، پردہ اٹھا کے
پردے والیاں ناقہ
جن پہ بیٹھے نکلے وداع سے
ایک گلابی صافہ باندھے، خواب سے سندر آقا
من ثنیات الوداع طلع البدر علینا
دکھ کی زمیں پہ ریت کے ٹیلے
دور تلک تھے پھیلے
دیکھا جوان کا طلوع طلعت ہو گئے موم سے گیلے
اب اس موم سے طاق بنیں گے در محراب سجیلے
ان میں شبد کے دیپ جلیں گے
دیپ کی لوؤں کے نیچے
انا اعطینک الکوثر والی ٹھنڈی نہریں
ما دعا اللہ داع وجب الشکر علینا
جتنے پیڑ تھے یثرب دل میں ہو گئے دف کی کھالیں
ان پہ بنونجار کی بٹیاں ماریں پھول سی تھاپیں
ہم نہیں مانگیں تم سے گل دل اور نہ کچھ آسائش
ہم نہیں مانگیں تم سے کاکل اور نہ کچھ آرائش
ہم نہ نمارق کی سکھیاں
ہم نہ بنات الطارق ہم ہیں بنونجار کی سکھیاں
مانگیں دید کی بارش گائیں ایک ہی خواہش
قط یا وجہ السروری مثل حسنک ما رأینا
طلع البـــدر علینا طلع البـــدر علینا

رسول اللہ کے نام ایک خط

ادھر ایک شب ہے
عجیب شک ہے!
کہ میری آنکھوں کی جلوتوں میں
بنام خلوت
کوئی ایک مکتوب لکھ رہا ہے
گرامی!
تو چیزے دیگری
رازداں عجب ہے
کہ میں کوئی عالی نسب نہیں ہوں
مگر تیرے شجرے میں جڑ گیا ہوں
دکھوں کی چادر بدن پہ اوڑھے
کہیں کہیں تجھ میں سو گیا ہوں
گرامی!
تو صاحب عہد و پیان کیسا ہے
کندن ہے چہرہ
نگینے کے موافق
مکاں لامکاں آسمانوں پہ مہتاب طائر
سنہرے سنہرے عماموں سے بچے
ستاروں کے جھمکے
تجھے دیکھ کے سب چھپے پھر رہے ہیں
ادھر ایک شب ہے
عجیب شک ہے
کہ میں شمس ہوں

اور تجھ میں طلوع ہو رہا ہوں...

وطن کی دہلیز پر
بے وطنی کے زخم

کشمیر ڈل سے، چودہ کوسوں کی دوری پہ
اک گاؤں تھا...
گاؤں میں خوبصورت سا گھر تھا
گھر کے مالک کا نام... 'ڈل'
ہاں —— 'ڈل' ہی تھا
دل میں مخفی تھی اک طاق
طاق میں رحل کی ایک پٹ پہ گیتا
دوسرے پٹ پہ قرآن روشن تھا...

'ڈل'، ہاں اس 'ڈل' کا
اک خوبصورت سا کنبہ بھی تھا
کنبے میں ماں، باپ، بھائی، بہن
بھابی، بہنوئی، بیوی اور دو زعفراں زار
بچے بھی شامل تھے...
کشمیر کی ڈل سے چودہ کوسوں کی دوری پہ
اک گاؤں تھا...

کشمیر کی ڈل سے چودہ کوسوں کی دور پہ
اک گاؤں تھا
اب نہیں ہے...
گاؤں میں خوبصورت سا گھر تھا
نہیں، اب وہ بھی نہیں ہے...
اور 'ڈل'، 'ڈل' کا کنبہ
نہیں، نہیں، اب وہ بھی نہیں ہے...
تو پھر — تو پھر — تو پھر —
تو پھر تم اسے ڈھونڈتے کیوں نہیں ہو!
اگر مجھ سے پوچھو تو وہ آج کل
دلّی کے اک آؤٹ اسکرٹ
شرنارتھی کیمپ میں
روز و شب، اپنی آنکھوں میں
یادوں کی اک ڈل بہا کے
اخبار کے چھوٹے پتوں کی ناؤ بنانے میں
مصروف ہے...

سزا، اور اتنی سزا
اس کو اتنی سزا کس لیے مل رہی ہے...
کشمیر اس کی بھی اتنی ہی مٹی ہے
جتنی کسی اور کی...
فرق اتنا ہے
اس نظم کے 'ڈل' کے آگے
فقط اک لفظ، پنڈت
زیادہ ہے!

اک خواب اور ۲۶ جنوری

دیکھا تھا اک خواب...
پانی کی جوہی لہروں پر
دھوپ اُگی ہے

ہولے ہولے، شام
دھوپ کے کانوں میں
ایسے سنگیت کا مد
گنگنا رہی ہے...
پل کے بعد... اک لمبے پل کے بعد
دھوپ نے بھی اتر میں
اس کے اترے انترال میں
اور لمبے سائے کے
سر دو سر دور پر
عشق اشلوک کا ایسائر
ٹانک دیا ہے
سن کے جسے، مارے شرم کے، شام
اور بھی زیادہ سانوری ہو گئی ہے
رات میں اور بھی زیادہ لین ہو گئی ہے
دیکھ کر یہ...
چاند بھی تڑپ تڑپا کے
ننھے منے سیکڑوں براتیوں سنگ
'منہ دکھائی' میں اسے
دے کر ڈھیر ساری چاندنی
برہا بھول گیا ہے...
لیکن جب الارم بجنے سے آنکھ کھلی...
خون، کہرام، آتنک، بھے، دنگے...
سب سامنے کھڑے تھے
آج چھبیس جنوری سنہ دو ہزار تین ہے
آؤ تھوڑی سی کوشش تو کریں
اُسی خواب کو دہرانے کی
تھوڑی سی خواہش تو کریں
اُسی خواب کو دوبارہ دیکھنے کی!

رات کئی دنوں سے غائب تھی

''رات کئی دنوں سے غائب تھی''
سخت کہرے کی دبیز ساعتوں میں
حلق میں
رَم کی ایک پوری بوتل جھونک کے سارجنٹ
رات کی vigilance پہ نکلا!
''رات، کئی راتوں سے غائب تھی''
لوٹا— آٹھ گھنٹے کے بعد
خالی ہاتھ، مضمحل، نڈھال سا
اپنے گھر
دیکھا رات بے لباس
اس کے سامنے
پلنگ پر پڑی ہوئی تھی
گاڑ رہا تھا سورج اپنا نیزہ
اس کے خفیہ قفل میں
بیڈروم کی کھڑکی کے ایک شیشے پر
پانی کی ایک بے ربط لکیر
دھیرے دھیرے گر رہی تھی
اس کے خالی ہاتھوں سے ہوتے ہوئے
اس کی پینٹ کے اگلے حصے میں
اُڑسے ہوئے قلم کے پاس...
سخت دبیز کہرے کی ساعتوں میں
حلق میں
رَم کی ایک پوری بوتل جھونک کے
سارجنٹ
رات کی vigilance پہ نکلا!
''رات کئی دنوں سے غائب تھی!''

مبارک ہو...

اچانک...
خود میں، یہ کیسی تبدیلیاں محسوس کر رہا ہوں میں!
میرے بال دراز اور گھنے ہو گئے ہیں
میں اب دو چوٹیاں باندھنے لگا ہوں
میری آنکھیں پہلے سے زیادہ مخمور ہو گئی ہیں
وہ اب دیکھنے کے بجائے زیادہ رونے لگی ہیں
میرے ہونٹ کہرے کی ٹھنڈ کی طرح
سفید پڑ گئے ہیں
وہ اب بولنے کے بجائے زیادہ کپکپانے لگے ہیں
میرا سینہ پہلے سپاٹ تھا
اب اس پر دو اُٹھانیں اُٹھ آئی ہیں
دودھ سی کوئی شے اس میں ٹھاٹھیں مارنے لگی ہے
میں پہلے قمیص اور پینٹ پہنتا تھا
اب میں شلوار اور جمپر پہننے لگا ہوں
لگتا ہے— لگتا ہے، ابھی گیارہ ستمبر ہی کو میں
غسل جنابت سے فارغ ہوا ہوں
اچانک...
اچانک، خود میں یہ کیسی تبدیلیاں
محسوس کر رہا ہوں میں
...ابھی ابھی تھوڑی دیر پہلے
مجھے ایک زبردست قے ہوئی تھی
دائی آئی تھی
اس نے میرا جمپر اُتار کے
میری کوکھ پر
ٹھنڈا اٹھار قبر سا ہاتھ رکھ کے کہا تھا
''مبارک ہو— تم ماں بننے والے ہو!''

مائی ڈیر فرانس!

مائی ڈیر فرانس!
غروب آفتاب کے بعد
طلوع آفتاب سے پہلے
تم نے میرا گھر سے نکلنا موقوف کر دیا تھا...
مائی ڈیر فرانس!
سترہ اکتوبر انیس سو اکسٹھ
اُس دن جب میں تمہاری طرف سے گزرا
تم نے مجھے گولی مار دی تھی
اور دریائے سین میں مجھے بھی
الجزائری لاشوں کے ڈھیر کے اوپر پھینک دیا تھا
مائی ڈیر فرانس!
اسپیشل پولیس ہیڈکوارٹر کے سامنے
سینٹ مائیکل برج ہے
اس پر اب ایک تختی کا اضافہ ہو گیا ہے
کندہ ہے جس پر— اعتراف جرم—
مائی ڈیر فرانس!
اب اس تختی کو اکھاڑنے میں
کیوں اتنی دیر لگا رہے ہو
سوچو تو آج بھی سترہ اکتوبر انیس سو اکسٹھ ہی ہے
...میرے خیال میں سارے کیلنڈر جھوٹ بولتے
ہیں...
مائی ڈیر فرانس!

صلاح الدین!

صبح کا وقت ہے
پھر بھی آسمان پر تارے نکلے ہوئے ہیں
تارے ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر گر رہے ہیں
ان کی گرم گرم راکھ سے
میری نظموں کے بچے
دھیرے دھیرے جلتے جا رہے ہیں
دوپہر کا وقت ہے
پھر بھی آسمان پر چاند چھنکا ہوا ہے
چھنکے ہوئے چاند کی نیلی نیلی کرنیں
زمین پر گر رہی ہیں
ان نیلی نیلی کرنوں کی بارش سے
میری نظموں کے بچے
دھیرے دھیرے بھیگتے جا رہے ہیں
شام کا وقت ہے پھر بھی آسمان پر سورج
سوا نیزے پر ٹکا ہوا ہے
سورج کے سوا سوا گز کے نیزے
زمین پر گر رہے ہیں
ان سوا، سوا گز کے نیزوں کی انیوں سے
میری نظموں کے بچوں کے جگر
دھیرے دھیرے چھدتے جا رہے ہیں
اب رات آگئی ہے
اچانک میری نظموں کے سارے بچے
غائب ہو گئے ہیں...
وہ جو دور ایک بہت بڑا سا قبرستان
نظر آ رہا ہے
کہیں میری نظموں کے بچے
اس قبرستان کی قبروں کے
کتبے تو نہیں ہو گئے۔

سب خاموش ہیں...
کوئی میرے سوال کا جواب ہی نہیں دیتا...
صلاح الدین...!

سر (Sir)

سر... سر...
میں ابھی زندہ ہوں سر...
'ہم یہاں کوڑا کرکٹ اٹھانے
آئے ہیں، تمہیں نہیں'
لیکن سر، سر میں ابھی زندہ ہوں سر...
'زندہ ہو... کیوں... ہم تمہیں نہیں اٹھا سکتے'
کیوں نہیں اٹھا سکتے سر...
'تم ایک ہیومن بی انگ ہو'
نہیں سر آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے
میں ایک ہیومن بی انگ نہیں،
افغانی، ہندوستانی، پاکستانی، عرب
یا گیارہ ستمبر والا ایک نوزائیدہ بچہ...
'شٹ اَپ، یو ایڈیٹ'

ماں

اے امریکی ماں،
میں تیرے آنسو دیکھنا چاہتا ہوں
اے امریکی ماں،
میں تیرے آنسوؤں کا رنگ
افغانی ماں کے آنسوؤں کے رنگ سے
پرکھنا چاہتا ہوں

ہائے یہ کیا ہوا...
میرا سارا عمل اکارت ہو گیا
آنسو، آنسوؤں سے مل کر
ایک ہو گئے
اور میں اکیلا رہ گیا

اب میں اپنے آنسو کس سے ملاؤں
...ہے کوئی جو میرے آنسوؤں سے
اپنے آنسوؤں کو ملا کے
ایک ہو جائے

''خدا بننا چاہتا ہے کیا...''
کوئی میرے منہ پر
میرے ہی لفظوں کا دروازہ مار کر
میرے ہی باطن میں کہیں
غائب ہو جاتا ہے
میں مر جاتا ہوں!

پھول نظمیں

عبداللہ جاوید

تین مصرعوں پر مشتمل نظمیں جن کا موضوع 'پھول' ہے، جو پھول بھی ہے اور علامت بھی۔ ع ج

پھول سی جس کی صورت
دل کے سونے آنگن کو ہے
اس کی سخت ضرورت

پھول کو لاگے ڈر
رات کی رانی کیسے سوتی
سانپ کو لپٹا کر

پھول کہانی ہے
روک سکو تو روکے رکھو
پھول جوانی ہے

پھول ہے پانی میں
شاید لڑکا ڈوب گیا
پریم کہانی میں

پھول کتابوں میں
رکھ کر لڑکی، کھومت جانا
اپنے خوابوں میں

پھول فسانہ ہے
روکے سے بھی کب رکتا ہے
یار... زمانہ ہے

پھول کی سیوا کر
پھول کو پوجا میں مت لے جا
پھول کی پوجا کر

پھول کا اترانا
ڈالی سے جب ٹوٹ گیا تو
مٹی ہو جانا

پھول کو توڑو گے
پھر اس ڈالی پر آخر تم
کس کو جوڑو گے

پھول ہے بالوں میں
مسجد کے اندر بھی آیا
یار خیالوں میں

پھول دریچے میں
آج اگر غفلت کر لی تو
دھول دریچے میں

پھول کا دیکھا حال
دنیاداروں کے نرغے میں
نازک دل پامال

پھول ہے ڈالی پر
اس کی خدمت میں دل لے جا
چاند کی تھالی پر

پھول کہاں جائے
پتی پتی ہو جانا ہے
چاہے جہاں جائے

پھول اندھیرے کا
کتنے لمحے اور رکے گا
چاند، سویرے کا

ستیہ پال آنند

فصل تو اب پک گئی ہے

بچوں کے لیے 'طوطا مینا' کی ایک کہانی

عصرِ حاضر کے تناظر میں

باجی مینا نے کہانی یوں سنائی...

''...کیا ثمر تھا
اولیں غنچہ، شگوفہ بخشتیں کا
ماحصل تھا فصل کے بونے سے پکنے تک کی محنت کا
حفاظت جس کی بے حد لازمی تھی

ایک معمولی تنازع تھا فقط املاک کی موروثیت
یا کھیت کے استحقاق و دعویٰ پر، مگر
اک وارثِ مابعد جیسے وارثِ مطلق کی صورت
بن گیا
(اور تا قیامت خود کو موروثی سمجھ کر)
اس پہ قابض ہو گیا
اور دوسرے منہ دیکھتے ہی رہ گئے

صاحبِ املاک، طاقت کے نشے میں چور تھا ہی
کھیت سارے سستے بھاؤ 'نام کے پٹے' پہ
اک شہ زور منصب دار کو بیچے، تو پھر بے فکر ہو کر
یوں پھنسا لہو و لعب میں
بھول بیٹھا، کاشتکاری پیشۂ آبا تھا اس کا
اگلی سے اگلی فصل کے وعدوں پہ
قرضوں کی ادائی میں ملوث کر دیا سب آنے والی
پیڑھیوں کو!''

''یہ کہانی تو ادھوری رہ گئی ہے،'' مینا باجی بول اٹھی...
''طوطے بھائی
اس برس بھی فصل تو تیار ہے، پر
منڈیوں کے سارے ساہوکار کوّے
کائیں کائیں کر رہے ہیں، کھیت پر منڈلا رہے
ہیں، دانہ سب چگ جائیں گے، تو...؟''

''تم بتاؤ۔ مینا باجی!'' طوطا بولا
''کوئی منصوبہ کہ جس سے اس برس تو
فصل بچ جائے کسانوں کی، انہیں کچھ فائدہ ہو!''

مینا بولی، ''بھائی طوطے، سب مہا پرکھ کہہ گئے ہیں
فصل جب پکنے کو ہو تو چند کوّوں کو پکڑ کر
الٹی ہانڈی کے بجوکوں کی طرح
بانسوں پہ لٹکانا ضروری ہے، کبھی تو جانتے ہیں!''

یہ خاک راہوں کی

یہ خاک راہوں کی
مجھ سے اکثر کلام کرتی ہے اس زباں میں
جسے فقط میں ہی جانتا ہوں
کہ میں تو راہوں کا ہم سفر ہوں
انہی کی معیت میں کتنی صدیوں سے چل رہا ہوں
مجھے کبھی راستوں کی پیشانیوں پہ لکھی
ہوئی لکیروں کو پڑھنا آتا ہے....
اپنی تاریخ کا نوشتہ
کبھی جو کندہ ہوا تھا
میرے شعور کی لوح پر۔ وہ اب بھی
چمک رہا ہے
وہ سارے نقشِ قدم جو تاریخ کے تواتر میں
مٹ گئے تھے
مجھے دمکتے دکھائی دیتے ہیں روز و شب
برسوں، عشروں، صدیوں کے فاصلوں تک!

یہ خاک راہوں کی
کچھ دنوں سے
خموشیوں کی ردا میں لپٹی ہوئی ہے جیسے
کلام کرنا تو اک طرف
مجھ کو منہ دکھانا بھی اب غلط ہو!
میں اب بھی اکثر
ہتھیلیوں پر اٹھا کے، مٹھی میں بھر کے اس کو
ہر ایک ذرّے کو دیکھتا ہوں
کہیں تو کوئی زبان کھولے

مجھے بتائے کہ میرا آخر قصور کیا ہے
کہ مجھ کو مٹی نے تج دیا ہے!

میں چاہتا ہوں اسے بتاؤں
کہ میں تو اب کچھ دنوں میں اس کی
شفیق گودی میں دفن ہونے کا منتظر ہوں
کہ میرے احباب مٹھیوں سے
اسے مری قبر پر گرائیں گے...
فاتحہ پڑھ کے لوٹ جائیں گے اپنے گھر کو!
میں چاہتا ہوں اسے بتاؤں
کہ اس سے ملنے کی وہ گھڑی اب قریب تر ہے
کہ جس میں بچھڑے ہوؤں کو ملنا نصیب ہوگا!

مگر یہ مٹی تو مجھ سے روٹھی ہوئی ہے جیسے
اسے گوارا نہیں ہے شاید
کہ اس سے میرا وصال ہو... میں بھی خاک بن کر
مدام ان راستوں پہ اڑتا پھروں
کہ جن سے
مرا تعارف ہے اب بھی قائم
ہزاروں برسوں کی دوریوں سے!!

اپنے ہیتھوے کا
بستر ازدواج

"Item I gave unto my wife my second best bed".

Shakespeare's Will

ایک نظم عالیہ بیٹی کے نام،
جسے شیکسپیئر کے کرداروں سے بہت پیار ہے۔ ستیہ پال آنند

بستر بستر پیار تو اپنا بٹا ہوا ہے
گھر کے سب کمروں میں، لیکن
پیار کہ جس کو ہم نے ہر پل
اپنی نس نس میں محسوس کیا ہے، وہ تو
اس بستر پر ہی ممکن تھا!

قلعے، فوجیں، شاہی درباروں کی رونق
جنگل، دریا، گھاٹی، پربت اور جزیرے
سب اس بستر پر بیٹھے، لیٹے جاگتے، اونگھتے
آپس میں باتیں کرتے ہی خلق ہوئے ہیں

یہ بستر تھا ولیم کی تخلیقی قوت کا اک ساگر
جس میں وہ اک غوطہ خور سا چمکیلے موتی پاتا تھا
تالیفی موسیقی کے موتی
لفظوں کی بھیگی سیپوں کے اندر تھے
ان کا پانا، ان کو مالاؤں میں پرونا
ولیم کا ہی کام تھا، میں تو
اک سامع تھی
بس بیٹھی سنتی رہتی تھی

جو وہ لکھتا، بول بول کر مجھ کو سناتا ہی رہتا تھا
اور یہ رنگ برنگے موتی
کرداروں کے منہ سے جھڑتے پھول اور کانٹے

'پینٹا میٹر' کے ارکان میں جگتے بجھتے جگنو جیسے
آج بھی اس بستر میں ٹانکے چمک رہے ہیں!

ہملٹ، لیئر، سیزر، میکبیتھ اور اوتھیلو
اس بستر پر 'غوں غاں' کرتے بڑے ہوئے ہیں
پورشیا، اوفلیا، روزا لنڈ، مرانڈا
کل کی بچیاں، ناٹک کی سب دوشیزائیں
اس بستر پر گڈے، گڑیاں چھوڑ گئی ہیں۔

آج اگر میں بیوہ وصیہ ہوں بستر کی
تو مجھ کو احساس ہے ولیم پاس ہے میرے
ازدواج کے اس بستر پر!

Pentameter: پانچ رکنوں پر مشتمل انگریزی عروض کی بحر
Rosalind, Miranda, Hamlet, King Lear, Portia,. Caeser, Macbeth, Othello, Ophelia: شیکسپیئر کے ڈراموں کے ہیرو اور ہیروئنوں کے نام
اپنے ہیتھوے (Anne Hathaway) تھا

فیاض رفعت

نظم

بدکار لوگوں کو دیکھ کر
اپنی فراخ پیشانیوں پر
شکنیں نہ لاؤ
کہ ان کے وجود سے تابندہ ہے
گناہوں کی کائنات
نیکی اور بدی کی اس یلغار میں
ہوگی کس کی مات
بس یہ ہے سوچنے کی بات

ایک نظم تمہاری طرف سے

کل تم نے وداع ہوتے وقت
میری مٹھی سونے چاندی کے
چمکتے سکوں سے بھر دی تھی
گھر آکر جب میں نے مٹھی کھولی
تو چھچھاتے سکوں کی
سانپ بچھو آنکھیں اٹھلا اٹھلا کر
مجھ سے کہہ رہی تھیں
جسم کا پہلا بیعانہ
مبارک ہو!

احتشام اختر

پرکھ

نگر کی سب دکانوں میں
رکھے ہیں پھول کاغذ کے
سبھی اونچے مکانوں میں
سجے ہیں پھول کاغذ کے
مکانوں کی جو زینت ہیں
سبھی ہیں کاغذی ساماں
مکانوں میں جو رہتے ہیں
سبھی ہیں کاغذی انساں
کہ ان کے خواب کے نقشے
کہ ان کے پیار کے قصے
سبھی رشتے سبھی ناطے
ارادے حوصلے جذبے
کھلونے سب ہیں کاغذ کے
پرکھنا ہے اگر ان کو
ذرا ان کے قریب آؤ
حقیقت کی صداقت کی
ذرا سی آگ دکھلاؤ

احتشام اختر

ارادہ

بلڈنگوں کی اونچائی
رنگ بن کے بکھری ہے
سرمئی اندھیرے نے
راستے کو گھیرا ہے
ہر دشا بھیانک ہے
کس دشا کو جائیں گے
آج میں نے سوچا ہے
کاغذی اصولوں کو
جیب سے نکالوں گا
اور پھاڑ ڈالوں گا

راشد جمال فاروقی

یہ جو گھر ہے

یہ جو گھر ہے
محض یہ گھر نہیں
اسے سانس لیتے سنا کرو
اسے اپنے ساتھ جیا کرو
کبھی اس کے ساتھ رہا کرو
کبھی اپنی بات کہا کرو
کبھی اس کی بات سنا کرو
یہ جو گھر ہے
گھر ہی نہیں ہے بس
یہ ہماری آہٹیں سینت کر
بڑا خوش ہے
ایسا لگا مجھے
یہ ہماری کلفتیں دیکھ کر
بڑا چپ ہے
ایسا لگا مجھے
یہ جو رت جگوں کا عذاب ہے
یہ جو ہجر ہجر ہے ہر طرف
یہ جو سانس سانس اداس ہے
یہ جو فکر فکر ہے ہر طرف
تو یہ بام و در بھی ملول ہیں
ذرا رت بدلتے ہی دیکھنا
یہ دریچے پھر سے نہائیں گے
انہیں خوشبوؤں میں
جو کھو گئیں
انہیں خواہشوں کو جگائیں گے
وہی خواہشیں کہ جو سو گئی
یہ جو صحن آج اجاڑ ہے
ذرا رت بدلتے ہی دیکھنا
یہی کھلکھلا کے ہنسے گا پھر
یہ خرابہ ہے جو بسے گا پھر

سوہن راہی

اک سفر

(چنڈی گڑھ سے پھگواڑہ جاتے ہوئے)

جابجا گاتی ہوئی ہریالیوں کا بانکپن
رقص میں سائے خیالوں کے چمن بنتے ہوئے
دور تا حدِ نظر مٹی کے محرابوں کا بن
آسماں کی نیلگوں سرحد کو یوں چھوتا ہوا
جس طرح اک باپ کے ہاتھوں کو چھونے کے لئے
سیکڑوں میلوں سے آئے ہوں کئی بیٹے کسی اک یگیہ میں
جن کی آہوتی سے دوشیزہ بہاروں کا لہو
نور بن کر خاک کی تہذیب پر لہرائے گا
چاند تاروں کی صداؤں میں پروئے لوک گیت
پھر لبوں کے نرم پتوں پر بکھرتے جائیں گے
پھر ہواؤں میں کھلیں گے رنگ کے روپک نئے
پھر نئی شامیں، نئے مہکے سویرے آئیں گے

ارمان نجمی

نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن

اپنی دھرتی کی آسودگی چھوڑ کر
جو تھا حاصل تمہیں اس سے منہ موڑ کر
دوسروں کے خیالوں کی تائید میں
ایک مفروضہ جنت کی امید میں
تم نے اپنے گھروں سے کنارا کیا
اجنبی پانیوں کا سہارا لیا
کیا تمہیں اس قدر بھی نہ معلوم تھا
کب ہوا راہ میں اپنا رخ موڑ لے
اس فضا کا تو کوئی بھروسا نہیں
اس کے سینے میں کب کوئی طوفاں اٹھے
خیر خواہوں نے پہلے قدم پر تمہیں
آئینہ وسوسوں کا دکھایا بھی تھا
یہ خطرناک طوفاں جو ہے سامنے
اس کے غیظ وغضب سے ڈرایا بھی تھا
تم تو خوابوں کے نشے میں ڈوبے رہے
آنکھ اوجھل پس و پیش کیا دیکھتے
تم کو مٹی کی پہچان ہوتی اگر
اس طرح داؤ پر خود کو کب ڈالتے

۲

اب حقیقت کی صورت گری ہے یہی
حلقۂ نیست میں جشنِ بے چارگی
ہر جہت شور کرتی یہ سفاکیاں
یہ گرجتا برستا ہوا آسماں
یہ امنڈتی ہوئی شونکتی آندھیاں
ان کے نرغے سے کیسے ملے گی اماں
دور تک موج پیچاں کی دیوار ہے
بچ نکلنا بہت ان سے دشوار ہے
تند لہروں کے بپھرے ہوئے وار کو
خالی ہاتھوں سے کیسے بچا پاؤ گے
اس سمندر میں کوئی جزیرہ نہیں
اب کہاں جاؤ گے اب کہاں جاؤ گے

خالد رحیم

بارہا

کتنا ویران ہے میرا کمرا
ڈس رہی ہے، مجھے یہ تنہائی
میرے کمرے کے ایک کونے میں
ایک چھوٹی سی میز ہے، جس پر
چند بکھری ہوئی کتابیں ہیں!
سوچتا ہوں کہ ان کتابوں سے
اپنے بے زار دل کو بہلاؤں
پھر مجھے یہ خیال آتا ہے
یہ کتابیں بہت پرانی ہے
بارہا ان کو پڑھ چکا ہوں!

وقت

چور کی مانند بھاگا جا رہا تھا
اور ہم سب
اس کے پیچھے دوڑتے ہیں
ہاتھ وہ آتا نہیں ہے!

چاند

اک مسافر
رات کے جنگل میں تنہا
پھر رہا ہے
جو ازل سے اپنی منزل ڈھونڈتا ہے!

تنہائی

کالی ناگنوں جیسی
پھن اٹھائے بیٹھی ہے
تم قریب آجاؤ
ورنہ مجھ کو ڈس لے گی!

یاد

چاندنی کی شہ پاکر
دل کی جھیل میں اکثر
وہ کنول بھی کھلتے ہیں
جو تمہاری صورت کے زاویے سے ملتے ہیں

تبدیلی

یہ پتے
ہزاروں کی تعداد میں
ریت پر دور تک جو کہ بکھرے پڑے ہیں
یہ آنسو کے قطرے ہی گویا
جو پیڑوں کی آنکھوں سے گرتے ہیں
اور ریت میں جذب ہو کر
بدل لیتے ہیں شکل اپنی

مصروفیت

کبھی جو خواب دیکھا تھا
اسی کی
آج کل قیمت
چکاتا پھر رہا ہوں
روز و شب
قسطوں میں مر مر کے!

معمہ

یہ میری پیٹھ پر
......شب خوں تمہارا
نہیں جانتا
یہ کس لئے ہے
یہ سچ ہے تم مرے دشمن نہیں ہو

خالد رحیم، خانساماں لین، منی ساہو چھک۔ بخشی بازار، کٹک، اڑیسہ۔ 753 001

ظفر عدیم

میری پہچان

اسی گھر کا وہ صحن ودالان دے دے
مری دھندلی آنکھوں میں پھر جان دے دے
الٰہی مجھے میری پہچان دے دے
مجھے اور مل جائیں گے رحل و قرآں
الٰہی وہ ریشم کا جزدان دے دے
جسے گھر کے صحن اور دالان میں
میری ماں نے
عقیدت بھری انگلیوں سے
لبوں میں درود و ثنا کے فضائل دبا کر
بڑی منتوں سے سیا تھا
پرویا تھا سوئی کے ناکے میں دھاگا
تو سوئی ہتھیلی میں بھی چبھ گئی تھی
مگر میری ماں نے ذرا اُف نہ کی تھی
الٰہی اسے صبر، تو نے دیا تھا
وہ ریشم کے کپڑے میں گوٹے کناری
فلک پر ستاروں کی چادر ہو جیسے
وہ ریشم وہ دھاگے کی وحدت تھی ایسی
الٰہی بہشتوں کے بدلے میں مجھ کو
مری ماں کے ہاتھوں کا عرفان دے دے
سیا تھا جو اس نے وہ جزدان دے دے
اسی گھر کا وہ صحن ودالان دے دے
الٰہی مجھے میری پہچان دے دے

اولڈ ایج ہوم

یہ بے زباں بے سخن سے چہرے
گھٹی گھٹی گونگی بہری آنکھیں
شکن شکن در شکن سے چہرے
تھکی تھکی ٹھہری ٹھہری آنکھیں

مرے قریب، اردگرد سارے
وجود کی شکل میں ہیں لاشے
تماشبیں ایک دوسرے کے
ہیں روز و شب ایک سے تماشے

لبوں پہ شکوے ہوں یا دعائیں
بس اک خموشی ہی بولتی ہے
لرزتی سانسوں کی سرسراہٹ
گھٹن کے دروازے کھولتی ہے

بجھی ہوئی آس واپسی کی
سمیٹ لیتی ہے جھریوں کو
تو رعشہ ہاتھوں کا تیز ہو کر
جگانے لگتا ہے انگلیوں کو

وہ ننھے ننھے سے پھول پودے
لپک لپک کر، ہتھیلیوں سے
بکھیر دیتے تھے رنگ، خوشبو
دعا نکلتی تھی لوریوں سے

ان انگلیوں کا سہارا لے کر
بہار آئی تھی آنگنوں میں
پھر اپنے حصے کی باقی خوشیاں
نہ آنچلوں میں، نہ دامنوں میں

مرے قریب اردگرد سارے
مری طرح در کو دیکھتے ہیں
کبھی وہ اس گھر کو سوچتے ہیں
کبھی وہ اس گھر کو دیکھتے ہیں

مری طرح، میرے ہم نشیں بھی
کچھ انگلیوں میں ٹٹولتے ہیں
وہ پھول پودے درخت بن کر
اب آسمانوں سے بولتے ہیں

مری طرح میرے ہم نشیں بھی
ہیں خوگر انتظار اب بھی
لبوں پہ شکوے ہوں یا دعائیں
ہمیں ہے بچوں سے پیار اب بھی

یہ آخری دن کے ہم نشیں ہیں
نہ ان سے یاری نہ رشتہ داری
بھرے رہیں گے یہاں کے بستر
بچھڑتے جائیں گے باری باری

پروین شیر

یہ مرا آسماں

گھر کے تاریک گوشے میں چھوٹا سا اک
کانچ کا آسماں ہے مرا
اک دریچہ وہاں جب کھلا
تو کہیں دور اک
دوسرے آسماں
سے درخشاں ستارے ترے نرم الفاظ کے
رقص کرتے ہوئے جگمگاتے ہوئے
آ گئے آسماں پر مرے
تیرے الفاظ کی کہکشاں
دل کے آنچل پہ پھر جھلملانے لگی
تیرے لہجے کے رنگین ریشم
مری روح کی دھجیاں
جوڑنے کے عمل سے گزرنے لگے تھے مگر
یوں ہوا...!
سب ستارے جو روشن تھے وہ
ایک اک کر کے بجھتے گئے
اور اب...
میرا چھوٹا سا یہ آسماں
پھر سے تاریک ہے
اب بھی اس کا دریچہ کھلا ہے
کہ شاید دمکتے ستارے پھر آ کر اجالا کریں!

زمستاں کا سورج

وہ تاروں کا جھرمٹ
جو تاریک راہوں کو پرنور کر دے
وہ ساون کی برکھا
جو سوکھی زمینوں کو سیراب کر دے
وہ زرخیز مٹی
جو بیجوں سے پودے
جو پودوں سے اکھوے نکلنے تلک
سبزہ و گل کو سینے سے اپنے لگائے
وہ گھنگھور بادل
جو سایہ فگن ہو جھلتی ہوئی
کھیتیوں کے سروں پر
وہ ٹھنڈی ہوا جس میں جو پسینہ سکھائے
بدن کو پھر دم سا تازہ تازہ بنائے
زمستاں کا سورج
جو یخ بستہ جاں کو
حرارت کی بانہوں میں آ کر سمیٹے
وہ تو ہے...!
جو تو ہے تو محفوظ میرا جہاں ہے
ترے دم سے ہے پرسکوں میری دنیا
فلک پر خدا ہے
زمیں پر ہے تو ماں...!

اب بھی

تیرے دل کی
دھڑکن اب بھی
دھرتی کے سینے سے اپنے
کان لگا کر سن لیتی ہوں!

اپنی آنکھیں موند کے
مٹی کی تہہ میں
تیری خوابیدہ آنکھوں کو
چھو لیتی ہوں
تجھ کو راحت کی چادر میں
لپٹی سوتو دیکھ کے تیرے
دل کی دھڑکن پر سر رکھ کر
بے فکری سے سو جاتی ہوں!

اسنیٰ بدر

مارہرہ

بان کے پلنگوں پر جب پھوار پڑتی ہے
چار پائی سیدھی سی کس قدر اکڑتی ہے
اور ہاتھ کے تکیے کسمسانے لگتے ہیں
پام کے بڑے پتے سرسرانے لگتے ہیں
کیسی دل کشا خوشبو کیاریوں سے آتی ہے
فاختہ کہیں بیٹھی دور سے بلاتی ہے
ملگجی منڈیروں پر بیل چڑھنے لگتی ہیں
مالتی کی ٹہنی سے شام جھڑنے لگتی ہے
ساتھ والی چچی کے گھر سے زردہ آتا ہے
کان میں پہننے کو تازہ بیلا آتا ہے
خالہ بی غرارے کو تھام کر نکلتی ہیں
باجیاں سہیلی سے چھت پہ جا کے ملتی ہیں
اماں جی سروتے سے چھالیہ کترتی ہیں
مہرو پاس بیٹھی ہے اس سے بات کرتی ہیں
تخت پر بچھی چادر عائشہ نے کاڑھی ہے
پھول ہیں شگوفے ہیں پتیاں ہیں جھاڑی ہے
اک دھواں سا اٹھتا ہے لکڑیوں کے چولہے سے
تیل تھوڑا اوڈالا تھا، گر گیا ہے بھولے سے
کنڈی کھول کر دیکھو کیا گلی میں سائل ہے
فاتحہ کے حلوے پر بلی کب سے مائل ہے
چائے کیتلی میں ہے طشتری ہے پیالی ہے
نانا کے سرہانے کی پھر صراحی خالی ہے
ابا جی کے آنے کا وقت ہونے لگتا ہے
پاندان کی کلیہ شیفو دھونے لگتا ہے
بار ہا دری چادر بھیگ بھیگ جاتی ہے
اور گاؤ تکیے سے اک مہک سی آتی ہے
جھولا جیسی کرسی پر بانو کھو چکا کب کا
لال ٹین کا شیشہ صاف ہو چکا کب کا
بچیاں وضو کر کے نل سے پانی بھرتی ہیں
جا نماز کا کونا نانی ٹھیک کرتی ہیں
اور اذان ہوتی ہے

ایک دوست کے مختصر قیام پر

چلو اچھا ہوا اس نے مری عادت نہیں ڈالی
چلو اس کو محبت تھی مگر اک درد سے خالی
نہیں، میری کمی کا کچھ زیادہ غم نہیں اس کو
چلو اس کی نظر میں یہ نہ خوش حالی نہ بد حالی

نہ جانے کون سا موسم اسے لے کر چلا آیا
مجھے سرسبز رکھنے کا کہاں سے حوصلہ آیا
مگر رخصت کے یہ آداب بھی سیکھے سکھائے تھے
شجر سایہ فگن چلتے ہوئے خود ہی جلا آیا

چلو تم بھی سمیٹو دل کوئی دستک نہ آئے گی
نہ روا ئے منتظر وہ ناوک چشمک نہ آئے گی
بھلے ہی اپنے غم بازار میں جا کر سجا دینا
کسی کی آنکھ بن کر رنج کی گاہک نہ آئے گی

یونہی مل کر لگا اس راہ میں آرام ہیں کتنے
یہ اب سمجھا محبت کے جہاں میں نام ہیں کتنے
مری بھی ذات بکھری ہے اسے بھی کام ہیں کتنے
کہانی مختصر سی تھی مگر انجام ہیں کتنے

کاوش عباسی

خواب اور خوف

اک گیت بجتا ہے
خواب ایک صدمے سے جاگ اٹھتے ہیں
یاد میں وہ محبت کی گلیاں ابھرتی ہیں
اب جن کی راتوں میں خوف اور تنہائیاں ہیں
فضاؤں میں پھیلے اندھیروں میں
بکھری ہوئی آرزوؤں کی لے گنگناتی ہے
جگنو چمکتے ہیں کوئی سنہری روش جھلملاتی ہے
لیکن وہیں کوئی ہاتھ آگے بڑھتا ہے
گردن تک آتا ہے
سانسیں الجھتی ہیں، دل ڈوب جاتا ہے
اک گیت بجتا ہے

ہم اتنا کچھ کھوئے ہوئے

ہم اتنا کچھ کھوئے ہوئے
کچھ کھو کر ہی سمجھتے ہیں ہم
کوئی ہماری کالی بات
کوئی ہمارا داغ حیات
کوئی ٹھوکر ہی
دل کا اک ٹکڑا جو کاٹ کے لے جاتی ہے
ہم میں کھولتی ہے
وہ خوں کا فوارہ
اور ذہن کی وہ برقی لہریں
ہم جن سے محبت سیکھتے ہیں
پھر نئی، ہماری محبت جس میں نہاتی ہے!

اکیلا

صحت مری یوں ہی قائم رہے
ٹی وی چینل سبھی یونہی چلتے رہیں
سوچیں میری جہاں بھر کے انسانوں کے
ہم قدم گنگناتی رہیں
میں تواریخ، ادب، شاعری کی کتابیں
اسی شوق سے یونہی پڑھتا رہوں
شاعری اپنی لکھتا رہوں
گھر میں تم بن جو تنہائی کا دکھ ہے
گھر پن کی پُر یاد راحت سے خُمار ہے
بے دوست ہو کر بھی، دل،
جینے کی تھاپ پر، یونہی خود مست چلتا رہے
میں نہ بیمار ہوں
تو
اکیلی، بہت دور تم سے، ادھوری سی یہ زندگی
پھر بھی جینے کے قابل ہی ہے
مجھ پہ بھاری نہیں!

اکیلا میں!

اکیلا میں
اس کی محبت بھی
ٹوٹے ہوئے شیشے کی آتشیں دھار!
میں شیشہ گر اس کا شیشہ شکن بھی
مگر میں بھی کیا
اپنی ہی وقت فطرت• کا پرزہ
یہ قابو میں میرے نہ وہ میرے بس میں
میں آپ اپنے 'خوں کیمیا'* کی اُگس میں
سو، تڑپوں کہ پگھلوں کہ چیخوں
میں ہر حال، ہر پل، محبت ہی چاہوں
محبت مگر مجھ کو
اک حال، اک رنگ ہی میں فقط ملنا چاہے
اکیلا میں!

• وقت فطرت: time-nature
* خوں کیمیا: Bio-Chemistry

عقیل شاداب

نیند

رات کی ردا اوڑھے سو رہا ہے سناٹا
اونگھتے درختوں پر کپکپی سی طاری ہے
خامشی کے ہونٹوں پر لوریاں تھرکتی ہیں
ہر خیال بوجھل ہے ہر نگاہ بھاری ہے

سارے شہر کی سڑکیں محوِ استراحت ہیں
قمقمے بھی راہوں کے نیند سے سلگتے ہیں
ہوٹلیں بھی سونی ہیں مے کدے بھی ویراں ہیں
گرجے مندر و مسجد کھوئے کھوئے لگتے ہیں

کنواریوں کے کمرے بھی دلہنوں کے حجلے بھی
اب تو ایسا لگتا ہے تھک کے سو گئے ہوں گے
الغرض سبھی اپنی اپنی خواب گاہوں کے
ریشمی اندھیروں میں جذب سو گئے ہوں گے

تم بھی اجنبی گھر میں کب کی سو چکی ہوگی
آہ جانے کیوں آخر مجھ سے نیند برہم ہے
اب خدا کرے مجھ کو یاد بھی نہ آؤ تم
تم سے دور زندہ ہوں یہ سزا ہی کیا کم ہے

میں بھی ایک دن تھک کر چور ہو ہی جاؤں گا
موت بن کے آئے گی نیند سو ہی جاؤں گا

دیوداسی

میں ایک
دیوداسی ہوں
بچپن میں ہی
میرا بیاہ
مندر کے
دیوتا سے
کر دیا گیا تھا
اور میں اک
مقدس دیوداسی
بن گئی تھی
اب میں
پوجا پاٹھ
اور ناچ گانے میں
ماہر ہوں
مجھے دیکھ کر لوگ
مدہوش ہو جاتے ہیں
بڑے بڑے امیر و کبیر
میری زلفوں
کے اسیر ہیں
اور مجھے شب باشی
کے لئے
لے جاتے ہیں
مجھے اپنی
منہ مانگی قیمت
ملتی ہے
اس سے
مندر کا
خرچ چلتا ہے
اور میرا دیوتا
میرا بھگوان
میری کمائی پر
پلتا ہے
میں ایک مقدس
دیوداسی ہوں

احسن امام احسن

بارِگراں

میں بھٹکتا رہا عمر بھر
اجنبی کی طرح
پھر بھی مجھ کو نہ منزل ملی
میں پریشان ہوں
اب کہاں جاؤں
ہمدرد کوئی نہیں
غم ہے آزار ہے
چھن گئی ہر خوشی
میں پریشان ہوں
زندہ رہنے کا جب کوئی ساماں نہیں
اے خدا
تیرا شہکار ہو کر بھی ہر وقت میں
سوچتا ہوں یہی
کیسے زندہ رہوں
جب ہے بارِگراں
میری خاطر، مری زندگی!!

طوائف

روز بکتی ہے بازار میں
کوئی ہمدرد ملتا نہیں ہے اسے
پھر بھی ارمان ہے
کاش کوئی کبھی
درد کو اس کے سمجھے ذرا
اس کی عزت کرے، اس کو اپنا کہے۔!

مردہ انسان

وہ کہہ رہا ہے، مجھ سے
اپنی ہر اک کہانی
مشکل سے جی رہا ہوں
اک بوجھ زندگی ہے
اس کی تمام باتیں
آتی ہیں سامنے جب
تب سوچتا ہوں میں بھی
کس درجہ ہو گیا ہے
انسان آج مردہ

کشمکش

ایک تحریر ہے
فکر کے جسم پر
میں جسے
روز لکھتا بھی ہوں
اور پڑھتا بھی ہوں
لیکن اب تک
اسے میں سمجھنے سے قاصر ہوں
کوئی بتائے مجھے
میں اسے کیا کہوں
اور کیا نام دوں!

پشیمانی

نہ جانے کیوں یہ
گمان گذرا
قدم تمہارے
بہک رہے ہیں
تو ہم نے سوچا
کہ اس کی تحقیق ہے ضروری
مگر حقیقت سے واقفیت ہوئی
تو عقدہ کھلا
کہ تم کو ہے
ہم نے بے شک، بہت محبت
غلط گمانی نے آج ہم کو
بہت پشیمان کر دیا ہے!

مناظر عاشق ہرگانوی

روبہ آسائش

بے روزگاری
مہنگائی
لاقانونیت
دہشت گردی
جہالت
تفرقہ بازی
اور نت نئے
بحرانوں کے عفریت نے
اپنے بازوؤں میں
جکڑ رکھا ہے
پھر بھی ہم
ترقی یافتہ ہیں
حقوق و مفادات کے
تحفظ کی بات کرتے ہیں
ظلم واستحصال کے
خاتمے کی علامت بن کر
نیا پرچم لہراتے ہیں

ایک نظم

تم یقین کرو
یا نہ کرو
درختوں کے کندھے سے جھولتا سناٹا
بے زبان نہیں ہوا کرتا
چھوؤ اور محسوس کرو
کہ ایک جھنجھناہٹ ہے
جو درختوں کی جڑوں سے
شروع ہو کر
مسلسل بج رہی ہے
میرے اندر کے سناٹے میں بھی
کوئی جھنجھناہٹ پیدا کر کے دیکھے
چھوئے اور محسوس کرے
کہ مجھ میں سورج کی گرمی ہے
اور چاندنی کی ٹھنڈک ہے

شاہد عزیز

شہر آرزو

میں لوٹ کر تو آ گیا
مگر پرانے شہر میں
پرانا کچھ نہیں رہا
وہ رہ گزر وہ راستے
وہ گھر گلی نہیں رہے
میں جن کی جستجو میں تھا
وہ لوگ جانے کیا ہوئے
وہ چاند آسمان کے
کس خلا میں کھو گئے
ماضی اور حال کے
وہ سارے غم بکھر گئے
وہ رشتے اب نہیں رہے
میں زندگی سے ڈر گیا
وہ شہر مجھ میں مر گیا

شاہد عزیز

سمجھوتہ

چلو تم سے بھی
کوئی بات کر کے
دیکھ لیتے ہیں
کوئی سمجھوتہ ہوتا ہے
تو کر کے دیکھ لیتے ہیں
مگر پہلے تمہیں یہ سب
سمجھ لینا ضروری ہے
کہ ہم کس بات سے
ناراض ہوتے ہیں
کہ یوں تو گفتگو کرنا
بہت آسان ہوتا ہے
مگر سب کچھ سمجھ لینا
بہت دشوار ہوتا ہے
تمہیں بھی جینا مرنا ہے
ہمیں بھی زندگی کے ساتھ
یوں ہی مل جل کے رہنا ہے

ناصر عظیم

رکاوٹیں

بشر کوئی کیسے
یہاں اپنی منزل
کو پائے
کہ حائل ہیں
بہت رکاوٹیں
راہ میں اُسکی
اور اُس پر
ہے احباب کا
یہ طریق
ایک کے ہاتھ میں ہیں
دوسرے کے پاؤں...!

لہو

اُسے لہو بہت
پسند ہے
وہ لہو خریدتا ہے
اور دوسروں کو
تحفہ میں دیتا ہے
اگر لگ جائے
اُس کے
دامن پہ لہو کا
کہیں کچھ نشاں
تو اُسے صاف کرنے کی خاطر
پھر کسی کا لہو
مانگتا ہوا وہ
نظر آتا ہے...!

تارا

وہ ایک تارا جو ٹوٹ گیا
لشکر سے اپنے
جو چھوٹ گیا
ایک مدت سے
جائے سکون کی
خاطر
وادی میں
آسمان کی
بدل کے شکل اور
رنگ جانے
کتنے برس سے
بھٹک رہا ہے
وہ ایک تارا جو ٹوٹ گیا...!

شاہد عزیز، 179، محلہ طلائی، اودے پور۔ 313 004

معظم علی خاں

شامِ غزل

ابھی تک یاد ہے شامِ غزل کا خوشنما منظر
حسیں منظر، جواں منظر، سراپا گل ادا منظر
وہ منظر جس پہ ہر منظر فدا رقصِ بہاراں کا
جہاں سجدہ کرے ہر پھول خود صحنِ گلستاں کا
جہاں کشمیر کے رنگیں مناظر بھی بھریں پانی
جہاں پر چاندنی راتوں کو ہو بے حد پریشانی
وہ منظر روبرو لایا چنندہ مہ جبینوں کو
دکھائے جو ہری جیسے تراشیدہ نگینوں کو
اتر آئے تھے مہر و ماہ و انجم شامیانے میں
کسر کوئی نہ چھوڑی تھی سراپا کو سجانے میں
معطر تھا مزاجِ حسن خود بیں عطرِ الفت سے
لبوں پر مسکراہٹ تھی سبھی کے ذکرِ الفت سے
نہ جانے کتنے آہو چشم تھے آدھی نقابوں میں
مگر اک چشمۂ آبِ رواں بھی تھا سرابوں میں
وہی جس کو سرورِ بادۂ الطافِ جاں کہئے
طلسماتی پرستاں کی مکمل داستاں کہئے

سبک چہرے پہ رنگینی تھی پاکیزہ شرابوں کی
مہک آتی تھی اس کے جسم سے تازہ گلابوں کی
نظر میں حسن کے جلوے چراغوں کی طرح روشن
اچک کر دیکھتا تھا نوجوانی بے وفا بچپن
چمک آنکھوں میں تھی تعلیم کے نوریں خزانوں کی
معطر تھی فضا سحرِ بیاں کے سائبانوں کی
تکلم میں ترنم کی جھلک بے حد نمایاں تھی
خموشی میں بھی لہجے کی کھنک بے حد نمایاں تھی
ادائے دلربائی میں کوئی ثانی نہ تھا اس کا
کسی شے سے اتر سکتا نہ تھا یعنی نشہ اس کا
نئی تہذیب کے زریں تقاضوں کا اشارہ تھی
مہذب دور کی رنگیں اداؤں کا نظارہ تھی
کچھ اس انداز سے زلفِ بریدہ اس نے لہرائی
خیال کیف پرور جاگ اٹھا لے کے انگڑائی

نہ جانے کون سے احساس نے جرأت عطا کر دی
حضورِ حسن جانے کی مجھے ہمت عطا کر دی
بھری محفل میں کی تادیر اس سے گفتگو میں نے
دبے لفظوں میں بالآخر بیاں کی آرزو میں نے
اچانک مدّ و جزرِ حزن اٹھا روئے تاباں پر
غموں کی چاندنی پڑنے لگی کچھ بحرِ ارماں پر
رخِ مہتاب پر داغِ تفکر سے نظر آئے
نہ آنا چاہتے تھے اشک آنکھوں میں مگر آئے
گھنی پلکوں نے جیسے ہی شرابِ ضبط چھلکائی
اسی پل ایک جانب سے یہ کانوں میں صدا آئی
طعامِ خاص ہے تیار اب تکلیف فرمائیں
بڑے کمرے میں از راہِ کرم تشریف لے آئیں
ابھی وہ میرے ذوقِ دید کو حیرانیاں دے کر
چلی کھانے کے کمرے کی طرف بیساکھیاں لے کر

4/8 زہرہ باغ علی گڑھ ۔202002 موبائل:9997734696،9219188478

اسلم حنیف

دو شخصیاتی نثری مُوشح

محمد ابن موسیٰ الخوارزمی

زمین اگرچہ
اپنی دائروی اور محوری گردشیں
پوری کر رہی تھی
مگر کائنات میں
انسانی جہالت کے سبب
(جو کائناتی علوم کے فقدان کا نتیجہ تھی)
سورج کی شعاعیں
تمازت کھو چکی تھیں
ازبکستان کے ایک گھر میں
شکستہ بوریے پر بیٹھا
خوارزمی اس حقیقت سے باخبر تھا
اس کا ذہن
نجوم کی گردشوں
زمین کے احوال اور
ریاضی کے ہندسوں کی
حقیقتوں کی دریافت میں محو تھا

اور جب
علم الجبرا
ایک باقاعدہ نظام کی صورت میں
ڈھل گیا
بوریے پر بیٹھی معمر ہستی کی
مسرور آنکھیں کھلیں
اس نے دیکھا کہ
سورج پوری آب و تاب سے
زمین کو منور کر رہا ہے
اور
پوری کائنات
انسانی ارتقاع کے نغمات
گنگنا رہی ہے

چارلی چپلن

مسائل حیات
اور
تنگ دستی کا مستقل دباؤ
طنز و مزاح اور مسخرے پن میں ڈھل کر
باطنی کرب پر
پردہ ڈال دیتا ہے
چارلی نے بچپن ہی سے
شرابی باپ اور مظلوم ماں کے درمیان رہ کر
زندگی کی جن تلخیوں کا زہر پیا تھا
دھیرے دھیرے وہ
فنی شکل میں منتقل ہو گیا
اور دھیرے دھیرے
چارلی ایک عظیم مزاحیہ فنکار کی حیثیت سے
دنیا کے ذہنوں پر چھا گیا...لیکن
کسی نے نہیں سوچا...کہ
خندۂ استہزا کے پس پردہ چارلی چپلن
پورے ماحول اور سماج کی
کرب ناک حقیقتوں کا مذاق اڑا رہا ہے
اس کے ڈرامے اور اس کی فلمیں
ازالۂ غم کا وسیلہ نہیں ہیں
بلکہ ماحول و معاشرت کی تنقید ہیں
جن پر ہنسنے کی بجائے
آنسو بہانا چاہئے

شاہد جمیل

کمرے سے باہر کا خوف

میرے کمرے میں——

کھڑکی کا پردہ ہٹا کر درندہ کوئی گھس رہا ہے
کواڑوں میں 'کی ہول' سے
آنکھ عفریت کی جھانک کر دیکھتی ہے
قریں 'وینٹی لیٹر' کے چمگادڑیں جھولتی ہیں
کتابوں کے ٹیبل سے چمٹا ہوا سانپ
پھن کاڑھتا ہے
وہاں ہینگر سے لٹکتا ہے بچھو
لپکتا ہوا چڑھ گیا کارنس پر کوئی کیکڑا ہے
وہ ٹی وی کے پیچھے سے ہوتی ہے جو سرسراہٹ
کسی کاکروچ کی نہیں ہے
ادھر لیمپ کی اوٹ سے گھورتی چھپکلی
کر رہی ہے اشارے
مسہری سے لگ کر کریہہ اور بد شکل مکڑا کھڑا ہے
لحاف اور بستر میں تکیہ کے نیچے
سرکتے ہوئے کنکھجوروں کا دل ناچتا ہے
مری آنکھ میں رینگتی ساعتوں سے لرزتی ہے دیوار
کلنڈر بھیانک خموشی میں پر پھڑ پھڑاتا ہے
کھا کر ہواؤں کے تھپیڑ
بڑے زور سے چیختا ہے—— نکل جاؤ
لیکن
مجھے یہ پتہ ہے
کہ کمرے سے باہر اگر میں نکل کر گیا تو
یہ سچ ہے کہ پتھر کا ہو جاؤں گا!!

خالی مکان میں ایک دعا

شاید اتنا بجھا ہوا ہے——یا
اتنا بے خود
بے آزار
جیسے سطحِ آب پہ ٹھہرا پتہ کوئی
ساکت، جامد، بے رفتار
یا خود اپنی ذات کے اندر
اتنا بے در، بے دیوار
مجھ کو——
اس ویران کھنڈر میں چکراتے آسیب سے کوئی
خوف نہیں
آنگن میں امرود کے نیچے لیٹا، تنہا، خالی، چپ
منظر، پس منظر میں گڈمڈ ہوتا میں
پیپل سے ٹکرا کے پلٹتی، سر کو پٹکتی،
اندھا دھند بے حملہ آور
میری پیاری دوست ہوا
منہ زور ہوا

احساس دلاتی ہے مجھ کو——
میرے تن میں من میں جتنا سناٹا ہے
اس میں تو دس دس آکاش گزارہ کر سکتے ہیں!
مالک و مولا!!
آوارہ سب رنگ ہوئے
میرے آنکھوں کے
دکھ کی یادیں خوابوں کا رخ موڑ چکی ہیں
میں کس دل سے تن کے بھیتر دھوپ نہاروں
بادل کے ارمان سجاؤں
اور سنہری، سبز، گلابی، دھانی کھڑکی
مجھ میں کھول
میرے من کے اندر جتنی دھند ہے مولا
اس کو ہی کر دے انمول

شارق عدیل

ارضِ فلسطیں

بہت دنوں سے لہو زار ہے وطن کی زمیں
بہت دنوں سے فلک بھی اداس ہے میرا
بہت دنوں سے مری بیٹیوں کے جسموں نے
نیا لباس نئی خوشبوئیں نہیں دیکھیں
بہت دنوں سے مرے ننھے سے فرشتوں کی
شرارتوں کو ترستی ہیں شہر کی گلیاں
بہت دنوں سے یہ معمول بن گیا ہے یہاں
جوان بیٹے مرے جب بھی شہر جاتے ہیں
پلٹ کے کتنے ہی ان میں سے گھر نہیں آتے
بہت دنوں سے ہی ہولناک سے منظر
مری نگاہوں میں پنجے گڑائے بیٹھے ہیں
مگر یہ سچ بھی زمانے پہ آشکارا ہے
کسی بھی لمحہ مرا حوصلہ نہیں ٹوٹا
تمہارے ظلم کی سب انتہائیں شاہد ہیں
کہ میں نے صبر کا دامن کبھی نہیں چھوڑا
مرا یقیں ہے مرا صبر جب بھی ٹوٹے گا
تو تم کو وادیٔ اقدس کو چھوڑنا ہوگا
مگر زمینِ فلسطیں کے غاصبو! یہ بھی
یقین رکھو کہ اس جنگ کے سمٹنے پر
خود اپنے جبر کی شرمندگی کو اوڑھے ہوئے
تمہیں خود اپنی ہی تاریکیوں میں کھونا

یہ کیسی جنگ ہے

یہ کیسی جنگ ہے جو اپنی منفعت کے لئے
غریب ملکوں کی آزادیوں کو چھینتی ہے
یہ کیسی جنگ ہے، جس میں مقابلے کے بغیر
نشانہ سادھ کے گولی چلائی جاتی ہے
یہ کیسی جنگ ہے جس میں اسیر لوگوں پر
اذیتوں کے لئے کتے چھوڑے جاتے ہیں
یہ کیسی جنگ ہے، جس میں بموں کی یورش سے
سماعتیں بھی خدا سے پناہ مانگتی ہیں
یہ کیسی جنگ ہے شہروں کی تنگ گلیاں بھی
بھڑکتے شعلوں سے روشن دکھائی دیتی ہیں
یہ کیسی جنگ ہے جس میں وفا پرستوں کی
ہلاکتوں کی خبر بھی اڑائی جاتی ہے
چلو یہ پوچھیں تباہی کے کاشکاروں سے
بنامِ امن کہاں تک لہو بہاؤ گے

نکل کے دیکھو کبھی ایٹمی حصاروں سے
تمام عالمِ انسانیت ہے شرمندہ
یہ سوچو خون کے سوداگرو ذرا سوچو
لہو کی ندیاں بہیں گی اگر زمینوں پر
تمہاری کاشت کے پرہول منظروں کے لئے
تمہارے ملکوں کے شہروں کو بھی ڈبو دیں گی
ہر ایک ظلم تمہیں اپنا یاد آئے گا
پناہ ڈھونڈو گے تم رات کے اندھیروں میں
مگر وہ رات بھی شعلوں میں ڈوب جائے گی

وہ وقت تم پہ قیامت سے کم نہیں ہوگا
تمہارے کرب کا ہم کو بھی غم نہیں ہوگا

شائستہ فاخری

محبت کے نام ایک نظم

محبت نظم لکھواتی ہے
اور رسوا کراتی ہے
محبت بند کمرے میں
لہو آنسو رلاتی ہے
محبت لفظ کی حرمت سمجھتی ہے
محبت درد کی آہٹ کو سنتی ہے
محبت مسئلے کرتی ہے پیدا
مگر حل ڈھونڈ لاتی ہے
محبت چپکے چپکے درد سہتی ہے
جو پھنس جائے نکلنا
اس کا ممکن ہی نہیں ہے
محبت عنکبوتی جال بنتی ہے
یہ خود کہتی ہے
کہہ کر خود ہی سنتی ہے
محبت زخم دیتی ہے
مگر مرہم بھی رکھتی ہے
محبت زہر بھی تریاق بھی ہے

محبت شہر پاکیزہ کا ہے اک کوچہ جاناں
محبت شہر ناپرساں کا اک جلتا چراغ جاں
محبت زندگی بھی موت بھی ہے
محبت صبح تابندہ
محبت شام افسردہ
محبت رقص کرتی ہے
تو سارے درد پیچھے چھوڑ جاتی ہے
کبھی گزرے ہوئے لمحوں سے
رشتہ جوڑ کر دیکھو
محبت خود بخود معنی بتائے گی
محبت کرنے والو!
غور سے سن لو
تم اس جانب اگر جانا
تو اتنا سوچ کر جانا
محبت ایسا صحرا ہے نہیں پھر لوٹ کر آنا

سید تحسین گیلانی

کیا غلط ہے

میں اگر سورج پہن لوں
روشنی کی شال اوڑھوں
رات کا چہرہ ٹٹولوں
مست ہولوں...!
بے سبب ہی مسکرا لوں
خواہشیں سولی چڑھا دوں
راستوں کو اپنے قدموں میں سمو لوں
تھوڑا ہنس لوں
تھوڑا رو لوں
اپنے اندر بہتے چشموں میں نہا لوں
اپنی بے تابی کی میت
کا ذرا نوحہ میں کرلوں
دندناتی وحشیانہ رقص کرتی
اس ہوا کے ہونٹ چوموں
آج سجدوں میں اتر کر میں ابد کے قفل کھولوں
گنگ ہو کر بھی پکاروں اور بولوں
چشم دل کے آنسوؤں سے نقش دھولوں
آج اگر میں گڑگڑا لوں... کیا غلط ہے؟
کیا غلط ہے...؟؟

سیفی سرونجی

رونے والا چہرہ لے کر...!

کب تک رینگتے وقت کو بیٹھے..
پہروں تکتے رہنا ہے
کب تک ہنستے ہنستے ہم نے
دکھ کو سہتے رہنا ہے
کب تک خون یہ آنسو بن کر
آنکھوں سے یوں بہنا ہے
کب تک لاشے دیکھ کے خود کو
"گھبرو" ہم نے کہنا ہے
رونے والا چہرہ لے کر
کب تک ہنستے رہنا ہے!!

نظم

آؤ ہم سب مل کر
جنگل کی طرف چلیں
کہ اب تو شہروں میں
انسان بھی
جنگل کی طرف کٹ رہے ہیں
یہ سچ ہے کہ اب
جنگل بھی انسانوں سے
محفوظ نہیں رہا
لیکن پھر بھی
چند سانس
سکون کی لے سکتے ہیں
اس لئے کہ
جنگل کے جانوروں کی
ہمدردی ہمارے ساتھ ہوگی

نظم

تمہاری جھوٹی انا نے
تمہیں آج
کہیں کا نہ چھوڑا
کہ تم نے
اپنے ضمیر کی آواز کو
کبھی محسوس نہ کیا
اور مسلسل
اپنی ضد اور انا کے خول میں
بند رہے
اور جب بیدار ہوئے
تو وقت گزر چکا تھا

سہیل اختر

مہاکوی جی

مہا کوی جی بہت دکھی ہیں
کویتا ان سے بچھڑ گئی ہے
وہی کویتا
جو ساتھ رہتی تھی ان کے ہر دم
کہ جب کوی جی نہیں تھے مشہور
جب کوی جی تھے بھولے بھالے
مہا کوی وہ نہیں ہوئے تھے

وہ ایک گاؤں کے رہنے والے
قریبی قصبے کے
ایک اسکول میں تھے ٹیچر
بڑے ہی اچھے تھے وہ مدرس
تمام بچوں کے تھے چہیتے
اگر چہ آسائشیں میسر نہیں تھیں ان کو
عجب طرح کا تھا روح پرور سکون حاصل
عجیب سی ایک اندرونی خوشی تھی حاصل

مگر پھر اک دن
نہ جانے کیسے
کوی کا احساس یہ ستایا
جو ان کا جائز ہے حق ادب پر
انہیں ابھی تک نہیں ملا ہے
وہ اپنی گم نامیوں سے نالاں

ادھر یہی سوچنے لگے تھے
کہ جو بھی مشہور آج کل ہیں
کوی وہ سارے ہیں ان سے کم تر
وہ چاہتے تھے
انہیں بھی شہرت ملے وہ ساری
ادب میں ہو اک مقام ان کا

ہوا یہ احساس
صرف لکھنے سے کچھ نہ ہوگا
انہیں بھی کچھ جوڑ توڑ کرنا پڑے گا اب تو

ہوئی سیاست کی ابتدا تب
وہی سیاست
جو توڑ دیتی ہے جسم سے روح کا ہی رشتہ
جو ختم کرتی ہے ساری قدریں
نگلتی ہے جو اصول سارے
جو مار دیتی ہے ایک انساں کو اندر اندر
جو خشک کرتی ہے فن کے سوتے
ہر ایک جذبے، ہر ایک احساس کی ہے قاتل

وہ ساری باتیں ہیں اب تو اریخ
کوی جی مشہور ہو چکے ہیں
کوی جی اب راجدھانی میں ہیں
ہر ایک ادارہ ہی جیب میں ہے
تمام اعزاز مل چکے ہیں
مگر کویتا بچھڑ گئی ہے

کوی جی، بتلاؤ! اب تو کوئی کمی نہیں ہے!
تو پھر یہ بے چینی کس لئے ہے؟
اگر کویتا سے پیار ہے تو
یہ ڈھونگ چھوڑو
اگر ہو ممکن
تو راجدھانی ہی چھوڑ دو اب
تمہیں تمہارا وہ گاؤں اب بھی پکارتا ہے
تمہارے گاؤں کے
کھیت، پربت، ندی، درخت انتظار میں ہیں
ہے روح جس گاؤں میں تمہاری
تمہاری پیاری کویتا شاید وہیں ملے گی

سہیل اختر

ہم ہوئے، تم ہوئے...

ہم جو منہ میں زبان رکھتے ہیں
ان کی ضد ہے یہ کاٹ لی جائے
بولنا ہم نے تھا سکھایا جنہیں
بولتے ہیں وہ اب ہمارے خلاف
لطف یہ ہے کہ جب بھی بولتے ہیں
وہ ہماری زباں ہی بولتے ہیں
اور دشمن بھی اس زباں کے ہیں
ہے حسد، خوف ہے کہ نفرت ہے
کیا ہے کھل کر کبھی نہیں کہتے
لاکھ اگلیں وہ زہر
پر دل سے
اس کی عظمت کے
وہ بھی ہیں قائل
اس میں حیرت کی بات ہی کیا یہ
اس میں تاثیر ہی ہے کچھ ایسی
''ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے
سب اسی زلف کے اسیر ہوئے''

برف زار

شہر پر برف گرتی رہی مستقل
سرد بوجھل ہوائیں، فضا مضمحل
سارے ماحول پر چھائی گھنگھور سی
ایک پژمردگی، بے حسی، مردنی

شہر آتش کے شرنار تھی
کس قدر تھے دکھی
سرد ماحول میں تھوڑی راحت ملی
اک ذرا سی جو تبدیل آب و ہوا ہو گئی
یوں لگا ختم ہر مسئلہ ہو گیا

ہے مگر کس قدر عارضی ہر خوشی
شہر آتش کے شرنار تھی
خوش تھے چھوڑ آئے پیچھے جہنم کدہ
حکمراں بربریت سے دہشت زدہ
تھے جہاں
پر یہاں
قہر موسم بدستور جاری رہا
سرد مہری کی نوکیلی، برفیلی ٹھنڈی ہوا
جسم پر وار کرتی رہی
روح کو زخم دیتی رہی

کون ہے جو سنے ان کی یہ بے کسی
شہر ہے لوگ ہیں، پر نہیں زندگی
قابل دید ہے شہر کی بے حسی

سرد پڑنے لگے، ولولے، حوصلے
برف جمنے لگی سارے جذبات پر
اور ہر احساس ہوتا گیا منجمد
رفتہ رفتہ رگوں کی روانی کہانی ہوئی
وہ کہانی...
جواں جس میں تھی زندگی
زندگی پُر بہار
اور بہار اپنے رنگوں سے معمور
کتنی مسحور کن تھی فضا، وہ ہوا
اس روانی کی منزل مگر
بیکرانی نہ تھی
اس کے حق میں تھا بہنا
بلندی سے گرنا
وہ جھرنا
کہ تھا برف زاروں میں جس کو مگر
آخر کار جمنا یونہی

شہر پر مستقل برف گرتی رہی
ایک ویرانی دیوار و در سے برستی رہی
اک عجب بے حسی شہر والوں پہ طاری رہی

Suhail Akhtar
JM(DM) IDCO, IDCO Towers,
Janpath, Bhubaneshwar-751022

منزہ شاہ

دو نظمیں

یہ جلتے بجھتے قمقمے
ہر شام کی آمد پر افسوس کرتے ہیں
چند گھڑیوں کے مہمان بنتے ہیں ٹمٹماتے ہیں
اداس شاموں کو روشن کرتے ہیں
یہ میری آنکھوں کے دیئے ہیں انھیں دیکھ لو
یہ بھی سر شام ہی سے جلتے ہیں
میری برباد حسرتوں کی مٹی میں
مجھے دفن کرتے ہیں
میرے پیمانہ لب کو تشنگی دیتے ہیں
صحرائے تمنا کی بستی میں
میں کچھ کہوں بھی تو کیا کہوں
تم سے ملنے کی حسرت سہی
یہ وقت بھی فریاد کا نہیں
لب پیاسے ہیں سانسیں کم ہیں
زندگی منجمد ہار رہی ہے
لہروں کی زمیں فانی ہے
میں ہوں اور تمہاری آہٹ ہے
جو ہر لمحہ میرے قریب
بہت قریب سے مجھے سنائی دیتی ہے
میری بے نور آنکھوں کو روشن کرتی ہے
ہر آہٹ پر گماں ہوتا ہے ہر پل دل دھڑکتا ہے
مجھے یوں ہی لگتا ہے مجھے ایسا ہی محسوس ہوتا ہے
کہ تم میرے پاس ہو
تمہاری یاد ہے اور میں ہوں
بس میں ہوں اور تم ہو
کمرے کا ملگجا اندھیرا ہے
زندگی زخش سفر پر ہے
بڑا لمبا سفر ہے
آخری پل ہیں اور آخری گھڑیاں ہیں
شام کا سویرا ہے اور تنہائی کا بسیرا ہے

۲

جب تمہارا دل ٹوٹ جائے تو تم کیا کرو گے
آسمان پر چمکتا سورج ڈوب جائے
تو تم کیا کرو گے
رات کی تاریکی شفق سے جا ملے تو تم کیا کرو گے
اک تارا بولے اور پھر ٹوٹ جائے
تو تم کیا کرو گے
اور دن کا اجالا کہیں آس پاس
پاس ہی پاس اندھیرے کو چھولے
تو تم کیا کرو گے
جب کسی دل کی دھڑکن پکارنے لگے اور
کسی کی صدائیں تم کو آواز دینے لگیں
تو تم کیا کرو گے
اور جب وطن کی مٹی بھی تم کو آواز دینے لگے اور
بندوقوں کی گولیوں کی بوچھاڑ
تمہارے کانوں سے ٹکرائے تو تم کیا کرو گے
یتیموں کی فغاں، بیواؤں کی آہ
بہنوں کے ترنم کی لہک اور ماں کے آنچل کی ہوا
تم تک پہنچنے لگے تو تم کیا کرو گے
اور جب کوئی ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ
تمہارے پاس آئے اور
بھیک مانگنے کی صدائیں بلند ہوں
گلیوں کا لہو بلائیں لے
ماتھے کی شکن سلوٹ بنے
اور پھر جب تم خود ہی بیساکھیاں لے کر چلنے لگو
تو تم مجبور لاچار بن جاؤ گے
نفسیاتی جیل کی قید میں دفن ہو جاؤ گے
مٹی کے ڈھیروں من
تمہارے جسم کو تمہارے تن من کو
تمہاری بصیرت کو تمہارے جلوؤں کو کھا جائیں گے
اک راکھ رہ جائے گی اک آگ جل جائے گی
بچا لو اس راکھ کو بچا لو اس آگ کو
جذبات کی یلغار ہے یہ آگ
احساسات کی مہکار ہے یہ راکھ
جینے کی کائنات ہے یہ آگ تو
دل کا ستون ہے یہ راکھ
خدارا بچا لو اس کو کہ یہ آگ
تمنا ہے تمہارے لئے
ہم سب کے لئے

درد چاپدانوی

کوہِ ندا

سنا ہے کہ حاتم گیا تھا جانبِ کوہِ ندا
کسی نے اسے دی تھی آوازِ پیہم
مگر دوسروں کی طرح اس نے اک پل
پلٹ کر نہ پیچھے کی سمت دیکھا
وہاں اس نے دیکھا
ہزاروں سنگی مجسمے ڈھل گئے تھے
جو پتھر میں
انہوں نے پلٹ کر دیکھا تھا اپنی بستی کو
یہ سوچ کر حاتم مسکرایا
کہ کوہِ ندا کا جہانِ طلسمات
بہتر ہے بستی سے جسے چھوڑ آیا ہوں میں
یہاں پر سکوں ہے نہ کوئی ہے ہلچل
اگر سنگ میں ڈھل گیا میں
تو اس کے طلسمات کو کیا سمجھ پاؤں گا
اچانک ہی حاتم کے اندر سے
آواز آئی چلے آؤ بستی کی جانب
یہاں زندگی کے حقیقت کا طلسمات جواں ہے
وہاں بے حقیقت فضا ہے
اچانک ہی حاتم نے اس سمت دیکھا
جدھر صدا آ رہی تھی
پھر وہ اک سنگ میں ڈھل گیا!

فرہاد

یقیں فرہاد کو ہرگز نہیں تھا
کہ کوہِ بے ستوں سے کوئی جوئے شیر نکلے گی
یہ کارِ تیشہ زنی پھر بھی کارِ زیاں نہیں ہے
اسے اس بات کا کامل یقیں تھا
کہ اس کہسار کے اندر کہیں
نہاں ہیں خد و خالِ شیریں
میں اس تمثال کو باہر نکالوں گا
اور اس طرح سے رخِ جاناں کا میں دیدار کروں گا
یقیں فرہاد کو کب نہر کے نکلنے کا تھا
مگر وہ جانتا تھا خد و خالِ شیریں کوہِ بے ستوں
میں پوشیدہ ہیں
یہی وہ آرزو تھی جس نے اس سے
تیشہ زنی کرائی تھی
اس لئے مصرعہ غالب حقیقت کا بنا ہے استعارہ
کوہکن نقاش یک تمثالِ شیریں تھا اسد

سقراط

مجھے یہ زہر کا پیالہ مت پیش کرو
میں تو پہلے ہی
شعور کا جامِ آتشیں پی چکا ہوں
مجھے تو اب کسی شے کی ضرورت ہی نہیں ہے
مجھے تو غیر فانی زندگی مل چکی ہے
اک جاوداں روشنی مل چکی ہے
میں خود اپنے اندر شناوری کر رہا ہوں
میں نے خود کو پہچان لیا ہے
گویا ہر زہراب میرے لئے تریاق ہے
میں غیر فانی ہو چکا ہوں
کوئی بھی زہراب میرا کیا بگاڑے گا
اور میں شعور کے جامِ آتشیں سے
ہر شے کو جلا کر راکھ کر دوں گا

سید تصنیف حیدر

لوگ کہتے ہیں اجنبی ہو تم

تم مری زندگی کا حصہ ہو
مری اُمید، مری دنیا ہو
راستہ میں ہوں نقشِ پا تم ہو
ابتدا میں ہوں، انتہا تم ہو
تم سرِ شام میری آنکھوں میں
خواب کی شکل میں اُترتی ہو
کبھی انفاس میں سمٹتی ہو
کبھی احساس میں ابھرتی ہو
میرا ہر راز تم سے وابستہ
مری ہر فکر میں سمائی ہو
تشنگی بن کے مجھ میں رہتی ہو
زندگی بن کے مسکرائی ہو
میری نظموں میں ڈھل گئی ہو تم
میری غزلوں میں بس رہی ہو تم
لوگ کہتے ہیں اجنبی ہو تم

تم ہی اکثر خیال کے در پر
ہٹ گئیں مسکراہٹیں رکھ کر
میں تمھیں ڈھونڈتا رہا اور تم
چھپ گئیں، دل میں آہٹیں رکھ کر
مری ہر ایک بات بھی تم سے
دن بھی تم سے ہے، رات بھی تم سے
میری خوشیوں کا سلسلہ ہو تم
میرے غم کی حیات بھی تم سے
خود سے بے گانہ، خود سے بے پروا
میں کوئی رنگ ہوں تمنا کا
اور تم میری آخری منزل
جس سے رشتہ ہے میری دنیا کا
دن میں یادوں کی روشنی ہو تم
رات میں خواب چاندنی ہو تم
لوگ کہتے ہیں اجنبی ہو تم

خواب کے سرمئی گھروندوں میں
میں تمھارا خیال رکھتا ہوں
اس دلِ پر اُمید میں ہمدم
اک غمِ لازوال رکھتا ہوں
جانتا ہوں کہ زندگی اکثر
منزلِ درد سے گذرتی ہے
اپنی تنہائی میں نکھرتی ہے
تم سے کچھ اس طرح ملا ہوں میں
چاند سے جس طرح چکور ملے
اور گھٹاؤں سے جیسے مور ملے
آسماں سے زمین کی نظریں
جس طرح بار بار ملتی ہیں
روز ساحل کے دامنِ دل سے
جیسے موجیں ہزار ملتی ہیں
کسی شاعر کی شاعری ہو تم
اپسرا ہو، کوئی پری ہو تم
لوگ کہتے ہیں اجنبی ہو تم

میں ہوں دہلیز تم چراغ کوئی
میری منزل کا ہو سراغ کوئی
میرے جذبوں کے کارواں میں تم
میرے دل میں، مرے جہاں میں تم
جھیل کا اک حسین منظر ہو
دھند کی اک سفید چادر ہو
ہر نشیب و فراز میں تم ہو
لَے میں تم اور ساز میں تم ہو
تم سے وابستہ سلسلہ دل کا
تم سے روشن ہے آئنہ دل کا
کبھی ساون کا روپ ہوتی ہو
کبھی سردی کی دھوپ ہوتی ہو
کبھی خاموشیوں کا بن ہو تم
کبھی معصوم سی کرن ہو تم
اب جہاں تک نظر کا سایہ ہے
میں نے تم کو قریب پایا ہے

۲۱ جولائی ۲۰۰۹

اس قدر دل کو بھا گئی ہو تم
اس قدر پاس آگئی ہو تم
لوگ کہتے ہیں اجنبی ہو تم

میری تنہائیوں کے بس میں ہو
میری آنکھوں کی دسترس میں ہو
گھر میں بازار میں سفر میں تم
شب کی آغوش میں، سحر میں تم
درد کے آخری پڑاؤ میں
دل کے جلتے ہوئے الاؤ میں
خواہشوں کے ہراک بگیچے تک
فکر کے آخری دریچے تک
یاد کی ہر نئی کہانی میں
میری دنیا میں، زندگانی میں
سب عروج و زوال ہے تم سے
ہر جواب و سوال ہے تم سے
زندگی کا خیال ہے تم سے
تم بچھڑ کر بچھڑ نہیں سکتیں
شہرِ انفاس میں بسی ہو تم
خواب کے رنگ میں رنگی ہو تم
لوگ کہتے ہیں اجنبی ہو تم

اک مصور کا شاہکار ہو تم
خوبصورت سا آبشار ہو تم
ہاں! سراپا کوئی بہار ہو تم
پیرہن، گل کو مات دے جائے
چہرہ، دل کو حیات دے جائے
زلفِ شب گیر آئنے جیسی
اور جبیں ٹھیک چاند کے جیسی
چشم کو میر کا خیال کہیں
حسن کو حسنِ لازوال کہیں
نقشِ مانی ہراک ادا میں ہے
کرشن کی بانسری صدا میں ہے
فکرِ غالب کی دلکشی ہو تم
دستِ آزر کی بت گری ہو تم
لوگ کہتے ہیں اجنبی ہو تم

پھر وہی صبح، وہی شب، وہی افسوس کی شام
جس میں اک خواب کے گم ہونے کا غم زندہ ہے
دل کے کونے میں کوئی وجہِ الم زندہ ہے
میں کہ برسوں سے کسی بھٹکے مسافر کی طرح
آج بھی تم کو ہی منزل کا نشاں جانتا ہوں
آج بھی میں کہیں برسوں کی مسافت بن کر
تم کو اُمید کی اک نہرِ رواں جانتا ہوں
اپنے ہر شعر کے ڈھلتے ہوئے آئینے میں
تم کو اعجازِ ہنر، رنگِ بیاں جانتا ہوں
لیکن اب تم سے بچھڑنے کا نہیں ڈر مجھ کو
ہے وہی عالمِ تنہائی میسر مجھ کو
جس میں دو جسم سرِ شام شفق بن جائیں
صبح کو دامنِ گیتی کی رمق بن جائیں
کبھی اُگتے ہوئے سورج کا نظارا ہو کر
آسمانوں سے کوئی ٹوٹتا تارا ہو کر
شہرِ انفاس کے خاموش نہاں خانوں میں
دل کے آنگن میں کبھی ذہن کے ایوانوں میں
آرزوؤں میں، تمناؤں میں، ارمانوں میں
ہم سے قائم ہے جہانِ غم ہستی جاناں!
دل نے مانا ہے اسے عشق پرستی جاناں!

زارا فراز جمشید پوری

بستی چھوڑ چکی ہوں

اب میں نے ہوا کا رخ دھار لیا ہے
بستی چھوڑ دی ہے
مٹی کے چھوٹے ٹیلوں کے اندر
میری بیٹی گم ہو گئی ہے
کب سے میں ریت اڑاتی پھر رہی ہوں
میرا لباس تک پھٹ چکا ہے
میرے تھیلے میں
صرف اس کے پوشاک ہیں
سخت سردی ہے ناں!
اس لئے اس کے سویٹر، مفلر اور کمبل بھی ساتھ
رکھ لئے ہیں
کیا پتہ وہ کس حال میں ہے
مل جائے تو فوراً اپنا روپ بدلوں گی
کہیں سرد ہوائیں اسے بیمار نہ کر دے
سب نے یہی کیا تھا
''اسے سردی سے بچانا''
مگر پھر خود ہی لوگوں نے
اس کے نازک بدن سے
ملائم ململ کی کرتی اتار کر
سفید سوتی چادر ڈال دی تھی
اور کہا تھا
اس سفر میں اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے
پر میری بیٹی نازک ہے
بیمار ہو جائے گی
اس کے ننھے ننھے کپڑوں کو لے کر
ڈھونڈ رہی ہوں ٹیلوں پر
میں اب بستی چھوڑ چکی ہوں...!!

افق کے پار

افق کے پار
جہاں تم ہو
جہاں سے تم مجھے آواز دیتی ہو
جو رستہ تم نے چھوڑ رکھا ہے
میرا عصا مجھے اس طرف ہی لے چلا ہے
جن رستوں پر
تمہارے ننھے قدموں کی نشانیاں ہیں
تمہارے نرم و نازک وجود کی پرچھائیاں ہیں
ان رستوں پر میری نگاہیں بچھی ہوئی ہیں
تمہارے لمس کو چھو رہی ہیں
مگر... تم کیوں کھو گئی
میری گود سونی ہو گئی
میری ممتا پیاسی رہ گئی ہے
تشنگی بڑھتی جا رہی ہے
تم میرے پہلو میں کب سماؤ گی...؟
تم مجھ کو اپنے پاس کب بلاؤ گی؟

سید صفدر

دل کی مٹی

دل کی مٹی میں کسی نے اک راز چھپایا ہے
کیا پایا ہے؟
اس کی 'نا' سے 'ہاں' کا اظہار ہوا ہے
اک 'انکار' بدل کر 'اقرار' ہوا
اک خاموش صنم دلدار ہوا ہے
وہ جو کچھ دل کے بھیتر تھا اخبار ہوا ہے
اک ویرانہ بازار ہوا ہے
اک سناٹا یلغار ہوا ہے
دل کی مٹی میں کسی نے اک راز چھپایا ہے
کیا پایا ہے!!

معرفت زبیر احمد، بھارت ہیلتھ سینٹر، مین روڈ، آزاد نگر، جمشید پور 832110

خالد رحیم

تضمینیں

بر غزل وزیر آغا

جانے یہ کس کی فرطِ وفا کا عتاب تھا
ہر سمت ایک خام خیال کا باب تھا
دشتِ جنوں تھا اور غمِ اضطراب تھا
''نکلے سفر پہ ہم تو قمر ہم رکاب تھا
پھر صبح تک رفاقتِ شب کا عذاب تھا''

یہ سچ نہیں کہ دل میں تمنا جواں نہ تھی
کیسے کہوں کہ راہِ وفا ضوفشاں نہ تھی
ایسا نہ تھا کہ تیری صدا نگہباں نہ تھی
''یہ بھی نہیں کہ تیری نظر مہرباں نہ تھی
تارا مرے نصیب کا زیرِ عتاب تھا''

اک مضمحل خیال کا اس شام ترے پاس
داغِ غمِ وصال کا اس شام ترے پاس
اس دل کی عرضِ حال کا اس شام ترے پاس
''میرے دکھی سوال کا اس شام ترے پاس
بھیگی ہوئی نظر کے سوا کیا جواب تھا''

طوفان اضطراب کی شورش لبوں پہ تھی
بیدار زندگی کی شفارش لبوں پہ تھی
اک خامشی میں جیسے گذارش لبوں پہ تھی
''دیکھا تو ایک خفیف سی لرزش لبوں پہ تھی
پلکوں کے ساتھ چپکا ہوا کوئی خواب تھا''

خالد! تھا ہر قدم پہ مروت کا سلسلہ
اک وقت تھا کہ لوگ یہاں کے تھے باوفا
گو آج زندگی میں نہیں ایسا ماجرا
''کر وہ زمانہ یاد کہ تھی آنکھ میں حیا
مابین دوستوں کے ابھی کچھ حجاب تھا''

بر غزل مظہر امام

سفر میں اکیلا ہے کس واسطے
تلاطم نے گھیرا ہے کس واسطے
انا سرکشیدہ ہے کس واسطے
غرورِ سفینہ ہے کس واسطے
خفا موجِ دریا ہے کس واسطے

تری گفتگو میں اثر ہے تو پھر
فضا چار سو معتبر ہے تو پھر
مہکتی ہوا ہم سفر ہے تو پھر
''یہ خوشبو کا موسم اگر ہے تو پھر
ترا رنگ پھیکا ہے کس واسطے''

کہاں کوئی قصہ بلندی کا ہے
جو رشتہ ہے صحرا نوردی کا ہے
فسانہ یہی اپنی ہستی کا ہے
''نتیجہ اگر ڈھیر مٹی کا ہے
بدن کا تقاضہ ہے کس واسطے''

نہ شاخِ تمنا نہ پھل پھول ہے
نہ منزل نہ اڑتی ہوئی دھول ہے
نہ دستِ ستمگر میں ترشول ہے
''نہ قاتل ہے کوئی نہ مقتول ہے
تو پھر ترا چرچا ہے کس واسطے''

یہاں زندگی خواب ڈھوتی نہیں
سراب وفا دھوپ ہوتی نہیں
فصلیوں کو شبنم ڈبوتی نہیں
''یہاں تشنگی ہاتھ دھوتی نہیں
پہاڑی کا جھرنا ہے کس واسطے''

زمانے کے بدلے ہیں تیور بہت
گرے آ کے شیشوں پہ پتھر بہت
اڑے آندھیوں کے یہاں گھر بہت
''سمندر ہے گرزور آور بہت
تو پھر یہ جزیرہ ہے کس واسطے''

خالد رحیم، خانساما لین، منی ساہو چک، بخشی بازار، کٹک۔ 753 001

نور محمد یاس

بر غزل ندا فاضلی

جو تھے شریف ان میں شرافت نہیں رہی
پہلی سی کوئی رسم مروت نہیں رہی
لوگوں کے درمیان محبت نہیں رہی
''مل جل کے بیٹھنے کی روایت نہیں رہی
راوی کے پاس کوئی حکایت نہیں رہی''

اس دورِ بے ضمیر نے چھینی ہیں چاہتیں
محفوظ رہ نہ پائیں وفا کی روایتیں
ڈھونڈیں کہاں پہ جاکے محبت کی آیتیں
''مسمار ہو رہی ہیں دلوں کی عمارتیں
اللہ کے گھروں کی حفاظت نہیں رہی''

ہر سمت بے حسی کی فضا میں ہے ہر کوئی
اک جیسے مسئلوں سے ہے دو چار آدمی
ڈھونڈے کہاں پہ جاکے فراغت کی زندگی
''ملکِ خدا میں ساری زمینیں ہی ایک سی
اس دور کے نصیب میں ہجرت نہیں رہی''

جن راستوں سے لوگ گزرتے ہیں ان دنوں
خود اپنے ہی وجود سے ڈرتے ہیں ان دنوں
قسطوں میں ٹوٹتے ہیں بکھرتے ہیں ان دنوں
''سب اپنی اپنی موت سے مرتے نہیں ان دنوں
اب دشتِ کربلا میں شہادت نہیں رہی''

رباعیات

آواز کا رس دیکھتے رہ جاؤ گے
خوشبوئے نفس دیکھتے رہ جاؤں گے
اس جانِ لطافت کو اگر خواب میں تم
دیکھو گے تو بس! دیکھتے رہ جاؤ گے

امڈا ہوا دریائے بلاغت آیا
چھایا ہوا معیارِ فراست آیا
کم فہم مگر پھر بھی یہی کہتے رہے
ہم تک نہ کوئی حرفِ ہدایت آیا

کیوں شہرِ ہوس فن کی امیری لیتے
مرجاتے مگر زندہ ضمیری لیتے
ملتی جو ہمیں سلطنتِ ہفت اقلیم
ہم اس کے عوض یہی فقیری لیتے

لمحوں سے نظر کون بچا سکتا ہے
خوابوں کے شجر کون بچا سکتا ہے
قدروں کا زوال اور عقیدوں کی شکست
یہ ٹوٹتے گھر کون بچا سکتا ہے

تیر اپنے اڑے دور کہیں بن میں گرے
پیڑ اپنا تھا پھل غیر کے آنگن میں گرے
ہر شے ہوئی تقسیم، مگر آنکھوں سے
آنسو جو گرے اپنے ہی دامن میں گرے

اڑتے رنگوں کا گوشوارہ آنکھیں
ٹوٹے خوابوں کا استعارہ آنکھیں
سب دیکھ لیا، سراب ہے ہر منظر
کیا چہرے، کیا چاند ستارہ آنکھیں

مانا کہ اندھیرے میں اجالا نہیں میں
کیا حسنِ ازل کا اک حوالا نہیں میں؟
میں کون ہوں، پہچان مجھے آئینے!
تو کون ہے؟ یہ پوچھنے والا نہیں میں

نور محمد یاس 41، ضیا محل لین، عقب جی پی او، بھوپال۔ 462001

دوہے

امام قاسم ساقی

ندی خوں سے لال ہے پانی کھیلے تاش
الٹی سیدھی یوں چلے بہتی ہے اک لاش

ذرہ ذرہ دہر کا دیتا کیوں ہے تھاپ
شاید جگ کے ڈھونگی کرتے ہیں کچھ بھانپ

پورب پچھم گھوم کر دیکھے ہے اب شمس
دنیا میں ہے کس جگہ اس کا اپنا عکس

پاکھنڈی سنتوں سے کیوں شہری یہ نادان
مانگ رہے ہیں برسوں سے جیون کی مسکان

سات سمندر پار بھی زندہ ہے تہذیب
اردو ہی کی دین سے ہوئی تھی تقریب

دو مصرعوں میں ڈھل گئے سارے ہی مفہوم
دوہے کے آہنگ کی دنیا میں ہے دھوم

ایک کبوتر امن کا خوں سے تر ہے دیکھ
ہر چہرے پہ خوف ہے گھر گھر ڈر ہے دیکھ

سورج آگے اک دیا رکھ کر اک انسان
سوچ رہا ہے شمس کا کر ڈالا اپمان

لے کے ہاتھوں چاندنی نکلے ہم نادان
دیکھا جوں ہی اڑ گئی جگنو کی مسکان

میں نے کر دی زندگی خوشبو کے بس نام
لکھ دیں ساری خدمتیں اردو کے بس نام

گرمی کی تاثیر سے پنچھی تھے بے حال
سورج کے اس چہرے سے سوکھی تھی ہر ڈال

برسوں بیٹھا سوچ میں اوڑھے وہ قرطاس
مجنوں میرے شہر کا بے شک کالی داس

منظر قصے دلربا میرے ہیں مضمون
جنگل صحرا لکھ چکا افسانہ ہامون

آئینے نے عکس کا دکھلایا اک روپ
مجھ سا اک ہے آدمی مجھ جیسا بہروپ

اب تو رب کا نام لو دل کو رکھو صاف
وہ ہے ایسا مہرباں سب کو کرتا معاف

دنیا مایا موہ ہے دنیا داری چھوڑ
رب کا رشتہ پاک ہے رب سے ناتا جوڑ

ساقی تیرے شہر میں دیکھی بگڑی چال
خون بہا کر بھائی کا جسم کرے ہے لال

صوفی سنتوں کی قسم باقی ہے تہذیب
یہ بھی رب کا ہے کرم خوش ہے اپنا نصیب

کلیوں کے بازار میں تتلی چلتی چال
خار مہذب ہوگئے کیسے مالا مال

بھیگی بھیگی رات میں چڑیا کرتی شور
سانپوں کی تھی سلطنت سانپوں کا تھا زور

اس دھرتی کی گود میں کھو جاؤ گے یار
پھر بھی دنیا آپ کو برسوں دے گی پیار

چاروں دشائیں دھوپ ہے اجلی پیلی دھوپ
سورج کی یہ چال ہے یا ہیں اس کے روپ

مالی مجھ کو یہ بتا کیسے بکھرے پھول
کس نے چھیڑا ہے انہیں کس نے کی ہے بھول

بھوکے دیکھو دیوتا مانگیں ہیں بلیدان
پتھر پی لے خون تو خوش ہوتے انسان

فنکاروں کے درمیاں رکھ کر اپنی بات
عہد نو کی آپ نے دے دی نا سوغات

دو دھرموں کے درمیاں اجلی اک دیوار
یکجہتی کے واسطے رستہ دیکھے یار

آنکھوں میں ہیں ناچتے منظر منظر خواب
اندھوں سے تو پوچھئے جیون کے آداب

جیون سارا ڈھل گیا سانسیں ہیں بیکار
رہتی ہر دم بے کلی جینا ہے دشوار

اس کی مجھ کو ہے طلب میرا وہ مطلوب
سب کو دیکھو بھا گیا میرا یہ اسلوب

اک لاغر کے ہاتھ میں شاہی یہ تلوار
فوجی سارے دنگ ہیں حیراں ہیں سالار

مکر و کینہ چھوڑ دے چل تو سیدھی راہ
اچھے ہر انسان پہ دنیا کرتی واہ

ایک نئی آواز ہے ایک نیا ہے ساز
کرلو مجھ سے گفتگو سمجھو ہر انداز

رنگوں کا تہوار ہے ہولی جس کا نام
نیلے پیلے ہوگئے دھرتی امبر شام

جیون کے اس کھیل میں ہر جیوت کردار
دھرتی کے اس منچ پر کھیل رہا ہے یار

ہر مصرع اک پھول ہے خوشبو ہے ہر حرف
کیسے سونگھو گے بھلا تم حاسد کم ظرف

'میں' کو اپنی ڈھیل دے خود سے بولے کون؟
تیرے تن میں ہے چھپا تیرا ہی فرعون

نصرت ظہیر

انکاؤنٹر کے بعد

گجرات پولیس کے ہاتھوں انکاؤنٹر کے بعد عشرت جہاں اور اس کے ساتھیوں کی لاشیں گجرات کی ایک سڑک کے کنارے نمائش کے لیے رکھے جانے کی تصویر دیکھ کر

یہ ہاتھ نرم تھے یہ پاؤں گرم تھے اب تک
یہ ہونٹ بولتے تھے اور یہ کان سنتے تھے
یہ آنکھیں دیکھتی تھیں ان میں زندگی تھی کبھی
یہ راستہ یہ تماشائی اور یہ فٹ پاتھ
انہیں خبر ہی نہیں ہے کہ کیا ہوا ہے ابھی

یہ راستہ یہ تماشائی اور یہ فٹ پاتھ
یہ صرف آج کے لمحے پہ ہاتھ ملتے ہیں
گزرتے کل کا کوئی غم نہ آنے والے کا
یہ صرف ساعتِ امروز لے کے چلتے ہیں

انہیں خیال کہاں ہے کہ آج بھی سورج
جب آنکھ ملتی ہوئی صبح لے کے لایا تھا
اجالا شب کی سیاہی پہ مسکرایا تھا
درخت شاخوں کی انگڑائیوں سے جاگے تھے
تو مل کے سارے پرندوں نے گیت گائے تھے
ہوا میں خوشبوئیں پھیلی تھیں سبزہ مہکا تھا
کلی کی آنکھ کھلی غنچے مسکرائے تھے
صبیح پھولوں کے گالوں پہ شبنمی قطرے
حسین تتلی کی جنبش سے تھرتھرائے تھے
یہ ہاتھ اپنی ہی مٹھی میں بند تھے اس دم!

یہ ہاتھ اپنی ہی مٹھی میں بند تھے لیکن
کسی سوال کے بازو ہلا ہی دیتے تھے
یہ پاؤں اپنے کسی راستے کے قیدی تھے
کوئی نشان کہیں پھر بھی چھوڑ جاتے تھے
یہ ہونٹ اپنے ہی لفظوں سے سِل چکے تھے مگر
وفورِ نغمہ سے رہ رہ کے تھرتھراتے تھے
یہ کان گونجتی چیخوں سے چھد گئے تھے مگر
ذرا سی گرم نگاہی پہ منھ چھپاتے تھے
یہ آنکھیں یوں ہی نظر بند تھیں مگر ان میں
عجیب خواب سے رہ رہ کے سر اٹھاتے تھے

یہ آنکھیں دیکھتی تھیں ان میں زندگی تھی کبھی
یہ ہونٹ بولتے تھے اور یہ کان سنتے تھے
یہ ہاتھ نرم تھے یہ پاؤں گرم تھے اب تک
یہ راستہ یہ تماشائی اور یہ فٹ پاتھ
انہیں خبر ہی نہیں ہے کہ کیا ہوا ہے ابھی

لمحۂ صِفر

دوڑتے دوڑتے
آرزوؤں کے بازار میں
تھک گئے حوصلوں کے قدم
دیکھتے دیکھتے خواہشوں کی چمک
بجھ رہی ہے نظر دم بدم
تھامتے تھامتے تیز رو وقت کی باگ کو
دست و بازو ہیں خم
اور یہ سوچتے سوچتے
ذہن و دل جیسے مفلوج ہیں
کس طرح
کن زمینوں پہ لے جا کے پھینک آؤں اب
آرزوؤں کے وحشی گراں بار کو
زندگی کے اس انبار کو
کس سے پوچھوں کسے آج آواز دوں
کس کو اپنا کہوں کس سے باتیں کروں
کوئی بھی تو نہیں...
کوئی بھی تو نہیں!

ناولٹ

شادی کا دن

مصطفیٰ کریم

230

ڈرامہ

روپ متی اور باز بہادر

اسیم کاویانی

267

مختصر ناول

شادی کا دن

مصطفیٰ کریم

پلاؤ، قورمہ، نان، کباب اور پھر رس ملائی۔ اس کے بعد چائے کھانا ختم ہوا۔ رکابیوں سے چھری کانٹے اور چمچوں کے ٹکرانے کی آوازیں بھی رک گئیں۔ سفید بلاؤز اور سیاہ اسکرٹ میں ملبوس ویٹریس میز پر سے جوٹھی رکابیاں اور ڈونگے سمیٹنے لگیں۔ سفید کاغذی میز پوشوں پر سالن کے زرد دھبے نمایاں ہوگئے۔ کرسیوں کے کھسکنے کی آوازیں آئیں اور مہمانوں کی گفتگو بلند ہوئی۔ مرمریں ستونوں سے گھرا ہال جس کی چھت سے روشن شینڈ لیئر لٹکے تھے اور جہاں سرخ اور گلابی پھولوں کے نقش و نگار تھے، وہ ہال جیسے ان گنت مستانہ وار اڑتی شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے بھر گیا۔ انگریز دولہا اور اس کی بنگلہ دیشی دلہن اس سرخ صوفہ پر بیٹھے تھے جو بڑے ڈائس پر تھا۔ دولہا کی نگاہیں سانولے اور کالے بنگلہ دیشی مہمانوں پر گھوم رہی تھیں جن کے درمیان رنگ برنگی ساریوں نے قوس قزح بکھیر دی تھی۔ دلہن سمٹی سمٹائی تھی اور نگاہیں بھی نیچی... جیسے مہندی لگے ہاتھوں اور کلائی میں طلائی چوڑیوں میں مستقبل کے خواب دیکھتی ہوں۔ ایک جانب سفید دیوار کے ساتھ جو پیانو تھا اس کے قریب میزوں کے گرد مہمان انگریز مرد و عورت بیٹھے تھے۔ مردوں کے سادہ سوٹ میں ریشمی ٹائیاں نمایاں تھیں۔ عورتوں کے جسم پر پھول دار گاؤن تھے اور بعض کے گلے میں زریں نکلس۔ جب وہ گردن گھماتیں تو نکلس پر روشنی منعکس ہو کر چمک جاتی۔ گوان کے لئے اسنیکس اور مکھن میں پکائے ہوئے چوزوں کا اہتمام کیا گیا تھا، لیکن ان میں سے بیشتر نے پلاؤ قورمہ نان اور چکن تکے کو ترجیح دی تھی۔ وہ بھی کھانا ختم کر چکے تھے اور اب ارغوانی شراب کی چسکیاں نازک جام سے لے رہے تھے۔

انھیں پیتے دیکھ کر نثار کی زبان پر بھی وسکی، بیئر، شیمپین اور وائن کا مزہ تلملانے لگا۔ لیکن ساتھ ہی اس کا دوست خلیل بیٹھا تھا۔ جس نے مسلسل کوششوں کے بعد اس کی عادت چھڑائی تھی۔ اس سعی میں نثار کی مذہبی سوڈانی بیوی کا بھی دخل تھا۔ نثار نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ چند لمحوں کے لئے۔ جیسے خواہشوں سے کہہ رہا ہو رخصت ہو جاؤ۔ جس میز کے ساتھ خلیل اس کی بیوی دلشاد اور نثار بیٹھے تھے وہاں پر چند بنگلہ دیشی مہمان بھی تھے۔ جن سے ہلو ہلو اور مختصر گفتگو ہوئی پھر کچھ اور بولنے کی نوبت نہیں آئی۔ خلیل اور نثار سابق مشرقی پاکستان میں رہ چکے تھے۔ کامیابی کے راستے وہیں تعلیم حاصل کرنے کے بعد کھلے تھے۔ دونوں کوشش کرتے تو بھولی بسری بنگلہ زبان پر آ جاتی۔ لیکن انھوں نے اجنبیت کی دیوار توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کا دل ہی نہیں چاہا۔ پاس بیٹھے بنگلہ دیشیوں سے انگریزی میں پوچھا کہ کس شہر سے آئے ہیں۔ ایک نے کہا مانچسٹر، دوسرے نے بتایا لیڈس۔ اس کے بعد کچھ اور بولنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ان کی بیویاں بھی خاموش خاموش سی رہیں۔ جب کھانا آیا تو کھانے میں مصروف ہو گئے۔ لیکن دلشاد کو ساتھ بیٹھی بنگلہ دیشی عورت سے بے تکلف ہونے میں دیر نہیں لگی۔ اب وہ رک رک کر خراب تلفظ کے ساتھ انگریزی میں باتیں کر رہی تھی۔ اس کا سپاٹ چہرہ جو ابروؤں کے درمیان شکنیں پڑ جانے کی وجہ سے سخت نظر آنے لگتا تھا بشاش نظر آتا تھا۔ دلشاد کا نیلا دوپٹہ سرک کر گلے میں آ گیا تھا اور خضاب آلودہ سر کے بال میں کہیں کہیں سفید جھلک رہی تھی۔ جس بنگلہ دیشی عورت سے وہ مخاطب تھی اس کے سینہ اور کمر کی چوڑائی موٹاپے کی وجہ سے ایک جیسی تھی۔ اس عورت کے چہرے پر کبھی مسکراہٹ آ جاتی اور کبھی سنجیدگی۔

''مسز چودھری میری تو کوئی اولاد ہے ہی نہیں۔ کوئی ذمہ داری بھی

مصطفیٰ کریم (پیدائش 1932) اردو فکشن کے ایک اہم اور ممتاز قلم کار ہیں۔انہوں نے 1957میں ڈھاکہ میڈیکل یونیورسٹی سے گریجویشن کیا اور پاکستان مسلح افواج میں میڈیکل آفیسر کے طور پر کمیشن کے گئے مگر 1962میں فوج سے استعفیٰ دے دیا اور ایف آر سی ایس کا امتحان دینے برطانیہ چلے گئے۔ پڑھائی کے دوران انہیں دل کا شدید دورہ پڑا اور صحت یاب ہونے کے بعد وہیں بس گئے۔ 1989میں انہوں نے نیشنل ہیلتھ سروس سے بھی سبک دوشی اختیار کرلی جس کے بعد وہ باقاعدگی سے لکھنے لگے۔ 'ہنٹرز اینڈ دی ہنٹیڈ' Hunters And The Huntedان کا پہلا انگریزی ناول تھا اس کی کہانی محبت، نفرت اور انتقام کے جذبات سے پُر ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ انسانی روح میں در آنے والے بدی کے جراثیم نے کس طرح انسانی معصومیت کو تباہ کر دیا ہے۔ان کے دو اردو ناول 'قرطبہ' اور 'طوفان کی آہٹ' حالیہ عرصہ میں موضوع گفتگو رہے ہیں اور کئی ناقدین کا خیال ہے کہ ان کی تخلیقات میں بھی وہی تاریخی شعور پوری جمالیات کے ساتھ موجود ہے جو قرۃ العین حیدر کا خاص وصف تھا۔زیر نظر مختصر غیر مطبوعہ ناول مصطفیٰ کریم صاحب نے دو سال پیشتر 'ادب ساز' کو برائے اشاعت عنایت کیا تھا جو بوجوہ اب شائع ہو پا رہا ہے۔ (ادارہ)

نہیں۔'' ساتھ ہی دلشاد کی کھوکھلی ہنسی بلند ہوئی اور اس نے دزدیدہ نگاہوں سے خلیل کی جانب دیکھا۔ جیسے بیوی کے بانجھ پن کا ذمہ دار وہی تھا۔ اور یہ تھا بھی سچ۔ وہ ننھے منے، مچلتے خلاق خلیل کے جسم سے نکلتے آتشیں سیال میں نہ ہونے کے برابر تھے۔ دلشاد باغ کی بابت کچھ کہہ رہی تھی۔ اس نے مسز چودھری سے کہا۔

''جی ہاں۔ مجھے بھی باغبانی کا شوق ہے۔ میرے خاوند ایک دن کہنے لگے تم نے باغ کو جنگل بنا دیا ہے کسی دن یہاں شیر نظر آئے گا۔ میں نے جواب دیا۔ اچھا ہوگا۔ پھر وہ ہم دونوں کو کھا لے گا۔'' دلشاد پھر ہنسی۔ مسز چودھری بھی خلیل پر شرمیلی نگاہ ڈال کر ہنسنے لگیں۔ وہ بھی ایک پھیکی ہنسی ہنس دیا۔

وہ اسٹیج جہاں انگریز دولہا اور اس کی بنگلہ دیشی دلہن بیٹھی تھی وہاں نغمہ بلند ہوا۔ گانے والی جب اسٹیج کی جانب آ رہی تھی تو خلیل نے اس کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ اتنی ساری جوان عورتوں جیسی وہ بھی ایک جوان عورت تھی۔ سرخ اور زرد ریشمی ساری میں ملبوس وہ چلتی ہوئی اسٹیج کی جانب آئی، دولہا دلہن پر نگاہ ڈال کر وہ مسکرائی اور پھر گانا شروع کر دیا۔ زریں آنچل میں اس کا سادہ چہرا سنجیدہ اور پروقار تھا۔ گانے کے الفاظ سن کر خلیل چونک پڑا۔ اب تک جو اکتاہٹ اسے ہو رہی تھی وہ اچانک ختم ہو گئی۔ اس کی نگاہیں گانے والی پر جم گئیں۔ لمبا قد اور بھرا بھرا جسم۔ نہ آواز میں جھجک اور نہ چہرے پر گھبراہٹ۔ اسے اپنی آواز کے سحر کا احساس تھا۔ نغمہ کے زیر و بم کے ساتھ کبھی اس کی آنکھیں نیم وا ہو جاتیں اور کبھی بند۔ جب گانے کی اٹھان میں تناؤ آتا تو اس کی گردن کی رگیں تن جاتیں۔ اس کا ایک ہاتھ سرخ میز پوش سے ڈھکی میز پر ٹکا تھا جس کے قریب شفاف گلدان میں سجے سرخ پھول مسکرا رہے تھے۔ اس کی قربت سے بھی اور دولہا دلہن کی موجودگی سے بھی۔ جن کے لبوں پر بھی تبسم تھا۔ شفیق اور والہانہ۔ انگریز دولہا کی نگاہیں بار بار گانے والی پر جاتیں۔ وہ کچھ سمجھنے کی ناکام کوشش کرتا اور پھر اپنی دلہن کے کان میں کچھ کہتا اور وہ شرما کر سر جھکا لیتی۔

گانے کے الفاظ اگر بنگلہ ہوتے تو خلیل اسٹیج کی جانب دیکھتا بھی نہیں۔ وہ چھت سے ٹنگے شینڈ لیئر کو دیکھتا یا سرخ گلابی اور نیلے پھولوں کے ان بڑے بڑے بوکیے سے اپنی نگاہیں تازہ کرتا جو ہال کے بڑے بڑے سبز دروازوں کے پاس رکھے تھے۔ یا پھر اپنے بچپن کے دوست نثار سے گفتگو کرتا جو پاس ہی بیٹھا تھا۔ گانے کے الفاظ خلیل کے دل میں اداس گنگناہٹ بھر رہے تھے۔ اردگرد جو بنگلہ دیشی مہمان بیٹھے تھے ان میں سے کچھ اس کے واقف تھے۔ جن سے بات کرتے ہوئے بنگلہ الفاظ اس کی زبان پر آنے سے پہلے رک گئے اور جب انھوں نے اردو میں بات کرنا چاہا تو کوشش کے باوجود نہیں کر سکے۔ ماضی میں ایسی ہی کوشش اجنبیت کی خلیج پاٹنے کے لئے کی گئی تھی لیکن وہ سعی رائیگاں ثابت ہوئی۔ تاریخ کے بے رحم پہیے نے اسے کچل دیا تھا۔ وہ آج بھی ان کے لئے اجنبی تھا اور وہ بھی اس کے لئے انجان افراد تھے۔ تین دہائیوں کے فاصلوں کو طے کرتے ہوئے وہ سانحہ جو اس وقت کے مشرقی پاکستان میں ہوا تھا اسے اس نے بھلانے کی کوشش کی تھی۔ اس نفرت کو بھولنا چاہا تھا جس سے بربریت اور سفاکی نے جنم لیا تھا۔ آج گیت کے الفاظ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے ایسا ہونا ممکن نہیں۔ عورت گا رہی تھی۔

کر لیجیے چل کر میری جنت کے نظارے

جنت یہ بنائی ہے محبت کے سہارے

گانا کسی ہندو کا تھا اور جنت، نظارے، محبت، فارسی اور عربی کے الفاظ تھے جو پراکرت کے باغ میں کھل کر اردو بن گئے تھے۔ یہ اس کے تخیل میں کہیں چھپے تھے۔ نگینہ کی طرح دمکتے ہوئے۔ یہ اس کی تاریخ کی بازگشت تھے۔ گم شدہ اور خاموش۔ جن کی بابت وہ سوچتا بھی نہیں تھا۔ عجیب بات تھی۔ گھر کے باغ میں باغبانی کرتے ہوئے، شراب خانوں میں شام اور رات کے ابتدائی لمحات میں بیئر پیتے ہوئے اور بیوی سے لڑائی جھگڑے کے درمیان ان الفاظ کی سوچ بھی نہیں آتی تھی جو اسے سمجھاتی کہ ان ہی الفاظ نے اسے انسان بنایا تھا۔ اور اس وقت اردگرد بیٹھے ہوئے سوٹ اور رنگ برنگی ساریوں میں ملبوس مہمان جس اجنبی زبان میں باتیں کر رہے تھے، اس نے انھیں بھی انسان بنایا تھا۔ مدت ہوئی ان کے درمیان رہنے کے باوجود انسانیت کا رشتہ ان سے کیوں ٹوٹ گیا۔ زندگی کے پرخار راستوں پر چلتے ہوئے محبت کے جو پھول اس نے چنے اور گلزار بنانے کی جو کوشش کی وہ رائیگاں کیوں ثابت ہوئی؟ اور پھر وہ بیگانگی کیوں آ گئی جس کی وجہ سے کچھ دیر پہلے تک وہ اکتاہٹ محسوس کرتا رہا تھا۔ یہ سارے لوگ جو اردگرد بیٹھے ہیں انھیں ان الفاظ سے آج دشمنی کیوں نہیں ہو رہی ہے؟ پاس بیٹھے سانولے مرد سرمئی اور سیاہی مائل سوٹ میں ملبوس کیوں ترنگ میں پیر ہلا رہے ہیں؟ اور ان کی شاداں بیویاں محویت سے کیوں گانا سن رہی ہیں؟ ان سوالوں کے جواب خلیل کے پاس نہیں تھے۔ اسے عجیب سی بے چینی ہوئی جسے منانے کے لیے وہ دولہا دلہن کو تکنے لگا۔

انگریز دولہا سفید چمکتی ہوئی شیروانی میں ملبوس۔ شیروانی کی آستین اور گریبان پر مصنوعی زری کا کام، بجلی کی روشنی میں دمکتا ہوا۔ گلے میں سرخ پھولوں کا ہار اور متبسم چہرہ مطمئن۔ اس کے ساتھ بیٹھی دھان پان سی سانولی دلہن۔ سر جھکائے ہوئے اور پرسکون۔ سرخ ساری میں ملبوس۔ ہاتھوں اور گردن میں سونے کے چند زیورات۔ اور اس کی گردن میں بھی سرخ پھولوں کے کئی ہار۔ دلہن نے اب جسے چاہا وہ اسے مل گیا۔ ماں باپ نہال تھے۔ لیکن دو سال پہلے فردوسی بیگم نے جب انھیں کہا کہ وہ جسے چاہتی ہے وہ ایک سیاہ فام افریقن ہے تو ماں باپ آگ بگولا ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر بیٹی اپنی ڈاکٹری لے کر کہیں اور جا کر رہے۔ ان سے رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ فردوسی بیگم نے رو دھو کر صبر کر لیا۔ صوم صلوٰۃ کے سختی سے پابند اور مذہب پر فدا ماں باپ نے ٹھیک ہی نصیحت دی تھی اس نے سوچا۔ لیکن دو سال بعد جب انگریز محبوب اسے ملا تو سب کچھ درست ہو گیا۔ ماں باپ نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ یہ راز کی باتیں تھیں جو بنگلہ دیشی نور بیگم نے بتائی تھیں۔ جو خلیل اور اس کی بیگم دلشاد کی دوست تھیں اور ہمسایہ بھی۔ اور اسی لئے ان سے کچھ قربت سی تھی۔ دور ہوتیں تو شاید نور بیگم انھیں جانتی بھی نہیں۔

اور آج فردوسی بیگم کے والد سعادت بہت خوش تھے۔ سعادت سے خلیل کی پرانی واقفیت تھی۔ وہ ہمیشہ اسے دیکھ کر خوش ہو جاتا تھا۔ لیکن مشرقی پاکستان کا بنگلہ دیش بن جانے کے بعد خلیل نے اس کے اور اپنے درمیان ہمیشہ ایک دیوار محسوس کی تھی۔ حالانکہ بنگلہ دیش بنتے وقت اس نے کسی کی جان نہیں لی تھی اور نہ ہی خلیل کی آستین پر کسی بنگالی کا خون تھا۔ اور نہ ہی اس کے جسم پر اس لیس دار کیچڑ کی بدبو تھی جو کسی بنگالی عورت کے ساتھ زنا کرنے کے بعد آ جاتی۔ جب کبھی سعادت سے ملاقات ہوتی تو اجنبیت کے آہنی کانٹے اسے قریب نہیں ہونے دیتے۔ بعد میں اسے جرم کا احساس ہوتا۔ اپنی کمینگی کا خیال آتا۔ لیکن احساس پر اختیار کسے ہوتا ہے۔ گانا ختم ہوا۔ دولہا اور اس کے والدین نے دیگر تمام مہمانوں کے ساتھ تالیاں بجائیں۔ "دولہا مسلمان ہو گیا ہے۔" دلشاد نے چپکے سے کہا۔ اس کے منہ سے قورمے کی بو آئی۔ خلیل نے بیوی کو جواب نہیں دیا۔ اس نے اکثر سوچا تھا کہ مذہب وہ کتاب ہے جسے انسان پڑھتا ہے، جینے کا کچھ سلیقہ سیکھتا ہے، کچھ روحانی سکون محسوس کرتا ہے۔ اور پھر وہ کتاب اس کی یاد کے کسی محترم طاق پر دھری رہ جاتی ہے۔ بعد میں کبھی زندگی کی ہلچل اور بھاگتی دوڑتی دنیا کے پاگل پن سے تنگ آ کر اسی کتاب کو اٹھاتا ہے اور اس کی مدد سے اردگرد کی جادوگری سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے کبھی توڑ پھوڑ کرتا ہے اور کبھی سوانگ بدلتا ہے۔ لیکن ہلچل میں، زمانے کی بھاگ دوڑ میں کوئی کمی نہیں آتی۔

گانا ختم ہوا اور اسٹیج پر سعادت آ گیا۔ وقار سے چلتا ہوا اور چہرے پر مسکراہٹ۔ سرمئی سوٹ اور ہلکے نیلے رنگ کی ٹائی میں اس کا گہرا سانولا رنگ کچھ اور ہی دب گیا تھا۔ بھرے چہرے پر سفید داڑھی اور اسی رنگ کے سر پر کچھ بال۔ مائک سے اس کی آواز آنے لگی۔ وہ اپنی زندگی کے ورق الٹنے لگا تھا۔ فردوسی بیگم کی پیدائش اور اس کے بعد کے چند دن۔ جب وہ اسے دیکھ کر اپنے ننھے ہاتھ پاؤں ہلانے لگتی تھی۔ شام کے وقت جب تک اسے دیکھ نہیں لیتی وہ سوتی نہیں اور وہ اکثر اسے گود میں اٹھا کر اپنے فلیٹ کے برآمدے میں اسے سلانے کے لئے ٹہلتا رہتا۔ بیٹی اپنے باپ کی آغوش میں سکون محسوس کرتی، اسے راحت ملتی اور اپنی روح کا تسلسل بھی۔ وہ اپنی منی

آنکھیں بند کر کے سو جاتی۔ اور یہ سب کچھ کراچی میں ہوا تھا۔ ہزاروں میل دور روشنیوں کا شہر۔ جو اب سعادت کا شہر نہیں تھا اور خلیل کا بھی نہیں۔ وہ جہان جو اُن کے دلوں میں بسا تھا اسے دوری کی آندھیوں نے ویران کر دیا تھا۔ فردوسی بیگم کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ مہمانوں میں جو باپ تھے ان کے چہروں پر بھی ویسی ہی مسکراہٹیں تھیں اور ان کی بیٹیوں کے چہروں پر بھی۔ ویسی ہی شفیق سی مسکراہٹ۔

سعادت اب اپنے بیٹے نفاست کا ذکر کر رہا تھا جو اسٹیج ڈائرکٹر اور چیخوف کے ڈراموں کا ماہر تھا۔ ان ڈراموں میں انسان کے نہ پورے ہونے والے آدرش اس کی بے ثباتی، وہ محبت جو ہمیشہ تشنہ رہ جاتی ہے، پچھتاوے، غم اور کمزوریاں ہیں۔ خلیل جب سعادت سے اس کے گھر ملنے جاتا اور نفاست بھی وہاں ہوتا تو وہ چیخوف کے ڈراموں کی بابت کبھی کبھی ایسی ہی معلومات فراہم کرتا۔ سعادت اس وقت اپنی تاریخ بتانے پر تلا تھا۔ وہ تاریخ جس میں نہ ہندوستان تھا اور نہ پاکستان۔ نہ بنگال کی ندیاں اور نہ ان ندیوں پر بہتی ناؤ اور ان میں بیٹھے ماہی گیر۔ شاید اسی لئے سعادت اور اس جیسوں کے بچوں کے لئے ان کے والدین کی تاریخ ہندوستان کی اس تقریباً تکون میں محدود تھی جس میں دہلی، آگرہ اور جے پور شہر تھے۔ اس دنیا کا اب ذکر ہی کیوں ہو جس میں محرومیاں اور ذلتیں تھیں۔ سعادت کی تقریر جاری رہی۔ جب نفاست انگلستان کے شہر گلاسگو میں پیدا ہوا تو گھر میں سعادت کی بیوی کی مدد کے لئے کوئی بھی نہیں تھا۔ پھر وہ بیمار بھی پڑ گئی۔ اس کے بعد ان کی جاننے والی ڈاکٹر بینا ان کی مدد کے لئے آ گئیں۔ وہ ہر روز ان کے گھر آتیں۔ کھانا پکا دیتیں اور سعادت کی بیوی کی ہر طرح مدد کرتیں۔ آج مہمانوں میں بینا بھی تھیں۔ سامنے ہی بیٹھی ہوئی۔ پستہ قد اور موٹی سی۔ ان کا چہرا کھل اٹھا تھا۔ اپنی تعریف سے کون خوش نہیں ہوتا۔ بینا ہندو تھیں۔ اس مذہب سے سعادت کو نفرت تھی۔ اس مذہب کے ماننے والوں پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا، اس نے کبھی خلیل سے کہا تھا۔ یہ اعتبار اس دن گم ہو گیا تھا جب سعادت بنگال کے ایک گاؤں میں کسی چٹرجی نام کے زمیندار کے گھر میں دعوت پر گیا اور سبھوں سے الگ رواج کے مطابق کیلے کے درخت کے چھلکے پر بھات دال اور مچھلی اسے پیش کی گئی۔ اسے پینے کا پانی دینے والا اوپر سے اس کے مٹی کے گلاس میں اس طرح پانی ڈالنے لگا جیسے پانی کی ایک بوند بھی اس کے گلاس سے نکل کر ادھر ادھر گری تو وہ جگہ ناپاک ہو جائے گی۔ لیکن وہ بہت پرانی بات تھی۔ پھر بھی سعادت نے خلیل کے سامنے اپنی رائے کبھی نہیں بدلی۔ بینا کی محبت کسی کام نہیں آئی۔ جو زہر سعادت کو دیا گیا وہی زہریلا لعاب بن کر اس کے منہ سے برابر ٹپکتا رہا۔ خلیل اس کی تنگ نظری نہیں قبول کر سکا تھا۔ اسی لئے خلیل نے وہ دیوار کھڑی محسوس کی جو اب بھی تھی ان دونوں کے درمیان۔ پھر بھی ان کی دوستی قائم رہی۔ آج اس کی تقریر سن کر اسے سعادت کی سوچ کا تضاد کانٹا بن کر گڑا۔

خلیل نے شدید اکتاہٹ کا محسوس کی۔ وہ کرسی پر سے اٹھا۔ ''کہاں جا رہے ہیں؟ خلال کی تلاش میں؟'' بیوی نے طنزیہ پوچھا۔ اس کی شوخ آنکھوں کے گرد جھریاں رینگ رہی تھیں۔ سر کے بال خضاب کی وجہ سے سیاہ تھے۔ کھانے کے بعد دانتوں کو خلال سے صاف کرنا خلیل کی عادت تھی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''خلیل۔ کہاں چلے؟'' نثار نے پوچھا۔ اس کی انگلیاں جس گلابی پھول کی پنکھڑیوں کو سمیٹ رہی تھیں وہ رک گئیں۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ میں ذرا سے تکبر کی جھلک بھی تھی۔ ٹوئڈ کے کوٹ اور سرمئی پتلون میں اس کا کسرتی بدن کسا تھا۔ اور سفید قمیص بے داغ اور بے شکن تھی جس میں سبز رنگ کی ٹائی مسکرا رہی تھی۔ گورا چٹا اور بڑی آنکھوں میں وحشیانہ چمک۔ نثار مغل شہزادہ لگتا تھا۔ چند لمحوں پہلے گلابی رنگ کا پھول گلدستہ سے ٹوٹ کر گرا تھا۔ نثار نے جیسے بے خیالی میں اس کی پنکھڑیوں کو توڑا اور پھر انھیں سمیٹنے لگا تھا۔ اس کے ہاتھ رک گئے تھے اور خلیل کے اچانک اٹھ جانے پر اسے حیرت تھی۔ وہ اسی کے ساتھ شادی میں شرکت کے لئے آیا تھا۔ خلیل نے اسے بھی جواب نہیں دیا۔ وہ فوئر میں آکر بے دلی سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

دلشاد جہاں بیٹھی تھی وہیں رہی۔ جو گانا اس نے سنا تھا اس میں وہ کھوئی تھی۔ اس لئے نہیں کہ وہ اچھا تھا۔ بلکہ اس گانے نے اسے یاد دلا دیا تھا کہ وہ بہت اچھا گاتی تھی۔ سر سنگیت سے اسے محبت تھی۔ مدت ہوئی اس کا گانا اسے ڈاکٹر توقیر کے قریب لے گیا تھا۔ اور توقیر ہی کی وجہ سے اس نے گانا ترک کر دیا۔ خلیل سے شادی، برسوں کی رفاقت، اس کے بوسوں کی لذت اور اس سے ہم آغوشی اس شام پر دھند نہیں ڈال سکی تھی، جو مدت ہوئی دھماکہ بن کر اس کی زندگی میں آئی تھی۔ ڈھاکہ میڈیکل کالج ہسپتال کے نجی وارڈ کا وہ کمرہ جہاں اس کے آزاد خیال اور مصور بیچارے یرقان کے مریض تھے۔ ان کے قریب ان کی دوست اور شب و روز کی ساتھی سنگ تراش حمیرا سیاہ ساری میں ملبوس بیٹھی تھی۔ اس کے سر پر دیویوں کی طرح جوڑا بندھا تھا۔ وہ اپنی گوری چٹی کلائیوں میں پہنی سرخ چوڑیوں کو سہلا رہی تھی، اور وہ مسکرا رہی تھی۔ شاید اسے پتہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اور وہ خود دھانی ساری پہنے ہوئے تھی۔ بر

جوان لڑکی کی طرح اسے بھی محبوب کی تلاش تھی۔ایسا محبوب جس پر وہ اپنی جان نچھاور کر دے۔اور توقیر بھی تھا وہاں، جو حال ہی میں ڈاکٹر بنا تھا۔ چہرے پر مایوسی اور شکست خوردگی۔ جیسے وہ جو پانا چاہتا تھا وہ اسے نہیں ملا۔ چچا نے دلشاد سے گانے کی فرمائش کی۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر طلعت محمود کی گائی ہوئی غزل گانے لگی۔

غمِ عاشقی سے کہہ دو رہ عام تک نہ پہنچے
مجھے خوف ہے یہ تہمت مرے نام تک نہ پہنچے

اور جب وہ ان اشعار کو گانے لگی۔

میں نظر سے پی رہا تھا تو یہ دل نے بد دعا دی
ترا ہاتھ زندگی بھر کبھی جام تک نہ پہنچے

نہ چاہتے ہوئے بھی الفاظ میں اس کی روح اتر آئی اور آنکھیں نم ہو گئیں۔اسے محسوس ہوا کہ قریب بیٹھے توقیر سے اسے عشق ہو گیا ہے۔ اچانک۔جیسا ہوتا ہے۔کبھی کبھی۔ جیسا وہ سن چکی تھی۔ساتھی اور سکھیوں سے۔عورتیں ایسے مردوں پر بھی نہال ہو جاتی ہیں جو ٹوٹے ہوتے ہیں۔ہارنا جن کے مقدر میں لکھا ہوتا ہے۔توقیر کے چہرے پر یہی تھا۔اس شام کے بعد اس سے اکثر ملنا ہوا۔کبھی اسپتال میں اور کبھی حمیرا کے اس چھوٹے گھر میں جہاں وہ تنہا رہتی تھی۔قربتوں کی منزلیں وہیں طے ہوئیں۔لیکن توقیر بوس و کنار سے آگے نہیں بڑھا۔اس نے کہا ہم دونوں دوست ہیں۔دلشاد کی سمجھ میں نہیں آیا۔وہ الجھن میں پڑ گئی۔تنہائی میں ملنا ملانا۔لپٹنا اور لپٹانا۔پیار کرنا۔کیا دوستی ہے؟ قبل اس کے توقیر کوئی قطعی جواب دیتا وہ فوج میں کمیشنڈ افسر بن کر مغربی پاکستان چلا گیا۔دلشاد کا دل ضرور ٹوٹا لیکن وہ اسے نہیں بھلا سکی۔اتنی مدت کے بعد بھی وہ یاد آتا تھا۔راتوں کو بستر میں کروٹیں لیتے ہوئے اس کا نام زبان پر آجاتا۔وہ شریک زندگی بنتا تو وہ اس کی جانب پیٹھ کر کے نہیں سوتی۔اس کے بیٹے سے اس کا سر لگا ہوتا۔اور وہ بانجھ بھی نہیں ہوتی۔ اس نے اچانک نثار کی آواز سنی وہ کرسی سے اٹھ رہا تھا۔

"دلشاد میں خلیل کے پاس جا رہا ہوں۔"

وہ ہال سے باہر آکر خلیل کے قریب دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔پاس کی میز پر سنگترے کے عرق اور کوک کی خالی اور کچھ بھری بوتلیں پڑی تھیں۔ان کے پاس ہی کاغذی گلاس سفید میز پوش پر شربت کے زرد اور سرخ داغوں کے درمیان بکھرے تھے۔

"کچھ پیو گے؟" نثار نے میز کی جانب اشارا کرتے ہوئے پوچھا۔ خلیل نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"خلیل۔جب بھی کسی ایسی دعوت میں جاتا ہوں۔تو مجھے وہ دعوت یاد آتی ہے جو اس دن تمہارے نانا نے دی تھی جس دن تمہارا ختنہ ہو رہا تھا۔آہ۔ ویسی باقر خانی اور پلاؤ جس پر گھی میں تلے پیاز اور بادام کشمش کا چھڑکاؤ ہوتا تھا پھر کہیں کھانا نصیب نہ ہوا۔پاکستان کے کسی شہر میں نہیں۔حالانکہ فوج کی نوکری کے دوران اس ملک کے شہر شہر میں پھرا ہوں۔"

خلیل نے بڑی کوفت محسوس کی۔یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہوئی اور وہ بھی اب جب کہ ان کی عمر ستر بہتر ہو چکی ہے۔اس شخص کو ایسی مہمل بات کرنی تھی تو عورتوں کے ختنہ کی بات کرتا جو سوڈان اور مصر میں روا ہے۔اور جب بھی وہ نثار کی سیاہ فام سوڈانی بیوی کو دیکھتا ہے تو سوچتا ہے کیا اس پر بھی یہ ستم ہو چکا ہے۔خلیل نے سوچا لیکن کچھ بولا نہیں۔بچپن کے دوست کی بے تکی باتیں اسے بری نہیں لگتی تھیں۔جب وہ 1951 میں ہندستان سے ہجرت کرنے کے بعد مشرقی پاکستان آیا تو کچھ دنوں کے بعد نثار بھی وہاں آگیا تھا۔وہ فوج میں کمیشنڈ افسر بن گیا اور خلیل سیاست میں ایم اے کرنے کے بعد انگلستان پی ایچ ڈی کرنے آیا اور پھر یہیں کا ہو رہا۔اسے اپنے نانا میر صابر علی یاد آنے لگے۔کب ملا تھا وہ ان سے؟ اسے یاد آیا۔جب وہ چار سال کا تھا تو مدھوپور میں والد کے انتقال کے بعد اپنی والدہ کے ساتھ ٹرین سے آرہ اسٹیشن پہنچا تھا۔تیز دھوپ تھی۔جب وہ اپنی روتی دھوتی بیوہ ماں کے ساتھ ڈبے سے باہر نکلا تو سامنے نانا ہی تھے۔گورے چٹے۔لمبا قد۔ترکی ٹوپی سر پر پیچھے کی طرف سرکی ہوئی اور زرد شروانی کے کچھ بٹن کھلے ہوئے۔ خلیل پر جونہی ان کی نگاہ پڑی وہ بے اختیار رو پڑے۔اور ان کے ساتھ جو دیگر رشتہ دار مرد و عورت کھڑے تھے انھوں نے بھی زور زور سے رونا شروع کر دیا۔خلیل کے والد کی وفات دور دراز مدھوپور نام کے شہر میں چند دن پہلے ہوئی تھی اور ان چند دنوں میں وہ مسلسل آہ و زاریاں سنتا رہا تھا۔اس کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل آئے اور وہ ڈر کر ماں سے لپٹ گیا۔اسٹیشن پر جو مسافر تھے وہ بھی اس رقت آمیز سماں کو دیکھنے لگے۔کسی نے خلیل کو اٹھا کر میر صابر علی کی گود میں دے دیا۔

"اپنے ابا کو کہاں چھوڑ آئے بیٹا؟" میر صابر علی نے روتے ہوئے پوچھا۔وہ اپنے جوان داماد کی علالت کے دوران اپنی ملازمت کی وجہ سے نہیں جا سکے تھے۔انھوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ بغیر الوداع کہے اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔خلیل کے پاس نانا کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔وہ بس سسکتا رہا۔

"جس کی کبھی قدر نہیں کی اب اس کے لئے کیوں آنسو بہا رہے ہو؟

جنھیں ہتھکڑیاں پہنائیں اور پھانسی کے راستوں پر دھکیلا ان کے گو نے کا نتیجہ ہماری معصوم بیٹی نے بھگتا۔ داماد کو ہم منحوسوں کی ضرورت نہیں تھی اس لئے اس نے ہمارا چہرہ بھی نہیں دیکھا مرتے وقت۔'' نانی بیٹی کو سینے سے لگائے اپنے پولس افسر خاوند سے شکوہ کر رہی تھیں۔ بھولی بسری یاد سے خلیل کے لبوں پر غم ناک مسکراہٹ آ گئی۔

''تمھیں دعوت یاد رہ گئی۔ میں تو کچھ بھی نہیں بھولا۔ نانا اب اور بھی شدت سے یاد آتے ہیں۔''

''تم جب مشرقی پاکستان چلے گئے تو میں کبھی کبھی ان کے پاس جایا کرتا تھا۔ بڑے باتونی ہو گئے تھے۔ جب بولنا شروع کرتے تو دو دو گھنٹے مسلسل بولتے رہتے۔''

''پھر بھی تم ان کے پاس جایا کرتے تھے؟''

''پٹنہ میں کوئی اور بزرگ تو تھا نہیں اس لئے ان کے پاس چلا جاتا تھا۔ عجیب بات ہے انھوں نے کبھی شکایت نہیں کی کہ تم انھیں چھوڑ کر چلے آئے۔''

''میں کرتا ہوں شکایت۔ وہ بھی اپنے آپ سے۔ جب میں ڈھاکہ چلا گیا تو پیچھے میرا سایہ رہ گیا۔ اسی سے باتیں کرتے ہوں گے۔ وہ تم سے نہیں مجھ سے باتیں کرتے تھے۔ تم میں انھیں خلیل نظر آتا ہوگا۔''

''آج کی دعوت میں آئے ہوئے کئی مہمانوں سے تمہاری واقفیت تو ہو گی؟'' نثار نے پوچھا۔ لیکن اسے اپنے سوال میں دلچسپی نہیں تھی۔ دروازے کے اوپر لگے خوبصورت پوسٹر پر اس کی نگاہیں تھیں جہاں کسی نے سرخ روشنائی سے بڑے بڑے حرفوں میں لکھ دیا تھا۔ Happy Marriage Firdousi and Junaid ۔ وئیم فوسٹر اب جنید بن چکا تھا۔

خلیل کی نگاہ بھی ادھر گئی۔ وہ سوچنے لگا ہم کالے گورا رنگ کیوں اتنا پسند کرتے ہیں؟ کیونکہ ہم پر ہمیشہ گوروں کی حکومت رہی؟ جب انگریز نہیں تھے تو گورے چٹے ترک ہی دہلی کے تخت پر تھے۔ حاکم و محکوم کا رشتہ کیا کیا نہیں سوچنے سمجھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

''مہمان جو آئے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کئی کو میں پہچانتا ہوں لیکن مخاطب ہونا نہیں چاہتا۔ وہ بھی شاید ایسا ہی پسند کرتے ہیں۔ قربت کے رشتے جو قائم کرتے تھے ان میں اب وہ لوگ نہیں رہے۔ انیس سو اکہتر میں پاکستان کی فوج نے انھیں ختم کر دیا۔'' خلیل نے بے دلی سے جواب دیا۔

''تو تمھیں قربت کس سے محسوس ہوتی ہے؟''

''ایرانیوں سے۔'' خلیل نے جواب دیا اور ہنس پڑا۔

''ایرانیوں سے کیوں؟''

''میں جس شہر میں رہتا ہوں وہاں ایک ایرانی تھے۔ ان کی بیوی انگریز تھیں۔ فریدوں اور ایلس۔ یہی نام تھے دونوں کے۔ وہ ایران کی کمیونسٹ پارٹی کے رکن تھے۔ میں سوئمنگ پول کبھی کبھی جاتا ہوں۔ وہیں فریدوں سے ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے گھر پر بلایا۔ پھر اکثر جانا ہوا۔ ہر بار ایسا لگا جیسے انھیں میرا انتظار تھا۔ وہ ہر موضوع پر گفتگو کرتے۔ فارسی کے قدیم شاعروں کا کلام مجھے دکھاتے اور ان کا کلام بھی مجھے سناتے۔ جو میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ خیر جب بھی میں گیا، اور کبھی بن بلائے بھی، تو ان کی مسکراہٹ میرا استقبال کرتی۔ تہران سے ان کی والدہ سوہن حلوہ انھیں بھیجتی تھیں۔ چونکہ یہ مٹھائی مجھے پسند ہے اس لئے اسے وہ خاص طور پر میرے لئے بچا کر رکھتے تھے۔ اس کے برخلاف میرے پڑوس میں ایک بنگلہ دیشی اور ایک ہندوستانی کنبہ ہے۔ جب بھی ان کے یہاں جانا ہوتا ہے بغیر فون کئے ان کے پاس نہیں جاتا۔ اسی لئے ایرانیوں سے مجھے قربت محسوس ہوتی ہے۔ ایک بار فریدوں نے ملکہ نور جہاں کی تصویر دکھائی جو دیگر ایرانی عورتوں کے ساتھ تھی۔ انھوں نے فخر سے کہا کہ ایران کی مشہور عورتوں میں وہ بھی شمار ہوتی ہے۔''

نثار کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ خلیل کے نوکیلے چہرے پر سیاہ و سفید داڑھی اسے بڑی بھلی لگی۔ اس کی بے چین آنکھوں کی معصومیت میں کشش تھی۔ اس کے سر کے بال اب بھی سیاہ تھے۔ حالانکہ وہ خضاب نہیں لگاتا تھا۔

''مغل بادشاہوں سے کیا تمہاری رشتہ داری بھی تھی؟'' نثار نے طنز کیا۔

''نہیں۔ تمہاری ہے۔ ان ہی سے تمہاری شکل ملتی ہے۔'' خلیل نے برا نہیں مانا۔ اس طرح کی نوک جھونک دونوں میں اکثر ہوتی تھی۔

''گورا رنگ مجھے بھاتا تو میں کالی سوڈانی عورت سے کیوں شادی کرتا۔ ماضی سے تمھیں اتنا پیار ہے میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔''

''انسانی رشتے کی ایک بنیاد ماضی کی روشنیاں بھی ہیں۔ وہاں سب کچھ تاریک نہیں ہوتا۔ ایک عربی کہاوت ہے، جس نے ماضی بھلا دیا اس نے اپنے آپ کو گم کر دیا۔''

''لیکن پنجاب، کشمیر، سندھ، سرحد اور سندھ کے جو لوگ اس ملک میں ہیں، ان سے تمھیں قربت نہیں محسوس ہوتی؟'' نثار کے چہرے پر ایک تمسخرانہ مسکراہٹ تھی۔

''ان میں اب مجھے سمجھنے والے نہیں رہے۔''

''خلیل بھائی۔ تم سنکی ہو گئے ہو۔ کیا تم اب بھی ہندوستانی ہو؟''

''دل میں ایک گوشہ ایسا ضرور ہے جو وہی ہے جسے تم نے ابھی کہا۔''

''یہ کیسے ممکن ہوگیا؟''

''نثار۔ میرا شعور اسی ملک میں بیدار ہوا۔ اسی کی زمین میں میرے آباؤ اجداد دفن ہیں۔ میرے والد کی لکھی کتاب کسی شہر کی لائبریری میں شاید اب بھی پڑی ہے، میں مانتا ہوں کہ وہاں بابری مسجد شہید کردی گئی اور شاید چند اور مسجدوں کو بھی یہی صدمہ پہنچا ہو۔ فسادات میں مسلمانوں کے جان و مال کا زیاں ہوتا رہتا ہے۔ لیکن وہاں جو آزادیٔ تقریر و تحریر ہے، کلاسیکی رقص، اعلیٰ فلم، اسٹیج ڈراموں کا جو معیار ہے اور فنون کی جو قدردانی ہے، ان کی وجہ سے دل ہندوستان کی جانب کھنچتا ہے۔ ایک اور حقیقت ہے جس کا اعتراف ضروری ہے۔ دل کے اس گوشے میں اکثر کوئی میخیں ٹھونکتا رہتا ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''جب آنکھوں کے سامنے گجرات کی اس مسلمان حاملہ عورت کا خیال آتا ہے جس کا پیٹ چاک کرکے کوئی ہندو اس کے بچے کو نکال کر عورت کے سامنے اسے ذبح کررہا تھا۔ گجرات سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اس مقتولہ عورت سے ایک تاریخی رشتہ ہے جو میرے نام کی وجہ سے جڑا ہے۔ اور ولی دکنی کے مزار کو مسمار کرنے کے بعد جو سڑک اس پر بنادی گئی ہے وہ میرے دل پر سے گذرتی ہے۔''

''پاکستان کی پھر اہمیت کیا ہوگی تمہارے دل میں۔''

''وہاں جو آمریت رہی ہے اور مذہب کے نام پر جو جہالت روا ہے، وہ مجھے اس سے دور کررہے ہیں، پھر بھی ایک زنجیر ضرور ہے۔ جس نے دل کو اس سے جکڑ رکھا ہے۔''

''پھر آپ کیا ہیں؟''

''بہت ساری سوچ، خواہشوں اور آرزوؤں کا مجموعہ۔ افلاطون نے سقراط کی بابت لکھا ہے کہ زہر کھا کر مرنے سے پہلے اس سے اس کے شاگردوں نے پوچھا آپ کی موت کے بعد آپ کو کس طرح دفن کیا جائے؟ اس نے جواب دیا جس طرح تم سب کی خواہش ہو بشرطیکہ میں تمہاری گرفت میں آسکوں۔ ظاہر ہے اس کے سارے افکار، نظریے اور تصورات ہی افلاطون تھے ورنہ جسم کی کیا حقیقت تھی۔ اور وہ افلاطون کسی کی گرفت میں نہیں آسکتا تھا۔ کسی حد تک یہ نکتہ ہر انسان کی بابت درست ہے۔ چونکہ بقول گرامچی ہر انسان دانشور ہے، اسی لیے مرنے کے بعد اس کی سوچ کچھ دنوں کے لئے کسی نہ کسی شکل میں زندہ رہ جاتی ہے۔''

''لگتا ہے انگلستان میں تم نے سب کچھ پالیا۔ افلاطون اور اٹلی کا دانشور گرامچی بھی تمہاری سوچ میں آگئے۔'' نثار نے کہا۔

خلیل کے چہرے پر کسی گہری سوچ کا سایہ آگیا۔ اس نے اپنے کوٹ کے کالر پر گرے ان سفید ذروں کو ٹھوکا مار کر جھاڑا جو اس کے سر کی خشک جلد سے گرے تھے۔ اپنے ایک پیر کو آہستہ آہستہ ہلاتے ہوئے وہ بولا۔

''طبعی رشتوں سے روحانی جڑیں نکل کر ملک کی سرزمین میں پیوست ہوجاتی ہیں۔ انگلستان میں مجھ پر بڑی مصیبتیں آئیں۔ لیکن اس ملک سے جو کچھ ملا اس سے ہمیشہ اور ہر بار ہمت توانا ہوگئی۔ اسی نے مجھے اب تک زندہ رکھا ہے۔''

''تو تم انگریز ہوگئے۔'' نثار نے طنز کیا اور اپنے سر کی پشت کو دونوں ہتھیلیوں پر ٹکادیا۔

''ہاں اس ملک کی شہریت حاصل کرنا انگریز بنادیتا ہے تو جو تم نے کہا وہ درست ہے۔''

''خلیل۔ جو تم نے کہا وہ بس کسی حد تک ہی صحیح ہے۔''

خلیل نے مایوسانہ آہستہ سے سر ہلایا اور بولا۔

''جو تم نے کہا اس سے انکار نہیں۔ اتنی مدت کے بعد لگتا ہے حاشیے پر بیٹھا ہوں۔''

''پھر مرکز میں کیوں نہیں جاتے؟''

''جب ان کے ساتھ ہوتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ انھیں میری ضرورت نہیں۔ لیکن مجھے ضرورت رہتی ہے۔ ایک ایسے رشتے کی حاجت جس میں وہ بن بلائے میرے یہاں آجائیں۔ اگر میں کچھ کھا رہا ہوں تو اس میں بلاتکلف شریک ہوجائیں۔ یہ سمجھنا چھوڑدیں ہم ان پر بار ہورہے ہیں۔''

''ایسا ہونا ممکن نہیں۔''

''ممکن ہے۔ سنو۔ دولہا اب تقریر کررہا ہے۔''

خلیل اور نثار دروازے کے پاس جاکر تقریر سننے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ دولہا اس خوشی کا اظہار کررہا تھا جو اسے اتنے سارے لوگوں کو دیکھ کر ہو رہی تھی۔ وہ ایلمس کے درخت کے سیدھے تنے کی طرح تنا ہوا تھا اور اس کی پر اعتماد نگاہیں حاضرین پر جمی تھیں۔ کسی یونانی مجسمے کی طرح ترشے ہوئے چہرے پر بشاشت تھی اور آواز میں گونج۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی بیوی کے جاننے والے اتنے سارے لوگ دور دور سے آئیں گے۔ جس خوشی سے اتنے سارے لوگوں نے اسے اپنالیا تھا وہ اس کے لئے حیرت ناک تھی۔ اور انتہائی مسرور کن بھی۔ خلیل نے سوچا کہ کیا فردوسی بیگم کا سابق سیاہ افریقن محبوب بھی یہاں موجود ہے؟ اس معاشرے میں لوگ وسعت قلبی تو دکھاتے ہیں۔ اسے Clockwork Orange کا مصنف انتھونی برجس

یاد آیا جس کی بیوی کے ساتھ دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکن سپاہیوں نے زنا بالجبر کیا تھا۔ پھر بھی مصنف نے اپنی شادی ختم نہیں کی۔ بیوی اسی طرح عزیز رہی۔ ''یہ دل کا معاملہ ہے خلیل۔ ٹوٹا ہوا دل وسیع القلبی کی اجازت نہیں دیتا۔'' اس میں چھپا دوسرا خلیل بولا۔ ''اگر اس کی بیٹی ہوتی اور کوئی سیاہ فام افریکن اس کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا تو وہ اجازت دے دیتا؟'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ ''میری تو اولاد ہی نہیں۔ اگر بیٹی ہوتی اور اس سے کوئی تعلیم یافتہ افریکن شادی کرنا چاہتا تو میں اعتراض نہیں کرتا۔'' وہی دوسرا خلیل جھوٹ بولا اور ہنس پڑا۔ ''اور اگر وہ ہندو ہوتا تو؟'' اسی چھپے ہوئے خلیل نے پوچھا۔ ''کون ہوتا وہ؟ مسٹر اور مسز مکرجی کا بیٹا؟ مسز مکرجی۔ جن کے منگے جیسا پیندا چلتے وقت ان کی ساری میں مچلتا رہتا ہے۔ اور جب وہ گنیش کو دودھ پلانے گئیں اور پلا کر مڑیں تو گنیش کا جھکا ہوا سونڈھ اچانک سیدھا ہو گیا تھا۔ یہ منظر خلیل کے تصور میں اسی دن سے آنے لگا تھا جس دن اس نے خبر سنی تھی کہ پتھر کے گنیش سڑا سڑ دودھ پی رہے ہیں اور عورتیں جوق در جوق دودھ کی کٹوریاں تھالیوں میں سجائے ان کی خدمت میں جا رہی ہیں۔ اسے ہر مذہب سے بیگانگی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی برا خیال اس کے دل میں آ گیا۔ تقریر ختم ہو گئی اور تالیاں بجیں۔ ہال میں مہمان ایک میز سے دوسری میز پر آپس میں بات چیت کرنے کے لئے جانے لگے۔ اور کچھ ڈائس پر جا کر دولہا دلہن کو مبارکبادیاں دینے میں مصروف ہو گئے۔

''تقریر اچھی تھی۔'' نثار بولا اور میز پر رکھی کوک کی بوتل سے پلاسٹک کے گلاس میں کوک ڈھالنے لگا۔ ''خلیل۔ تم بھی پیو گے؟''

''نہیں۔ ابھی خواہش نہیں ہو رہی ہے۔'' خلیل نے جواب دیا اور دوبارہ صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔

''تم اندر کیوں نہیں جاتے؟''

خلیل چند لمحوں کے لئے خاموش رہا۔ وہ دن اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ اور وہ وقت بھی۔ صبح اور دوپہر کے درمیان کا ایک طویل وقفہ کسی بیکراں سمندر کی موج کی طرح سامنے آ گیا۔ اتنا بڑا جلوس اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ ڈھاکہ میڈیکل کالج کے سامنے سے دور تک سڑک پر تیزی سے جا رہا تھا۔ ''راشٹر بھاشہ بنگلہ چاہیے'' کے فلک شگاف نعرے لگ رہے تھے۔ اس جلوس میں وہ بھی شامل تھا۔ حالاں کہ بنگلہ اس کی مادری زبان نہیں تھی۔ لیکن وہ اس دیش میں رہتا تھا جہاں یہی بولی جاتی تھی۔ بچے ماں کی لوریاں اسی زبان میں سن کر اس کی آغوش میں سکون سے سو جاتے تھے۔ محبت کے الفاظ میں اسی زبان کی مٹھاس ہوتی تھی۔ اس دیش کے شعر و ادب میں اسی کا سونا لپکتا تھا۔ اس زبان کو خطرے سے بچانا اپنی زبان کے تحفظ سے مختلف نہیں تھا۔ لوگ جوش میں اسے ایک جانب دھکیلتے ہوئے آگے نکل گئے۔ پھر اچانک پولس کی گولیاں چلنے لگیں۔ لوگ مارے جانے لگے۔ ان گنت زخمی ہو گئے۔ اور بھگدڑ مچ گئی۔ وہ بھاگا نہیں تیز چلتا ہوا واپس اپنے ہاسٹل آ گیا۔ اس دن کے بعد اس زبان کے بولنے والوں اور ایک تہذیب سے وہ رشتہ قائم ہو گیا جو نہیں مٹا۔ لیکن جنھیں اس رشتے کی شناخت تھی وہ اس دنیا سے جا چکے تھے۔ 70 اور 71 میں جو بربریت اس سرزمین پر ہوئی اس کے پہلے شکار وہی ہوئے۔ آج شادی کے ہال میں جو افراد تھے ان کے لئے وہ اجنبی تھا۔ خلیل نے اپنے سینے میں درد اٹھتا محسوس کیا۔ ہلکا ہلکا۔ تیز نہیں۔ کوئی شے سینے کے اندر کراہ کر سکڑنے لگی۔ اس کا ہاتھ سینے پر چلا گیا۔

''مجھے اجنبیت محسوس ہوتی ہے۔ اتنے دنوں تک ان کے درمیان رہنے کے باوجود انھیں انگریزی میں مخاطب کرنا اور انھیں کچھ یاد بھی دلانا۔ مجھے بہت دشوار لگتا ہے۔'' خلیل نے اپنا سینہ آہستہ آہستہ سہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''کیسی یاد؟'' نثار نے کوک کی چسکی لی اور اپنے تر لبوں کو سفید رومال سے صاف کیا۔

''جنگ و جدال۔ خون خرابہ۔''

''لیکن تم اس میں شریک نہیں تھے۔'' نثار گلاس میں ارغوانی کوک کو تک رہا تھا۔

کسی پچھتاوے کی یاد سے خلیل کے لب سکڑ گئے۔ پھر وہ بولا۔

''زبان کے مسئلے پر لڑائی شروع ہوئی اور جلد ہی قوم اور مذہب کی جنگ بن گئی۔''

''خلیل۔ مادری زبان چکنا حیوان ہے۔ جسے پکڑنے کی کوشش میں انسان گر ہی جاتا ہے۔''

''نہیں نثار۔ جب ہم مادری زبان کی بابت سوچتے ہیں تو ہم اس کی وسعت اور گہرائی سے ماورا اپنی ذات کی گہرائی میں کچھ دیکھتے اور پاتے ہیں۔ ایک ایسی شے جس کا بیان ممکن نہیں لیکن جو بہت ہی محترم اور عزیز ہوتی ہے۔''

''خلیل۔ تم میری بات نہیں سمجھے۔ پاکستان اردو کی خاطر بھی قیام میں آیا تھا۔ لیکن بدنصیب اردو وہاں کی سرکاری زبان بھی نہیں بن سکی۔''

خلیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ان مرد و عورتوں کو دیکھ رہا تھا جو ہوٹل کے بار کی جانب سے جھجکتے ہوئے آ رہے تھے۔ مہمانوں کے لئے سعادت

نے سوائے شراب کے دیگر پینے کی چیزوں کو مفت حاصل کرنے کی اجازت
دی تھی۔ لیکن یہاں تو سبھی کچھ موجود ہے۔ ہر طرح کا جوس اور کوک بھی۔ پھر
یہ لوگ وہاں کس لئے گئے تھے؟ شاید چھپ کر پینے کے لئے۔ اسے اپنا پینا یاد
آیا۔ پہلی بار اور وہ بھی چھپ کر نہیں۔ ہندوستان میں زندگی کا وہ دور جب یار
دوستوں کی کمی نہیں تھی۔ جب کالج جانا ایک مذاق تھا اور کورس کی کتابیں
پڑھنا وبال۔ خلیل جب انٹر میڈیٹ میں تھا تو اس کے جاننے والوں میں راج
کمار جین بھی تھا۔ پڑھائی میں بہت تیز دیگر حرفتوں میں بھی ماہر۔ دونوں شہر
کے سینما ہال میں مٹنی شو میں کوئی انگریزی پکچر دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ ٹکٹ
جین نے خریدا اور پکچر کے دوران اس نے بیئر کا آرڈر بھی دے دیا۔ ایک
گلاس اپنے لئے اور دوسرا خلیل کے لئے۔ لیکن اسے مزا نہیں آیا۔ اس نے
چپکے سے ساری بیئر بہا دی۔ پہلے گناہ میں کچھ لطف نہیں آتا۔ خلیل نے
انگلستان میں ہی پینا شروع کیا اور وہ بھی اس دن سے جب وہ اور ساندرا
ایک دوسرے سے ہم آغوش سرخ شراب پی رہے تھے۔ اسپینش شراب
ساندرا لے کر آئی تھی لیکن مسالے دار مرغی خلیل نے پکائی تھی۔ دونوں بوتل
سے چند گھونٹ پیتے پھر ایک دوسرے کے لبوں سے اسے چوسنے لگتے۔ خلیل
کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

''کیا بات ہے خلیل۔ کیوں مسکرائے۔''

''یونہی کچھ خیال آگیا۔''

''کیا؟ بتاؤ۔''

''تم ڈاکٹر منظور چودھری سے ابھی ملے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ ڈھاکہ
یونیورسٹی میں تھا۔ چند سال پہلے اس کی بیٹی کی شادی بھی کسی انگریز سے ہوئی
تھی۔ سب کچھ ڈھاکہ ہی میں ہوا تھا۔ شادی کے دن خوب گانا بجانا اور رقص
بھی ہوا...''

''کون سا رقص؟ بالی وڈ جیسا؟''

''نہیں۔ سادہ سا رقص تھا۔ ویسا رقص نہیں جو برمنگھم میں تمہارے عزیز
ڈاکٹر علی افضل کے گھر پر ان کے بیٹے کی شادی کے دن ہوا تھا۔ جس میں دو
لڑکیاں ناچ رہی تھیں جن میں سے ایک ناچ کے ساتھ گا رہی تھی۔ چولی کے
پیچھے کیا ہے؟ نثار۔ کون نہیں جانتا وہاں کیا ہے؟''

''عجیب بات ہے۔ افضل بھائی تو بڑے مذہبی ہیں۔ ان کے گھر میں
مجھے بھی پانچوں وقت نماز پڑھنا پڑا۔ جب وقت آتا تو ان کا نواسہ اذان دیتا
پھر سب کی نگاہیں میری جانب بھی اٹھ جاتیں۔''

خلیل بے اختیار ہنس پڑا اور ہنستے ہوئے بولا۔

''چلو ثواب مل گیا۔ خیر میں منظور چودھری کی بیٹی کی شادی کی بات کر
رہا تھا۔ جس کے ویڈیو میں کسی بھی اردو بولنے والے کو میں نے نہیں دیکھا۔''

''خلیل تمھیں یقین کیسے ہوتا؟''

''جو چند افراد ویڈیو دیکھ رہے تھے ان میں ڈاکٹر چنٹو پادھیائے بھی تھے۔
بعد میں دبی زبان میں ان سے اس کی وجہ پوچھی تھی۔ انھوں نے کہا۔ وہاں
اردو بولنے والوں کی ضرورت نہیں تھی۔'' جواب دے کر خلیل ہنسنے لگا۔

اسے ہنستے دیکھ کر نثار کو حیرت ہوئی۔ اس نے اس سے وجہ پوچھی۔

''بعض انگریز ہمارا نام بگاڑ کر لطف لیتے ہیں۔ منظور چودھری نے مجھے
بتایا تھا کہ ایک ہسپتال جس میں دونوں کام کرتے تھے وہاں انگریز ڈاکٹر اور
نرسوں کو چنٹو پادھیائے کا پورا نام استعمال کرنے میں دشواری ہوتی تھی انھوں
نے نام سے چنٹو اور 'ھ' اڑا دیا۔ اور غریب کا نام پادائے پڑ گیا۔ ہسپتال میں جو
شرارتی پاکستانی ڈاکٹر تھے انھوں نے حرف 'ا' پر زور دینے کے لئے اسے 'آ'
بنا دیا۔ اب تم سمجھ سکتے ہو کہ وہ کس طرح بلائے جاتے ہوں گے۔''

''ول ڈن۔ ان ہندوستانیوں پر جب بھی موقعہ ملے وار کرنا چاہئے۔''
نثار قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

فوئر میں چند مہمان مرد و عورت کھڑے تھے، وہ چونک کر ان کی جانب
دیکھنے لگے۔ دو ویٹریسیں جو جوٹھے برتن اٹھائے ہال سے نکلیں۔ دونوں اس
میز کے پاس رکیں جس پر جوس اور کوک کی بوتلیں تھیں۔ دونوں نے گلاس
میں سنگترے کا جوس ڈالا اور اطمینان سے پی گئیں۔ پھر وہ پینٹری میں چلی
گئیں۔ خلیل کی ہنسی اچانک رک گئی۔ وہ نثار کی طرح کیوں نہیں ہنسا۔ اس کی
طرح ایک زہریلی خوشی اسے کیوں نہیں ہوئی؟ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔
فرقہ پرستی کا زہر جو چپکے سے روح میں سرائت کر جاتا ہے اس میں کیوں نہیں
ہے؟ خاص کر یوں بھی کہ کوشش کے باوجود وہ فرشتہ نہیں بن سکا تھا۔

خلیل فوئر میں لگے شیشوں سے باہر ہوٹل کے وسیع میدان کی جانب
دیکھنے لگا جس کے وسط میں تالاب تھا اور اس کے گرد درخت تھے۔ سرسبز اور
کسی خوشی سے جھومتے ہوئے۔ دعوت کے دوران اس پر خاموشی سی رہی تھی۔
کبھی پانی کا گلاس مانگ لیا اور کبھی قورمہ بڑھانے کے لئے کہا۔ کسی بات پر
مسکرا دیا۔ کوئی رسمی بات کر لی۔ نثار کی بات اسے بری لگی تھی۔ لیکن وہ ایسی
باتیں سننے کا عادی تھا۔ اسے چپ دیکھ کر نثار سمجھ گیا کہ خلیل خوش نہیں ہے۔

''خلیل۔ تمھیں میری بات بری لگی۔ یہاں جو بنگلہ دیشی بیٹھے ہیں ان
سے تمھیں قربت نہیں محسوس ہوتی پھر یہاں کیوں آ گئے؟''

''سعادت نے بہت اصرار کیا۔ وہ اچھا مسلمان ہے۔ جیسے زیادہ تر

مسلمان ہوتے ہیں۔"

"تمہارے لہجہ میں طنز ہے۔نہیں بلکہ دشمنی کی آنچ۔"

نثار کی بات سن کر خلیل نے محسوس کیا کہ وقت کے منجدھار میں بہتے ہوئے اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا۔ یہ سارے لوگ جو یہاں موجود تھے ان ہی جیسوں کے ساتھ کبھی رہنے کے بعد بھی ان کے لئے اجنبی تھا۔ ہندوستان اس کے آباؤاجداد کا ملک تھا جس کی اب محض یادیں تھیں جو نہ بھی آتیں تو اس کی زندگی میں فرق نہیں پڑتا۔ اور جہاں وہ آبسا وہاں بھی وہ اجنبی ہے۔ یہ المیہ اس کی زندگی کی روداد ہے۔ اور ان سارے لوگوں کی بھی جو یہاں روشنیوں، رنگ برنگے غباروں اور بوکیس میں کھلے پھولوں کے درمیان بیٹھے ہیں۔ اداسی نے اسے گھیر لیا اور اس کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگی۔ ایک غمگین مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی اور وہ دھیمی آواز میں بولا۔

"دشمنی؟ کس سے؟ اب نہ کسی سے دشمنی ہے اور نہ ہی کسی کے ساتھ ایسی وابستگی۔ وہ دوری جیسے ختم ہو گیا۔"

"تمہیں اتنی اجنبیت ان سب سے محسوس ہو رہی ہے پھر مجھے بے کار لے کر آئے۔ انھیں دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے کہ ہم لوگوں نے لاتیں مار کر ایک دوسرے سے بہت دور کر دیا ہے۔ خیریت ہوئی ہے کہ کوئی نہیں جانتا کہ میں پاکستانی فوج میں تھا اور 70 - 71 میں میری ڈیوٹی پنجاب رجمنٹ کے ساتھ مشرقی پاکستان میں تھی اور پھر ہندوستانیوں کی قید بھی اسی نوکری کی وجہ سے برداشت کی۔" نثار نے ادھر اُدھر نگاہیں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

"میں نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ جب سعادت کو پتہ چلا کہ میرے گھر میں ایک مہمان ہے تو وہ مصر ہو گئے کہ تمھیں ساتھ لاؤں۔ ان کی جگہ کوئی انگریز ہوتا تو ہرگز اس طرح اصرار نہیں کرتا۔ اگر سعادت تمہیں نہیں مدعو کرتے تو میں یہاں آتا بھی نہیں۔ تم نے فوج کی نوکری کیوں کی؟"

"ان کا سر توڑنے کے لئے۔" نثار آنکھوں سے مہمانوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے زیر لب بولا۔

"لیکن خود ہی سر تڑوا کر آ گئے۔" خلیل نے چوٹ کی اور اپنے پیروں کو پھیلا دیا۔

"وہ بھی جنگ میں نہیں۔ کھلنا میں ان بنگالیوں نے جلوس نکالا تھا اور پھر فساد بھی ہو گیا۔ اور وہ بھی خوفناک۔ ان کم بختوں نے ایک گیارہ سال کی اردو بولنے والی بچی کی رانوں کے درمیان لکڑی ٹھونس کر اس سے کسی بنگالی عورت کی آبروریزی کا بدلہ لیا تھا۔ ہماری پلٹن جب جلوس منتشر کرنے لگی تو کسی نے ڈنڈا میرے سر پر مارا۔ خیریت ہوئی سر پر فوجی ٹوپی تھی اس لئے کھوپڑی نہیں ٹوٹی۔ کچھ دن آرام کرنے کے بعد صحت مند ہو گیا۔ بعد میں سر میں درد اور چکر کی شکایت ہونے لگی خوش قسمتی سے وہ صرف کبھی کبھی ہوتی تھی۔"

"پاک دامنی اور عورت کی آبرو، قومی نظریے کی بنیاد میں اہم نکات ہیں۔ دھرتی ماں، مادر وطن کی عزت اسی حقیقت کا ماورائی اظہار ہے۔ لیکن مذہبی یا قومی جدوجہد میں جو بربریت ہوتی ہے اس سے بچنا ممکن نہیں۔ جس بنگالی عورت کے ساتھ زنا کیا گیا اس کا رشتہ دار شاید نیک انسان ہو اسے ظالم اور تشدد پسند بننے میں دیر نہیں لگی۔ اسی نے اس معصوم بچی پر سفاکی کی ہوگی۔"

نثار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جیسے اسے کسی اور موضوع کی تلاش تھی۔ اس نے گفتگو کا رخ بدلنے کے لئے کہا۔

"سچ تو یہ ہے کہ تم فوجی افسر بنتے۔ تمہارے نانا تمہارے بچپن کی وہ تصویر بڑے شوق سے دکھاتے تھے جس میں تم پولس یونیفارم میں گھوڑے پر بیٹھے ہوئے تھے۔"

"درحقیقت میر صابر علی کو بجائے پولس کے فوج کی ملازمت کرنی چاہئے تھی۔ پھر ممکن تھا میری دادی اور چچا دشمن بننے کی ہمت نہیں کرتے۔"

خلیل نے صوفہ کی پشت سے سر ٹکا دیا اور خلا میں تکنے لگا۔ نانا کی بابت نہ جانے کتنی بار وہ سوچ چکا تھا۔ عجیب بات تھی آج بھی ان کا خیال اس پر چھایا رہا اور وہ خاموش خاموش سا رہا۔ اسے اپنی شادی یاد آئی جس میں نانا نہیں شریک ہو سکے تھے۔ نہ اسے دولہا بنا دیکھا نہ عزیزوں سے مبارکبادیاں سنیں۔ سینکڑوں میل کی دوری اور دمہ نے اجازت نہیں دی کہ وہ اپنے ویران مکان سے نکلتے اور اپنی آرزوئیں پوری ہوتے دیکھتے۔ خلیل کی روح میں جو شے ٹوٹی ہوئی تھی وہ سسکنے لگی جو زخم تھا وہ پھر دکھنے لگا۔ دل کی بات وہ کس سے کہتا۔ سینہ کا درد تیز ہو گیا۔ جو اس نے محسوس کیا تھا کاش اسے وہ کسی سے کہہ سکتا۔ بہت ساری اذیتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں کسی سے کہنے کی خواہش نہیں ہوتی۔

ہال کے اندر سے پیانو بجانے کی دلکش آواز آنے لگی۔ نغمہ میں کچھ ایسا سحر تھا کہ اس کے سرور سے خلیل کی آنکھیں مند گئیں۔ ساز سے اٹھنے والی صدا نغمہ نہیں دوا کی بوندیں تھیں جنھوں نے خلیل کے دل میں اٹھتی کرب کی لہروں کو جذب کر لیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور نثار سے ادھر چلنے کے لئے کہا۔ لیکن اس نے نفی میں سر ہلا کر انکار کر دیا۔ دو جوان لڑکیاں ہال سے نکل کر اس میز کے پاس آگئی تھیں جس پر مشروب رکھے ہوئے تھے۔ دونوں گلاس میں سنگترے کا عرق ڈال کر آہستہ آہستہ پینے لگیں۔ ان میں سے ایک بولی۔

''رحیمہ نہ صرف آکسفرڈ کی گریجویٹ ہے بلکہ پیانو بجانے میں بھی ماہر ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے والدین ان پڑھ آزاد کشمیری ہیں۔''

''اور وہ خوش قسمت ایسی کہ پاکستانی ڈاکٹر خاوند نہ صرف دین دار ہے بلکہ جو مسلمان جیل میں ہیں ان سے جیل میں مل کر ان کی خبر گیری بھی کرتا رہتا ہے۔''

''لکی گرل۔''

''لکی بوائے۔''

خلیل نے سعادت سے اس جوڑے کی تعریف اکثر سنی تھی۔ اس نے سوچا کہ یورپ میں جو مسلمان آبسے ہیں اگر اسی طرح فنون اور علم اپناتے تو معاشرے میں اہم اور طاقتور ہوتے۔ نہ ان کی بڑی تعداد غربت کا شکار ہوتی اور نہ ہی ان پر دہشت پسندی کی مہر لگتی۔ انسانیت کا سبق فن سے ملتا ہے اور ظلم کے خلاف مہلک ہتھیار بھی یہی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہال کے دروازے پر آ گیا۔ وہاں اور مہمان بھی کھڑے تھے۔ ہال میں ایک جانب جہاں سرخ گلاب کا بہت بڑا بوکیٹ تھا جس کے قریب گوری سی رحیمہ پیانو پر انہماک سے کوئی دھن بجا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں پر نازک سا سنہری فریم کا چشمہ تھا اور چپٹے چہرے پر عجیب سی رونق۔ وہ گلابی شلوار اور قمیص پہنے ہوئے تھی اور سرخ دوپٹہ گردن میں جھول رہا تھا۔ اس کے سر کے بال گردن تک ترشے ہوئے تھے۔ ہال کے وسط سے میز اور کرسیاں ایک جانب ہٹا کر جگہ بنا دی گئی تھی، وہاں چند انگریز مہمان مرد و عورت رقص کر رہے تھے۔ ان کے چہرے متبسم تھے اور آنکھوں میں ایک دوسرے کے لئے چاہت۔ اچانک نیلی اور لال ساری میں ملبوس دو لڑکیاں اٹھیں اور ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر رقص کرنے لگیں۔ ان کے پیروں کی گردش میں بھی خاموش موسیقی تھی۔ رقص، موسیقی اور خوشی سبھی ایک دوسرے سے ہم آہنگ۔ چند عمر رسیدہ بنگالی عورتوں نے آس پاس بیٹھے جوان لڑکوں پر معنی خیز نگاہیں ڈالیں۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ ساری میں ملبوس لڑکیوں کے ساتھ جوڑا بنا کر رقص کریں۔ لیکن کوئی نہیں اٹھا۔ ایک لڑکی شوخی سے ہنستی ہوئی دولہا اور دلہن کے پاس گئی اور ان کا ہاتھ پکڑ کر رقص کرنے کے لئے کھینچا۔ فردوسی بیگم نے گھبرا کر اپنے والد کی جانب دیکھا جو پاس ہی کھڑا تھا۔ سعادت کے چہرے پر سختی تھی۔ گانا ٹھیک تھا لیکن رقص درست نہیں۔ یہی خیال اس کے ذہن میں تھا۔ اس نے چہرہ دوسری جانب کر لیا۔ فردوسی بیگم نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ خاوند نے بھی اصرار نہیں کیا۔

خلیل نے سوچا یہ موسیقی اس گیت سنگیت سے کتنی مختلف تھی جسے وہ تعلیم کے دوران یونیورسٹی میں خاص موقعوں پر سنا کرتا تھا۔ جب ٹیگور اور قاضی نذر الاسلام کے دنوں کے علاوہ اقبال ڈے بھی منایا جاتا تھا۔ جب ایک تہذیب میں دوسری تہذیب گھل رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اور بغیر کسی جبر کے۔ جب بنگلہ بولنے والے لڑکے دوست بن رہے تھے۔ اور بنگالی لڑکیوں سے محبتیں ہو رہی تھیں۔ بے اختیار اور کسی انجان کشش کے باعث۔ خلیل کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ دنیا ہی مٹ گئی اور وہ بھی اتنی بیدردی سے۔ اس نے سوچا۔

پیانو کی آواز فوئر میں بھی آ رہی تھی۔ دور سے آتی اور ہوا پر مچلتی ہوئی۔ نثار نے اس میں کوئی دل کشی نہیں محسوس کی۔ وہ اسے بری لگی۔ بہت بری۔ اس کا سر دکھنے لگا۔ وہی درد جو اتنی مدت کے بعد بھی 70۔71 کے مشرقی پاکستان میں اسے لے جاتا تھا۔ لاٹھیوں کی تڑ تڑ۔ گولیوں کی سنسناہٹ۔ چیخ و پکار۔ ہارمونیم اور پیانو میں کتنی مشابہت ہے۔ اور اس رات شہر ڈھاکہ کے ایک کمانڈ پوسٹ کا دروازہ بند تھا۔ میز پر پڑا ہارمونیم بھی مردہ۔ اور اس کی بجانے والی جہاں آرا ہاتھ جوڑ رہی تھی۔ اسے ایک دعوت میں بلا یا گیا تھا جس میں چند پاکستانی فوجی افسر بھی شریک تھے۔ جو دعوت کے بعد کیپٹن نثار پر معنی خیز نگاہیں ڈالتے ہوئے رخصت ہو گئے تھے۔ جہاں آرا کی زرد ساری کا آنچل اس کے سر سے ڈھلک گیا تھا اور دہشت زدہ چہرے پر آنسوؤں کی دھار تھی۔

''نا بھائی۔ میں تمہاری بہن ہوں۔ سب گانے والی عورتیں بری نہیں ہوتیں۔ مجھے ننگا مت کرو۔ میرا جسم بھی تمہاری بہن جیسا ہے۔ میں مکتی باہنی کے لئے پیغام نہیں لے جاتی۔ میرا بھائی مکتی باہنی میں نہیں ہے۔ اماں۔ ابا۔ دیکھو میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔''

اماں ابا کیا کوئی بھی ادھر قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ باہر رائفل بردار سپاہی کھڑے تھے۔ کمانڈ پوسٹ کے باہر پیپل کے درختوں میں ہوا پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ اور اس رات نثار کے سر کا درد اچانک پھر آ گیا تھا۔ وہ درد جس سے اسے نجات مل چکی تھی۔ اس نے ایسا ہی سمجھ رکھا تھا۔ لیکن اس رات اس درد کا مداوا بھی جہاں آرا تھی۔ جوان جسم اور عمدہ آواز۔ جو مقامی اسکول میں معلمہ تھی۔ اس وقت نثار نہیں تھا بلکہ ننگ دھڑنگ پھرنے والا وہ قدیم انسان جو پتھروں سے شکار کرتا تھا۔ جسے جانوروں کا کچا گوشت کھانے میں جھجک نہیں ہوتی تھی۔ ماں اور بہن بس عورت تھی جس سے جسم کی حاجت پوری کرنے میں کوئی برائی نہیں تھی۔ جہاں آرا کی کشمکش اور فریاد سب بے کار ثابت ہوئی۔ نثار کے سر کے درد کا علاج ہو گیا۔

اسے اپنی یاد سے گھبراہٹ ہونے لگی۔ ساتھ ہی اپنے آپ پر ترس آیا اور ان تمام مہمانوں پر بھی جو وہاں بیٹھے تھے۔ ان دنوں اور آج کے درمیان کیا ہو گیا؟ آج وہ نفرت اسی طرح کیوں نہیں ابھری؟ سامنے وہی لوگ تھے۔ پستہ قد اور سیاہ۔ جنھیں دیکھ کر ان دنوں شدید بیگانگی اور نفرت کا احساس ہوتا تھا۔ جنھیں وہ اس وقت بھٹکے ہوئے مسلمان سمجھتا تھا۔ جن کا اس تہذیب سے کوئی تعلق نہیں تھا جو اس کی تھی۔ لیکن تہذیب؟ کیا ہے یہ؟ آج بھی اس وقت کی طرح ایک مبہم تصور تھا اس کے ذہن میں۔ وہ ان سے مختلف ہے۔ اس کے کھانے سے بلسہ مچھلی کی بو نہیں اٹھتی۔ وہ بنگلہ نہیں بولتا۔ وہ ہندوؤں کی زبان ہے۔ اس کی زبان تو اسلامی زبان ہے۔ جس کے موجد ہندوستانی مسلمان تھے۔ یہی تو ہے تہذیب۔ وہ اسی کا پاسبان تھا اور ملک کا بھی۔ ان بنگالیوں کی علیحدہ پسند تحریک کیسے برداشت کرتا۔ فوجی تربیت نے اسے مرنا اور مارنا سکھایا تھا۔ نفرت، جان لینا یہی اس کا نصب العین تھا اس وقت۔ نثار نے اپنا سر سہلایا اور پھر آہستہ آہستہ اسے دبایا۔ لیکن سر کے درد میں کمی نہیں ہوئی۔ ہال کے اندر سے ایک عورت سبز ساری میں ملبوس باہر نکلی۔ پینتیس کے لگ بھگ اس کی عمر تھی اور سر پر گنجاپن کا چھوٹا سا نشان۔ وہ اپنے پتلے لبوں کو ٹیشو پیپر سے خشک کر رہی تھی۔ جونہی اس کی نگاہ فوئر میں بیٹھے نثار پر پڑی چند لمحوں کے لئے اس کے قدم رک گئے۔ نثار کے گورے چہرے پر اس کے سر کے گھنگریالے بال کی دولت آگئی تھی۔

اس کی بڑی بڑی گہری آنکھیں کھوئی ہوئی تھیں۔ پیانو پر بجنے والا والز کا نغمہ کہیں دور چلا گیا۔ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ کہیں کھو گئے۔ عورت کو جس کا نام مہر النسا تھا جھرجھری آگئی۔ وہ باہر تازہ ہوا کی تلاش میں جانا چاہتی تھی۔ لیکن نثار کے سامنے سے گذرنا اسے دوبھر محسوس ہوا۔ وہ لیڈیز روم میں چلی گئی۔ جس چہرے کو اس نے ابھی دیکھا تھا اس کی تصویر اس کے ذہن میں کسی سنگدل مصور نے چاقو سے کھرچ کھرچ کر بنادی تھی۔ وہ بیسن کے سامنے کھڑے ہو کر دیوار میں لگے آئینہ میں اپنا عکس دیکھنے لگی۔ دھیما سا گندمی رنگ۔ چوڑا چہرہ اور سیاہ آنکھوں میں چمک۔ خاندان کے سارے افراد کہتے تھے کہ وہ اپنی خالہ جہاں آرا پر گئی ہے۔ ان کی آنکھوں میں بھی ایسی ہی چمک تھی۔ جیسے کوئی شرارت کرنا چاہتی ہوں۔ وہ اسے ماں سے زیادہ پسند تھیں۔ رات کے وقت ان کے ساتھ سونے میں سکون ملتا۔ جس کی وجہ ان کی وہ گنگناہٹ تھی جو سونے سے پہلے ان کے ننھے سے منہ سے نکلتی۔ ہر رات کسی نئے گانے کی گنگناہٹ۔ کبھی کوئی ہندوستانی فلمی گانا، کبھی رابندر سنگیت اور کبھی نعت یا حمد۔ وہ بڑی شرارتی تھیں۔ اسے بگلی گڑیا کہہ کر چھیڑتیں۔ چونکہ مہر النسا کے چہرے پر اس کے سر کے بال اکثر بکھرے رہتے۔ گھر میں ایک بارہ سال کا چھوکرا ملازم تھا۔ اکثر رات کے وقت جہاں آرا خالہ سیاہ روشنائی سے اس کے چہرے پر داڑھی مونچھیں بنا دیتیں۔ اسے خبر بھی نہیں ہوتی۔ صبح ہوتی تو وہ جدھر جاتا لوگ قہقہہ مار کر ہنس پڑتے۔ گھر میں ایک جوان باورچن تھی۔ وہ کسی وجہ سے بو نہیں محسوس کر سکتی تھی۔ جہاں آرا کے والد اس کے سر پر اکثر معصومانہ ہاتھ پھیر دیتے تھے۔ ایک دن جہاں آرا خالہ نے باورچن کے سر کے تیل میں کراسن کا تیل ملا دیا۔ ان کے والد نے جب اپنی دانست میں معصومانہ حرکت کی تو ان کے ہاتھ میں کراسن تیل کی بو چپٹ گئی۔ اور وہ دوپہر بھی اسے یاد آگئی جب گھر میں کوئی نہیں تھا۔ وہ جہاں آرا خالہ کے کمرے میں سو رہی تھی۔ کسی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی تو اس نے دیکھا کہ ساتھ کے پلنگ پر لیٹی جہاں آرا خالہ کے بلاؤز کا بٹن کھلا تھا اور بارہ سالہ نوکر کا منھ ان کے سینے پر تھا۔ اس دن کے بعد اسے ایک عجیب سے خوف نے گھیر لیا۔ وہ رات کے وقت ان کے ساتھ سونے سے ڈرنے لگی تھی۔

جہاں آرا خالہ ہمیشہ صاف کپڑے پہنتی تھیں۔ انھیں ہلکا زرد رنگ پسند تھا۔ اسی رنگ کی ساری اور اسی رنگ کا بلاؤز ان کے جسم پر اکثر ہوتا۔ جوں ہی جوان ہوئیں ان کی بابت اسکینڈل ہونے لگے۔ کسی دن یونیورسٹی میں کسی لڑکے کے ساتھ گھنٹوں باتیں کرنے کی خبر آتی اور کبھی کسی لیکچرر کے ساتھ کمرے میں تنہا دیر تک بیٹھنے کی افواہ سنی جاتی۔ ماں باپ نے کبھی ڈانٹا تو وہ صاف کہہ دیتیں کہ لڑکیاں ان سے جلتی ہیں اسی لئے انھیں بدنام کرنے کی کوششیں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن جب راشٹر بھاشا بنگلہ کی تحریک زور شور سے شروع ہوئی تو اس وقت وہ بخشی بازار گرلس اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ بنگلہ زبان کی تحریک کے ساتھ ان کے سارے اسکینڈل غائب ہو گئے۔ اب ان کے چہرے پر کوئی اور ہی چمک تھی اور کسی ارادے کی پختگی۔ اور ملک میں فوجی کارروائی شروع ہوئی تو ایک دن جہاں آرا خالہ نے اسے کمرے کی صفائی میں ہاتھ بٹانے کے لیے کہا۔ ان کی کتاب میں کسی فوجی افسر کی تصویر ملی۔ اس نے جب ان سے اس کی بابت پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ اس کا نام نثار ہے اور وہ جس اسکول میں پڑھاتی ہیں وہاں وہ دو تین بار مکتی باہنیوں کی تلاش میں آچکا ہے۔ لیکن وہ اچھا انسان ہے۔ اس نے کہا کہ وہی ہوگا جو بنگالی چاہتے ہیں لیکن جنگ بند کردیں۔ کیسی معصوم سی خواہش تھی۔ ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ قومی آزادی کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ قوم کبھی کبھی وقتی طور پر مذہب کی بنیاد پر بنتی ہے۔ لیکن سب سے اہم زبان ہے۔ اس زبان میں کہی ہوئی شاعری اور گیت ہیں۔ ادب کا وسیع خزانہ ہے۔ اور وہ زبان اس جغرافیائی حد بندی

میں بولی جاتی ہے۔ جس میں رہنے والے لوگوں کا دکھ درد، خوشی اور راحت ایک جیسے ہوتے ہیں۔ جہاں آرا یہی کہتی تھیں۔ اور ایک شام وہ گھر واپس نہیں آئیں۔ دوسرے دن وہ آئیں۔ تو چلتی پھرتی لاش تھیں۔ بے جان اور بے حس۔ گال اور گردن پر نیلے داغ۔ سر کے بال الجھے ہوئے۔ کسی نے پوچھنے کی ہمت نہیں کی کہ وہ کہاں غائب رہی تھیں۔ وہ آنچل میں منھ ڈھانپے چارپائی پر پڑ گئیں۔ ان کے ابا نے پوچھا کہ کیا ہوا۔ تو وہ بغیر سر اٹھائے بولیں۔

''میں نے سونار بنگلہ کے لئے اپنا تن قربان کر دیا تم سب بھی کچھ قربان کرو۔''

اور جہاں آرا خالہ کے اسکول کے بہاری چوکیدار نے قربانی دے دی۔ اسے درخت سے باندھ دیا گیا اور اس کے سامنے اس کی بیوی کے ساتھ زنا ہوا۔ اس کے بعد اس کی دو کم سن بیٹیوں کے ساتھ یہی بربریت کی گئی۔ چوکیدار خدا کو پکارتا رہا۔ اس دھرتی کو چھوڑنے پر رویا جہاں اس کے ماں باپ دفن تھے۔ اس کے بعد اس چوکیدار کا گلا کاٹ دیا گیا۔ آہستہ آہستہ اور بیدردی سے۔

خیالوں کی زنجیر اچانک ٹوٹ گئی۔ پیچھے کیوبکل سے زنجیر کھینچنے اور پھر فلش کے تیز پانی گرنے کی آواز آئی۔ ایک دبلی پتلی انگریز عورت وہاں سے نکلی اور مہرانسا سے ذرا فاصلے پر بیسن میں اپنے ہاتھ دھونے لگی۔ عورت کی آنکھوں کے گرد سیاہی مائل حلقے تھے اور آنکھوں کے نچلے پپوٹے بوجھل ذرا سوجے ہوئے جو اکثر راتوں کو جاگنے کی وجہ سے ہو جاتے ہیں۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔

''ہلو۔ مہرالنسا۔ مجھے گمان ہوا کہ تم ہی ہو۔''

''جورجینا! تمھیں دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ عراق میں جنگ کے خلاف جلوس میں ہم دونوں شریک تھے۔ ہے نا؟''

''ہاں۔ ہاں۔ اسے کیسے بھلا سکتے ہیں۔ دیر تک ساتھ چلتے رہے۔ اچھی طرح یاد ہے۔ آج بہترین دعوت ہوئی۔'' جورجینا کاغذی دستی تولئے سے اپنا ہاتھ خشک کرتے ہوئے بولی۔

''اس دن تمہارے ساتھ تمہاری بیٹی بھی تھی۔ وہ بھی آئی ہے؟ جلوس کے بعد ہم دونوں ٹرین میں لندن سے ساتھ برمنگھم واپس آئے تھے۔'' مہرالنسا بیسن میں لگے نلکے کو بند کرتے ہوئے بولی۔

''نہیں۔ وہ نہیں آئی۔ حالانکہ فردوسی سے اس کی پرانی دوستی ہے۔ میری بیٹی کی شادی ختم ہو گئی ہے۔'' جورجینا اس طرح بولی جیسے اس کی بیٹی کی شادی کا ٹوٹنا کوئی معمولی بات تھی۔

جورجینا کے چہرے پر جو مصنوعی مسکراہٹ تھی مہرالنسا کے لئے اسے سمجھنا مشکل نہیں تھا۔

''مجھے افسوس ہوا۔''

''میری بیٹی غم زدہ نہیں ہے۔ اس کا خاوند کسی اور عورت کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ بیٹی برداشت نہیں کر سکی۔ اس کے دو بچے ہیں۔ نہ جانے وہ کس طرح ان کی دیکھ بھال کرے گی اور وہ بھی اکیلی۔ پھر کبھی ملاقات ہوگی۔''

جورجینا بولی اور لیڈیز روم کے باہر چلی گئی۔

جہاں آرا، نثار، فوجی ایکشن، مشرقی پاکستان، بنگلہ دیش اور اب یہاں انگلینڈ میں اتنے سارے سال سے دشوار زندگی اور عراق میں جنگ کے خلاف جلوس میں شرکت۔ کیوں گئی تھی وہاں؟ اتنے دنوں سے لندن جانا نہیں ہوا تھا اور گھر کے مسائل سے مہرالنسا کا دل گھبرا گیا تھا۔ جوان بیٹا منان جس کا کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا، کبھی وہ عربوں کی طرح گھٹنوں تک کا لمبا کرتا پہنے ہوئے ہوتا اور کبھی اپنے سر کے بال سرخ رنگ سے رنگ لیتا۔ پوچھنے پر کہتا کہ ریستوراں میں انوکھا نظر آنے سے گاہکوں کا دل بہلتا ہے۔ خیریت ہوئی یہاں نہیں ساتھ آیا ورنہ یقیناً نظر بچا کر کسی انگریز ویٹریس کو رجھانے کی کوشش کرتا۔ مہرالنسا سوچتی ہوئی اپنی میز کے پاس چپ چپ سی آکر بیٹھ گئی۔ ہال میں جاتے وقت اس نے ایک بار پھر نثار پر نگاہ ڈالی۔ اس نے بھی اس کی جانب چونک کر دیکھا۔ نثار کے ماتھے پر کسی سوچ کی وجہ سے شکنیں پڑ گئیں۔

خلیل واپس فوئر میں آ گیا۔ نثار کو اداس اور کسی سوچ میں ڈوبا دیکھ کر اس نے پوچھا۔

''کیپٹن نثار۔ کیا سوچ رہے ہو؟'' خلیل نے پوچھا۔

''کیپٹن نہیں صرف نثار علی۔ تاش کے پتوں سے جوا کھیلنے میں ماہر۔'' نثار اپنی سوچ میں کھویا ہوا بولا۔

اچانک ہال سے ایک دبلا پتلا اور لمبا نوجوان نکلا۔ جسم پر سفید سوٹ اور سرخ قمیص۔ ٹائی سے بے نیاز۔ چھریرا بدن اور چمکتی ہوئی آنکھیں۔ وہ بڑی جلدی میں تھا۔ خلیل کو دیکھ کر ہلو انکل بولا اور فوئر کی سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ واپس ہوا تو اس کے ساتھ دبلی پتلی جوان لڑکی تھی۔ کسی ہوئی سیاہ جینس اور نیلے رنگ کی قمیص میں ملبوس۔ مرجھایا ہوا گندمی رنگ اور بڑے بڑے پستان۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور اس کی آنکھیں جھکی تھیں چہرہ بھی مغموم تھا۔ ہال کے دروازے کے پاس وہ رک گئی اور بڑی منت سے بولی۔

''نفاست۔ میں اندر نہیں جا سکتی۔''

''نسیمہ۔ احمق مت بنو۔ میں نے تمہیں دعوت دی ہے۔ تم بن بلائے نہیں آئی ہو۔''

''نہیں۔ پھر بھی۔ بس یہ تحفہ دولہا دلہن کو دے دینا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے چمکیلے کاغذ میں لپٹا ایک ڈبہ نفاست کے ہاتھ میں دے دیا اور اپنی آنکھیں خشک کرتی ہوئی سیڑھیوں سے ہوٹل کی نچلی منزل کے فوئر میں اتر کر تھکی سی صوفہ پر بیٹھ گئی۔

نفاست کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے اچٹتی ہوئی نگاہ خلیل اور نثار پر ڈالی اور ہال کے اندر چلا گیا۔

''یہی نفاست ہے۔ سعادت کا بیٹا۔''

''اور وہ لڑکی کون تھی؟'' نثار نے پوچھا اور جیب سے رومال نکال کر اپنا منہ خشک کرنے لگا۔

''وہ نسیمہ ہے۔ اس شہر میں کئی سال پہلے ڈرامہ فیسٹیول میں وہ اپنے کالج کی ٹیم کے ساتھ آئی تھی اور آرتھر ملر کے ڈرامہ Crucible میں اس نے اداکاری کی تھی۔ لگتا ہے نفاست اسے اچھی طرح جانتا ہے۔ لیکن اتنی دیر سے کیوں آئی اور ہال کے اندر بھی نہیں گئی؟'' خلیل کے چہرے پر نہ سمجھنے کی وجہ سے شکنیں تھیں اور وہ نیچے نسیمہ کی جانب دیکھ رہا تھا۔ جہاں وہ بیٹھا تھا وہاں سے نچلی منزل کا فوئر صاف نظر آتا تھا۔

''خلیل۔ انسان کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ اور وہ بھی ان دنوں جب کہ دنیا اتنی پیچیدہ ہو چکی ہے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ ایک اور رس ملائی کے ڈش کی خواہش ہو رہی ہے۔'' نثار پینٹری کی جانب دیکھ رہا تھا۔ جہاں مرد و عورت ویٹر خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

''جاؤ لے لو ایک ڈش۔ شاید بچ رہی ہو۔''

نثار اٹھ کھڑا ہوا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا پینٹری میں گیا۔ جہاں سنک میں اور زمین پر بڑی بڑی دیگچیوں کے ساتھ جوٹھے برتن پڑے تھے۔ مرد و عورت ویٹرس خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ایک بڑی میز پر رس ملائی کی ڈشیں پڑی تھیں۔

''کیا میں رس ملائی کی دو ڈش لے سکتا ہوں؟''

''آپ بھی لے لیں۔ ہم نے بھی ذرا چکھی ہے۔ اچھی ہے۔'' خوبرو ویٹرس نے جواب دیا۔

''تم سے کم۔'' نثار نے چھیڑا۔

''یقیناً'' ویٹرس خوش ہو کر بولی۔

نثار دو ڈش لے کر آ گیا۔ اور ایک خلیل کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

''تم نے اسکواش نہیں پی۔ میں اکیلا ندیدوں کی طرح نہیں کھا سکتا۔ تم بھی کھاؤ۔ میری خاطر ہی سہی۔''

خلیل نے لے لیا اور جب رس ملائی اس کے منہ میں گھلنے لگی تو کچھ سوچتے ہوئے اس نے کہا۔

''ڈھاکہ میں کالا چند کے رس گلے یاد آ رہے ہیں۔''

''یہاں وہ آ جاتا تو اس کی دکان بھی انبالہ سویٹ میٹ والوں کی طرح خوب چلتی۔''

''لطف کی بات ہوتی اگر اس کی دکان لندن میں انبالہ سویٹ میٹ کی دکان کے سامنے ہوتی۔ ہے نا نثار؟''

''ہاں۔ اچھا ہوتا۔ ڈرمنڈ اسٹریٹ میں اس کے سامنے دیوانہ بھیل پوری کی دکان ہے۔ میں عامرہ سے شادی کے بعد وہاں گیا تھا۔ میں نے بیوی سے کہا کہ ایسا کھانا تمھیں کھلاتا ہوں کہ ہم دونوں پر دیوانگی طاری ہو جائے گی۔ بیوی نے کہا کہ کیا بعد میں وہاں بستر بھی ہوگا۔'' نثار کے چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

خلیل کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ''تمہاری بیوی کی خوش مزاجی کا میں قائل ہوں۔''

''اس سے شادی کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔''

''اور کیا وجوہات تھیں۔''

''اتنی مدت ہو گئی لیکن اب بھی رات کو سونے سے پہلے جسم پر خوشبودار تیل ملتی ہے۔ بستر اور تکیہ بھی عطر کی خوشبو سے بسے ہوتے ہیں۔ اگر کبھی بھی برج میں پیسے ہارتا ہوں تو برا نہیں مانتی۔''

''کیوں ماننے لگی برا۔ اسی برج میں جیتے ہوئے پیسوں سے ٹھاٹ کرتے ہو۔''

''نہیں خلیل اس سے ٹھاٹھ نہیں ہوتی۔ میں نے جن ڈاکٹروں کے اشتراک سے ضعیفوں کی رہائش کے گھر خریدے ہیں۔ اصل آمدنی کا ذریعہ وہی ہیں۔ عجیب بات ہے زندگی میں تنگی کبھی نہیں ہوئی۔ حالانکہ جب فتح پور میں زمینداری کا خاتمہ ہوا تھا تو ابا گھر میں اعلان کر رہے تھے۔ ہم فقیر ہو گئے۔''

''وہ تو بہت پرانی بات ہو گئی۔''

''ماضی کب پرانا ہوتا ہے۔ پلک جھپکتے ہی سامنے آ جاتا ہے خلیل۔''

خلیل خاموش رہا۔ ہال کے دروازے پر جو لوگ کھڑے تھے وہ تالیاں بجا رہے تھے اور مہمانوں کی آواز آ رہی تھی۔ ''رحیمہ۔ اور بجاؤ۔ پلیز۔ وہ بجاؤ۔''

''کسی بنگلہ گانے کی دھن بجاؤ۔ میں گاتی ہوں۔'' کسی عورت نے گانا

شروع کر دیا تھا۔

''اماں۔ اس گانے کی یہاں ضرورت نہیں ہے اور یہ بہت پرانا گیت ہے۔'' بیٹی نے ماں سے کہا۔

خلیل کے جسم میں حرارت جاگ اٹھی تھی۔ ''نثار۔ تم نے سچ کہا۔'' وہ بولتا ہوا اٹھا اور دروازے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ رحیمہ کے پاس ہلکے سبز رنگ کی ساری میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر کی وہی عورت کھڑی تھی جو کچھ دیر پہلے نثار کے سامنے سے گذری تھی۔ وہ آہستہ آہستہ گا رہی تھی۔ رحیمہ اس گانے کی لے پیانو پر بجانے کی کامیاب کوشش کرنے لگی۔ لڑکیوں نے چور نگاہوں سے انگریز مہمانوں کی جانب دیکھا۔ جیسے اس اجنبی دھن کے بجنے سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ رحیمہ کا خاوند بھی پیانو کے پاس سے ہٹ گیا تھا۔

خلیل کے چہرے پر معصوم سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ کسی بھولی بسری یاد کا جھونکا آیا اور اسے مسرور کر گیا۔ ڈھاکہ میڈیکل کالج یاد آ گیا۔ 1915 یا 1925 میں وہاں کوئی فنکشن ہو رہا تھا۔ پھونس کے بنے ہوئے بیرک نما ہوسٹل کے درمیان کھلی جگہ میں اسٹیج بنا تھا جس کی روشنی رات کو منور کر رہی تھی۔ اور اس پر دو جوان لڑکیاں ہارمونیم اور ڈھولک کی آواز کے ساتھ ناچ رہی تھیں اور ایک گورا چٹا ان کا ہم عمر لڑکا اسی گیت کو گا رہا تھا۔ لڑکیوں نے اپنی دھانی رنگ کی ساریوں کے آنچلوں کو اپنی کمر کے گرد اڑس لیا تھا۔ اور لڑکا پھٹی ہوئی بنیائن اور لنگی پہنے ہوئے تھا۔ بنگال کے کسانوں کا معمولی لباس۔ کوئی تزک بھڑک نہیں۔ لیکن آواز میں خود اعتمادی اور جوش۔ لڑکیوں کے پیر ایک ساتھ تھرکتے۔ ان کے ہاتھ ہوا میں بلند ہوتے جیسے آسمان سے کچھ بٹور رہی ہوں اور پھر ان کے ہاتھ ایک دوسرے کی جانب بڑھتے۔ جیسے خوشی کا جو خزانہ انھیں وہاں ملا اسے ایک دوسرے پر نچھاور کر رہی ہوں۔ آج کی طرح اس دن بھی اس گانے کے الفاظ کو وہ نہیں سمجھ سکا تھا۔ لیکن اس کی لے میں جو ولولہ تھا۔ لڑکیوں کے رقص اور گانے میں جو سرشاری تھی وہ اس کی روح میں اتھتی کسی ترنگ سے ہم آہنگ ہو گئی تھی۔ یہ سادہ لوگوں کی سرزمین ہے اور یہ آواز ان ہی لوگوں کے دل کی ہے۔

اس رات اس نے سوچا تھا۔ خلیل اداس سا چلتا ہوا واپس آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

''کیوں۔ گانا پسند نہیں آیا؟''

''نہیں نثار۔ کچھ یاد آ گیا۔''

''کیا؟''

''جھوٹ کہوں یا سچ۔''

''دونوں کو ملا کر۔ بات چیت میں دل چسپی کا گر یہی ہے۔''

ہال کے اندر سے ڈاکٹر مینا نکل آئیں۔ کچھ دیر پہلے دلہن کا باپ سعادت ان ہی کی تعریف کر رہا تھا۔ انھوں نے خلیل پر کسی پرانی شناسائی کی نگاہ ڈالی۔ مدت ہوئی وہ لیڈیز یونیورسٹی میں میڈیکل آفیسر تھیں۔ خلیل بھی وہیں سیاسیات کا اسسٹنٹ پروفیسر تھا۔ دونوں کا اکثر ملنا جلنا ہو جاتا تھا۔ سعادت کے گھر میں بھی ان سے ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ وہ جب پاس سے گذریں تو خلیل نے پوچھا۔

''گانا پسند نہیں آیا۔ کیا گھر جا رہی ہیں؟''

''نہیں نہیں۔ اچھا ہے۔ میرے پڑوسی سیاحت کے لئے گئے ہوئے ہیں اور اپنا کتا ہمارے پاس چھوڑ دیا ہے۔ اس کے کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔''

مینا بولتی ہوئی سیڑھیوں پر اتر گئیں۔

نثار اپنی ٹھنڈی انگلی سے سہلاتا ہوا انھیں دیکھتا رہا جب تک کہ وہ سیڑھیوں پر سے غائب نہیں ہو گئیں۔

''لگتا ہے اس عورت کو انسان اور جانور دونوں سے محبت ہے۔''

''تم مردم شناس ہو۔ مینا کے گھر میں کتا، بلی اور رنگین پروں والی چڑیاں بھی ہیں۔''

''یعنی ٹمس Tits چہکتی رہتی ہیں اور اپنے رنگوں سے لبھاتی بھی ہیں۔''

نثار نے اس جوان ویٹرس کے سینے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا جو چائے کے برتنوں کا طشت اٹھائے پاس سے گذر رہی تھی۔

''تم Dirty Old Man بن چکے ہو نثار۔''

''کون نہیں ہوتا۔ پارسائی کا دعوہ کرنے والے بڈھے جو پانچ وقت ٹکریں مارتے رہتے ہیں۔ کیا انھوں نے کبھی اپنی جنسی کیفیتوں کے بارے میں لکھا ہے؟ ہو سکتا ہے سعادت سے مینا محبت کرتی ہو۔ اور اب بھی اس میں کمی نہیں آئی ہے۔''

''دونوں دوست کیوں نہیں ہو سکتے؟''

''ہاں۔ اگر دونوں کی ازدواجی زندگی میں خلا ہے تو ممکن سمجھنا چاہیے۔ اس کا خاوند نظر نہیں آیا۔''

''میں نے بھی اسے سعادت کے گھر میں کبھی نہیں دیکھا ہے اور نہ ہی اس کا ذکر سنا۔''

''اس ملک میں اس کی اہمیت اتنی نہیں۔''

''تم نے وقت نہیں گنوایا ہے۔ نثار۔ سوچتے اور سمجھتے رہتے ہو۔''

''فوج کی نوکری ساری عقل نہیں کھا لیتی۔'' نثار نے جواب دیا اور خلا

میں تکتے ہوئے بولا۔ ''مرد وعورت کی دوستیوں کی نوعیت بھی عجیب ہوتی ہے۔ مرد صرف تین چار ہی سے دوستی کرتے ہیں اور اسے نبھاتے ہیں۔ اور عورتیں جلد ایک دوسرے کی دوست بن جاتی ہیں اور جب تک سامنے ہوں رفاقت نبھاتی ہیں پھر ایک دوسرے کو بھولتے دیر نہیں لگتی۔ میری بیوی جہاں کہیں بھی رہی اس نے دیگر عورتوں کے ساتھ مل کر قرآن خوانی کے حوالے سے دوستیاں قائم کیں۔ لیکن جب اس شہر سے دوسرے شہر جانا ہوا تو ان سب کو بھولتے دیر نہیں لگی۔''

خلیل نے جواب نہیں دیا۔ گو وہ اور نثار ایک دوسرے سے مختلف ہو چکے تھے پھر بھی بچپن کی دوستی اسی طرح مستحکم رہی۔ خلیل کے گھر میں اب بھی فوجی وردی میں ملبوس نثار کی وہ تصویر تھی جو فوج میں کمیشن ملنے کے بعد لی گئی تھی۔ دل کی کون سی ایسی بات تھی جو اس نے نثار سے نہیں کہی۔ یہاں تک کہ اسے یہ بھی بتادیا تھا کہ عمر کے ساتھ بیوی سے ایک عجیب سی دوری ہوتی جا رہی ہے۔ نثار نے اسے سبق دیا کہ محبت کیا ہے اسے سمجھنا مشکل ہے۔ خلیل کی شناساؤں میں حباب نام کی ایک بیوہ عورت تھی۔ جس سے فلسطینیوں سے چندہ جمع کرنے کے سلسلے میں اکثر ملتا رہتا تھا۔ جس کی خبر اس کی بیوی کو نہیں تھی۔ نثار اس سے کہتا تھا کہ ان خفیہ ملاقاتوں کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے دل میں بیوی سے محبت ختم ہوگئی۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ خلیل کا حباب سے ملنا آسان کردیا کرتا تھا۔ خلیل بیوی سے کہتا کہ نثار سے ملنے جارہا ہوں لیکن حباب کے یہاں جا پہنچتا۔ جس کا گھر عجیب سی جگہ تھا۔ اور اس کی رہائش اس سے بھی عجیب۔ دیواروں پر خطاطی کے اعلےٰ نمونے اور ریگستان کے مناظر۔ منقش جلدوں میں بندھے قرآن اور ہائی فائی سے شیریں قرأت کی اٹھتی آواز۔ اس نے اس سے ملنے جلنے میں کبھی پابندی نہیں محسوس کی۔ خاموشی اس کا مرض تھا یا اس کی عادت۔ ہلکی سی مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتی۔ لاونج کی جانب اشارہ کرتی جہاں قالین اور بڑے بڑے کشن ہوتے، وہاں جا کر وہ بیٹھ جاتا۔ اسے کھانا اور چائے ملتی اور اکثر شیریں قرأت اسے سننی پڑتی۔ اس کا ماضی کیا تھا اور حال کیا ہے ان سے حباب کو غرض نہیں تھی۔ زیادہ تر وہی باتیں کرتا رہتا۔ فلسطینیوں کے لئے چندہ جمع کرنے کی مہم، مشرق وسطیٰ کی سیاست، سمرقند، بخارا، اسپین اور مراکش کی سیاحت موضوع گفتگو ہوتے۔ خلیل بیوی سے علیحدگی پسند نہیں کرتا تھا۔ انگلستان میں جب تنگ دستی نے آن گھیرا تو گذر اوقات بیوی کی اس کمائی سے ہوئی تھی جسے وہ سیلز گرلز کی حیثیت سے کماتی تھی۔ اس کے علاوہ نثار بھی اس کی مدد کردیتا تھا۔

''مجھے اکثر خیال آیا ہے کہ عورت جب خود کفیل ہوجاتی ہے پھر اس کا خاوند وہ عام انسان بن جاتا ہے جس نے اپنا حیاتی فرض نبھادیا اور اس کے بعد بیوی کی زندگی میں Facade بن کر رہ گیا۔ اسی لئے مینا کے ساتھ اس کے خاوند نے دعوت میں شرکت کو ضروری نہیں سمجھا۔''

''خلیل۔ شادی عورت کے لئے پنجرہ ہے۔''

''جبھی تو ابسن نے گڑیا کا گھر نام کا ڈرامہ لکھا۔ جس کی ہیروئن اس گھر کو چھوڑ کر نکل جاتی ہے جس میں وہ ایک مدت سے بیوی اور ماں بن کر رہ رہی تھی۔''

نثار ہنس پڑا اور بولا۔

''تو تمہارے خیال میں مینا گڑیا گھر سے نکل آئی ہے۔''

''مکمل طور سے نہیں۔ بیٹا موجود ہے جو امریکہ میں رہتا ہے۔ خاوند سے علیحدہ ہوکر اسے صدمہ نہیں پہنچانا چاہتی۔'' خلیل نے اپنی کنپٹی سہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''میں نے ہمیشہ ہندوؤں سے دوری محسوس کی ہے۔ میں وہ دن نہیں بھول سکتا جب کانگریس نے 1973 میں انتخابات جیتنے کے بعد زمینداری کا خاتمہ کردیا تھا۔ اس دن ابا جان کو جو پریشانی ہوئی وہ اب بھی نگاہوں کے سامنے پھرتی رہتی ہے۔ تمہیں تو یاد ہوگا ان کا بھاری جسم تھا۔ اس دن وہ بے چینی سے گھر کے اندر برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ ان کا منہ کھلا تھا۔ نفاست پسند ابا کا سفید کرتا اور پائجامہ بھی اس دن میلا سا تھا۔ وہ اپنا سر ہلاتے اور اماں سے کہتے۔ ہم فقیر ہوگئے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے بعد گاؤں سے بیل گاڑیوں پر غلے کی بوریاں، گھی، رسیاؤ سے بھری ہانڈیاں اور گڑ آنا آہستہ آہستہ بند ہوگیا۔ اور کبھی گاؤں جانا ہوا تو پالکی کے لئے کہار مشکل سے ملتے تھے۔''

''جھولتے ہوئے پالکیوں میں جانا۔ کہاروں کی ہیا ہیا کی آواز۔ ان کے تیز قدموں کی چاپ۔ اردگرد کھیتوں کی ہریالی۔ سچ پالکی کا سفر عمدہ ہوتا تھا۔ وہ دنیا ہی ختم ہوگئی اور وہ بھی اتنی بیدردی سے۔'' خلیل نے سوچتے ہوئے کہا۔

''قصور مینا کے مذہب ماننے والوں کا ہے۔ گاندھی جی نے ہندوستان کی آزادی کو رام راج سے عبارت کیا اور جناح صاحب نے مسلمانوں کی الگ ریاست پاکستان کی طلب شروع کی۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ سنتے ہیں جب پاکستان بنا تو گاندھی جی ہنس رہے تھے اور مذاق کر رہے تھے۔''

''دل رو رہا ہوگا۔'' خلیل نے جواب دیا۔

''میاں تم ایسے لوگوں کی چالاکیاں نہیں سمجھ سکتے۔ اور ان کا چپ

کاروزہ۔ لیڈر ان سے اہم بات کرنا چاہتے ہوں اور مکمل خاموشی ان کا روزہ ہو۔''

''نثار۔ مکمل خاموشی سے گہری سوچ کا موقعہ ملتا ہے اور وہ جسے انرجی کہتے ہیں وہ بھی بیکار صرف نہیں ہوتی۔'' خلیل نے جواب دیا اور ساتھ ہی اس کی نگاہ نیچے فوئر میں گئی۔ نسیمہ کے پاس مینا کھڑی تھیں۔ دوری کی وجہ سے وہ ان کی باتیں نہیں سن سکا۔

''تم اوپر کیوں نہیں آئیں؟'' مینا پوچھ رہی تھیں۔

''نفاست کے والد مجھ پر نگاہ ڈالنا بھی پسند نہیں کرتے۔ اور...'' نسیمہ نے مرجھائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''اور کیا؟''

''ان کی شکل ڈیڈ سے بہت ملتی ہے۔''

مینا ہنس پڑی۔ نسیمہ کے والد سے کبھی اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ لیکن یہ سن کر کہ وہ سعادت سے ملتا جلتا ہے اسے ہنسی آئی۔ کیا وہ بھی اپنی بیوی پر سبھوں کے سامنے غصہ سے چیخ پڑتا ہوگا۔ اور اگر وہ مجھ سے کبھی ملتا تو سعادت ہی کی طرح اس کی گفتگو میں نرمی ہوتی۔ مینا نے سوچا۔

''تم میرے گھر بھی اب نہیں آتیں؟''

نسیمہ نے مینا پر اداس نگاہ ڈالی جہاں اسے ننھے سے بچے کے چہرے جیسی معصومیت نظر آئی۔ مینا کی آنکھوں میں نرمی تھی اور شفقت کی جھلک۔ نسیمہ ان کی اس دن سے ممنون تھی جب ہسپتال میں ان سے پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔ بعد میں ان سے ربط وارتباط بھی ہوگیا۔ ان سے باتوں باتوں میں کبھی پتہ چلا تھا کہ وہ نفاست کے کنبہ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ نسیمہ نے لمبی سانس لی اور بولی۔

''ملنے کے لئے دل ضرور چاہتا ہے اور آپ سے کچھ کہنے کی بھی خواہش ہوتی ہے۔ لیکن ہمت نہیں پڑتی۔ آخری بار جب آپ کے گھر آئی تو وہاں سعادت کے والد بھی موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ مجھے تو ڈر ہوا کہ کہیں مجھے سخت سست نہ کہنے لگ جائیں۔ اس کے علاوہ نریش مجھے دیکھ کر عجیب سے ہو جاتے ہیں۔ جیسے میرا آنا انھیں بہت برا لگتا ہے۔''

''بیوقوف۔ میرے سامنے سعادت تمہیں کبھی برا بھلا نہیں کہہ سکتے۔ اور میرا اپنا نریش تو ہے ہی پگلا۔ تو جانتی ہے۔ ان سب کی فکر مت کر۔ جب بھی جی چاہے چلی آ۔''

نسیمہ کے شانے پر مینا کا جو ہاتھ تھا اسے اس نے پکڑ لیا۔ نرم ہاتھوں کی گرمی سے اسے توانائی کا احساس ہوا۔ ان ہاتھوں کے سہارے کی اسے اب بھی ضرورت تھی۔ اس کے پتلے لب کھلے جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ لیکن مینا جلدی جانا چاہتی تھی۔

''تم میرے گھر آنا ضرور۔ مجھے انتظار رہے گا۔ بائی۔'' اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے مینا نے کہا اور لیڈیز روم کی جانب چلی گئیں۔ نسیمہ کچھ دیر تک انھیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ ہلکے سرخ رنگ کے کوٹ پتلون میں ان کا فربہ جسم جلد ہی آنکھوں کے سامنے سے گم ہوگیا۔

نسیمہ نے نفاست کو سیڑھیوں پر اترتے دیکھا۔ وہ اس کے پاس آیا اور سامنے صوفہ پر بیٹھ گیا۔ اس کے جیکٹ کے کالر میں دلہن کے دیگر قریبی رشتہ دار مردوں کی طرح سرخ گلاب لگا تھا۔ چہرے پر تھکان تھی اور سر کے بال ذرا الجھے ہوئے تھے۔ مہمانوں کو خوش آمدید کہنا اور ہوٹل میں مختلف ضرورتوں کی وجہ سے بار بار اوپر نیچے جانا۔ ان سب سے وہ تھک گیا تھا۔ طبیعت بحال کرنے کے لئے وہ عمدہ سگریٹ پی رہا تھا جس کا خوشبودار دھواں نسیمہ کے گرد پھیل گیا۔

''تمہیں سگریٹ پیتے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

''کبھی کبھی خاص موقعوں پر پی لیتا ہوں۔'' نفاست بولا اور سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر اس نے گفتگو جاری رکھی۔ ''افسوس شادی کا دن ہے ورنہ ڈیڈ سے لڑائی ہو جاتی۔ آج کی دعوت کے سارے اخراجات میں نے برداشت کیے ہیں۔ میں جسے چاہوں بلا سکتا ہوں۔ ڈیڈ مجھ سے پوچھنے لگے۔ تمہیں میں نے کیوں مدعو کیا؟''

نسیمہ کے دل میں برچھی پیوست ہوگئی۔ ساتھ ہی اسے بے عزتی کا بھی احساس ہوا۔ اس کے لب کپکپائے اور ہاتھ میں لرزش ہوئی۔ اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ سعادت کی نگاہ میں وہ اچھی عورت نہیں تھی۔ چونکہ وہ اپنا گھر چھوڑ کر آزادانہ زندگی گذار رہی تھی۔ اور جس کا اپنے والدین سے ملنا جلنا نہیں تھا۔ باپ بیٹے میں اس کی وجہ سے کشیدگی ہو اس نے کبھی نہیں چاہا تھا۔ وہ ایک ہی بار نفاست کے ساتھ اس کے والد کے گھر گئی تھی۔ جب پوچھنے پر اس نے اپنے باپ کا نام بتایا اور ساتھ ہی کہا کہ نہ صرف باپ بلکہ ماں سے بھی اس کا ملنا جلنا نہیں ہے اور جب اس سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے کہا کہ وہ اس کی زندگی میں رخنہ ڈال رہے تھے۔ تو سعادت میں بے رخی آ گئی۔ وہ نفاست ہی سے باتیں کرتا رہا۔ نفاست کی ماں اپنے خاوند کی خواہشوں کی پابند تھی۔ اس کے ماتھے پر بل تھے اس نے نسیمہ سے محض رسمی باتیں کیں۔ دونوں میں سے کسی نے نہیں پوچھا کہ اس کی دلچسپیاں کیا ہیں۔

دنیا کے کن ملکوں کی اس نے سیر کی ہے اور ملک کے معاشرہ کی بابت اس کے کیا خیالات ہیں۔ اس کے بعد ان کے گھر اس کا جانا نہیں ہوا۔ وہ نفاست سے تھیٹر میں مل لیتی تھی۔ اس کے فلیٹ میں ویک اینڈ یا کوئی دن گذر جاتا تھا۔ یہی کافی تھا۔

''نفاست۔ مجھے مدعو کرنے کی تمہیں ضرورت نہیں تھی۔ مجھے پتہ تھا کہ اگر انھوں رانے نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو ان کا کیا رویہ ہوگا۔ اسی لئے اوپر نہیں آئی۔''

''تم جانتی ہو میں جھوٹ نہیں بولتا۔ اگر میں ڈیڈ سے نہیں کہتا کہ تم بھی یہاں ہو تو دل پر بوجھ رہتا۔ میں ویٹرس سے کہتا ہوں کہ وہ تمہارے لئے یہاں کھانا لے آئے۔''

نسیمہ نے ہاتھ اٹھا کر منع کیا۔ حالانکہ وہ وہ بھوکی تھی۔ صبح اس نے محض چائے پی تھی اور اس وقت عمدہ کھانے کے تصور سے اس کی آنتیں سکڑ رہی تھیں۔ لیکن وہ اس دعوت کا کھانا نہیں کھا سکتی تھی جس میں اس کی شرکت نا قابل قبول ہوتی۔ اس لئے شادی کی دعوت میں شریک ہونا اس کے لئے ناممکن تھا۔

''نفاست۔ تم بارمین سے کہو کہ وہ میرے لئے سینڈوچز اور کافی لے آئے۔''

نفاست سمجھ گیا کہ اصرار کرنا بے کار ہے۔ وہ کبھی نہ مانتی۔ نسیمہ فیصلہ کر لینے کے بعد اسے کبھی نہیں بدلتی تھی۔ بار ساتھ ہی کے کمرے میں تھا نفاست وہیں چلا گیا۔ نسیمہ نے لمبی سانس لی۔ اس کی آنکھیں جن میں ہمیشہ اداسی رہتی تھی وہ اور غمگین ہو گئیں۔ وہ اس دن کی بابت سوچنے لگی جب وہ گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے نکل گئی تھی۔ اسے پتہ تھا کہ ڈیوڈ سے اس کی دوستی کی بابت نفاست کے والدین ایک دن جان جائیں گے۔ لیکن اسے پرواہ نہیں تھی۔ آزاد زندگی کی راحت میں سب کچھ تھا۔ تھیٹر میں اس کے کام کے اوقات شام کے پانچ بجے سے رات کے ساڑھے گیارہ تک تھے۔ پاس ہی بار بھی تھا جہاں سے تماشائی وسکی اور وائن ہاتھ میں لئے اس کمرے میں آجاتے جہاں کلوک روم تھا اور کاؤنٹر کے پیچھے نسیمہ۔ تھیٹر کے یونیفارم میں ملبوس جس پر اسٹیفن جوزف تھیٹر سرخ دھاگوں سے لکھا تھا۔ یہ چہل پہل اس کے گھر کی گھٹن سے کہیں بہتر تھی جہاں اس کے والدین کے جھگڑے تاریک جنگل میں درندوں کی چیخ پکار لگتے۔ جہاں جعلی ٹیکس بھرنے کے جرم میں سزا یافتہ باپ تھا اور جو بجائے افسردہ رہنے کے بہت مطمئن نظر آتا۔ اور نا آسودہ، حاسد ماں ہر وقت منہ بگاڑے رہتی۔ بچپن میں اسے کہا گیا تھا کہ اسے ڈاکٹر بننا ہے اور اپنی دانست میں اس نے کوشش بھی کی لیکن شروع ہی سے اسکول اور کالج کی تعلیم میں اس کا دل نہیں لگا۔ کسی طرح یونیورسٹی پہنچ گئی۔ جہاں ڈیوڈ ملا اور اس کی محبت بھی۔ پھر پڑھائی میں اس کی دل چسپی ختم ہو گئی۔ محبت ہی دنیا تھی۔ وسیع اور گہری۔ جہاں پنجرہ نما گھر نہیں تھا اور جہاں ماں باپ کے فساد اس کی روح میں زخم نہیں لگا سکتے تھے۔ تھیٹر کے کام میں کچھ ایسا نیا پن تھا کہ ماں باپ کی یاد کبھی آئی بھی تو اسے اداسی نہیں ہوئی۔

زندگی کبھی یکساں نہیں رہتی۔ دھوپ چھاؤں سے ہی زندگی عبارت ہے۔ کبھی روشنی اور کبھی تاریکی انسان کا مقدر ہے۔ ڈیوڈ کسی نجی کام سے لندن گیا۔ وہاں دہشت گرد نے جب اس زمین دوز ٹرین میں بمباری کی جس میں وہ سفر کر رہا تھا تو دوسروں کے ساتھ وہ بھی مارا گیا۔ نسیمہ نے جب خبر سنی تو اس کا کمرہ تاریک قید خانہ بن گیا اور اس کی آہ و بکا پاگل چڑیوں کی طرح دیواروں سے سر مارنے لگی۔ جب وہ لندن گئی تو اسے ہسپتال کے سرد مردہ خانے میں اس کا حسین محبوب مسخ شدہ لاش کی شکل میں ملا۔ خون آلودہ پچکا سر اور دھنسی چھاتی۔ ٹوٹی ہوئی ٹانگیں اور زخموں سے بھرا جسم۔ نسیمہ کی آنکھوں میں جتنے آنسو تھے کبھی بہے۔ روح کی آہیں مسلسل ہچکیاں بن گئیں۔ ڈیوڈ کے اشک بار والدین نے اسے دلاسہ دینے کی کوشش کی۔ لیکن سب بے سود۔ جب وہ ڈیوڈ کی تدفین کے بعد اسکاربرو واپس آئی تو کچھ دنوں کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ ممکن تھا کہ وہ پاگل بن جاتی لیکن ڈیوڈ کی وفات کے بعد جنھوں نے تعزیت کے کارڈ بھیجے تھے ان میں ایک نفاست کا بھی تھا۔ جس پر لکھا تھا ''میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ زندگی کا دوسرا نام ہمت ہے۔'' اس مختصر تحریر میں مقناطیسی کشش تھی۔ نسیمہ نے اسے بار بار پڑھا۔ پھر اس نے سوچا، بہت سوچا۔ آخر اس نے فیصلہ کر لیا۔ ایک غم اور بھی سہی۔ وہ اسقاط کرائے گی۔ ہمدرد ڈاکٹر نے مقامی ہسپتال میں انتظام کر دیا۔ جو جراحت اس پر ہوئی اس کی اذیت کی کھرچیں اس کے دل پر بھی ہوئیں۔ اسی ہسپتال میں بینا بھی کام کر چکی تھیں۔ ایک دن وہ شناسا نرسوں سے ملنے ہسپتال کے اسی وارڈ میں گئیں جس میں نسیمہ تھی۔ جب انھیں پتہ چلا کہ نسیمہ بالکل تن و تنہا ہے تو وہ دل جوئی کے لئے اس کے پاس آ گئیں۔ اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ وہ اس کی ہر طرح معاونت کریں گی۔ جب وہ ہسپتال سے ڈسچارج ہونے لگی تو اسے اس کے فلیٹ میں پہنچا دیا۔ شروع شروع میں ہر روز ان کا فون آتا تھا۔ وہ اس کی خیریت پوچھتیں اور ہمت افزائی کرتیں۔ ایک دن وہ شہد اور پھل لے کر اس سے ملنے آئیں۔ ایسی فکر مندی کیوں؟ نسیمہ نے خود سے خاموش سوال کیا تھا؟ لیکن

مینا سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی اور نہ ہی انھوں نے بتایا۔ تنہائی میں کسی کی غم گساری بہت بڑا سہارا تھی۔ نسیمہ اپنے کام پر واپس آ گئی۔ اور اسے جب کسی نے کہا کہ وہ ڈرامہ میں چھوٹا سا پارٹ کرے تو اسے بڑی حیرانی ہوئی۔ اس وقت تک ایشیائی صرف ان اسٹیج یا ٹی وی ڈراموں میں نظر آتے تھے جن کا تعلق ان کے اپنے معاشرے سے ہوتا تھا۔ اس کا کردار معمولی تھا۔ ہوٹل کی ریسپشنسٹ کی حیثیت سے چند الفاظ اسے کہنے تھے۔ اس کے علاوہ خاموشی سے ڈیسک پر سر جھکائے کاغذات تکتے رہنے کی اداکاری کرنی تھی۔ ڈرامے کا ہدایت کار نفاست تھا۔ جلد ہی دونوں دوست بن گئے ایک ایسی دوستی جس میں ایک دوسرے کی ہمدردی کے علاوہ ہمیشہ ایک دوسرے کی خواہشوں کا احترام رہتا تھا۔ نفاست سے اس نے کچھ نہیں چھپایا۔ ڈیوڈ سے اس کی محبت اور پھر اسقاط بھی کچھ نسیمہ نے اسے بتا دیا۔ پھر بھی نفاست اس سے دور نہیں ہوا۔ وہ اس کا سہارا بنا رہا۔ نسیمہ نے ایک بار پھر زندگی سے محبت محسوس کی۔ جینے میں اسے خوشی محسوس ہوئی۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کے ساتھ جا کر رہنا پسند نہیں کیا۔ وہ اب بھی اپنی آزادی کی قدرداں تھی۔

اس طرح آزاد رہنے میں کوئی پابندی یا کسی کی محکومی نہیں محسوس ہوتی تھی۔ اور اس وقت ہوٹل کے فوئر میں زندگی کا پرانا البم کھل گیا تھا اور سبھی تصویریں سامنے آ گئی تھیں۔ ماں باپ کی بھی یاد آئی جو برے سہی لیکن انھوں نے اس کے ساتھ اپنی دانست میں اچھائی کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور ڈیوڈ جو زندہ ہوتا تو اس کے ساتھ وہی زندگی گذارتی جس کا خواب ہر عورت دیکھتی ہے۔ نسیمہ کا دل بھر آیا لیکن وہ اپنے آنسو پی گئی۔ نفاست آ گیا۔

''تم نے بڑی دیر لگا دی؟''

''وہاں دیوار پر چند تجریدی پینٹنگز تھیں۔ انھیں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔'' نفاست نے بار کی جانب اشارا کرتے ہوئے جواب دیا۔

''میں نے حال ہی میں کہیں پڑھا ہے کہ اس کے محرک مسلمان تھے۔ ان کے محلوں اور حویلیوں میں جو اقلیدسی مصوری ہوتی تھی اسی سے تجریدی آرٹ کی ابتدا ہوئی۔'' نسیمہ نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ مختلف موضوع کے آغاز سے اسے اپنے دل پر سے بوجھ اٹھتا محسوس ہوا۔

''ابھی حال میں مصوری کے کسی مورخ نے لکھا ہے کہ اسلامی مصوروں کا نظریہ تھا کہ جب اقلیدسی مصوری میں نمایاں ہو تو کائنات کی خوش آہنگی اور توازن واضح ہوتا ہے۔ انسان کے تصورات تجریدی ہوتے ہیں اس کے علاوہ دنیا میں جو انتشار رہا ہے اس کا تجریدی فن کے ذریعہ اظہار کرنا آسان ہوتا ہے۔ وہ مصوری جس میں انسان یا حیوان ہوتے ہیں انھیں اسلام کے ابتدائی دور سے برا سمجھا گیا ہے۔ چونکہ انسان یا حیوان خدا ہی تخلیق کر سکتا ہے اور ان میں جان بھرنا اسی کی قدرت ہے۔ جس کا مقابلہ انسان نہیں کر سکتے۔'' نفاست نے کہا اور صوفہ میں دھنس کر بیٹھ گیا اور ساتھ ہی اپنی ٹانگیں پھیلا دیں۔

''کسی فنکار نے کبھی خدائی کا دعوہ نہیں کیا ہوگا۔ فنکار کی روح میں جب ہلچل ہوتی ہے وہ اس کا اظہار اپنے فن میں کر دیتا ہے۔ سسٹائن چیپل کی چھت پر مائیکل انجلو نے خدا، کائنات کی تخلیق اور آدم کی جو عظیم مصوری کی ہے وہ اسی نکتہ کی گواہ ہے۔''

نفاست کا دل خوش ہو گیا۔ اس نے اثبات میں آہستہ سے سر ہلایا۔ اس کی محبوبہ نے ایک بڑی سچائی کا اظہار کیا تھا۔ اس کی روح ایسی ہی سچائیوں کی تلاش میں رہتی تھی۔ نفاست جانتا تھا کہ نسیمہ اپنا تخیل منور کرنے اکثر مقامی لائبریری جاتی رہتی ہے۔ اس کی مسرور آنکھیں نسیمہ سے ملیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں کہ ہم تنہا ہوتے تو میں تمھیں سینے سے لگا لیتا اور کہتا کہ ایسی باتوں سے بھی محبت توانا ہوتی ہے۔

''جب تم روم میں تھیں تو اکثر وہاں سسٹین چیپل میں جانا رہا ہوگا؟''

''اکثر تو نہیں۔ ہاں ایک دو بار ضرور گئی۔ مصور ہوتی تو شاید ہر روز وہاں جاتی اور سارا وقت گذارتی۔''

''کیا تنہا گئی تھیں؟''

''نہیں ڈیوڈ ساتھ تھا۔'' نسیمہ نے دھیمی آواز مین جواب دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے ذکر سے نفاست نے خوشی نہیں محسوس کی ہوگی۔

بار مین سینڈوچز اور کافی لے آیا اور میز پر رکھ کر اس نے ذرا تیکھے لہجہ میں پوچھا۔

''کسی اور چیز کی ضرورت ہے؟''

نفاست نے لمبے تڑنگے بار مین پر نگاہ ڈالی اور منہ سکیڑ کر خشک لہجہ میں بولا۔

''نہیں۔ شکریہ۔''

جب وہ چلا گیا تو نسیمہ بولی۔ ''جب یہ عام سی بات بھی بولتے ہیں تو اس سے ان میں چھپی نسل پرستی عیاں ہو جاتی ہے۔''

''تم نے سچ کہا۔ اگر اس کے لہجہ میں نرمی ہوتی تو کیا بگڑ جاتا۔''

''اتنے سارے کالوں کا ترک بھڑک لباس میں ہونا اور کار پارک میں ان کی شاندار موٹر کاریں۔ وہ رشک و حسد سے جل رہا ہوگا۔ اسی لئے اس کی نسل پرستی اس کی آواز سے ظاہر ہو گئی۔''

''ہوا کرے۔ میں اس کی پرواہ بھی نہیں کرتا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے نظر

انداز کرنا میں نے بہت پہلے ہی سیکھ لیا تھا۔''

نسیمہ آہستہ آہستہ سینڈوچز کھانے لگی اور ساتھ ہی کافی کی چسکیاں بھی لے لیتی۔ گو وہ بات کرتی رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں کی نمی سے نفاست سمجھ گیا کہ وہ بہت غم زدہ ہے۔

''کیا بات ہے نسیمہ؟ تم خود ہی اوپر نہیں آئیں۔ اتنے سارے لوگوں کے درمیان تمہارا دل بہل جاتا۔''

اس کی بات اسے احمقانہ لگی۔ اس کے دل میں آیا کہ وہ نفاست کو ڈانٹ کر کہے کہ تم کیسے بیوقوف انسان ہو۔ ابھی تم اپنے والد کی خفگی کی خبر لائے اور اب مجھ سے پوچھ رہے ہو میں اوپر کیوں نہیں آئی۔ لیکن وہ ضبط کر گئی اور بولی۔

''مجھے تمہارے والد سے ڈانٹ نہیں سننی تھی۔ ہوسکتا تھا کہ وہ نکل جانے کے لئے کہتے۔''

''وہ اتنے گئے گذرے نہیں۔ ایسی خوشی کے موقعے پر اس طرح کی بات کوئی نہیں کہہ سکتا۔''

''کچھ باتیں یاد آگئیں جو نہ آتیں تو اچھا ہوتا۔ لیکن دل پر کسے اختیار ہے اس وقت عجیب سا خیال بھی آرہا ہے۔''

''وہ کیا؟''

نسیمہ کافی کی پیالی میں آہستہ آہستہ چمچ چلانے لگی اس کی نگاہیں کسی سوچ میں غرق جھکی تھیں۔ وہ دھیمی آواز میں بولی۔

''شاید میری زندگی میں بھی ایسا ہی دن آئے۔ میں دلہن بنی بیٹھی ہوں اور اتنے سارے مہمان مجھے مبارکبادیاں دیتے ہوں۔''

''اور دولہا کون ہوتا؟'' نفاست نے مسکرا کر پوچھا اور معنی خیز نگاہوں سے نسیمہ کو تکتے ہوئے کافی کی چسکی اس نے لی۔

''یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے۔'' نسیمہ نے شرمیلی نگاہوں سے نفاست کو تکا اور نیپکن سے اپنے لبوں کو خشک کرنے لگی۔

''ایسا ہوسکتا ہے۔ مستقبل کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کرسکتا۔''

نسیمہ خاموش ہوگئی۔ وہ کافی کی پیالی آہستہ آہستہ گھما رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اداسی گہری ہوگئی۔ وہ دھیمی آواز میں بولی۔

''مجھے اکثر خیال آیا ہے کہ شاید تمہارے والد میرے المناک ماضی کی بابت جانتے ہیں۔''

''تمہیں ایسا شبہ کیوں ہوا؟''

''جب وہ مجھے ملے تو ان کی آنکھوں میں مجھے نفرت نظر آئی۔''

''ہمیں دوسروں کی پرواہ نہیں ہونی چاہئے۔ میں نے انھیں بتایا تھا کہ تمہارا اسقاط ہوچکا ہے۔''

نسیمہ کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہوگیا۔ نفاست کی صاف گوئی اسے کبھی کبھی بہت بری لگتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ نفاست کو ایک تھپڑ جڑ دیتی۔

''تم نے ایسا کیوں کہا؟ تمہیں میری نجی زندگی کا خیال نہیں آیا؟''

''انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ وہ کہاں رہتی ہے تو میں نے بتادیا کہ تم کرائے کے فلیٹ میں رہتی ہو۔ اور پھر انھوں نے سوال کیا کہ کیا وہ کنواری ہے۔ میں نے کہہ دیا نہیں۔ بلکہ تمہارا اسقاط ہوچکا ہے۔ جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔''

''نفاست۔ تم احمق ہو۔ نرے احمق۔ تم انسانی زندگی کی گہرائیوں میں جاتے ہو۔ تمہیں اتنا بھی پتہ نہیں کہ کیا کہنا چاہئے اور کیا نہیں؟'' نسیمہ غصے سے تڑپ کر بولی۔ اسے سامنے بیٹھا اس کا محبوب ذہنی اعتبار سے مفلس محسوس ہوا۔ وہ بہ مشکل اپنی آواز دبا سکی تھی۔ بار مین کے علاوہ ایک دو اور افراد بھی فوئر کی نچلی منزل میں تھے وہ سب اس کی اونچی آواز سن کر چونک اٹھے تھے۔

نسیمہ اٹھ کر جانے لگی۔ لیکن اس کے پیروں کی آواز اچانک کار پارک سے آتی ڈاکٹر مینا کی چیخوں میں دب گئی۔ کوئی ان کی کار چوری کرنے کی کوشش کر رہا تھا مینا نے اسے دیکھ لیا اور جوں ہی انھوں نے کسی کو خبردار کرنے کی کوشش کی اس نے دو تین مکے انھیں مارے اور ان کا پرس چھین کر بھاگ کھڑا ہوا۔ فوئر کی بالائی منزل سے خلیل اور نثار نے واردات دیکھ لی تھی۔ دونوں تیز چلتے ہوئے کار پارک میں گئے۔ اور زمین پر پڑی مینا کی اٹھنے میں مدد کی۔ مارے خوف کے ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور چہرہ زرد تھا۔ جلد ہی ہوٹل کے منتظمین وہاں آگئے۔

''کیا آپ سیکورٹی گارڈ نہیں رکھتے؟'' نثار نے منتظمین میں ایک سے پوچھا۔

''ہم نے کار پارک میں نوٹس لگادیا ہے کہ یہاں کار رکھنے والے اپنی گاڑیوں اور اس کے اندر جو کچھ بھی ہے اس کے ذمہ دار وہ خود ہیں۔'' موٹا منیجر اپنا چشمہ اپنے موٹے چہرے پر درست کرتے ہوئے نرمی سے بولا۔

نسیمہ نے ہوٹل سے نکلتے ہوئے مینا کی چیخ و پکار سن لی تھی اور وہ بھی بھاگتی ہوئی وہاں آگئی۔ مینا اس کے سینہ سے لگ گئی اور روتے ہوئے بولی۔

''ہم عورتوں کو کہیں بھی تحفظ نہیں۔ دیکھو۔ اس اچکے نے مجھے مارا اور میرا پرس بھی چھین کر لے گیا۔''

''آپ اس کی فکر نہ کریں۔ میرے پاس کافی رقم ہے۔ آیئے ہوٹل

میں ابھی آرام کر لیجئے۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔'' نسیمہ نے اعتماد اور خلوص سے کہا۔

شادی کے ہال میں جب اطلاع پہنچی تو وہاں کھلبلی مچ گئی۔ کچھ اور لوگ جائے واردات پر آ گئے جن میں سعادت، نفاست اور مہر النسا بھی تھے۔ نثار پر مہر النسا کی نگاہ پڑی تو پھر وہ ٹھٹکی اور اسے خوف کا بھی احساس ہوا۔

''کس نے ایسی ہمت کی۔ تمہیں اس کی شکل یاد ہے؟'' سعادت نے پوچھا۔

''اس کے سر کے بال سرخ رنگے تھے اور وہ شاید ہم ہی جیسا تھا۔'' مینا اپنا چہرہ نسیمہ کے سینہ میں چھپائے لرزتی ہوئی بولی۔

مہر النسا کی رنگت زرد پڑ گئی۔ منان؟ اس کا بیٹا۔ صبح جب وہ یہاں آ رہی تھی تو اس نے کہا تھا۔ ''تم جاؤ۔ میں نہیں جانا چاہتا۔ دعوت نامہ میں تمہارے نام کے ساتھ فیملی لکھا تھا۔ میں اب بڑا ہو گیا ہوں۔ علیحدہ دعوت نامہ میرے نام سے بھی آنا چاہئے تھا۔'' مہر النسا جانتی تھی کہ وہ لا ابالی انسان ہے اور ریستوراں میں معمولی کام کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ احساس کمتری میں مبتلا ہے اور ساتھ ہی اس کی پولس سے معمولی جھڑپیں بھی ہو چکی ہیں۔ اسی لئے بہانہ بنا رہا ہے۔ اس نے بیٹے کے ساتھ چلنے پر اصرار نہیں کیا۔ اتنا وہ ضرور غصہ میں بولی تھی۔

''اپنے لوگوں سے کٹ کر ہم نہیں جی سکتے۔'' مہر النسا کے سامنے آج صبح کی ساری گفتگو اور منان کا رشک وحسد سے جلتا ہوا چہرا آ گیا۔ آس پاس کھڑے افراد اور رنگ برنگی موٹریں، ہوٹل ریگل کی سفید عمارت گھومتی محسوس ہوئی۔ وہ چکرا کر گرنے لگی۔ لیکن نثار نے اسے تھام لیا۔ چند ہی لمحوں میں اسے ہوش آ گیا اور نثار کے بازوؤں کو اپنے گرد پا کر اسے جھرجھری آ گئی۔

''تھینکس۔'' وہ بہ مشکل بولی اور خود کو اس کے بازوؤں کے حلقے سے آزاد کر کے کمزور قدم اٹھاتی ہوئی مینا کے پیچھے چل دی جسے سہارا دے کر نسیمہ ہوٹل کے اندر لئے جا رہی تھی۔ وہاں پہنچ کر نسیمہ نے فوئر کے ایک صوفہ پر اسے بٹھا دیا۔ ہوٹل کا منیجر مینا کے پاس آ کر نرمی سے بولا۔

''اگر کچھ دیر کے لئے بستر پر آرام کرنا چاہتی ہیں تو میں ایک کمرہ کھلوا دیتا ہوں۔''

''نہیں۔ شکریہ۔ میں کچھ دیر بعد گھر چلی جاؤں گی۔'' مینا نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''ہم نے پولس کو خبر کر دی ہے۔ اگر ممکن ہو تو ان کے آنے تک رک جائیں۔'' منیجر نے اپنی ناک پر چشمہ کو سرکاتے ہوئے کہا۔

مینا نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا کر اسے صوفے کی پشت سے ٹکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ مہر النسا بھی وہیں ان سب کے قریب دوسرے صوفہ پر بیٹھ گئی تھی۔ سعادت مینا کے قریب آ کر نرمی سے بولا۔

''میں کوئی سوفٹ ڈرنک منگواتا ہوں اس کے چند گھونٹ لینے سے تمہاری طبیعت کچھ بحال ہو جائے گی۔'' لیکن مینا نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ سعادت وہاں سے جلد اوپر ہال میں جانا چاہتا تھا۔ جو واردات ہو گئی تھی اس سے اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی اور نسیمہ کا ہمدرد بن کر مینا کے پاس ہونا اسے برا لگ رہا تھا۔ وہ وہاں سے ہٹا اور نفاست کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں شادی کے ہال میں چلے گئے۔

مہر النسا بھی اضطراب میں دوسرے صوفہ پر بیٹھی اپنے پیر ہلا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ہلکی سی لرزش بھی تھی۔ اسے رہ رہ کر منان کا خیال آ رہا تھا لیکن کسی وجہ سے اسے یقین تھا کہ اس کا بیٹا لاکھ برا سہی لیکن ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ آخر اس سے رہا نہیں گیا وہ اٹھی اور بار مین سے پوچھا ٹیلی فون بوتھ کدھر ہے اور جواب پا کر ادھر چلی گئی۔ جب اس نے ریسیور اٹھا کر مشین میں پیسہ ڈالنا چاہا تو اسے اپنے پرس میں ریزگاری نہیں ملی۔ اس کی گھبراہٹ اور شدید ہو گئی۔ ساتھ کے بوتھ میں کوئی شوخی سے بول رہا تھا۔

''عامرہ۔ تم پاگل ساحرہ ہو۔ تم خرطوم میں گل چھرے اڑا رہی ہو؟ خیر کوئی بات نہیں۔ ہاں خلیل ٹھیک ٹھاک ہے اور شادی کی پارٹی بھی عمدہ رہی ... اللہ حافظ۔'' بولنے والا جوں ہی مڑا مہر النسا نے اس سے ایک پاؤنڈ کی ریزگاری مانگنا چاہی۔ جو شخص اس کے سامنے تھا اسے دیکھ کر وہ چونک پڑی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس نے اپنی کانپتی ٹانگوں کو قابو میں نہیں کیا تو وہ گر پڑے گی۔ اس کے سامنے نثار تھا۔ اس سے کچھ بولا نہیں گیا وہ بہ مشکل چلتی ہوئی بار مین کے پاس ریزگاری حاصل کرنے کے لئے آئی۔ لیکن وہ کچھ بول نہیں سکی اور کاؤنٹر سے ٹک کر شیلف میں سجے مختلف مشروب کی رنگ برنگی بوتلوں کو تکنے لگی۔ کاش شراب پینا حرام نہیں ہوتا تو توانائی کے لئے چند بوند وہسکی پی لیتی۔

''آپ کیا پینا پسند کریں گی؟'' بار مین نے مصنوعی نرمی سے پوچھا۔

کار پارک میں جو کچھ ہو گیا تھا اس کی خبر بھی نے سن لی تھی اور ہوٹل کے منتظمین کی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہو گئی تھیں جو پارٹی میں شرکت کے لئے آئے تھے۔

''شکریہ۔ شکریہ۔ مجھے کچھ پینا نہیں ہے۔ برائے مہربانی آپ مجھے ایک پاؤنڈ کی ریزگاری دے سکتے ہیں۔''

''ہاں۔ دیکھتا ہوں۔'' بارمین بولا اور غلے سے ریزگاری نکال کر اس کے حوالے کر دی۔ مہر النساء نے مڑ کر بوتھ کی جانب دیکھا۔ وہ شخص وہاں سے جا چکا تھا۔ چوبی بوتھ خالی تھے اور وہاں سے زرد رنگ کی خستہ ٹیلی فون ڈائریکٹریاں اداسی سے اسے تک رہی تھیں۔ بوتھ میں جا کر مہر النساء نے گھر کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب سے منان ہلو بولا۔

''تم کہیں باہر گئے تھے؟'' مہر النساء بہ مشکل بولی۔

''نہیں تو۔ میں کہیں نہیں گیا۔ گھر ہی پر تمہارے جانے کے بعد سے ہوں۔''

مہر النساء نے اپنی جان جسم میں واپس آتی محسوس کی۔ اس کے دل میں نکمے بیٹے کے لئے سوئی ہوئی محبت جاگ اٹھی۔ وہ پاس ہوتا تو یقیناً اس کا ماتھا چوم لیتی۔ منان لاکھ برا ہو ایسا کام نہیں کر سکتا۔

''لنچ کھا لیا؟''

''نہیں۔ خواہش نہیں ہو رہی ہے۔ کچھ دیر میں کھا لوں گا۔''

''کیا کرتے رہے؟''

''تمہارے الیاس ماموں کی ڈائری پڑھ رہا ہوں۔ بہت دل چسپ ہے۔''

''میرے الیاس ماموں تمہارے بھی نانا تھے۔ اور تم اسے کیوں پڑھ رہے ہو؟ اس میں کسی کی نجی زندگی تحریر ہے۔''

''اسے اگر تم پڑھ سکتی ہو تو میں کیوں نہیں؟ اور تم نے اب تک اتنی حفاظت سے کیوں رکھا ہوا ہے؟''

''یہ میں پھر کبھی بتاؤں گی۔ اچھا۔ گڈ بائی۔'' مہر النساء نے فون رکھ دیا۔ کتنا برا ہوتا ہے دل۔ کیسے اتنی جلدی پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے خیال آ گیا کہ مینا کا پرس میرے بیٹے نے چھینا ہے اور ساتھ ہی اسے مارا بھی ہے۔ اس کی طرح کے لاابالی اور لوگ بھی ہیں۔ وہ بھی اپنے سر کے بال کبھی سرخ اور کبھی سنہرا ہیئر ڈریسر کے پاس جا کر کراتے ہیں۔ اور اب مرد جس طرح اپنی آرائش پر خرچ کرتے ہیں وہ ایک وبا بن چکی ہے۔ اور الیاس ماموں کی ڈائری کی اہمیت میرے سوا کون سمجھ سکتا ہے۔ اس ڈائری میں ڈھاکہ کے بخشی بازار میں بنا اس کا گھر تھا۔ جہاں ہر گھر کی طرح خوشی اور غم کی لہریں تھیں۔ وہ دو منزلہ سفید عمارت جس کی دیواروں پر سیاہی مائل کائی کے دھبے تھے۔ جس کے ننھے چمن میں آم اور جامن کے درختوں سے صبح کے وقت قمریوں کے بولنے کی آواز آتی اور ساتھ ہی اس گھر میں زندگی کی گونج سنائی دینے لگتی تھی۔ اور بھی بہت کچھ تھا۔ جس کی یادیں ہمیشہ آئیں۔ ہر روز ہی۔ اور ہر رات بھی جب نیند روٹھی ہوتی۔ مہر النساء یہ سب کچھ سوچتی ہوئی اوپر ہال میں چلی گئی۔ جہاں لوگ زور زور سے باتیں کر رہے تھے اور ساتھ ہی ہنستے بھی جاتے تھے۔ کار پارک میں جو واردات ہو گئی تھی اس کی بابت چند نے مہر النساء سے پوچھا۔ اسے جتنی واقفیت تھی اس نے بتا دی۔

نثار کچھ خاموش سا خلیل کے پاس آیا اور دوسرے صوفہ پر بیٹھ گیا۔

''کسے فون کرنے گئے تھے؟''

''عامرہ کو۔''

''بیوی اب بھی اسی طرح یاد آتی ہے؟''

''تمھیں تو پتہ ہے وہ سوڈان گئی ہوئی ہے۔ کبھی دوسری جگہ جاتی ہے تو چاہتی ہے کہ میں اسے روز فون کیا کروں۔ بیوی کو خوش تو رکھنا پڑتا ہے جو اتنا آسان نہیں۔''

سعادت پھر مینا کی خیریت پوچھنے نیچے آ گیا اور مزاج پرسی کرنے لگا۔ مینا نے بے جان آواز میں جواب دیا کہ وہ ٹھیک ہے اور اگر پولس کے آنے کی خبر نہیں ہوتی تو وہ اپنے گھر جا چکی ہوتی۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک لمبا تڑنگا کانسٹبل لمبے قدم رکھتا ہوا آ گیا۔ چہرا سنجیدہ، ہونٹ بھینچے ہوئے اور چھوٹی آنکھیں۔ اس نے سر کی ہلکی جنبش کے ساتھ ہلو کہا اور مینا سے تعارف کے بعد اس کا بیان لینے لگ گیا۔ مینا نے رک رک کر ساری واردات بتا دی۔ جسے کانسٹبل نے اپنی رپورٹ بک میں لکھ لیا اور اس پر مینا سے دستخط لینے کے بعد جائے واردات پر چلا گیا۔

''مجھے ٹیکسی منگوانی ہوگی۔ میری کار کی کنجیاں تو میرے پرس میں تھیں۔ گھر جا کر مجھے دوسری کنجی لانی ہوگی۔'' مینا بے چارگی سے بولی۔

''تم ٹیکسی مت منگواؤ۔ نفاست تمہیں لے جائے گا۔ میں اسے ابھی بلاتا ہوں۔'' سعادت بولا اور اوپر ہال میں نفاست کو ڈھونڈنے چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کا بیٹا ساتھ نہیں تھا اور سعادت کا منہ اترا ہوا تھا۔

''وہ نہیں ملا۔ چلو میں پہنچا دیتا ہوں۔'' سعادت کی آواز میں ندامت تھی اور اس کی نگاہ بھی جھکی تھی۔ یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ اس نے نفاست سے کہا کہ وہ مینا کو اس کے گھر پہنچا دے لیکن اس نے انکار کر دیا تھا۔

''نہ۔ نہ۔ اتنے سارے مہمان چھوڑ کر تم کیسے جا سکتے ہو؟'' مینا بولی۔

''میں تمہیں اپنے کار میں لے چلتا ہوں۔ نثار، تم دلشاد سے کہہ دینا کہ میں مینا کو ان کے گھر پہنچا کر ابھی آتا ہوں۔'' خلیل صوفہ پر سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''آنٹی۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔ آپ کی کار کی کنجی میں

لے آؤں گی اور یہاں سے اسے لے جا کر آپ کے گھر میں پہنچا دوں گی۔"

نسیمہ نے مینا کا ہاتھ مشفقانہ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

سعادت اب تک نسیمہ کی موجودگی کو نظر انداز کرتا رہا تھا۔ اس کی معاونت کی پیش کش سے وہ خوش نہیں ہوا۔ اس کے چہرے پر نفرت کی شکنیں آ گئیں۔ لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔ اور وہ کہتا بھی کیا۔ مینا، نسیمہ اور خلیل کو فوئر سے نکل کر کار پارک میں جاتے ہوئے وہ کچھ دیر تک دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں بل کھاتا ہوا اوپر چلا گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نفاست اگر آٹھ دس سال کا ہوتا تو اس کی بات نہیں ماننے پر وہ اس کی اچھی طرح پٹائی کر دیتا۔ اس عمر میں مینا کے لئے ایک عجیب سی کشش اور خیر خواہی کا محسوس کرنا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس لئے بھی اسے خود پر جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔ اس کے قدم آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر اٹھ رہے تھے۔ دعوت کے انتظام میں مصروفیت اور اس کا تناؤ، مینا پر کسی کا حملہ، نسیمہ کی موجودگی اور اس کی انسانیت، سبھی کچھ اسے عجیب اور پریشان کن محسوس ہو رہا تھا۔ اوپر اس کی نگاہ نفاست پر پڑی جو کسی مہمان سے محو گفتگو تھا اور جس کے چہرے پر طمانیت تھی۔ اسے اپنے باپ کی الجھنوں کی کیوں فکر ہوتی۔ سعادت نے محسوس کیا کہ اس کا بیٹا اس کے لئے اجنبی ہے ورنہ اس کی معمولی سی درخواست کو وہ کیوں رد کرتا۔

دو

مینا نے اپنے گھر کا جو پتہ بتایا تھا وہاں خلیل انھیں جلد لے آیا۔ گھر کے سامنے باغ میں گھاس بڑھی ہوئی تھی اور کیاریوں میں جنگلی پودے اگ آئے تھے۔ گلاب کے پھول کچھ کھلے تھے اور کچھ مرجھا کر سیاہ ہو چکے تھے۔ خلیل نے کار کا وہ دروازہ کھولا جدھر مینا بیٹھی تھیں۔ شکریہ کہتی ہوئیں مینا اور نسیمہ اتر گئیں۔

"نسیمہ آپ کے ساتھ واپس جا سکتی ہیں؟"

"بڑی خوشی سے۔" خلیل نے مینا کو جواب دیا۔

"آئیے۔ ایک نظر ٹیری پر ڈال لیجئے، اسے کتوں کے مقابلے میں حسن کا انعام مل چکا ہے۔" مینا نے مرجھائی ہوئی آواز میں تکلفاً کہا۔

خلیل کو کتوں سے ایسی کوئی الفت نہیں تھی پھر بھی وہ مینا کے پیچھے ہو لیا۔ مینا نے گھر کے نیلے دروازے کے ساتھ لگی گھنٹی بجائی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا۔ سامنے سانولے رنگ کا مرد تھا۔ چہرے پر شیو بڑھی ہوئی۔ جیسے سفید اور سیاہ چونٹیاں گالوں پر رینگ رہی ہوں۔ آنکھوں میں سرخ دھاگے جیسی لکیریں۔ جوں ہی اس کی نگاہ خلیل پر پڑی ایک مصنوعی مسکراہٹ اس کے چہرے پر آئی جو جلد ہی مٹ گئی۔ نسیمہ پر نریش کی نگاہیں گئیں تو اس کا سر جھک گیا اور پیشانی پر ناگواری کی شکن آ گئی۔

"یہ ڈاکٹر خلیل ہیں۔ ہم دونوں لیڈس یونیورسٹی میں کام کیا کرتے تھے۔ یہ پروفیسر تھے اور میں میڈیکل آفیسر۔ یہ نسیمہ ہے، جس سے تم پہلے مل چکے ہو۔" مینا تھکی آواز میں بولی۔ اس نے خاوند کے چہرے پر ناگواری دیکھ لی تھی جو اسے بری لگی۔

خلیل نے ہلو کہا جس کا جواب نریش نے سپاٹ آواز میں دیا۔ اس نے جب خلیل سے ہاتھ ملایا تو اس کی گرفت بھی ڈھیلی تھی۔ نریش زرد رنگ کی شکن آلودہ ٹی شرٹ اور جینز میں ملبوس تھا اور اس کے پاؤں میں ربر کی چپل تھی۔ بیوی کی سماجی زندگی کا نریش ہمیشہ سے حاسد تھا۔ جو بھی غیر مرد اس کے ساتھ اسے نظر آتا اسے وہ بیوی کا عاشق سمجھ بیٹھتا تھا۔ اس وقت نسیمہ کی موجودگی اسے گراں گذر رہی تھی۔ کوئی یاد تھی جو نریش کے دل پر پھوڑے اگا رہی تھی۔ نریش سر کے درد کا بہانہ بنا کر اوپر اپنے کمرے میں آ گیا۔ میلی نیلی قالین پر جگہ جگہ سرخ شراب کے دھبے تھے اور میز پر وسکی کی بوتل گلاس کے ساتھ رکھی تھی۔ کمرے میں عجیب سی بو تھی۔ جیسے نریش کے اندر کوئی گلی ہوئی لاش تھی جس کی بو ہر سو پھیلی تھی۔ کتابوں کی خالی الماری میں گنیش کی مورتی کے پاس گیندے کے مرجھائے ہوئے زرد پھول نریش کی بے توجہی کا شکوہ کر رہے تھے۔ اور ان کے قریب ایک اینٹ تھی جس پر سیاہ روشنائی سے سواستیکا کا نشان بنا دیا گیا تھا اور جس پر سیندور کے دھبے تھے۔ یہ اینٹ منہدم بابری مسجد کی ہزاروں نوحہ کناں اینٹوں میں سے ایک تھی۔ ہندوستان کے ایک سفر میں جب یہ ملی تو نریش نے بھی دیگر متعصبوں کی طرح اسے ملیچھوں پر اپنی سنسکرتی کی فتح سمجھا اور سنبھال کر رکھ لیا۔ ملیچھوں نے ہزار سال تک اس کے ملک پر حکومت کی۔ جس کی وجہ سے اس کی تہذیب تباہ ہو گئی، اس کا دھرم مٹتے مٹتے بچا۔ یہی نہیں اس کا مقدس ملک ان ہی کی وجہ سے ٹوٹا۔ نریش کے فلسفۂ حیات کی بنیاد یہی افکار تھے۔ اس نے اپنا بستر بھی نہیں بنایا تھا جس کے نیچے پرانے رسالے پڑے تھے۔ نریش سر تھام کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اسے وہ عورت یاد آنے لگی جس کی شکل نسیمہ سے ملتی جلتی تھی۔ اسی طرح سیدھی ناک اور بڑی آنکھوں میں اداسی۔ وہ بے لباس تنگ کمرے میں چارپائی پر پڑی تھی۔ اور وہ اس کے جسم میں عدم اعتماد، بے وقعتی اور انگلستان میں جو ذلتیں اسے ملی تھیں، ان سب کو بہانے کے بعد چارپائی کے پاس کھڑا اپنا لباس پہن رہا تھا۔ اس کا جسم ہلکا تھا اور پرسکون بھی۔ جن ملیچھوں نے اس کے ملک پر ہزار سال حکومت کی وہ عورت ان ہی میں سے ایک تھی۔ عورت اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس نے سوئچ دبا دیا۔ کمرہ روشن ہو گیا۔ جہاں دیوار پر

بلب روشن تھا وہاں دو برہنہ یورپین عورتوں کی تصویریں تھیں۔

''بابو بھول گئی۔ پہلے بتی جلا دیتی تو ان کتیوں کو دیکھ کر تمہیں اور جوش آتا۔'' وہ عورت جسے وہ تصرف میں لایا تھا وہ بھدی آواز میں بولی تھی۔

نریش نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس نے پتلون پہنی۔ زپ کھینچی۔ قمیص کا بٹن لگایا اور دیوار میں لگے آئینہ میں اپنا عکس دیکھ کر لبوں سے لالی مٹانے لگا تھا جو عورت کے ہونٹوں سے لگ گئی تھی۔

''کہاں کے رہنے والے ہو؟''

''نند پور کا۔'' انگلستان میں اب اس کی رہائش تھی وہ کیسے بتاتا۔ انگلستان کا رہنے والا چند ہندوستانی سکوں میں دام نہیں چکا سکتا تھا۔ عورت اپنے دلال کو بلا لیتی اور نریش سے چوگنی قیمت وصول کی جاتی۔

''وہی نند پور جس کے سامنے امرود کا بہت بڑا باغ ہے؟''

نریش نے جواب نہیں دیا۔ اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

''میری ماں وہیں کی رہنے والی تھی۔ نگینہ اس کا نام تھا۔ گاؤں والے کہتے تھے، نگینہ کی طرح دمکتی ہے۔ مجھے فرید پور میں بیاہنے کے بعد مر گئی۔ ابا پہلے ہی مر گئے تھے۔ شوہر میری گود میں بچہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔''

عورت نے چند الفاظ میں اپنی زندگی کی روداد بتا دی تھی۔ اور نریش کے جسم میں کوئی شے مردہ ہوتی محسوس ہوئی۔ اسے اپنا بچپن یاد آ گیا تھا جو کسی خوفناک درندے کی طرح اس کے گلے میں اپنا دانت پیوست کرنے لگا تھا۔ اس کی ماں بیمار تھی اور دو سالہ نریش کے منہ سے دودھ نہیں چھوٹا تھا۔ نگینہ اپنی نوزائیدہ بچی گود میں اٹھائے اس کی حویلی میں کام کرنے آتی تھی۔ وہ اسی کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ جتنے دنوں تک ماں بیمار رہی۔ شاید چار مہینہ کا عرصہ رہا ہوگا۔ وہ نگینہ کے جسم سے زندگی کی حرارت کشید کرتا رہا تھا۔ وہ بعد میں خاوند کے ساتھ کہیں چلی گئی تھی۔ وہ جب کچھ بڑا ہوا تھا تو ماں پیار سے اس کے گال مسل کر کہتی۔ ''کب تک کالا کلوٹا رہے گا؟ نگینہ کا دودھ تو نے پیا ہے۔ وہ نگینہ کی طرح دمکتی تھی۔''

وہ اپنا مردہ جسم گھسیٹتا اس عورت کے پاس سے نکل پڑا تھا۔ اور قحبہ خانہ کے بازار میں پان، مٹھائیوں اور پھولوں کی دکانوں کے درمیان جب چل رہا تھا تو کوئی مکروہ آواز اس کا پیچھا کرتی ہوئی چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی وہ اپنی بہن کے ساتھ مباشرت کر کے بھاگ رہا ہے۔ مدتوں پہلے یہ واقعہ ہوا تھا۔ ہندوستان کے بٹوارے کے چند سال بعد جب وہ اپنی بیوی مینا کے ساتھ انگلستان آ گیا تھا تو پے در پے ناکامیوں کی ذلت اٹھانے کے بعد وہ تنہا ہندوستان گیا تھا۔ اپنے اضطراب اور انتشار سے نجات پانے وہ شہر شہر گھوم رہا تھا اور ایک دن الہ آباد میں اپنی بے چینی سے مجبور وہ اس بازار میں گیا جہاں جسم کا سودا ہوتا تھا۔ وہاں جو عورت اسے ملی وہ بہن نکلی۔ یہ تاریخ کا جبر تھا۔ ٹوٹتی بکھرتی تہذیب کی ہلاکت آفرینی۔ نریش نے اپنی زندگی کے اس المیے کو بھلانے کی کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوا۔ لیکن نسیمہ جب نظر آئی تو اس کی خواریوں میں سب سے اذیت ناک خواری مردہ چوہوں کا ہار بن کر ایک بار پھر اس کے گلے میں پڑ گئی۔

نیچے باغ سے مینا کی آواز کہیں دور سے آتی اسے محسوس ہوئی۔ وہ ٹیری... ٹیری... پکار رہی تھی۔ پاس کے چھوٹے سے سگ خانہ سے بھورے رنگ کا وہ ننھا سا کتا نکل آیا جس کے جسم پر گھنے اور لمبے سنہرے بال تھے۔ مینا نے اسے چمکار کر گود میں اٹھا لیا۔ خلیل کی نگاہیں باغ میں بھٹک رہی تھیں جہاں باہر کی طرح ویرانی تھی۔ اسے حیرت ان ننھی آہنی جھنڈیوں پر ہو رہی تھی جو کیاریوں میں لگی تھیں۔ وہ مینا سے ان کی بابت پوچھنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ وہ اس وقت ٹیری کی محبت میں سرشار پیالے میں دودھ ڈال کر اسے پلا رہی تھیں۔ کبھی اسے چمکارتیں اور کبھی اس کی پشت پر پیار سے ہاتھ پھیرتیں۔ ان کے چہرے سے مسرت پھوٹ رہی تھی اور وہ اردگرد کھڑے افراد سے بے خبر تھیں۔ باغ کا ویرانہ پن کیاریوں میں آہنی جھنڈیاں اور مینا کے خاوند کا ٹوٹا پھوٹا نظر آنا اور خود مینا کی کتے پر فریفتگی، خلیل کے لئے ایک عجیب منظر تھا۔ آخر خلیل سے رہا نہیں گیا جب کتا دودھ پی چکا تو خلیل نے پوچھا۔

''کیاریوں میں یہ ننھی جھنڈیاں کیا ان پھولوں کے لئے ہیں جو ابھی اگے نہیں؟''

''نہیں وہ ان قبروں کے نشان ہیں جہاں میری پیاری بلی، سیاہ مینا اور بجی ہمیشہ کی نیند سو رہے ہیں۔ ان کی وجہ سے کبھی گھر میں چہل پہل رہتی تھی۔ مینا کا صبح شام چہچہانا۔ سبز بجی کا اڑتے ہوئے آ کر کبھی ہمارے سر یا کندھے پر بیٹھ جانا اور ہماری پیاری بلی۔ اسے تو جیسے ہماری زندگی پر حق تھا۔ دن ہوتا تو ہمارے گرد پھرتی رہتی اور رات آتی تو ہمارے بستر کے پائنتی پر آ کر سو جاتی۔'' مینا اداسی سے اپنے ہونٹوں کو مچکاتے ہوئے بولیں۔

مینا کا خاوند اوپر اپنے کمرے کی بند کھڑکی کے پاس کھڑا غمگین نگاہوں سے انھیں تک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کھڑکی پر ٹکے تھے۔ جیسے وہ کسی قید خانے میں بے بس ہو۔ جہاں نہ زندگی کی نغمگی تھی اور نہ زندگی کی آہٹیں۔ مینا کی نگاہ اس پر پڑی۔ نریش نے کھڑکی کھولی اور میاؤں میاؤں بولا۔ پھر اس نے چڑیوں کی طرح چہچہانے کی کوشش کی۔ غم غلط کرنے کے لئے اس نے دو تین

پیگ چڑھالئے تھے اور اب اس پر شگفتگی چھا گئی تھی۔ بینا نے اس کی جانب مشفقانہ ہاتھ ہلایا۔ نسیمہ نے بھی ہلکی سی تالی بجا کر اسے شاباشی دی۔ بینا دھیمی آہ لے کر بولیں۔

''بینا کو نریش لتا منگیشکر کہتا تھا۔ سبز بجی رابن ہڈ اور سفید بلی کا خطاب شہزادی ڈائنا تھا۔ ان سب کے مر جانے کے بعد نریش کی روح میں بھی کسی کی موت ہو گئی۔ وہ خبطی ہو گیا ہے۔'' بھولی ڈاکٹر بینا کبھی نہیں سمجھ سکی تھیں کہ کون سی اذیتیں ان کے خاوند کی جان قطرہ قطرہ سلب کرتی رہی ہیں۔

''وہ خبطی نہیں ہوا۔ انسانوں کی پہلی گفتگو جانوروں جیسی آوازوں میں ہوئی۔ مجھے جنوبی افریقہ کے ملک بوتسوانہ کے شاعر کی نظم سننے کا اتفاق ہوا تھا جس میں کئی الفاظ چڑیوں اور جانوروں کے تھے۔ جنوبی امریکہ کے ملک پیراگوئے کی قدیم زبان Guarani میں الفاظ جانوروں کی بولیوں سے ملتے جلتے تھے۔ انگلستان کے مشہور شاعر ٹیڈ ہیوز کی نظم ORGHANST میں اس نے الفاظ کی بجائے چڑیوں اور جانوروں کی بولیاں استعمال کی ہیں۔'' نسیمہ بولی۔

''نسیمہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ آج کی ہماری گفتگو ہزاروں سال میں ان گنت بولیوں سے خلط ملط اور ٹوٹ کر بنی ہے۔'' خلیل نے نسیمہ کی حمایت کی۔

''گویا میرا خاوند تاریخ دوہرا رہا ہے۔''

''ممکن ہے۔ عجیب ہوتی ہے زبان بھی۔ اور شاعری میں کیسا انوکھا پن اس کی وجہ سے آتا ہے۔ تمھیں یونیورسٹی کے قریب کتابوں کی ننھی دکان یاد ہے جس کی شاپ ونڈو میں رھائم شیٹ Rhyme Sheet لگی ہوتی تھی اور عجیب وغریب نظمیں ہوتی تھیں۔ ایک تو اب تک یاد ہے۔

Here's A, B and C

D, E, F and G

H, I, J, K, L, M, N, O, P, Q

R, S, T, U

بینا اور نسیمہ ہنس پڑیں۔ دونوں کے چمکتے ہوئے ہموار دانت چمک اٹھے۔ دونوں کے چہرے پر ایک جیسی معصومیت تھی۔

''نریش بھلا انسان ہے مجھے دیکھ کر اس نے اجنبیت نہیں محسوس کی۔ اب چلتے ہیں۔'' خلیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نریش۔ کار کی وہ کنجی لے آؤ جو میری سنگار میز پر ہے۔''

بیوی کا حکم سن کر نریش کے چہرے پر ناگواری آ گئی۔ اس نے اس طرح منہ بنایا جیسے بینا کا منہ چڑا رہا ہو۔ وہ کنجی لے آیا اور بینا کے اشارے پر اسے نسیمہ کے حوالے کر دیا۔ خلیل اور نسیمہ کار میں آ کر بیٹھ گئے اور کار چل پڑی۔

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔

''ایسا لگتا ہے جیسے تم اور بینا ماں بیٹی ہو۔''

''سچ ہی ہے۔''

''کیا؟'' خلیل نے حیرت سے پوچھا اور لمحہ بھر کے لئے نسیمہ کی جانب دیکھا۔ جس کا چہرہ متبسم تھا اور سیاہ آنکھوں میں طمانیت کی گہرائی۔ اس نے اکثر ایسا ہی سوچا تھا۔ جو قربت اسے بینا سے تھی اس کا اور کیا نام وہ دیتی۔

''میں ایسا ہی سمجھتی ہوں۔ شکر ہے آپ نے بھی یہی سمجھا۔''

خلیل نے جواب سن لیا تھا پھر بھی اسے نسیمہ کی بابت جستجو تھی۔

''کیا تم مقامی کالج میں زیر تعلیم ہو؟''

''ہاں کالج ہی ہے۔ آپ جسے دنیا کہتے ہیں اس کا اور کیا نام ہو سکتا ہے۔''

خلیل لاجواب ہو گیا۔ ساتھ بیٹھی لڑکی کی سوچ میں وہ پختگی آ گئی تھی جو اس سے بڑی عمر کے افراد میں بھی جلد نہیں آتی۔ وہ اس سے اور سوالات بھی کرنا چاہتا تھا۔ وہ دعوت میں دیر سے کیوں آئی اور اس میں شریک کیوں نہیں ہوئی۔ نفاست سے اس کا کیسا رشتہ ہے؟ یہ نجی سوالات تھے جن کا پوچھنا بد اخلاقی ہوتی۔ اس کی نگاہ سامنے آتی موٹروں پر تھی اور وہ ادھیڑ عمر کی عورت سرخ لیٹر بکس میں خط ڈال رہی تھی اس پر بھی خلیل کی نگاہ گئی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے معنی خیزی سے پوچھا۔ ''کالج میں معلم ہوتے ہیں اور طالب علم ہوتے ہیں۔ تم...''

''اس کالج میں کوئی معلم نہیں ہوتا۔ دنیا جو سبق دیتی ہے وہی سب کچھ ہے۔ جس کے سامنے والدین کی نصیحتیں اور اسکول کالج کے سبق ہیچ ہوتے ہیں۔''

سامنے ٹریفک لائٹ کی سرخ آنکھیں گھور رہی تھیں۔ کار وہاں رک گئی۔ خلیل خاموش تھا۔ جو کچھ نسیمہ نے کہا اس کی حقیقت سے انکار کرنا مشکل تھا۔ خلیل اسٹیرنگ وہیل پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ ساتھ بیٹھی لڑکی کی سادگی میں دلکشی تھی اور اس کی شخصیت بھی پراسرار تھی۔ بینا کے ساتھ اس نے جو ہمدردی کی اس سے بھی خلیل متاثر تھا۔

''بینا کے خاوند شادی کی دعوت میں شریک نہیں ہوئے؟''

''دونوں میں ایسی قربت نہیں ہے کہ ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ دیکھے جائیں۔ اور نریش الکوہلک بھی ہے۔'' نسیمہ نے جواب دیا۔

''کیا وہ بھی ڈاکٹر ہے؟''

''اسے ڈاکٹر سے عشق کرنا آتا تھا لیکن ڈاکٹر بننا نہیں۔'' نسیمہ نے کسی قدر بیگانگی سے جواب دیا۔

خلیل سمجھ گیا کہ نسیمہ اور مینا کے درمیان گہری رفاقت ہے جبھی وہ اس کی نجی حالات سے واقف ہے۔ کار پھر چل پڑی تھی اور سڑک پر دیگر تیز بھاگتی کاروں کے درمیان خلیل مہارت سے اپنی کار چلا رہا تھا۔ ونڈ اسکرین اور کار کی دونوں جانب لگے آئینوں پر اس کی نگاہیں بار بار جا رہی تھی۔ نسیمہ نے جان لیا کہ وہ محتاط ڈرائیور ہے۔

''ظالم زندگی انسان کو کیا نہیں بنا دیتی۔ حیرت ہے مینا نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔'' خلیل بولا۔

''وفا کے عہد کا توڑنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ خاص کر یوں بھی جب کہ رفیق زندگی پٹ گیا ہو۔ برٹش ہندوستان میں وکیل تھا۔ اسے انگلستان آکر پتہ چلا کہ اس کی وکالت کی ڈگری اس ملک میں بیکار ہے اور یہاں وکالت کرنے کے لئے اسے قانون کا امتحان نئے سرے سے پاس کرنا پڑے گا۔ اس نے کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا اور اگر ہو بھی جاتا تو انگریزی کے خراب تلفظ کی وجہ سے ناکارہ ہی رہتا۔''

خلیل نے لمبی اور گہری سانس لی۔ ماضی میں وہ بھی ایسی ہی آزمائشوں سے گذر چکا تھا۔ اور اگر سانڈرا ساتھ نہیں دیتی تو وہ بھی ٹوٹ کر بکھر چکا ہوتا۔ ایک غم ناک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آگئی اور دھیمی آواز میں وہ بولا۔

''زندگی میں کتنی تشنگی ہوتی ہے۔ کتنی ناکامیاں کتنی آرزوؤں کا خون۔ انسان کیا نہیں سہتا۔''

نسیمہ نے چونک کر خلیل کو دیکھا۔ جس کے چہرے کی وہ بشاشت جس نے ڈھلتی عمر کی کھرچنوں کو چھپا لیا تھا، جس کی چال کی چستی، ترشی ہوئی داڑھی، سر کے بالوں سے آتی دھیمی پومیڈ کی خوشبو اور سوٹ اور ٹائی کی سجاوٹ اس کی خود اعتمادی اور وقار کی گواہیاں دے رہی تھیں۔ لیکن یہی شخص خود میں ایک ناکام ہستی چھپائے ہوئے تھا۔

''کیا آپ بھی ڈاکٹر ہیں؟''

''کبھی تھا۔ طبی ڈاکٹر نہیں۔ میں نے سیاست میں پی ایچ ڈی کی تھی۔ اب ضعیف اور ناکارہ انسان ہوں۔''

''عمر وہ احساس ہے جو بوڑھا نہیں ہوتا۔''

''بشرطیکہ اس کا احترام کیا جائے۔''

''کیا مطلب؟''

''یعنی۔ اس وقت میں جوانوں والی حرکت کروں تو...''

''وہ کیا ہوگی بھلا؟'' نسیمہ نے خلیل کی بات کاٹی۔ وہ اس کے فلرٹ کرنے کے لہجے سے خوش ہو کر مسکرا رہی تھی۔

''کیا یہ بھی بتانے کی بات ہے۔ تم اتنی بھولی تو نہ بنو۔'' خلیل نے کہا۔ اسے اچانک محسوس ہوا کہ 1976 ہے اور اس کے ساتھ کار میں سانڈرا بیٹھی ہے۔ اور اس کے سر کے سنہرے بال اس کی پیشانی پر بجے ہیں۔ کار ایک راؤنڈ اباؤٹ کے پاس آگئی۔ خلیل نے کار کی رفتار دھیمی کر دی۔ سامنے کوئی اسکول تھا جس کے میدان سے لڑکیاں ہاکی اسٹک اٹھائے نکل رہی تھیں اور سڑک کے کنارے مکان کے باغات میں میپلس اور سرو کے درخت دھوپ میں چمک رہے تھے۔ جون کا مہینہ تھا اور خلیل نے کھڑکیوں کا شیشہ نیچے کر دیا تھا۔ ہوا نسیمہ کی گردن اور گالوں کو آہستہ آہستہ سہلا رہی تھی۔ اس کا داہنا ہاتھ بھری بھری ران پر پڑے قمیص کے دامن کو ہموار کر رہا تھا۔ سانڈرا بھی موٹر میں بیٹھی کبھی کبھی اسی طرح کرتی تھی۔ نسیمہ کو پاس بیٹھا انسان دلچسپ محسوس ہو رہا تھا جس میں بچوں جیسی جستجو اور جوانوں جیسی شوخی اب بھی باقی تھی۔

''کیا آپ بھی بنگلہ دیشی ہیں؟''

''میں نہیں جانتا کہ میں کیا ہوں۔ زندگی کا ایک دور وہاں ضرور گذرا ہے۔ اس وقت وہ ملک مشرقی پاکستان تھا۔ جب میں وہاں سے نکلا تو کچھ عرصہ بعد وہ بنگلہ دیش بن گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہاں سے نکالا گیا۔ پاکستان میں بھی کچھ عرصہ رہا۔ لیکن وہاں وہ دھنک ہی نہیں رہی جو اس سرزمین کو نکھارتی رہتی تھی۔ اس دھنک کے بہت سارے رنگ 1974 میں رخصت ہو گئے پھر وہاں بچتا کیا۔ اور انگلینڈ میں ایک مدت تک رہ جانے کے بعد بھی اجنبیت کا احساس مٹا نہیں۔ تم کہہ سکتی ہو کہ میں ایک Identity Crisis میں مبتلا رہتا ہوں۔''

''وہ تو سبھی کا مقدر ہوتا ہے۔ کم و بیش سبھی کا۔ کسی نہ کسی شکل میں۔ جب نفاست چیخوف کا ڈرامہ سی گل Seagull ڈائریکٹ کر رہا تھا تو اس ڈرامہ کی اہم کردار ماشا کی ہدایت کرتے وقت جب اس نے اس کا جملہ دوہرایا تو وہ بالکل عورت ہی لگ رہا تھا۔ ہاتھوں اور آنکھوں کی جنبش میں ویسی ہی نسوانیت تھی۔''

''اور ماشا کا جملہ کیا تھا؟'' خلیل نے کار کا گیئر بدلتے ہوئے پوچھا۔ ایک موڑ پر اسے کار کی رفتار دھیمی کرنی پڑ گئی تھی۔

''ڈرامہ میں ماشا ہمیشہ سیاہ کپڑے پہنتی تھی۔ جب اس کی ماں نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ میں اپنی زندگی کا سوگ مناتی ہوں۔''

خلیل کے چہرے پر ایک مسکراہٹ آگئی اور وہ بولا۔
''سیاہ لباس میری بیوی کو بھی بہت مرغوب ہے۔''
''وہ بھی سوگ منا رہی ہوں گی۔''
''ممکن ہے۔ مجھ سے شادی کرنے کا سوگ۔ اور کوئی غم میری سمجھ میں نہیں آتا۔''

نفاست نے اس سے کبھی کہا تھا کہ چیخوف کے ڈراموں کے کردار اپنے غم کا اظہار نہیں کرتے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ خلیل کی بیوی کے ساتھ بھی ہو گا۔ نسیمہ نے سوچا پھر وہ چپ ہوگئی۔

خلیل خاموشی سے گاڑی چلا رہا تھا۔ نسیمہ بھی چپ تھی۔ جب وہ واپس ہوٹل پہنچا تو ہال میں اب بھی مہمانوں کی گہما گہمی تھی۔ شادی کا دن ہی پرانے شناساؤں، دوستوں یا دور دراز شہروں میں رہنے والے رشتہ داروں سے ملنے ملانے کا ہوتا ہے۔ مہمانوں کو جانے کی جلدی نہیں تھی۔ ہال میں نثار نہیں نظر آیا۔ خلیل نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ اسے دلشاد بھی دکھائی نہیں دی۔ وہ فوئر میں آیا اس کی نگاہ کھلی کھڑکی کے باہر گئی۔ نثار تالاب کے کنارے چہل قدمی کر رہا تھا۔ قریب لیبرنم کے درختوں سے زرد پھولوں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ خلیل آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے پاس گیا اور نثار سے اس نے کہا۔

''واپس چلا جائے۔''
''ابھی مشکل ہے۔ بھابھی چند مہمانوں کے ساتھ پوینا ڈ گئی ہوئی ہیں۔ تازہ ہوا اور سمندر کا کنارا۔ ان کی جانب کس کا دل نہیں کھنچتا۔''

خلیل نے جواب نہیں دیا۔ وہ دونوں خاموش اپنے خیالات میں کھوئے رہے۔ خلیل سوچنے لگا کہ جب وہ دلشاد کو مینا، اس کے خاوند کا خاکہ اور ان کے گھر کے باغ میں پالتو جانور اور پرندے کی قبروں کی بابت بتائے گا تو کیا وہ ان باتوں میں دلچسپی محسوس کرے گی؟ اور نسیمہ کی بابت وہ کیا کہے گا؟ کچھ بھی نہیں یا محض چند الفاظ۔ وہ اسے اپنی کار میں ہوٹل واپس لایا تھا۔ نسیمہ جس طرح اس کی کار میں بیٹھی تھی اور سانڈرا سے ملتا جلتا اس کا بات کرنے کا انداز۔ ابھی اس کے تخیل میں اس وقت دیوانہ وار رقص کر رہے تھے۔ اس عجیب سے ہلچل سے فرار ممکن نہیں تھا۔ اس کا ذکر وہ نہیں کر سکتا تھا۔ کسی سے بھی نہیں۔ خلیل تالاب کے کنارے سیکا مور کے درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ تالاب کا ساکت پانی اور اس پر دھوپ کا منجمد سنہرا پن۔ سانڈرا کی جلد اور زلفوں کی طرح۔ اور سانڈرا طویل قامت، بھرا بھرا جسم، جس کی نیلی آنکھیں کوئی راز چھپائے ہوئے دکھائی دیتیں۔ اسے وہ واقعہ یاد آیا جس نے اسے سانڈرا کا دوست بنایا تھا۔ اس دن وہ سرخی مائل اسکرٹ اور زرد بلاؤز میں ملبوس تھی۔ لائبریری کے ایک گوشہ میں کتابوں سے بھری الماریوں کے درمیان سوائے ان دونوں کے کوئی اور نہیں تھا۔ خلیل پریشانی میں مبتلا تھا۔ جمالیات پر ہیگل کی لکھی تحریر سمجھنے کی کوشش مسلسل نا کام ہو رہی تھی۔ یونیورسٹی کی لائبریری میں جہاں وہ بیٹھا تھا وہ اس کی مخصوص جگہ تھی۔ جہاں آس پاس کھڑکی نہ ہونے کی وجہ سے لوگ کم ہی بیٹھتے تھے۔ اس کے پیسے ختم ہو رہے تھے۔ کمرے کا کرایہ، روزمرہ کے کھانے پینے اور ٹیوب میں آنے جانے کا خرچ، کس طرح ادا ہو گا؟

یہ سوچ کر اسے مسلسل گھبراہٹ رہتی تھی۔ وہ جب بھی لائبریری میں اس جگہ بیٹھا ہوتا سانڈرا ادھر آ کر کتابوں کی الماریوں میں کچھ تلاش کرنے لگتی۔

وہ لائبریری میں معمولی سے عہدے پر تھی۔ اس دن بھی وہ کچھ کھوجتی ہوئی ادھر آ گئی اور خلیل کے سامنے میز پر بکھری کتابیں اور رسالے سمیٹنے لگی۔ خلیل نے بغیر سر اٹھائے سانڈرا کے اس ہاتھ کو پکڑ لیا جو اس کے قریب تھا۔ اس ہاتھ میں گرمی تھی اور اس کا دباؤ بھی ویسا جیسا خلیل کے ہاتھ کا۔ جیسے وہ اسے جانتی تھی کہ وہ اس وقت ایک کمزور انسان ہے جسے سہارے کی ضرورت ہے۔ جو گر پڑا ہے اور اٹھنے میں جس کی مدد کرنی چاہئے۔ خلیل نے نگاہیں اٹھائیں۔ سانڈرا کچھ گھبرائی ہوئی ادھر دیکھ رہی تھی جدھر وسیع ہال میں لوگ سر جھکائے پڑھائی میں مصروف تھے۔ نیلی آنکھوں میں خوف کی وجہ سے وہ اس وقت کچھ اور ہی دلکش نظر آ رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ قربت کے اس اچانک اظہار کا علم کسی کو ہو۔ اس نے نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور وہاں پر سے چلی گئی۔ اس کے بعد ملاقاتیں ہوئیں گہری دوستی ہو گئی جو اس وقت ٹوٹی جب خلیل کی بیوی دلشاد لیڈس آ گئی۔

قریب کے کار پارک سے ہارن کے بجنے کی آواز آئی۔ خلیل کے خیالوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ نسیمہ، مینا کی کار ڈرائیو کرتی ہوئی کار پارک سے نکل رہی تھی اور ہاتھ ہلا کر اسے الوداع کہہ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کچھ عجیب سی دمک تھی۔ مینا کے ساتھ جو انسانیت اس نے کی تھی اس نے اس خفگی کو کافی حد تک دور کر دیا تھا جو کچھ دیر پہلے نفاست سے اسے ہوئی تھی اور خلیل بھی اسے دلچسپ انسان محسوس ہوا تھا۔ نثار نے بھی مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔

''اس لڑکی کے دلکش ناک نقشہ میں عجیب سی جاذبیت ہے۔ تمہارے آنے میں دیر ہو گئی۔ کیا مینا کا گھر دور ہے؟''
''ہاں ذرا فاصلے پر ہے۔'' خلیل نے جواب دیا اور مینا کے گھر اور اس

کے خاوند کی زندگی کے خالی پن کا ذکر کیا۔

نثار چپ رہا۔ اس کی نگاہیں تالاب کے کچھ فاصلے پر ایلڈر، بیچ اور سرو کے درختوں پر گئی جن کی سرسبز شاخوں سے شام پورے والہانہ پن سے لپٹی تھی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

''میں سمجھ گیا تھا کہ ڈاکٹر بینا کی زندگی میں کوئی خلا ضرور ہے جسے تمہارا دوست سعادت پر کر رہا ہے۔''

نثار کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن اسے پیچھے سے کسی کے بولنے اور چلنے کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ نفاست اور مہر النسا باتیں کرتے ہوئے تالاب کی جانب آرہے تھے۔ نثار اور خلیل بید کے درخت کے ساتھ کھڑے تھے جس کی جھکی ہوئی گھنی شاخوں نے انھیں ادھر آنے والوں کی نگاہوں سے چھپا لیا تھا۔

''مہر النسا آپا۔ آپ میری مشکلات سمجھئے۔ میں بنگلہ دیش کی خاطر کسی فیسٹیول کا انتظام تھیٹر میں نہیں کر سکتا۔'' نفاست کی تیز آواز آئی۔

''لیکن وہاں ہندوستانیوں کا کلاسیکل رقص تو ہوا تھا۔ مجھے بنگلہ دیشی ڈانس گروپ نے بتایا ہے۔'' مہر النسا عاجزی سے بولی۔

''میں آپ کا دل دکھانا نہیں چاہتا۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ اس وقت بنگلہ دیشی اکرم خاں اس ملک کا بہترین رقاص ہے۔ لیکن اس کے علاوہ میں نے کسی بنگلہ دیشی رقاص یا رقاصہ یا ڈانس گروپ کا نام نہیں سنا ہے۔ ہندوستانیوں کے یہاں اس کی توانا روایت ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک ہزار سال حکومت رہی لیکن اس روایت کو وہ نہیں ختم کر سکے۔ آپ یہ جان کر حیرت زدہ رہ جائیں گی کہ جس شام اسٹیون جوزف تھیٹر میں انور یکھا گھوش کا رقص تھا تو شاید دو سو انگریز تماشائیوں میں صرف ایک پاکستانی اور دو بنگلہ دیشی تھے۔''

''انگریز تو ہمیشہ سے ہندوؤں کے دوست رہے ہیں۔ ہمیں ٹوٹا پھوٹا بنگال ملا۔ پورا مل جاتا تو اس میں آج کلکتہ بھی ہوتا ہے۔'' مہر النسا کی غم زدہ آواز میں شکایت تھی۔

''ٹوٹا پھوٹا بنگال ملا؟ آپ نے درست کہا۔ دیکھئے۔ نکتہ ہندوؤں سے انگریزوں کی دوستی نہیں۔ فنی تخلیق اور وسعت خیالی کے بغیر روشن خیالی مکمل نہیں ہوتی۔ اور وہ انگریزوں میں موجود ہیں۔'' نفاست نے مہر النسا کو سمجھانے کی کوشش کی۔

مہر النسا کے نازک سے چہرے پر پشیمانی اور پریشانی کی وجہ سے پسینہ آ گیا تھا۔ اسے نفاست سے آنکھ ملانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ایسی خوش حال نہیں تھی۔ خاوند اسے طلاق دے کر انگریز عورت کے ساتھ رہ رہا تھا۔ عدالت نے جو رقم مہر النسا کے لئے واجب الادا قرار دی تھی اسے وہ بھیجتا ضرور تھا۔ لیکن رقم کافی نہیں تھی۔ اپنے حالات بہتر بنانے کے لئے ایک بنگلہ دیشی ڈانس گروپ کے پروموشن کی ذمہ داری اس نے حال میں لی تھی اس طرح اس کی آمدنی میں اضافہ ہو سکتا تھا۔ ہال میں اس موضوع کو چھیڑنا مہر النسا نے مناسب نہیں سمجھا۔ موقعہ پا کر اس نے نفاست سے کہا کہ وہ تخلیہ میں اس سے کچھ بات کرنا چاہتی ہے۔ اس کے انکار سے مہر النسا کو دکھ ہوا اور اس کے خلاف نفرت بھی اس نے محسوس کی۔ سعادت اور اس کا کنبہ خوش حال تھا۔ انھیں ان آزمائشوں سے نہیں گذرنا پڑا جن سے وہ گذر رہی تھی۔ اسے بے بسی کا احساس ہوا۔ سعادت سے اس کی دور کی رشتہ داری تھی اور کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ شاید اس کی مدد کا سامان ہو جائے۔ لیکن اس کی امید شیشہ کی طرح ٹوٹتی محسوس ہوئی۔

''نفاست۔ بابلو۔ تمہاری مہر النسا آپا ان دنوں بڑی مشکلوں میں ہے۔ اماں ڈھاکہ میں بیمار رہتی ہیں ان کے لئے ہر مہینہ مشکل سے کچھ رقم بھیج پاتی ہوں۔ ڈانس گروپ کے پروموشن سے مجھے کچھ آمدنی ہو جاتی ہے۔''

نفاست کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اسے غصہ آنے لگا۔ یہ سکڑی ہوئی عورت اس سے ایسا کام لینا چاہتی تھی جس میں اسے کبھی دل چسپی نہیں ہوئی۔ وہ اس کا اب ہم وطن نہیں تھا۔ برطانیہ اب اس کا ملک تھا۔ یہاں کے رسم و رواج اور اقدار اس کے تھے۔ جبھی وہ تھیٹر ڈائرکٹر بن سکا تھا۔ لیکن یہ پستہ قد عورت اس ماضی کی جانب کھینچ رہی تھی جو اس کا نہیں تھا۔ اس کے جی میں آیا کہ اس عورت کو دھکا دے کر تالاب میں ڈال دے۔ اس عجیب خیال سے اسے کوفت ہوئی۔

نثار کان کا تیز تھا۔ اس نے ساری گفتگو سن لی تھی۔ چند لمحوں کے لئے وہ کسی سوچ میں گرفتار ہو گیا۔ سامنے تالاب کی سبز گہرائی میں کوئی ہیولا اسے نظر آیا جو سطح آب پر آنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ پھر وہ سامنے آ گیا۔ بارش میں بھیگا ہوا جسم۔ اس کے چکنے بازو نم اور اس کی رانیں اور پستان بھیگے کپڑوں میں دلکش۔ اس عورت کے پاس اس کی جیپ رکی۔

''آیئے میں آپ کو گھر پہنچا دیتا ہوں۔''

یہ نثار ہی کی آواز تھی۔ جہاں آرا سے چند ملاقاتوں میں بارش سے بھیگی سڑک پر مدتوں پہلے پہلی ملاقات۔

وہم، خیال، ماضی اور آج۔ کوئی اور حقیقت۔ یا اس پرانی سچائی کا نیا عکس۔ گناہ کا کفارہ ادا نہیں ہوتا لیکن کوشش تو کی جا سکتی ہے۔ زندگی اگر

اجازت دے تو مجرم منصف بھی بن سکتا ہے۔ وہ سارے خیالات اس کے ذہن میں تیز گردش کرنے لگے جو مہرالنسا کی آواز سن کر گونج اٹھے تھے۔ وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا نفاست اور مہرالنسا کے پاس آ کر اس سے بولا۔

''آپ میرے نرسنگ ہوم میں کام کرنا پسند کریں گی؟''

مہرالنسا اور نفاست چونک پڑے۔ مہرالنسا نے ندامت محسوس کی۔ کوئی اجنبی اس کی مجبوریاں جان لے گا، اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔ نفاست کی بنگلہ زبان سے واقفیت نہیں تھی اسی لئے وہ اس سے انگریزی میں باتیں کرتی رہی تھی۔ جبھی اس شخص نے سب کچھ سمجھ لیا تھا اور یہ شاید وہی ہے جس نے جہاں آرا خالہ کی عزت لوٹی تھی۔ انھوں نے کبھی نہیں بتایا کہ ان کی آبروریزی کس نے کی۔ لیکن اپنی کتاب میں چھپائی ہوئی فوجی افسر کی تصویر انھوں نے پھاڑ کر پھینک دی تھی اور پاکستانی فوجیوں سے انھیں دلی نفرت ہو گئی تھی۔ مہرالنسا نے ایک دوبار نثار پر اڑتی ہوئی نگاہ ڈالی پھر دوسری جانب دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ اسے اپنی آواز حلق میں دم توڑتی محسوس کی۔ اس پر ایک عجیب سا خوف بھی طاری ہو گیا تھا۔ جس شخص نے اسے مخاطب کیا تھا اس میں اب بھی دلکشی تھی۔ مردوں کی وجاہت پر عمر کا اتنا اثر نہیں ہوتا۔ کسی نے مہرالنسا سے کبھی کہا تھا۔ اسے نثار کے لئے کشش محسوس ہو رہی تھی۔ نفرت، غصہ اور قربت کی خواہش نے مہرالنسا کو کشمکش میں گرفتار کر دیا تھا۔

نفاست نے برا سا منہ بنایا۔ ایک اجنبی شخص کا اس کے اور مہرالنسا کے درمیان اچانک آ جانا اور اس عورت کے لئے خیر خواہی جتانا جس کی امداد سے وہ کترا رہا تھا، اسے پسند نہیں آیا۔

''کیا آپ انھیں جانتے ہیں؟'' نفاست نے رکھائی سے پوچھا۔

''ان کی شکل میری ایک جاننے والی سے ملتی جلتی ہے۔ ڈھاکہ میں ان سے میرا ملنا ہوتا تھا۔ اکثر۔'' نثار نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا۔ اس جاننے والی کے ساتھ جو حرکت اس نے کی تھی اسے تاریخ کے جبر نے مسخ کر دیا ہوگا۔ اتنی مدت کے بعد کون کہاں مارا گیا، کس کی عزت کہاں لٹی اس نوجوان کو پتہ بھی نہیں ہوگا۔ نثار نے سوچا۔

نثار نے انگریزی میں بات کی تھی جس کی وجہ سے نفاست سمجھ گیا کہ اسے بنگلہ زبان اچھی طرح نہیں آتی۔

''کیا آپ بھی بنگالی ہیں؟ کیا آپ کا وطن کلکتہ تھا؟'' نفاست کے لہجہ میں تلخی تھی۔ اس کے ابرو سکڑ گئے تھے اور لب ایک جانب کھنچے تھے جس سے غصہ کا اظہار ہوا۔

''ڈھاکہ اور کلکتہ میں میرا رہنا ہو چکا ہے۔ لیکن میں کچھ تبدیلی کے ساتھ وہی کہنے پر مجبور ہوں جو میرا دوست کچھ دیر پہلے کہہ رہا تھا۔ ڈھاکہ، پٹنہ، کلکتہ، راولپنڈی اور پشاور۔ یہ سارے شہر کبھی میرے تھے۔ لیکن جب جڑیں کٹ جاتی ہیں پھر اپنے شہر اپنے نہیں محسوس ہوتے۔ لیکن اب تو وہ پرانی باتیں ہو گئیں۔ میں ایک مدت دراز سے برٹش شہری ہوں۔ جو شہر کبھی اپنے تھے وہ غیر ہو چکے ہیں۔''

''یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟'' مہرالنسا اچانک بولی۔ نثار کے لہجہ کے حزن سے اس کی شخصیت اسے دل چسپ لگی۔

نثار نے اداسی سے اسے دیکھا اور ایک اداس مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ گئی۔

''جب میرا شعور جاگا تو اس وقت ایک عجیب سی افراتفری میں نے ارد گرد دیکھی۔ ہندوستان کی آزادی اور قیام پاکستان، ہندو مسلم فساد اور بڑے پیمانے پر ہجرت۔ صدیوں سے آباد گھروں کا ویران ہو جانا۔ بے روزگاری اور جان چلے جانے کا خوف۔ اور سب سے بڑا المیہ جنھیں کبھی اپنا سمجھا ان ہی سے بدترین دشمنی ہو گئی۔''

''بہت ہی دلچسپ۔ ہے نا خلیل انکل؟'' نفاست نے طنزیہ خلیل سے کہا جو پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ نفاست کے لئے نثار کی گفتگو میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ اسے اس نے محض ایک جذباتی انسان سمجھا اس کے علاوہ ماضی کا المیہ نفاست کے لئے نہیں تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ اسے حال اور مستقبل کی فکر رہتی تھی۔

نفاست نے خلیل کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور بولا۔

''لیجئے مہرالنسا آپا۔ آپ کا کام بن گیا۔ میں جاتا ہوں۔ دلہن کی رخصتی کا وقت قریب آ گیا ہے۔'' سر کی جنبش سے سبھوں کو اس نے الوداعی سلام کیا اور چلا گیا۔

ہوٹل کے خاص دروازہ کے سامنے پھولوں سے لدی سفید مرسڈیز آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ جس کے قریب دولہا کے قریبی رشتہ دار سیاہی مائل سوٹ میں ملبوس کھڑے تھے۔ ان کے علاوہ چمکتی نیلی اور سرخ ساڑھیوں میں بنگلہ دیشی عورتیں بھی ان کے آس پاس موجود تھیں۔ مہرالنسا بھی ادھر جانا چاہتی تھی لیکن وہ کیسے جاتی۔ اس کی ملازمت کا امکان ہو رہا تھا اور آمدنی میں اضافہ کی صورت بن رہی تھی۔

''ڈھاکہ میں جنھیں آپ جانتے تھے ان کا نام کیا تھا؟'' مہرالنسا نے پوچھا۔

''اب تو یاد نہیں۔ دوست کا نام دوست ہی ہوتا ہے۔'' نثار نے ٹالنے

کی کوشش کی۔

خلیل کسی قدر حیرت سے نثار کو تک رہا تھا۔ جس کے چہرے پر معصومیت تھی۔ اس وقت اس کے ارادوں کا سمجھنا مشکل تھا۔

''آپ کے نرسنگ ہوم میں کام کرنا مشکل ہے۔ میں نرس نہیں ہوں۔'' مہرالنسا نے کسی قدر بے بسی سے کہا۔

''دراصل وہ ان ضعیفوں کی رہائش گاہ ہے جو تنہا نہیں رہ سکتے۔ وہ پہلے نرسنگ ہوم تھی، میں نے جب اسے خریدا تو اس کا نام نہیں بدلا۔ نثار نے سمجھانے کی کوشش کی۔''

''وہ کس جگہ ہے اور میرے کام کی نوعیت کیا ہوگی؟'' مہرالنسا نے اپنی حیرت اور خوشی پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ وہ اپنی ساری کا آنچل انگلیوں سے مڑور رہی تھی۔

''وہ ویلی روڈ پر ہے۔ کام مشکل نہیں لیکن ذمہ داری کا ضرور ہے۔ یہ اس کا پتہ ہے۔ آپ صبح فون کرلیجئے گا۔ اس وقت عام طور پر وہیں ہوتا ہوں۔ آپ اس رہائش گاہ کو دیکھنے کے بعد کام کی نوعیت سمجھ لیں۔ شروع میں صرف تین مہینہ کا کنٹریکٹ ملے گا۔ اگر آپ کا کام تسلی بخش ہوا تو آپ کے کنٹریکٹ کی توسیع کردی جائے گی۔'' نثار اعتماد سے بولا اور ایک ننھا کارڈ مہرالنسا کی جانب بڑھایا جس پر نرسنگ ہوم کا پتہ لکھا تھا۔

مہرالنسا نے اثبات میں سر ہلا کر مسکراتے ہوئے شکریہ کہا اور کارڈ پرس میں ڈال کر وہاں سے چل دی۔ گھبراہٹ اور خوشی سے اس کے قدم آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔ وہ ہائیڈرینجیم کے سرخ پھولوں کی جھاڑیوں کے پاس آکر رک گئی۔ ہوٹل سے چند بچے نکل کر بھاگتے ہوئے آئے اور تناور درختوں کے تنوں کے پیچھے چھپ گئے۔ ان کی مائیں باہر آکر انھیں تلاش کرنے لگیں۔ اچانک پاس سے سنہری چڑیوں کا جھنڈ اڑتا ہوا اپنی چہچہاہٹ سے نغمہ بکھیر گیا۔ جون کی گرم شام میں مہرالنسا نے تازگی محسوس کی۔ اچانک اس کے سنگین مسئلہ کا حل کیسے ہوگیا وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ اللہ تیری مرضی۔ وہ زیر لب بولی اور ہوٹل کے اندر چلی گئی۔

خلیل اور نثار اسے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

''کیا تم اسے جانتے ہو؟ حیرت ہے اسے ملازمت کی پیشکش تم نے اچانک کیوں کردی؟'' خلیل نے پوچھا اور ایک ننھا پتھر اٹھا کر تالاب میں پھینکا۔ تالاب سے غڑاپ کی آواز آئی اور سطح آب پر ہلچل مچی پھر پانی میں سکون آگیا۔

''میں اسے جانتا تو نہیں لیکن اسی شکل وصورت کی ایک عورت سے میں اچھی طرح آشنا تھا۔'' نثار نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''سابق مشرقی پاکستان میں ملے ہوگے؟'' خلیل نے کہا۔ وہ اس کی آوارگی سے واقف تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ وہاں اس کی کوئی محبوبہ رہی ہوگی۔

''ہاں وہیں۔ جب دن رات موت کا سامنا ہو۔ مارنا اور مارے جانا انسان کا تصور بن جائے تو ان سے جو ذہنی تناؤ اور انتشار کی کیفیتیں ہو جاتی ہیں اس میں کیا کچھ نہیں ہوجاتا۔ اور... اور پھر زندگی میں خلا آجاتا ہے۔ میں اسے ہی پر کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اسی لیے کوشش اب بھی جاری ہے۔''

خلیل کے چہرے پر ناسمجھی کی وجہ سے شکنیں آگئیں۔ نثار سے اسے قربت ضرور تھی اور وہ اس کا ممنون بھی تھا، لیکن اس کے دل میں حسد کی ہلکی سی آگ کبھی کبھی جلنے لگتی تھی۔ نثار بغیر کسی ہنر کے غیر ملک میں آیا اور کامیاب ہو گیا۔ اس نے اس کی طرح نہ محرومیاں برداشت کیں اور نہ ہی ان آزمائشوں سے گذرا جنھیں اسے برداشت کرنا پڑا تھا۔ نثار تھوڑا سرمایہ اپنے ساتھ لایا تھا جس سے اس نے ریستوراں کھولا جو چل نکلا۔ اس سے جو آمدنی ہوئی وہ ضعیفوں کی رہائش گاہ خریدنے کے کام میں آئی۔ اور اس طرح اس کی دولت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ وہ اسکاربرو سے دور ریون اسکار نام کی جگہ میں رہتا تھا۔ چھوٹے سے مکان کے گرد دور دور تک ویران میدان اور ان سے پرے پہاڑیاں۔ نثار سے جب کبھی خلیل نے پوچھا کہ اس طرح ویرانہ میں رہنا تمھیں کس طرح اچھا لگتا ہے تو اس نے جواب دیا کہ شہر کے بنگلے اسے نہیں اچھے لگتے۔ ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ جب گوری بیوی اسے چھوڑ کر چلی گئی تو اس کا صدمہ ناقابل برداشت ہوگیا۔ لوگوں سے سامنا کرنا اسے مشکل محسوس ہونے لگا۔ اس کی مردانگی پر حرف آچکا تھا اور اس کی خوداعتمادی چل دی گئی تھی۔ جوان اولادیں یوں بھی کم ملنے جلنے آتی تھیں۔ ان کی نگاہ میں قصور اسی کا تھا۔ اسی نے بیوی کے جذبات کی پرواہ نہیں کی تھی جس کا نتیجہ اسے بھگتنا پڑ گیا تھا۔ اسی لئے اس نے ویرانہ میں رہائش اختیار کرلی تھی۔ بیوی سے علیحدگی، دور رہنا اور تنہائی ان سب کا علاج نثار نے شراب میں تلاش کرلیا۔ زندگی کے یہ واقعات کچھ ایسے تھے کہ اس نے خلیل سے بھی کچھ نہیں کہا۔ لیکن اسے نثار کے ذہنی زوال سے آگاہ ہوتے دیر نہیں لگی۔ وہ اس سے ہر روز ملنے لگا۔ اور اسے مجبور کیا کہ اخباروں میں تلاش رشتہ کے جو اشتہارات شائع ہوتے ہیں ان کے ذریعہ وہ عورتوں سے ملے۔ میل جول بڑھائے۔ شادی نہ بھی سہی کوئی رفیق تو مل سکتا ہے۔ خلیل کی بات نثار کس طرح اٹھاتا۔ وہ کوئی معمولی دوست نہیں تھا۔ یہ وہی خلیل تھا جس نے مدتوں

پہلے جب نثار کی بہن کو آپریشن کے بعد خون کی ضرورت ہوئی تو اس نے اپنا خون دیا تھا۔ سوڈان کی رہنے والی عامرہ اسکاربرو سے کچھ فاصلے پر مالٹن نام کی جگہ میں اسکول میں عارضی ٹیچر تھی۔ نثار لاکھ چاق چوبند سہی۔ لیکن ضعیفی نے اسے بھی آن لیا تھا۔ زندگی میں اس دور کی ابتدا ہو چکی تھی جب بیوی کی رفاقت اشد ضرورت بن جاتی ہے۔ گوری بیوی نے اسے اسی وقت چھوڑا تھا۔ سیاہ فام عامرہ کے سحر میں گرفتار ہوتے اسے دیر نہیں لگی تھی۔

تین

نفاست جب ہال کے اندر پہنچا تو اس وقت فردوسی اور اس کا خاوند رخصت ہو رہے تھے۔ دونوں کے ساتھ ماں باپ تھے۔ سعادت کی داڑھی پر آنسوؤں کے جو قطرے بیٹی کی جدائی کے تصور سے گرے تھے وہ موتیوں کی طرح لگ رہے تھے۔ ماں بھی آنسو بہا رہی تھی۔ ارد گرد مہمان اپنی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ مسرت اور رشک سے بھری ان کی نگاہیں دولہا دلہن پر تھیں۔ مائک پر کسی حالیہ بالی وڈ فلم کا کوئی اداس سا گانا ہو رہا تھا۔ جب نفاست قریب آیا تو اس کے سینہ سے لگ کر فردوسی رقت آمیز آواز میں بولی۔

''اماں، ابا کا خیال رکھنا۔''

''میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے۔'' نفاست نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اس کا دل بھی اداس تھا۔ آنکھیں بھی نم سی تھیں۔ ایک مدت تک ماں باپ کا گھر ہی دنیا تھی جہاں وہ اور فردوسی ایک دوسرے سے کبھی لڑتے جھگڑتے اور کبھی باہمی قربت سے خوش ہوتے بڑے ہوئے تھے۔ جب وہ تعلیم کے لئے اس گھر سے نکلے تو وہ دنیا ناآشنا سی ہونے لگی۔ ماں باپ سے تعلق ضرور رہا لیکن حوصلوں اور نت نئے جذبات کی آسودگی کسی اور دنیا میں ہی ممکن ہو سکی تھی۔ نسیمہ کا خفا ہو کر چلے جانے کا بھی غم اسے تھا۔ اس سے کچھ اور نہیں بولا گیا اور خاموش دولہا دلہن کے پیچھے چلنے لگا۔ فردوسی کے خاوند نے باری باری ساس اور سسر سے ہاتھ ملایا اور بیوی کے ساتھ سجی سجائی کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ وہ انگریز مہمان جو دعوت میں شریک ہوئے تھے وہ سعادت اور اس کی بیوی سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔ باقی مہمانوں نے بھی الوداع کہا اور چلے گئے۔ کچھ دیر تک کار پارک سے موٹروں کے نکلنے کی آواز آئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ سامنے میدان، چمن اور تالاب کے گرد بھی سناٹا چھا گیا۔ تالاب کے قریب خلیل اور نثار اب تک کھڑے تھے۔

ایک عجیب خالی پن سے سعادت گھر گیا۔ اب بیٹی پر اس کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ وہ اب اس کی نہیں رہی تھی۔ وہ اس کے گھر میں کب آئے گی اور کب نہیں اس پر شوہر کی اجازت کا دخل ہوگا۔ اس کا بیٹا نفاست بھی اب اجنبی بن گیا تھا۔ بغیر اس کی اجازت کے اپنی گرل فرینڈ کو دعوت میں لا کر اس کی بے عزتی بیٹے نے کی تھی۔ سعادت نے اپنے دل میں غصہ اٹھتا محسوس کیا۔ جس کا اظہار اس وقت مشکل تھا۔

اخلاقاً مہمانوں کو کھانا کھلانے کے بعد میزبان کھاتے تھے اس لیے سعادت، اس کی بیوی اور بیٹے کے لئے کھانا علیحدہ میز پر لگا دیا گیا تھا۔

نفاست ادھر چلا گیا۔ سعادت خود کو بیوی کے ساتھ تنہا پا کر بولا۔

''آج ایک ہی دکھ نہیں ہوا۔ صرف بیٹی نہیں گئی بیٹے نے بھی...''

''خوشی کے الفاظ بولو۔ بیٹی کو اچھا دولہا مل گیا۔ آج مسجد میں جا کر شکرانہ کی نماز پڑھنا۔'' سعادت کی بیوی نے خاوند کی بات کاٹی اور اس میز کی جانب چلی جہاں کھانا چن دیا گیا تھا اور جہاں نفاست ویٹرس کو کچھ ہدایت دے رہا تھا۔

نفاست باپ سے ذرا الگ کرسی پر بیٹھا۔ ماں باپ سے اسے بات کرنے کی خواہش نہیں ہو رہی تھی۔ اسے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ اس نے نسیمہ کا دل دکھایا ہے۔

''آؤ ادھر اپنے ابا کے ساتھ بیٹھو۔'' نفاست کی ماں بولی۔ وہ خاموشی سے باپ کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

خلیل، دلشاد اور نثار اپنے میزبانوں کے پاس آئے۔ خلیل نے بڑی شگفتگی سے کہا۔

''سعادت، دعوت عمدہ تھی اور کھانا بہت اچھا تھا۔''

''آپ نے انتظام بھی عمدہ کیا تھا۔ فوئر میں مہمانوں کے ناموں کے ساتھ میز کا نمبر جس کی وجہ سے سبھوں کو معلوم ہو گیا کہ کسے کہاں بیٹھنا ہے۔'' نثار نے بھی بشاشت سے داد دی۔

''بھائی سب اللہ کا کرم ہے۔'' سعادت نے چھت کی جانب ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔

''بھائی۔ آپ بھابھی کے ساتھ ہمارے گھر آیئے۔ آپ بہت دن سے ہمارے یہاں نہیں آئے ہیں۔'' سعادت کی بیوی کاغذی نیپکن اپنی گود میں بچھاتے ہوئے بولی۔ تعریف سن کر وہ بھی خوش ہو گئی تھی۔

''ہاں ہاں ضرور۔ اپنے دوست کو بھی لانا۔'' سعادت نے ہاں میں ہاں ملائی۔

''میں اس شہر میں کم ہی رہتا ہوں۔ کبھی موقعہ ہوا تو ضرور آؤں گا۔'' نثار نے مطمئن لہجہ میں جواب دیا۔

''کیا آپ یہاں نہیں رہتے ہیں؟'' نفاست نے حیرانی سے پوچھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ شخص اگر یہاں اسکاربرو میں نہیں رہتا ہے تو اس نے مہرالنسا کو ملازمت کی پیشکش کس طرح کردی؟

''نہیں۔ میں اس شہر میں نہیں رہتا ہوں۔ لیکن یہاں میری تجارت ہے اس لیے اکثر آنا ہوتا ہے۔''

سعادت کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور نیپکن سے منہ خشک کرنے کے بعد باری باری اس نے خلیل اور نثار سے ہاتھ ملایا۔ سعادت کی بیوی دلشاد سے گلے ملی اور اپنی نو بیاہتا بیٹی کے لیے دعا کرنے کے لیے استدعا کی۔

''ضرور۔ ضرور۔ خدا اچھا ہی کرے گا۔ اب آپ نفاست کی جلدی شادی کر دیجیے۔'' دلشاد بولی۔ اس کی مسکراہٹ مصنوعی تھی۔ اس کا جامنی دوپٹہ گلے میں جھول رہا تھا اور گلابی فراک کی آستین میں وہ ٹیشو پیپر ٹھنسا تھا جسے وہ پھینکنا بھول گئی تھی۔ لاولد دلشاد جب بھی کسی ایسی دعوت میں آتی تو اسے لاولد ہونے کا خیال پریشان کر دیتا تھا۔

''ہاں بھائی۔ آپ لوگ اسے سمجھایئے۔ ہماری بات بیٹا نہیں مانے گا۔'' سعادت کی بیوی نے نفاست پر پیار بھری نگاہ ڈالتے ہوئے شکایت کی۔

جب وہ لوگ جانے کے لیے مڑے تو سعادت کی بیوی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''بھائی آپ لوگ رکیے۔ بہت سا کھانا بچ گیا ہے۔ کچھ ساتھ لیتے جایئے۔ کھانا پکانے کی زحمت سے بچ جائیں گے۔'' سعادت کی بیوی بولتے ہوئے پینٹری کی جانب بڑھی۔ لیکن نثار نے انھیں روک دیا اور بولا۔

''مسز سعادت۔ آپ کھانا تو ختم کر لیجیے۔''

''ارے بابا۔ اتنا سارا پلاؤ اور قورمہ دیکھ کر ہی پیٹ بھر گیا ہے۔ میں بعد میں کھالوں گی۔ آیئے بھابھی میرے ساتھ۔'' مسز سعادت نے نرمی سے دلشاد کو کھینچا۔

نفاست کچھ دیر تک انھیں خالی کرسیوں اور میزوں کے درمیان جاتے دیکھتا رہا۔ اس نے سر ہلایا۔ جیسے اس نے جو کچھ دیکھا اس پر اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے وہ نرمی سے بولا۔

''اماں میں بہت انسانیت ہے۔ یہ لوگ بنگالی نہیں ہیں پھر بھی اماں ان سب کے ساتھ کتنا اپنا پن کر رہی ہیں۔''

''بنگالی نہیں ہیں تو کیا ہوا۔ مسلمان تو ہیں اور خلیل سے میری بہت پرانی واقفیت ہے۔'' سعادت نے کسی قدر رکھائی سے جواب دیا اور کچھ سوچتے ہوئے اس نے کوک سے بھرا گلاس اٹھایا۔

''ابا۔ مجھے افسوس ہے میں نے آپ کی بات نہیں مانی۔''

''تم میری بات مانو گے یا نہیں میں نے ایسا سوچنا ترک کر دیا ہے۔''

''آپ رنج نہ کریں۔ آج شادی کا دن ہے۔''

''رنج؟ نفاست تمھیں اس کی پرواہ ہی کب رہی ہے۔''

''پرواہ تو ہے۔ آپ مجھے بچہ سمجھنا چھوڑ دیں۔''

''بچہ تو نہیں...''

''نابالغ جوان بھی نہیں سمجھیں۔''

''میری اور تمہاری عمر میں ستائیس سال کا فرق ہے۔ اس مدت میں میرے جو تجربے ہوئے، جو زمانہ میں نے دیکھا اور میری عمر نے جو مسافرت طے کی، تم اس تک کیسے پہنچ سکتے ہو؟'' سعادت نے اپنی آواز کو اونچی ہونے سے روکتے ہوئے ادھر ادھر نگاہ ڈالی۔ خالی ہال میں باپ بیٹے کی گفتگو سننے والا کوئی بھی نہیں تھا۔

''ابا۔ ایسا دعوا میں نے کب کیا ہے؟ مجھے ڈاکٹر مینا پسند نہیں ہیں اس لئے میں نے انھیں ان کے گھر لے جانے سے انکار کر دیا۔'' نفاست بولا اور چھری کانٹا رکابی پر رکھ دیا۔ کسی سوچ نے اس کی بھوک ختم کر دی تھی۔ اسے اپنے والد پر ترس آرہا تھا۔

''زندگی میں اکثر اپنی پسند کے خلاف کام کرنے پڑتے ہیں۔ تمہاری پیدائش کے وقت جب تمہاری ماں ہسپتال میں تھیں تو ہمارے گھر کا کام اور تمہاری بہن کی دیکھ بھال مینا نے سنبھال لی تھی۔''

''ان کے دل میں آپ کے لئے کمزوری رہی ہوگی۔'' اپنے شک کے بے تکلف اظہار سے نفاست نے طمانیت محسوس کی۔ باپ کے چہرے پر غصہ دیکھ کر اسے خوشی بھی ہوئی۔

مارے غصہ کے سعادت کا دل چاہا کہ میز پر رکھا پانی سے بھرا جگ اپنے بیٹے کے سر پر دے مارے۔ جو اس نے کہا وہ سعادت کا بے تکلف دوست ہی کہہ سکتا تھا۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ بچپن سے نفاست کو سچ بولنے کی عادت اسی نے سکھائی تھی۔ اس غیر ملک میں بیٹے کی زندگی کی اونچ نیچ سے واقف ہونے کا کوئی اور طریقہ نہیں تھا۔ یہاں تک کے بلوغت کے ساتھ جن جنسی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے انھیں بھی اس نے سمجھا دیا تھا۔

''کمزوری؟ تمہارے دل میں بس ایسے ہی خیالات آتے ہیں۔'' سعادت نے بھی کھانے سے ہاتھ روک لیا تھا اور اداس نگاہوں سے فرش کی جانب دیکھ رہا تھا۔ باپ بیٹے کے درمیان خاموشی کی دیوار کھڑی ہوگئی۔ جس دروازے سے نفاست اپنے والد کے پاس بے تکلفی سے آتا جاتا رہتا تھا وہ

بند ہوگیا۔ اس خاموشی میں سعادت نے ٹن ٹن کی آواز سنی۔ نفاست کھانے کی چھری پلیٹ پر آہستہ آہستہ مار مار رہا تھا۔ سعادت نے محسوس کیا کوئی بند دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ وہ دھیمی آواز میں بولا۔

"جن دنوں میں رائل انفرمری ایڈنبرا میں کام کر رہا تھا تو میرے سائیکٹرک وارڈ میں بینا کا خاوند بھی مریض تھا۔ بینا کی ملازمت کسی دور شہر کے ہسپتال میں نئی نئی ہوئی تھی۔ اس کا ایڈنبرا آ کر شوہر کی تیمارداری کرنا مشکل تھا۔ اس کے خاوند کا علاج اور دیکھ بھال میں نے اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داریوں سے بڑھ چڑھ کر کی۔ یہ تمہاری پیدائش سے پہلے کی بات ہے۔"

"ابا۔ حیرت ہے۔ وہ ہندو اور ہندوستان کے رہنے والے ہیں۔ اور آپ ہمیشہ اس ملک اور ہندوؤں کے خلاف زہر اگلتے رہے ہیں۔ ایسی مہربانی آپ نے کیوں کی؟"

سعادت کے دل نے کہا۔ تم نے بیٹے کو سچ بولنے کا سبق ہمیشہ دیا ہے۔ اسے سچ سچ بتادو کہ بینا کی آنکھوں اور سادہ چہرے میں اب بھی تمہیں معصومیت اور کشش محسوس ہوتی ہے۔ نام اور مذہب مختلف ہونے سے وہ اپنا پن نہیں مٹ جاتا جو وہ مٹی دیتی ہے جہاں تم پیدا ہوئے اور جس زبان میں تم اس مٹی سے الفت کا اظہار کیا کرتے تھے، وہی زبان اس اپنا پن کی روح ہوتی ہے۔ اور ان سب سے بچھڑ جانے کے بعد اسی مٹی کی خوشبو اور اسی زبان کا سحر اگر مل جائے تو ان کی جانب کھنچ جانا ناگزیر ہوتا ہے۔ جب سعادت انگلستان آیا تو کچھ عرصہ اس نے ایڈنبرا کے ایک ہسپتال میں بھی کام کیا تھا۔ بینا کا خاوند اسی وارڈ میں مریض تھا جس میں سعادت ہاؤس جاب کر رہا تھا۔ کلکتہ کی رہنے والی بینا کے علم میں جب آیا کہ سعادت مشرقی پاکستان کا رہنے والا بنگالی ہے تو بینا نے ایک دن اپنی مجبور آنکھوں سے اسے تکتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر بابو ان کا خیال رکھئے گا"۔ تو وہی دور دراز کی مٹی اور زبان کی روح جو سعادت میں بسی تھی بولی۔ ہاں کہو۔ یہ تمہارا فرض ہے۔ اور کچھ مدت کے بعد جب سعادت اور بینا مانچسٹر میں مختلف ہسپتالوں میں کام کر رہے تھے، اور نفاست کی پیدائش کے وقت سعادت کی بیوی ہسپتال میں بیمار تھی تو اسی فرض کی خاطر بینا نے اس کے گھر کی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔ اور ان ہی دنوں جب ایک شام سعادت گھر میں داخل ہوا تو کچن میں کیسٹ پلیئر میں کوئی بنگلہ گانا بج رہا تھا اور کھڑکی کے قریب جیرینیم کے گلابی پھول لہلہا رہے تھے بینا سبز ساری کا آنچل کمر میں اڑسے کھانا پکا رہی تھی۔ اس کے نمایاں کولہے، کمر سے نیچے تک لٹکی چوٹی اور بجلی کی روشنی میں چکنے شانے کی چمک۔ سعادت بے اختیار اس کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔

اس کی بیٹی پڑوس کے گھر میں اپنی سہیلی کے ساتھ کھیلنے گئی ہوئی تھی۔ کیا پکا رہی ہو؟ اس نے پوچھا۔ دیکھ لو۔ بینا نے مڑ کر جواب دیا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں چمک تھی اور سادہ چہرا بھی تمتمایا نظر آیا۔ اس نے بینا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کے گرم ہونٹوں کو چوما اور جب اس کے بلاؤز میں ہاتھ ڈال کر اس کے پستانوں کو ٹٹولنا چاہا تو بینا نرمی سے خود کو چھڑاتے ہوئے بولی۔ نہ نہ ڈاکٹر بابو۔ میں تمہاری بیوی سے پھر کبھی آنکھیں نہیں ملا سکوں گی۔ سعادت کی بیوی اس وقت جیسے پاس آ کھڑی ہوئی اور سعادت کو کھینچ کر بینا سے جدا کر دیا۔ سعادت، بینا کے ہونٹوں کی گرمی اس کے جسم کا گداز کبھی نہیں بھول سکا۔ اسے اچانک احساس ہوا کہ اس کا بیٹا اس کے جواب کا انتظار کر رہا ہے۔

"میں نہیں جانتا میں نے ایسا کیوں کیا تھا۔ اور جیسا جوزف کونراڈ نے کہیں لکھا ہے۔ اکثر اپنے خیالات کا جاننا مشکل ہوتا ہے اور اعتقادات ساحل پر اڑتی کہر ہے جو اڑ کر کہیں چلی جاتی ہے۔ اچانک۔ نہ ہمیں زندگی کی سمجھ ہے اور نہ ہی زندگی ہمیں سمجھتی ہے۔ جبھی تم نے آج میرا دل دکھایا۔ نسیمہ کو یہاں بلا لیا۔"

"وہ میری بہت اچھی دوست ہے۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ میں آپ سے چھپانا نہیں چاہتا۔ آپ ہی نے مجھے ہمیشہ سچ بولنے کا سبق دیا ہے۔" نفاست نے اپنے والد کی کلائی پر مشفقانہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔

سعادت چپ رہا۔ ہال کے بڑے دروازہ کے باہر لیبرنم کے ان درختوں پر اس کی نظر گئی جن سے لٹکے ہوئے زرد پھولوں کے گچھے ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔ ایک اداس مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی۔ نفاست کی پیدائش پر اس نے بڑی خوشیاں منائی تھیں۔ قریبی دوستوں کے گھروں میں جا کر اس نے مٹھائی تقسیم کی۔ ماں کو خوشی کا تار دیا اور مسجد میں جا کر اس کی صحت اور کامیابی کی دعائیں مانگی تھیں۔ نفاست ہمیشہ صحت مند رہا اور زندگی میں کامیاب بھی ہوا۔ اس نے جو حاصل کیا وہ سعادت نے پسند نہیں کیا۔ لیکن نفاست نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ نہ وہ مذہبی بنا اور نہ ہی ان اقدار کا اسے احترام تھا جو سعادت کے لئے محترم تھے۔ زندگی کے منجدھار میں نفاست اپنے والد کا ہاتھ چھوڑ کر دور جا رہا تھا۔ ایسا کیوں ہوگیا؟ سعادت نے سوچا۔ اسے اپنی اداسی گہری ہوتی محسوس ہوئی۔

سامنے سے اس کی بیوی آتی دکھائی دی۔ چہرا زرد اور قدم بھی سست۔ بیٹی کی جدائی کے غم کے بوجھ کے ساتھ ایک اور بوجھ بھی دل پر آن گرا تھا۔ پینٹری میں جب باتوں باتوں میں اسے پتہ چلا کہ نثار کبھی فوجی افسر تھا اور

اس کی پوسٹنگ 1971 میں ڈھاکہ تھی تو وہ بے جان سی ہو گئی۔ بہ مشکل اس نے ان مہمانوں کو رخصت کیا جنھیں وہ کھانا دینا چاہتی تھی اور اب وہ چلتے ہوئے خود کو گھسیٹ رہی تھی۔ 71 میں جو خبر اسے ڈھاکہ سے انگلستان میں ملی وہ تازہ ہو گئی تھی۔ راستے میں پڑی کرسی سے اسے ٹھوکر لگی۔ وہ گرتے گرتے بچی۔ نفاست تیزی سے اٹھا اور جا کر ماں کو تھام لیا۔ جب وہ قریب آئی تو سعادت سے بے جان آواز میں بولی۔

''تم جانتے ہو۔ خلیل بھائی کے ساتھ ان کا دوست بھی پاکستانی فوج میں تھا اور اندولن کے وقت اس کی پوسٹنگ ڈھاکہ میں تھی۔''

''اچھا۔'' سعادت نے حیرت سے پوچھا اور اپنی بیوی کی جانب اس طرح دیکھا جیسے کچھ اور سننے کا منتظر ہو۔ نفاست بھی ماں کی جانب سوالیہ نگاہوں سے تک رہا تھا۔

''آہ۔ رقیہ آپا یاد آ گئیں۔ وہ اپنے بیٹے کی شادی ہماری بیٹی فردوسی سے کرنا چاہتی تھیں، لیکن 71 کی جنگ نے ان کا اور ان کی آرزوؤں کا بھی خاتمہ کر دیا۔'' ایک سسکی اس نے لی اور بات جاری رکھی۔ ''ڈھاکہ میں کرفیو تھا۔ ہر روز ہی گولیاں چلتی تھیں۔ ابا نے رقیہ آپا کو گاؤں بلا بھیجا۔ وہ ناؤ میں رات کے وقت اپنے بچوں کے ساتھ بوڑھی گنگا پار کر رہی تھیں۔ پاکستانی فوجی بھی کشتیوں میں گشت کر رہے تھے۔ جنھوں نے للکارا۔ ڈر کے مارے کسی نے جواب نہیں دیا۔ سپاہیوں نے گولی چلا دی۔ رقیہ آپا کے سینے میں گولی لگی اور وہ بیٹا بیٹی کے سامنے ڈھیر ہو گئیں۔ زندہ ہوتیں اور اگر ان کے بیٹے سے ہماری فردوسی کا بیاہ نہ بھی ہوتا پھر بھی آج یہاں وہ ضرور ہوتیں۔''

سعادت کی غم زدہ بیوی نے کہا اور مرحومہ بہن کی یاد میں اپنا سر آنچل سے ڈھک لیا۔

سعادت اور نفاست اس واقعے کو اکثر سن چکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سعیدہ اپنی بہن سے بے انتہا محبت کرتی تھیں۔ لیکن اس وقت اس المیہ کا ذکر انھیں غیر ضروری محسوس ہوا۔ نفاست نے نثار کے خلاف غصہ اٹھتا محسوس کیا۔ اس کی ماں، بیٹی کی جس جدائی سے غم زدہ تھی اس میں اجنبی مہمان نے اضافہ کر دیا تھا۔

''ہو سکتا ہے۔ اس رات ندی پر اسی شخص کی ڈیوٹی ہو اور اسی نے گولی چلائی ہو۔ ذرا سوچیے۔ یہ آج مہر النسا آپا سے پوچھ رہا تھا کہ کیا وہ اس کے نرسنگ ہوم میں کام کر سکتی ہیں؟'' نفاست نے تیز لہجے میں کہا۔

''نہیں؟'' سعادت اور اس کی بیوی ایک ساتھ حیرت سے بولے۔

''مہر النسا نرس نہیں اور نہ ہی اسے ایسے کاموں کا تجربہ ہے، وہ نرسنگ ہوم میں کام کس طرح کر سکتی ہے؟'' سعادت قاب سے بریانی نکال کر اپنی پلیٹ پر ڈالتے ہوئے بولا۔

''مریضوں کے بڈ پین صاف کرائے گا۔ ہمارے لوگ اپنے ہی جیسوں کا استحصال کرتے ہیں۔'' نفاست طنزیہ ہنستے ہوئے بولا۔

''مشرقی پاکستان میں ہمارا استحصال ہی تو کرتے تھے جبھی ہم نے بنگلہ دیش بنا لیا۔'' سعادت نے کہا۔

''ابا۔ آپ کو اگر معلوم ہو جاتا کہ خلیل انکل کے ساتھ آج سابق پاکستانی فوجی افسر تھا، جس نے شاید اس ظلم میں حصہ لیا ہو جو پاکستانی فوج ان دنوں کر رہی تھی تو کیا آپ اسے دعوت میں بلاتے؟''

''شاید نہیں۔'' سعادت نے اطمینان سے جواب دیا۔ موضوع مختلف ہو چکا تھا۔ اس لئے بیٹے کے سوال سے سعادت نے دل پر سے بوجھ اٹھتا محسوس کیا۔

''لیکن ابا آپ البدر کی تنظیم کے ان افراد سے تو ملتے ہیں جو انگلستان میں آ بسے ہیں۔'' نفاست کی نگاہیں اپنے والد پر جمی تھیں اور وہ سلاد سے کھیرے کی قاش اٹھا کر آہستہ آہستہ کتر رہا تھا۔

''ہم ان سے ملتے جلتے ہیں لیکن دعوت میں نہیں بلاتے۔'' سعادت نے جواب دیا اور اپنی کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

''حیرت ہے۔''

''نفاست۔ حیرت کیوں؟'' اس کی والدہ نے پوچھا۔

''ڈھاکہ میڈیکل کالج میں ابا کے جو دو تین دوست تھے وہ البدر کے ہاتھوں سفاکی سے مارے گئے۔ جب ابا ان سے یہاں ملتے ہیں تو کیا ان کے مقتول دوست درمیان میں نہیں آ کھڑے ہوتے۔؟''

سعادت مسکرایا۔ ایسے سوال اس کے دل میں بھی اٹھا کرتے تھے، جن کا جواب دے کر وہ اپنے ضمیر کو سلا چکا تھا۔ اس نے پانی کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا اور آہستہ آہستہ پینے لگا۔ جب وہ گلاس خالی کر چکا تو نیپکن سے اپنا منہ خشک کرتے ہوئے بولا۔

''تم بڑے برٹش بنتے ہو۔ شاید ریڈیکل بھی ہو۔ 1857 کی بغاوت میں آج کے انگریزوں کے بزرگ ہندوؤں اور مسلمانوں کے منہ میں گائے اور سؤر کا گوشت ٹھونس کر انھیں توپ کے دہانے پر رکھ کر گولے سے اڑا دیا کرتے تھے۔ پھر بھی تم ان کے درمیان آسودگی سے رہتے ہو۔ زندگی میں مجرموں کو معاف کرنا پڑتا ہے اور انھیں آبرو کے ساتھ زندہ رہنے کا موقع بھی

دینا چاہئے۔ ایسا نہ ہو تو دنیا کبھی تہذیب یافتہ نہیں ہو سکتی۔"

نفاست کی آنکھوں میں باپ کے لئے محبت کی چمک آگئی۔ وہ مسکرا دیا اور مشفقانہ سعادت کا ہاتھ دبا کر کہا۔

"ابا۔ آپ نے درست کہا لیکن 1857 کی جنگ بغاوت نہیں جنگ آزادی تھی۔"

"نفاست اب چپ رہو۔ آج ان سب باتوں کا دن نہیں ہے۔ دعا کرو کہ فردوسی خوش رہے۔" سعادت کی بیوی کھانا ختم کر چکی تھی۔ اس نے اپنے گلے سے سرخ گلاب کا ہار اتار کر میز پر رکھتے ہوئے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"خوشی اور غم۔ ہم اپنی زندگی پیچیدہ کر دیتے ہیں اور بعد میں اس پر غم کرتے ہیں۔" نفاست نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ کسی سوچ کی وجہ سے اس کا نچلا ہونٹ بالائی لب کے نیچے دبا تھا۔ آنکھیں سکڑ آئی تھیں اور ایک ابرو ذرا تنا تھا۔

نسیمہ کی محبت نے اسے اپنے والد سے دور کر دیا۔ اسے ڈیوڈ کی الفت میں گھر چھوڑ کر نکلنا پڑا۔ ڈیوڈ اس وقت خودکش بمباری میں مارا گیا جب نسیمہ اس کے بچے کی ماں بننے جا رہی تھی۔ اور بہن فردوسی بیاہ کی وجہ سے ایک اجنبی معاشرے کی ہو گئی ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ ہم سب کس ہوا کی زد میں خشک پتوں کی طرح ناچ رہے ہیں؟ نفاست سوچ رہا تھا۔ اس نے ماں کی آواز سنی۔

"بس فردوسی خوش رہے۔ وہ بالکل انجان گھر میں گئی ہے۔ نہ جانے اس کے ساس سسر کیسے ہوں؟"

"اماں۔ آپ اس کی فکر نہیں کیجئے۔ آپ کی بیٹی کی زندگی میں وہ مداخلت نہیں کریں گے۔ اور فردوسی کے گھر کا ماحول وہی ہوگا جو وہ اور اس کا خاوند پسند کریں گے۔ ہمارے گھروں جیسا نہیں۔"

"ہمارے گھروں میں کیا خرابی ہے؟" سعادت نے بیٹے سے پوچھا۔

"خرابی؟ آج دعوت میں بالی وڈ گانوں کی کیا تک تھی؟ جانے دیجئے کچھ اور باتیں کرتے ہیں۔"

"میں بس اتنا چاہتی ہوں کہ اس کے گھر میں شراب نہیں آئے اور وہ نمازیں پڑھتی رہے۔" نفاست کی والدہ بولیں۔

"ایسا ہی ہوگا۔ فردوسی ہماری بیٹی ہے۔" سعادت بڑے یقین سے بولا۔

"اور اس کے خاوند سے آپ کی کیا توقعات ہیں؟" نفاست کے سوال میں تیکھا پن تھا۔

"وہی۔ وہ اب مسلمان بن چکا ہے۔ نمازیں پڑھ سکتا ہے۔ یہاں کتنی روحانی تشنگی ہے کوئی مجھ سے پوچھے۔" سعادت اپنا منہ نیپکن سے پونچھتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے پر خود اطمینانی تھی۔ جو کچھ وہ سوچتا سمجھتا رہا تھا اس کا اظہار اس نے کر دیا۔

"ابا۔ روحانی تشنگی صرف خدا کا ہو رہنے سے نہیں مٹتی۔ ایسا ہوتا تو دنیا کے عظیم مصوروں کی شاہکار مصوری کے سامنے مسحور ہجوم نہیں نظر آتا اور میوزیکل ہال موزارٹ اور بیتھوون کا نغمہ سننے والوں سے نہیں بھرا رہتا۔"

سعادت نے ناگواری سے اپنا منہ موڑ لیا۔ اس کی کوشش کے باوجود بیٹے میں مذہبی رجحان نہیں پیدا ہو سکا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کبھی کبھی عید کی نماز پڑھنے چلا جاتا اور بعد میں کہتا کہ اس نے تاریخی اور تہذیبی فریضہ انجام دیا ہے۔ اور آج وہ پھر اس کی اس طرح تردید کر رہا تھا جیسے اس کے لئے مذہبی احکامات اہم نہیں تھے۔ اس سے رشتہ رکھنا مشکل تھا لیکن اسے توڑنا اور بھی مشکل۔ فردوسی کی شادی کے اخراجات نفاست نے برداشت کیے تھے۔ سعادت نے محسوس کیا کہ اسے بیٹے کا ممنون نہیں ہونا چاہیے۔

"میں کیٹرر سے کہہ کر آتا ہوں کہ دعوت میں کھانے کا بل مجھے روانہ کرے۔" یہ بولتا ہوا سعادت کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ابا۔ ایسا نہ کیجئے۔ وہ بل مجھے بھیجے گا۔" نفاست نے سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کا منہ کھلا تھا اور چہرے پر عاجزی تھی۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" سعادت سختی سے بولا۔

"ابا۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں دعوت پر جو رقم خرچ کرنا چاہتا ہوں وہ آپ پر احسان نہیں ہے۔ وہ تو میری بہن کے لئے ایک تحفہ ہے۔"

"ہائے اللہ۔ باپ بیٹے میں پھر جھگڑا ہونے لگا۔" سعادت کی بیوی بے بسی سے بولی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

سعادت دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے خیال آنے لگا کہ یہ وقت تلخ بحث مباحثے کا نہیں ہے۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ اس کی زندگی میں سکون کیوں نہیں ہے؟ اس کے بچوں کی زندگی اس کی توقعات سے مختلف کیوں ہوگئی؟ کاش بیٹی نے کسی ایسے شخص کو پسند کیا ہوتا جس کا تعلق اس کے معاشرے سے ہوتا۔ سچ تو یہ تھا کہ اس کی دلی خواہش تھی کہ اسے کوئی پاکستانی پسند آتا۔ اس کے دل میں غصہ ان پاکستانی حکمرانوں سے تھا جن کے لیے اس کا بنگال ان کی ملکیت تھی جہاں وہ من مانی کر سکتے تھے اور جہاں کے رہنے والے ان سے کم تر تھے۔

"میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ دیگر افراد کتنے اطمینان کی زندگی گذارتے

ہیں۔ خلیل پر نظر ڈالو۔ اس کی کوئی اولاد نہیں۔ جیسا سننے میں آیا ہے اس کی بیوی سے نہیں بنتی۔ لیکن دونوں کتنے مطمئن نظر آتے ہیں۔" سعادت سر جھکائے ہوئے بجھی آواز میں بولا۔

"ابا۔ معاف کر دیجئے۔ میں نے آپ کا دل دکھایا۔ میرا دل بھی دکھا ہے اور نسیمہ بھی ناراض چلی گئی۔"

تینوں چپ ہو گئے اور ہال کی بڑی کھڑکی کے باہر دیکھنے لگے۔ جون کی مرجھائی ہوئی شام آہستہ آہستہ رخصت ہو رہی تھی۔ تین ہنس تالاب سے نکل کر کنارے پر خاموش کھڑے تھے۔ دور تک ترشی ہوئی گھاس سے بھرا میدان اور ان سے پرے برگد اور ایلڈر کے درخت۔

"کیسا خالی پن لگ رہا ہے۔ کچھ دیر پہلے وہاں مہمانوں کے رنگ برنگے کپڑوں کی بہار تھی۔ اب تو درختوں کا سبز رنگ بھی مرجھایا ہوا لگ رہا ہے اور ہنس نہ جانے کس کا انتظار کر رہے ہیں؟" سعادت کی بیوی نے کہا۔

"اماں۔ وہ ہنس اگر گم سم ہیں تو شاید انھیں احساس ہے کہ فردوسی اب ہماری نہیں رہی۔" نفاست بولا اور مشفقانہ ماں کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"یہ تو ہونا ہی تھا۔ اب انتظار کس کا ہے؟ چلو اٹھیں۔ عجیب دن رہا۔ اتنی ساری خوشی۔ مہمانوں کا مسکراتے ہوئے مبارکباد دینا۔ گانا، رقص اور رنج بھی۔ شاید یہی زندگی ہے۔ اسی طرح سب کچھ ہوتا ہے۔" سعادت ایک غمگین مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

تینوں کھانا ختم کر چکے تھے۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ویٹرسوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہال کے باہر کار پارک کی جانب چل دیئے۔

چار

خلیل بیزاری سے کار چلا رہا تھا۔ دلشاد نے کار پارک سے نکلتے وقت فرمائش کر دی کہ بجائے سیدھے گھر جانے کے پارک شائر مور سے ہوتے ہوئے جائیں۔ وہاں پہاڑیاں اور وادیاں جنگل سے بھرے تھے اور ایک ننھی سی ندی بھی ان کے درمیان سے گذرتی تھی۔ ادھر سیر کے لئے جانے کی خواہش بری نہیں تھی۔ لیکن دلشاد کچھ دیر پہلے سمندر کے کنارے سے گھوم کر آ چکی تھی۔ خلیل نے محسوس کیا کہ اس کی خواہش عجیب سی ہے۔ جلد ہی اسے سمجھنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ دلشاد نے محض اسے تنگ کرنے کے لئے ایسی فرمائش کی ہے۔ خلیل نے سوچا کہ انکار کر دے۔ لیکن اسے پتہ تھا کہ دلشاد کی خفگی میں مزید اضافہ ہوگا۔ اس کے بعد اس پر ایک سنگین خاموشی چھا جائے گی وہ گھر جا کر بستر پر پڑ جائے گی اور نہ اسے چائے ملے گی اور نہ ہی نثار کے لئے معمولی میزبانی کے فرائض انجام دینا دلشاد پسند کرے گی۔ سچ تو یہ تھا کہ دلشاد کا ناراض ہونا غلط نہیں تھا۔ خلیل بغیر اسے اطلاع دیئے مینا کو اس کے گھر لے گیا اور خاصی دیر کے بعد وہاں سے لوٹا۔ اور دلشاد نے کسی سے سنا کہ جب وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک جوان خوبرو لڑکی تھی۔ خلیل نے ان سب کی بابت ہلکا سا بھی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ اسی لئے دلشاد نے خاموش جنگ کی ابتدا کر دی تھی۔ جب وہ تنگ سڑک آ گئی جو کونسل کالج کے سامنے سے گذرتی ہوئی آگے تالاب کے کنارے پارک شائر مور کی جانب مڑتی تھی تو خلیل نے کار کا رخ ادھر کر دیا۔ اب دونوں جانب پہاڑیاں تھیں اور ان پر گھنا جنگل جس کی وجہ سے دھوپ یہاں نہیں تھی۔ تاریکی کا سحر تھا اور خاموشی تھی۔ نثار نے عجیب سا سکون محسوس کیا۔ اس نے پیر پھیلا دیئے اور دزدیدہ نگاہوں سے خلیل کی جانب دیکھا جس کی پیشانی پر بل تھے اور ابرو سکڑے ہوئے۔ نثار نے محسوس کر لیا کہ اسے کچھ پریشانی ہے۔ لیکن اس کی بابت اسے کوئی جستجو نہیں تھی۔ جس ملک کی رسم ہو کہ کسی کے نجی حالات میں مخل مت ہو اسے توڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔ نثار نے سوچا اور سر پیچھے ہیڈ سٹ پر ٹکا کر گنگنانا شروع کر دیا۔

دلشاد غصہ میں تھی اس لئے پیچھے کی نشست سے آتی نثار کی گنگناہٹ اسے ناگوار لگی۔ آخر اس کے ضبط کی دیوار ٹوٹ گئی اور تلخ لہجہ میں اس نے پوچھا۔

"خلیل۔ آپ مجھے بتا کر کیوں نہیں گئے؟"

خلیل نے محسوس کیا جیسے لومڑی کھیائی ہے۔ جب بھی بیوی غصہ میں آتی تھی وہ اسے اسی طرح کی کوئی ذی حس محسوس ہوتی تھی۔ قصور اس کا ضرور تھا لیکن ہمیشہ کی طرح اس کا اعتراف کرنا اس نے ضروری نہیں سمجھا۔

وہ چپ رہا۔

"آپ خاموش کیوں ہیں جواب کیوں نہیں دیتے؟"

"تم تو اس طرح پوچھ رہی ہو جیسے میں نے کوئی جرم کیا ہے۔ ڈاکٹر مینا کی کار کسی نے چرانے کی کوشش کی اور انھیں پیٹا بھی، وہ بڑی پریشانی میں مبتلا تھیں جلد گھر جانا چاہتی تھیں۔ میں انھیں پہنچانے چلا گیا تھا۔ نثار سے میں نے کہہ دیا تھا کہ تمھیں بتا دے۔"

"یہ اچھی رہی۔ میری اہمیت تو آپ کے دل میں کبھی نہیں رہی۔ مجھے خود بتا دیتے تو آپ کی ہتک ہو جاتی۔ اور وہ لڑکی کون تھی جسے اپنے ساتھ آپ لائے تھے؟"

خلیل کا دل چاہا کہ کہہ دے کہ وہ میری اور ساندرا کی بیٹی تھی۔ اگر وہ ساندرا سے شادی کرتا اور دونوں کی اگر بیٹی ہوتی تو آج نسیمہ کے عمر کی ہی ہوتی۔ رنگ البتہ بہت صاف ہوتا۔ اپنی سوچ سے اسے فرحت ہوئی۔ بیوی

جب غصہ میں آئے تو کسی بھولی بسری محبوبہ کے تصور سے مسرت تو ہوتی ہے۔ خلیل اسی لئے خوش تھا۔

"وہ ڈاکٹر مینا کی بیٹی تھی۔"

نثار ہنس پڑا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ خلیل جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کی گنگناہٹ بند ہوگئی تھی اور وہ میاں بیوی کی نوک جھونک سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"آپ کی لاپرواہی کی بھی کوئی حد ہے۔ آپ کے انجائینا کی گولیاں میرے پرس میں تھیں۔ گھر سے چلے تو اسے ساتھ لینا بھول گئے۔ میں نے انھیں رکھ لیا تھا۔ وہاں سینہ میں درد اٹھتا تو کیا کرتے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ موت آجاتی اس سے زیادہ اور کیا ہوتا۔"

"آپ رنڈاپے کی زندگی میں خوش رہ سکتے ہیں مجھ سے بیوگی برداشت نہیں ہوسکتی۔" کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے دلشاد نے جواب دیا۔

ان کی زندگی میں اسی طرح ہوتا تھا۔ جھگڑا، مصالحت، قربت کی خواہش اور کبھی دور رہنے کا خیال۔ زندگی کے بہت سارے رنگوں کے یہ انوکھے رنگ تھے۔ خلیل نے سکون محسوس کیا۔ اب فساد کی نوبت نہیں آئے گی۔ اس نے سوچا۔

"نثار۔ تم نے گنگنانا کیوں بند کردیا؟"

"نثار بھائی کچھ گائیے۔ میاں بیوی کے جھگڑے کے پس منظر میں آپ کا الاپنا اچھا لگے گا۔"

نثار نے دلشاد کے طنز کا برا نہیں مانا۔ وہ اسے اس دن سے جانتا تھا جب خلیل کی اس سے شادی ہوئی تھی۔ اس طرح کی چھیڑ چھاڑ دونوں میں اکثر ہوتی تھی۔ قبل اس کے کہ وہ جواب دیتا خلیل نے ہاتھ بڑھا کر کار کے ریڈیو کا بٹن دبا دیا۔ بی بی سی کی خبریں ہو رہی تھیں۔ اس نے آواز تیز کردی۔

"خلیل۔ آپ دن رات اخبار پڑھتے رہتے ہیں اور ٹی وی پر جو خبریں نشر ہوتی ہیں ان کے سننے میں وقت گذارتے ہیں پھر آپ اس شام کو کیوں تباہ کررہے ہیں؟" دلشاد نے شکایت کی۔

خلیل نے ان سنی کردی۔ اس نے آواز دھیمی نہیں کی اور نہ ہی راستے کے پیچ و خم پر کار کی رفتار میں کمی کی۔ اچانک خبر سے اطلاع ملی کہ کراچی میں کسی خودکش بمبار کے حملے سے کئی افراد مارے گئے ہیں اور ان گنت زخمی ہوئے ہیں۔ خلیل کے کان کھڑے ہوگئے۔ دلشاد نے ہاتھ بڑھا کر ریڈیو بند کردیا۔

"خلیل۔ آپ کو بس ضد ہوجاتی ہے۔ سکون بھی کوئی شے ہوتی ہے۔ میری خوشی کی کبھی پرواہ نہیں کی آپ نے۔ ہوا کرے دنیا میں دھماکے ہمیں اس سے کیا... اچھا ہوتا کوئی بم ہماری کار کے نیچے پھٹتا پھر سارا قصہ ہی ختم ہوجاتا۔" دلشاد غصہ سے بولی اور دوسری جانب منہ پھیر کر پہاڑیوں کو دیکھنے لگی جس پر درختوں کی شاخیں ایک دوسرے سے الجھی تھیں۔ اس کا خاوند عجیب و غریب انسان ہے۔ جسے گھر کے اندر کی یکسانیت گراں نہیں گذرتی۔ جس گھر کے کمروں، دروازوں اور دریچوں میں تبدیلیاں نہیں آتی ہوں، وہاں لمحات کا زہر اسے کیوں نہیں ڈستا؟ اس وقت اسے کھلی فضا میں پہاڑیوں کے درمیان گذرتے ہوئے، رنگ و روپ سے نکھرے درختوں، جھاڑیوں اور ان کے درمیان بہتی ندی اور یہ سناٹا اسے کیوں نہیں بھلا لگ رہا ہے؟ دلشاد سوچ رہی تھی۔

خلیل جھنجلا اٹھا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے کچھ کہا تو دلشاد پھٹ پڑے گی اور چیخ چیخ کر اسے صلواتیں سنانے لگ جائے گی۔ بہتر یہی تھا کہ وہ خاموش رہے۔ یہی وہ ہتھیار تھا جس سے وہ دلشاد پر حملے کرتا تھا۔ بیوی کی کوئی بات بری لگے تو خاموش ہوجاؤ۔ دن رات چپ رہو۔ وہ کچھ کہے تو ہاں ہوں میں جواب دے کر خاموشی کے خول میں گم ہوجاؤ۔

آخر سیر ختم ہوئی اور وہ گھر واپس آگئے۔ ڈرائیو میں نثار کی مرسڈیز اسپورٹس کار کھڑی تھی۔ گرمی کی دھندلائی دھوپ میں گلاب اور پینزی کے زرد پھول چمن میں مسکراتے نظر آئے۔ جیسے گھر کے اندر جو گھٹن رہتی تھی اس پر طنزیہ ہنس رہے ہوں۔ جیسے کہہ رہے ہوں زندگی چند روزہ سہی لیکن اس میں خوش رہ سکتے ہیں۔ زندگی کو حسین بنا سکتے ہیں۔

"لیجئے بیگم صاحبہ۔ سیر ہوگئی اور ہم گھر آگئے۔" خلیل اکتائی آواز میں بولا۔

"شکریہ۔ میں چلی لیٹنے۔ تھک گئی ہوں۔ نثار بھائی سلام علیکم۔" دلشاد بے دلی سے بولی۔ ہاتھ اٹھا کر نثار کو الوداع کہا اور گھر کے بند دروازے کی جانب بڑھی۔ پرس سے اس نے دروازے کی کنجی نکالی اور گھر کے اندر جا کر تاریکی میں گم ہوگئی۔

"خلیل۔ میں بھی جا رہا ہوں۔ میرا گھر خالی ہی ہوگا۔" نثار نے کہا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

"یہاں بھی یہی ہے۔ خالی پن... سناٹا... زندگی کے روگ۔ جسے برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ہر دن... ہر رات۔ یہی تلاش خوشی ہے۔ اداس نہ رہنا ہی مسرت ہے۔" خلیل نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دے کر دوست کو رخصت کردیا۔ ■■

Mustafa Karim. Email:karim@btinternet.com

ڈرامہ

روپ متی اور باز بہادر

اسیم کاویانی

■ نصرت صاحب، میں نے آپ کو 'روپ متی اور باز بہادر' نامی ڈراما ارسال کیا تھا۔ اس کی روداد یہ ہے کہ 1994 میں 'کتاب نما' میں اردو تھیٹر ٹرسٹ ،بنگلور' کی جانب سے اردو ڈراما نگاری کے مقابلے کے لئے ایک اشتہار چھپا تھا۔ اول انعام شاید پانچ ہزار روپوں کا تھا۔ روپ متی باز بہادر کے قصے میں شامل رومان، سازش، تصادم، اور ٹریجڈی کے عناصر عوامی دل چسپی کے حامل ہیں، اس لئے میں نے یہ ڈراما لکھ کر رجسٹرڈ ڈاک سے روانہ کر دیا تھا اور بذریعہ رجسٹری ڈرامے کی واپسی کے لئے ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ بھی ملفوف کیا تھا۔ ایک سال تک نہ تو اس مقابلے کے نتائج کا کہیں اعلان چھپا نہ وہاں سے ڈراما واپس آیا، نہ کسی خط کا جواب ملا۔ میرے پاس ڈرامے کی نقل نہیں تھی، اس لئے میں نے 'نشیمن' کے امیر اللہ شاہ نظامی صاحب کو اپنی تشویش سے آگاہ کیا۔ نظامی صاحب نے بڑی زحمت اٹھائی۔ اردو تھیٹر کے کرتا دھرتا دو تین پتے بدل چکے تھے۔ نظامی صاحب نے ایک کے بعد دوسرا پتا ڈھونڈتے ہوئے بالآخر انھیں جالیا۔ ان حضرت نے مجہول سے حیلے حوالوں سے اپنی بے عملی چھپانے کی کوشش کی، لیکن بہر حال انھوں نے فوری طور پر یہ ڈراما مجھے رجسٹری سے لوٹا دیا۔

پندرہ برس تک یہ ٹھنڈے بستے میں پڑا رہا۔ سال ڈیڑھ سال قبل میں نے اس پر نظر ثانی کی، اور مزید مطالعے کی روشنی میں تعارف کا اضافہ کیا، اور اشاعت کی غرض سے دفتر 'آج کل' میں بھیج دیا گیا۔ خورشید اکرم صاحب غالباً اس کی اشاعت میں دلچسپی رکھتے تھے، اس لئے انھوں نے مجھے یہ ڈراما اپنے ذاتی E-mail پتے پر ای میل کرنے کے لئے کہا تھا کہ اچانک ان کی جگہ ڈاکٹر ابرار رحمانی صاحب نے لے لی۔ ان کا جواب یہ ملا کہ ڈراما بہت اچھا ہے، لیکن 'آج کل' اس کی ضخامت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد یہ ڈراما 'ذہن جدید' میں بھیجا گیا۔ زبیر رضوی صاحب نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے یوں لکھا تھا کہ یہ ڈراما 'انارکلی' کی طرح ادبی لحاظ سے پڑھنے میں لطف دیتا ہے، لیکن اسے اسٹیج کرنے میں دشواری ہے۔ اگر اسٹیج کیا جائے تو سیٹ بہت گراں خرچ ہوں گے اور 'زیوا کنڈ' کا پس منظر فراہم کرنا محال ہے۔ انھوں نے اصرار کر کے ڈرامے کا تعارفی حصہ 'ذہن جدید' نمبر 55 میں چھاپنے کی اجازت چاہی تھی، جو انھیں ہمیشہ بہت پسند آیا تھا، اور پیش کش کی تھی کہ چونکہ وہ اردو ڈراموں کے انتخابات شائع کرتے رہتے ہیں، اس لئے اگر میں چاہوں تو وہ 'روپ متی باز بہادر' کو اپنے ڈراموں کے آئندہ کسی انتخاب میں شامل کرنا چاہیں گے۔ میری خاموشی کو رضا مندی جان کر انھوں نے ڈرامے کا تعارف خود ہی کمپوز کرا کے 'ذہن جدید' میں چھاپ دیا (اس لیے کمپوزنگ کی غلطیاں راہ پا گئیں)۔

آپ کو اس ڈرامے میں کوئی خوبی نظر آئے تو شائع کریں ورنہ پھیر دیں۔ مجھے احساس ہے کہ عام طور پر قاری طویل تحریروں کے مطالعے کے متحمل نہیں ہوتے۔ اس لئے طے کیا ہے کہ اپنی آئندہ تحریروں میں اختصار کا پہلو پیش نظر رکھوں گا۔ **اسیم کاویانی**

روپ متی اور باز بہادر کے رومان کی داستان سب سے پہلے 1599 میں (اکبر کے عہد حکومت کے 43 ویں برس میں) احمد العمری نے تحریر کی تھی، جو اکبر بادشاہ کے ایک پنج ہزاری منصب دار شرف الدین حسین مرزا کے وابستگان خدمت میں سے تھا، اور جس نے جہاں گیر کے عہد حکومت کے آغاز تک حیات پائی تھی۔ احمد العمری نے روپ متی اور باز بہادر کی داستان عشق ابتدا سے اس کے الم ناک انجام تک ایک عینی شاہد سلیمان خان کی زبانی سنی تھی، جو ان دونوں کا معتمد، وفادار اور باز بہادر کے عیش کدے کی دیکھ ریکھ کا افسر اعلا تھا۔

یہ داستان پوری تفصیل اور محققانہ تعارف کے ساتھ پہلی بار ایل ایم کرمپ کی کتاب 'The Lady of the Lotus -Queen of

Mandu' کے ذریعے روشنی میں آئی۔ جس کا پہلا اڈیشن آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، لندن سے 1926 میں شائع ہوا تھا۔ کرمپ نے اپنی کتاب کی بنیاد احمد العمری کے قلمی نسخے کی ایک نقل پر رکھی ہے، جس کا ترجمہ اس نے A Strange tale of faithfullness کے نام سے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ کرمپ نے اپنی اس کتاب کا کام 1923 میں اپنے مانڈو کے زمانہ قیام میں شروع کردیا تھا، جہاں وہ اپنے دوست اور میزبان میجر ہز ہائی نیس سراُودے جی راؤپوار کے مہمان تھے۔ ہز ہائی نیس پوار، اپنے پرکھوں کی وراثت کے امین ایک مراٹھا پرنس تھے۔ کرمپ نے اپنی یہ کتاب ان ہی کے نام معنون کی تھی لیکن طباعت کے دوران ہی میں ہز ہائی نیس کا انتقال ہوگیا۔

کرمپ کی کتاب میں مانڈو اور باز بہادر کے عہد کی باقیات کی کئی تصویریں شامل ہیں۔ ان میں مغل دور سے منسوب مصوروں (سانولا، گوردھن اور چترا من) کی اُن تاریخی تصاویر کے فوٹو بھی دیے گئے ہیں، جن کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ اس مخطوطے کے ورثا نے مخطوطے کی تزئین کے لیے بعد میں یہ تصویریں بنوا کر اور کہیں کہیں اپنے تاثرات لکھ کر اس میں منسلک کردیے تھے۔

کرمپ (L M Crump C I E) نے اپنی کتاب کے تعارف میں تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ احمد العمری کے 1599 کے قلمی نسخے سے 1653 میں نقل کردہ ایک مخطوطے کے منتشر اجزا بہم پہنچانے میں بھوپال کے بشیر الدین بی اے، ایل ایل بی نے کتنی مشقت اٹھائی اور فارسی سے انگریزی ترجمہ کرنے میں بھی ان کا کتنا ہاتھ بٹایا۔ اس کے علاوہ سیہور کے ایل ایس بال بھدر اسنہا اور پنڈت گلاب شنکر دکشت نے روپ متی کی (یا اس سے منسوب) کویتاؤں کے انگریزی ترجمے میں مدد کی تھی اور کونیل C E Laurd نے کرمپ کی تلاش و جستجو کو آسان بنانے میں، آرکیالوجیکل ڈپارٹمنٹ آف انڈیا کی اجازت سے آگرہ میوزیم میں رکھے مجموعہ وقایع اور تاریخی روزنامچوں سے استفادے کا موقع دے کر معاونت کی تھی۔ اپنی کتاب کے دوسرے اڈیشن میں کرمپ نے بشیر الدین کا دوبارہ شکریہ ادا کیا تھا کہ انھوں نے کتاب کے پہلے اڈیشن کی بعض غلطیوں کی نشان دہی اور تصحیح کی تھی۔

کرمپ کی رائے میں العمری شاعرانہ مزاج کا حامل تھا۔ اس نے مرصع و پُرتکلف عبارت میں یہ قصہ لکھا ہے، لیکن اس کا انداز بیان اصلیت اور سچائی سے معمور ہے۔ وہ ہندی تہذیب و روایات سے بھی واقف تھا اور اچھا تاریخی شعور رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک مشرقی مصنف ہونے کے باوجود اس نے اس دور کے اعتبار سے صنف نازک کے تعلق سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، انھیں کافی جدید یہاں تک کہ یورپی کہا جاسکتا ہے۔

کرمپ نے اپنی کتاب کے تعارف میں لکھا ہے کہ: ہندستانی مائتھا لوجی میں کنول کی خاص اہمیت ہے۔ جسے سمندر نے جنما۔ اسی کنول سے برہما نمودار ہوئے، اور دیوی لکشمی بھی۔ (سمندر منتھن کے وقت کنول کے پھول پر تیرتی ہوئی پائی گئی تھیں۔ اس لیے انھیں پدما، کملا بھی کہا جاتا ہے۔ ایم) اندر دیوتا کی محبوب نرتکی رمبھا اور عورتوں کی چار مشہور قسموں میں، سب سے بہترین قسم پدمنی کی تخلیق بھی کنول سے منسوب ہے۔ اسی طرح ماضی کے سنہرے وقتوں میں دروپدی، سیتا اور ساوتری کے کردار بھی اپنی پاکیزگی حسن اور اپنے داستانوی تناظر میں، کثافت میں لطافت کو بچائے رکھنے کی بنا پر حسن و سرشت نیلوفری کے حامل ہیں۔ اس زمانے میں جب کہ ہر طرف برائیاں پھیلی ہیں۔ پیار و وفا کی پیکر روپ متی کا کردار بھی کسی اعتبار سے ان سے کم نہیں ہے۔

۲

'آئین اکبری'، 'اکبر نامہ'، 'طبقات اکبری'، 'ماثر الامرا'، 'منتخب التواریخ' (بدایونی) اور 'تاریخ فرشتہ' میں روپ متی کے قصے کا ذکر موجود ہے۔ بلاک مین Blochmann سر جون مالکم Sir John Malcom کننگھم Sir ACunningham اور آرڈ وغیرہ محققین نے قصے پر تاریخی نظر سے روشنی ڈالی ہے۔

روایتوں میں مشہور ہے کہ روپ متی کا جنم نربداتٹ پر 'دھرم پوری' نامی گاؤں میں ہوا تھا، لیکن کرمپ نے العمری کے بیان اور سرجان مالکم کی تحقیق سے اتفاق کیا ہے کہ روپ متی کی جائے پیدائش سارنگ پور تھی۔

العمری نے لکھا ہے کہ روپ متی کے اشعار اور اس کی رعنائی خیال سے روپ متی کا ایک تعلیم یافتہ برہمنی ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا بیان ہے کہ روپ کی ماں نے اپنے پتی کی موت کے بعد اس کے بھائی سے بیاہ کرلیا تھا، جب کہ اس عہد میں بیوہ کے بیاہ کا رواج تھا، نہ دیور یا جیٹھ سے بیاہ ہی ممکن تھا، اسی لیے محققین کی اکثریت نے اسے برہمن زادی تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔

البتہ یہ بتایا جاتا ہے کہ راجپوت نسل کی ایک جات 'کبوتری' کہلاتی ہے۔ روپ کا اس جات کی ہونا، ممکن ہے، چوں کہ کبوتری جات کے لوگ سنگیت، نرتیہ اور ناٹیہ کلا سے جڑے ہوتے ہیں۔ روپ متی کے شوق شکار کا ذکر بھی اس کے برہمن ہونے کی تردید کرتا ہے۔

باز بہادر سے اس کے رشتے کی نوعیت کے بارے میں بھی مختلف رائیں ملتی ہیں۔ فرشتہ نے اسے ایک درباری نرتکی بتایا ہے، اور 'ماثر الامرا' نے اسے مغنیہ لکھا ہے۔ 'اکبر نامہ' سے واضح نہیں ہوتا کہ روپ ملکہ تھی یا نرتکی، لیکن اس کا ذکر عزت کے پیرائے میں کیا گیا ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ مورخ اسے ملکہ سمجھتا ہے۔ احمد العمری نے اس کے لیے ہندی لفظ پتر Mistress

لکھا ہے، جس کے معنی محبوبہ، آشنا یا معشوقہ کے ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ باز بہادر کا میلان دیکھ کر روپ کے پتا نے اس کا ہاتھ باز کے ہاتھ میں دے دیا تھا، جس کے عوض میں وہ جاگیر سے نوازا گیا تھا۔ 'طبقات اکبری' میں اسے باز بہادر کی محبوب ملکہ بتایا گیا ہے۔ الفنسٹن ElphinstoneL779-1859 نے اپنی کتاب 'ہسٹری آف انڈیا' میں خافی خان کے حوالے سے روپ متی کو باز بہادر کی ہندو زوجہ بتایا ہے، جو حسن مجسم اور مشہور شاعرہ تھی۔

جو محققین روپ کو باز بہادر کی ملکہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، ان کی دلیلیں یہ ہیں کہ (1) روپ متی نے اپنا نام بدلا نہ دھرم (2) باز بہادر سے اس کے بیاہ کی رسم کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ (3) وہ پردہ نہیں کرتی تھی۔ (4) باز بہادر کے دربار میں اس کے رقص کرنے کا ذکر بھی اس کے ملکہ ہونے کے status کی تردید کرتا ہے۔ خود روپ اپنی کویتاؤں میں باز سے اپنے تعلق کو اتحاد یا ملاپ یا اتصال کے لفظ سے تعبیر کرتی ہے۔

اس باب میں سارے مورخین متفق ہیں کہ ان کے عشق کی کہانی سچی ہے۔ فرشتہ نے نسبتاً تفصیل سے باز بہادر کے احوال میں روپ متی کی وفا شعاری کا تذکرہ کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ باز بہادر اور روپ متی کے عشق کا چرچا سارے ملک میں ہو گیا تھا۔ 'اکبر نامہ' میں ابوالفضل کو لکھنا پڑا کہ اس وفا شعار نے باز بہادر کے عشق میں بہادرانہ زہر پی کر اپنی جان دے دی۔ طبقات اکبری میں لکھا ہے: 'در وقت ہزیمت، خواجہ سرای باز بہادر، روپ متی را بزخم شمشیر مجروح ساخت، تا بدست بیگانہ نیفتد۔ چوں ادہم خان روپ متی را طلب داشت۔ روپ متی از غیرت زہر خوردہ ہلاک شد۔' ص 152

اکبر نامہ میں ذکر ہے کہ روپ متی کی موت سارنگ پور میں ہوئی، لیکن یہ معتبر نہیں۔ 'آئین اکبری' اور 'مآثر الامرا' میں بیان کیا گیا ہے کہ باز بہادر اور روپ متی دونوں ایک ساتھ دفنائے گئے اور ان کا مقبرہ اُجین کے ایک تالاب کے بیچ میں موجود ہے، لیکن اُجین میں ایسے کسی تالاب کا نشان نہیں ملتا۔ کرمپ نے لکھا ہے کہ سارنگ پور کے شمال میں ایک میل دور کالی سندھ ندی کے ساحل پر ایک سرودر کے بیچ ایک مقبرہ روپ متی اور باز بہادر کا مانا جاتا رہا ہے جب کہ Abbott نے 1835 میں 'MANDU' کے تذکرے میں لکھا تھا کہ سارنگ پور میں انھوں نے خود روپ متی اور باز بہادر کا مقبرہ دیکھا تھا، جسے باز بہادر نے اپنے عہد حکم رانی میں تیار کرا لیا تھا۔ اغلب ہے کہ روپ متی کے باقیات کو مانڈو سے یہاں لا کر دفن کیا گیا ہو۔ روپ متی کی آخری خواہش تھی کہ اس کے پہلو میں باز بہادر کی جگہ ہو۔ روایت ہے کہ اس کے مقبرے پر 'روپ متی' پکارا جاتا تو 'باز بہادر' کی بازگشت سنائی دیتی تھی۔ برسوں بعد اس وقت روپ کی بے قرار روح ضرور آسودہ ہوئی ہوگی، جب باز بہادر کی موت کے بعد اس کی لاش یہاں لا کر روپ کے پہلو میں دفن کی گئی ہوگی۔

۳

:The Lady of The Lotus-Queen of Mandu

دریائے ریوا کی وادی میں دھرم پوری نامی گاؤں میں راٹھوڑ برہمن طبقے کا ایک رئیس جادو رائے بستا تھا۔ اس کی اہلیہ نے ریوا کی اُپاسنا کر کے روپ متی کو پایا تھا۔ اس خطے کے سبزہ زاروں میں جہاں ہوائیں مستی میں گیت گنگنایا کرتی تھیں، پیڑوں کے پتے لہلہاتے دف بجایا کرتے تھے، پھولوں سے لدی ڈالیاں جھومتی ہوئی رقص کیا کرتی تھیں اور دریائے ریوا کا ہیم جل ترنگ روح کو سرشار کیے رہتا تھا۔ فطرت کی ان رعنائیوں سے نہال روپ متی نے اپنی عمر کا چودھواں سال پورا کیا تھا۔

باز بہادر کا حسنِ اتفاق سے روپ متی تک پہنچنے کا بیان ہمارا دھیان کالی داس کے یہاں تپ ون میں راجا دشینت کی شکنتلا سے ملاقات کی طرف لے جاتا ہے۔ روپ متی اپنی خادمہ کے ساتھ جنگل میں ایک تالاب کے کنارے بیٹھی ہوئی کوئی گیت گنگنا رہی ہے۔ ساتھ ہی اپنے ہاتھ پیر دھونے اور پھر چنبیلی کے پھولوں کے گجرے سے اپنی زلفوں کو سجانے میں لگ جاتی ہے۔ ایسے میں باز بہادر جو اپنے شوق شکار میں ایک ہرن کا پیچھا کرتے ہوئے، اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا تھا۔ روپ متی کی مدھر آواز سے کھنچا یہاں آنکلتا ہے، ایک برگد کے پیڑ کی اوٹ سے محو نظارۂ جمال ہوتا ہے اور ساتھ ہی روپ کے عشق میں بے حال۔

قصہ مختصر باز بہادر اپنے آپ کو روپ کے سامنے ظاہر کر دیتا ہے اور اپنے عشق کا اظہار کرتے ہوئے اسے اپنی رانی بنانے کی پیش کش کرتا ہے۔ عہد شباب کی دہلیز پر کھڑی روپ متی کو مردانہ وجاہت اور مالوہ کی سلطنت کے مالک باز بہادر کی پیش کش میں خوش بختی کی ایک نئی دنیا بانہیں پھیلائے اپنی طرف بلاتی نظر آتی ہے، لیکن اس انجانی دنیا کے اندیشوں، دھرم کی خلیج اور سماجی نابرابری کی رکاوٹوں کا خیال ذہن میں آتے ہی وہ اپنا پہلو بچاتے ہوئے ایک ناممکن العمل شرط سامنے رکھ دیتی ہے۔ روپ متی اپنے ہاتھ سے مانڈو کے کوہستانی سلسلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے باز بہادر سے کہتی ہے کہ جب تک مقدس ریوا کا نرمل جل، اُس بلندی پر واقع محلوں میں نہیں جائے گا، تب تک وہ شادی نہیں کر سکتی!

باز بہادر اس شرط کو پورا کرنے کی اُدھیڑبن میں لوٹتا ہے۔ ادھر روپ متی کی خادمہ، روپ متی کے والدین سے اس کی باز بہادر سے ملاقات کا راز

افشا کر دیتی ہے۔ جادو رائے بھلا حاکم وقت کی مخالفت کا حوصلہ کہاں کر سکتا تھا وہ روپ متی کو افیم سے بھرا پیالا دے کر اسے کمرے میں بند کر دیتا ہے کہ وہ صبح سے پہلے اسے پی لے اور خاندان کی ناموس پر قربان ہو جائے۔ اس کمرے میں رات کے وقت روپ کو نربدا دیوی درشن دیتی ہے اور اسے خود کشی سے باز رہنے کی صلاح دیتے ہوئے بتاتی ہے کہ مالوہ میں محل کے قریب تمرس کی جھاڑیوں کے نیچے ایک چشمہ نمودار ہوگا، جس سے ایک آب جو محل کے حوض تک رواں کر کے تم میرے نرمل جل سے سیراب ہوتی رہوگی۔ پس اسی لمحے روپ متی افیم کے پیالے کے بجائے محبوب کے ہونٹوں کے پریم رس سے اپنی تشنگی مٹانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔

باز بہادر کے خادم خاص سلیمان خان کے ذریعے پدر شجاعت خان، اپنے پسر بازید خان کے عشق سے آگاہ ہوتا ہے اور وہ باز کو اس عشق سے باز آنے کی صلاح دیتا ہے۔ کچھ دنوں بعد شجاعت خان کا انتقال ہو جاتا ہے۔ چھ ماہ بعد باز بہادر جادو رائے کو طلب کرتا ہے اور اسے جاگیر و انعام سے نوازتا ہے۔ جادو رائے روپ متی کا ہاتھ باز بہادر کے ہاتھوں میں سونپ دیتا ہے۔ نربدا دیوی کی پیش گوئی کے مطابق پہاڑ کے کسی پوشیدہ پرنالے کی راہ سے باز بہادر کے محل کے قریب، تمرس کی جھاڑیوں کی تہہ میں پہنچتا ہے [illegible] آب زلال کا ایک چشمہ اُچھلتا اُبلتا نکل پڑتا ہے۔ وہ نرمل جل ایک بڑا تالاب (ریوا کنڈ) بنا کر ذخیرہ کیا جاتا ہے، اور ایک آب جو کے ذریعے محل کے حوض میں پہنچایا جاتا ہے۔

ریوا کے کنارے اپنے محل کے عشرت کدے کی کیف و مستی بھری فضا میں باز بہادر اور روپ متی کے شب و روز بابر کی اس سنت کو تازہ کرنے میں گزرتے ہیں کہ ع بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست! گیت و سنگیت کا سماں بندھتا ہے۔ عشق و الفت کے نغمے گائے جاتے ہیں اور ریاست و حکومت کے کام کاج روز بروز خستہ و خراب ہوتے جاتے ہیں۔

باز بہادر، شجاعت خان کی شجاعت سے قطعاً محروم ہے۔ ہندستان سے افغان اثرات کو کسی بھی قیمت پر مٹانے پر تلے مغل اہل اقتدار کا رخ مالوہ کی طرف پھرتا ہے۔ مالوہ پر پہلا حملہ بہادر خان کی سرکردگی میں ہوتا ہے جو ناکام بنا دیا جاتا ہے۔ اگلی بار ادہم خان ایک بڑی فوج کے ساتھ حملہ کر کے مالوہ کو تسخیر کر لیتا ہے، لیکن باز بہادر جنگ میں بچ کر مالوہ سے نکل جانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

روپ متی ایک مالن کے بھیس میں محل سے فرار ہو کر سارنگ پور سے 20 میل دور اپنے گاؤں جا پہنچتی ہے۔ وہاں پہنچ کر اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے پتا کی موت کے بعد اس کی ماں نے اپنے جیٹھ سے بیاہ رچا لیا ہے۔ وہ اپنے بھائیوں کے پاس پناہ گیر ہوتی ہے۔ ادہم خان کے سپاہی اسے تلاش کرتے ہوئے وہاں جا پہنچتے ہیں۔ روپ متی کے دونوں بھائی، بہن کو بچانے کی کوشش میں سپاہیوں سے لڑائی میں جاں بحق ہو جاتے ہیں۔

ادہم خان فتح کے نشے میں چور عیش و نشاط اور سیر و شکار میں مشغول ہے۔ روپ متی کو تین دن تک کی سوگ کی مہلت ملتی ہے اور پھر سہاگ کا جوڑا پہنا کر وہ ادہم خان کے حجلۂ عروسی میں پہنچا دی جاتی ہے، لیکن جس وقت ادہم خان اس کے پاس پہنچتا ہے، روپ متی اپنی نجات کی کوئی صورت نہ دیکھ کر زہر کھا کر عالم بالا کی راہ لے لیتی ہے۔

العسری روپ متی کے جذبۂ عشق اور وفا کیشی سے غیر معمولی طور پر متاثر ہے، اور اسی تناظر میں وہ سارے طبقۂ نسواں کی مدح سرائی میں بڑی وسعتِ قلبی اور کشادہ نظری کا ثبوت دیتا ہے۔ وہ عورت کو مرد کی ماں، زندگی کی مرکز و محور، سکونِ دل اور وفا سرشت قرار دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ دنیا کی تاریخ، مرد کی حماقتوں اور غلط کاریوں سے بھری ہوئی ہے۔ نیکی کا دشمن مرد ہی ملے گا، عورت شاذ ہی ملے گی۔ بچوں کی پرورش و نگہداشت عورت ہی کر پائے گی مرد نہیں کر سکے گا۔ مکر و دغا کا مرتکب بھی مرد ہی ہوتا ہے، جب کہ ہندو عورت تو اپنے پتی کی موت پر پروانہ وار جل مرتی ہے۔

روپ متی کے سراپا کے بیان میں العسری نے بڑی دل کش اور کہیں کہیں نادر تشبیہات و استعارات کا استعمال کیا ہے۔ مثلاً اس کے حسین چہرے کے بیان میں ابروؤں کا ذکر کرتے ہوئے انھیں 'فردوس کی قوسِ قزح' یا 'آہوئے نگاہ کے سینگ' یا 'نگاہوں کے شاہین کے پھیلے ہوئے پنکھ' یا 'صنم پرستوں (عاشقوں) کے مندر میں کتابِ مقدس کے اوراق' سے تعبیر کرتا ہے۔ روپ متی کے سینے کی تعریف کرتے ہوئے اس نے جن لفظوں کا استعمال کیا ہے، اسے پڑھ کر بے ساختہ ہمارے ذہن میں فارسی کا یہ مصرعہ گونجنے لگتا ہے: ع حباب خاستہ از بحر کافور!

۴

دیسی زبانوں میں ہمارے قصہ گویوں اور تمثیل نگاروں کے تخیل کی کرشمہ سازیوں کے طفیل اس قصے کے مختلف Version کہیں کچھ تصرف، کہیں کچھ مبالغے کے ساتھ مشہور ہیں۔ اسی طرح روپ متی کے جنم، حسن، اُس کے گیت و سنگیت اور رقص کے کمال فن، اس کی موت اور وفا کیشی کی حکایتیں مدھیہ پردیش کے دیہاتوں کے لوگوں میں روایتاً پہنچتی رہی ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ رومان ہر زمانے میں لوک گیتوں اور کہانیوں سے ہوتا ہوا، ادب

کے صفحات اور ناٹکوں اور تھیٹروں تک اپنے جلوے بکھیرتا رہا ہے۔

گجراتی زبان میں چنی لال وردھمان شاہ نے روپ متی کے قصے کو پہلی بار ناول کے روپ میں پیش کیا تھا۔ جدید ہندی میں ہمیں ایک مختصر کتاب 'باز بہادر روپ متی' منشی دیوی پرشاد کی لکھی ملتی ہے۔ اردو زبان میں اس رومان پر لکھا ہوا پہلا اور قابل ذکر ڈراما محشر عابدی کا 'روپ متی باز بہادر' ہے، جو لاہور سے 1936 میں کتابی صورت میں شائع ہوا تھا۔ مجموعی طور پر یہ ایک اوسط درجے کا ڈراما ہے۔ 'روپ متی اور باز بہادر' پر پہلا ریڈیو فیچر سید عابد علی نے لکھا تھا اور محمود نظامی نے پروڈیوس کیا تھا۔ یہ ریڈیو فیچر 5 مارچ 1940 کو لاہور ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا تھا، جس میں باز بہادر کا کردار سید امتیاز علی تاج نے اور روپ متی کا کردار مس موہنی داس نے ادا کیا تھا۔ ممکن ہے اس دور کے ریڈیو سامعین نے اسے پسند کیا ہو جیسا کہ مصنف نے دعوا کیا ہے، لیکن یہ اپنی مطبوعہ صورت میں محض ایک سطحی اور عامیانہ ریڈیو فیچر ہے۔ واقعات بھی تاریخ سے متناقض ہیں۔

روپ متی باز بہادر کی رومانی کہانی کو ہندی سنیما کے پردے پر بھی کئی بار پیش کیا جا چکا ہے۔ 1960 میں بنی فلم کے ستارے تھے، شمیم آرا، اسلم پرویز اور آغا تالش۔ اس کے علاوہ نروپا رائے اور بھارت بھوشن بھی ایک فلم میں روپ متی اور باز بہادر کے کردار نبھا چکے ہیں، اس فلم کے میوزک ڈائرکٹر ایس این ترپاٹھی تھے۔ 1989 میں مدھیہ پردیش فلم ڈولپمنٹ کارپوریشن کی طرف سے کمار ساہنی اس رومان کے پس منظر میں ایک موسیقی ریز فلم 'خیال گاتھا' بنا چکے ہیں۔ جس میں منگل ڈھلون نے باز بہادر کا اور بیتا وششٹ نے روپ متی کا رول ادا کیا ہے، اور پنڈت برجو مہاراج اور الکھ نندا سمرتھ نے بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔

کرمپ کی کتاب کے توسط سے احمد العمری کے قصے کو بنیاد بنا کر کافی حد تک کام یاب کوشش جگدیش کمار زل کے ہندی ناول 'روپ متی' میں نظر آتی ہے، جو 1961 میں شائع ہوا تھا۔ اس عشقیہ داستان کے پس منظر کی حد تک مغلوں کے کردار کے تعلق سے ظلم اور تعیش کے ذکر کو تو گوارا کیا جا سکتا ہے لیکن مصنف نے اکبر کی مجالس اور اس کے مصاحب بیربل کا تذکرہ جس مضحکہ خیز اور مبتذل ڈھنگ سے کیا ہے وہ شایستہ ذوق طبائع کو گراں گزرتا ہے۔ اس کے علاوہ مصنف نے ہندی قارئین کی ضیافت طبع کے خیال سے ناول کے تانے بانے میں ہندو کتھاؤں اور روایتوں کو پرونا ضروری سمجھا ہے۔ آخر میں اس عشقیہ داستان سے متاثر ہو کر لکھی گئی سروجنی نائیڈو کی نظم An Indian Love Song کا ذکر بھی ضروری ہے، جو ایک عمدہ اور دل کش نظم ہے۔

۵

مالوہ تاریخ کے جھروکے سے: مالوہ جسے سنسکرت میں Malava کہا جاتا ہے اور دوسری صدی قبل مسیح میں جو اونتی Awanti کہلاتا تھا وہاں کبھی موریہ اور گپت راجاؤں کی سلطنتوں کے دربار سجتے تھے اور ان کی راجدھانی اُجین یا دھار ہوا کرتی تھی۔ اسی دھرتی پر کبھی وکرمادتیہ اور راجہ بھوج ہو گزرے ہیں، جو آج بھی داستانوں میں زندہ ہیں کہ ہمیں اس عہد کی تاریخ نہیں ملتی۔ بہر کیف ایک طرف وندھیاچل کی پہاڑیوں کے کوہستانی سلسلے اور ایک طرف نربدا کی وادیوں سے جڑے، مالوہ کے سرسبز و شاداب اور زرخیز خطے کو ہندستان کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

مالوہ کی تاریخ میں مسلمان تیرھویں صدی کے ربع دوم میں داخل ہوئے جب شمس الدین التمش نے مالوہ پر فوج کشی کی اور اس کے دارالحکومت اُجین پر قبضہ کرلیا۔ مالوہ کی باضابطہ تاریخ دلاور خان غوری کے دور سے ملتی ہے، جو 1392 میں یہاں کا حکمراں بنا۔ دلاور خان نے مانڈو میں قدرتی حسن اور جاں فزا مناظر کی بہتات دیکھ کر اس کا نام 'شادی آباد' The City of Joy رکھا تھا، اگرچہ اس کا دارالحکومت دھار تھا۔ 1405 میں دلاور خان کی موت کے بعد اس کا بیٹا الپ خان تخت پر بیٹھا اور 'ہوشنگ شاہ' کا لقب اختیار کیا۔ وہ اپنے مذاق تعمیر اور انصاف پسندی کی بنا پر ہر دل عزیز تھا۔ مانڈو کے قلعے اور شہر پناہ کی تعمیر اسی کے عہد حکومت میں ہوئی تھی جو کہ ستائیس برس پر محیط ہے۔

سلطان ہوشنگ شاہ اپنے وزیر اعظم ملک مغیث کے بیٹے محمود شاہ پر بڑا مہربان تھا، جسے اس نے اپنا نائب اور دست راست بنا لیا۔ اگست 1432 میں ہوشنگ شاہ کا انتقال ہوا۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنے بیٹے غزنین خان عرف محمد شاہ کو اپنا جانشین مقرر کرتے ہوئے محمود شاہ کو اس کا رہنما مقرر کیا تھا، لیکن نہ تو محمد شاہ ایک اہل حکمراں ثابت ہوا اور نہ محمود شاہ وفادار رہبر۔ محمود شاہ ہی نے ساقی کو رشوت دے کر اسے زہریلی شراب کے ذریعے ہلاک کرایا اور 1435 میں خود سلطان محمود شاہ خلجی کا نام اختیار کرکے بادشاہ بن گیا، اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور سکہ جاری کیا۔ اپنے 33 سال کے دور میں اس نے حدود سلطنت کی خوب توسیع کی۔

1469 میں سلطان محمود شاہ خلجی کے انتقال کے بعد اس کا بڑا بیٹا غیاث الدین خلجی تخت پر بیٹھا۔ اس کی عسکری صلاحیت اور ذاتی خوبیوں کی مورخوں نے تعریف کی ہے۔ وہ منشیات سے سخت نفور تھا اور پنج وقتہ نمازی تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے عورتوں سے بڑا لگاؤ تھا۔ اس کی حرم سرا میں پندرہ ہزار عورتیں تھیں اور ان کا ایک اچھا خاصا شہر آباد تھا۔ جس کا سارا انتظام بھی عورتوں کے حوالے تھا۔

غیاث الدین خلجی کے بیٹوں ناصر الدین اور شجاعت خان میں تخت کے لیے تکرار بڑھی، جس کے نتیجے میں ناصر الدین نے شجاعت خان کا قتل کیا، اور اپنے بوڑھے باپ کو بھی (بعمر 80 سال) زہر دے کر ہلاک کیا اور نومبر 1500 میں مالوہ کا فرماں روا بن گیا۔ (فرشتہ نے ناصر الدین کو اس الزام سے بری کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس نے اپنے باپ کو زہر دے کر مار ڈالا۔)

ناصر الدین نے 1510 میں وفات پائی اور اُس کا تیسرا بیٹا 'سلطان محمود ثانی' سے موسوم تخت نشیں ہوا۔ یہ ایک ضعیف الاعتقاد، اور نااہل بادشاہ تھا۔ اس کے دور میں خانہ جنگی اور سازشوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ مالوہ کی سرزمین پر پائیدار حکومتوں کا دور ختم ہوگیا۔ سلطان محمود شاہ ثانی کے انتقال کے بعد، اقتدار کی شورشوں سے نڈھال مالوہ کی ریاست کو بالآخر مئی 1526 میں بہادر شاہ گجراتی نے تسخیر کیا اور اپنی ریاست گجرات کا حصہ بنالیا۔ 1534 میں مالوہ پر ہمایوں نے قبضہ کیا اور یہ دہلی کے زیر نگیں آیا، لیکن ملّو خان نامی ایک خلجی سردار نے کوئی سال بھر تک غیر مسلسل لڑائیوں کے بعد مالوہ کا ایک بڑا حصہ حاصل کرلیا اور 'قادر شاہ' کا لقب اختیار کرکے 1536 میں اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا۔

1542 میں جب دہلی کے تخت پر شیر شاہ سوری قابض ہوا تو اس نے قادر شاہ کو کھدیڑا اور مالوہ، اُجین، سارنگ پور اور متصل سارا علاقہ اپنے ایک وفادار عزیز شجاعت خان کو دے دیا۔ شجاعت خان نے 1554 تک خوش انتظامی سے حکمرانی کی۔ اس نے اپنی موت سے پہلے اپنی سلطنت اپنے تینوں بیٹوں بازید خان، دولت خان اور مصطفا خان میں تقسیم کردی تھی، لیکن بازید خان نے دولت خان کو ہلاک کیا، مصطفا خان کو شکست دے کر بھاگ جانے پر مجبور کیا اور 1555 میں خود مختار حکمراں بن گیا۔ اس نے شجاعت خان کے اپنے نام پر بسائے گئے دارالحکومت شجاول پور کو ترک کرکے قدرت کے حسین نظاروں سے مالامال مالوہ کو اپنی راج دھانی بنانا پسند کیا، اور خود کے لیے 'باز بہادر' کا لقب اختیار کیا۔ رانی روپ متی کو حرم میں داخل کرنے کے بعد اس کے شب و روز عیش و عشرت اور سرود و نغمہ میں گزرنے لگے۔

ایک بار اُس نے گاڈھا کی رانی درگاوتی کے علاقے میں فوج کشی کرکے شرمناک شکست اور ہزیمت کا سامنا کیا اور جنگ و جدل کی راہ لگ بھگ بھلا بیٹھا۔

جنوری 1561 میں ادہم خان کے لشکر سے شکست کھانے کے بعد باز بہادر خاندیش کی طرف نکل گیا، اور کچھ فوج اکٹھا کرکے پیر محمد (اکبر کا متعین کردہ حاکم مالوہ) سے پھر لوہا لینا چاہا، لیکن ناکام رہا۔ پیر محمد ایک غیر مقبول اور ظالم حاکم ثابت ہوا۔ اس نے جب برہان پور ہڑپنے کی کوشش کی، اس وقت باز بہادر نے بیرار کے ریجنٹ اور اسیر گڑھ کے حاکم طفیل خان کی مدد سے یا بقول مولف 'مانڈو و خاندیش' کے میران مبارک خان کی مدد سے اسے گھیر لیا اور پیر محمد نربدا میں غرق ہوا۔ باز بہادر کو مختصر مدت کے لیے پھر مانڈو ہاتھ لگا، لیکن اکبر نے جب عبداللہ خان ازبیک کو اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا تو باز بہادر بنا مقابلہ کیے خاندیش کی طرف فرار ہوا، پھر گجرات اور دکن تک مدد کے لیے بھٹکتا رہا، لیکن کہیں مدد نہ پاسکا۔ ابوالفضل نے باز بہادر کے دیار بدیار مدد کے لیے بھٹکنے کی تفصیل لکھی ہے۔ آخر اسے میواڑ کے رانا اودے سنگھ کے یہاں پناہ ملی۔

اپنے دور حکومت کے پندرھویں برس میں اکبر نے حسن خان چنگیزی کے ذریعے باز بہادر کو اپنے دربار میں بلایا۔ اسے جان کی امان دی اور دو ہزاری کا منصب بھی بخشا۔

ادہم خان نے مالوہ سے حاصل ہوئے خزانے میں خرد برد کی تھی۔ اس لیے اسے مالوہ سے بلالیا گیا تھا۔ دو سال بعد ہی ادہم نے شمس الدین اتگہ خان (اکبر کے رضاعی بھائی) کو قتل کردیا تو اکبر نے ادہم خان کو موت کی سزا دے دی۔

ہندستان میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد، مالوہ وقفے وقفے سے پنڈاریوں کی لوٹ مار اور غارت گری کا نشانہ بنتا رہا۔ اس طرح مراٹھوں کے قبضے میں آئے ابتدائی علاقوں میں ایک مالوہ بھی رہا۔ یہاں تک کہ 1817 میں ان کی طاقت ختم کرکے یہاں پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا۔

مصادر: اس مضمون میں جن کتابوں کا ذکر آیا ہے، ان کے علاوہ اور کتابیں بھی مطالعے میں رہی ہیں۔ مالوی گیت (نغمہ محبت) کننگھم آرکیالوجیکل رپورٹ II میں موجود ہے، اور کرمپ کی کتاب میں شامل روپ متی کی 26 نظموں میں سے ایک ہے، اسے انگریزی ترجمے کے ساتھ وہیں سے لیا گیا ہے۔ شری نریندر جوشی کا روپ متی کے پس منظر میں لکھا ہندی گیت 'من سے من کے تار ملے' جگدیش کمار نرمل کے ناول سے ماخوذ ہے۔ ڈرامے کا پلاٹ طبع زاد ہے۔ البتہ تاریخ اور روایات نے اُس کا پس منظر فراہم کیا ہے۔ (ایم کاویانی)

پہلا ایکٹ

-----مانڈو-----

پہلا منظر

'مانڈو' میں ریوا کے کنارے 'باز بہادر' کا عشرت کدہ۔ ایک پُر آرائش و پُر زیبائش شبستاں کا منظر۔ صندلی مسہری، نقرئی چوکیاں، منقش چھت پر روشن جھاڑ اور فانوس، فرش پر قیمتی قالین، دیواروں پر لگی عیش و عشرت بھرے مناظر کی تصاویر، مسہری کے مقابل کشادہ جھروکے، جن کے پردے سمٹے ہوئے ہیں اور ریوا کی خنک ہواؤں اور ہر طرف پھیلی دودھیا چاندنی نے کمرے کا

ماحول خواب ناک بنا دیا ہے۔ روپ متی اور باز بہادر جھروکے کے پاس کھڑے ریوا کی خاموش لہروں پر چھٹکی چاندنی کا نظارہ کر رہے ہیں۔

روپ متی: میں حیران ہوں کہ آپ نے وزیروں اور سرداروں کو ملاقات کے لیے وقت دینے سے کیوں انکار کر دیا؟ یہاں ہمارے قیام میں اضافے سے کہیں حکومت کے کام کاج متاثر نہ ہوں!

باز بہادر: چاندنی راتیں ہمیشہ نہیں ہوتیں روپ متی۔ کم از کم قدرت کی ان حسین اور ان مول گھڑیوں کو ہم مکروہات حکومت میں ضائع کرنا نہیں چاہتے۔

روپ متی: ممکن ہے کہ انھیں کچھ اہم کام درپیش ہوں، آپ نے پوچھ تو لیا ہوتا؟

باز بہادر: اُن دماغوں میں محصول اراضی کی تجویزیں، جاگیرداریوں کے قضیے، مہم آزمائیوں کے منصوبے، اضافہ لشکر کے مشورے، اقارب کی سفارشیں اور ترقی مناصب کے تقاضے ہی سرگرداں ہوں گے، جو کہ ہمیشہ رہتے ہیں۔ افسوس ان لوگوں کو سب کچھ میسر ہے، سوائے مذاق حسن کے۔ جیسے ان کی زندگی میں نہ صبح طباشیر بکھیرتی آتی ہے، نہ شام شفق کی گلگوں چادریں پھیلاتی ہے، نہ رات ستاروں کی قندیلوں سے جگمگاتی ہے، نہ کلیاں باد بہاری میں میں جھولا جھولتی ہیں، نہ طیور خوش نوا کی زمزمہ سرائیاں اور شمیم باغ کی خوش ادائیاں ہی انھیں مسرت و شادمانی کا کوئی پیغام پہنچا پاتی ہیں۔ قدرت کی بہار آفرینیوں کی بجائے مادّی آسائشوں کا جادو ہی ان کے سر چڑھ کر بولتا ہے اور جاہ طلبی و زرپرستی کے جال ہی میں وہ نہال رہتے ہیں، یہاں تک کہ چاندنی راتوں میں بھی!

روپ متی: آج تو مزاج بہت شاعرانہ ہو چلا ہے!

باز بہادر: چاندنی رات ہو، ریوا کا کنارہ ہو، اور پہلو میں روپ متی ہو، ایسے میں جو شاعر نہ ہو، وہ دیوانہ ضرور ہو گا۔

روپ متی: (آسمان پر چاند کو دیکھتے ہوئے) آپ نے ایک کنیز کو فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا۔ میں آپ کی بے پایاں محبت اور بے اندازہ لطف و کرم سے کبھی کبھی گھبرا سی جاتی ہوں کہ کہیں یہ خوشی مجھ سے چھن نہ جائے۔

باز بہادر: (فدایانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے) رُوپ، میری شاموں کی ملاحت، میری صبحوں کا جمال، شاہوں کے ایوانوں میں حسن اور جوانیوں کے جھرمٹ لگے ہوتے ہیں، لیکن ایک ایسا حسن مجسم، جو سدا کے لیے دل میں بس جائے، ایک ایسی نظر پُر اثر جو روح کو شاد کام کرے، ایک ایسا لحن سرمدی، جس کا ہر نغمہ دل کی گہرائیوں میں اُتر جائے، اور رقص میں پیروں کی تھرکن، جسم کا لوچ، چتون کے اشارے اور دست و نگاہ کے انداز و ادا کی وہ ساحری کہ یہ لگنے لگے کہ زمان و مکان وجد میں آ گئے ہیں۔ ان ساری باتوں میں تمھاری مثال کہاں! (خوش مذاقی سے) لگتا ہے خالق نے تمھیں بڑی فرصت اور فیاضی سے بنایا ہے، حیرت ہے وہ خود کیوں نہ ریجھ گیا!

روپ متی: (خوش مذاقی کا جواب خوش مذاقی سے دیتے ہوئے) آپ بھی حد کرتے ہیں، چوں کہ آپ شاعر بھی ہیں، اس لیے کیوں نہ آپ کی ان باتوں کو شاعرانہ اُڑان سمجھ لیا جائے!

باز بہادر: لیکن ہم بادشاہ بھی تو ہیں۔

روپ متی: اچھا تو میں انھیں آپ کی شاہانہ ترنگ سمجھ لیتی ہوں۔

باز بہادر: ہماری باتیں شاعرانہ اُڑان ہیں نہ شاہانہ ترنگ، بلکہ ایک سچے چاہنے والے کے دل سے نکلی ہوئی آواز ہے، جو دل کے کانوں ہی سے سنی جا سکتی ہے، لیکن تم ہو کہ سننا ہی نہیں چاہتی۔

روپ متی: دل کی باتیں دل کے کانوں سے بھلا کیسے سنی جاتی ہیں۔

باز بہادر: دل کو دل کے قریب لا کر (روپ متی کو ہم کنار کرتا ہے۔ اپنے چہرے سے روپ متی کی زلفوں کو مس کرتے ہوئے کھوئے ہوئے لہجے میں) بہار بستر و نوروز آغوش، ہمارے ساتھ تم خوش تو ہو روپ متی!

روپ متی: اتنی خوشی ہے کہ من میں نہیں سماتی۔ میں ایک اَن سنا گیت تھی، آپ کیا ملے، میرے ساز زندگی کو مضراب مل گئی۔

باز بہادر: (پہلو میں بٹھاتے ہوئے اور معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے) اور مضراب کو نغموں کا خزانہ۔

روپ متی: (کچھ شرماتی ہوئی، کچھ کھوئی ہوئی) سوچتی ہوں کاش یہ لمحات جاوداں ہو جائیں، لیکن پھر خیال آتا ہے کہ وقت کو قرار کہاں! مجھے برس بیت گئے پر کل کی سی بات لگتی ہے، جب مجھے اپنے گاؤں سے باہر بھلا کون جانتا تھا اور آج حاکم مالوہ کے محل کی نہیں دل کی بھی رانی بنی ہوئی ہوں۔ چکرا سی جاتی ہوں کہ یہ سب سپنا ہے یا حقیقت!... پر، پتا نہیں آنے والے کل کے پردے میں کیا چھپا ہے؟... (چند ثانیے رک کر) کبھی کبھی ایک عجیب سا خیال، ایک انجان سا خوف پریشان کرنے لگتا ہے۔

باز بہادر: کیسا خیال، کاہے کا خوف؟ آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو روپ متی!

روپ متی: زمانہ ہمیشہ سے محبت کرنے والوں کا دشمن رہا ہے۔ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، سوہنی مہیوال، اور سسّی پنوں جیسے محبت کے متوالوں کے الم ناک انجام کا خیال دل میں آتا ہے تو گھبرا سی جاتی ہوں۔

باز بہادر: یہ سچ ہے کہ بے درد زمانے نے ان پریم کرنے والوں کا دامن مراد نہ بھرا اور ان پر بڑا ستم ڈھایا، لیکن تمھیں کس چیز کی کمی ہے روپ متی! باز بہادر کے ہوتے ہوئے تمھارے من پر غم و الم کے خیال کا سایہ بھی نہ پڑنا چاہیے۔

روپ متی: ان لازوال محبتوں کی قسم، اپنی روپ سے کبھی منہ نہ پھیر لینا۔

باز بہادر: نیرنگیٔ زمانہ بساطِ عالم پر چاہے کیسی ہی چالیں چلے، تم باز بہادر کو اپنی محبت میں ثابت قدم پاؤ گی۔

روپ متی: (فلک پر چاند کی طرف دیکھتے ہوئے) یہ چودھویں کا چاند گواہ ہے، کبھی کوئی ناشدنی ہوئی تو روپ متی بھی اپنی جان سے گزر جائے گی پر اپنی وفا پر آنچ نہ آنے دے گی۔

باز بہادر: بھئی، بلاوجہ کے اندیشوں کو چھوڑو۔ اس حسین شام میں اب اپنی مدھر آواز کا جادو جگادو اور عہدِ وفا کے ان لمحوں کو یادگار بنادو۔

روپ متی: جیسا حضور کو پسند ہو، (وینا سرکاتے ہوئے) آپ کو بھی ساتھ دینا ہوگا!

روپ متی نے الاپ شروع کیا، ادھر باز بہادر کی انگلیاں وینا کے تاروں پر رقص کرنے لگیں۔

روپ متی: من سے من کے تار ملے...... من سے من کے تار ملے

گونج اٹھی جھنکار کی جب...... من سے من کے تار ملے

جب بسنت آئے اُپون کے

ہر ترونا پہ آجائے بہار

نو بَدھوؤں سے وَرکش لگے

پا کر ساجن کے نو اُپہار

پت جھڑ جائے، بسنت آئے

ہر لیتکا پر پیار کھلے

گونج اٹھی جھنکار کی جب، من سے من کے تار ملے

روپ متی کا پد ختم ہوا، باز نے جھومتے ہوئے الاپ سنبھالا

باز بہادر: من سے من کے...... من سے من کے تار ملے

بھول گیا میں کمودنی کو

نیل کمل کو بھول گیا

دِگز بھوؤں کے جھولے پر میں

اَنایاس ہی جھول گیا

تیرا ہے آکرشن ایسا

اَروناؔ اُدھر سے اُدھر ملے

من سے من کے تار ملے...... من سے من کے تار ملے

باز گار ہا تھا اور روپ مبہوت ہو کر سن رہی تھی۔ پھر اس نے بھی سُر میں سُر ملایا

دونوں: تم جو آئے مجھ کو میرے

سپنوں کے سنسار ملے

من سے من کے تار ملے...... من سے من کے تار ملے

گیت ختم ہوا۔ وینا سے سنگیت کے سُر جاری ہیں۔

(پردہ)

دوسرا منظر

باز بہادر کے دربار کا منظر۔ دربار کی زیبائش و آرائش سے بادشاہ کے ذوقِ جمال کا اظہار ہوتا ہے۔ باز بہادر تخت پر جلوہ افروز ہے۔ کچھ فاصلے پر باربک، عرض بیگی، ان کے بعد وزرا و امرا حسبِ مراتب اپنی نشستوں پر بیٹھے ہیں۔ دروازوں پر باوردی محافظ متعین ہیں، اچانک باہر سے شور کی ہلکی ہلکی آوازیں آتی ہیں، جو رفتہ رفتہ تیز ہوتی ہیں۔ سب کے چہروں پر حیرت کے آثار ہیں کہ یہ بلکل ان ہونی سی بات ہے۔

آواز: ''دہائی ہے ان داتا دہائی ہے۔''

باز بہادر: باہر یہ شور کیسا ہے؟

[شحنہ (کوتوال) کی دربار میں آمد]

شحنہ: عالی جاہ، ایک درماندہ حال، نحیف وزار بوڑھا، بغیر پروانے کے، نہ جانے کس طرح ڈیوڑھی تک پہنچ گیا، اور سرکار کے انصاف کی دہائی دیتا ہوا دربار میں آنے کے لیے بضد ہے۔ پاسبان اس کی ضعیف العمری کو دیکھ کر جبر سے باز آئے کہ کہیں مر نہ جائے، لیکن وہ تو جان دینے پر اُتارو ہے۔

باز بہادر: اسے دربار میں پیش کیا جائے۔

شحنہ: لیکن عالی جاہ اس کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔

باز بہادر: ظاہر ہے وہ کوئی نذرانہ پیش کرنے تو آیا نہیں ہے۔ ضرور کوئی ایسی ہی بات ہے کہ اسے اپنی جان تک عزیز نہیں، اسے دربار میں لایا جائے۔

(دو سپاہی ایک شخص کو پکڑے ہوئے لاتے ہیں۔ یہ ایک سفید ریش، کم زور، تھکا ماندہ بوڑھا ہے، جس کی کمر میں ہلکا سا خم ہے، چہرے پر غم واندوہ کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں، کثیف لباس جگہ جگہ سے پھٹ گیا ہے۔ اس کے بازو اور چہرے پر گھاؤ اور کھرونچوں کے نشان ہیں اور کہیں کہیں خون بھی رس رہا ہے، آنکھیں آب دیدہ ہیں اور ہونٹ کانپ رہے ہیں۔ وہ حاجب کی رہ نمائی میں آگے بڑھتا ہے، تخت پر متمکن باز بہادر پر نظر ڈالتا ہے اور سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔)

باز بہادر: مردِ کہن سال، کیا تمھیں کسی نے دربار کے ضابطوں سے آگاہ نہیں کیا؟ کیا تمھیں اپنے علاقے کے منصف سے انصاف نہ مل سکا، جو تم نے یہاں آنے کی ضرورت محسوس کی؟ آخر ایسی کون سی بات ہے، جس کے لیے تم نے ہنگامہ برپا کر رکھا ہے؟

(بوڑھا اپنے انگوچھے سے چہرے کا پسینہ، گرد اور زخموں سے رستا ہوا لہو پونچھتا ہے، پھر تھر تھرائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کرتا ہے۔)

بوڑھا: اَن داتا، میری شکایت جس کے متعلق ہے، اس کے نام سے منصف شہر کا بھی خون خشک ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نے میری فریاد پر کان نہ دھرا اور ناچار ہوکر میں مانڈو چلا آیا۔ حضورِ شاہی میں اپنی فریاد پہنچانے کے لیے تین دن سے مارا مارا پھر رہا ہوں، پر میری رسائی کہاں! آج دربار کی خبر سن کر امید بندھی تو پاسبان ایک ایسے غریب شہر سے ضابطے داری کے مصر ہو گئے، جس کا ضابطۂ حیات ہی تتر بتر ہو چکا ہے۔

باز بہادر: ڈرو نہیں، بتاؤ تم کون ہو اور تم پر کس نے ظلم ڈھایا ہے، اور وہ کون ظالم ہے، جس کے نام سے منصف شہر کا بھی خون خشک ہوتا ہے۔

بوڑھا: میں ساٹھ ستر گھروں پر مشتمل ایک چھوٹے سے گاؤں عظمت گڑھ کا ایک کاشت کار ہوں اور وہاں کا چودھری بھی۔ ابھی ایک ہفتے قبل تک میری یہ کمر اتنی جھکی ہوئی نہ تھی۔ نہ اس جھریوں زدہ چہرے پر اتنی شکستگی اور ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ میرے چھوٹے سے پریوار میں خوشیوں اور شادمانیوں کا ڈیرا تھا۔ میرے اکلوتے گبرو محنت کش بیٹے اور میری سندر، اور سُگھڑ بہو نے جو سال بھر پہلے ہی ہماری بگیا میں بہار بن کر آئی تھی۔ میرے گھر کو سورگ بنا رکھا تھا۔ ان دونوں نے اپنی محبت اور خدمت گزاری سے میرے دل سے اپنی پتنی کی موت تک کا غم بھلا دیا تھا۔

(حسرت و حرماں بھرے لہجے میں)

میرے گلشن ہستی میں ابھی بہار نے ٹھیک سے قدم بھی نہ جمائے تھے کہ اچانک برقِ ستم گری اور سب کچھ جلا کر خاک کر ڈالا... میری مُرادوں کی کشتی پُرسکون لہروں پر ہولے ہولے بہے چلی جا رہی تھی، ہوا بھی موافق تھی اور دھارا بھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے بھنور کی بھینٹ چڑھ گئی... میرا چھوٹا سا پریوار مسرت بھرے ترانے گاتا، ہنستا کھیلتا جیون کی ڈگر پر بڑھا چلا جا رہا تھا کہ یکا یک طوفان بلا خیز نے گھیر لیا اور آناً فاناً میرا اسنسار تہس نہس کر دیا... میں نے جب تل تل کر ہزار جتن کر کے عمر بھر کی کمائی اکٹھی کی اور سکون کی چند سانسیں لینا چاہیں، تو ایک لٹیرا ڈاکا ڈال کر آنِ واحد میں میرا سرمایۂ حیات لوٹ لے گیا۔ (زار و قطار روتے ہوئے اور سینہ کوبی کرتے ہوئے) میرے دل کا سرور، میری آنکھوں کا نور، میرے جگر کا ٹکڑا، میرا وہ گبرو جوان بیٹا، میری وہ پری چہرہ سیتا صفت بہو، ہائے جنھوں نے ابھی جی بھر کے بہارِ جوانی کے مزے بھی نہ اُٹھائے تھے کہ دفعتاً، خاک میں مل گئے۔ فنا کے گھاٹ اتر گئے۔

باز بہادر: پیر مرد، یقیناً تم نے بڑی دل دوز مصیبت جھیلی ہے۔ تمھاری آنکھوں کا کرب، تمھاری آواز کا درد، اور تمھارا یہ آنسوؤں بھرا چہرہ، تمھارے لفظوں سے سوا تمھارے حالات کو آشکار کر رہا ہے، لیکن ابھی تک یہ بھید نہیں کھلا کہ تمھارا ملزم کون ہے اور اصل ماجرا کیا ہے؟

بوڑھا: میرا مجرم... میرا مجرم ہے سپہ سالار صلابت خان۔

باربک: (مداخلت کرتے ہوئے) تم ہوش میں تو ہو مرد زال! کہیں تم غلطی سے کسی سپاہی یا اہل کار کی بدعملی کو تو سپہ سالار کے سر نہیں منڈھ رہے ہو! کیا تم جانتے ہو کہ سپہ سالار پر بہتان لگانے کی صورت میں تمھارا انجام کیا ہوگا؟

(باز بہادر کے چہرے پر غیظ و غضب کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، آنکھیں غصے سے اُبل رہی ہیں۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے باربک کو خاموش ہونے کے لیے کہتا ہے۔)

باز بہادر: (بھاری اور سپاٹ لہجے میں) پیر مرد، اپنا بیان جاری رکھو۔ تمھاری شکایت کا ایک لفظ بھی صداقت سے خالی نہیں ہونا چاہیے۔ دھیان رہے کہ حقیقت بیانی میں ذرّہ برابر بھی کمی بیشی انصاف کی راہ میں آڑے آسکتی ہے۔

بوڑھا: اَن داتا، میں انصاف ہی کے لیے یہاں حاضر ہوا ہوں۔ میں نے اپنے بیٹے اور بہو کو کھو کر اپنا سب کچھ کھو دیا ہے۔ میری آخری خواہش یہی ہے کہ اپنی بہو اور بیٹے کے قاتل کا انجام دیکھ لوں۔

میری فریاد ہے اَن داتا کہ آج سے ایک ہفتے قبل جب سپہ سالار صلابت خان، میرے گاؤں کے پاس جنگل میں اپنے کچھ سپاہیوں کے ساتھ شکار کھیلنے آئے تھے... اُس دن جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ میرا بیٹا ابھی کھیت سے لوٹا نہ تھا۔ میری بہو اپنی چند سہیلیوں کے ساتھ ندی پر پانی بھرنے گئی تھی۔ میں اپنے گھر کے آنگن میں کھاٹ پر بیٹھا ہوا بے صبری سے اپنی بہو اور بیٹے کی راہ دیکھ رہا تھا۔ چوں کہ بہو اُمید سے تھی، اس لیے مجھے بڑی چنتا رہتی تھی کہ اُسے کہیں کوئی گزند نہ پہنچے۔ اچانک میری بہو کی سکھیاں ہانپتی کانپتی، بھاگتی ہوئی آتی دکھائی دیں۔ اُن کے ساتھ اپنی بہو کو نہ پا کر میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ سب پانی بھرنے کے لیے ندی کے کنارے پہنچی ہی تھیں کہ ناگہاں صلابت خان اور اس کے سپاہی گھوڑے دوڑاتے ہوئے وہاں آ گئے، اور ان لڑکیوں کو دیکھ کر ان سے بے ہودہ مذاق کرنے لگے، جوں ہی صلابت خان کی نظر سب سے الگ کھڑی میری بہو پر پڑی، اس نے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ آج تو اس ہرنی کا شکار ہو جائے۔ وہ ان کی بدنیتی بھانپ کر سہمی ہوئی ندی کے کنارے کنارے بھاگ کھڑی ہوئی۔ سپہ سالار اور اس کے ساتھی بھوکے بھیڑیوں کی طرح اُس معصوم اور سراسیمہ کا پیچھا کرنے لگے۔ ایک طرف وہ بے بس و لاچار دھرم، سماج، اور انسانیت کی دہائیاں دے رہی تھی، دوسری طرف اُن شیطانوں کی آتش ہوس دہک رہی تھی۔ اس

دوران میں اُس کی سکھیاں بھی اپنے گھڑے گاگر چھوڑ چھاڑ کر، جان بچا کر دور جا کھڑی ہوئی تھیں۔ سامنے ندی کا دھارا تھا اور دور دور تک کوئی یار و مدد گار نہ تھا۔ قریب تھا کہ صلابت خان کا دستِ ہوس اسے جا دبوچتا، اُس ساوتری نے اپنے آپ کو ندی کی موجوں کے حوالے کر دیا اور اپنے بطن میں ننھی سی جان اور اپنے سینے میں آرزوؤں کا جہان لیے چادرِ آب میں چھپ گئی اور وہ سنگ دل بھیڑیے شکار کو ہاتھ سے جاتا دیکھ کر مایوس لوٹ گئے۔

(کچھ توقف کے بعد بوڑھا پھر گویا ہوتا ہے۔)

بوڑھا: میری بربادی کی داستان یہیں ختم نہیں ہوئی۔ ابھی میرا سینہ چھلنی نہ ہوا تھا اور تقدیر کے ترکش میں بھی تیر بچے ہوئے تھے۔ ابھی زمانے کو ایک ایسا کاری وار کرنا باقی تھا، جو میری کمر کو کمان کر دے۔ ابھی قدرت نے مجھے وہ رونا نہ رُلایا تھا کہ جس کے بعد پھر رونے کے لیے میری آنکھوں میں کوئی آنسو ہی نہ رہے۔

میرے بیٹے کو کھیت سے واپسی پر راہ ہی میں کسی نے بتا دیا کہ اس کی دنیائے محبت کس طرح برباد ہوگئی۔ وہ غیظ و غضب سے شعلہ جوالہ بنا ہوا آیا۔ آتے ہی اپنی تلوار سونت لی اور صلابت خان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ محلے کے نوجوانوں نے اُسے سنبھالا، بزرگوں نے اونچ نیچ سمجھائی اور دہائی دی کہ اگر اس نے جوشِ انتقام میں کوئی انتہائی قدم اٹھایا تو سارا گاؤں سپہ سالار کے قہر و عتاب کا نشانہ بن جائے گا۔ اُن سب کی بھلائی کا خیال اس کے جذبہ انتقام پر غالب آ گیا پر اُس کی غیرت و حمیت پر نہیں۔ اُس نے وہی تلوار اٹھائی اور اپنے پیٹ میں گھونپ لی۔ (بوڑھے کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، کچھ دم لے کر پھر کہتا ہے۔)

ابھی میرے بیٹے اور بہو کی چتا بھی ٹھنڈی نہ ہوئی تھی کہ سپہ سالار کے سپاہی آئے اور مجھے یہ دھمکی دے گئے کہ اگر میں نے اس سانحے کے سلسلے میں سپہ سالار کے خلاف کوئی شکایت کی تو اس کا انجام بُرا ہوگا۔ (زہر خند انداز میں) اپنا سب کچھ گنوا دینے والے کو بُرے انجام کی دھمکی... ہا

(بوڑھے کا بیان ختم ہوا... سارے دربار پر سناٹا چھایا ہوا ہے۔)

باز بہادر: پیر مرد، تمھاری فریاد سنی گئی۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ تمھیں انصاف ضرور ملے گا اگرچہ وہ تمھارے زخموں کا مداوا تو نہ ہوگا۔ (ناظم الملک کی طرف رُخ کر کے)

ناظم الملک!... حکم دیا جاتا ہے کہ دو دن بعد سپہ سالار دربار میں اپنی بریت ثابت کریں اور اس وقت تک وہ نظر بند رہیں گے۔ مزید یہ کہ اس بوڑھے فریادی کی حفاظت اور دیکھ بھال کا انتظام آپ کے ذمے ہوگا۔ دربار برخاست ہوتا ہے۔

(پردہ)

تیسرا منظر

(دربار کا حسبِ سابق منظر۔ سپہ سالار صلابت خان اپنی بریت میں بیان دینے کے لیے حاضر ہے۔ سب ہمہ تن گوش ہیں۔ بوڑھا فریادی آج صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے ایک طرف سر جھکائے کھڑا ہے۔)

باربک: سپہ سالار صلابت خان، تمھارے خلاف الزام ہے کہ تم نے ایک مجبور عورت کی عزت لوٹنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ وہ اپنی عزت بچانے کی کوشش میں ندی میں ڈوب کر موت کے گھاٹ اُتر گئی۔ اس سانحے کے ردِ عمل میں اس کے پتی نے بھی خود کو ہلاک کر ڈالا۔

صلابت خان: میں نے کسی ناری کی عزت نہیں لوٹی، نہ میں نے کوئی قتل کیا۔ میں نے کوئی قابلِ تعزیر جرم نہیں کیا۔

باز بہادر: پھر تم ان الم ناک موتوں کا ذمے دار کسے قرار دو گے؟

صلابت خان: عالی جاہ، میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں صرف پیر مرد کی بہو پر نگاہ بد ڈالنے کی خطا کا مرتکب ہوا ہوں، لیکن عملاً میں نے کسی کو کوئی گزند نہیں پہنچایا۔ اس کی بہو کی جان خوف نے لی، اور اس کے بیٹے کی طیش و جنون نے۔

باز بہادر: وہ ابلہ کس سے خوف زدہ تھی؟ کیا اُس خوف زدہ ناری کے پاس اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دینے کے علاوہ یہی ایک راہ باقی نہ رہ گئی تھی کہ وہ خود کو تمھاری ہوس کا شکار بن جانے دے۔ شکاریوں کے نرغے میں گھری ایک بے بس اور ہراساں ہرنی کو ہر طرف موت رقصاں نظر آ رہی ہے، جو ایک جائے فرار ہے تو وہاں ایک گہری کھائی، منھ پھاڑے یوں نظر آتی ہے، گویا راہِ عدم کا دروازہ کھلا ہے۔ ایسے میں اگر وہ شکاریوں کے ہاتھوں تکا بوٹی ہو کر سیخ و کباب کی صورت میں اُن کی شکم پُری کا سامان نہ بنتے ہوئے، کھائی میں گر کر لقمہ اجل بن جائے تو بھی تم شاید یہی کہو گے کہ شکاریوں نے تو تیر و سناں کا استعمال ہی نہیں کیا، وہ ہرنی تو حادثاتی موت مر گئی۔ اسی طرح اس کے پتی کا غم و غصے سے مغلوب ہو کر اپنی جان لے لینا کیا اس سانحے کے سبب سے نہ تھا؟

صلابت خان: عالی جاہ! کیا عرض کروں، جو حالات پیدا ہوئے، وہ میرے سان گمان میں بھی نہ تھے، نیز جو کچھ ہوا اسے میری تقصیر کا ردِ عمل تو کہا جا سکتا ہے، لیکن ان ہلاکتوں میں میرے ارادے کا کوئی دخل نہ تھا...

باز بہادر: (بات کاٹ کر، برافروختگی سے) شعلے کو چنگاری کا نام دینے سے اس کی تمازت، لطافت میں نہیں بدل جاتی۔ اپنے گناہ کو کبھی خطا اور کبھی تقصیر سے تعبیر کر کے تم اس کی سنگینی گھٹا نہیں سکتے۔ کیا اس مجبور عورت کو موت سے ہم کنار کرنے کے حالات کا سبب تم خود نہیں ہو۔ فرض کرو تمھارا دستِ ہوس

اسے، اس کے ندی میں ڈوبنے سے پہلے ہی جالیتا تو اس صورت میں کیا تم کسی کم سنگین جرم کے مرتکب ہوتے! جواب دو صلابت خان، اگر تم اپنے ناپاک ارادوں میں کام یاب ہو جاتے تو کیا تمھاری ہوس کا شکار بن جانے کے بعد اُس ابلہ کی زندگی، موت سے بدتر نہ ہو جاتی! کیا اس کے غیرت مند شوہر کے جیون کا ایک ایک پل جہنم نہ بن جاتا۔ کیا ایسے حالات سے دوچار ہونے کے بعد یہ بوڑھا اپنے گاؤں میں پھر کسی سے نگاہیں چار کر پاتا۔

صلابت خان: عالی جاہ، میں اس بارے میں اور کوئی تاویل پیش نہ کروں گا۔ واقعات کی یہ بد بختانہ صورتیں گھیرا ڈال کر میرے بچاؤ کی راہ مسدود کر رہی ہیں، جب کہ میرے ہاتھوں کوئی جرم سرزد نہیں ہوا۔ اب میں صرف اپنی سابقہ خدمات کا واسطہ دے کر آپ سے عفو و درگزر کی التجا کرتا ہوں۔

باز بہادر: (جذبات سے عاری لہجے میں) تم پر یہ جرم ثابت ہو چکا ہے کہ تمھارے ہوس ناک ارادوں نے ایک ناری کو اپنی عزت بچانے کے لیے خود کشی پر مجبور کر دیا۔ جس کے نتیجے میں اُس کے غیرت مند شوہر نے بھی غم و غصے سے مغلوب ہو کر اپنے ہاتھوں سے خود کو ہلاک کر دیا۔ تم سپہ سالار صلابت خان، جو اس ریاست کی سرحدوں ہی کے نہیں بلکہ مالوہ کے لوگوں کی جان و مال اور ننگ و ناموس کے بھی محافظ و نگہبان ہو، خود ہی ان کی عزت و آبرو کے لٹیرے بن گئے اور اپنا فرض منصبی بھول بیٹھے۔ تمھیں جن کے لیے سراپا مہر ہونا چاہیے تھا، انھیں کے حق میں تم سراسر قہر ثابت ہوئے، تمھیں جن مجبوروں، بے کسوں کا دست گیر بننا چاہیے تھا، انھیں پر تم نے دستِ ستم دراز کر ڈالا۔ تمھارے لیے مناسب ہوتا کہ کسی ظلم کے مارے کی مدد کرتے پر تم تو خود ہی ظلم کی مار بن گئے۔ اس کم زور و ناتواں بوڑھے کو اس کی دنیا اجاڑنے کے بعد، تم نے حرفِ شکایت ادا کرنے اور انصاف کا در کھٹکھٹانے سے بھی روکنا چاہا اور خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیں۔ تم نے صلابت خان اپنے منصب سے روگردانی، اور سنگ دلی کی انتہا کر دی۔

عرض بیگی: اَن داتا، دخل اندازی معاف، فیصلہ سنانے سے پہلے ایک درخواست ملاحظہ فرمالیں۔

(عرض بیگی، باز بہادر کے قریب جا کر ایک درخواست اس کے حوالے کرتا ہے، باز بہادر اُس پر نظر ڈالتا ہے اور چند ثانیوں میں بار یک کو لوٹا دیتا ہے۔)

باز بہادر: مابدولت سے تمھارے خیر اندیشوں نے رحم اور معافی کی درخواست کی ہے، جو نامنظور کی جاتی ہے۔ مالوہ کی حکومت تمھارے اجداد کی قربانیوں کو فراموش نہیں کر سکتی، لیکن ماضی حال کا قرض ادا نہیں کرتا۔ ہم اس مقدمے کا فیصلہ سناتے ہوئے اس نکتے کو نظر انداز نہیں کریں گے کہ تمھارے ہاتھوں سے کوئی جرم سرزد نہیں ہوا، لیکن تمھاری ہوس ناک نگاہوں نے ایک بے بس ناری کی عزت خطرے میں ڈال دی اور پھر کئیوں کی دنیا اُجڑ گئی، تو مابدولت کا فیصلہ یہ ہے کہ تمھاری یہ ہوس ناک آنکھیں نکال لی جائیں اور اس کے ساتھ ہی چوں کہ تم نے اپنے فرائض منصبی کو بھلا دیا، اب یہی بہتر ہے کہ تم اپنے منصب کو بھول جاؤ۔ تمھیں تمھارے عہدے سے معزول کیا جاتا ہے۔

صلابت خان: (اشک بار آنکھوں سے) رحم، رحم عالی جاہ! میری دنیا نہ اُجاڑیے۔

باز بہادر: بس کرو صلابت خان، تمھاری اس گریہ وزاری کے پس منظر میں ہمارے کانوں سے اُس مجبور عورت کی آہ و بکا اور التجائیں ٹکرا رہی ہیں، جنھیں تم نے اَن سُنا کر دیا تھا۔ کوتوال صلابت خان کو جلاّدوں کے حوالے کر دیا جائے۔

(کوتوال کے اشارے پر دو حبشی آ کر صلابت خان کو پکڑ کر لے جاتے ہیں۔)

(پردہ)

چوتھا منظر

(روپ متی اور باز بہادر اپنے محل کے عشرت کدے میں۔ وہی پہلے منظر کا مقام)

باز بہادر: ہاں تو روپ! تم کل کے مقدمے کے فیصلے کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہو!

روپ متی: اس میں شک نہیں کہ آپ کا فیصلہ انصاف کے عین مطابق ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ سلطنت کی مصلحتوں کے خلاف اور ایک طرح سے کافی سخت معلوم ہوتا ہے۔

باز بہادر: انصاف صرف جرم کی نوعیت اور اس کے مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر کیا جاتا ہے۔ مصلحتوں اور مفادات کو عزیز رکھ کر نہیں۔ ہم حکومت یا دنیا کے تقاضوں کو انصاف کی راہ کا روڑا نہیں بننے دے سکتے، اگر ایسا کریں تو مالوہ کا انصاف، انصاف نہ رہ جائے گا۔ ایک ایسا تماشا بن جائے گا، جو مصلحت و ضرورتِ زمانہ کے اعتبار سے ہر آن اپنا رنگ بدلا کرے گا۔

رانی! یہ تو تمھیں بھی تسلیم ہے کہ ہمارا فیصلہ انصاف پر مبنی ہے، بس اگر ہم سیدھے کھڑے ہیں تو اس بات کی پروا کرنا عبث ہے کہ ہمارا سایہ ٹیڑھا پڑ رہا ہے۔

روپ متی: مجھے جتنا آپ کا انصاف پیارا ہے، اتنا ہی آپ کے انصاف اور خوش انتظامی پر استوار سلطنت مالوہ کا استحکام بھی عزیز ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ صلابت خان کو دی ہوئی سزا، ریاست کے استحکام پر کوئی بُرا اثر نہ ڈالے۔ آخر مالوے کے تخت کی استقامت میں صلابت خان کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

باز بہادر: ہم تمھارے خدشے کو بے بنیاد سمجھتے ہیں۔ جب ہم نے کسی کی جاں نثاری، وفاداری، فرض شناسی اور خوش انتظامی کے صلے میں کبھی انعام و اکرام سے ہاتھ نہ روکا تو پھر کسی کی فرض ناشناسی، ستم آزمائی، اور منصب سے رُوگردانی کی پاداش میں سزا و سرزنش سے ہاتھ کیوں اُٹھالیں! اور مالوے کے تخت کی بنیادیں اتنی کم زور نہیں ہیں کہ ایک صلابت خان کے نہ ہونے سے ڈھے جائیں گی۔ جس پیڑ کی جڑ مضبوطی سے زمین میں جمی ہو، وہ ٹہنی کے کٹ جانے سے سوکھ نہیں جاتا۔

روپ متی: (باز بہادر کے قریب آکر، اس کے شانوں پر سر ٹکائے ہوئے) آپ کی کہی ہوئی ایک ایک بات دل تو مان لیتا ہے، پر دماغ.....

باز بہادر: (بات کاٹ کر) اندیشہ ہائے دور دراز کا شکار ہے۔ (اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر) میری محبوب، رقص و موسیقی کی ملکہ ذرا یہ تو بتاؤ، کسی راگ کا جنم کس بات پر منحصر ہے؟

روپ متی: کوئی بھی راگ کسی نہ کسی ٹھاٹھ سے جنم لیتا ہے اور ہر ٹھاٹھ اپنی جگہ ہلکے بھاری یا اونچے نیچے سُروں کی ایک خاص ترتیب پر قائم ہوتا ہے۔

باز بہادر: اور یہ سُروں کی خاص ترتیب کبھی نہیں بدلتی۔

روپ متی: ہاں، سُروں کی ترتیب بگاڑنے والا صحیح راگ جنم نہیں دے سکتا۔

باز بہادر: اسی طرح صحیح انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کسی بھی واردات کے مقصد، اُس واردات سے ہوئے نقصان اور نتائج سے نظر نہ ہٹے اگر غیر متعلق باتوں کو اس طرح ملحوظ رکھا جائے کہ واردات کی سنگینی اوجھل ہوجائے تو انصاف اپنا اعتبار کھو دیتا ہے اور ایک بے اعتبار انصاف کبھی ایک پائیدار حکومت کی بنیاد نہیں بن سکتا۔

(روپ کے چہرے پر کچھ قائل ہونے، کچھ قائل نہ ہونے کا ملا جلا تاثر ہے۔ وہ باز کے پہلو سے اُٹھ کر انگڑائی لینے کے لیے بازوؤں کا قوس بناتی ہے۔ جسم کا تناؤ نمایاں ہوتا ہے۔)

باز بہادر: (موڈ بدلتے ہوئے اور شرارت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے)

ع انگڑائی کا خم ہے کہ دھنک ٹوٹ رہی ہے!

(روپ متی شرما کر اپنے ہاتھ نیچے کر لیتی ہے۔ باز بہادر اٹھ کر روپ کے قریب جاتا ہے اور اسے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیتا ہے۔)

باز بہادر: خلوت کدے کی اس حسین دنیا میں تو کم از کم سلطنت کے تفکرات کے سائے مسلط نہ کرو۔ (زلفوں کو سہلاتے ہوئے) یہاں تو ہم صرف تمھاری زلفوں کے گھنیرے سائے چاہتے ہیں اور تمھارے رسیلے ہونٹوں سے ٹھمری کی مدھر تانیں۔

روپ متی: میری آواز میں آپ ایسا کیا پالیتے ہیں۔ آپ کے دربار میں تو ایک سے بڑھ کر ایک گُنی گیانی ہیں۔ کوئی تان کا استاد ہے تو کوئی بول میں اَن مول، کوئی دُھرپد کا دھنی ہے تو کوئی خیال میں بے مثال، کوئی سُروں کا سرتاج ہے۔ تو کوئی الاپ میں...

باز بہادر: (بات کاٹتے ہوئے) عالم میں یوں تو لاکھ سہی تم سا کوئی کہاں! تم جب مالکوس الاپتے ہوئے گمک کی تانیں لیتی ہو تو لگتا ہے کہ گلے میں وینا بج رہی ہے اور راگ آساوری کو الاپنے میں دھیوت کو ایسے پُرسوز ڈھنگ سے ادا کرتی ہو کہ دل کسی اور ہی عالم میں پہنچ جاتا ہے۔ ایسا کمال کسی اور میں کہاں۔

روپ متی: لیکن آپ کی 'باز خوانی' کا ایک الگ جادو ہے۔ اس طرز کے مُوجد ہی نہیں خاتم بھی آپ ہیں۔

باز بہادر: لیکن تمھاری ایجاد 'راگ بھوپ کلیان' کا جواب ہمارے پاس کہاں! خیر، ہمیں تو آج پھر سے اپنا وہ 'نغمۂ محبت' سنادو، جس کے لفظوں کی تاثیر، روپ الاپ کی تان میں، اپنے ماورائے سخن جذبات میں، ہمیں دنیا و مافیہا سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

روپ متی: لیجیے سناتی ہوں: (روپ متی کے اشارے پر چند کنیزیں آکر ساز لیے بیٹھ جاتی ہیں۔)

سکھی دوسروں کو اپنے خزانے پر اترانے دے

Friend let others boast their treasure,

میرے تو دھن پیارے کی پریت پونجی

Mine's a stock of pure love's pleasure,

اُن کو جتن کر (کے) راکھوں من میں

Safely cared for every part,

تو پرتیت تاروئے

Neath that trusty lock my heart,

کا ہو تریا کی لاگے نہ درشٹی

Safe from other woman's peeping,

اپنے کر راکھوں گی کنجی

for the key's in my own keeping,

میرے تو دھن پیارے کی پریت پونجی

Mine's a stock of pure love's pleasure,

دن دن بڑھے سوایوڈیوڑھو

Day by day it grow's little,

گھٹے نہ اِکّو گونجی

Never loses e'en a little,

باز بہادر کے سینہ اوپر

نچھاور کروں گی دھن اور جی

But through life will ever go,

with Baz Bahadur weal or woe.

(پردہ)

پانچواں منظر

صلابت خان کی حویلی کا مناسب ڈھنگ سے آراستہ کمرہ۔ ایک طرف مسہری پر مسند سے ٹیک لگائے ہوئے صلابت خان نیم دراز ہے۔ آنکھوں پر ریشمی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ اُس کے پاس ہی مسہری پر نجیب خان، اور قتلغ خان بیٹھے ہیں۔ مسہری سے کچھ ہٹ کر مخملی مونڈھوں پر شہاب الدین، پیلو خان اور قاضی امام الدین بیٹھے ہیں۔ سرہانے کی دیوار پر ایک دوسرے کو قطع کرتی ہوئی دو شمشیریں لگی ہیں۔ جن پر سپر ٹنگی ہے۔ مسہری کے دائیں جانب ایک دریچہ ہے۔ جس پر گہرا عنابی پردہ پڑا ہے، اس لیے باہر کا منظر چھپا ہوا ہے۔ کمرے کا ماحول گمبھیر نظر آتا ہے اور گہرا سکوت چھایا ہوا ہے۔ ایسے میں دور کہیں کسی چیل کی مکروہ چیخ فضا میں گونجتی ہے اور کمرے کا سکوت ٹوٹتا ہے۔

نجیب خان: ساتھیو، صلابت خان کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ ہم سب کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہونا چاہیے، جن افغانوں کی جرأت و جاں نثاری سے مالوہ کی حکومت کا استحکام قایم ہے، انھیں کا سپہ سالار ایک ادنا سی خطا پر اندھا کر دیا گیا۔

قاضی امام الدین: باز بہار نے سراسر ظلم کیا ہے۔ صلابت خان کو عملی طور پر کسی گناہ کے ارتکاب کے بنا اتنی بڑی سزا بھگتنی پڑی کہ اس کی آنکھیں نکال لی گئیں اور وہ بھی ایک ناہنجار روبتاں کی شکایت پر۔

شہاب الدین: ہمارے لیے یہی بہتر ہے کہ آیندہ کے لیے پیش بندی کر لیں۔ آج جو صلابت خان کے ساتھ ہوا ہے، کل وہ ہمارے ساتھ بھی پیش آ سکتا ہے۔

نجیب خان: یوں بھی سرکار دربار میں گویّوں اور رقاصوں کا بول بالا ہے اور جاں نثار و وفادار، ذلیل و خوار کیے جا رہے ہیں۔

قتلغ خان: نہ تو باز بہادر کو حدودِ مملکت کی توسیع کی جستجو ہے، نہ ہی لشکری قوت میں اضافے کی فکر، البتہ والیِ مالوہ کی توجہ کا مرکز ناچ رنگ کی محفلیں ضرور بنی ہوئی ہیں۔

پیلو خان: یہ کوہ و دمن کے سبزہ زاروں اور قدرتی خزانوں سے مالامال ریاست، اس صورت میں کب تک محفوظ رہ سکے گی، جب کہ حکم راں شمشیر و سناں کی بجائے چنگ و رباب اور تیر و تفنگ کی جگہ رقص و ادا کا متوالا ہوتا جا رہا ہو!

قتلغ خان: ایسے حالات میں جب کہ دہلی میں آلِ بابر نے دوبارہ اقتدار حاصل کر لیا ہے اور مغل لشکر کے مہیب سائے دور دور تک بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ ہم لوگوں کا مالوہ اور مملکتِ مالوہ سے وابستہ اپنے مفادات کی حفاظت کی طرف سے غافل رہنا، ہم سب کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

صلابت خان: (مسند کے سہارے قدرے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے) میری دنیا تو اندھیر ہو چکی ہے، میرے دوستو، اب مجھ سے کیا چاہتے ہو؟

نجیب خان: تمھیں اپنے ساتھ ہوئی ناانصافی اور ظلم کا بدلہ لینا چاہیے۔ تمھاری تذلیل سارے جرگے کی تذلیل ہے۔ ہوا کا رُخ بتاتا ہے کہ مغل تسلط جلد یا بدیر چہار طرف پھیلتا جائے گا۔ اس لیے ہمارا منصوبہ یہ ہے کہ اس سے پہلے کہ مالوہ مغل لشکر کی نگاہ میں چڑھے، تم خود ہی آگرہ جا کر یہاں کے معاملات سے آگاہ کر دو۔

شہاب الدین: اور مغل فوج کشی کی صورت میں ہماری طرف سے مکمل تعاون اور وفاداری کا پیغام پہنچا دو، بشرطیکہ مغلیہ قلم رو کے تحت ہمارے مناصب اور مفادات محفوظ رکھے جائیں۔

صلابت خان: کیا تم لوگوں نے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے؟

پیلو خان: پوری طرح سوچ سمجھ کر ہم سب نے مل کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ مالوہ کو ایک مدبر حکم راں کی ضرورت ہے، ایک شاعر اور گویّے کی نہیں۔

قتلغ خان: پانی سر سے اتنا اونچا ہو گیا ہے کہ میں پچھلے کئی دنوں سے چند لشکری اُمور کی بابت صلاح و مشورے کے لیے کوشاں ہوں، لیکن اذنِ باریابی ہی نہیں ملتا۔ جب بھی جاتا ہوں۔ ساز و آواز کی محفل جمی ہوتی ہے۔ طنبورے کی تانوں اور سُر بہار کی جھنکاروں میں گم شاہ کو بھلا میرے لیے گوش بر آواز ہونے کی فرصت کہاں!

پیلو خان: بالکل صحیح فرمایا تم نے۔ ہمارے تمھارے لیے وہاں کوئی گوش شنوا نہیں، لیکن جہاں:

لگی تھاپ طبلوں پہ مردنگ کی

صدا اونچی ہونے لگی چنگ کی

ہمارے یہی بادشاہ سلامت ہمہ تن گوش نظر آتے ہیں!

قاضی امام الدین: اس لیے صلابت خان تم اس ساز کی کھونٹیاں ہی ڈھیلی کر دو، جس سے یہ ترانے پھوٹ رہے ہیں۔

صلابت خان: میرے سینے میں بھی انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔ جب تم

جیسے جاں نثار میرے ساتھ ہو، تو مجھے تمھارے منصوبے میں شامل ہونے میں کوئی عذر نہیں، بلکہ میں اسے پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں گا، پر آگرے کا سفر...!

نجیب خان: وہ سب انتظام ہم نے کرلیا ہے۔ تاجروں کا ایک قافلہ پرسوں آگرہ کے لیے روانہ ہوگا۔ تم اہل خاندان کے ساتھ ان کے ہم راہ چلے جانا، تمھاری روانگی راز رہے گی۔ دربار اکبری تک رسائی حاصل کرنے کے لیے تمھیں وہاں ادہم خان سے ملنا ہوگا۔ رئیس التجار امیر چند کھنہ نے آگرہ میں تمھاری بود و باش کے انتظام اور ادہم خان سے ملاقات کرانے کا ذمہ لیا ہے۔ مشہور ہے کہ اکبری فیصلوں کی تہ میں اسی ادہم خان کی ماں ماہم بیگم کا دماغ کام کرتا ہے، اگر تم نے فہم و فراست سے کام لے کر اسے ہم وار کرلیا تو سمجھو کام بن گیا۔

پیلو خان: اب ہم سب رخصت ہوتے ہیں، تم سفر کی تیاری کرو۔ خدا حافظ

(پیلو خان کے ساتھ ہی سب لوگ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔)

صلابت خان: خدا حافظ۔

(پردہ)

دوسرا ایکٹ

-----آگرہ-----

پہلا منظر

ماہم بیگم، سرخ و سپید باوقار خاتون، جس کی عمر بشرے سے نہیں جھلکتی، پر پانچویں دہائی پار کر چکی ہے، ایک قرینے سے سجے وسیع کمرے میں چاندنی سے منڈھے تخت پر مسند سے لگی بیٹھی ہے۔ قریب ہی کھڑی ایک باندی مور چھل جھل رہی ہے۔ کچھ فاصلے پر دو کنیزیں کھڑی ہیں۔ دروازے پر قلماقنی متعین ہے۔ تخت کے سامنے دیوار پر ایک جنگی منظر کی روغنی تصویر فریم میں لگی ہے۔ ایک کنیز (نوبہار) داخل ہوتی ہے۔

نوبہار: حضور عالیہ، عالی جاہ ادہم خان، صلابت خان کے ساتھ تشریف لے آئے ہیں۔

ماہم بیگم: انھیں ہمارے پاس بھیج دو۔

(نوبہار باہر جاتی ہے، کچھ دیر بعد ادہم خان کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے متعاقب صلابت خان کا ہاتھ تھامے ہوئے نوبہار آتی ہے۔)

ادہم خان: والدہ معظمہ، تسلیمات۔ جیسا کہ میں نے آپ سے ذکر کیا تھا، سپہ سالار مالوہ صلابت خان کو لے آیا ہوں۔

صلابت خان: حضور عالیہ، غلام بندگی عرض کرتا ہے۔

ماہم بیگم: ادہم خان کی زبانی ہمیں تمھارے بارے میں معلوم ہوا اور یہ بھی پتا چلا کہ تم ہم سے ملنا چاہتے ہو۔

صلابت خان: جی ہاں، حضور عالیہ، مجھے آپ ہی سے ملنا تھا کہ احکام اکبری آپ ہی کی صلاح و مشورے کے بعد مکمل ہوتے ہیں۔ اس لیے کچھ ندیموں نے مجھے راست آپ ہی سے گزارش گزار ہونے کی صلاح دی ہے۔

ماہم بیگم: ہم تمھاری روداد سننا چاہیں گے۔

صلابت خان: (چہرے پر اُداسی چھا جاتی ہے، گلوگیر ہو کر کہتا ہے۔) میں اپنی بدنصیبی کی داستان کیا سناؤں، حضور عالیہ، میری پشتوں کی وفاداریوں کو فراموش کر کے، حاکم مالوہ نے مجھے ایک ناکردہ گناہ کی ایسی بھیانک سزا دی کہ میں نہ تو جی سکتا ہوں نہ مر سکتا ہوں۔ میری آنکھوں سے دنیا کی رنگینیاں چھین کر ان میں سدا کے لیے نامرادیوں کے اندھیرے بسا دیے گئے۔

ماہم بیگم: صلابت خان، تم نے زبان سے جو کچھ نہیں کہا، اس سے بہت زیادہ زبان حال سے ظاہر ہے۔ تم جیسے سپہ سالار کو ان حالوں پہنچا کر ملک بایزید نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ افسوس! اس نے تمھاری پشتوں کی جاں نثاری کا یہ صلہ دیا! ایسے ظالم کو کیفر کردار تک پہنچانا ہی چاہیے۔ مالوہ وسطِ ہند کا قدرتی خزانوں، آبی ذرائع اور زرخیز زمینوں سے مالا مال ایک ایسا علاقہ ہے، جو ایک عرصے سے ہماری نگاہِ انتخاب میں ہے، یہ اور بات ہے کہ اُدھر ہماری توجہ نہ ہوسکی۔

صلابت خان: مجھے امید ہے کہ اب آپ اسے اپنی توجہ کا مرکز بنائیں گی۔ میرا پورا تعاون آپ کے ساتھ ہوگا۔ میری غرض صرف والیِ مالوہ سے انتقام لینا ہے۔

ماہم بیگم: انتظار کرو، تمھارا جذبہ انتقام بھی آسودہ ہو جائے گا اور ہماری تسخیرِ مالوہ کی آرزو بھی۔ تم باز بہادر کا تاج اُتارنا چاہتے ہو۔ میں ادہم خان کو مالوہ کا تاج دار دیکھنا چاہتی ہوں۔

صلابت خان: میں آپ کا تابع دار ہوں اور بے قراری سے اُس دن کا انتظار کروں گا، جب ہماری آرزوئیں پوری ہوں گی۔

ماہم بیگم: میں اس سلسلے میں جلد ہی بادشاہ سلامت سے مشورہ کروں گی۔ اب سے تم خُود کو ہماری امان میں سمجھو۔

صلابت خان: میں حضور عالیہ کی نوازش اور مہربانی کو تا زندگی نہیں بھولوں گا۔

ادہم خان: (کنیز سے) نوبہار، صلابت خان کے قیام کا انتظام کرو۔

(نوبہار، صلابت خان کو ساتھ لے کر باہر جاتی ہے، دوسرے ہی لمحے شمشاد (کنیز) کمرے میں داخل ہوتی ہے۔)

شمشاد: بیگم صاحبہ کو یاد دلانے کے لیے آئی ہوں کہ دربار خاص کے لیے روانگی کا وقت ہوا جاتا ہے۔

ماہم بیگم: خوب یاد دلایا شمشاد، چلو ہم آرہے ہیں۔

(ماہم بیگم کے ساتھ ہی سب کنیزیں کمرے سے باہر چلی جاتی ہیں۔ صرف ادہم خان اکیلا رہ جاتا ہے۔)

ادہم خان: کسی کو انتقام سے غرض ہے، کسی کو مالوہ پر قبضہ واقتدار چاہیے، (اپنے خریطے سے لکڑی کے دو سلائیوں پر لپٹی روپ متی کی رنگین روغنی تصویر نکال کر دیکھتا ہے۔) پر مجھے تو اے پری پیکر تمھارے حسن وشباب نے دیوانہ بنا دیا ہے۔ سب کی منزلیں الگ الگ ہیں، لیکن راستہ ایک ہے، تسخیرِ مالوہ، اور میں ان سب مقاصد کو پورا کرنے کے لیے مالوہ تسخیر کروں گا۔ (ادہم خان کی نظریں، سامنے دیوار پر لگی ہوئی جنگی منظر کی تصویر پر گڑی ہیں، جس میں دو متحارب لشکروں کے فوجی گھوڑوں پر سوار برسرِ پیکار ہیں۔)

(پردہ)

دوسرا منظر

ایک وسیع وعریض ایوان میں اکبر کے دربارِ خاص کا منظر۔ اکبر ایک قدرے اونچے تخت پر شاہانہ وقار سے متمکن ہے، تخت پر چتر اور چتر پر سایہ گستر لگا ہے۔ کچھ فاصلے پر دورباش نصب ہے، دورباش کے پاس ہی آداب گاہ ہے، جہاں رُک کر بادشاہ کی تعظیم کی جاتی ہے۔ تخت کے پیچھے، دائیں، بائیں، سلاح دار، جاں دار (دو محافظ) کھڑے ہیں۔ وزراء اور معتمدین حسبِ مراتب اپنی نشستوں پر بیٹھے ہیں۔ بادشاہ سے کچھ فاصلے پر بار بک اور حاجب ایستادہ دربار کی ذمے داریاں نبھا رہے ہیں۔ ماہم بیگم کچھ امرا و وزرا کی جہاں دیدہ خواتین کے ساتھ ایوان کے بائیں جانب زنانے حصے میں براجمان ہیں۔ اُن سب کی نشست گاہ کے آگے چلمن پڑی ہے۔

بار بک: ظلِ الٰہی، آج کے اُمورِ دربار تو طے ہوئے، اب آخر میں حضور عالیہ ماہم بیگم صاحبہ ایک اہم تجویز پیش کرنے کی اجازت چاہتی ہیں۔

اکبر: انھیں اپنی تجویز پیش کرنے کی اجازت ہے۔

ماہم بیگم: (چلمن کی اوٹ سے) بادشاہ سلامت، آپ کی قلم رو میں صبحِ بنارس کی ضوفشانیاں بھی ہیں، اور شامِ اودھ کی رنگینیاں بھی۔ کیا ہی اچھا ہو اگر حدودِ سلطنتِ دہلی میں شبِ مالوہ کی رعنائیاں بھی سمٹ آئیں۔ اطلاعات ملی ہیں کہ مانڈو کے حکم راں کا ظلم وستم اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ ملک بایزید رعایا کی فوز وفلاح سے غافل، اور امرا و حکام کے اعتماد سے محروم ہو چکا ہے۔ یوں جانیے چنگ ورباب اور عیش ونشاط میں گرفتار باز اسیر پنجۂ صیاد ہوا چاہتا ہے۔

اکبر: (اشارہ کرتے ہوئے) خان خاناں، اس بارے میں ہم تمھاری رائے جاننا چاہتے ہیں۔

بیرم خان: بادشاہ سلامت، باز بہادر ایک انصاف پسند، رعایا پرور اور خاص طور پر فن کاروں کا بڑا قدر دان حاکم مشہور ہے۔ اس کے علاوہ مالوہ کی حدود کے باہر نہ تو اسے دعوائے ملک گیری ہے، نہ ہی ہماری سرحدوں میں اس کی دخل اندازی کی کوئی شکایت ہے۔

ادہم خان: بادشاہ سلامت، اجازت ہو تو خانہ زاد کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔

اکبر: اجازت ہے۔

ادہم خان: باز بہادر کے ظلم وایذا رسانی کی جیتی جاگتی مثال خود مالوہ کا سپہ سالار ہے، جو باز بہادر کے قہر وعتاب کا بے وجہ نشانہ بنا، سوری سپاہ کے شانہ بشانہ لڑنے والی افغان قوم کا وہ فرزند، جس کے اجداد کی ہڈیوں پر مالوے کے تخت کی بنیاد قایم ہے، آج میری تحویل میں ہے اور مغلوں سے پناہ کا طلب گار ہے۔ بادشاہ سلامت حکم دیں تو صلابت خان کو حضور کے قدموں میں پیش کیا جائے۔ (تمام لوگ متجسسانہ نظروں سے ادہم خان کی طرف دیکھتے ہیں۔)

اکبر: حکم دیا جاتا ہے۔

(چند لمحے بعد حاجب، صلابت خان کو لیے ہوئے آتا ہے اور دورباش سے کچھ فاصلے پر ملاقاتیوں کے لیے مخصوص جگہ پر پہنچا دیتا ہے۔ صلابت خان کو رنش بجالاتا ہے۔)

بار بک: ظلِ الٰہی، سپہ سالار صلابت خان قدم بوسی میں حاضر ہے۔

اکبر: مغل افواج سے لوہا لینے والی سپاہ کے سورما، کیا افغانوں کی بہادری اور وفاداری کے کارنامے اسی انعام کے سزاوار تھے، جو تم شیر شاہ کی شکست وہزیمت کے بعد، سلطنتِ مالوہ کو استقامت پہنچانے کے صلے میں اس انجام کو پہنچے!

صلابت خان: جہاں پناہ کا اقبال بلند ہو۔ مجھ بدبخت اور ناکردہ گناہ پر حاکمِ مالوہ کی نگاہِ قہر نے بڑا ستم ڈھایا ہے، لیکن غلام اپنی بدنصیبی کا دُکھڑا چھیڑ کر مزاجِ اقدس مکدر کرنا نہیں چاہتا۔

بیرم خان: یہ بات عقلِ سلیم قبول نہیں کرتی کہ کوئی بنا کسی سبب کے ایسی سزا پائے!

اکبر: ہر انجام اپنے عمل کی مکافات ہوتا ہے، خیر ہم تمھاری روداد کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ہمارے لیے اتنا کافی ہے کہ مالوہ کا سپہ سالار ہماری پناہ میں ہے، لیکن والیِ مالوہ سے بلا سبب نبرد آزمائی کیوں کی جائے؟

بیرم خان: بادشاہ سلامت، صلابت خان کو کھو کر باز بہادر آیندہ بھی زور آزمائی کی جرأت نہیں کرسکتا، یوں بھی حضور کی تخت نشینی کی تقریب پر سفیرِ مالوہ نذرانۂ تہنیت اور خیر سگالی کا پیغام لایا تھا۔

ماہم بیگم: خُلد آشیانی شہنشاہ ہمایوں نے فرمایا تھا کہ افغانی، ہندستان میں مغل اقتدار کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہیں، اور حضرت علی مرتضیٰ کا قول مشہور ہے کہ دشمن کے حسنِ سلوک پر نہ جاؤ۔ پانی کتنا ہی گرم کیوں نہ ہو، آگ پر

جب پڑے گا تو اسے بجھا دے گا۔

(صلابت خان حاجب سے کچھ کہتا ہے۔)

باربک: ظلِ الٰہی، سپہ سالار صلابت خان اس سلسلے میں کچھ اہم باتیں کہنے کی اجازت چاہتا ہے۔

اکبر: اجازت ہے۔

صلابت خان: جہاں پناہ، حقیقتِ حال یہ ہے کہ باز بہادر کی رنگ رلیوں اور عیش کوشیوں سے نظمِ سلطنت درہم برہم ہوا جا رہا ہے۔ رعایا درماندہ حال ہے اور اُمرا برگشتہ خاطر، چوں کہ اربابِ نشاط کو منصب دارانِ حکومت پر فضیلت حاصل ہے، اس لیے اُن میں ایک عام بے اطمینانی اور عدم تحفظ کا احساس پایا جاتا ہے۔ مالوہ کی زرخیز و شاداب سرزمین اور مانڈو کے بے قیاس زر و جواہر سے بھرے خزانوں سے دہلی کی حکومت کا صرفِ نظر کرنا کسی حال میں مناسب نہ ہوگا۔ اس سے پہلے کہ پڑوسی راجاؤں کی نیت بگڑے یا اس سے پہلے کہ ان قدرتی وسایل اور خزانوں کی فراوانی سے مقابل اپنی طاقت ناقابلِ تسخیر بنا لے، اسے جا دبوچنا ہی دانائی ہے۔ (اپنے چوغے میں سے ایک خریطہ نکال کر باربک کو دیتے ہوئے۔) جہاں پناہ، فرماں روائے مالوہ اپنے اُمرا و وزرا، کا اعتماد کس حد تک کھو چکے ہیں، اس کا حال اُن کی اس مشترکہ عرض داشت سے ظاہر ہو جائے گا، جس میں انھوں نے حاکم مالوہ کے طور طریقوں سے مایوس ہو کر بادشاہ دہلی سے اپنی امیدیں وابستہ کی ہیں اور مغل لشکر کشی کی صورت میں ہر ممکن مدد کا وعدہ کیا ہے۔

اکبر: عرض داشت پڑھی جائے۔

(باربک دونوں ہاتھوں میں عرض داشت لیے ہوئے ہے۔ اس کے ہونٹ ہل رہے ہیں، گویا عرض داشت پڑھ رہا ہے، پس منظر سے دھیمی دھیمی موسیقی کی لہریں فضا میں گھل رہی ہیں۔)

اکبر: یہ تفصیل دل پذیر ہے اور تمھارے موقف کی حمایت بھی کرتی ہے۔

ادہم خان: مثل مشہور ہے کہ لوہا گرم ہوتے ہی چوٹ لگا دینی چاہیے۔

ماہم بیگم: بادشاہ سلامت، اگر مالوہ پر لشکر کشی کی تجویز کو تائید شاہی حاصل ہے تو میں ایک درخواست کرنا چاہوں گی۔

اکبر: یہی سمجھ لو کہ اس منصوبے کو ہماری تائید حاصل ہے، کہو کیا کہنا ہے۔

ماہم بیگم: بادشاہ سلامت، میری درخواست ہے کہ ان دنوں ادہم خان کے لشکریوں کا لوہا تیز ہو رہا ہے، کیوں نہ آپ اسے مالوہ کی مہم سونپ دیں، حالات بھی موافق ہیں، اِدھر صلابت خان سے دشمن کی عسکری طاقت کی تفصیلات بھی حاصل ہو جائیں گی۔ اس طرح یہ معرکہ بڑی آسانی سے سر ہو جائے گا۔

اکبر: دشمن کو حقیر سمجھنے کی بھول نہیں کرنا چاہیے۔ ادہم خان میں ابھی تجربے کی کمی ہے، اور پھر (اپنائیت سے) کوکا کو ہم اپنے سے دور کرنا نہیں چاہتے۔ خان خاناں نے مجھے ہمیشہ وہ زمین فراہم کی ہے، جس پر میرے خوابوں نے حقیقت کا جامہ پہن کر قدم رکھا ہے۔ یہ مہم بھی وہ سر کریں یا پھر وہ جسے مناسب سمجھیں، اسے اس مہم پر مامور کریں۔

بیرم خان: جہاں پناہ کی قدر افزائی ہے۔

(اکبر کے ساتھ ہی سارے لوگ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور دربار برخاست ہو جاتا ہے۔ ماہم بیگم کی پیشانی پر تیوریاں چڑھ جاتی ہیں اور ادہم خان کے چہرے پر ناگواری اور حسد کے جذبات نمایاں ہیں۔)

(پردہ)

تیسرا منظر

(اسی ایکٹ کے پہلے منظر کا مقام۔ ماہم بیگم کا ایوان)

ادہم خان: (چڑچڑے پن سے دانت پیستے ہوئے) بیرم خان نے بادشاہ سلامت کو ہمیشہ وہ زمین فراہم کی ہے، جس پر اُن کے خوابوں نے حقیقت کا جامہ پہن کر قدم رکھا ہے۔ چہ خوب!

ماہم بیگم: (ترش روئی اور غضب ناکی سے) میں نے اگر خود بیرم خان کے قدموں تلے سے زمین نہ کھسکا دی تو ماہم آنگہ میرا نام نہیں۔

ادہم خان: سوچ لیجیے، بیرم خان کو زک پہنچانا بہت مشکل کام ہے۔

ماہم بیگم: آسان ہونے سے پہلے ہر کام مشکل ہوتا ہے۔

ادہم خان: پتا نہیں، بیرم خان نے اکبر پر کیا جادو کر دیا ہے کہ وہ ہمیں خاطر ہی میں نہیں لاتا۔

ماہم بیگم: ایک شخص، صرف یہ ایک شخص! میرے ارمانوں کا خون نہیں کر سکتا۔ اگر تاریخ کا یہ اگر جس کا نام بیرم خان ہے، نہ ہوتا تو آج دہلی کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ اکبر شہنشاہ اکبر نہ ہوتا اور میرے لختِ جگر ادہم خان، تم محض ادہم خان نہیں ہوتے!

ادہم خان: لیکن تاریخ کا یہ 'اگر' ایک سنگین حقیقت ہے۔ اکبر شہنشاہ اکبر ہے اور ادہم خان محض ادہم خان۔

ماہم بیگم: (فیصلہ کن انداز میں) لیکن اس بار تاریخ میں لکھوں گی۔ میں اپنے ہاتھ آئی ہوئی یہ بازی، یوں ہاتھ سے نہ جانے دوں گی۔ جاؤ، معلوم کرو بیرم خان نے اس مہم پر کسے مامور کیا ہے، جو بھی ہو، تم محاذ جنگ میں کمک

رسالہ جاگیرداروں، باج گزاروں کو مطلع کردو کہ اس لڑائی میں وہ بیرم خان کی اعانت سے ہاتھ کھینچ لیں، مشہور کردو کہ وزیر اعظم، نوجوان اکبر کو اپنے اشاروں پر نچا رہا ہے اور حکم شاہی کے در پردہ دراصل اپنی من مانیوں پر تلا ہوا ہے۔ کوشش کرو کہ جنگ میں کوئی کمک بہ وقت ضرورت شریک نہ ہو سکے۔ اُن کی راہیں مسدود کرادو۔ بن پڑے تو خبر رسانوں کو بھی رام کرلو، مگر کمال ہشیاری کے ساتھ۔ صلابت خان سے کہہ دو کہ کلیدی اطلاعات کی بابت سردست لبوں پر قفل لگا لے۔ جاؤ، ادہم خان، بس مجھے یہ خوش خبری سنادو کہ بیرم خان اس مہم میں ناکام و نامراد رہا۔ میں اس کا وعدہ کرتی ہوں کہ مالوہ کی حکم رانی تمھیں دلا کر رہوں گی۔

ادہم خان: (نگاہوں میں چمک پیدا ہوتی ہے۔) والدہ معظمہ، یہ سب تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، یوں سمجھیے آپ کا کام ہوگیا۔

ماہم بیگم: (شفقت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے) ساتھ ہی تمھارا بھی۔

(دونوں مسکراتے ہیں۔)

(پردہ)

چوتھا منظر

سنگ سُرخ سے بنا اکبر کے محل کا خصوصی راحت کدہ۔ اس کی وسعت کے پیش نظر، اس کی تزئین و آرائش میں ایک طرح کی سادگی جھلکتی ہے، پر جو غور سے دیکھو تو دیدہ زیبی و پُرکاری کھلتی ہے۔ محرابوں کی جالیوں میں نفیس و نازک نقش و نگار کا کام دیکھ کر نگاہ ہٹنا گوارا نہیں کرتی۔ فرش پر بیش بہا، دبیز ایرانی قالین بچھے ہیں۔ نقشیں صندلی مسہری پر زرکار مسند اور تکیے قرینے سے رکھے ہیں۔ مسہری کے دونوں پہلوؤں میں نقرئی چوکیاں رکھی ہیں۔ دن ڈھلنے کے قریب ہے، منقش چھت میں آویزاں بلوریں جھاڑ اور فانوس اور دیواروں سے لگے شمع دان روشن ہیں۔ مسہری کے سامنے جھروکے سے آسمان پر ہلکی ہلکی شفق کی لالی پھیلتی نظر آرہی ہے۔ کچھ فاصلے پر مغربی بُرج میں روشنیاں جھلملا رہی ہیں اور اُن کا عکس سامنے بہتی نہر کے پانی میں لرز رہا ہے، نہر کے کنارے سربلند سرو کے درخت قطار میں لگے ہوئے ہیں۔ برج میں بابا رام داس[1] بیٹھا ہوا راگ ایمن کلیان الاپ رہا ہے۔ اکبر ایک ہشت پہلو میز پر ہاتھ ٹکائے محو نظارہ ہے۔ آسمان پر سرخی گہری ہو چلی ہے۔ (ایک کنیز آتی ہے۔)

کنیز: خداوند نعمت حضور عالیہ ماہم بیگم باریابی کی اجازت چاہتی ہیں۔

اکبر: اجازت ہے۔ (ماہم بیگم داخل ہوتی ہے)

ماہم بیگم: عالی جاہ، کچھ ضروری باتیں کہنے کے لیے آئی ہوں۔

اکبر: (بظاہر خوش طبعی سے، لیکن طنز کی کاٹ لیے ہوئے لہجے میں) ایک تم ہی تو ہو جو اکبر سے جو کہنا چاہو بے جھجک کہہ سکتی ہو۔ اکبر تمھارا احسان مند ہے۔ کہو ادہم خان کی جاگیر میں اضافہ مطلوب ہے یا شہاب خان[2] کے منصب میں ترقی چاہیے!

ماہم بیگم: (اکبر کے طنز بھرے استفہامیہ لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے) میں نے سنا ہے سارنگ پور کے محاذ پر مغل لشکر کی حالت ابتر ہے۔ جہاں بیرم خان نے باز بہادر کی سرکوبی کے لیے امیرالامرا بہادر خان، خان زمان کے بھائی کو روانہ کیا تھا، دیکھیے بُرے آغاز نے بُرے انجام کے آثار پیدا کردیے ہیں۔

اکبر: ہاں، وہاں کی خبریں اچھی نہیں ہیں، اور نامُراد بہادر خان کی سپاہ مراجعت کی تیاری میں ہے۔

ماہم بیگم: (اکبر کے مثبت جواب سے تقویت پاکر، متحیرانہ لہجے میں) حیرت ہے! بیرم خان کی حکمت عملی، باز بہادر کو مات نہ دے سکی! شاید اس لیے کہ بیرم خان کی ترجیحات، اکبری فتوحات کی بجائے، کچھ خاص ذاتی دل چسپیوں کو حاصل ہیں، ورنہ کیا بات تھی کہ اس نے سارنگ پور کی مہم پر بختاور[3] بہادر خان جیسے ناتجربہ کار کو بھیج دیا۔ حضور نہ مانیں گے، پر لوگ کہتے ہیں کہ (ماہم بیگم، جو ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی ہوئی گفتگو کررہی ہے، دفعتاً اپنی چال کا رخ بدلتی ہے۔) وہ بادشاہ گر ہے۔ اس نے اپنی متوازی بادشاہت قائم کر رکھی ہے۔ اس کے ایک وقت کے دستر خوان پر تیس تیس ہزار شمشیر زن کا ہاتھ پڑتا ہے۔[4] یہاں تک کہ بیرم خان کی داد و دہش کے چرچوں نے عنایات خسروی کا شہرہ ماند کردیا ہے۔ اُس کے بڑھتے ہوئے مراتب اور اختیارات سے ہم سروں کے دلوں میں بے چینی و مایوسی کا احساس بڑھتا جارہا ہے۔ اور یہ آثار استحکام حکومت کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔

اکبر: پہاڑ کٹ گئے، دریا پایاب ہوگئے، کانٹوں بھرے راستے صاف و ہموار ہوگئے، اب بیرم خان کی کیا ضرورت ہے! خلد آشیانی والد مرحوم کی دشت نوردی میں جو آبلہ پا، ان کا ہر قدم پر سہارا بنا رہا، جس نے ان کے بچھڑے ہوئے اقبال اور کھوئی ہوئی حکومت کو حاصل کرنے میں اپنی جان و مال کی پروانہ کی، جس نے کم سن و ناخواندہ اکبر کو سریر آرائے سلطنت بنا کر، انتہائی نازک موقع پر اپنے حسن تدبیر سے حکومت کے بگڑے کام سنوار دیے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ، وہ بیرم خان جس نے ہماری راہوں میں پھول ہی پھول کھلا دیے، وہ خود حریفوں کی نظر میں خار بنا ہوا ہے!

ماہم بیگم: (چونک کر) حضور! کیا مجھ بد بخت کی خیر خواہی پر بھی شک وشبے کا گمان ہے! جس نے اپنے ان ہاتھوں سے حضور کی ننھی سی جان کو پروان

بڑھاپا۔ اس عمر میں مجھے یہی سننا باقی رہ گیا تھا! یاد رکھیے کہ آپ کے چاروں
طرف وہ لوگ ہیں، جو وہی باتیں کہنا چاہتے ہیں جو کہ ایک بادشاہ سننا چاہتا
ہے، پر میں جو کچھ کہہ رہی ہوں وہ آپ سے کوئی نہ کہے گا، لیکن یہ باتیں زبانِ
زدِ خاص و عام ہیں۔
اکبر: تم سے بڑھ کر بھی میرا خیر طلب ہے کوئی! لوگوں میں تو یہ بھی مشہور بتایا
جاتا ہے کہ سلطنتِ دہلی میں ادہم خان آدھے کا حصے دار ہے۔
ماہم بیگم: یہ اتہام ہے۔ یہ اس نسبت خاص کو بدنام کرنے کی سازش ہے، جو
مجھے اور ادہم کو حضورِ عالی سے ہے۔ میرا دل کہتا ہے، بلکہ مجھے یقین ہے کہ
ہمارے خلاف یہ افترا پردازیاں، بیرم خان ہی کے ہوا خواہوں نے پھیلا رکھی
ہیں۔ شاید بیرم خان کے متعلق میں مابدولت کی رائے نہ بدل سکوں، لیکن میں
اس کے بارے میں اپنی رائے بھی نہیں بدل سکتی۔ مجھے خوشی ہوگی، اگر میرے
اندیشے حقیقت کا روپ اختیار نہ کریں، اور کسی بدبختی کا نظارہ نہ کرنا پڑے۔
اکبر: تم اپنے سائے کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکتیں ماہم بیگم، چوں کہ تم نے سورج
کی طرف پیٹھ کر رکھی ہے۔ تم نے اپنی فہم و فراست رشک و حسد کو سونپ دی ہے۔
ماہم بیگم: (رقت بھرے انداز میں) رشک و حسد بھی وہی کرتا ہے جو محبت کرتا ہے۔
اکبر: اس کے ساتھ ہی رشک و حسد ایک خراج ہے جو کم تری، لیاقت کو پیش
کرتی ہے۔
ماہم بیگم: (آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں) کیا اسی طرح طنز کے تیروں
سے میرا جگر چھلنی کرتے رہیں گے عالی جاہ! کیا ہم سب متوسلان شاہی کے
سکھ دکھ بھی مغلیہ عظمت و استحکام سے وابستہ نہیں ہیں؟ میری آل اولاد آپ پر
قربان، سارنگ پور میں مغل لشکر کی پسپائی کی خبروں نے جی جلا کر رکھ دیا تو پھر
ایک بار یہی عرض کرنے چلی آئی کہ کیوں نہ یہ مہم ادہم خان کے حوالے کر دی
جائے۔ اس کی سپاہ کیل کانٹے سے لیس ہے، لیکن جب حضور کو یہ پسند نہیں تو
اب میں اس سلسلے میں کچھ نہ کہوں گی۔ (دست مال آنکھوں سے لگاتی ہے کہ
آنسو نہ چھلکیں۔)
اکبر: (گہری سوچ میں ڈوبا ہوا... ہلکے ہلکے قدموں سے ٹہلتے ہوئے...
قدرے توقف کے بعد)
سارنگ پور کی پسپائی واقعی ہمارے لیے تشویش کی بات ہے۔ ہمیں
حیرانی ہے کہ پیغام رسانی کے ذرائع یک بہ یک کیسے اتنے ناکارہ ہو گئے کہ
لشکر کو موقع پر کہیں سے کمک نہ مل سکی۔ بیرم خان سے یقیناً ان بد نظمیوں کا
جواب طلب کیا جائے گا... شاید اپنی پچھلی انتہائی کٹھن مہم آزمائیوں کے
مقابلے میں... مالوہ پر لشکر کشی کو انھوں نے ایک معمولی لڑائی سے زیادہ
اہمیت نہیں دی... اور زیادہ توجہ نہیں دی... اُن سے یہ غفلت کیوں کر ہوئی (
کچھ سوچتے ہوئے، دھیمے سُروں میں) شاید خان بابا کے قوا میں اضمحلال
آ رہا ہے... (چند ثانیے توقف کے بعد) اچھا لو ماہم بیگم! ہم نے تمھاری
خواہش پوری کی اور مالوہ کی مہم کی قیادت ادہم خان کو سونپی۔ صبح اسے کوچ کا
حکم مل جائے گا۔ اسے ہدایت فرمائیں کہ مغلیہ عز و وقار کا لحاظ رکھے اور سرخ
رو ہو کر لوٹے۔ (ماہم بیگم کے چہرے پر مسرت کے آثار)
ماہم بیگم: حضور خاطر جمع رکھیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ ادہم خان ضرور فتح و
نصرت کے ڈنکے بجاتا آئے گا۔

تیسرا ایکٹ

-----مانڈو-----

پہلا منظر

(روپ متی کا سجا سنورا کشادہ ایوان۔ (موسوم بہ، روپ متی
کی شہ نشیں) روپ متی جیسے کسی کے انتظار میں بیٹھی ہے۔ دو کنیزیں
کمرے کی اشیا کو قرینے سے لگانے یا ستھرائی میں لگی ہیں۔)
روپ متی: (سوسن اور نرگس کو آتا دیکھ کر بے تابی سے) کیا جنگ ختم ہوگئی!
آثار تو یہی تھے کہ جنگ کا عفریت اپنی بھوک مٹا چکا ہے!
سوسن: محاذ کی خبریں تشویش ناک ہیں رانی صاحبہ، آج ہمارے لشکر کو شدید
جانی نقصان کا سامنا کرنا پڑا ہے۔
لالہ رُخ: آخر آج کیا ہو گیا! چند روز پہلے تو قاضی امام الدین کہہ رہے تھے
کہ (نقل اتارتے ہوئے) سارنگ پور کا میدان کارزار دشمنوں کی لاشوں
سے پٹا پڑا ہے۔ بہادر خان کی شکست کا شمس فی نصف النہار ہے، اور جلد ہی
بقیۃ السیف بندی بنا لیے جائیں گے۔ اب جنگ کا پانسا کیسے پلٹ گیا؟
روپ متی: ہاں سوسن! آج وہ بلانے پر بھی کیوں نہیں حاضر ہوئے۔ یہ ماجرا
کیا ہے؟
سوسن: رانی صاحبہ، اُس وقت وہ جو کہہ رہے تھے، وہی حقیقت تھی، اس لیے ان
کی چرب زبانی یہاں کام کر رہی تھی۔ آج دشمنوں کی ہوا بندھی ہوئی ہے اور ہمارا
ستارہ گردش میں ہے، اس لیے وہ دشمن کے خیمے میں مبارک بادیاں پہنچا رہے
ہیں۔ ہمارے مخبروں کو اب یقین ہو گیا ہے کہ دشمنوں سے ان کی ساز باز تھی۔
روپ متی: چڑھتے سورج کے پجاری۔ آستین کے سانپ۔ لیکن اچانک یہ
ہوا کا رُخ کیسے بدل گیا؟
نرگس: خبر ہے کہ دشمن کا مورچا اب بہادر خان کی بجائے ناصر الملک پیر محمد
کی تازہ دم فوج نے سنبھال لیا ہے۔ جس کی اعلا کمان ادہم خان کے ہاتھوں

میں ہے اور وہ خود سارنگ پور میں بہ نفسِ نفیس موجود ہے۔

روپ متی: آخر مالوہ پر مغل یلغار کی وجہ کیا ہے؟ ہم نے تو کسی غیر حکومت کے معاملات میں دخل دیا نہ کبھی ارضِ غیر کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ آخر اس جنگ کا انجام کیا ہوگا! ہم صلح کیوں نہیں کر لیتے؟

نرگس: ہمارا ایلچی صلح کا پیغام لے کر ناصر الملک کے پاس گیا تھا لیکن وہ بے نیل مرام واپس آگیا۔ دوسرا ایلچی ادہم خان کے پاس بھیجا گیا ہے، جو ابھی نہیں لوٹا۔

روپ متی: آخر وہ کیسے لوگ ہیں جو صلح و آشتی نہیں چاہتے! کیا سچ مچ ان کے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہے، جنھیں امن چین پیارا نہیں ہوتا؟ کیا امن و صلح اور دوستی کی صداؤں کے لیے بھی کوئی اپنے کان بند کر سکتا ہے؟ آدمی آدمی میں اس قدر فرق کیوں ہے مرگ نین (کنیز سے مخاطب ہوتی ہے۔)

مرگ نین: اپنی اپنی فطرت ہے رانی صاحبہ، جیسے ڈھول اور نقارے کے عادی کان، بانسری اور وینا کی دھیمی دھیمی لے سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔

روپ متی: (چہرے پر خوف و تشویش کے سائے لرز رہے ہیں) جنگ کا یہ عفریت نجانے کتنی بستیوں کو ویران، کس قدر گھر اور املاک کو تباہ و برباد، کیسی کیسی امیدوں، آرزوؤں کو پامال کر دے گا اور نجانے کتنی زندگیوں کو فنا کے گھاٹ اُتار کر دم لے گا۔

مرگ نین: جنگ کی بنیاد ہی ظلم پر ہوتی ہے رانی صاحبہ،

(ایک کنیز باہر سے آکر اطلاع دیتی ہے)

کنیز: رانی صاحبہ، اُردا بیگنی کے پاس محاذ سے کوئی خبر آئی ہے۔ (اشارہ پاکر جاتی ہے۔ باہر سے چہ می گوئیوں اور سرگوشیوں کی آوازیں آتی ہیں اور گھٹی گھٹی سسکیاں بھی سنائی دیتی ہیں... چند لمحوں میں اردا بیگنی داخل ہوتی ہے۔)

روپ متی: کہو، کیا خبر آئی ہے۔ کیا لام بندی ہوگئی؟ کیا صلح کی صورت نکل آئی!

اردا بیگنی: رانی صاحبہ، دوسرا ایلچی بھی ناکام لوٹ آیا ہے۔ مغلوں کی شرائط ایسی نہیں تھیں کہ قبول کر لی جاتیں، اس لیے صلح ممکن نہ ہوسکی۔

روپ متی: (بے چینی سے) مغلوں کی کیا شرطیں تھیں؟ (اردا بیگنی کو خاموش اور اس کے چہرے کا رنگ اُڑا ہوا دیکھ کر، گھبرا کر کنیز کو پکارتی ہے) سوسن، تم دیکھو تو کون آیا ہے، اسے یہاں لے آؤ، میں خود اس سے معلوم کروں گی۔

(سوسن باہر جاتی ہے۔ مرگ نین اور لالہ رُخ باریک چلمن کھینچ لیتی ہیں، جس کے آر پار دیکھا جاسکتا ہے۔ باہر بدستور دھیمی دھیمی سرگوشیاں جاری ہیں۔ سوسن، رائے سین کو لیے ہوئے آئی ہے۔)

رائے سین: نمک خوار بندگی عرض کرتا ہے۔ رانی صاحبہ۔

روپ متی: سردار رائے سین! صلح کے لیے مغلوں کی کیا شرطیں ہیں؟

رائے سین: رانی صاحبہ ان کے اظہار میں حدِ ادب مانع ہے۔

روپ متی: سردار، جو بھی شرطیں ہیں، کھل کر کہو، آج حدِ ادب مقرر نہیں۔

رائے سین: رانی صاحبہ، ادہم خان نے جنگ بندی کے لیے دو شرطیں رکھی ہیں، پہلی یہ کہ حاکم مالوہ قلم روئے مغلیہ میں محض دو ہزاری منصب پر اکتفا کریں۔ (رک جاتا ہے۔)

روپ متی: اور دوسری شرط؟

رائے سین: گستاخی معاف رانی صاحبہ، دوسری شرط یہ ہے کہ رانی روپ متی ان کے حوالے کر دی جائے۔

(روپ متی سناٹے میں آجاتی ہے، کچھ دیر بعد اپنے آپے میں آکر کہتی ہے)

روپ متی: (کھوئے کھوئے انداز میں) اور ان شرطوں کا کیا جواب دیا گیا؟

رائے سین: رانی صاحبہ! والیِ مالوہ نے جواب بھیجا ہے کہ باز بہادر، باج گزار بننے کے لیے نہیں پیدا ہوا اور رانی روپ متی کے عوض انھیں ساری دنیا کی بادشاہت بھی قبول نہیں۔

روپ متی: (خیالوں میں ڈوبی ہوئی بڑبڑاتی ہے) باز بہادر نے اپنا وعدہ پورا کیا، وہ ہمیشہ اپنی بات کے دھنی اور اصولوں کے پابند رہے، نفع و نقصان سے بے نیاز۔ (یکلخت گھبرا کر) اب وہ کہاں ہیں؟ وہ ٹھیک تو ہیں نا۔ محاذ پر اب کیا ہو رہا ہے؟

اردا بیگنی: (بھرائے ہوئے لہجے میں) بڑی تعداد لشکریوں کی جان گنوا چکی ہے۔ مٹھی بھر سپاہی اپنے سالار کے ساتھ جان ہتھیلی پر لیے ایک ایسی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ جو... (رو پڑتی ہے۔)

رائے سین: لیکن فرماں روائے مالوہ نے جس جرأت و پامردی سے مغل لشکر کے چھکے چھڑائے اور آغاز جنگ میں دشمن نے جو زک اٹھائی، اسے وہ بھی سدا یاد رکھے گا۔

نرگس: اور دنیا کہے گی کہ ایک ظالم و جابر بادشاہ کے توسیع پسندانہ عزائم اور ہوسِ ملک گیری کے خلاف، تاج دار مالوہ نے جانبازی اور اولوالعزمی کی ایک نئی تاریخ مرتب کر دی۔

سوسن: اور زمانہ گواہ ہے کہ یہ جنگ ہم امن پسندوں پر لادی گئی اور ہمیں مجبوراً نبرد آزما ہونا پڑا۔

رائے سین: باشندگانِ مالوہ کے دلوں سے اپنے رعایا پرور، دلیر اور دیالو فرماں روا کی مہربانیوں کا نقش کبھی محو نہ ہوگا۔

روپ متی: (گھبرا کر کانوں پر ہاتھ رکھتی ہے) بند کرو یہ ثنا خوانیاں، مت چھیڑو بے وقت کی بھیرویں۔ میرا دل دہلتا ہے۔ کہیں تمھاری اس طرح کی

باتیں کسی الم ناک انجام کی تمہید تو نہیں!

(مرگ نین اشارہ کرتی ہے۔ رائے سین واپس جاتا ہے۔ اس کے پیچھے اُردابیگنی بھی جاتی ہے... ایک کنیز آکر اطلاع دیتی ہے۔)

کنیز: سلیمان خان شرف باریابی چاہتے ہیں!

روپ متی: انھیں بھیج دو۔

(سلیمان خان داخل ہوتا ہے اور جھک کر تسلیمات ادا کرتا ہے۔)

روپ متی: کہو سلیمان خان، کیا کہنا چاہتے ہو!

سلیمان خان: رانی صاحبہ، بُری خبر ہے۔ سالار جنگ، جنگ میں کام آگئے۔ مغل لشکری مانڈو شہر میں داخل ہو چکے ہیں... تاج دار مالوہ (زبان لڑکھڑاتی ہے اور رک جاتا ہے۔)

روپ متی: (چہرے پر گھبراہٹ اور خوف کے سائے قدرے اونچی آواز میں کہتی ہے۔) کیا ہوا تاج دار مالوہ کو؟ کیا ہوا انھیں؟ تمھیں چپ کیوں لگ گئی!

سلیمان خان: تاج دار مالوہ کا کچھ پتا نہیں۔ دو طرح کی خبریں گشت کر رہی ہیں۔ وہ دشمنوں کے ہاتھ آگئے ہیں یا... (رک جاتا ہے)

روپ متی: (روہانسی ہو کر دہراتی ہے) دشمنوں کے ہاتھ لگ گئے ہیں (خوف سے لرزتی ہے) یا...

سلیمان خان: میرے منھ میں خاک! (آنکھوں میں لرزتے آنسوؤں کو روک کر) یا پھر دشمنوں کی سناؤنی آگئی ہے، لیکن مجھے اس پر یقین نہیں، ان کا جسد مبارک نہیں ملا ہے۔

(کنیزوں کی سسکیاں اور دبی دبی چیخیں... روپ متی کے چہرے پر کرب و خوف کے سائے۔ گھبرا کر پیچھے ہٹتی ہے اور دیوار سے لگ کر زمین پر ڈھیر ہو جاتی ہے۔)

روپ متی: یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ ہم نے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی ہیں۔

(سب سناٹے میں کھڑے ہوئے ہیں۔ کچھ دیر کے توقف کے بعد سلیمان خان پھر گویا ہوتا ہے۔)

سلیمان خان: مجھ سیاہ زبان پر قسمت کی مار کہ کچھ اور بُری خبریں دینے کے لیے میں بد بخت ہی بچا ہوں۔ (سکوت)

روپ متی: (آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے، اپنے آپ سے بے خبر، خلا میں گھورتے ہوئے) میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی بُری خبر سن چکی سلیمان۔ اب میری زندگی میں کوئی خبر اچھی بُری نہیں ہو سکتی۔

سلیمان خان: مغل لشکریوں نے شہر میں جو کشت و خون کا بازار گرم کر رکھا ہے، اس میں آپ کے دونوں بھائی بھی ان سے مقابلہ کرتے ہوئے جاں بحق ہو گئے۔ (کنیزوں کے منھ سے سسکیاں نکلتی ہیں۔ روپ متی بُت بنی ہوئی ہے۔)

(اتنے میں ایک کنیز گھبرائی ہوئی بھاگی بھاگی اندر داخل ہوتی ہے۔)

کنیز: ادہم خان کا لشکر ترپولیا کے اندر داخل ہو چکا ہے اور محل کی طرف بڑھا چلا آرہا ہے۔

(پس منظر میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز، جو رفتہ رفتہ نزدیک آتی محسوس ہوتی ہے۔)

سلیمان خان: رانی صاحبہ کی حفاظت کے لیے سلاحدار حبشنوں کا محافظ دستہ اور چند وفادار خادم باہر متعین ہیں، جو اپنی آخری سانس تک آپ کی حفاظت کریں گے۔ ویسے اگر رانی صاحبہ چاہیں تو محل سے بحفاظت نکلنے کی راہ... (پس منظر میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی تیز تر ہوتی آوازوں سے بات کٹ جاتی ہے۔)

(ایک اور دہشت زدہ کنیز بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوتی ہے۔)

کنیز: ادہم خان کے فوجی محل میں داخل ہوا ہی چاہتے ہیں۔ محل کے محافظ بھاگ کھڑے ہوئے ہیں۔ (روپ متی غش کھا کر فرش پر گرتی ہے۔ کنیزیں سسکیاں لیتی ہوئی دوڑ کر اسے اُٹھا کے مسہری پر لٹاتی ہیں۔ سلیمان خان بعجلت کنیزوں کو کچھ ہدایتیں دیتا نظر آتا ہے اور ایک نظر روپ متی پر ڈال کر چلا جاتا ہے۔ کنیزیں دروازہ و دریچے بند کر دیتی ہیں... پس منظر میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز رُکتی ہے... گھوڑوں کی ہنہناہٹ... بھگدڑ کی آوازیں... جوتوں کی دھمک... تلواروں کی جھنکاریں... غلام گردش میں بھاری قدموں سے دوڑنے کی آوازیں... زنانہ و مردانہ چیخ و پکار... تاریکی کے بڑھتے سائے۔)

(پردہ)

دوسرا منظر

وہی کمرہ ہے۔ صبح کا اُجالا پھیلا ہے۔ کمرے کی اشیا کی ترتیب میں معمولی تبدیلی نظر آتی ہے۔ دروازے پر دو ترکنیں کمر سے تلوار باندھے اور پہلو میں خنجر جمائے، بت بنی کھڑی ہیں، لیکن کمرے کا سارا منظر ان کے ملاحظے میں ہے۔ روپ متی مسہری پر خوابیدہ ہے۔ مرگ نین اسے جگانے کی کوشش کر رہی ہے۔ کنیزوں کے لباس بھی بدلے ہوئے ہیں۔

روپ متی آنکھیں کھولتی ہے۔ کنیزوں کے چہروں سے اداسی زائل ہوتی ہے... روپ متی کمرے کی بدلی بدلی فضا دیکھ رہی ہے۔ اس کی نظریں

دروازے پر ایستادہ اجنبی ترکنوں پر جا کر ٹھٹکتی ہیں۔

روپ متی: (مرگ نین سے) اُردابیگنیاں کہاں ہیں؟ مجھے کیا ہو گیا تھا؟

مرگ نین: (سر جھکائے ہوئے، غمگین لہجے میں) رانی صاحبہ، آپ ساری رات بے ہوش رہیں۔ اس بیچ مالوہ کی تاریخ میں ایک نیا ورق جڑ گیا ہے۔ ہماری بساط حکومت اُلٹ گئی ہے۔ اب یہاں فاتح مالوہ سپہ سالار ادہم خان کا قبضہ و اختیار ہے۔ ہمارے وفادار و جاں نثار کام آ گئے ہیں یا بندی بنا لیے گئے ہیں۔ (روپ متی بُت بنی سن رہی ہے۔ مرگ نین چند ثانیے رُک کر پھر گویا ہوتی ہے۔) میری خوش نصیبی ہے ہم خدمت گزاروں (کنیزوں کی طرف دیکھتے ہوئے) کو آپ کی سیوا میں بدستور سابق متعین رہنے کی اجازت ملی ہے۔ سپہ سالار کی مہتمم حرم خانم جان نے انھیں (ترکنوں کی طرف آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے) آپ کی پاسبانی کے لیے مامور کیا ہے۔ وہ آپ کی مزاج پُرسی کے لیے کچھ ہی دیر پہلے آئی تھیں، اور آپ کے لیے سپہ سالار ادہم خان کا ایک پیغام چھوڑ گئی ہیں۔

(روپ متی منھ پھیر کر بیزاری کا اظہار کرتی ہے۔)

مرگ نین: (رقعہ بڑھاتے ہوئے) ملاحظہ فرما لیجیے، اس کا جواب فوری طور پر منگوایا گیا ہے۔

روپ متی: کیا تم میری ذہنی کیفیت، ان حالات میں، یہ سب پڑھنے کے قابل سمجھتی ہو!

مرگ نین: (دھیرج سے) میں پڑھ دیتی ہوں، آپ سن لیں!

(روپ متی کی خاموشی کو خود ہی رضامندی پر محمول کر لیتی ہے اور پڑھنا شروع کرتی ہے۔)

مرگ نین: روپ پیاری،

اگر چہ فاتح مالوہ ادہم خان تمھاری روپ نگری میں اب پہنچا ہے، لیکن بہت پہلے سے تمھارے حسن و شباب اور رقص و سرود کے کیف آگیں اور جذبات انگیز افسانے ہم تک پہنچ چکے ہیں، اور تب سے یہ عالم ہے کہ ہم تمھارے نادیدہ عاشق ہو گئے ہیں۔

کسی بھی فاتح کا مفتوح پر تصرف و اختیار ایک مانا ہوا حق ہے، جس کے بیان کی ضرورت نہیں، لیکن ہم تمھیں اپنے دل کی ملکہ بنائیں گے اور مراتب و اعزاز بھی کسی حرم خاص سے کم نہ ہوں گے۔ تمھاری نجی خواص کا عملہ بھی برقرار رکھا گیا ہے کہ وہ مزاج یار کا مزاج داں ہے۔

آؤ اور ہمارے جسم و جاں پر چھائی مسافتوں کی کلفت اور مجادلوں کی واماندگی کو اپنے ناز و انداز اور رقص و سرود کا جادو جگا کر دور کر دو۔ ہمارے لیے عیش و طرب اور لطف نشاط کی ایک نئی محفل سجا دو!

فوری جواب کا خواہاں،

والی مالوہ، ادہم خاں۔

(کمرے میں خاموشی چھا جاتی ہے۔ روپ متی کا مزاج برہم ہے۔ اس کے چہرے پر غصے کے آثار ہیں اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔ حزنیہ لہجے میں مرگ نین سے کہتی ہے۔)

روپ متی: میری یہ زندگی باز بہادر کے لیے ارپن ہے، بس تم تو جانتی ہو میرا جواب کیا ہوگا۔

مرگ نین (سمجھانے کے انداز میں) رانی صاحبہ، اب ہم حالات کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ میں جانتی ہوں آپ کا جواب کیا ہوگا، لیکن بہ تقاضائے مصلحت جو جواب لکھا جانا چاہیے، وہ میں لکھ دیتی ہوں۔ اُسے رد یا قبول کرنے کا آپ کو اختیار ہے۔

(مرگ نین جواب تحریر کرنے لگتی ہے۔ درمیان میں رُک رُک کر سوچ میں غلطاں نظر آتی ہے۔ جواب تحریر کر کے روپ متی کو دیتی ہے۔ روپ متی بے دلی سے رقعہ لے کر ملاحظہ کرتی ہے۔)

راوی: قدر دانِ من!

میرے ہوش و حواس، انقلاب زمانہ کی وجہ سے از خود رفتہ اور دل و دماغ سخت صدمے کی حالت میں ہیں۔ میرے جسم و جان کے آقا باز بہادر کی گم شدگی، میرے جواں سال بھائیوں کے قتل اور ان کے خاندان کی تباہی اور میرے وابستگانِ دولت کی بربادی نے مجھے محبس غم و اندوہ کا زندانی بنا دیا ہے۔ یقیناً میں مفتوح و مجبور ہوں اور فاتح کے مفتوح پر تصرف و اختیار کے حق سے بھی آگاہ ہوں، پھر بھی از رہِ انسانیت اور اُس دلی چاہت کے جس کا اظہار آپ نے والا نامے میں کیا ہے، میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ مجھے اپنے بھائیوں کی موت کے سوگ سے اُبھرنے کے لیے تیجے تک کی مہلت، جو رسمِ زمانہ بھی ہے، عنایت فرما دیجیے۔

میری موجودہ حالت ایسی نہیں ہے کہ میری صحبت آپ کے لیے کسی لحاظ سے طرب انگیز و نشاط بخش ثابت ہو، البتہ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اس وقفے کے گزر جانے کے بعد وہی ہوگا جو وقت کی تحریر ہے، یعنی ایک فاتح کے اختیار اور ایک مفتوح کی سپردگی کی وہی روایتِ زمانہ جو ہمیشہ سے چلی آئی ہے۔

حرماں نصیب، روپ متی

(روپ متی خاموشی سے رقعے کا جواب ملاحظہ کرتی ہے۔ اس کے بعد مرگ نین کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی ہے۔)

روپ متی: اُس کے بعد مرگ نین! اس کے بعد کیا ہوگا؟

مرگ نین: (دلاسا دیتے ہوئے) رانی صاحبہ، یہ مہلت مل جانے دیجیے۔ اپنی حالت سنبھالیے۔ آگے بھگوان کوئی بھلی صورت پیدا کریں گے۔ امید رکھیے!

(ایک کنیز باہر سے آکر اطلاع دیتی ہے)

کنیز: خانم جان آرہی ہیں۔ (اس کے متعاقب خانم جان، ایک بھاری بھر کم گوری چٹی ایرانی خاتون، عمدہ پوشاک میں ملبوس، کمرے میں داخل ہوتی ہے اور روپ متی کو دیکھ کر گویا ہوتی ہے۔)

خانم جان: چشم بددور، رانی صاحبہ بیدار ہوگئیں۔ (روپ متی کے قریب بیٹھ کر، کنیزوں سے مخاطب ہوتی ہے۔) اے کنیزو، بُت بنی کیا کھڑی ہو۔ ان کے غسل و پوشش، اور سجنے سنورنے کا اہتمام کرو۔ (روپ متی کی طرف رُخ کرکے) رانی صاحبہ، واقعی خدا نے آپ کو ملکوتی حسن سے نوازا ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ آپ آقائے نعمت ادہم خان کی دل داری و دل نوازی میں کوئی کسر نہ رکھ چھوڑیں گی۔ کیا رقعے کا جواب ارقام فرما چکیں!

مرگ نین، روپ متی کی طرف دیکھتی ہے۔ روپ متی کے اشارہ ابرو سے اثبات میں جواب پا کر جوابی رقعہ خانم کو سونپ دیتی ہے۔ خانم اسے خریطے میں رکھتی ہوئی اٹھتی ہے۔

خانم جان: اچھا رانی صاحبہ، اب آپ اپنے تردّدات اور تفکرات کو حیطۂ خیال سے نکال باہر کریں اور خوشی و مسرت بھری نئی زندگی میں قدم رنجہ فرمانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اللہ امان۔ (جاتی ہے)

(پردہ)

(تین دن بعد)

تیسرا منظر

(ہو بہو پہلے ایکٹ کا پہلا منظر، مانڈو میں ریوا کے کنارے باز بہادر کا عشرت محل)

خواب گاہ خوب آراستہ ہے۔ جھروکوں پر اطلسی پردے پڑے ہیں۔ منقش مسہری گلاب اور چنبیلی کے پھولوں کی پنکھڑیوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ مسہری کے پہلو میں ایک چوکی پر خشک میووں اور فواکہات کا طشت دھرا ہوا ہے۔ ساتھ ہی ایک دوسری چوکی پر شیشہ و پیمانہ اور ایک بلوریں کنٹر شراب ارغوانی سے بھرا ہوا ہے۔ دیواروں پر شہوت خیز مناظر کی تصویریں آویزاں ہیں۔

روپ متی کے اشارے پر ایک کنیز ڈور کھینچ کر مسہری کے مقابل جھروکے کا پردہ سرکاتی ہے۔ فلک پر ماہ نیم ماہ پوری تابانی کے ساتھ ضو فشاں ہے، اور اس کا عکس ریوا کے پانی میں ہلکورے لے رہا ہے۔

رانی روپ متی نے لباس عروسی زیب تن کر رکھا ہے۔ خواص اسے سجانے سنوارنے میں لگی ہوئی ہیں۔ ایک گیسو سنوار رہی ہے تو ایک گجرا لگا رہی ہے۔

تمام کنیزیں رانی کا روپ انوپ اور چہرے پر بلا کا سکون دیکھ دیکھ کر حیران حیران سی ہیں، پر مرگ نین کے چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی ہے۔ وہ رانی کو چند زیور پہناتی ہے اور اٹھنا چاہتی ہے۔ روپ متی اپنا بایاں ہاتھ آگے بڑھاتی ہے اور معنی خیز نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ مرگ نین پھر بیٹھ جاتی ہے اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے زیورات کے بکس سے ایک قدرے بڑی اور ہیرا جڑی انگشتری نکال کر پہناتی ہے۔ اب بناؤ سنگھار ختم ہو چکا ہے۔ رانی روپ متی نرگس کو پکارتی ہے۔

روپ متی: ذرا قرطاس و قلم تو لاؤ نرگس!

(نرگس حیران حیران سی قلم دوات اور کاغذ کا دستہ آگے بڑھاتی ہے۔ رانی کچھ تحریر کرتی ہے اور پھر وہ کاغذ تہ کرنے لگتی ہے۔)

روپ متی: میری وینا کہاں ہے؟

(ایک کنیز کمرے کے ایک سرے سے وینا لاکر حاضر کرتی ہے۔ روپ متی وینا بجانا شروع کرتی ہے۔ سماں بندھ جاتا ہے... کچھ دیر بعد کسی کے آنے کی آہٹ ہوتی ہے۔ دروازے میں خانم جان نمودار ہوتی ہے۔ کمرے کا ماحول دیکھ اس کے چہرے پر بشاشت اور اطمینان کا اظہار ہوتا ہے۔ مرگ نین سے مخاطب ہوتی ہے۔)

خانم جان: بس گھڑی ایک میں آقائے نعمت تشریف لاویں گے۔ میں ذری تیاری دیکھنے آئی تھی۔ اب جاتی ہوں۔

(خانم جان چلی ہے۔ روپ متی وینا پرے سرکاتے ہوئے، سوسن کو اشارہ کرتی ہے۔)

سوسن: رانی صاحبہ، کیا اسے لے جاؤں! آپ نے تو سحر طاری کر دیا تھا جاری رکھیے نا!

روپ متی: لیکن ع کوئی لے نہیں پاتے ساز زندگی میں ہم!

(سوسن وینا اُٹھا کر لے جاتی ہے۔ روپ متی نشست سے اٹھ کر ہولے ہولے قدموں سے مسہری کی طرف بڑھتی ہے اور مسہری پر بیٹھ کر مرگ نین کو اشارہ کرتی ہے۔)

روپ متی: مرگ نین، جام بھر دو! (مرگ نین کے چہرے پر اس کا دلی غم و کرب جھلک رہا ہے۔ دوسری کنیزیں اسے حیرت سے دیکھ رہی ہیں۔ وہ آگے بڑھ کر مئے ارغوانی کا جام بھرتی ہے اور روپ متی کو پیش کرتی ہے۔ روپ متی اشارۂ ابرو سے اسے دور ہٹنے کا اشارہ کرتی ہے۔ وہ واپس اپنی جگہ چلی

جاتی ہے۔ روپ دائیں ہاتھ سے جام کو تھامے ہوئے بائیں ہاتھ سے انگشتری کو یوں جھکاتی ہے کہ اس کا ہیرے جڑا پٹ کھل کر کوئی سفوف جام میں جا گھلتا ہے اور پٹ خود ہی بند ہو جاتا ہے۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوتا ہے کہ فاصلے پر کھڑی ہوئی یا اشیاء کی ترتیب وسلیقے میں مصروف کنیزیں دیکھ نہیں پاتیں۔

ریوا کے کنارے پر کسی جگہ سے موسیقاروں نے (سابق حاکم باز بہادر کے سنگیت کار رائے چند اور کلانڈھی نے جو ابادہم خان کے در دولت سے وابستہ ہیں۔) راگ باگیسری چھیڑا ہے۔ (کافی ٹھاٹھ سے نکلا یہ راگ جذبات میں شوخی اور تموج پیدا کرتا ہے۔) محل تک پہنچتے پہنچتے اُن کے سنگیت کی مدھم ہوتی ہوئی لہریں، عشرت کدے کے سکون بخش، سجے سنورے اور خواب آگیں ماحول میں ایک کیف ومستی کا سماں پیدا کر رہی ہیں۔ نیم شب کا گجر 5 بجتا ہے۔ گجر کا آہنگ تھمتے ہی...

(ادہم خان کے قدموں کی چاپ۔ کنیزیں اپنی اپنی جگہ ایستادہ ہیں۔)

روپ متی مسند سے ٹیک لگائے مسہری پر نیم دراز ہے۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں ملا کر، ہتھیلیوں پر سر گردن ٹکائے اور اپنی نظریں جھروکے کے منظر پر جمائے ہوئے ہے۔ جہاں نیلے گگن پر چودھویں کا چاند ضیا بار ہے۔ روپ متی کے حسین چہرے، صراحی دار گردن اور وادیِ سینہ (جو اندازِ نشست کی وجہ سے نمایاں ہے) کے نشیب وفراز پر چاندنی نے ڈیرہ ڈال لیا ہے۔ یوں بھی کمرے میں ہر طرف چھٹکی چاندنی نے بڑا نورانی اور رومانی ماحول بنا دیا ہے۔

ادہم خان دروازے میں داخل ہوتا ہے۔ اس کی نظر سیدھی، روپ متی کے چاندنی میں نہائے ہوش ربا پری پیکر پر پڑتی ہے۔ وہیں ٹھٹک کر رہ جاتا ہے۔ روپ متی کی نظریں بدستور جھروکے کی طرف اُٹھی ہوئی ہیں۔ ادہم خان مبہوت ہو کر روپ متی کے سراپا پر نظر ڈالتا ہے۔ (چند لمحوں کے بعد خاموشی توڑتا ہے۔)

ادہم خان: سچ کہا ہے کسی نے "شنیدہ کے بود مانند دیدہ"۔ جتنا سنا تھا، کم سنا تھا۔ جو دیکھا ہے، اُن سُنا تھا۔ (قدم بڑھاتے ہوئے) جو پایا ہے، بے پایاں ہے۔

(ہلکے ہلکے قدم اٹھاتا ہوا اور یہ شعر گنگناتا ہوا مسہری کی طرف بڑھتا ہے)

آفاق ہا گردیدہ ام.....

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

(کنیزیں ایک ایک کر کے کمرے سے جانے لگتی ہیں۔ مرگ نین ایک گوشے میں کھڑی ہے۔ اس کا چہرہ زرد ہے... ادہم خان مسہری پر بیٹھتا ہے ۔ اب وہ روپ متی کے حسین مگر ساکت چہرے اور پوری طرح کھلی غزالی آنکھوں کے عین مقابل ہے۔ وہ اپنے کیسہ سے ہیروں کا جگمگاتا ہوا نیکلس نکالتا ہے اور اپنے ہاتھ ہار پہنانے کے لیے بڑھاتا ہے۔)

ادہم خان: (شرارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ) ایک فاتح کی طرف سے ہار کا تحفہ قبول ہو!

(ادہم خان ہار تھامے ہوئے اپنے ہاتھ روپ متی کی گردن کے گرد حمائل کرتا ہے۔ اس کے ہاتھ، روپ متی کے ہاتھوں سے مس ہوتے ہی، روپ متی کے باہم جڑے ہاتھ جدا ہو جاتے ہیں۔ سر کا سہارا جاتا رہتا ہے اور روپ متی کی گردن ڈھلک جاتی ہے۔ اس کے ہونٹوں سے نیلگوں جھاگ جھلک رہا ہے۔ ادہم خان گھبرا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ مرگ نین کی چیخ بلند ہوتی ہے، وہ سسکیاں لے لے کر رو رہی ہے۔ باہر کھڑی کنیزیں بھی دوڑ کر اندر آجاتی ہیں۔ روپ متی کے ایک ہاتھ کے کنگن میں رقعہ اڑسا ہوا ہے۔ ادہم خان کی اس پر نظر پڑتی ہے، وہ اسے اٹھا لیتا ہے اور پڑھتا ہے۔

راوی: روپ متی دُکھیا بھئی، بنا بہادر باز

اب جیہ تم پر جات ہے، یہاں کہاں ہے کاج[6]

خواص سسکیاں لے لے کر بین کر رہی ہیں۔

جھروکے سے جھانکتے چودھویں کے چاند پر بھی جیسے غموں کی بدلی چھا گئی ہے۔

پس منظر سے روپ متی کے باز بہادر سے کہے ہوئے لفظوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔

راوی: "آسمان پر چمکتا ہوا یہ چودھویں کا چاند گواہ ہے کہ روپ متی اپنی جان سے گزر جائے گی پر اپنی وفا پر آنچ نہ آنے دے گی۔

ادہم خان: ہم جیت کر بھی بازی ہار گئے، روپ متی،

تم نے جان ہار کر محبت جیت لی!

(پردہ)

■■

حواشی:

1۔ تان سین اُس وقت تک اکبری دربار سے وابستہ نہیں ہوا تھا۔

2۔ ماہم بیگم کا رشتے کا داماد

3۔ بختاور = نہایت ناکام، اردو زبان کی تمدنی اہمیت، ص: 240، مولفہ عبدالرزاق قریشی

4۔ دربار اکبری از مولانا محمد حسین آزاد، ص: 177، ایڈیشن 1898ء

5۔ نوبت بجتی تھی۔ میں نے گجر بجا دیا ہے۔

6۔ مشہور ہے کہ روپ متی نے دمِ مرگ یہ آخری دوہا کہا تھا۔

اسیم کاویانی، ممبئی aseemkavyani@gmail.com

محترم شمس الرحمٰن فاروقی سے معذرت

معزز معاصر سہ ماہی 'اثبات' ممبئی کے غیر معزز مدیر کی انتہائی دل آزار تحریروں پر اور پروفیسر قمر رئیس کے لیے جس طرح اس مدیر نے 'ادب ساز' میں چھاپے گئے میرے ایک خط کو ان کے لیے وجہ مرگ قرار دیا تھا اس پر، 'ادب ساز' کے گزشتہ شمارے کے 'گوشۂ اختلاف' میں جواباً اپنے معروضات پورے سیاق وسباق کے ساتھ پیش کرتے ہوئے، ایک جملہ میرے قلم سے جناب شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے بارے میں ایسا لکھا گیا جو مجھے قطعی نہیں لکھنا چاہئے تھا۔ ہر چند وہ جملہ عام حلقوں کے حوالے سے تھا کہ ان کے بارے میں یہودیوں سے متعلق ایک مثل مشہور ہے (یعنی میں نہیں کہتا لوگ کہتے ہیں) اس کے باوجود مجھے کوئی حق نہیں تھا کہ اتنا سخت جملہ ان کے بارے میں اپنے قلم سے لکھتا۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ 'اثبات' کے مدیر کی باتیں بے حد اشتعال انگیز اور بیہودہ تھیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اپنا آپا کھو کر ایک ایسے قدآور ادیب کے بارے میں، جسے اختلاف رکھنے والے بھی عزت دیتے ہوں میں اناپ شناپ لکھ کر اُسی سطح پر آ جاؤں جس پر یہ مدیر اتر آیا تھا۔ یہ بھی درست ہے کہ ٹھیک اسی پیراگراف کے نیچے وہ پیراگراف منقول تھا جو 'ادب ساز' شمارہ 7-6 مطبوعہ 2008 میں صفحہ 296 پر چھپا تھا اور جس میں اردو ادب کے لیے فاروقی صاحب کی خدمات کا اعتراف کیا گیا تھا۔ اس اعتراف سے پہلے تو وہ جملہ چھپنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اس سلسلے میں خواہ میں کتنی بھی وضاحتیں اپنے اور دوسروں کے سامنے رکھ لوں مگر حقیقت یہ ہے کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے، جس کے لیے میں تہِ دل سے معذرت خواہ ہوں اور فاروقی صاحب سے غیر مشروط معافی مانگتا ہوں۔ کئی طرح کے ذہنی وفکری اختلافات کے باوصف، جو ہوسکتا ہے آگے بھی برقرار رہیں مجھ پر ان کا احترام لازم ہے۔

ٹیلی فون پر میں نے فاروقی صاحب سے معافی کی بات کہی تو وہ خوش ہوئے اور انھوں نے فراخ دلی سے معاملے کو درگزر کرنے کے لیے کہا۔ بلکہ جب میں نے وعدہ کیا کہ میں تحریری طور پر بھی رسالے میں یہ معذرت چھاپوں گا تو انھوں نے کہا اس کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم جب تک میں یہ وعدہ پورا نہ کرلوں میرا ضمیر مطمئن نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ جس قلم سے یہ گستاخی ہوئی تھی آج اسی قلم سے میں اپنی پشیمانی کا بھی اظہار کررہا ہوں۔ ہوسکتا ہے کچھ لوگوں کو میرا یہ رویہ عجیب لگے لیکن میرے لیے اس میں حیرت یا پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر میں خود کو مارکسسٹ مانتا ہوں تو سچے مارکسسٹ کا فرض ہے کہ وہ دوسروں کا محاسبہ کرنے سے پہلے خود اپنا محاسبہ کرے، خود کو خود تنقیدی self criticism کے عمل سے گزارے اور اس معاملے میں جھوٹی انا false ego کا شکار ہوئے بغیر اپنی اصلاح کرے، کیونکہ غلطیاں باعمل اور باضمیر انسانوں سے ہوتی ہیں بے دل اور بے دماغ فرشتوں سے نہیں۔

ساحر لدھیانوی پر 'ادب ساز' کی خصوصی اشاعت کو، جس کا اجرا اردو کی عظیم شخصیت پروفیسر گوپی چند نارنگ نے فرمایا تھا، غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی، اور جس والہانہ انداز سے اس کا خیر مقدم ملک و بیرونِ ملک کیا گیا اور اس کے طفیل میں جس قدر داد وتحسین سے مجھے نوازا گیا اس سب کے پیش نظر میں خاصا مطمئن ومسرور تھا لیکن جب ایک شب میری نظر اتفاق سے اپنے ہی مذکورہ جملے پر پڑی تو میں دھک سے رہ گیا اور میرے لیے یہ سمجھنا دشوار ہوگیا کہ آخر کن ذہنی کیفیتوں میں یہ جملہ مجھ سے لکھا گیا۔ بعد میں کچھ اور دوستوں نے بھی جو فاروقی صاحب سے بہت اتفاق نہیں رکھتے اور جن میں میرے مربی وسرپرست گوپی چند نارنگ صاحب شامل تھے، اس غلطی کی نشان دہی کی اور کہا کہ اختلاف رائے اپنی جگہ لیکن احترام سب کا لازم ہے۔ تب سے دل پر جو بوجھ تھا، شکر ہے وہ آج ان سطروں کے ساتھ اتر رہا ہے۔ محترم فاروقی صاحب سے اس تحریر کے ذریعے بھی میری گزارش ہے کہ وہ میری غلطی کو ایک aberration اور سہو سمجھ کر معاف کردیں۔ میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ میرے دل میں پہلے بھی ان کا احترام تھا اور آگے بھی رہے گا۔

نصرت ظہیر

'اثبات' کا مثبت اعلان

'ادب ساز' کے گزشتہ شمارے کے 'گوشۂ اختلاف' میں 'اثبات' ممبئی کے مدیر اشعر نجمی کے گزشتہ الزامات پر جو کچھ کہا گیا تھا، شکر ہے اس کا 'مثبت' نتیجہ برآمد ہوا ہے۔ اس دوران شائع ہونے والے اپنے شمارہ نمبر 8 میں انھوں نے، حسبِ عادت اداریہ تو اتنا ہی طویل لکھا، لیکن نہ صرف یہ کہ ڈھکے چھپے لفظوں میں 'مزاح المومنین' کی آڑ لیتے ہوئے اپنے الزامات کو ایک طرح سے واپس لے لیا، بلکہ آخر میں یہ بھی اعلان کر دیا کہ آئندہ ان کا (؟) ہر اداریہ قارئین کے لیے ہوگا، خود اپنی قلبی تسکین کے لیے نہیں۔ طویل اداریے میں انھوں نے حسبِ دستور بہت سی غیر ضروری جلی کٹی باتیں لکھی ہیں اور انداز وہی تلخ اور جارحانہ بلکہ معاندانہ بنائے رکھا، جس کے جواب میں بہت کچھ کہا اور لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اچھی بات یہ ہے کہ مدیر موصوف کو شخصیتوں سے شخصی انداز میں الجھنے اور شخصی نوعیت کی صحافت، بلکہ 'صحافت بازی' کرنے کی غیر معنویت اور بے مصرفی کا عرفان ہو گیا ہے۔ یہ عرفان اس لیے بھی ضروری تھا کہ 'اثبات' ایک اچھا خاصا قاعدے کا ادبی رسالہ لگ رہا تھا اور اب امید ہے کہ اس کے اداریے میں بھی قاعدے کی ہی باتیں ہوں گی۔ 'ادب ساز' کو وی پی سے بھیج کر زبردستی کیوں بیچا جاتا ہے، پروفیسر قمر رئیس کی موت یرقان سے نہیں بلکہ کسی نصرت ظہیر کا خط پڑھ کر واقع ہوئی تھی، کسی منصور سردار نے راقم الحروف (مدیر 'اثبات') سے کیوں ترکِ تعلق کر لیا، ادبی صحافت میں شفافیت کی بات کرنے والے ڈھونگی اور 'بے حیا' ہوتے ہیں، ممبئی میں وہ کون ایسا جیالا ادیب ہے، جس کا 'سازشی ذہن' عالمِ سکرات میں ہے اور جس کے سانسوں کی ڈور ابھی نہیں ٹوٹی ہے، 'پردے کی بو بو' کس اخبار کے نائب مدیر کو کہتے ہیں، ایم کاویانی جیسے محقق و نقاد کو پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کون سا 'ٹائم کیپسول' کھلا دیا ہے، مدیر صاحب پہلوانوں کی طرح ہمیشہ لنگر لنگوٹ کسے رہتے ہیں، جیسے عجیب و غریب اور احمقانہ موضوعات پر کسی کینہ توز اور ہر کس و ناکس کو کوسنے والی بڑھیا کے لہجے میں اب 'اثبات' کے اداریے نہیں لکھے جائیں گے، اس کا مدیر 'اثبات' نے بظاہر بڑی ایمانداری کے ساتھ رسالے کے قارئین سے وعدہ کیا ہے۔ یعنی اب اداریوں میں ادب کی بات ہوگی، ادب کے مسئلوں پر صحت مند بحث ہوگی اور شخصیتوں کو ہدفِ ملامت نہیں بنایا جائے گا۔

پہلے لوگ سوچا کرتے تھے کہ آخر 'اثبات' کس بات کے لیے نکالا جا رہا ہے۔ جب پہلا شمارہ سامنے آیا تو محض شبہ تھا لیکن جب دوسرے شمارے میں 'اردو کی نئی بستیاں' کے عنوان سے چھاپے گئے مضمون میں کہا گیا کہ غیر ممالک میں اردو کے حلقوں کو پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی ذاتی منفعت کے لیے 'اردو کی نئی بستیاں' کہلوانا شروع کیا ہے اور یہ اعلان بھی چھاپا گیا کہ 'اثبات پبلکیشنز' سے شائع ہونے والی پہلی کتاب کا عنوان ہوگا 'کیا ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سارق ہیں؟' تو پوری طرح واضح ہو گیا کہ 'اثبات' 'اس بات' کے لیے وجود میں لایا گیا ہے۔ اس کے بعد کے شماروں میں جی بھر کر گوپی چند نارنگ کو نشانہ بنایا گیا، یہاں تک کہ ان کی کتاب کے خلاف ایک گوشہ بھی شائع ہوا۔ لیکن مدیر موصوف کے اس اعلان کے بعد کہ اب اداریوں میں صرف ادب کی بات ہوگی، ہمیں پوری امید ہے کہ ان کا رسالہ اپنے مشمولات میں بھی ایک متوازن، ذمہ دار، ایماندار، معروضی اور نہایت شریف ادبی رسالے کا کردار ادا کرے گا۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ اس پر عمل ہوتا بھی ہے یا نہیں۔

اردو ادب ویسے ہی دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب کے مقابلے میں کہیں زیادہ برے دور سے گزر رہا ہے۔ ایسے میں خود کو ادبی کہنے والے اردو رسالے، 'مدیرانہ انا پرستی' کے جال میں پھنسے رہتے ہیں تو ان کا بند ہو جانا ہی اردو ادب کے حق میں بہتر ہوگا۔ مدیروں کا بحیثیت ایک ڈکٹیٹر کے ادبی رسالوں پر مسلط رہنا، ادبی صحافت کے لیے نہیں بلکہ من جملہ اردو ادب کے لیے بھی مہلک ثابت ہو رہا ہے۔ نگار، نقوش، کتاب اور گگن جیسا کوئی ادبی رسالہ آج اردو میں نظر نہیں آتا۔ شاعر، آج کل اور نیا دور جیسے اردو کی ادبی صحافت کے ستون سمجھے جانے والے جریدے آج اپنے ماضی کا مرثیہ بن کر شائع ہو رہے ہیں۔ اردو ادب میں تخلیقی معیار تو گر ہی رہا تھا، اب تنقیدی معیار کا گراف بھی اس کے منطقی و لازمی ردِ عمل کے طور پر نیچے آنے لگا ہے۔ یہاں تک کہ نقاد بھی اس کا گلہ کرنے لگے ہیں کہ اردو میں تخلیق و تنقید دونوں روبہ زوال ہیں۔ اس پس منظر میں 'اثبات' کی صحیح معنوں میں مثبت ادبی صحافت، اردو ادب کے لیے ایک روشن ستارا ثابت ہو سکتی ہے اور اس طرح کی صحافت سے ادب کا موجودہ منظر بدل سکتا ہے۔ ادارہ

تنقیدی تراشے

ظ انصاری اور سکندر علی وجد کی ادبی نوک جھونک

اردو 'بلٹز' کے اوراق سے

زیر نظر تحریریں ممبئی کے اردو ، ہفت روزہ 'بلٹز' کے تراشوں پر مشتمل ہیں جو ، معروف محقق اور نقاد جناب اسیم کاویانی نے درج ذیل نوٹ کے ساتھ 'گوشۂ اختلاف' کے لیے ارسال کی ہیں، اور جنھیں ہم شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں:

''ظ انصاری اردو کے مشہور ادیب و مترجم تھے۔ اُن کی مصنفہ اور ترجمہ شدہ کتابوں کی تعداد ڈیڑھ درجن کے قریب ہوگی۔ 78-1977 میں وہ بمبئی کے ہفت روزہ 'بلٹز' میں 'خدا لگتی...' کے عنوان کے تحت اردو کی کتابوں پر بے لاگ تبصرے لکھا کرتے تھے، جو اُن کے بے تکلفانہ اور لچھے دار اسلوب اور ادبی موشگافیوں کی بنا پر دل چسپی سے پڑھے جاتے تھے۔ اگرچہ ان کے تبصروں میں بات کو چٹپٹا اور پُر لطف بنانے کی کوشش میں علمی سنجیدگی کا فقدان بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ کہیں مصنف کے نقطۂ نظر کو بالائے طاق رکھ کر اپنی بات سُنانے کی کوشش بھی نظر آتی ہے۔ کہیں مبصر کے شوقِ اظہار کے وفور میں تبصرہ مضمون کی شکل اختیار کرتا نظر آتا ہے، غرض کہ کوئی بندھا ٹکا ضابطہ نہیں ملتا۔ خود ظ انصاری نے 'کتاب شناسی' میں انھیں 'تکلف برطرف' تبصروں کا نام دیا ہے، جن کا مقصد قاری کو مختصر لفظوں میں ''کتاب کا مطالعہ کرانا، ضمناً 'کہا سُنی' کا موقع بھی ہاتھ سے جانے نہ دینا، اور کتاب و مصنف کے تعلق سے اپنے تاثر کو بے تکلف بیان کرنا'' بتایا ہے۔

ذیل میں 23 ستمبر 1978 کے 'بلٹز' میں چھپا سکندر علی وجد کے انتخابِ کلام پر ظ انصاری کا تبصرہ، اس تبصرے کے ردِ عمل میں 'بلٹز' ہی میں چھپی وجد کی سخت استہزائی نظم، اس نظم کی اشاعت پر ظ انصاری کا جواب، اس کے بعد جواب الجواب کے طور پر وجد کے روانہ کردہ مزید طنزیہ اشعار جنھیں ظ نے اپنی عبارت آرائی میں پرو کر 'بلٹز' میں شائع کیا تھا، پیش کیے جا رہے ہیں۔

ظ انصاری اپنے تبصرے کے ضمن میں طنزیہ جملوں میں کسی حد تک 'بے احتیاط' نظر آتے ہیں، وہیں وجد (جو MP بھی تھے) اپنی لعن طعن میں بے مہار، اور غیر شایستہ ہو گئے ہیں۔ آخر میں ظ سپر ڈالتے نظر آتے ہیں۔ وجد کے شعروں میں کھپی ترکیبوں پر اُن کے اعتراضات میں بھی کوئی دم نہیں ہے۔ ساغر اور صہبا ہم معنی نہیں ہیں۔ ساغر شراب کے پیالے کو کہتے ہیں تو صہبا ایک قسم کی شراب کو۔ اسی طرح شیشہ گری کہا جا سکتا ہے تو الماس گری کیوں نہیں! 'تخلیقِ سخن جوہر الماس گری ہے' کے معنی واضح ہیں کہ سخن وری ہیرا تراشنے جیسا ہنر / کمال ہے۔ اسیم کاویانی

پہلا تراشہ:

سکندر علی وجد کا انتخاب

مبصر: ظ انصاری

سکندر علی وجد بڑی احتیاطوں، حد بندیوں، رکھ رکھاؤ اور ادب آداب کے آدمی ہیں۔ اگر ہمارے سامنے 65 برس کی زندگی کی موٹی موٹی باتیں نہ ہوتیں تب بھی پچھلے شعری مجموعے (خصوصاً اوراقِ مصوّر) اور یہ پتلا سا انتخاب کافی تھا گواہی دینے کو۔

ہم وجد کے سلیقے کے مدّاح ہیں جو سیرت و صورت، بصارت اور بصیرت، حالات اور معاملات میں ہر طرف جھلکا پڑتا ہے۔

ہم ان کے وسیع مطالعے، رنگا رنگ دلچسپیوں اور ذوقِ سلیم کی ہفت اقلیم

پرواز سے بھی آگاہ ہیں۔ اس کا اور چھور پانا دشوار ہے۔

جو لوگ شاعری کو اپنے نام کے ساتھ لگائے رکھتے ہیں ان میں شاید ہی کسی کو علم کی پیاس اور بڑوں کے ورثے کا اتنا پاس ہو جتنا وجد کو ہے۔

بھرپور زندگی جینے کا حوصلہ انھیں کچھ قدرت سے ملا تھا۔ کچھ اچھی صحبت اور مردم شناس طبیعت نے بخشا۔ انتظامیہ سے عدلیہ میں آئے۔ ڈسٹرکٹ اور سیشن جج رہے۔ عدالت کے فیصلے بھی لکھے اور شعر بھی۔ مگر ہم سے پوچھیے، تو انھوں نے شاعری سے اظہارِ ذات کے بجائے اخفائے حال کا کام لیا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ جیسے اچھوتے ترنم سے وہ سالہا سال چھوٹی بڑی محفلوں میں اپنا کلام سناتے رہے ہیں، وہ وجد آور ضرور تھا، مگر وجد نہیں تھا۔ وجد نے اپنے شعر کو اندرونی شخصیت کی لہک سے، تہ داری، اس کی وسعت، گہرائی اور رنگینی سے محفوظ رکھنے کے سارے جتن کر لیے تب چھاپے کی مشین سے گذارنے کا اہتمام کیا۔

پھر بھی اگر کہیں کہیں پیرہن رنگین ہو جاتا ہے تو اس میں دربار دار وجد کا قصور نہیں، شاعر وجد کا جذبۂ بے اختیار کام کر گیا ہے۔ اس انتخاب میں یہی جذبہ کارفرما ہوا۔ انھوں نے بہت کڑا چناؤ کیا ہے اپنے کارناموں کا۔

وجد شاعرانہ دعووں سے پرہیز کرتے ہیں، نجانے کس لمحے میں کہہ گزرے:

دو سو برس میں وجد سراج و ولی کے بعد
اُٹھے ہیں جھومتے ہوئے خاکِ دکن سے ہم

اور ہم خاکِ دکن کے ان دو سو برس پرانے شعرا کی تازگی کا راز تلاش کرتے کرتے وجد کے پرانے پن تک جا پہنچے۔

شاعر اور اس کی شاعری کو ہم آخر کیسے سمجھیں؟ تہ میں کس طرح اُتریں؟ شخصیت اور فن دونوں کو جوڑ کر یا دونوں کو جدا کر کے؟ یا محض شعری رویے کی روشنی میں؟ فنکاری میں؟ شاعرانہ جدّت یا حدّت میں؟ یا باری باری ان سب میں؟ ہم نے بھی سارے آسن آزما لیے مگر آج تک بہتے دریا کے کنارے ٹانگیں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ پانی کے ٹمپریچر اور رفتار کے سوا کسی صفت پر اپنے اندازے کا اعتبار نہیں آتا۔

وجد کے اس انتخاب کلام کو ہی لیجیے۔ ان کو ہندستان گیر شہرت ملی 'اجنتا' 'ایلورا' اور 'کاروانِ زندگی' کی بدولت۔ تکلف برطرف کہیں تو ان میں سے دو نظمیں (اجنتا اور کاروان) مجموعہ کلام سے خارج کر دیجیے، وجد کے شاعرانہ مرتبے میں کوئی کمی بیشی نہیں ہونے والی۔ چھ بند (مسدس) کی 'ایلورا' جو صرف چند ہفتوں میں دنیا کے تمام کاموں سے فرصت پا کر لکھی گئی، دو برس میں مکمل ہونے والی گیارہ بند کی 'اجنتا' کے سامنے ترشی ہوئی قد آدم

دو سو برس میں وجد سراج و ولی کے بعد
اُٹھے ہیں جھومتے ہوئے خاک دکن سے ہم
اور ہم خاک دکن کے ان دو سو برس پُرانے شعرا کی تازگی کا راز تلاش کرتے کرتے وجد کے پرانے پن تک جا پہنچے۔
شاعر اور اس کی شاعری کو ہم آخر کیسے سمجھیں؟ تہ میں کس طرح اُتریں؟ شخصیت اور فن دونوں کو جوڑ کر یا دونوں کو جدا کر کے؟ یا محض شعری رویے کی روشنی میں؟ فنکاری میں؟ شاعرانہ جدّت یا حدّت میں؟ یا باری باری ان سب میں؟ ہم نے بھی سارے آسن آزما لیے مگر آج تک بہتے دریا کے کنارے ٹانگیں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ پانی کے ٹمپریچر اور رفتار کے سوا کسی صفت پر اپنے اندازے کا اعتبار نہیں آتا

مورتی ہے جو ایک ہی کھڑی چٹان سے تراشی گئی ہے۔ ایلورا کے مکمل مندروں کی طرح یہاں بھی کہیں جوڑ یا پلاسٹر نہیں ملتا۔

مگر وجد کو تو اپنی بے داغ شیروانی کا بٹن، دامن اور کالر یہاں بھی سنبھالنا ہے۔ ان کی لفظیات سے کیا مجال جو کوئی بھانپ جائے کہ صحنِ چمن سے آ رہے ہیں یا آرٹ اسٹوڈیو سے، رقاصہ کے رنگ محل سے نکلے ہیں یا اجنتا کی اَنی ہوئی گپھا سے۔ نہ لباس پر گرد ہے، نہ ماتھے پر پسینہ۔ مثال ملاحظہ ہو۔ اجنتا کے ایک بند کی ٹیپ ہے:

ملا ہے زندگی کو بانکپن ان کج کلاہوں سے
نظر والوں پہ شمشیریں برستی ہیں نگاہوں سے

اب عالمی شہرت کے مالک، مقبول فدا حسین کی 'تصویریں' موضوعِ سخن ہیں۔ ابتدا ہوتی ہے:

بے حجاب تصویریں، بے پناہ شمشیریں
دل فریب خوابوں کی بے لحاظ تعبیریں

یا مثلاً 'جامعہ عثمانیہ' کے راج مزدور اپنی جھونپڑیاں اٹھا کر رخصت ہوتے ہیں:

جوش واخلاق سے کی کوشش پیہم ہم نے
نظم کہسار کیا درہم و برہم ہم نے
کوہِ غم ٹوٹ پڑے، پر نہ کیا غم ہم نے
کر دیا قوم کا اک خواب مجسم ہم نے

ہم نے نقشِ ہوسِ خام نہیں چھوڑا ہے
کام چھوڑا ہے کہیں نام نہیں چھوڑا ہے

اور 'ایلورا' بھی تقریباً اسی کیفیت پر تمام ہوتی ہے:

نگاہ ڈھونڈ رہی ہے نشاں نہیں ملتا
غبار سامنے ہے کارواں نہیں ملتا

اُستادانہ غزلوں میں تو یہ 'وضعداری' نبھ جائے لیکن موضوعاتی نظموں میں لفظیات کی یہ ہمواری بے لطف یکسانی بن جاتی ہے۔ نوجوان شاعروں کو وجد کے اس عمل سے عبرت پکڑنی چاہیے۔

اس لحاظ سے دیکھیے تو چند نامشہور نظمیں ہیں وجد کی، جو اپنی انفرادیت کی بدولت جی جائیں گی اور جن پر اہلِ نظر جان چھڑکیں گے۔ مثلاً: 'جگنو' مثلاً: سمندر کے کنارے کی ریت پر چند کیڑوں نے جو کشیدہ کاری کی اور 'حل طلب مسئلے بکھیر دیے' ان پر نظم، 'نقش ونگار'، 'رقاصہ' (جو یادش بخیر تارا چودھری سے متعلق ہے) 'سارنگی'، 'نغمے کی موت' اور 'کاروانِ زندگی' کے چند بند۔

غزلیں ان جیسے شاعر کی نہ بانکی ہوتی ہیں نہ پُر شور، نہ شورابہ۔ وہ ان کے خاص ترنم کے ساتھ جگنوؤں کی طرح چمک اُٹھتی ہیں اور بریس کی روشنائی یا روشنی میں بھی اپنی معنویت سلامت رکھتی ہیں۔ بظاہر معمولی سی، عام روش کی غزل ہے، لیکن وہیں یہ شعر بھی دبے پڑے ہیں:

اے شبِ ہجراں ہم کو اُن کے
غم کا بھی غم اپنا بھی غم

فکر کی آگ میں بنتا ہے سخن
حرف پر سوز، دُعا ہو جیسے

شاعری وہ ہے کہ دریاؤں کے نام
کوہساروں کی صدا ہو جیسے

وجد خوشیوں کے سرابوں میں ہے گم
ہر خوشی غم سے جُدا ہو جیسے

آئینہ رخوں کی بے نیازی
اے وجد حجابِ آرزو ہے

اس منزلِ پُر شور سے خاموش گزر جا
ہے جن کی یہاں دھوم وہ کم یاد رہیں گے

ان کے پچھلے مجموعے 'بیاضِ مریم' کو حُسین کی رواں قلم لکیروں نے اور وجد کے خطِ شکستہ نے مل ملا کر ایک جدت اور اہمیت عطا کی تھی۔ اس کا کچھ بقیہ یہاں بھی موجود ہے۔ انجمن ترقی اُردو نے اس انتخاب کو خاص اشاعتی سلیقے سے نواز کر شاعر کے شایانِ شان بنا دیا۔

دوسرا تراشہ:

ظ۔ انصاری کے نام

میرے 'انتخاب' پر تبصرے کے جواب میں بائیں ہاتھ سے لکھی ہوئی نظم!

ناداں مجھے درکار نہیں داد کا صدقہ
کیا شعر مرا کاسۂ دریوزہ گری ہے
ہے شہرتِ ارزاں کی طلب بوالہوسوں کو
محتاجیِ عالم کا سبب بے ہنری ہے
واقف ہوں میں ایک ایک ریاکارِ ادب سے
فتنوں سے خبردار مری بے خبری ہے
کیا تجھ کو دِکھاؤں دُرِ شہوارِ معانی
نایاب جہاں میں ہنرِ دیدہ وری ہے
رنگین بہانہ ہے فقط نظم و غزل کا
مقصود، حقیقت کی یہاں پردہ دری ہے
ہے حُسنِ عمل شعر خرد مند جنوں کا
تخلیقِ سخن جوہرِ الماس گری ہے
ملحوظ رہے فکرِ فلک رس کا تقدس
یہ رہ گزرِ منزلِ پیغام بری ہے
افکار کی پُر نور فضاؤں کے سفر میں
خفاش کو ناحق ہوسِ ہمسفری ہے

سکندر علی وجد ہفت روزہ 'بلٹز' بمبئی 25 نومبر 1978

تیسرا تراشہ

ہم نے پچھلے پانچ برسوں میں، موجود یا مرحوم، کوئی ستر مصنفوں اور ان کی تصنیفوں پر لکھا۔ کچھ خوش ہوئے کچھ ناخوش۔ شاعروں کے قبیلے میں زیادہ تر ہمارے ذاتی دوست خفا ہوئے۔ بعضوں نے ہمیں بد مذاق جان کر معاف کیا اور کسی کسی نے ہماری تول ٹھیک مان کر داد بھی دی۔ البتہ بدنیتی کا الزام کسی نے نہیں لگایا۔ صرف ایک شاعر ہیں کلاسیکی انداز کے، سکندر علی وجد، جو بہت بے قابو ہو گئے اور ہمیں 'نادان'، 'ریاکارِ ادب'، 'بے خبر، بے بصر، بے ہنر' کہہ کر یہاں تک کہ: "خفاش کو ناحق ہوسِ ہمسفری ہے" کی پھبتی کس کر بھی اپنا جی ٹھنڈا نہ کر سکے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ افکار کی پرنور فضاؤں میں پرواز کرتے ہیں تو چمگادڑ بھلا ان کے بلند مقامات کو کیا جانے: اسے خواہ مخواہ ہمسفری کی ہوس ہے!

23 ستمبر 1978 کے بلٹز (اُردو) میں شاعری کے انتخابوں پر ہمارا

تبصرہ چھپا تھا، اس میں وجد صاحب کے انتخاب پر یہ سطریں بھی شامل تھیں۔

''..... بڑی احتیاطوں، حد بندیوں، رکھ رکھاؤ اور ادب آداب کے آدمی ہیں... ہم وجد کے سلیقے کے مداح ہیں جو صورت و سیرت، بصارت اور بصیرت، حالات اور معاملات میں ہر طرف چھلکا پڑتا ہے... ہم ان کے وسیع مطالعے، رنگا رنگ دلچسپیوں اور ذوقِ سلیم کی ہفت اقلیم پرواز سے بھی آگاہ ہیں۔ اس کا اور چھور پانا دشوار ہے... جو لوگ شاعری کو اپنے نام کے ساتھ لگائے رکھتے ہیں ان میں شاید ہی کسی کو علم کی اتنی پیاس اور بزرگوں کے ورثے کا اتنا پاس ہو جتنا وجد کو ہے... وجد صاحب نے خود بھی اپنی شاعری کے بارے میں ایک مختصر سا مضمون لکھ کر (جو بیک وقت دو رسالوں میں چھپا) یہی جتایا ہے کہ:

''اُردو کے بعد فارسی شاعری میرا سرمایۂ نشاط ہے۔ اُردو میں ولی سے جوش تک، فارسی میں فردوسی سے قاآنی تک تمام اہم شاعروں کا کلام میں نے غور اور شوق سے پڑھا ہے۔ میں اپنے فن کو دشمن کی نظر سے دیکھتا ہوں ... اعلا شاعری کی منزل تک پہنچنے کا کوئی آسان اور قریب کا راستہ نہیں، برسوں کی محنت، مشق اور مطالعے کے بعد اچھا شعر کہنے کا سلیقہ آتا ہے، میری نظمیں 'ایلورا' آٹھ برس میں 'اجنتا' انیس برس میں اور 'کاروانِ زندگی' تمیں برس میں مکمل ہوئیں...''

چھے بند کی 'ایلورا' اگر وجد کے آٹھ برس پی گئی تو واقعی انھوں نے عمرِ عزیز کھوئی شاعری کر کے۔ سچا فن کار بھی پرندوں کی طرح انڈے سیتا ضرور ہے لیکن ہمیں سروکار ہے اس کے نتیجے سے۔ اور وجد کے 45 برس کا نتیجہ اگر یہی کچھ ہے تو گرڈھنڈورہ پیٹنا چاہیے کہ

پیت نہ کیجو کوئے!

یعنی شعر اگر باطن سے ٹپکتا نہ ہو تو برسوں سیتے رہنے پر بھی کچھ برآمد نہیں ہونے والا۔ اہلِ بلنز کا اور اہلِ قلم کا کہنا ہے کہ طیش کے عالم میں بے اختیار جو چند مصرعے ہماری، ہجو میں اُس قلم سے ٹپک پڑے ہیں وہ ان کے باقی کلام سے کہیں زیادہ بے باک ہیں اور شخصیت کا آئینہ۔ کاش وہ بے اختیار ہو کر ہی شعر کہا کرتے۔

چوتھا تراشہ:

سالہا سال کے تعلق اور باہمی قدردانی کو ہم یوں سرِ بازار رسوا نہ کرتے، لیکن وجد نے جو دوبارہ اپنی جوابی نظم کا بقیہ بھیجا اور اصرار کر کے چھپوایا، اُس نے ہمیں زبان کھولنے پر مجبور کر دیا۔

وجد لکھتے ہیں کہ اس نظم میں تبصرہ نگار ظ انصاری کے سارے اعتراضوں کا جواب ہے۔ تو سوال و جواب کو ذرا ترتیب سے چن دیا جائے؟

ہم نے پچھلے پانچ برسوں میں، موجود یا مرحوم، کوئی ستر مصنفوں اور ان کی تصنیفوں پر لکھا۔ کچھ خوش ہوئے کچھ ناخوش۔ شاعروں کے قبیلے میں زیادہ تر ہمارے ذاتی دوست خفا ہوئے۔ بعضوں نے ہمیں بد مذاق جان کر معاف کیا اور کسی کسی نے ہماری تول پکّی مان کر داد بھی دی۔ البتہ بد نیتی کا الزام کسی نے نہیں لگایا۔ صرف ایک شاعر ہیں کلاسیکی انداز کے، سکندر علی وجد، جو بہت بے قابو ہو گئے اور ہمیں 'نادان'، 'ریاکار ادب'، 'بے خبر، بے بصر، بے ہنر' کہہ کر یہاں تک کہ: ''خفّاش کو ناحق ہوس ہمسفری ہے'' کی پھبتی کس کر بھی اپنا جی ٹھنڈا نہ کر سکے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ 'افکار کی پر نور فضاؤں میں' پرواز کرتے ہیں تو چمگادڑ بھلا ان کے بلند مقامات کو کیا جانے؛ اسے خوامخواہ ہمسفری کی ہوس ہے!

ظ ا: وجد نجانے کس لمحے میں کہہ گزرے:

دو سو برس میں وجد سراج و ولی کے بعد
اُٹھے ہیں جھومتے ہوئے خاکِ دکن سے ہم

اور ہم خاکِ دکن کے ان دو سو برس پرانے شعرا کی تازگی کا راز تلاش کرتے وجد کے پرانے پن تک جا پہنچے۔

وجد:

کیا فرق ہے سونے میں نیا ہو کہ پُرانا؟
اس فرق پہ اصرار تری کم نظری ہے

ظ ا: ڈیڑھ ہزار برس پرانی نقش کاری، جدید طرزِ تعمیر، اور مجرّد آرٹ abstract، تینوں پر ان کی نظمیں ایک ہی لفظیات، ایک ہی انداز، ایک ہی لہجے میں نکلی ہیں۔ ان کے درمیان فضا کا کوئی فرق نہیں:

''ان کی لفظیات سے کیا مجال، جو کوئی بھانپ جائے کہ صحنِ چمن سے آ رہے ہیں یا آرٹ اسٹوڈیو سے، رقاصہ کے محل سے نکلے ہیں یا...

وجد:

ہے آتشِ دل ساغرِ صہبائے سخن میں
خشکی مرے لب کی مری آنکھوں کی تری ہے

ظ ا: استادانہ غزلوں میں تو یہ وضع داری نبھ جائے لیکن موضوعاتی نظموں میں لفظیات کی یہ ہمواری بے لطف یکسانی بن جاتی ہے۔

وجد:

آرام دل و جاں ہے ترا حسنِ تخیّل
اس حُسن کا زیور مری آشفتہ سری ہے

خ ا: اظہارِ ذات کے بجائے اس (شاعری) سے انھوں نے اخفائے حال کا کام لیا ہے...

وجد:

توصیفِ حکایاتِ جنوں میری عبادت
تنقیص ترا مشغلہ خوش بسری ہے

خ ا: جیسے اچھوتے ترنّم سے وہ سالہا سال چھوٹی بڑی محفلوں میں اپنا کلام سناتے رہے، وہ وجد آور ضرور تھا، مگر وجد نہیں تھا۔ وجد نے اپنے شعر کو اندرونی شخصیت کی لہک سے، اس کی وسعت، گہرائی اور رنگینی سے محفوظ رکھنے کے سارے جتن کر لیے تب چھاپے کی مشین سے گزارنے کا اہتمام کیا۔

وجد:

تاریک ضمیروں پہ اثر کر نہیں سکتا
اشعار میں جو سوزِ دُعائے سحری ہے

پچھلے پندرہ سال میں وجد نے لے دے کے کُل تین نظمیں لکھیں ا: پوکھرن (راجستھان) میں ایٹمی دھماکے کی کامیابی کو عالمی امن کی ضمانت اور خوش خبری بتانے یا جتانے کے لیے (اُن دنوں وہ اندرا کانگریس کی طرف سے راجیہ سبھا کے ممبر تھے)، ۲: 'کام زیادہ باتیں کم' اورنگ آباد میں شری سنجے گاندھی کی آمد پر منظوم نعرہ (گانے بجانے کے لیے) اور تیسری یہ جس میں کل سات شعر نئے ہیں اور دو قسطوں میں لکھے اور چھپوائے گئے... افسوس!

یہ ہجو ہے، تحقیر ہے یا جامہ دری ہے؟

اس میں بھی سات ترکیبیں ایسی کہ خوش مذاق آدمی ان کی پوری شاعری سے بدظن ہو جائے: (1) ''مقصودِ حقیقت کی یہاں پردہ دری ہے'' یہاں، زائد (2) ''تخلیقِ سخن جوہرِ الماس گری ہے'' یہ 'جوہر الماس گری' کیا؟ (3) 'رہ گزرِ منزلِ پیغامبری' (4) 'ساغرِ صہبائے سخن' اس جگہ ساغر اور صہبا میں کوئی ایک لفظ زائد (5) 'مشغلہ خوش بسری' (6) ''...کے سفر میں ...ہوسِ ہمسفری ہے'' سر میں دردِ سر ہے۔ (7) 'توصیفِ حکایاتِ جنوں میری عبادت' یا تو جنوں کی توصیف ہوگی یا جنوں کی حکایات ہوں گی۔ توصیفِ حکایاتِ جنوں سے مراد اگر آرٹ کا اپری سی ایشن ہو تو دُور از کار ترکیب ہونے کے علاوہ وجد کے کلام میں وہ عبادت کے بجائے عیادت نظر آتا ہے۔

یہ ہے 45 یا 48 برس کی مشقِ سخن کا حاصل کہ ایک طرف اعلا شاعری کے نمونے سجانے میں شاعر چند بند کی (ایک اچھی خاصی) نظم 'کاروانِ زندگی' پر بقول خود تیس برس کھپا دیتا ہے، دوسری طرف اپنے فن کو دشمن کی نظر سے دیکھنے کا دعوا ہے اور جہاں اس پر انگلی اٹھتی دیکھی، وہ بے قابو ہو جاتا ہے کہ ارے دیکھو یہ تاریک ضمیر اور خفاش اس 'پُرنور فضا' میں بھلا کیا پر ماریں گے!

پانچواں تراشہ:

'دُعائے سحری'

پانچ ہفتے کی غیر حاضری کے بعد یہ خاکسار تبصرہ نگار بمبئی پہنچا تو بلٹز کے دونوں شمارے یکے بعد دیگرے نظر سے گزرے۔ اول صبر کیا۔ مروّت نے جواب الجواب کی اجازت نہ دی۔ پھر سوچا کہ اَوروں کے ساتھ صبر کا یہ سلسلہ اتنا طول پکڑ چکا ہے کہ وجد جیسے محتاط شاعر، بے عیب غزل گو، مطمئن شہری اور بے ضرر بزرگوار کو بھی بے تحاشا ایسے شعر لکھنے اور چھپوانے کی شہ مل گئی۔ لاؤ، ذرا اہلِ نظر کے سامنے خوان سجا دیں۔ خوان سجانے میں رات کا پچھلا پہر گیا۔ کھڑکیوں سے صبح کا اُجالا چھن رہا ہے۔ سنا ہے کہ صبحِ صادق کی دُعا قبول ہو جاتی ہے۔

• ہماری دُعا ہے کہ وجد کے اشعار کو 'سوزِ دُعائے سحری' اگر آج تک نصیب نہیں ہوا، آئندہ نصیب ہو — آمین!

• آدمی کو قلم اور بیان کی قوت دینے والے لافانی مصنف! وجد کے کلام کو نہ سہی، اس چند ورقی انتخاب کو قبولِ عام کی نعمت سے (اور آنے والے فنکاروں کو عبرت سے) سرفراز فرما — آمین!

• اے 'سب سے اچھے ٹھٹھا کرنے والے' یہ تنہا وجد کی خطا نہیں۔ تیری مخلوق میں اکثر ذی حیثیت اور باعزت شہری اپنے سماجی رتبے کے ساتھ فنی مرتبے کو تولنے میں مبتلا ہو جاتے ہیں، تو ان کی خطاؤں سے در گزر کر — آمین!

• انسان کو 'اُچھلتے پانی سے پیدا کرنے والے' قلم کے محنت کشوں کو توفیق عطا فرما کہ وہ اپنے پانی سے باہر نہ اُچھلا کریں — آمین!

• اے نیتوں کا حال جاننے اور انھی کو بنیاد ماننے والے عالم الغیب 'خدا لگتی' کے مصنف کو اس جوابی مثلث کی اشاعت سے باز رکھ۔

شاعر کا نشانہ تو بہت تیز ہے لیکن
پستول کی ایجاد سے ہے پہلے کی بندوق
بندوق میں سیلی ہوئی بارود بھری ہے

ظ انصاری، اردو بلٹز، بمبئی

■■

'غزل نما'

صنف کی ایجاد کا قضیہ

اسلم حنیف

غزل نما کی ایجاد کو عام طور پر ظہیر غازی پوری سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے علیم صبا نویدی کی کتاب 'اردو شاعری میں نئے تجربے' کی اشاعت کے بعد یہ ثابت کیا تھا کہ اس کے موجد کاظم نائطی ہیں مگر ان کی حالیہ تحقیق کے مطابق ان سے قبل غزل نما کا تجربہ شاہد جمیل نے کیا تھا اس لئے کاظم نائطی بھی غزل نما کے موجد نہیں رہے۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ڈاکٹر فہیم اعظمی مرحوم کے مؤقر جریدے 'صریر' کے شمارہ نومبر 2003 میں غزل کی ایجاد کو کاظم نائطی سے منسوب کرتے ہوئے علیم صبا نویدی کی کتاب سے مصنف کا یہ اقتباس پیش کیا تھا:

''1979 کے آس پاس جب آزاد غزل کا تجرباتی دور شروع ہوا تو ہمارے علاقے تمل ناڈو میں بھی راقم الحروف اور کاظم نائطی نے ہفت روزہ 'اتحاد' کے ذریعے ایک تحریک چلائی تھی... اسی دور میں 'اتحاد' ہی میں آزاد غزل کو غزل نما کا نام دے کر اپنی ایک تخلیق کاظم نائطی نے پیش کی تھی۔'' صفحہ 142

اسی کتاب سے ماخوذ دوسرا اقتباس جو ظہیر غازی پوری کے تجربہ کے بارے میں ہے، بھی نقل کیا گیا تھا جو اس طرح ہے:

''... بعد میں چل کر ظہیر غازی پوری نے اگست 1981 میں تجرباتی آزاد غزل کے زیر عنوان پہلی بار 'سالار' بنگلور کے ادبی ایڈیشن میں ایک غزل نما پیش کی تھی جس میں انہوں نے غزل کے ایک شعر کے دونوں مصرعے ایک ہی بحر میں کہتے ہوئے مختلف اشعار میں ارکان کی کمی بیشی سے غزل کہی تھی۔'' صفحہ 143

ان حوالوں کی روشنی میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے جو نکات پیش کئے ہیں وہ یہ ہیں:

تمل ناڈو کے شاعر کاظم نائطی نے پہلی غزل نما 1979 میں کہی تھی۔

1979 میں ہی کاظم نائطی نے مدراس کے ہفت روزہ 'اتحاد' میں اسے شائع کرایا تھا۔

ظہیر غازی پوری کی غزل نما پہلی بار اگست 1981 میں 'سالار' بنگلور کے 'ادبی ایڈیشن' میں شائع ہوئی تھی۔

کاظم نائطی نے اپنی آزاد غزل کو 'غزل نما' کا نام دے کر شائع کرایا تھا۔

ظہیر غازی پوری نے آزاد غزل کے زیر عنوان 'غزل نما' پیش کی تھی۔

بحث کو آگے بڑھانے سے قبل مناظر عاشق ہرگانوی کی حالیہ تحقیق کے بارے میں بھی جان لینا ضروری ہے کہ وہ شاہد جمیل کو غزل نما کا موجد کیوں تسلیم کرتے ہیں؟ نصرت ظہیر کی ادارت میں شائع ہونے والے اہم ادبی جریدے 'ادب ساز' میں ان کا جو مضمون شمارہ (2009)12-11 میں بعنوان 'غزل نما کا موجد کون' شائع ہوا ہے اس میں وہ مذکورہ موقف کے خلاف یہ انکشاف کرتے ہیں۔

''لیکن 2009 میں میری تحقیق نے نئی کروٹ لی ہے۔ غزل نما کے موجد کاظم نائطی بھی اب نہیں رہے۔ بلکہ شاہد جمیل کے سر پہ یہ سہرا بندھتا ہے۔'' 'ادب ساز' صفحہ نمبر 354

''... جس کا (غزل نما کا) پہلا تجربہ ہفتہ وار 'غنچہ' بجنور کے یکم اکتوبر 1973 کے شمارے میں ملتا ہے۔'' 'ادب ساز' صفحہ نمبر 354

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے کاظم نائطی اور شاہد جمیل کے تجربات کے جو نمونے پیش کئے ہیں، ان پر آگے بحث کی جائے گی لیکن 'صریر' میں شائع ہوئے ان کے مضمون کی تردید میں ظہیر غازی پوری کا جو مضمون 'صریر' کے سالنامہ 2004 میں شائع ہوا تھا اس میں کاظم نائطی کی غزل نما کی اشاعت کے بارے میں تحریر ہے کہ '' کاظم نائطی نے اپنی آزاد غزل (بعنوان غزل نما) 1979 میں نہیں، بلکہ 'اتحاد' کے عیدالضحیٰ نمبر 1981 میں شائع کرائی تھی۔''

چونکہ مذکورہ بیان مظہر امام کے ضمیمہ مشمولہ کتاب نما (دہلی) کے آزاد غزل نمبر 1988 سے ماخوذ ہے اور مناظر عاشق ہرگانوی نے نائطی کی غزل نما کی اشاعت کا حوالہ علیم صبا نویدی کی کتاب سے اخذ کیا ہے، علیم صبا نویدی خود نائطی کے شریک کار رہے ہیں اس لئے مظہر امام کے بیان میں سہو کا

امکان ہوسکتا ہے۔ قطع نظر اس کے ظہیر غازی پوری یہ ثبوت فراہم کرنے سے قاصر ہیں کہ نائطی نے جو تجربہ کیا تھا اس کا عنوان غزل نما نہیں تھا؟ اور انہوں نے جو تجربہ 1981 میں پیش کیا تھا اسے غزل نما کے نام سے ہی شائع کرایا گیا تھا؟

غزل نما کی ایجاد کے حوالے سے انھوں نے جو مضامین تحریر کیے ہیں ان میں شعوری طور پر مغالطہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً:

1۔ ''غزل نما کا تجربہ راقم الحروف نے دسمبر 1979 میں کیا تھا... میں نے اپنی پہلی شعوری کاوش کو 'تجرباتی آزاد غزل' کا نام دیا تھا۔ مگر بعد میں اس نئی تکنیک میں کہی گئی غزل کو میں نے غزل نما کے نام سے موسوم کیا۔ تجرباتی آزاد غزل کے زیر عنوان پہلی بار 'سالار' بنگلور کے ادبی ایڈیشن میں 10 اگست 1981 مدیر کے خصوصی نوٹ اور میرے خط کے اقتباس کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ مجموعہ 'کشت غزل نما' (حنیف ترین) صفحہ نمبر 17

2۔ ''میں نے 'غزل نما' کا تجربہ جب 'تجرباتی آزاد غزل' کے نام سے کیا تھا تو اس کی تکنیک اور ساخت سے متعلق ساری باتیں صاف صاف لکھ دی تھیں۔'' 'غزل نما ایک مستحسن تجربہ' مشمولہ سال نامہ 'صریر' 2004

علمی اور تحقیقی دنیا میں زبانی دعوے کوئی معنی نہیں رکھتے اس لیے ظہیر غازی پوری اگر غزل نما کو 1979 کا تجربہ قرار دیں تب بھی چونکہ یہ تخلیق 1981 میں شائع ہوئی تھی اس لئے اول الذکر سنہ کا حوالہ پیش کرنے سے تجربے کی عمر میں اضافہ سعی رائیگاں کے سوا اور کچھ نہیں۔ دوسری بات یہ کہ تجرباتی آزاد غزل کے نام سے شائع ہونے والی تخلیق کی ہیئت کو غزل نما کے عنوان سے موسوم کرنے کا خیال انہیں بہت بعد میں ہوا۔ شاید دس سال کے بعد (کیونکہ ان کے مذکورہ تجربے پر 1991 تک جو ناقدین ادب نے تاثرات پیش کیے ہیں ان میں غزل نما کی اصطلاح کو استعمال نہیں کیا گیا ہے) لیکن وہ اس حقیقت کے اظہار کی بجائے گھما پھرا کر تخلیق پر ہی غزل نما کے عنوان کو چسپاں کر دینا چاہتے ہیں اور ان کی یہی کوشش مناظر عاشق ہرگانوی کو ان کی تردید کا سامان مہیا کرتی ہے۔ حالانکہ خود مناظر عاشق ہرگانوی بھی تردید واختلاف کے معاملے میں واضح موقف بیان نہیں کر سکے ہیں۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی یہ بات قابل تسلیم ہے کہ کاظم نائطی نے آزاد غزل کے تجربہ کو پہلی بار غزل نما کے عنوان سے پیش کیا تھا، لیکن دوسری تحقیق کے مطابق جب وہ اولیت کا سہرا شاہد جمیل کے سر باندھتے ہیں تو اس بات کا ثبوت نہیں دیتے کہ ہفتہ وار 'غنچہ' (بجنور) یکم اکتوبر 1973 اور اسی پرچہ میں 24 نومبر 1973 کو شائع ہونے والی تخلیقات 'غزل نما' ہی کے عنوان سے شائع ہوئی تھیں۔ اگر موصوف یہ ثبوت بھی دے دیتے کہ شاہد جمیل کے آزاد غزل کے نئے تجربات غزل نما کی سرخیوں کے ساتھ منظر عام پر آئے تھے تو ان کی دلیل کو باوزن قرار دیا جاسکتا تھا۔

مناظر عاشق ہرگانوی کی بنیادی غلطی یہ بھی ہے کہ وہ اعتراض کو غزل نما کی اصطلاح کے استعمال تک محدود نہیں رکھتے بلکہ بحث میں تخلیقی تجربوں کو بھی شامل کر لیتے ہیں اور غور نہیں کرتے کہ ان کے پیش کردہ تجربے ظہیر غازی پوری کے تجربہ سے مختلف ہیں۔

علیم صبا نویدی نے اگرچہ نائطی اور ظہیر غازی پوری کے تجربوں پر اظہار خیال کیا ہے۔ مگر انداز وہی ہے جو ظہیر غازی پوری کا۔

''مگر انہوں نے اس طرح کا کوئی تجربہ نہیں کیا، جیسا کہ بعد میں چل کر ظہیر غازی پوری نے اگست 1981 میں تجرباتی آزاد غزل کے زیر عنوان پہلی بار 'سالار' بنگلور کے ادبی ایڈیشن میں غزل نما پیش کی تھی۔'' 'اردو شاعری میں نئے تجربے' صفحہ نمبر 143-142

ظہیر غازی پوری کو غزل نما کا موجد کہا جاسکتا ہے کیونکہ اس سے بیشتر آزاد غزل کے تمام تجربات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس کے تمام مصرعوں کا ہم وزن ہونا (ہم وزن یا باوزن؟) درست ہے۔ مگر ہر مصرعے کے ارکان کا برابر ہونا کوئی لازمی شرط قرار نہیں پائی تھی۔ بحوالہ مذکور

علیم صبا نویدی نے نائطی کے تجربے کو ظہیر غازی پوری کے تجربے سے مختلف تو قرار دیا ہے۔ مگر سالار 1981 کے شمارے میں تجرباتی آزاد غزل کے عنوان سے شائع شدہ تخلیق کو ہی غزل نما کے نام سے موسوم کر دیا ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ جو غزل نما کی فارم نائطی نے اپنائی تھی وہ اگر آزاد غزل سے مختلف نہیں تھی تو خود علیم صبا نویدی یا دیگر حامیانِ آزاد غزل نے اسے نیا نام دینے پر اسی وقت نائطی کے خلاف آواز کیوں بلند نہیں کی؟ اور اگر نائطی نے اپنے تجربے کو غزل نما کی اصطلاح سے موسوم کر ہی دیا تھا تو ظہیر غازی پوری کو اس اصطلاح کے سرقہ کا کیا حق پہنچتا ہے؟ سوال یہ بھی ہے جو اصطلاح یا ہیئت کسی نے رائج کی ہو تو بعد میں اسی کو اپنی طرف سے منسوب کرنے والے کو موجد کہا جاسکتا ہے؟

ماہنامہ 'صریر' (کراچی) کے شمارہ نومبر 2003 میں جب مناظر عاشق ہرگانوی کا مضمون 'غزل نما کا موجد کون؟' شائع ہوا تھا تو میں نے اپنے تفصیلی مکتوب میں اصطلاح اور ہیئت کے مسئلہ کو اہمیت دیتے ہوئے نائطی کی غزل نما کی تقطیع کے بعد ثابت کیا تھا کہ نائطی کا 'تجربہ' غزل نما' ظہیر غازی پوری کی صنف غزل نما سے کسی طرح مطابقت نہیں رکھتا، رہا سوال یہ کہ ظہیر غازی

پوری نے ناظمی کے تجربے کے عنوان کو شعوری طور پر اپنایا تھا یا لاشعوری صورت میں یہی نام انہوں نے وضع کیا تھا؟ اس سلسلے میں اگر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی صاحب اعتراض کریں تو اس پر سنجیدگی سے غور کیا جاسکتا ہے۔ صریر، شمارہ فروری 2004

چونکہ مناظر عاشق ہرگانوی، کاظم ناظمی کی اصطلاح کو بنیاد بنا کر ظہیر غازی پوری کے تجربے کو کلی طور پر مسترد کردینا چاہتے تھے اس لئے میرے مکتوب پر اظہار خیال کی بجائے خاموشی اختیار کرلی۔ ظہیر غازی پوری اس لئے خوش تھے کہ پہلی بار میں نے ناظمی کے تجربہ کی تقطیع کر کے اسے ان کی اختراع سے مختلف قرار دیا تھا، اس لئے ان کا ردعمل توصیف کی حد سے آگے نہ بڑھ سکا۔

''جناب اسلیم حنیف نے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانی کے مراسلے کا منصفانہ جواب لکھا ہے۔ انہوں نے تقطیع کر کے یہ بھی سمجھا دیا ہے کہ کاظم ناظمی نے آزاد غزل کہی تھی اور عنوان غزل نما قائم کردیا۔ محض عنوان کو تو صنف کا درجہ حاصل نہیں ہوسکتا۔'' مراسلہ ظہیر غازی پوری، مطبوعہ صریر اپریل، 2004

ظہیر غازی پوری نے نہ صرف متذکرہ مراسلے میں غزل نما کی اصطلاح کے بارے کسی قسم کی بحث نہیں کی، بلکہ ان کا جو مضمون 'صریر' کے سال نامہ جون رجولائی 2004 میں شائع ہوا تھا اس میں بھی غزل نما کی تعریف وتوصیف سے متعلق ناقدین کے تاثرات اور آزاد غزل کی خامیوں پر تفصیلی گفتگو کی گئی، مگر میرے سوال کو نظر کردیا گیا۔ اسی لئے کہ ان کے پاس اس کا معقول جواب موجود نہیں ہے۔

چونکہ غزل غزلیہ اور گیتل کے عنوان سے کئے گئے تجربے خود آزاد غزل کے تجربے سے ماخوذ ہیں اس لئے ان تمام ہیئتوں کا تجزیہ مآخذ اور خود اس کی حقیقت پر بحث کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

جس دور میں آزاد غزل اپنے ارتقائی دور کو پورا کر رہی تھی راقم الحروف نے اس کی ہیئت پر سخت تنقید کے لئے مختلف رسائل میں نہ صرف خطوط شائع کرائے، بلکہ 'اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے' کے عنوان سے مضمون بھی تحریر کیا اور اس میں آزاد غزل کو یاس یگانہ کی ایک غزل سے مستعار ہونے کا شبہ ظاہر کرتے ہوئے اس کی ہیئت کو غزل کے مزاج کے منافی اور متناقص تجربہ قرار دیا۔ یہ مضمون ماہنامہ 'شیرازہ' جموں کشمیر شمارہ 1920-1987 میں شائع ہوا۔ مضمون کی اشاعت کے بعد آزاد غزل کا تخلیقی رجحان نہ صرف کمزور پڑتا چلا گیا، بلکہ تنقیدی سطح پر اس کی حمایت وتعریف کرنے والے بھی گنے چنے لوگ ہی رہ گئے۔ قطع نظر اس کے ماہنامہ 'صریر' کے شمارہ فروری 2004 میں جملۂ معترضہ کے طور پر جب میں نے آزاد غزل کی پیدائش کے سن کو رقم کیا تو اس کی تردید کرتے ہوئے مظہر امام نے تحریر کیا کہ:

''فروری کے 'صریر' میں جناب اسلم حنیف کا ایک طویل مکتوب شائع ہوا ہے، جس میں ایک جملہ یہ بھی ہے۔''... 'آزاد غزل' کی ایجاد کا سن مظہر امام نے 1960 تحریر کیا ہے۔'' یہ بیان درست نہیں ہے، اس طرح کی کوئی بات کبھی اور کہیں نہیں کہی رلکھی۔ میں ایک بار پھر (اور شاید آخری بار) واضح طور پر آزاد غزل کے پہلے تجربے کے تعلق سے چند حقائق 'صریر' کے ذریعے پیش کررہا ہوں تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ ہر چند یہ باتیں میں پہلے بھی کئی مرتبہ لکھ چکا ہوں۔

1۔ میں نے پہلے بار آزاد غزل کا تجربہ 21 فروری 1945 کو کیا۔

2۔ اسکول سرٹی فکیٹ کے مطابق میری تاریخ پیدائش 5 مارچ، 1930 ہے۔ پرانے کاغذات کے بموجب میں 12 مارچ، 1928 کو پیدا ہوا۔ یعنی آزاد غزل کا تجربہ میں نے پہلی مرتبہ سترہ سال کی عمر میں کیا۔

3۔ یہ آزاد غزل پہلی مرتبہ کرامت علی کرامت کے مضمون 'شاعر اور فن کار۔ مظہر امام' مطبوعہ 'اشارہ' پٹنہ، اگست، 1959 میں نقل ہوئی۔

4۔ یہ آزاد غزل پہلی بار سہ ماہی 'رفتار نو' دربھنگہ (بہار) کے سالنامہ جنوری 1962 میں شائع ہوئی۔

5۔ یہ آزاد غزل اسی سال میرے پہلے مجموعے 'زخم تمنا' میں بھی شامل ہوئی، جو اکتوبر 1962 میں منظر عام پر آیا اور (اس میں) آزاد غزل کی تاریخ وہی درج ہے، جو میں نے اوپر لکھی ہے یعنی 21 فروری 1945۔

ماہنامہ صریر اپریل، 2004

ایک محقق وناقد پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ کسی مسئلہ کی حقیقت جاننے کے لئے تحریری ثبوت فراہم کرتا ہے، اس کے باوجود بعض امور میں وہ تحقیق کے بنیادی ثانوی وسائل کے استعمال کو بروئے کار لانے سے قاصر رہتا ہے اور مصنف کی خود نوشت ہی کو ترجیح دینا اس کی مجبوری بن جاتی ہے۔ چونکہ میں محقق ہوں نہ ناقد اس لئے بھی اقرار ہے کہ میں نے ایجاد کا سن غلط تحریر کردیا تھا لیکن اس غزل کی اشاعت کے سلسلے میں کسی نے بھی کرامت علی کرامت کے مضمون (مشمولہ 'اشارہ') کا اشارہ نہیں کیا ہے۔

رہا آزاد غزل کی اشاعت کا مسئلہ سو اس سلسلے میں فہیم اعظمی نے لکھا ہے۔

''لیکن 1962 سے جو اردو ادب میں جدیدیت کی تحریک کی شدت سے شروع ہونے کا زمانہ تھا، ان کی غزل نہ صرف شائع ہونے لگی، بلکہ اس پر بحث ومباحثے بھی ہوئے۔'' آرائین جدیدیت صفحہ 576

علیم صبا نویدی نے تحریر کیا ہے کہ:

''لیکن 1964 میں مظہر امام نے آزاد غزل کی بنیاد ڈالی'' اردو شاعری میں نئے تجربے صفحہ نمبر 95

''ان کی پہلی غزل جو 1942 میں کہی گئی ہے، جنوری 1962 میں دربھنگہ کے ماہنامے 'رفتارِ نو' کے خاص نمبر بابت جنوری 1962 میں شائع ہوئی۔ بحوالہ مذکور صفحہ نمبر 971

عبدالمتین کے مطابق:

''بقول مظہر امام پہلی آزاد غزل کی تخلیق فروری 1945 میں ہوئی تھی، مگر پہلی بار اس کی اشاعت 'رفتارِ نو' دربھنگہ میں 1961 کو ہوئی۔'' ماہنامہ 'عمین' شمارہ نمبر 9، نومبر، دسمبر 1996 صفحہ نمبر 32

مذکورہ بالا تینوں شخصیتیں تنقیدی ادب میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہیں۔ انہوں نے کہاں سے حوالے اخذ کئے ہیں، یہ میں نہیں کہہ سکتا، لیکن بیانات میں جو تضاد موجود ہے، مظہر امام نے اس پر تنقید کیوں نہیں کی؟ اس مصلحت کو وہ خود بہتر جانتے ہوں گے۔ مظہر امام خود بھی معتبر ناقدین میں شامل ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے آزاد غزل کے تولد کا جو سن تحریر کیا ہے وہ اس لئے درست ہے کہ پندرہ یا سترہ سال کی عمر لڑکپن (Puberty) عنفوانِ شباب (Adolescence) کی منزل میں داخل کر دیتی ہے اور کم سن نوجوان کی طبعی توانائی یا Physical Energy جوش پر ہوتی ہے۔ جذباتی سطح پر ہیجان بپا رہتا ہے اور تخلیقی صلاحیتیں creative abilities اظہار کے لئے ذہن میں اضطراب پیدا کئے رہتی ہیں، لیکن افعال و تجربات میں لغزشوں کا عمل دخل زیادہ رہتا ہے کیونکہ یہ دور شعور و فکر کی پختگی کا دور نہیں ہوتا۔ آزاد غزل میں فن و فکر کی عدم پختگی مظہر امام کے الفاظ کی تصدیق کے لئے اگرچہ کافی ہے، مگر مزید تصدیق کے لئے کہا جاسکتا ہے کہ اگر وہ بذاتِ خود آہنگ و ہیئت کے اصولوں سے آشنا ہوتے تو آزاد غزل کی نظریہ سازی کا کام بھی خود ہی سر انجام دیتے نہ کہ کرامت علی کرامت۔

میں اجتہاد و تجربہ کا مخالف نہیں ہوں۔ میں نے خود کئی اصناف وضع کی ہیں اور متعدد شعری تجربات بھی کئے ہیں، جن سے اردو ادب کے دانشور نا آشنا نہیں ہیں اور جانتے ہیں کہ میرے تجربات ہیئت و فن کے گہرے مطالعے کا نتیجہ ہیں۔ قطع نظر اس کے میں نے موشح نما غزل ایجاد کی ہے اس کی ہر ہیئت میں غزل کی دو بنیادی خصوصیات کا خیال رکھا گیا ہے۔

1۔ غزل کے شروع یا آخر میں یا دونوں جانب جو ٹکڑے لگائے گئے ہیں ہر مصرعے کی طرح یہ بھی ہم وزن ہوں تاکہ مجموعی صورت میں ہر مصرع کا آہنگ و وزن یکساں رہے۔

2۔ غزل میں قافیہ کی ناگزیریت برقرار رہے اور جو اضافی ٹکڑے بالخصوص ہر مصرعے کے بعد لگائے گئے ان میں بھی قافیہ/ ردیف کو برقرار رکھا جائے تاکہ ہر شعر غزل کے خارجی ربط کا مظہر بنا رہے۔

غزل کی متذکرہ خصوصیات یعنی فن و ارکان کی یکسانیت اور قافیہ و ردیف کی ناگزیریت کو ختم کر دیا جائے تو غزل، غزل نہیں رہ سکتی، بلکہ چیستاں بن کر رہ جائے گی۔

آزاد غزل میں ارکان کی اہمیت اور قافیہ کے التزام کو تو برقرار رکھا گیا ہے۔ مگر مصرعوں کی عدم یکسانیت اسے غزل کے زمرے سے خارج کر دیتی ہے۔ اسی لئے میں ایسی غزلوں پر آزاد غزل کا اطلاق کرتا ہوں، جنہیں شاعر عروضی ارکان میں کمی بیش کے ساتھ تخلیق کرے یا اپنے طور پر غیر عروضی ارکان ترتیب دے کر غزل کی تخلیق کرے لیکن بہر صورت ہر مصرعہ بنیادی وزن کے مطابق ہو۔ آزادی و اجتہاد کا یہ تصور مظہر امام کی غزل کے نظریے سے بہتر اور ٹھوس ہے۔

غزل کے حوالے سے غیر مساوی الارکان غزلیہ تجربے ہوں یا نثری آہنگ پر مشتمل تجربے یا پھر قافیہ وردیف سے ماورا تجربے انہیں غزل کے زمرے میں نہیں رکھا جاسکتا۔ غزل کے ہیئتی تجربے جو اس کے مزاج کے منافی ہیں ان کا سلسلہ آزاد غزل کے معرض اظہار میں آنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اس لئے اصطلاحات پر بحث کے لئے ان کی ہیئتوں کو جاننا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ مظہر امام کی آزاد غزل کی فارم ملاحظہ کیجئے۔

ملی ہے جو منزل تو یہ لگ رہا ہے کہ سارا سفر رائیگاں ہے
کہ اب سانس کا بوجھ ڈھونا بھی جی کا زیاں ہے
وہ خوابیدہ آتش فشاں ہے
جو اک راز سینے میں میرے ابھی تک نہاں ہے
وہی نقش اول، وہی نقش ثانی
وہ تصویر جاں ہے

یہ آزاد غزل بھی متقارب سالم کے ارکان میں تخلیق کی گئی ہے۔ پہلے مصرع میں فعولن سات بار، دوسرے مصرع میں پانچ بار، تیسرے مصرع میں تین بار اور چوتھے مصرع میں پانچ بار، پانچویں مصرع میں چار بار اور چھٹے مصرع میں رکن فعولن دو بار استعمال ہوا ہے۔ کہا جاسکتا ہے قافیہ وردیف کے استعمال کے باوجود ارکان کو من مانے طریقے پر برتا گیا ہے اور یہی نہیں بلکہ متحد المعنی ہونے کے باوجود دو مصرعے بھی ہم وزن نہ ہونے کی بنیاد پر شعر

کی تعریف سے خارج ہیں۔

غزلیہ کے عنوان سے فارغ بخاری نے کئی ہیئتوں کو وضع کیا ہے۔ مختلف بحور کے بے قافیہ تجربے وغیرہ کے علاوہ وہ طاق مصرعوں کی تخلیق کو بھی جائز تصور کرتے ہیں۔ مثلاً:

روپ ندی پر کب سے کھڑی ہے، کوئی تو لوٹ کے آئے
کیا آگ ہے کہ جس میں تحلیل ہو رہا ہوں
شعر لکھنا یوں ہے، جیسے حسن کے جادو پہ شاعر کی گرفت
چاند سے وابستہ ہے، اب بھی مری دیوانگی
پھول میری کمزوریاں
تنہائی میں خوب اڑانیں بھرتا ہوں
تازہ ہواؤں روشنیوں کے سنگ رہا ہوں
سارے جہاں کے رنگ ہمارے اندر ہیں
چہرے سچ بولتے ہیں

اگرچہ غزل کے اشعار کا طاق ہونا محاسن غزل میں شامل نہیں ہے۔ لیکن جب سے مختصر غزلوں کا دور شروع ہوا ہے اکثر شعراء پانچ، سات اور نو شعروں کا کہنا پسند کرتے ہیں۔ فارغ بخاری کو یہ مغالطہ ہوا ہوگا کہ شعروں کا طاق ہونا، بحرالارکان اور ردیف وقافیہ کی طرح غزل کا جزو لاینفک ہوتا ہے۔ اس لئے انہوں نے جہاں کسی بحر کے مخصوص ارکان وآہنگ اور قافیہ سے انحراف کو ترجیح عنایت فرمائی وہیں غزل کی مصرعوں کو طاق کرنے کا اجتہاد بھی پیش کرنا ضروری سمجھ لیا، لیکن نہ سوچ سکے کہ شعر دو مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس لئے طاق مصرعوں کی غزل کے معنی ہوں گے کہ اس میں یا تو کوئی شعر ایسا ہے، جس میں تین مصرع موجود ہیں یا پھر کوئی مصرع ایسا ہے جس پر شعر کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ فارغ بخاری واقعی پہلے اختراع کار ہیں، جنھوں نے نہ صرف غزل کو اس کی مجملہ ہیئتی پابندیوں سے فراغت دلا دی ہے، بلکہ شعر کے معنی بھی بدل کر رکھ دیئے ہیں۔ ان کی اس چھوٹ سے متاثر ہو کر ہو سکتا ہے کوئی یک مصرعی شعر اور ایک مصرعی غزل کی تخلیق کا بھی تجربہ کر ڈالے۔

سلیم شہزاد کی غزلیہ فارغ بخاری سے مختلف ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

ہجوم دوستاں معتبر میں ہے اکیلا
وہ اپنے آپ سے ڈرتا ہوا، اپنے ہی گھر میں ہے اکیلا
سفر میں ہے اکیلا
پرندہ دشت گم شدگی کی پیچاں رہ گزر میں ہے اکیلا

یہ تجربہ بحر ہزج سالم محذوف الآخر کے ارکان پر مشتمل ہے۔ ارکان کو برتنے میں کسی اصول کو بھی قائم نہیں رکھا گیا ہے، بلکہ آزاد غزل کی طرح مصرعوں کو کم زیادہ کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلیم شہزاد فارغ کے ہیئتی تجربے کے برخلاف آزاد غزل کی ہیئت ہی کو غزلیہ کے عنوان سے متعارف کرانے پر اصرار کرتے ہیں۔

غزل نما کے عنوان سے ناطقی نے جو تحریر کیا تھا اس کے چار مصرعے سے ملاحظہ کیجئے:

بڑی وحشتیں تھیں صدائیں بہت تھیں
مرے گرد و پیش ایسی ہنگامہ آرا فضائیں بہت تھیں
برے لفظ نوک زباں پر جو لاتے تامل تھا تم کو
مجھے کوسنے کی دعائیں بہت تھیں

یہ فارم بھی آزاد غزل سے مختلف نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ اسے نئی اصطلاح سے موسوم کر دیا گیا ہے۔ غزلیہ کی طرح غزل نما کی اصطلاح بھی دو فنکاروں کے یہاں استعمال ہوتی ہے اور اسی اصطلاح کی بنیاد پر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے اختلاف کی راہ ہموار کی ہے۔ ان کی نئی تحقیق کے مطابق غزل نما کے جو تجربے شاہد جمیل نے اکتوبر 1973 میں کئے ہیں، بہ اعتبار ہیئت انہیں بھی ملاحظہ کیجئے:

نہ ہنسنے ہنسانے میں دل لگ رہا ہے، نہ پڑھنے پڑھانے کو جی چاہتا ہے
فقط مار کھانے کو جی چاہتا ہے!
ہر اک فرد میری خوشامد کرے اور اس طرح دل کو مسرت ہو حاصل
وہ نخرے دکھانے کو جی چاہتا ہے!

دوسرا تجربہ بھی اسی نوعیت کا ہے

نہ ادھر جائے ہے نہ ادھر جائے ہے کیا کہوں ذہن کس طرح ڈر جائے ہے
صورت مولوی جب نظر آئے ہے!
چوٹی باجی کی صاف، ابا کی جیب ختم اور بھیا کی ساری کتب حوض میں
میری سادہ طبیعت جب اٹھلائے ہے!

پہلی تخلیق میں سات شعر ہیں جو بحر متقارب سالم کے رکن فعولن پر اس طرح تخلیق کئے گئے ہیں کہ تمام مصرع ہائے اولیٰ کے ارکان برابر اور دوسرے مصرعوں کے ارکان آپس میں یکساں ہیں یعنی پہلے مصرعوں میں فعولن کا استعمال آٹھ آٹھ بار اور قوافی کے ساتھ دوسرے مصرعوں میں یہ رکن چار بار لایا گیا ہے۔

دوسری تخلیق میں بھی بحر متدارک سالم کے رکن فاعلن کو مذکورہ ترتیب ہی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی پہلے مصرعوں میں فاعلن آٹھ آٹھ بار

اور ثانی مصرعوں میں چار چار بار۔

اس اعتبار سے کہ شاہد جمیل نے دونوں تخلیقات کے پہلے مصرعوں میں بحروں کے بنیادی ارکان کو مضاعف صورت میں برتا ہے اور مصرع ہائے ثانی کو اصل وزن پر برقرار رکھا ہے، تجربوں میں خوشگوار آہنگ پیدا ہو گیا ہے۔ ترتیب میں قرینہ بھی ہے اور جدت بھی مگر آزاد غزل کی طرح اس کے دو مصرعے، شعری خوبی سے معرا ہیں اس لئے اس کے متحد المعنی دو دو مصرعوں پر مشتمل تخلیق پر بھی غزل کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔

شاہد جمیل کے دونوں تجربوں کے مطالعے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ بہ اعتبار معانی ان میں غزل کا رنگ و آہنگ موجود نہیں ہے بلکہ یہ مزاحیہ اسلوب کی حامل تخلیقات ہیں۔ موضوع و مواد پر غور کیجئے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ تخلیقات ادب کے باشعور قارئین کی بجائے اسکول کے طالب علموں کو مد نظر رکھ کر نظم کی گئی ہیں۔ بچوں کے مزاج و شعور کا خیال رکھتے ہوئے سب سے پہلے اسماعیل میرٹھی نے ہزل کہی تھی۔ شاہد جمیل کے تجربے بھی بچوں کے مزاحیہ ادب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب اگر انہوں نے ان تجربات کو غزل نما کے عنوان سے شائع کرایا تھا تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ غزل اور ہزل کے فرق سے بھی ناواقف ہیں اور اگر مناظر عاشق ہرگانوی ان ہزلیہ تجربوں کو زیر بحث عنوان سے موسوم کر رہے ہیں تو انہیں اپنے رویہ پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

ظہیر غازی پوری نے غزل نما کے عنوان سے جو ہیئتی تجربہ کیا ہے اس کو بھی پڑھ لیجئے:

نظر نظر اضطراب دیکھوں نفس نفس انقلاب لکھوں
میں جبریت کی بیاض میں خود سزا کا کب تک حساب لکھوں
بدن بدن کو غبار صحرا
نظر نظر کو سراب لکھوں
یہی تو انکار و آگہی کا ہیں پیش خیمہ
میں اپنے طبقوں کو کیسے خانہ خراب لکھوں

یہ اشعار بحر متقارب مقبوض اثلم کے ارکان فعول فعلن پر ترتیب دیئے گئے ہیں اور اس طرح کے پہلے شعر میں ارکان کی تعداد فی مصرع آٹھ ہے۔ دوسرے شعر میں چار چار رکن ہیں اور آخری دونوں مصرعوں میں ان کی تعداد چھ چھ ہے۔ یعنی ہر شعر، معنی و آہنگ کے اعتبار سے مکمل ہے۔ مگر غزل کے اشعار کی طرح ہر شعر کے ارکان برابر نہیں ہیں۔ اس لئے مجموعی طور پر مختلف الارکان اور باہم منتشر اشعار کے مجموعے کو بھی غزل کے عنوان سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔ میں پہلے بھی ظہیر غازی پوری کے تجربہ کو آزاد غزل کے مقابل بہتر تجربہ قرار دے چکا ہوں اور آج بھی اسی موقف پر قائم ہوں مگر اصطلاح کے سلسلے میں ان کے غیر مدلل خیالات سے متفق نہیں ہوں اور نہ ہی غزل میں ان کے پیش کردہ تصرف کو جائز قرار دیتا ہوں۔ میرا موقف یہی ہے کہ غزل بہر طور غزل ہے اور ہیئت کے اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے اگر تجربے کئے جائیں تو ان تجربوں کو نئی اصطلاح کے لاحقہ کے ساتھ غزل کے نام سے پکارا جا سکتا ہے۔

چونکہ آزاد غزل کے بعد مختلف قسم کے تجربات غزل کے حوالے سے سامنے آتے ہیں اور تعجب کی بات یہ ہے کہ مظہر امام کی آزاد غزل کی تحریک کو آگے بڑھانے والے کاظم نائطی نے جب آزاد غزل ہی کی فارم کو غزل نما سے موسوم کیا تو خود مظہر امام یا علیم صبا نویدی نے اس اصطلاح کو مسترد کیوں نہیں کیا؟ اسی طرح سلیم شہزادے نے بھی جب آزاد غزل کو غزلیہ کا عنوان عطا کیا تو مظہر امام اور ان کی تحریک کے لوگوں نے اصطلاح بدلنے کے وجوہ پر بحث کیوں نہیں کی؟ میرا خیال ہے کہ اس کی اہم وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ مظہر امام خود غزل کے سخت گیر اصولوں سے آگاہ تھے اور اپنی وضع کردہ اصطلاح سے خود بھی مطمئن نہیں تھے۔ اس کا ثبوت ہمیں ظہیر غازی پوری کو تحریر کردہ مکتوب سے مل جاتا ہے جو انہوں نے 27 دسمبر 1985 کو تحریر کیا تھا۔

آپ نے آزاد غزل کے لئے ایک خاص التزام کی سفارش کی ہے اور آپ اسے غزل نما کہتے ہیں۔

''سلیم شہزاد آزاد غزل کے لئے غزلیہ کا نام تجویز کرتے ہیں۔ ڈاکٹر تاراچند رستوگی بھی اسی نام کو پسند کرتے ہیں لیکن نام میں کیا رکھا ہے اصل چیز تو اس کی تکنیک ہے۔'' "مشمولہ غزل نما ایک مستحسن تجربہ' سالنامہ نصریہ 2004

مظہر امام اپنی آزاد اور ظہیر غازی پوری کی غزل نما کی تکنیک کے فرق سے واقف ہوتے تو اس پر بھی روشنی ڈالتے مگر اس سلسلے میں بھی ظہیر غازی پوری کے اٹھائے گئے سوال کا جواب کرامت علی کرامت ہی نے عنایت کیا۔

''... آپ کے اور ہمارے نظریہ میں فرق صرف اتنا ہے کہ آپ چاہتے ہیں آزاد غزل کا ہر شعر غزل کا ہو اور ہم چاہتے ہیں کہ آزاد غزل کا ہر مصرع غزل کا ہو۔ ماہنامہ گلبن (احمد آباد) شمارہ مارچ۔ اپریل 1988

غزل بے حد حساس اور نازک صنف سخن ہے اور یہ ایسے ہیئتی تجربوں کو قبول نہیں کر سکتی، جو بنیادی وزن و آہنگ کے خلاف ذاتی اجتہاد کا نتیجہ ہوں۔ غزل اور نظموں میں بنیادی وزن کا تعین مطلع سے ہوتا ہے اگر کوئی ایک مصرع یا پورا شعر مطلع کے فن و ارکان کے خلاف نظم کر دیا جائے یا ہو جائے تو جس

طرح مصرع شعر کو ناموزوں کر دیتا ہے اسی طرح شعر غزل کو خارج از لحن بنا دیتا ہے۔ آزاد غزل کے ابتدائی ہم قافیہ دونوں مصرعے ہم وزن نہیں ہوتے اس لئے غزل کے مطلع کی طرح ان سے بنیادی وزن کا اخذ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ جس تخلیق کی بنیاد ہی ناموزونیت پر قائم ہو اور اس کے دیگر اشعار بھی اسی رنگ و قالب کے مظہر ہوں تو ایسی ناموزوں تخلیق کو غزل کہا ہی نہیں جاسکتا۔ غزل نما میں نوعیت بدل جاتی ہے۔ مطلع کے مصرعے ہم وزن ہوتے ہیں۔ مگر ان سے حاصل شدہ ارکان پر دوسرے اشعار کی تقطیع ممکن نہیں ہوتی اس لئے بنیادی وزن سے انحراف کی وجہ سے شعر ناموزونیت کے ذیل میں چلے جاتے ہیں اور تخلیق 'فردیات' کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اور اپنی ذات میں مکمل مگر غزل کے خارجی اصولوں اور مجموعی طور پر غزل کے آہنگ کو مجروح کرنے والے اشعار کے مجموعے کو چاہے کسی اصطلاح سے پکارا جائے مگر اس کو غزل کے ساتھ منسلک کرنا قطعی بے جواز کہا جائے گا۔

ذکر آہی گیا ہے تو کیوں نہ اپنی دو آزاد غزلوں (مطبوعہ 'معلم اردو' لکھنؤ شمارہ فروری 1988) کے شعر بھی بطور نمونہ یہاں پیش کر دوں:

دفن کی عظمتوں کو ہم بھی چاٹتے رہیں
اگر نگاہ میں گزشتہ واقعے رہیں

جگہ جگہ بکھیر دو یہ سوکھی پتیاں
اب آہٹوں سے بے خبر نہ راستے رہیں

دلوں میں جاگ اٹھے گا پھر ضمیر دشت کا
اگر خلوص و مہر کے نہ سلسلے رہیں

اپنی بیداری کی جب ایک ایک آہٹ 'خواب اثر' ہو جائے گی
گنبد بے در میں گھٹ کر زندگی نامعتبر ہو جائے گی

تجربوں کی دھوپ سے مانوس انساں اس سے تھے آشنا
روشنی حد سے تجاوز کرتے ہی تاریک تر ہو جائے گی

اول الذکر غزل کا بنیادی وزن مفاعلن مفاعلن مفاعلن فعل ہے۔ جو بحر ہزج مثمن سالم کے ارکان سے ماخوذ وزن، مفاعلن چار بار کے آخری مفاعلن سے علن کو اڑا کر حاصل کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ وزن اصل وزن میں ذاتی تحریف کا نتیجہ مان لیجئے۔ دوسرے غزل، بحر رمل مثمن سالم (فاعلاتن فی مصرع چار بار) میں فاعلن کے اضافے کے ساتھ کہی گئی ہے۔ پہلی غزل کے آخر میں فعل کے استعمال کو عروضی اعتبار سے درست ثابت کیا جاسکتا ہے اور دوسری غزل کا نام رمل معشی سالم سالم سالم سالم محذوف الآخر تجویز کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس طرح حذف و اضافہ کو عام شاعر بھی بروئے کار لاسکتا ہے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ مجھ سے پہلے کسی شاعر نے اصل اوزان میں حذف و اضافے کے ساتھ غزلیں نہ کہی ہوں، لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ان تجربات کو کوئی نام نہیں دے سکے۔ اور میں نے انہیں نام دیا ہے۔

دوسری صورت میں شاعر خود ساختہ اوزان کو مرتب کر کے غزل کی تخلیق کر سکتا ہے۔ اس طرح کی غزلیں تخلیق کرنے کی باقاعدہ تحریک علامہ شارق جمال نے شروع کی تھی۔ ان کے دیے گئے اوزان پر شعرا غزلوں کی تخلیق کرتے تھے لیکن یہ کام اناڑیوں کے بس کا نہیں تھا اس لئے مقبول عام نہیں ہوسکا۔

ان کی کتاب عروض میں نئے اوزان کا وجود میں اس طرح کے تجربے موجود ہیں۔ چند شعرا کا ایک ایک شعر پیش کر رہا ہوں۔

شور شہروں سے اب کے لے گیا ہے سیلاب
اب کہاں جائے گی یہ موج دریا معلوم

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

وزن: فاعلن مفعولات فاعلن مفعولات

تیرے رکھ رکھاؤ میں کہ مرے سجاؤ میں
غلطی کہاں ہوئی یہی ہوسکا نہ طے

رؤف خیر

وزن: فَعِلن مفاعلن فَعِلن مفاعلن

اے درد دل تجھے آگہی ہے
کیوں اب بھی مجھے خوشی ہے

عتیق احمد عتیق

وزن: مستفع لن فعولن فعولن

خود ساختہ وزن میں ایک غزل میں نے بھی تخلیق کی ہے جس کا مطلع ہے۔

صاحبو! یہ کہو صلیب پر ہے وہ پرندہ جو شاخ نیب پر ہے

اس کا وزن فاعلاتن مفاعلن فعولن ہے۔

متذکرہ تمام تجربات کی خصوصیات یہ ہیں کہ ان کے اوزان چاہے عروضی ارکان میں حذف و اضافہ کا نتیجہ ہیں یا ذاتی اجتہاد کا، ہر غزل اپنے بنیادی وزن کے عین مطابق ہے یعنی اوزان کو برتنے میں آزادی کو اہمیت حاصل ہے۔ مگر یہ آزادی غزل کے خارجی اصولوں سے متصادم نہیں ہے۔

موشح نما غزل کے عنوان سے جو ہیئتی تجربے خاکسار نے کئے ہیں کئی انداز کے ہیں۔ یہاں چند ہیئتوں کے نمونے پیش کر رہا ہوں۔

ہے بات عجب روشن ہیں وہ نقش کف پا اب بھی

یہ دن ہے کہ شب بکھری ہے سرِ راہ ضیا اب بھی
ربِ رحم کر اب چلنے تو لگیں آندھیاں اس دل میں
ہوں مہر بہ لب ہے کس لئے محبوس فضا اب بھی

پھر پسِ پردہ شب دیکھئے کون ہوا نوحہ کناں نوحہ کناں
شور ہے حد سے سوا
کیسا اب جشنِ طرب کرب میں ڈوب گیا سارا جہاں سارا جہاں
درد کا باب کھلا
مجھ سے مت پوچھ یہ اب فکرِ حالات تھی یہ، یا مری بیگانہ روی
جانِ من رشکِ صبا
حادثہ تھا یہ عجب تیرا غم بن نہ سکا، سوزِ نہاں سوزِ نہاں
میں یہ کس رہ پہ چلا

پہلی غزل مستزاد کے برخلاف تجربہ ہے یعنی مستزاد یہ غزل میں شعرا چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہر مصرعہ کے آخر میں لگایا کرتے تھے۔ میں نے انہیں شروع میں لگا دیا ہے لیکن ہر ٹکڑا باہم مقفّیٰ ہے۔ اور اگر ان ٹکڑوں کو غزل سے الگ کر دیا جائے تو مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا، البتہ ٹکڑوں کی موجودگی میں معنی کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔

دوسری موشح نما غزل کی خصوصیت یہ ہے کہ درمیان میں موجود غزل ذوقافیتین ہے اور دوسرے قافیہ کو ہر جگہ مکرر لایا گیا ہے۔ مطلع کو چھوڑ کر تمام پہلے مصرعے باہم مقفّیٰ ہیں۔ ابتدائی چھوٹے ٹکڑے تمام کے تمام مطلع کی طرح مقفّیٰ ہیں اور آخر کے تمام چھوٹے مصرعے بھی آپس میں مقفّیٰ کر دیئے گئے ہیں۔ پہلی غزل کی طرح اس کے پہلے مصرعے ہٹا کر بھی مفہوم پورا رہتا ہے لیکن اگر آخر کے زائد مصرعے بھی ہٹا دیئے جائیں تب بھی غزل کا ہر شعر مفہوم کے اعتبار سے مکمل رہتا ہے۔

میں نے جتنے بھی شعری تجربے کئے ہیں یا اصناف وضع کی ہیں ان میں جدت کے باوجود ہیئت کے اصولوں کو بھی پوری طرح اہمیت دی ہے۔ خود غزل میں بھی کئی طرح کے تجربے کئے ہیں جن کو ڈاکٹر فراز حامدی کی مرتبہ کتاب اسلم حنیف اردو زبان و ادب کا پہلا منفرد شاعر میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ یہاں بحث کو مختصر رکھنے کے لئے میں نے دیگر غزلیہ تجربات کی مثالوں کو قصداً نظر انداز کر دیا ہے۔

جہاں تک غزل نما کی اصطلاح کو وضع کرنے کا تعلق ہے اس کے سلسلے میں میں نے دوماہی گلبن (ستمبر تا اکتوبر 2000) کے شمارے میں دو موشح نما غزلوں کی اشاعت کے ساتھ اپنے نوٹ میں وضاحت کر دی تھی۔ مگر ان غزلوں کو علیم صبا نویدی نے اپنی گراں قدر تصنیف ''اردو شاعری میں نئے تجربے'' میں شامل کرتے ہوئے یہ تحریر کیا ہے کہ:

''موصوف نے اس صنف سے متعلق کسی طرح کی تفصیل نہیں پیش کی۔ البتہ انہوں نے اندلسی شاعری کے قدیم ترین تجربات میں پائے جانے والے بے پناہ تنوع کی طرف اشارہ کیا ہے، جو موجود آزاد نظم، نظم معریٰ اور نثری کے ناموں سے یاد کرتے ہیں یہ موشحات ہیں، جن کے ابتدائی نقوش عربی میں موجود ہیں۔ موصوف نے ان کی تفصیلات ماہنامہ صریر کراچی میں پڑھی ہوں گی۔'' صفحہ نمبر۔ 209

موصوف کو نوٹ کے مطالعہ میں سہو ہوا ہے۔ میں نے نوٹ میں جس مضمون کا حوالہ دیا تھا وہ مضمون میرا ہی تحریر کردہ ہے۔ اس مضمون میں ثابت کیا گیا ہے کہ مغرب میں بلینک ورس، فری ورس اور پروز پوئٹری کے تجربات سے کئی صدی قبل اندلس کے شعرا نے اس طرح کے تجربات موشح کے عنوان سے کئے تھے۔ اردو میں بھلے ہی یہ انگریزی شاعری کے حوالے سے معرض اظہار میں آئے ہوں گے۔ مگر ہمیں انہیں ان کی اصل اصطلاح کے ساتھ ہی لکھنا چاہئے یعنی معرا موشح، آزاد موشح اور نثری موشح۔ قطع نظر اس کے، عربی کے موشحات کے متنوع اور ہمہ رنگ تجربات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے جو غزل میں تجربے کئے ہیں ان کو بھی اسی اصطلاح سے موسوم کیا ہے تاکہ اردو میں باقاعدہ اور کثیر الہیئت صنف کا اضافہ کیا جاسکے۔

موشح نما غزل کے تمام تجربے قافیہ و آہنگ اور ہیئت کے اعتبار سے متنوع ہونے کے باوصف وزن و آہنگ میں یکسانیت کے بنیادی اصول پر مشتمل ہیں اور معنوی اعتبار سے ہر شعر مکمل ہے اس لئے ان تجربات کو غزل کے سخت گیر اصولوں سے ہم آہنگ ہیئت و فن کے جامع و نادر تجربات کی بحث سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔

آخر میں عرض کروں کہ آزاد غزل کی اصطلاح اگرچہ مظہر امام ہی کی وضع کردہ ہے یہ اصطلاح کی وضع کردہ ہیئت منطبق نہیں ہوتی، جب کہ میں جن ہیئتوں پر اس کا اطلاق کرتا ہوں اور اپنے مضامین میں اس کا جواز بھی پیش کر چکا ہوں، کے لئے اس اصطلاح کا استعمال بالکل مناسب اور درست ہے۔ ظہیر غازی پوری اگر غزل نما کی اصطلاح کو مستعار لینے اور اپنے تجربے پر مطابق کرنے کے فنی دلائل پیش کر دیتے تو شاید ان کے خلاف مناظر عاشق ہرگانوی کا ردعمل شدید نہ ہوتا اور بحث تجربے کے مستحسن اور غیر مستحسن ہونے تک محدود رہ جاتی۔ ■■

طنزیہ

کئی راز ہیں زیر شکم گاؤتکیہ

مظہر الزماں خاں

گاؤتکیہ کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کرسی کی، کیونکہ گاؤتکیہ اور کرسی ایک ہی وجود کے دو نام ہیں۔ دونوں سے ٹیک لگائے بیٹھنے والے پچھلی صدی میں بھی موجود تھے اور آج بھی موجود ہیں۔ ان کی پیٹھ سے گاؤتکیے کچھ اس قدر چپک گئے ہیں کہ وہ گاؤتکیہ کو چھوڑ سکتے ہیں اور نہ گاؤتکیے ان کی پیٹھ کو چھوڑ سکتے ہیں۔ گویا دونوں میں میاں بیوی کا سا رشتہ ہے اس کے علاوہ گاؤ تکیہ کی ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ رات میں گاؤتکیہ پیٹھ سے نکل کر دونوں رانوں کے درمیان پہنچ جاتے ہیں اور کچھ اس طرح بھینچے جاتے ہیں کہ جمہوریت خطرے میں دکھائی دیتی ہے جیسے آج۔ لیکن پھر صبح ہوتے ہی وہ اپنے اصل مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ بہر حال گاؤتکیہ ایک تاریخ ہے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ اب آئیے ہم یہاں ان کے اندر بسنے والی چیزوں کو پیش کریں اور یہ ساری چیزیں جو گاؤتکیہ کے پیٹ میں موجود ہیں وہ ہماری عوام ہیں اور عوام کا حال سیاست دانوں کا پیٹ ہی ہے جو بھرتا ہی نہیں۔

خیر، لیجئے اب محترم عزت مآب گاؤتکیہ صاحب کا باطن پیش خدمت ہے کہ اوپر سے 'کئی چاند تھے سرِ آسماں' کے مصداق باطن کی اصل تاریخ یعنی 'کئی پیوند ہیں زیر زمین' والا معاملہ ملاحظہ فرمائیں۔ سب سے پہلے ہم اس کے اوپر اوڑھی ہوئی سفید قبا کو اتارتے ہیں تو ہمارے ہاتھ سب سے پہلے جو لگتی ہے وہ ایک چمک دار مخملی کنٹوپ ہے جسے ہم اپنی دادی اماں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں کہ ہماری دادی اماں ایک ناقص مورخ کا کام انجام دینے کے لئے ہمارے سامنے چھالیہ کترتی ہوئی بیٹھی ہیں۔ لہٰذا ہم اس سوار اشہب دادی اماں کے سامنے کنٹوپ پیش کر دیتے ہیں تو وہ مسکراتے ہوئے ہماری طرف دیکھ کر کہتی ہیں۔ یہ تمہارے سکڑ دادا کے سر کا تاج ہے جو کہتے ہیں آج سے کئی برس پہلے اس گاؤتکیہ میں محفوظ کر دیا گیا تھا تاکہ سند رہے کہ تاج اسی طرح محفوظ کر دیئے جاتے ہیں۔ کیونکہ خواب جب جب کروٹیں لیتے ہیں تو تاج گاؤتکیوں کی زینت بن جاتے ہیں اور ان کی جگہ دکھائی نہ دینے والے تاج کنٹوپ حاصل کر لیتے ہیں اور آج کا عہد دکھائی نہ دینے والے کنٹوپوں کا عہد ہے تو تمام تاج گاؤتکیوں کے اندر اتر گئے ہیں اور تاج کا اندر اتر جانا زیادہ خطرناک بات ہے۔ بہر حال جو چیز سب سے پہلے ہمارے ہاتھ لگی وہ ہمارے سکڑ دادا کا تاج تھا۔

اب دیکھتے ہیں کہ دوسری مرتبہ ہمارے ہاتھ کیا چیز لگتی ہے۔ لیجئے دوسری بار جو چیز ہمارے ہاتھ آئی بقول ہماری دادی اماں ہماری پڑدادی کا لہنگا ہے۔ اس تعلق سے دادی اماں خاموش ہیں تو بھلا ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ ویسے ہم لہنگے یعنی پیٹی کوٹ کی تاریخ بھی لکھ سکتے ہیں کہ آج کل ایسی ہی تاریخوں کا دور ہے۔ ادب میں بھی ایسی تاریخی ناولوں کو پہلے آسمان پر رکھا جا رہا ہے کہ سر آسماں ایسے ہی چاند آج کل چمک رہے ہیں، کیونکہ ابرک کے سورجوں کا دور ہے۔ لہٰذا ہم یہاں لہنگوں کی تاریخ بیان نہیں کریں گے کہ ادب میں لہنگوں کی تاریخیں بہت بیان ہو چکی ہیں اور اب ان تاریخوں کو دھویا جانے لگا ہے۔ ادب میں کالی شلواروں کا ہجوم ہے جنہیں ہمارے عہد کے دانشور دھو رہے ہیں اور دھو دھو کر سکھا رہے ہیں اور سکھا سکھا کر دھو رہے ہیں۔

بہر حال ہم تیسری مرتبہ گاؤتکیہ میں ہاتھ ڈالتے ہیں جیسے قدیم ادب میں خاموش سرخا! اور اس مرتبہ جو چیز ہمارے ہاتھ لگتی ہے وہ بڑی عجیب و غریب ہے جسے ہم بس کھینچتے چلے جا رہے ہیں، جیسے کشمیر اور فلسطین کا مسئلہ، اور یہ سرخ نواڑ کی طرح باہر نکلتی ہی چلی جا رہی ہے اور جب پوری طرح باہر آ چکی ہے تو ہمارے قریب بیٹھی ہوئی دادی اماں ہمیں اس کی تاریخ بتا رہی ہیں۔ بچو یہ تمہارے پڑدادا کا ازار بند ہے وہ ہمیشہ سرخ ازار بند ہی استعمال کرتے تھے کیونکہ انھیں سرخی سے بڑی محبت تھی چنانچہ وہ سرخ قمیص، سرخ لنگی، سرخ ٹوپی اور سرخ چپل اور سرخ عورت.. ایک دن بے چارے سرخ گولی کا نشانہ بن گئے۔

یہ کہہ کر دادی اماں نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور پھر ہمارے ہاتھ کو دیکھنے لگیں اور اس مرتبہ جو نادر موتی ہمارے ہاتھ لگا وہ ہماری پڑپھوپی کا ننھا سا پائجامہ تھا ہلکے گلابی رنگ کا اور بقول دادی اماں ہماری یہ پھوپی آج بھی زندہ ہیں اور کئی جگہ سے دن میں کئی بار ملتی رہتی ہیں کہ رات میں ملنے کے دن اب لد گئے ہیں۔ چنانچہ مل مل کر انھوں نے اپنے پیٹ سے اپنے عہد میں پوری ایک بستی آباد کر دی ہے۔

اب ہمارا ہاتھ پھر گاؤ تکیہ میں گھومنے لگا کہ شاید کوئی نایاب چیز ہمارے ہاتھ لگ جائے لیکن اس مرتبہ جو چیز ہمارے ہاتھ آئی ہم نے اسے فوراً چھپالیا کہ کہیں دادی اماں کی نظر نہ پڑ جائے اور پھر انتہائی سرعت سے گاؤ تکیہ میں ہاتھ ڈال دیا۔ اور اب کی بار جو قیمتی شے برآمد ہوئی وہ مثلث تھی اور ہم حیرت سے اس مثلث چیز کو دیکھنے میں لگے ہوئے تھے کہ دادی اماں نے کہا یہ تمہارے چچا کی لنگوٹ ہے۔ اپنی جوانی میں وہ کثرت سے ورزش کیا کرتے تھے اور بالکل سانڈ کی طرح سارے محلّے میں دندناتے پھرتے تھے اور کسی خاتون کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے مگر خواتین آنکھیں مٹکا مٹکا کر ان کی طرف دیکھا کرتی تھیں۔

بہر حال ہم نے اس لنگوٹ کو ایک طرف رکھتے ہوئے پھر گاؤ تکیہ میں ہاتھ ڈال دیا اور دوسری چیز نکال کر دادی اماں کے سامنے پیش کردی تو انہوں نے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ بقول تمہارے دادا جان جو ہماری جان تھے یہ بڑے ابو کے عقیقہ کی شیروانی ہے جو شیرمال ہوگئی ہے اور یہ شیروانی تمہارے دادا جان نے اپنے دادا جان کے لئے بنوائی تھی اور اس پر ٹنکے ہوئے چمک دار بٹن تمہارے سکڑ دادا کے باپ کی نشانی ہیں کہ یہ بٹن نسل در نسل چلے آرہے ہیں۔ لیکن لگتا ہے کہ اب یہ سلسلہ ختم ہو چکا ہے کیونکہ اب رشتوں میں دراڑیں پیدا ہوگئی ہیں۔ قدریں ٹوٹ چکی ہیں۔ لہٰذا اب ان دراڑوں کو پاٹنے والے ہاتھ آج ہم میں باقی نہیں رہے اس لئے اب سارے رشتے، گاؤ تکیوں میں محفوظ کردیے گئے ہیں کہ گاؤ تکیہ ہمارے ملک کی تاریخ ہے اور اس تاریخ کے اندر بہت سے راز پوشیدہ ہیں۔ یہ کہہ کر دادی اماں نے ایک لج لجے پان کو اپنے پھوپلے منہ میں دباتے ہوئے کہا کہ ہمارا ملک بلکہ ہر ملک آج ہمارے پوپلے منہ کی طرح ہوگیا ہے اور اس کے عوام ہمارے مریل پان کی طرح ہوگئے ہیں۔ چنانچہ ہم نے گاؤ تکیہ سے برآمد ہوئی ایک اور چیز کو پیش کیا تو انہوں نے پیک کو اگالدان میں ڈالتے ہوئے کہا یہ تمہاری امی جان کی گرگی ہے۔

"گرگی کیا دادی اماں" ہم نے حیرت سے کہا تو وہ بولیں بیٹے دکنی زبان میں دونوں طرف سے سلے ہوئے پائجامہ کو گرگی کہتے ہیں اور ہم لوگ تو دکنی گرگیوں کے دور کے لوگ ہیں گو کہ ہمارے آباؤ اجداد افغانستان سے چلے آئے تھے اور دکن میں آکر گرگی ہوگئے بلکہ آج کل سب کے اندر گرگیاں ہی گرگیاں چھپی ہوئی ہیں کہ جمہوریت آج کل گرگیوں کے سیاسی کھیل کا ہی نام ہے۔ بدلتے جاؤ، پتہ نہیں چلتا کہ کس کی گرگی کون پہن چکا ہے۔ بہر حال ہم نے اپنی ممی کی گرگی کو نہایت احترام سے ایک طرف رکھ دیا اور پھر ہاتھ ڈال کر ریشم کی کوئی مہین چیز باہر کھینچ کر نکالی تو دادی اماں نے شرماتے ہوئے کہا کہ یہ میری شادی کی ساڑی ہے جو تمہارے دادا جان نے شادی کی پہلی عید کو تحفہ کے طور پر مجھے دی تھی کہ اس وقت ساڑی کا نیا دور شروع ہوا تھا۔ اس کے بعد ہمارا ہاتھ پھر گاؤ تکیہ میں داخل ہو کر جب برآمد ہوا تو دادی اماں نے کہا یہ تمہاری تائی اماں کی چولی ہے اور یہ یادگار چولی ان کی شادی میں دی گئی تھی چنانچہ تمہارے تایا نے اس چولی کی خاطر ہمارا گھر ہی چھوڑ دیا لیکن بیٹے ہمارے آج کے سماج میں بہت سے چولیوں کے مرید ہیں کہ چولی دامن کا ساتھ شاید اسی کو کہتے ہیں اور پھر اس کے ساتھ ہی ہم نے دادی اماں کے سامنے گاؤ تکیہ سے برآمد ہونے والی جو چیز ہماری مٹھی میں آگئی تھی پیش کردی تو وہ بولیں یہ تمہارے ابو جان کا نپل nipple ہے۔ وہ تقریباً دس سال تک نپل چوستے رہے جب کہ آج کی نسل 80 سال کی عمر میں بھی نپل کی عادی ہے کہ نپل کا دوسرا نام سیاست ہے۔

ہم نے پھر گاؤ تکیہ کے شکم میں ہاتھ ڈال کر جب باہر نکالا تو اس بار ہمارے ہاتھ کو کپڑے کا ایک بستہ لگا۔ چنانچہ ہم نے تعجب سے کہا "دادی اماں، یہ بستہ کس کا ہے" وہ بولیں یہ تمہارے چاچا جان کا بستہ ہے۔ وہ شاعر تھے اور اپنے اشعار اس بستے میں رکھتے تھے۔ دراصل انھیں ایک لڑکی سے پیار ہوگیا تھا اور اسی پیار نے انھیں شاعر بنا دیا تھا چونکہ وہ پتنگ اڑانے کے بڑے شوقین تھے اور اکثر اپنی پتنگ پر اپنی محبوبہ کو شعر لکھ لکھ کر اس کے گھر کی چھت پر پتنگ کو غوطہ لگاتے تھے۔ ان کی محبوبہ پتنگ پر لکھے ان کے شعر اپنے بارے میں پڑھ پڑھ کر خوش ہوتی تھیں اور اس کا جواب وہ اپنے گھر کے ملازم کے بچے کے ذریعہ بھیج دیا کرتی تھیں۔ چونکہ وہ شاعر تو تھی نہیں اس لیے کبھی کبھی فلمی گیت لکھ دیا کرتی تھیں۔ ایک فلمی گیت اب تک مجھے یاد ہے جو اس نے تمہارے چاچا جی کو لکھا تھا۔ گیت تھا "تمہارے سنگ میں بھی چلوں گی پیا جیسے پتنگ پیچھے ڈور..."

"ہوں!" ہم نے دادی اماں کی دھندلی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پھر گاؤ تکیہ کے اندر ہاتھ ڈالا لیکن اب کی بار ہمارا خالی خالی ہاتھ اداس اداس واپس چلا آیا تو ہم نے دادی اماں سے کہا لیجئے ایک تاریخ ختم ہوئی۔ ایک نسل غروب ہوئی کہ اب اس میں کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ دادی اماں نے دوسرے گاؤ تکیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا وہاں ایک اور تاریخ رکھی ہوئی ہے۔ اسے کھول کر پڑھو کہ اس میں بھی ایک مایوس نسل چھپی ہوئی ہے۔ ہم نے کہا بس اب رہنے دیجئے دادی اماں، ایک تاریخ کا یہ حال ہے تو پھر دوسری تاریخ کا حال کیا ہوگا۔ وہ بولیں، بچو پچھلی تاریخ کم از کم جیسی بھی تھی لیکن آج کی تاریخ کا تو نہ کوئی چہرہ موجود ہے اور نہ کوئی نشانی کہ وہ میلے کپڑوں کی گٹھڑی کی طرح ہو کر رہ گئی ہے!!! ■■

ہاؤس نمبر 18/2/77-9-4، یوسف ٹاکری ٹولی چوکی، حیدرآباد۔ 500 008

مصر کا بازار

حیدر طباطبائی

حضرت نوحؑ پیغمبر کے ایک بیٹے تھے 'مصر' جو شمالی افریقہ میں آباد ہوئے سو پہلے اس جگہ کا نام مصر ہوا پھر یہ مملکت مصر بنا اور شہرت اس عروج پر آئی کہ مصر کا ذکر قرآن کریم میں بھی آیا۔ فرعون کی حکومت اور حضرت یوسفؑ کی سلطنت کے باعث بڑی شہرت ہوئی۔ یہاں کی تہذیب اور تمدن اتنا بلند تھا کہ عرب، فارس اور ہند کے سوا یونان پر بھی مصری تہذیب کا اثر ہوا۔ یہاں فرعون کے مقابر جو، الاہرام یا پیرامیڈ کے نام سے مشہور ہیں یا مخروطی مینار پھر زیارت گاہیں، بہت مشہور ہیں۔ شہر قاہرہ یہاں کا پایہ تخت ہے۔ اب اس کی آبادی 77 لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ شہر میں کاریں اس قدر زیادہ ہیں کہ گھنٹوں ٹریفک جام رہتا ہے۔ پیغمبران کے بعد سلاطین کا دور آیا۔ سلطان محمد علی مصر کا بہت بڑا بادشاہ تھا جس کی خوبصورت اور بلند وبالا مسجد قاہرہ کے جنوب میں واقع ہے اور آج بھی اپنی عظمت کی داستان سنا رہی ہے۔ قاہرہ کے بازاروں میں گھوم گھوم کر میں پوچھتا رہا کہ حضرت یوسفؑ کہاں نیلام ہوئے تھے اور سب لوگ لاعلم پائے۔ عزیز مصر کا محل کہاں تھا کسی کو نہیں معلوم۔ پیرامیڈ جو عربی زبان میں الاہرام کہلاتے ہیں ان میں تین تو بڑے ہرم ہیں۔ اول کیوایس، جس میں فرعون کی لاش مومیائی ہوئی رکھی ہے۔ دوم کیفران۔ اس پیرامیڈ میں فرعون کی بیویوں کی لاشیں رکھی ہیں اور سوئم مبکراس۔ اس میں چھوٹے بچے جو مر گئے تھے ان کے جسد ہائے خاکی مومیا کر اس امید سے رکھے گئے تھے کہ یہ بھی زندانِ الحرام میں ہی زندہ و سلامت روی کے ساتھ اٹھ کر کھڑے ہو جائیں گے۔ ایک فرعون کا ولی عہد مر گیا تھا جس کا نام تھا اخسٹیل۔ اس کا ہرم بھی ہے اور لاش بھی ہے۔ ان مقابر کو مخروطی شکل میں اس قدر پختہ اور بلند بنایا گیا تھا آج قرنوں سال کے بعد بھی سلامت ہیں۔ مصر کے عہد قدیم میں ایک بادشاہ گزرا ہے طوطن خامن نام کا۔ اس کے عشق کے چرچے مشہور ہیں۔ اس کی خیالی تصویر کے لاکٹ بنوا کر لڑکے و لڑکیاں اپنے گلوں میں ڈالا کرتے ہیں۔

آج کا قاہرہ دنیا کے شہروں میں اپنی منفرد عظمت کا حامل ہے۔ قاہرہ ایرپورٹ لاس انجلیس ایرپورٹ سے بھی بڑا اور خوبصورت ہے۔ ایرپورٹ کے نزدیک ہی وہ فوجی ہیڈکوارٹر واقع ہے جہاں 6 اکتوبر 1973 کو ظالم اسرائیلی طیاروں نے بم باری کی تھی۔ جنگ سے چند دن پہلے ہیڈکوارٹر کو صدر ناصر کے حکم سے ہٹا لیا گیا تھا اور کیموفلاج کے طور پر وہاں لکڑی اور پلاسٹک کے ٹینک و طیارے رکھوا دئے گئے تھے۔ چنانچہ صیہونی بمباروں نے ان ہی کو ہدف بنایا۔ اس جنگ میں مصر کا سپریم کمانڈر فیلڈ مارشل عبدالحکیم عامر کو صیہونیوں نے خرید لیا تھا اس لئے جنگ کے آغاز کے ہی روز اس نے اپنے کو مار ڈالا تھا۔

آج بھی مصری عوام میں اسرائیل و امریکہ سے نفرت عروج پر ہے۔ قاہرہ شہر کے بازار بڑے زبردست ہیں۔ ان ہی بازاروں میں اللہ کے پیغمبر حضرت یوسفؑ نیلا ہوئے تھے۔ حضرت یوسفؑ نے اپنی دستگیری سے قبل جو خواب دیکھا تھا کہ چاند اور گیارہ ستاروں نے ان کو سجدہ کیا ان گیارہ ستاروں کے نام ہیں: طارق، ذوبان، ذیاک، ذوالکتفین، وتان، قابس، محمودان، فیلق، مصبح، صوح اور فروع یا سند۔

جب حضرت یوسفؑ نے یہ خواب دیکھا تو تعبیر یہ ہوئی کہ وہ مملکت مصر کے بادشاہ ہوں گے اور ان کی ماں باپ و تمام بھائی ان کے پاس آجائیں گے۔ حضرت یوسفؑ کی ماں کا نام راحیل تھا اور باپ جلیل القدر پیغمبر حضرت یعقوبؑ تھے۔ یوسفؑ کے جو گیارہ بھائی تھے وہی ان ستارگان کے نام تھے۔

آج بھی قاہرہ کی خیابانوں میں ان گیارہ ستاروں کو ایک جدول کی شکل میں بنا کر فال نکالی جاتی ہے اور ان گیارہ ستاروں پر لوگوں کے نام ہوتے ہیں۔ قاہرہ میں لباس کفش اور آرائش کے سامان خریدنے کے

لئے شارع قصرِ نیل بہت خوب ہے۔ اس خیابان کے آخر میں جامع اظہر کی مسجد اور مکتب آجاتے ہیں۔ مسجد دیدنی ہے۔ پورا جامع اظہر کسی بڑی یونیورسٹی سے کم نہیں ہے۔ کتاب خانہ اتنا بڑا ہے کہ حد نہیں۔ قلمی اور شائع شدہ، ملا کر تیس لاکھ سے زیادہ کتب موجود ہیں۔ ایک جانب فقہ جعفری کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ کتاب خانے کے ایک بہت بڑے ہال کا نام ہے 'باب نہج البلاغہ' ہے۔

جامع الاظہر کے روبرو راس الحسین ہے۔ اس کو مسجد الحسین بھی کہا جاتا ہے۔ ایک مصری روایت کے تحت کربلا کے خونی فاجعے کے بعد سرِ حسینؑ ابن علیؑ دمشق سے قاہرہ لایا گیا اور یہاں دفن ہوا۔ اس روایت سے شیعہ مذہب کو انکار ہے لیکن چونکہ نسبت حسینؑ ابن علیؑ سے تھی اس لئے میں اندر گیا۔ مسجد کی دائیں جانب ایک اُطاق میں روضہ ہے جہاں قبر مبارک بنی ہوئی ہے۔ لوگ بڑی عقیدت سے قرآن کی تلاوت و نمازیں پڑھ رہے تھے۔ راس الحسین سے پندرہ منٹ میں ٹیکسی نے بی بی نفیسہ کے حرم پہنچا دیا ہے۔ اہل بیت اطہار میں سے تھیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ بی بی نفیسہ امام رضاؑ کی خواہر تھیں دوسری یہ کہ امام حسنؑ کی پوتی تھیں۔ یہ مسجد اور روضہ بھی نہایت خوبصورت سفید۔سنگ مرمر سے تعمیر ہوا ہے۔ بی بی نفیسہ کے حرم سے کچھ فاصلے پر سلطان محمد علی کی بنوائی ہوئی مسجد ہے۔ یہ دنیا کی چند خوبصورت مساجد میں سے ایک ہے۔

وسط شہر قاہرہ میں حضرت امام شافعؒ کا مزار ہے جس سے متصل بہت اعلیٰ پائے کی مسجد ہے۔ شہر کے وسطی علاقے میں ہی مینار قاہرہ ہے جو مینار پاکستان سے بڑا ہے۔ مصریوں کا کہنا ہے کہ پیرس کے ایفل ٹاور اور دلی کے قطب مینار کے بعد یہ سب سے بلند ٹاور ہے۔ اس پر جانے کا ٹکٹ ہے اور لفٹ کل آٹھ منٹ میں اوپر لے جاتا ہے جہاں سے پورا قاہرہ ماچس کی ڈبیوں کے ڈھیر کی مانند نظر آتا ہے۔

الاہرام یعنی پیرامیڈ میں امریکی و اسرائیلی سیاحوں کا قتل ہو چکا ہے اس لئے وہاں سخت پہرا لگا تھا۔ پھر بھی یورپی و امریکی سیاحوں کا ہجوم تھا کیونکہ یہ عجوبہ دنیا ہے ہی ایسا۔ وسط قاہرہ میں ایک سڑک ہے کارنیشن اسٹریٹ۔ یہاں صدر جمال عبدالناصر اور صدر انور السادات کے خوشنما بنگلے بنے ہوئے ہیں۔ سامنے دریائے نیل اپنی آب و تاب سے رواں ہے۔ حسنی مبارک کے فرزند دلبند اب سرکار آچکے ہیں۔ ناصر کے لڑکوں کے پانی کے جہاز چلتے ہیں۔ سادات کے لڑکے اور انگریز بیوی مصر میں واردات و صادرات کی بہت بڑی تجارت میں مصروف ہیں۔

مصر میں غربت کا بول بالا ہے۔ سڑکوں پر گداگری عام بات ہے۔ ان بھیک مانگنے والوں میں دس گیارہ سال کی خوبصورت لڑکیاں بھی ہوتی ہیں۔ جوان لڑکے اور لڑکیاں بھوکے خاموش سڑکوں کے کنارے بیٹھے راہگیروں کا منہ تکا کرتے ہیں۔ مصر میں خواتین کی تعداد زیادہ ہے جن کو پوری آزادی ہے پھر بھی ایران کے اسلامی انقلاب کا اثر یہ ہوا کہ آج مصر کی نوے فی صد خواتین حجاب میں نظر آتی ہیں۔ دکانوں، ریستورانوں میں کام کرنے والی جوان حسین لڑکیاں ہوتی ہیں۔ مصری لڑکیاں قد بلند اور قبول صورت ہوتی ہیں جو ہندوستانی یا پاکستانی لڑکوں سے شادی کرنا پسند کرتی ہیں۔ شرط یہ ہوتی ہے کہ عربی زبان ضرور آنی چاہئے۔ جس ملک میں خواتین پر پابندی کم ہوتی ہے وہاں دیکھا گیا ہے کہ سڑکوں پر خواتین سے چھیڑ چھاڑ بھی کم ہوتی ہے۔ مصری معاشرہ بڑا پاک صاف ہے۔ فقط غربت ایک داغ کی مانند ہے۔ قاہرہ شہر سے عربی زبان کے چھ روزنامے اجرا ہوتے ہیں جن کے نام ہیں۔ الاہرام، الیوم المصر، الخبار، الفکر یا المصر۔ انگریزی زبان میں The News منتشر ہوتا ہے۔ مصر کا دوسرا بڑا شہر اسکندریہ ہے جہاں سے عربی زبان میں الجمہوریہ اور انگریزی زبان میں Egyption Gazette شائع ہوتا ہے۔

قاہرہ کے روزنامہ نگار حماد الحسن سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ مصر اس وقت ایک خاموش انقلاب سے گزر رہا ہے۔ لوگوں میں حسنی مبارک یا جمال مبارک سے نفرت بڑھ رہی ہے دوسری قیادت سامنے نہیں ہے ہر طرف فوج مسلط ہے جمہوریت کا نام و نشان نہیں ہے۔ مصر میں اب وہ لوگ خال، خال ہی رہ گئے ہیں جنہوں نے ملک فاروق کو دیکھا تھا۔ لیکن آج بھی مصری عوام کے دلوں میں ملک فاروق کا بڑا احترام ہے۔ ملک فاروق کی تصاویر دکانوں تک پر لگی ہیں ان کا نام تک احترام سے لیا جاتا ہے۔ جنرل نجیب کو لوگ کم جانتے ہیں ناصر کا بڑا احترام ہے۔ دوسرے درجے پر انور سادات کا احترام ہے۔ یہ خاموش انقلاب کب پختہ ہوگا کسی کو نہیں معلوم لیکن سرکار سے دشمنی عام پائی جاتی ہے۔

پانچ دن ہم قاہرہ میں رہ کر زمینی راستے سے ایک ٹیکسی کرائے کی لے کر اسکندریہ کے لئے چلے جو قاہرہ سے تین گھنٹے کے راستے پر ہے۔ راستے بھر زیتون کے باغات اور خرمے کے باغات خوشنما انداز میں دیکھنے میں آئے۔ سڑکوں پر دونوں جانب زیتون اور کھجوروں کے درخت لگے تھے جن کے پھل بھی توڑ کر کھائے۔ کھجوریں انواع و اقسام کی ہوتی ہیں۔

اس راستے میں دریائے نیل نے بھی پیچھا کیا۔ ایک جگہ نیل میں جزیرہ بنا ہوا ہے جہاں پام کے درختوں میں شہد کی مکھیوں کا چھتا ہوتا ہے اور اس قدر شہد کی مکھیوں کے چھتے کبھی نہیں دیکھے ان کی تعداد کئی لاکھ تھی انشااللہ خاں کا یہ شعر صادق آتا ہے:

اب درختوں پہ جتنے پتے ہیں شہد کی مکھیوں کے چھتے ہیں

یہاں کے سب سے بڑے ٹھیکے دار عامر بن خلیل تھے جو انگریزی خوب بول لیتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ دنیا کا بہترین شہد دریائے نیل کے ساحل پر ہوتا ہے۔ ان سے یہ شہد آسٹریلیا والے خرید کر لے جاتے ہیں اور آسٹریلیا کا بنا ہوا لیبل چپکا کر دنیا بھر میں فروخت کرتے ہیں۔ عامر بن خلیل نے ایک نہایت خوبصورت شیشے کی اچاری منگا کر ایک بہت بڑی شہد کی مکھی دکھائی اور کہا یہ مکھا ہے۔ اس کا نام ہے یعسوب۔ یعسوب کے معنی ہیں سردار۔ یہ صرف اپنی رانی سے ہی جنسی اختلاط کرتا ہے جس کے سرخ پر ہوتے ہیں۔ باقی اس کا کام یہ ہے کہ یہ شہد کے چھتے پر اوپر کی جانب بیٹھا رہتا ہے اور عام مکھیاں پھولوں یا پھلوں کا رس لاتی رہتی ہیں۔ یعسوب چھتے پر سے اتر کر وہ رس چاٹتا ہے۔ اگر کوئی مکھی زہریلے پھول یا کھٹے پھلوں کا رس لاتی ہے تو مکھیوں کا سردار یعسوب اسی وقت اس مکھی کا سر کاٹ کر الگ کر دیتا ہے۔ اسی لئے ہر چھتے کے نیچے سر کٹی ہوئی بہت سی مکھیاں پڑی ہوتی ہیں۔

عامر بن خلیل نے بتایا کہ نیا چھتا لگتے ہی ہم ان یعسوب کو چھوڑ دیں گے تاکہ پھر سے سرداری کریں اور خلاف قانون کرنے والوں کی گردن زدنی کریں۔ اتنے میں اشارہ کر کے ایک بہت خوبصورت سرخ پرندے کو دکھایا جو نیل کے وسط میں اڑ رہا تھا۔ یہ جوڑا تھا جو 'سرخاب' کہلاتا ہے۔ یہ پرندہ مور سے کچھ چھوٹا ہوتا ہے۔ بڑے، بڑے سرخ پر ہوتے ہیں جنھیں بادشاہ اپنے تاج کی زینت بڑھانے کے لئے تاج کے اوپر لگایا کرتے تھے۔ یہ آبی پرندہ ہوتا ہے، اس قدر سرخ کہ اس کے عکس سے پانی بھی سرخ ہو جاتا ہے۔ دن بھر سرخاب کے نر، مادہ ساتھ، ساتھ رہتے ہیں لیکن رات کو ان کے مقدر میں جدائی لکھی ہوتی ہے۔ شب فرقت ان کی پہچان ہے۔ رات کو نر دریا کے ایک کنارے پر چلا جاتا ہے۔ مادہ دوسرے کنارے سے تڑپ، تڑپ کر آوازیں دیا کرتی ہے اور صبح کی پہلی کرن کے ساتھ یہ پھر یکجا ہو جاتے ہیں۔

ان کی محبت یا اصالت کا امتحان یہ ہوتا ہے کہ دن میں ایک پرندے کو پکڑ کر آگ جلا کر اس میں ڈال دیں تو دوسرا پرندہ بھی آگ میں کود پڑتا ہے۔ ان میں قدرتی طور پر اگر ایک کو موت آجائے تو دوسرا اپنے آپ مر جاتا ہے۔ عامر بن خلیل نے بتایا کہ سرخاب کی مادہ کو عورتوں کی طرح سے ہر ماہ حیض آتا ہے اور جب مادہ پیٹ سے ہو جاتی ہے تو حیض بند ہو جاتا ہے اور تین ماہ بعد جب انڈا یا انڈے ہو جائیں تو پھر سے ماہواری جاری ہوتی ہے۔

کابل کے جنوب میں ایک چشمہ ہے جس کا پانی سرخ ہے اس پانی کو سرخاب یعنی سرخ رنگ کا آب کہتے ہیں۔ تبریز میں بھی سرخ مٹی کا ایک ٹیلہ ہے جو پہاڑ معلوم دیتا ہے اسی کا نام بھی سرخاب ہے۔ بقول شاعر:

کوئی شاخ آہوؤں کی جلوہ گری میں تو نہیں
کوئی سرخاب کا پر کبک دری میں تو نہیں

اسکندریہ کے راستے میں بہت بڑا سفاری پارک ہے جہاں شیر ببر اور دوسرے جانور بہت قریب سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ روبرو ایک ریستوراں ہے جہاں جالی کے پنجروں میں شیر موجود ہیں۔ اسکندریہ کو سکندر نے آباد کیا تھا۔ براعظم افریقہ کا بہت بڑا بحری مرکز تجارت ہے۔ یہ شہر بحر روم کے کنارے پر واقع ہے۔ اتنا خوبصورت کوئی بھی شہر یورپ میں نہیں ہے۔ شہر کے بیس میل کا ہلالی شکل کا علاقہ ساحلی علاقہ ہے جس کو کوسٹ لائن کہا جاتا ہے۔ ان بیس میل میں ساحل کے کنارے بیس سے پچاس منزلوں تک کی عمارتیں بنی ہوئی ہیں جو ہلکے زرد رنگ کی ہیں۔ اتنا صاف شفاف شہر ہے کہ لب ساحل دن بھر گھومتے رہنے کو دل چاہتا ہے۔

سمندر میں نہانا منع ہے کیونکہ یورپی خواتین نیم برہنہ ہو کر غسل لیتی ہیں اور گولی چل جاتی ہے کیونکہ منافی اسلام ہے۔ وسط ساحل پر ایک ریستوراں ہے بنام بلیغ۔ اس کے دو ٹرالر سمندر میں صید ماہی پر مامور ہیں۔ تازہ سمندری جانور آتے ہیں جن میں زیادہ تر مچھلی جھینگے اور کیکڑے وغیرہ ہوتے ہیں اور جنھیں آگ پر بھون کر زیتون کے تیل اور دیگر مسالوں کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

میں گیتی نوردی کے شوق میں ویسٹ انڈیز، میکسیکو، الاسکا، سنگاپور سب گھوم چکا ہوں لیکن مصر بہت پسند آیا۔ یہاں کے لوگ ملنسار مہمان نواز اور شریف النفس ہوتے ہیں۔ ٹیکسی والے چالبازی نہیں کرتے ٹھگی بالکل نہیں ہے۔ اسی لیے میر انشااللہ خان انشا نے قسمیں کھائیں تھیں کہ:

سونے کی گائے کی قسم اور نیل کی قسم
فرعون کی قسم تجھے ہامان کی قسم

باب الکتاب

کتب نما

رفیعہ شبنم عابدی
مشتاق صدف
کوثر مظہری
عبید صدیقی
جینت پرمار
شوکت حیات
منظور عثمانی
گگن بھارتی
عارف منصور
بلقیس ظفیر الحسن
خورشید اقبال
شاہد جمیل
محبوب محشر
خلیل مامون
عتیق اللہ
کرشنا مورتھی مڈی گونڈہ
گلزار
نسیم سہارنپوری
شارق عدیل
ستیہ پال آنند

کی کتابوں پر نصرت ظہیر کے تحریر کردہ سنجیدہ و نیم سنجیدہ تعارفی تبصرے

ضروری انتباہ: کتابوں کے مصنفین ان تبصروں کی ترتیب سے اپنا مقام و مرتبہ طے کرنے کی کوشش نہ فرمائیں۔ شکریہ!

تبصرہ

کلامِ راہی اور صنائع بدائع: محمد ادریس رضوی

مرزا خلیل احمد بیگ

راہی 1975 کے آس پاس بسلسلۂ ملازمت علی گڑھ میں مقیم تھے اور یہاں کے ادبی حلقوں میں ان کی خاصی پذیرائی ہوتی تھی۔ اُس زمانے میں علی گڑھ میں جہاں ایک طرف معین احسن جذبی، خورشید الاسلام اور اختر انصاری جیسے ترقی پسند شاعر موجود تھے وہیں خلیل الرحمٰن اعظمی، منیب الرحمٰن اور شہر یار جیسے جدید شاعر بھی تھے۔ راہی ذہنی اعتبار سے جدید شاعروں سے زیادہ قریب تھے اور انہی کے ساتھ ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ یہ زمانہ راہی کی شاعری کے عروج کا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ کچھ ہی عرصے کے بعد خلیل الرحمٰن اعظمی کا انتقال ہوگیا، منیب الرحمٰن امریکہ چلے گئے اور راہی نے بھی علی گڑھ چھوڑ دیا۔ بعد میں ان کے دو اور شعری مجموعے 'حرفِ مکرر' اور 'لاکلام' شائع ہوئے جن سے اردو شاعری میں ان کی حیثیت مسلّم ہوگئی اور ان کا شمار جدید غزل کے معماروں میں ہونے لگا۔

غلام مرتضیٰ راہی سے میری ملاقات علی گڑھ کی ہی ادبی و شعری محفلوں میں ہوئی، اور میں ان کی شخصیت اور شاعری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ میں نے ان کے مجموعۂ کلام 'لامکاں' کی اشاعت پر ان خیالات کا اظہار کیا :

''غلام مرتضیٰ راہی کا شعری اسلوب نہ صرف یہ کہ صوتی اور لفظی سطح پر، بلکہ نحوی سطح پر بھی ایک منفرد اسلوب ہے۔ راہی کے کلام کے لسانی تجزیے سے زبان و بیان کی بے شمار خوبیاں ہمارے سامنے آتی ہیں۔''

اور آج، ربع صدی گذر جانے کے بعد بھی میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ راہی کی شاعری میں بیان و اظہار کی وہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں جو ان کے اسلوبِ شعر کو انفرادیت بخشتی ہیں۔

محمد ادریس رضوی لائقِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے غلام مرتضیٰ راہی کے کلام میں پائے جانے والے صنائع و بدائع پر ایک مفصل کتاب موسوم بہ 'کلامِ راہی اور صنائع و بدائع' تصنیف کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ راہی کی شاعری نہ صرف 'گنجینۂ معنی' کے طلسم سے عبارت ہے، بلکہ زبان و بیان کی گوناگوں خوبیوں سے بھی متصف ہے۔ یہ کتاب کئی اجزا پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلے صنعت ہائے لفظی و معنوی بیان کی گئی ہیں، پھر تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور مجازِ مرسل وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد پیکر تراشی اور محاوروں کا ذکر ہے اور سب سے آخر میں شعری تعلّی پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے، اور ان سب کی توضیح میں راہی کے کلام سے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ اس ضمن میں مصنف کا طریقۂ کار یہ رہا ہے کہ پہلے وہ ایک صنعت یا شعری اصطلاح کا ذکر کرتے ہیں پھر اس کی شافی و کافی تعریف بیان کرتے ہیں اور مثال میں راہی کا وہ شعر پیش کرتے ہیں جس میں یہ صنعت استعمال کی گئی ہے۔ اکثر یہ بھی ہوا ہے کہ کسی صنعت کی تعریف بیان کرتے وقت اردو کے کسی کلاسیکی یا جدید شاعر کے کلام سے مثال پیش کی گئی ہے، پھر راہی کے شعر میں اس صنعت کی جلوہ گری دکھائی گئی ہے۔ اس طرح مصنف نے زیرِ تذکرہ کتاب میں راہی کے کلام کے ساتھ ساتھ ولی، میر، غالب، اقبال، دیا شنکر نسیم، احسان دانش وغیرہ کے بھی بہت سے اشعار نقل کر دیے ہیں۔

زیرِ تذکرہ کتاب اگرچہ راہی کی استعمال کردہ لفظی و معنوی صنعتوں اور بدیع و بیان کے مطالعے سے متعلق ہے، لیکن اس میں مصنف نے راہی کے بعض اشعار کے ضمن میں عروضی نکات سے بھی بحث کی ہے اور اشعار کی تقطیع بھی کی ہے جس سے مصنف کی دقتِ نظر اور بحور و اوزان سے گہری واقفیت کا پتا چلتا ہے۔ اسی طرح کتاب میں راہی کے اشعار کے حوالے سے بیان و بلاغت کے بعض نکات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔

محمد ادریس رضوی کا خیال ہے کہ لفظی و معنوی صنعتیں راہی کے کلام کی 'اضافی' خوبیاں ہیں جن سے راہی کے کلام کا حسن 'دوبالا' ہوگیا ہے (ص 29)۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے استعمال سے کلام میں حسن پیدا ہوجاتا ہے، لیکن یہ تمام چیزیں بنیادی طور پر شعری اسلوب سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کی شناخت و توضیح اسلوبیات کا میدان ہے۔ قدما کی ان اصطلاحات کو جو مشاہدات پر مبنی ہیں اسلوبیات سائنسی بنیاد عطا کرتی ہے اور انھیں اسلوبیاتی تدابیر (Stylistic devices) قرار دیتی ہے، اور شعر میں ان کی وقوع پذیری کو زبان کے ادبی و تخلیقی استعمال کا لازمہ بتاتی ہے۔ علاوہ ازیں ادب میں کام آنے والی زبان کی ہر سطح پر خواہ وہ صوتی سطح ہو یا صرفی، نحوی اور معنیاتی، زبان کے استعمال کی کچھ امتیازی شکلیں پائی جاتی ہیں (یہ شکلیں زبان کے خصوصی استعمال سے معرضِ وجود میں آتی ہیں) جنھیں ادبی

فن پارے کے اسلوبی خصائص (Style-features) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایک ماہر اسلوبیات کا کام ان خصائص کو نشان زد کرنا ہے۔ شاعری کی زبان عام بول چال کی زبان سے مختلف ہوتی ہے، اس لیے عام بول چال کی زبان میں ان خصائص کا فقدان ہوتا ہے۔ محمد ادریس رضوی کا اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے ایک ماہر اسلوبیات کی طرح زبان کی ہر سطح پر راہی کے کلام کے اسلوبی خصائص کو نشان زد کیا ہے۔

اسلوب شعر میں انفرادیت زبان کے نادر، انوکھے اور منفرد استعمال سے بھی پیدا ہوتی ہے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب زبان کے بندھے ٹکے اصولوں، مقررہ قاعدوں اور ضابطوں، نیز مروجہ نارم (Norm) سے انحراف کیا جائے جسے لسانی انحراف (Deviation from the linguistic norm) کہتے ہیں۔ علاوہ ازیں نحوی سطح پر الفاظ کے درمیان غیر منطقی ربط (Illogical connection) جو اگرچہ قواعد کی رو سے درست ہوتا ہے، جسے ہم معنیاتی عدم مطابقت (Semantic incompatibility) کہہ سکتے ہیں بھی بیان واظہار میں جدت اور اسلوب شعر میں انفرادیت کا باعث بنتا ہے۔

صبا اکرام کے اس شعر میں 'پانیوں' کا استعمال لسانی انحراف کی مثال ہے:

ہے اب تو خیر اسی میں کہ پانیوں میں رہو
کبھی جو سطح پہ آئے تو ڈوب جاؤ گے

اسی طرح مظفر حنفی کا درج ذیل شعر جس میں لفظ 'چاند' کے ساتھ فعل اُگنا کی تصریفی شکل 'اُگا' کا استعمال کیا گیا ہے، معنیاتی عدم مطابقت کی عمدہ مثال پیش کرتا ہے:

چاند اُگا ہے، پروا سنکی، چلنا ہے تو چل
مہکانے پھلواری من کی، چلنا ہے تو چل

ان دونوں مثالوں میں بیان واظہار کی ندرت وجدت اسلوب شعر کی انفرادیت کی ضامن ہے۔

راہی کے کلام میں لسانی انحراف کی مثالیں زیادہ نہیں پائی جاتیں، البتہ انھوں نے لفظوں کے غیر منطقی انسلاکات سے ضرور کام لیا ہے۔ وہ نحوی سطح پر دو ایسے الفاظ ترتیب دیتے ہیں جن میں قواعدی ربط تو ہوتا ہے، لیکن منطقی طور پر وہ ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہوتے، جیسے 'امواج' کا 'مگن ہونا' (مگن ہونا ایک انسانی جبلت ہے جسے غیر ذی روح شے کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے)۔ گویا معنیاتی عدم مطابقت سے راہی اپنے شعری اسلوب میں جدت وندرت اور انوکھا پن پیدا کرتے ہیں جس سے اُن کے بیان و اظہار کی انفرادیت کا پتا چلتا ہے۔ ان کے کلام سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

یہ کتاب کئی اجزا پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلے صنعت ہائے لفظی و معنوی بیان کی گئی ہیں، پھر تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور مجاز مرسل وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد پیکر تراشی اور محاوروں کا ذکر ہے اور سب سے آخر میں شعری تعلی پر اظہار خیال کیا گیا ہے، اور ان سب کی توضیح میں راہی کے کلام سے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ اس ضمن میں مصنف کا طریقۂ کار یہ رہا ہے کہ پہلے وہ ایک صنعت یاشعری اصطلاح کا ذکر کرتے ہیں پھر اس کی شافی و کافی تعریف بیان کرتے ہیں اور مثال میں راہی کا وہ شعر پیش کرتے ہیں جس میں یہ صنعت استعمال کی گئی ہے۔ اس طرح مصنف نے زیر تذکرہ کتاب میں راہی کے کلام کے ساتھ ساتھ ولی، میر، غالب، اقبال، دیا شنکر نسیم، احسان دانش وغیرہ کے بھی بہت سے اشعار نقل کردیے ہیں

سینے میں تڑپ ہے تو مزہ جینے کا
امواج کو دریا میں مگن دیکھتا ہوں

وہ ایک ضرب لگا کر نکل گیا اس پار
تڑپ کے رہ گیا دریائے نیل اپنی جگہ

اڑتی چنگاری پکڑلی پھول نے
اور دامن میں چھپا کر لے گیا

زندگی بھر میں سرابوں میں سفر کرتا رہا
ریت پر چلتے ہوئے ناؤ مری پار ہوئی

ستارے چاند سورج کہہ رہے ہیں
چلے آؤ جہاں تک روشنی ہے

کاری گری دکھا کے میں ہو جاؤں گا الگ
لڑتا رہے گا آخری پتا ہواؤں سے

مجھے قوی امید ہے کہ غلام مرتضیٰ راہی کے کلام کے اس قابل قدر مطالعے اور تجزیے کو علمی حلقوں میں بہ نظر تحسین دیکھا جائے گا اور نہ صرف اہل علم، بلکہ ادب کے عام قاری، تحقیق کار اور طالب علم بھی اس سے خاطر خواہ استفادہ کریں گے۔ (15 دسمبر 2008) ■■

تبصرہ

نہالِ دل پر سحاب جیسے: پروین شیر

رئیس الدین رئیس

کرچیاں کے بعد اب پروین شیر کا دوسرا شعری مجموعہ 'نہالِ دل پر سحاب جیسے' پہلے سے بھی زیادہ آب وتاب اور شان وشوکت سے عالمی منظرنامے پر رونق افروز ہوکر دونوں ہاتھوں سے تعریف وتوصیف کے خزانے سمیٹ رہا ہے۔

اس مجموعے کی کئی خصوصیات ہیں۔ عام مجموعوں کے برعکس یہ اپنے طول وعرض میں تقریباً سوا اور ایک فٹ لمبا چوڑا ہے۔ سفید پلاسٹک جیسے چکنے اس کے اوراق ہیں دلکش سرورق ہے اور خصوصی مستحکم ومضبوط جلد۔ دوسری انفرادیت اس کی یہ ہے کہ دائیں صفحات پر اردو منظومات ہیں تو اس کے بائیں صفحات پر ان نظموں کے انگریزی تراجم پیش کیے گئے ہیں۔ تیسری خوبی اس کی یہ ہے کہ یہ ایک باتصویر اور مصور مجموعہ ہے۔ چوتھی خاصیت اس کی یہ ہے کہ یہ تمام تصاویر پروین شیر کے ذوق مصوری کے جمال وکمال کا خوشگوار وشاندار مظاہرہ ہیں۔ اور اس مجموعے کی پانچویں خاصیت اور مخصوص انفرادیت یہ ہے کہ یہ ایک یک موضوعی مجموعہ ہے جس میں شامل سبھی آزاد نظموں (جو تعداد میں پچاس ہیں) کا ایک ہی موضوع ہے اور وہ موضوع ہے 'ماں'۔

کائنات کی جنم داتا ماں کی عظمت وفضیلت کا ذکر دنیا بھر کے زبان وادب میں بڑے ادب واحترام کے ساتھ ہوتا چلا آرہا ہے مگر ماں کو موضوع بنا کر پیش کرنے کا حوصلہ نہ کسی ادیب کو ہوا اور نہ ہی کسی شاعر کو۔ ویسے رفتگاں وگذشتگاں کا جن میں ماں بھی شامل ہے خراج عقیدت کے طور پر ان کی یاد میں اکا دکا نظمیں تعزیتی اسلوب میں کہہ کر چھپوالینا یا غزل میں ایک آدھ شعر ماں پر کہہ دینا تو عام بات رہی ہے لیکن ماں کے موضوع پر پچاس نظموں پر مبنی مجموعہ اجرا کرنے کی جرأت پہلی بار پروین شیر نے ہی دکھائی ہے۔

پروین شیر شاعرہ بھی ہیں مصور بھی اور موسیقار بھی۔ انھوں نے شاعری میں مصوری کی ہے اور مصوری میں شاعری۔ زبان وبیان پر ان کی مضبوط گرفت ہے۔ ان کا اسلوب نیا تخیل بلند لہجہ شستہ وشائستہ زبان نرم سبک جذبہ گہرا اور احساس شدت کی اثر انگیزی سے عبارت ہے۔ بقدر مزاج ومنہاج وہ عصر نو کی ایک جدت پسند شاعرہ ہیں۔ ان کی نظمیں یک موضوعی ہوتے ہوئے بھی تکرار، تکان اور یکسانیت ومجہولیت سے پاک وصاف ہیں جب کہ سبھی نظموں کا تعلق ان کی حقیقی ماں سے ہے جنھوں نے حال ہی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا ہے۔ ایسے میں اس بات کا پورا پورا خطرہ لاحق تھا کہ محدود موضوع کے محدود الفاظ بار بار نظموں میں آکر اکتاہٹ کا سبب بن جاتے۔ جذبات واحساسات کی یکسانیت نظموں کو بے مہری وبے اثری کی کھائی میں ڈھکیل سکتی تھی۔ مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا اور اس لئے نہیں ہوا کہ موصوفہ خلاقانہ اظہار کی جدید تکنیک اور خیال کی ترسیل کو نت نئے پیراہن عطا کرنے کے فن سے بہ احسن واقف ہیں۔

انھوں نے اپنی نظموں میں تازگی وتازہ کاری، رنگارنگی اور گہرائی وگیرائی پیدا کرنے کے لئے مناظر فطرت کو شخصیت کے خدوخال عطا کرکے مادی اشیا کی استعاراتی زبان میں اپنے جذبات واحساسات کو وسیلہ اظہار بنایا ہے۔ گویا ان کی تخلیقی توانائی بذات خود کرشمہ ساز ہوکر ایسے نئے نئے الفاظ میں ڈھل گئی ہے جو لغت میں نہیں ملتے۔ ان کی تمام نظمیں ماں سے عقیدت محبت اس کی عظمت، فضیلت اور اس کی سنہری خوشگوار اور مغموم یادوں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں۔ ان کا لہجہ حزنیہ ہے، ان کے الفاظ افسردگی اور اداسی کی شال میں لپٹے ہوئے ہیں جن کی موجودگی نے ان کی شاعری میں حزنیہ نغمگی پیدا کرکے ان کی نظموں میں بلا کی جاذبیت دل کشی اور دل پذیری کی کیفیت پیدا کردی ہے جو قاری کو فی الفور اپنی گرفت میں لے کر اسے اپنا ہم مزاج بنا لیتی ہے۔ ان نظموں کی ایک اور خوبی یہ بھی ہے کہ یہ ماں کی نوحہ خوانی، ماتم سرائی یا سینہ کوبی نہیں ہیں اور نہ ہی یہ کوئی ذاتی قسم کی سطحی جذبات کے دائرے میں قید ہیں۔ پروین کے شعری سفر کا آغاز بھلے ہی ذات سے شروع ہوتا ہو مگر یہ ان کی بلندیٔ فکر اور تخلیقی وتکنیکی نظام نیز لفظی دروبست کی ہنرمندانہ کارکردگی کے سبب کائنات سے اپنا رشتہ استوار کرہی لیتا ہے۔ ان کا طریق کار ہی یہ ہے کہ کبھی وہ ذات سے کائنات کی طرف تو کبھی کائنات سے ذات کی طرف پیش رفت کرکے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔

جذبات کو مناظر فطرت سے ہم آہنگ کرنا اوران کو تصویر میں ڈھالنے کے فن یعنی Scenario کو ان کی کتاب کے سرنامے نہال دل پر سحاب جیسے میں بھی محسوس کیا جاسکتا ہے اور مصورہ کی سرورق کی تصویر سے بھی۔ انہوں نے کتاب کے عنوان کا انگریزی میں جو ترجمہ کیا ہے اس کا اگر پھر سے اردو میں ترجمہ کیا جائے تو وہ تپتی زمین پر بارش کے چھینٹے یا قطرے ہوگا۔ یہ تپتی زمین دل ہے اور جو بادل سے برستے بارش کے قطرے ہیں وہ ماں اور ماں کے پیار کی علامت ہیں۔

ان کی پہلی نظم 'اے ماں' اگر چہ ایک ایسی نظم ہے جو دانہ، اونچا پیڑ اور سر کا آسمان پہنچنا جیسے استعاروں اور علامتوں کی زبان میں ایک بیٹی کی جذبات کی عکاسی کرتی ہے اور اعتراف بھی کرتی ہے کہ اس کی ماں نے ایک حقیر ذرے کو آفتاب بنانے میں کیا کچھ نہ کیا ہے۔ مگر اس کے نتیجے میں ان دونوں کے درمیان جواب فاصلے کی خلیج حائل ہوگئی ہے وہ بھی کسی المیے سے کم نہیں۔ قربت اگر خوشی کا باعث بنتی ہے تو قربت رنج والم اور درد وکرب کی غماز ہوتی ہے۔ یہ بات اس نظم میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ بخوف طوالت یہاں مکمل نظم پیش کرنا تو ممکن نہیں البتہ فاصلے اور ہجر وفراق کی کرب ناکی والم ناکی کا احساس دلانے کے لئے ان کی متذکرہ نظم کی آخری چند لائنیں بطور نمونہ از خروارے ذیل میں پیش کردینا ہی کافی ہوگا۔ ملاحظہ کیجئے:

اے ماں! میں تو ایک بے مایہ چھوٹا سا دانہ تھی
جس کو تو نے اونچا پیڑ بنا کر
اپنی شفقت سے پروان چڑھا کر
میرے سر کو آسمان تک پہنچایا ہے
اب میں اتنی دور ہوں تجھ سے
اپنا سر تیرے قدموں میں کیسے رکھوں؟

ان کی نظم 'طیارہ' بھی ایک ماں اور اس کے بچے کے ازلی وابدی تعلق کا ایک محکم شناخت نامہ ہے۔ اس نظم کا تکنیکی اور فنی اختصاص یہ ہے کہ اس میں معنویت کی ترسیل رنگارنگی، دبازت اور تعمق وتہہ داری پیدا کرنے کے لئے Organic Objects کو Personify کرکے نظم کے کرداروں کو ابھارا اور اجاگر کیا گیا ہے جس سے Scenario میں جو دھڑکن پیدا ہوئی ہے وہ قاری کے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہوکر اس پر ایک عجیب سی وجدانی کیفیت طاری کردیتی ہے۔ ایک اوبڑ کھابڑ زمین پر گرا ہوا طیارہ Stranded Aircraft ہے جو اڑان بھرنے کے لائق نہیں رہا ہے مگر وہ بچی زمین خود کو ایک Run Way میں تبدیل کرکے اس طیارے کو پھر سے

انہوں نے اپنی نظموں میں تازگی وتازہ کاری، رنگارنگی اور گہرائی وگیرائی پیدا کرنے کے لئے مناظر فطرت کو شخصیت کے خدوخال عطا کرکے مادی اشیا کی استعاراتی زبان میں اپنے جذبات واحساسات کو وسیلہ اظہار بنایا ہے۔ گویا ان کی تخلیقی توانائی بذات خود کرشمہ ساز ہوکر ایسے نئے نئے الفاظ میں ڈھل گئی ہے جو لغت میں نہیں ملتے

بادلوں کی دیوار کے اس پار اڑان بھرنے کے لائق بنادیتی ہے۔ ماں کو بچی زمین اور اس کے جگر کے ٹکڑے کو طیارہ کے طور پر مصور کرکے پروین نے جو Imagery پیش کی ہے وہ شاعری میں مصوری کا ایک بہترین نمونہ ہے۔

نظم بوڑھی بچی میں جہاں Nostalgia کا رویہ رکھا ہے وہیں انہوں نظم کی تعمیر وتنظیم میں Paradoxicals کا رویہ یعنی تضادات کی صفت سے بھی استفادہ کیا ہے۔ نظم کے ابتدائی حصے میں جب وہ وقت کی سوئی کو الٹا گھما کر اپنے بچپن کے دور میں چلی جاتی ہیں تو وہ ہمیں تتلیوں کے پیچھے بھاگنے والی ایک نٹ کھٹ بچی کے روپ میں نظر آتی ہیں مگر جب یادوں کی ڈور ٹوٹ جاتی ہے تو حال کا عفریت پھر سے انہیں اپنی باہوں میں جکڑ لیتا ہے اور تبھی انہیں یہ کرب ناک احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنی کائنات روپی ماں سے محروم ہوکر خود بھی اب عمر رسیدگی کے بھنور میں گرچکی ہیں۔ نظم کے کلائمکس پر مبنی آخر لائنیں ملاحظہ ہوں:

جب سے تم گئی ہو اس کو چھوڑ کر میری امی
وہ بچی سن رسیدہ ہوگئی ہے کچھ ہی دن میں

غرض کہ ماں کے موضوع پر ان کا یہ مجموعہ اپنی انفرادیت اور شعری محاسن کے سبب ایک یادگار تصنیف کا درجہ رکھتا ہے۔ ■■

صفحات: 208 قیمت: 1100 روپے، 60 امریکی ڈالر، 40 یورو

تقسیم کار: مکتبہ 'شعر وحکمت'، 2/659-3-6 ساجی گڈا، حیدرآباد، اے پی، انڈیا

کتاب سے ہونے والی آمدنی سے ضرورت مند ماؤں اور بچوں کی مدد کا اعلان

اس بسوط وبرحق تبصرے کے ساتھ یہ لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ماں کو موضوع بنا کر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں جو شاید تبصرہ نگار کے مطالعے میں نہیں آئیں۔ ان میں ایک پاکستان کے منفرد فکشن نگار محمد حامد سراج کی 'میّا' ہے جو انھوں نے اپنی والدہ کی رحلت پر کچھ ایسے دل سوز انداز میں تحریر کی کہ ان کا ذاتی غم دنیا کا غم بن جاتا ہے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ شعری مجموعوں میں پروین شیر صاحبہ کا یہ مجموعہ اپنی نوعیت کا پہلا شعری مجموعہ ہو۔ ادارہ

کتب نما

نصرت ظہیر

تعارفی تبصرے

ضروری انتباہ: کتابوں کے مصنفین ان تبصروں کی ترتیب کے مطابق اپنا مقام ومرتبہ طے کرنے کی کوشش نہ فرمائیں۔ شکریہ!

آنگن آنگن پروائی/نئی گھٹائیں اتر رہی ہیں

رفیعہ شبنم عابدی

اردو کی معتبر شاعرہ رفیعہ شبنم عابدی صاحبہ کے یہ دو شعری مجموعے اظہار خیال کی فرمائش کے ساتھ اس طرح موصول ہوئے ہیں کہ ایک مجموعے پر انہوں نے اظہار خیال کے ساتھ اس کے 'خوشگوار' ہونے کی امید بھی وابستہ کردی ہے۔ یعنی یہ کہ اظہار خیال کریں تو وہ خوش گوار بھی ہونا چاہیے۔ پڑھ کر اچھا نہیں لگا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اردو کے اچھے خاصے شہرت یافتہ اور تسلیم شدہ ادیب اپنی تنقید سننے سے اتنا گھبراتے کیوں ہیں۔ رفیعہ شبنم اردو کی جانی پہچانی ادیب ہیں۔ پچاس سال سے فکشن، شاعری اور تدریس کی دنیا میں سرگرم ہیں، دو یونی ورسٹیوں میں ان پر پی ایچ ڈی کا کام ہو رہا ہے، پانچ شعری مجموعے آچکے ہیں، دس تنقیدی کتابیں چھپ چکی ہیں، نصف درجن سے زائد کتابیں زیر طبع یا زیر تصنیف ہیں، فارسی، انگریزی اور مراٹھی سے اردو میں ترجمہ کر کے بھی 6 کتابیں شائع کرا چکی ہیں، ادبی سماجی اور تعلیمی کاموں کے لیے تقریباً دو درجن ایوارڈز سے نوازی گئی ہیں اور دیگر اعزازات ان کے علاوہ ہیں۔ اب اور کیا چاہیے؟ اتنا کچھ کرنے اور پا لینے کے بعد تو آدمی ویسے بھی توصیف و نکتہ چینی سے بے نیاز ہو جاتا ہے، کوئی تعریف کرے تو خاموش رہتا ہے اور تنقید کرے تو خندہ پیشانی سے اس کا خیر مقدم کرتا ہے کہ توصیف سے تنقید کہیں زیادہ کام آتی ہے اور اس کے قد کو بڑھاتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ خوشگوار اظہار خیال کی بات لکھتے وقت 'کتب نما' کے وہ تعارفی تبصرے رفیعہ صاحبہ کے ذہن میں رہے ہوں گے جن میں تحریر کو دل چسپ بنانے کے لیے صاحب کتاب سے چھیڑ چھاڑ کی گئی ہوگی۔ اس طرح کی تبصرہ نگاری چونکہ اردو کے ادبی رسالوں میں عام طور پر بالکل نہیں کی جاتی ہے اور ادیب حضرات ایسی تحریریں پڑھنے کے عادی نہیں ہیں اس لیے رفیعہ صاحبہ نے چھیڑ چھاڑ کو تنقیص، یا نکتہ چینی یا تضحیک سے تعبیر کیا ہوگا۔ ان سے پہلے اردو میں جمالیات کے تعلق سے بھرپور اور تاریخی نوعیت کا کام کرنے والے نقاد اور فلسفی پروفیسر شکیل الرحمٰن کو بھی یہ دھوکا ہو گیا تھا کہ راقم نے ان کا مذاق اڑایا ہے۔ آخر جب میں نے زبانی صفائی دی تب ان کا دل صاف ہوا۔ میں نے وضاحت کی کہ جناب اردو رسالوں میں روایتی خشک انداز میں لکھے گئے جو تنقیدی یا تعارفی تبصرے چھپتے ہیں انھیں صرف دو اشخاص پڑھتے ہیں۔ ایک وہ جو تبصرہ لکھتا ہے، اور دوسرا وہ جس پر تبصرہ ہوتا ہے۔ ایک تیسرا شخص بھی ہو سکتا ہے، کاتب یا کمپوزیٹر۔ مگر اس سے تبصرے کے مطالعے کی توقع اس لیے فضول ہے کہ یہ برادری متن کو پڑھے یا سمجھے بغیر لکھ لینے کی زبردست صلاحیت رکھتی ہے۔ چنانچہ میری کوشش رہتی ہے کہ تبصرے کو تھوڑا سا دل چسپ بھی بنا دیا جائے تاکہ کاتب نہ سہی، رسالے کا قاری تو اسے پڑھ لے۔ پروفیسر صاحب نے میری وضاحت کو قبول کیا اور پہلے سے زیادہ شفقت فرمانے لگے۔ ('ادب ساز' کا کوئی شمارہ ایسا نہیں جو میں نے انھیں رجسٹرڈ پوسٹ سے نہ بھیجا ہو اور جس کی قیمت انھوں نے بذریعہ منی آرڈر نہ بھیج دی ہو۔ یوں تین ساڑھے تین سو روپے بھیجنا کوئی بڑی بات نہ ان کے لیے ہے نہ 'ادب ساز' کے لیے، لیکن اس شفقت اور سرپرستی سے جو حوصلہ ملتا ہے اس کی قیمت لاکھوں روپوں میں بھی ادا نہیں کی جا سکتی)

رفیعہ صاحبہ نے اگر 'کتب نما' کے آدھے تبصرے بھی پڑھ لیے ہوتے تو انھیں اندازہ ہو جاتا کہ ان میں کبھی کوئی بات دل کو دکھانے والی نہیں لکھی جاتی۔ اور تحریر کو دل چسپ بنانے کے لیے قلم کو اتنا بے لگام بھی نہیں کر دیا جاتا جتنا مرحوم مشفق خواجہ کبھی کبھی کر دیا کرتے تھے اور دل لگی دل آزاری بن جاتی تھی۔ جو بھی لکھا دل سے لکھا۔ محبت اور خلوص کے ساتھ لکھا۔ اور مکمل دیانت داری اور بے تعصبی سے لکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک کا سب سے سخت تعارفی تبصرہ مشہور شاعر جناب غلام مرتضیٰ راہی کی خود نوشت سوانح 'راہی کی سرگزشت' پر جب لکھا گیا تو مصنف نے لائق تقلید کشادہ قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے راقم کو نہ صرف مبارک باد دی بلکہ یہ بھی کہا کہ وہ تبصرے میں لکھی گئی باتوں

سے عدم اتفاق کے باوجود مبصر کی آزادیٔ رائے کا احترام کرتے ہیں۔
'ادب ساز' ادبی صحافت میں اسی طرح کی شفافیت اور معروضیت کو فروغ دینا چاہتا ہے اور اسی جذبے کے تحت اب میں یہ لکھنے پر مجبور ہوں کہ چاہ کر بھی میں رفیعہ شبنم صاحبہ کی دونوں کتابوں میں ایسی کوئی خاص بات نہیں ڈھونڈ پایا ہوں جس کا ذکر انھیں ناخوشگوار لگ سکتا ہو۔
'آنگن آنگن پروائی' میں سب سے قیمتی صفحات میرے خیال سے وہ ہیں جو 'پروائیاں چلیں' کے عنوان سے خود رفیعہ شبنم نے تحریر کیے ہیں۔ نثر ہو یا نظم انھیں دونوں پر قدرت حاصل ہے۔ یہ صفحات اسی کے گواہ ہیں۔ شاعری کے تعلق سے اپنے احساسات وخیالات کو انھوں نے پراثر انداز میں بیان کیا ہے۔ ترقی پسندی سے بےزاری اور اپنی شاعری پر مکمل اطمینان کے تعلق سے ان کی کچھ باتوں پر اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی سنجیدگی، دردمندی اور اس ایماندارانہ اعتراف کی ستائش کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ ان کی ابتدائی رہنمائی ترقی پسند تحریک نے ہی کی تھی جس سے آج وہ اس مقام تک پہنچی ہیں۔ اس مجموعے کی اکثر غزلیں اور دوسرے مجموعے 'نئی گھٹائیں اتر رہی ہیں' کی بیشتر نظمیں اس کی گواہ ہیں۔ ذاتی، سماجی اور انسانی سروکار ان کی فکر پر پوری طرح حاوی ہیں اور وہ معاشرے سے کٹ کر صرف ذاتی کرب کے خول میں مقید رہنے کی قائل نہیں ہیں۔ دوسرے مجموعے میں جو صرف نظموں پر مشتمل ہے انھوں نے آزادیٔ نسواں اور اس کائنات کے نصف یعنی عورت کے دکھ درد کے حق میں مرد تسلط سماج کے خلاف کھل کر احتجاج کیا ہے۔ اور اچھی بات یہ ہے کہ کسی قسم کی نعرہ بازی یا خطیبانہ لہجے کے بغیر شاعری کی جمالیاتی قدروں کو بروئے کار لانے کی کوشش کے ساتھ کیا ہے۔
یہاں ان کے منتخب اشعار اور نظموں کے اقتباسات نقل کرنے سے صرف اس تحریر کی طوالت بڑھے گی لہٰذا اس مشورے کے ساتھ یہ تعارف مکمل کرتا ہوں کہ دونوں کتابیں کہیں سے حاصل کریں اور انھیں پڑھ کر رفیعہ شبنم کی شعری کائنات کے سفر پر نکل جائیں۔

آنگن آنگن پروائی
صفحات:168؛ **قیمت**:150 روپے
ناشر: تخلیق کار پبلشرز، 104/B آئی بلاک لکشمی نگر، دہلی۔ 110092

نئی گھٹائیں اتر رہی ہیں
صفحات:144؛ **قیمت**:150 روپے
تقسیم کار: بھیونڈی بک ایجنسی بھنڈی بازار ممبئی۔ 400003

دیکھنا تقریر کی لذت/مشتاق صدف

اصولاً یہاں مجھے ساہتیہ اکادمی کے پروگرام آفیسر مشتاق صدف کی جگہ گوپی چند نارنگ صاحب کا نام لکھنا چاہیے تھا کیونکہ چھ سو سے زائد صفحات کی اس کتاب میں سخن سارے کا سارا ان ہی کا ہے۔ صرف 13 صفحات ہیں جن میں سے دو خلیل مامون نے پیش لفظ کے طور پر لکھے ہیں اور گیارہ صفحات میں جناب مشتاق صدف نے نارنگ صاحب پر 'مقدمہ' چلایا ہے۔ اردو والوں میں، بلکہ اردو کیا باقی زبانوں کے ادیبوں میں بھی یہ بڑا عجیب رواج ہے کہ کام کسی کا ہوتا ہے اور اس پر نام کا ٹھپہ کوئی اور لگا دیتا ہے۔ سیمینار میں پندرہ ادیب مقالے پڑھتے ہیں مگر سولھواں ادیب چپکے سے مقالوں کا بنڈل پریس میں بھیج کر مجموعے کا مولف، مرتب، یا ایڈیٹر بن جاتا ہے اور تعارف نامے میں اپنی تحریر کردہ کتابوں کی تعداد ایک عدد بڑھا دیتا ہے۔ ہماری اکادمیوں کی الماریاں اسی طرح کی سیمیناری کتابوں سے آباد ہیں جن پر مولف، مرتب یا ایڈیٹر کی حیثیت سے اصولاً کاتب یا کمپوزیٹر کا نام چھاپا جانا چاہیے کہ ان کاموں میں سب سے زیادہ محنت اسی کی ہوتی ہے۔
مگر خیر، ڈاکٹر مشتاق صدف بھی کیا کریں۔ ان سے پہلے کے تمام سینیئرز یہی سب کرتے آرہے ہیں۔ انھوں نے پھر بھی کتاب کی ترتیب میں خاصی محنت کی ہے۔ اردو کے پی ایچ ڈی ہونے کے باوجود کافی پڑھے لکھے اور بڑے قاعدے کے آدمی ہیں۔ ادبی نقد ونظر میں ابھی سے کمال دکھانے لگے ہیں۔ مقدمے میں یہ اشارہ انھوں نے بڑے کام کا کیا ہے کہ ''ادب میں انٹرویو اتنا ہی اہم ہے جتنی کہ تحریر۔'' اور اگر انٹرویو گوپی چند نارنگ کا ہو تو وہ تحریر سے بڑا ہو جاتا ہے۔ صدف نے اسے بڑے مزے کا نام دیا ہے۔۔۔ 'مکالماتی ادب'۔ اور شکر ادا کیا ہے کہ اہل فکر ونظر مشرق کے مکالماتی ادب پر توجہ دینے لگے ہیں۔ نارنگ صاحب کے تعلق سے مکالماتی ادب کی اس اصطلاح کو، جو پہلی بار میرے پڑھنے میں آئی ہے، یوں بھی وسعت دی جاسکتی ہے کہ اگر ان کی تقریریں اور خطاب کتابی شکل میں جمع کر لیے جائیں تو یہ متن بھی ادب کا ایک اعلیٰ نمونہ کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔ ڈاکٹر صدف نے درست لکھا ہے کہ: ''نارنگ صاحب بات چیت یا تقریر کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک لڑی میں پروئی ہوئی زبان ان سے ادا ہو رہی ہے۔ پرکشش لب ولہجہ، طلسماتی انداز گفتگو، چہرے کا اتار چڑھاؤ، لفظوں کی ترتیب وتنظیم، جملوں کی ساخت اور خیالات کی فراوانی ایسی جیسے دریا رواں دواں ہے۔۔۔''

اردو کے نابغۂ روزگار فلسفی ادیب اور دانشور نقاد، پدم بھوشن پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ادبی مکالمات پر مشتمل یہ ضخیم کتاب اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ اس میں وہ تمام انٹرویو یک جا کردیے گئے ہیں جو نارنگ صاحب نے نصف صدی سے زائد عرصے پر محیط اپنی ادبی زندگی میں ہندوستان، پاکستان اور دیگر ممالک میں ادبی صحافیوں، رسائل وجرائد اور اخبارات کو دیے ہیں۔

نارنگ صاحب تحریر اور تقریر دونوں کے استاد ہیں اور ہر چند کہ انھوں نے تخلیقی دعوے کبھی نہیں کیے، لیکن اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کا جو اُن کا تحریری اور تقریری اسلوب ہے وہ تمام کا تمام تخلیقیت سے پُر ہے۔ اپنے مافی الضمیر کو موزوں ترین الفاظ کے انتخاب سے مخاطب کے دل ودماغ میں اتار دینے، لفظوں کے انتخاب میں حسن وتاثر کی جمالیات کو ملحوظ رکھنے اور متعلقہ موضوع سے ادھر اُدھر بھٹکے بغیر آس پاس کے تمام عناصر کو دل نشیں انداز میں اپنے بیان کا حصہ بنالینے کا جو تخلیقی ہنر انھیں آتا ہے وہ اردو کے کئی بڑے تخلیق کاروں کو بھی نصیب نہیں۔ اردو ادب کو بہت کم ایسے نقاد نصیب ہوئے ہیں جن کی تحریر وتقریر میں تخلیقیت کا لطف ملتا ہو اور جنھیں نقد ونظر کی جستجو سے قطع نظر، محض مطالعاتی لطف وانبساط کی خاطر بھی پڑھا اور سنا جاتا ہو۔ مرحومین میں مولانا عبدالماجد دریابادی، ظ انصاری اور مشفق خواجہ اور معاصرین میں وارث کرمانی اور کچھ حد تک مظفر حنفی کی تنقیدی تحریروں میں بھی ایک طرح کا تخلیقی حسن پایا جاتا ہے۔ تاہم گوپی چند نارنگ کی خصوصیت یہ ہے کہ تحریر کے علاوہ ان کی تقریر بھی تخلیقی حسن کی حامل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی وہ کسی ادبی اجتماع سے مخاطب ہوتے ہیں تو تمام مجمع انھیں مکمل توجہ اور دل چسپی کے ساتھ سنتا ہے۔ تقریر کا یہی لطف بہت حد تک اس کتاب میں شامل کیے گئے انٹرویوز میں بھی موجود ہے۔ انٹرویو لینے والی شخصیت خواہ انتظار حسین اور عطاالحق قاسمی جیسے فکشن نگار کی ہو، یا آصف فرخی، ابوالکلام قاسمی اور شافع قدوائی جیسے صائب الرائے ادیبوں اور ناقدین فن کی، یا پھر یوگیندر بالی اور منجولا لال جیسے انگریزی کے نامور صحافیوں کی، نارنگ صاحب نے ہر انٹرویو میں سوالوں کے جواب ممکنہ شفافیت اور وضاحت کے ساتھ لیکن دل نشیں پیرائے میں ہی دیے ہیں۔

لیکن بات صرف اسلوب کی نہیں، معلومات کی بھی ہے۔ یہ سبھی انٹرویو ہمیں اردو ادب کی مختلف تحریکوں، رویّوں اور تخلیقی وتنقیدی مسئلوں سے تو واقف کراتے ہی ہیں، زبان وادب کے پرانے اور نئے منظر ناموں کو بھی سامنے لاتے ہیں اور عالمی ومقامی نوعیت کی ثقافتی، تہذیبی اور فنی وفکری تبدیلیوں کے بارے میں بھی ہماری معلومات بڑھاتے ہیں۔

کتاب چار حصوں میں منقسم ہے۔ 'حصہ اول' میں پاکستانی اخبارات ورسائل میں شائع ہونے والے 14 انٹرویو ہیں۔ ان میں اختر امان کی وہ دل چسپ مکالماتی تحریر بھی شامل ہے جو 'ڈاکٹر گوپی چند نارنگ — آدھا مسلمان؟' کے عنوان سے 'نوائے وقت' (راولپنڈی) میں شائع ہوئی تھی۔ 'حصہ دوم' میں برطانیہ، امریکہ، کینیڈا اور ناروے کے اخبارات ورسائل میں چھپنے والے 6 انٹرویو شامل کیے گئے ہیں۔ 'حصہ سوم' کتاب کا طویل ترباب ہے اور یہ 18 انٹرویوز پر مشتمل ہے۔ ان میں 'گوپی چند نارنگ سے پریم کمار کی گفتگو' (مہتاب حیدر نقوی) 'نئی سوچ نئے مباحث' (ابوالکلام قاسمی شافع قدوائی) اور 'فنی دست رس کے بغیر ادبی نروان نہیں' (ابرار رحمانی، احمد صغیر) اہم انٹرویو ہیں جن کا مطالعہ اردو ادب کے ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے۔ ایک اور اہم انٹرویو، جس کے بارے میں خود نارنگ صاحب نے کہا تھا کہ ہندوستان میں یہ میرا اب تک کا سب سے اچھا اور جامع انٹرویو ہے، راقم السطور نے 2005 میں کیا تھا۔ 'گوپی چند نارنگ سے سات سوال' کے عنوان سے سب سے پہلے 'ادب ساز' میں شائع ہونے والے اس انٹرویو کے ساتھ ایک ناانصافی یہ ہوئی ہے کہ اس کے ساتھ ماہنامہ 'انشا' کے ضخیم 'گوپی چند نارنگ نمبر' کا حوالہ دیا گیا ہے (امید ہے آئندہ ایڈیشن میں مشتاق صدف اس سہو کا ازالہ فرمادیں گے) اس انٹرویو کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں اردو زبان وادب کا ہی نہیں بلکہ عالمی ادب، ہندوستانی ادب، بدلتے ہوئے تہذیبی وثقافتی رویوں اور عالمی رجحانات پر بھی نارنگ صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

چوتھا باب یعنی 'حصہ چہارم' پاکستان اور ہندوستان کے انگریزی اخباروں اور رسالوں میں چھاپے گئے 10 انٹرویوز پر مشتمل ہے۔ ان میں 'ہندوستان میں اردو Urdu In India' کے عنوان سے تحریر کیا گیا اجتماعی مصاحبہ ایک یادگار انٹرویو ہے جس میں نارنگ صاحب سے سوالات کرنے والوں میں ڈاکٹر وزیر آغا، انتظار حسین، پروفیسر شہرت بخاری، ڈاکٹر آغا سہیل، پروفیسر رضی عابدی، جاوید شاہین، حسن رضوی، جمیلہ ہاشمی، ریاض انور اور سلمان شاہد جیسی ہستیاں شامل تھیں۔ ڈاکٹر مشتاق صدف نے جو مقدمہ اس کتاب کے لیے تحریر کیا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ اس میں انھوں نے نہ صرف انٹرویو کی اہمیت پر بات کی ہے بلکہ نارنگ صاحب کی خطابت کے اوصاف کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے۔

صفحات: 606، قیمت: 450 روپے

ناشر: کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور

منٹو شناسی اور شکیل الرحمٰن/ کوثر مظہری

جو کیا مشتاق صدف نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ساتھ، وہی کیا ان سے بھی پہلے کوثر مظہری نے پروفیسر شکیل الرحمٰن کے ساتھ۔ تین سو سے ذرا کم صفحوں کی کتاب میں سب سے قیمتی سوا سو صفحے شکیل الرحمٰن صاحب کے تحریر کردہ ہیں، باقی کے صفحوں میں شکیل صاحب کی دو مرتبہ چھپ کر آؤٹ آف پرنٹ ہو جانے والی کتاب 'منٹو شناسی' پر 16 پختہ و نیم پختہ ادیبوں کے تبصرے ہیں اور ان ہی میں ایک چھ صفحاتی تبصرہ کوثر مظہری صاحب کا ہے جسے 'مقدمہ' کے عنوان سے کتاب کے شروع میں رکھ کر وہ بھی کتاب کے مرتب بن گئے ہیں۔ خیر صاحب، وہ جانیں اور ان کا کام۔ 'منٹو شناسی' پر جن قلم کاروں کے تبصرے اس 'تیسرے ایڈیشن' میں طبع کیے گیے ان میں، یوسف سرمست، پروفیسر افتخار اجمل شاہین، بلراج کومل، اظہار خضر، ڈاکٹر شاہد حسین، اے خیام، خورشید ملک، ذکاالدین شایاں، مشتاق احمد نوری، شرجیل احمد خاں، اقبال انصاری، حقانی القاسمی، مشرف عالم ذوقی، جمال اویسی اور راشد انور راشد شامل ہیں، اور یہ بھی حضرات اس کتاب کے مرتب ہو سکتے تھے۔

اردو میں ادیب بہت گزرے ہیں اور انشا اللہ تب تک گزرتے رہیں گے جب تک اردو ادب خود گئی گزری چیز نہیں بن جاتا۔ جن ادیبوں کے نام سے ہم آپ، سب آشنا ہیں ان میں بہت کم ایسے ہیں جنھوں نے اردو ادب کو واقعی کچھ نہ کچھ دیا ہے۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن ان ہی میں سے ایک ہیں، جن کا اردو ادب ہمیشہ مقروض رہے گا۔ خاص طور سے اردو ادب میں جمالیات کے موضوع پر جب بھی بات ہوگی اور اس کی تخلیقی معنویت کو ہندوستان کی تہذیبی جڑوں میں ڈھونڈنے کی جب بھی کوشش کی جائے گی تو پروفیسر شکیل الرحمٰن ضرور راستے میں ملیں گے اور ان کی رہنمائی کے بغیر ایسی کوئی جستجو کوئی تلاش اپنی منزل کو نہیں پہنچ پائے گی۔ اس ضمن میں اردو کے پورے تنقیدی ادب میں، شکیل الرحمٰن کا کوئی نعم البدل نہ تو ہے نہ شائد کبھی پیدا ہوگا، یہ بات 'ادب ساز' میں پہلے بھی لکھی جا چکی ہے۔

'منٹو شناسی' منٹو کے تحریر کردہ 16 افسانوں کے تعلق سے پروفیسر صاحب کے لکھے ہوئے تجزیاتی مضامین پر مشتمل ہے۔ ان میں ٹوبا ٹیک سنگھ، بابو گوپی ناتھ، بو، ہتک، ممی، سر کنڈوں کے پیچھے، موذیل، خوشیا، سہائے، کھول دو، شاردا، شاہ دولے کا چوہا، ٹھنڈا گوشت، سرمہ، ممد بھائی، بیگس، شامل ہیں (کالی شلوار، کو پتہ نہیں کیوں چھوڑ دیا گیا، اور کوثر مظہری سے گنتی میں نہ جانے کیوں غلطی ہوئی کہ سولہ کہانیوں کو اپنے مقدمے میں پندرہ لکھ دیا ہے)۔ مرتب نے درست لکھا ہے کہ پروفیسر شکیل الرحمٰن کی تحریروں میں اکتاہٹ کی بجائے redability ہے۔ اردو کے، بلکہ کسی بھی زبان کے ایک سو نقادوں میں مشکل سے کوئی ایک ملے گا جسے پڑھنے کو عام قاری کا جی چاہے گا۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن، دو ڈھائی انگلیوں پر گنے جانے والے اردو کے ایسے ہی نقادوں میں ایک ہیں جن کی تنقیدی تحریروں میں بھی بلا کی تخلیقیت پائی جاتی ہے۔ آپ نے ٹوبا ٹیک سنگھ پر کئی نقادوں کی تحریر پڑھی ہوں گی۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن کی یہ تحریریں بھی پڑھیے:

''.... تقسیم ہند (کی) ٹریجڈی کا سب سے اہم عنوان سعادت حسن منٹو کا افسانہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' ہے۔ زندگی کی کوکھ سے رشتہ رکھنے والا افسانہ نگار ہی ایسا افسانہ خلق کر سکتا تھا... منٹو نے ٹوبا ٹیک سنگھ کو (افسانے میں) ایک درخت کی مانند کھڑا رکھا کہ اس کی جڑیں اپنی زمین میں پیوست ہیں اور درخت وہیں گرتا ہے کہ جہاں کھڑا ہوتا ہے۔ اپنی مٹی سے رشتے کی یہ کہانی جانے کتنی سرگوشیاں کرتی ہے، کیا درخت اپنی مٹی سے الگ ہو کر زندہ رہ سکتا ہے!

یہ افسانہ ٹریجڈی کو ایک سوالیہ نشان بنا کر سامنے رکھ دیتا ہے۔''

'بو' پر لکھے گیے مضمون کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

''کہا جاتا ہے گوتم بدھ جب کسی جنگل سے گزرتے درختوں پر بہار آنے لگتی، ایسا ہوتا تھا، کوئی معجزہ نہیں تھا، یہ پھول کوئی دیکھتا نہ تھا، اس لیے کہ پھولوں کی صورتیں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔

دراصل تمام پھول
درختوں کے احساسات ہوتے!!

ہر درخت میں حرکت سی پیدا ہو جاتی، درختوں کی حرکت مختلف ہوتی، اسی طرح جب کوئی بڑا تخلیقی فنکار انسانوں کے جنگل سے گزرتا ہے تو درختوں پر اسی نوعیت کے پھول آنے لگتے ہیں۔ ہر درخت ایک پیکر کی صورت اپنے تحرک کا احساس دلاتا ہے...''

ان تحریروں سے پروفیسر شکیل الرحمٰن کے وسیع و عمیق مطالعے اور ادب و زندگی کی گہری سمجھ کا ہی نہیں ان کی تخلیقی صلاحیت و بصیرت کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں آئندہ جب بھی منٹو کی تفہیم کسی کا موضوع بنے گی، پروفیسر شکیل الرحمٰن کی یہ تحریریں یقیناً اس کی راہ روشن کریں گی۔

آخر میں صرف ایک بات کہ کتاب کو ترتیب دیتے وقت اگر اس بات کا خیال رکھ لیا گیا ہوتا کہ جس جگہ سے پروفیسر شکیل الرحمٰن کے لکھے ہوئے مضامین کا سلسلہ شروع ہوتا ہے وہاں پچھلے اور اگلے صفحات کے درمیان ایک 'تفریقی صفحہ' اسی طرح ڈال دیا جائے جیسا آگے ان کے اپنے 'متن' اور 'منٹو

شناسی' پر دوسروں کے تحریر کردہ مضامین والے حصے کو الگ کرنے کے لیے ڈالا گیا ہے تو نئے قاری کو یہ الجھن نہ ہوتی کہ جن مضامین پر کسی کا نام نہیں ہے وہ کس کے لکھے ہوئے ہیں۔ فہرست میں بھی اس کا خیال نہیں رکھا گیا ہے، جب کہ 'مثنوی شناسی پر مضامین' کی فہرست آگے چل کر دوبارہ چھاپی گئی ہے۔

صفحات: 296؛ **قیمت**: 300 روپے

ناشر: انجم پبلکیشنز، 297۔ ساؤتھ سٹی، گڑگاؤں۔ 122001

رنگ ہوا میں پھیل رہا ہے/ عبید صدیقی

عبید صدیقی سے میری پہلی ملاقات غالباً 1988 میں قومی آواز کے ایڈیٹر موہن چراغی مرحوم کی ویسٹرن کورٹ والی رہائش گاہ پر ایک دل چسپ دعوت کے دوران ہوئی تھی۔ یہ پُر تکلف دعوت خاصی بے تکلف تھی۔ میزبان میں، چراغی صاحب کنک اور فرحت احساس، عبید صدیقی اور پاکستان ہائی کمیشن میں ان دنوں پریس اتاشی کے فرائض انجام دینے والے ایک 'شاہ' صاحب مہمان تھے جن کا پورا نام اس وقت یاد نہیں آ رہا ہے۔ چراغی صاحب کی اہلیہ ان دنوں باہر گئی ہوئی تھیں۔ طے ہوا تھا کہ دعوت کا تمام خرچ میرے ذمے ہوگا اور چراغی صاحب ایک خاص الخاص نان وتیج کشمیری ڈش خود تیار کریں گے۔ اس ڈش کے لیے بغیر ہڈی کا گوشت بھی چراغی صاحب کی ہدایات کے مطابق مرحوم بکرے کے مقرر کردہ مقامات سے حاصل کروایا گیا تھا۔ اور واقعی صاحب کیا خاص ڈش تیار کی تھی چراغی صاحب نے۔ نہ ذائقے کا پتہ تھا نہ گوشت کا۔ پتہ نہیں کس ترکیب سے بکرے کو گلایا بلکہ گھلایا تھا کہ گوشت کا ایک ریشہ تک نہیں نظر آتا تھا۔ تاہم سب چراغی صاحب کا دل رکھنے کے لیے جی بھر کر اس پراسرار ڈش کی تعریفیں کرتے رہے اور ان کی دیکھا دیکھی میں نے بھی اپنے ایڈیٹر کی شان میں دو تین ڈکاریں لی تھیں۔

مجھے یاد ہے کہ اس دعوت میں سب سے زیادہ بولنے کے فرائض عبید صدیقی نے ادا فرمائے تھے جس سے میں دل ہی دل میں خاصا بھنا رہا تھا۔ ایک تو چراغی ہی کیا کم کشمیری تھے۔ اس پر طرّہ یہ کہ عبید بات بات میں سرینگر اور کشمیر کا ذکر لے آتے۔ پھلوں کا ذکر ہو تو کشمیر کے پھل۔ لباس کی بات ہو تو کشمیریوں کا لباس۔ یہاں تک کہ کسی نے دہلی کی گرمیوں کا ذکر چھیڑا تو اس پر بھی یہ دعویٰ کہ واہ صاحب واہ، کشمیر کی گرمی کتنی اچھی ہے۔

تنگ آ کر فرحت سے شعر سنانے کی فرمائش کی۔ اس پر بھی عبید صاحب چپ نہیں بیٹھے۔ فرحت جو بھی شعر سناتے اس کا دوسرا مصرع ان سے پہلے عبید سنا دیتے۔ میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ ایک تو چراغی صاحب کا گھر۔ اس پر یہ فرحت کے دوست۔ لیکن جب شعر سننے کا سارا مزہ غارت اور معاملہ برداشت سے باہر ہو گیا تو تمام احتیاط بالائے طاق رکھتے ہوئے میں نے کہہ ہی دیا کہ یار فرحت تم جلدی جلدی تمام شعروں کے فقط پہلے مصرعے سنا دو باقی دوسرے مصرعے ان حضرت سے کسی اور دن یک مشت سن لیں گے۔ اس پر عبید صاحب شاید برا مان گیے۔ اس کے بعد دفتر میں، پریس کلب میں اور یہاں وہاں کئی مختصر ملاقاتیں ان سے ہوئیں مگر ان کے ساتھ کچھ خاص ٹیوننگ نہیں ہو پائی۔

کچھ عرصہ بعد وہ بی بی سی سے وابستہ ہو گئے، لندن میں کئی سال رہنے کے بعد دہلی میں این ڈی ٹی وی سے جُڑے اور پھر جامعہ ملیہ کے ماس کمیونکیشن انسٹی ٹیوٹ میں پروفیسر ہو گئے۔ اس دوران ان کی غزلیں یہاں وہاں مجھے تب پڑھنے کو ملیں جب وہ شاعری چھوڑے ہوئے تھے۔ یہ کوئی تیرہ برس کا عرصہ تھا اور اس بیچ عام قائین کی طرح میں بھی یہ سمجھتا رہا کہ یہ شاعری والے عبید صدیقی کوئی اور ہیں۔ وہ تو اب جب ان کا پہلا شعری مجموعہ سامنے آیا ہے تو میں نے جانا ہے کہ دونوں دراصل ایک ہی عبید صدیقی ہیں۔ خیر اس میں تھوڑا سا دروغ برائے گردنِ راوی بھی ہے۔ عبید ایک imposing شخصیت کے مالک ہیں، خوش شکل، خوش پوش، خوش گفتار... دنیا جہان کی گفتگو کریں گے لیکن اپنی شاعری یا اپنے اشعار کا ذکر میں نے آج تک ان کی زبان سے نہیں سنا۔

اس پہلے مجموعے میں انھوں نے بہت سی معلومات اپنے بارے میں بہم پہنچا دی ہے۔ ان کی پہلی غزل 1969 میں 'بیسویں صدی' میں چھپی تھی جس کا ایک شعر انھیں آج بھی یاد ہے:

میں چونک چونک اٹھا ایک ایک سائے پر
چراغ گھر میں جلایا تھا روشنی کے لیے

ابتدا میں وہ حفیظ میرٹھی سے متاثر تھے جو اس فیض عام کالج میں پڑھاتے تھے جہاں انھوں نے 12 ویں تک تعلیم حاصل کی (عبید نے) اور غزلوں پر ان سے اصلاح بھی لی (حفیظ میرٹھی سے)۔ پھر علی گڑھ یونی ورسٹی میں انھیں جاوید حبیب، فرحت احساس، آشفتہ چنگیزی، مہتاب حیدر نقوی، ابوالکلام قاسمی، عقیل احمد، غضنفر علی، اسعد بدایونی، سید محمد اشرف، طارق چھتاری، اظہار ندیم، نسیم احمد، پیغام آفاقی اور غیاث الرحمٰن جیسے دوست ملے چنانچہ بری شاعری کر ہی نہیں سکتے تھے۔ اس کے بعد کب اور کیوں دہلی آئے، سری نگر گئے، لندن رہے، واپس دہلی آئے اور اب کیا کچھ کر رہے ہیں یہ سب انھوں نے 'کیا نئے کوئی کہانی میری' کے تحت لکھ دیا ہے۔

مجموعہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ دسمبر 2009 سے جولائی 2010 تک کی منتخب غزلوں پر مشتمل ہے اور ڈیڑھ سو سے زائد صفحوں پر پھیلا ہے۔ دوسرے حصے میں 1975 سے 2009 کی شاعری کا انتخاب ہے اور یہ صرف 27 صفحوں کا ہے۔ اسی دور میں وہ 13 برس شامل ہیں جب انھوں نے کوئی شعر نہیں کہا۔ گویا چونتیس برس کی ابتدائی شاعرانہ زندگی بعد کے صرف آٹھ مہینوں کا ضمیمہ addenda یا appendix بن کر رہ گئی ہے۔ مجھے لگتا ہے ہر زندگی میں یہی ہوتا ہے۔ جو کچھ بعد میں رونما ہوتا ہے اسی کو سبقت اور اولیت ملتی ہے۔ وقت کی ترتیب الٹ جاتی ہے۔ خود راقم نے جولائی 2007 کے بعد ایک ڈیڑھ سال تک جو نظمیں غزلیں کہیں وہ 1967 سے 1981 کے چودہ برسوں کی قافیہ پیمائی پر بھاری نکلی۔ کم از کم مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔

عبید کی کتاب پہلے ہی شعر سے قاری کو ہمراہ کر لیتی ہے:

یہ روشنی کے لیے کب جلائے جاتے ہیں
یہاں چراغ ہوا میں سجائے جاتے ہیں

ہوا میں چراغ جلانے کے روایتی معاملے کو عبید نے کیا پختگی دی ہے اور مفہوم کو کس بلندی پر پہنچا دیا ہے یہ شعر کی پہلی قرأت سے ہی کھل جاتا ہے۔ اس کے بعد آگے بڑھتے جائیے شعر پر شعر، غزلوں پر غزلیں قاری کے شعور و لاشعور کو چونکانے، چکانے اور فکر کو مہکانے کے لیے موجود ہیں۔ شعر، اس مجموعے میں فرحت احساس نے بھی اپنی تحریر کے لیے اپنی پسند کے چنے ہیں اور خوب چنے ہیں۔ مگر ایک مٹھی انتخاب اس فقیر کا بھی دیکھیے:

انھیں سنبھال کے رکھنا پڑے گا آنکھوں میں
یہ خواب خوابوں کا حاصل بتائے جاتے ہیں
ذرا سا فرق ہے بستی میں اور صحرا میں
یہاں چراغ وہاں دل جلائے جاتے ہیں

ہمارے زخم پھر کیسے بھریں گے
تمھارے پاس جب مرہم رہے گا

بہت مکروہ لگتی ہے یہ دنیا
اگر نزدیک جا کر دیکھتے ہیں
کہاں تک روشنی جائے گی اس کی
چلو اب دل جلا کر دیکھتے ہیں
امیر شہر سنتا ہی نہیں ہے
ذرا آنکھیں دکھا کر دیکھتے ہیں
ہمارے بیچ کیا رشتہ بچا ہے
تمہارے پاس آ کر دیکھتے ہیں
ضروری ہے اُسے رستے پہ لانا
کوئی چکّر چلا کر دیکھتے ہیں

کبھی تم مسکراتے کیوں نہیں ہو
بتاؤ تو بتاتے کیوں نہیں ہو
بظاہر غم تمھیں کوئی نہیں ہے
تو پھر خوشیاں مناتے کیوں نہیں ہو

دنیا کا احترام ضروری نہ تھا مگر
اس کو ذلیل و خوار کیا یہ برا کیا
دینا ہی تھا جواب تو خاموش کیوں رہے
موقعے کا انتظار کیا یہ برا کیا

کبھی چراغ کبھی دل جلا کے دیکھ لیا
ذرا سا رنگ تو بدلا دھواں نہیں بدلا

شہر کا نوحہ اگر لکھوں گا
لفظ برتوں گا ترانے والے
جانے کس درد سے تکلیف میں ہیں
رات دن شور مچانے والے

میں فرد جرم تیری تیار کر رہا ہوں
اے آسمان سن لے ہشیار کر رہا ہوں
آسانیوں میں جینا مشکل سا ہو گیا ہے
میں زندگی کو تھوڑا دشوار کر رہا ہوں

اک آرزو جو مائلِ اظہار تھی رہی
لیکن ہمارے بیچ جو دیوار تھی رہی

یہ اور ان جیسے نہ جانے کتنے اشعار، مختلف ذہنی کیفیتوں اور محسوسات کے مختلف رنگوں کو کائنات ادب میں پھیلا رہے ہیں اور اس عمل نے عبید صدیقی کے پہلے شعری مجموعے کو واقعتاً حالیہ عرصے کا اہم ترین شعری مجموعہ بنا دیا ہے۔

صفحات: 224؛ **قیمت:** 250 روپے
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ممبئی، علیگڑھ

انترال.../ جینت پرمار

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ جینت پرمار کا یہ چوتھا شعری مجموعہ، اردو کے

اس منفرد شاعر مصور کے فن اور تخلیقیت کو اس سج دھج سے سامنے لاتا ہے کہ میرے خیال سے اس پر انھیں ایک اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ دے دیا جانا چاہیے۔ 1990 میں 'اور'2006 میں 'پنسل اور دوسری نظمیں'2007 میں 'مانند'اور اب یہ 'انترال' یعنی Interval یا وقفہ۔ چاروں مجموعے جینت پرمار کے شعری سفر کی ایک روشن داستان بیان کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ انھوں نے قدم بہ قدم فکر و ترسیل کی نئی منزلوں کو سر کیا ہے اور آج ان کی شاعری خود اردو کے شعری ادب کے لیے سرمایۂ افتخار بن گئی ہے۔

اردو کے اس 'دلت' شاعر سے مجھے دلی محبت نہ ہوتی تو میں بے ساختہ انھیں منفرد لب و لہجے کا شاعر قرار دے دیتا۔ لیکن بدقسمتی سے اردو میں یہ اصطلاح اس بری طرح استعمال کی جانے لگی ہے کہ تقریباً بے مفہوم ہو کر رہ گئی ہے۔ خود مجھے ایک صاحب نے کسی محفل میں منفرد لب و لہجے کا شاعر ڈکلیئر کیا تو اپنے آپ پر اس قدر شرم آئی کہ کچھ نہ پوچھیے۔ اس لیے میں انھیں بالکل نئے مزاج نئے لہجے اور نئی زبان کا اردو شاعر اور نئے رنگوں کا اردو مصور کہنا زیادہ پسند کروں گا۔ ان کی لفظیات، علامتوں کے استعمال اور اسلوب و بُناوٹ میں کہیں کہیں مجھے گلزار کی جھلک دکھائی دیتی ہے لیکن وہ گلزار نہیں ہیں۔ بعض نظموں اور بعض غزلوں میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے 'شب خونی' شاعروں کی پرچھائیاں سرکتی محسوس ہوتی ہیں لیکن خدا کا شکر ہے وہ 'شب خونی شاعر' بھی نہیں ہیں۔ ان کے کلام میں 'دلت طبقوں' کی محرومیوں کا بڑا دردانگیز بیان ملتا ہے لیکن وہ 'دلت شاعر' بھی نہیں ہیں۔ وہ ایک سچے شاعر ہیں۔ اسی زمین اور اسی مٹی سے اگنے والے سچے شاعر جس سے اردو زبان نے جنم لیا ہے۔

'اردو کے نام' منسوب کیے گئے اس مجموعے اور جینت پرمار کے مجموعی شعری و فکری رویے کے تعلق سے ایک بات میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ غالب، ٹیگور، فیض اور گلزار کی طرح جینت پرمار کے فکر و احساس کی دنیا بھی زبان، مکان اور زمان کی حدود میں مقید نہیں ہے۔ وہ ان سے آگے کی شاعری ہے۔ اُس شعری کائنات کی شاعری ہے جس میں کسی بھی شے کو دردمندی اور محبت کے ساتھ چھو لیں تو وہ شاعری بن جاتی ہے۔ مستزاد یہ کہ وہ مصور بھی ہیں۔ مقبول فدا حسین کی طرح، جو شاعر بھی تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فنون و اصناف لطیف میں جتنی قربت و یک جہتی شاعری اور مصوری کے درمیان ہے اتنی شائد دیگر دو اصناف میں نہیں ہوں گی۔ اور صرف قربت کی بات نہیں، یہ دونوں اصناف ایک دوسرے کو مکمل بھی کرتی ہیں۔ جینت پرمار کے یہاں کم از کم شاعری کی حد تک یہ حسن ضرور موجود ہے کہ ان کی نظمیں اور غزلوں کے بہت سے اشعار اپنے آپ میں کسی پینٹنگ کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔ جو کچھ میں نے 'یار جلا ہے...' کے ایک تعارفی تبصرے میں گلزار کی شاعری کے بارے میں لکھا تھا وہ پرمار کی شاعری کے تعلق سے بھی دوہرانا چاہوں گا کہ اس شاعری کو چپ چاپ پڑھیں تو یہ سنائی بھی دیتی ہے اور نظر بھی آتی ہے۔

جب بھی نظم لکھتا ہوں
پہلے من میں سنتا ہوں
اس کا پیکرِ بصری
من کے کورے کینوس پر
اک پرت سماعت کی
اور کھول دیتا ہے!

نظم 'Visual Shape' سے

حرف، صدا اور عکس کا یہ تھری ڈی افیکٹ Three Dimensional Effect صرف ان شاعروں کے یہاں پایا جاتا ہے جو حرف آشنا بھی ہیں اور عکس فہم بھی۔ لیکن واضح رہے کہ گلزار کا ذکر کر کے میں جینت پرمار کی شاعری کو undermine نہیں کرنا چاہتا۔ صرف اپنی بات کو سمجھانے کے لیے میں نے گلزار کا سہارا لیا ہے۔ جینت اپنا ایک الگ وجود رکھتے ہیں۔ انھوں نے شعر و ادب میں غالب، ٹیگور، گوپی چند نارنگ، پابلو نرودا، منیر نیازی اور مظہر امام کا اثر بھی قبول کیا ہے۔ ان سبھی پر ان کی نظمیں اس مجموعے میں موجود ہیں۔ مثلاً 'گوپی چند نارنگ' کے عنوان سے یہ نظم:

ایک درخت
زمیں پہ اُگ کر
جھکا کے رکھ دیتا ہے
نیلے آسمان کو
اپنے قدموں کے آگے!
اور زمیں کی گہرائی کو
دے دیتا ہے
آسمان کی اونچائی!!

لیکن ان سبھی شخصیتوں سے روشنی پا کر جو کچھ انھوں نے تخلیق کیا ہے وہ ان کا اپنا ہے۔ گوپی چند نارنگ پر ان کی اس نظم کو ہی دیکھ لیجیے۔ اردو ادب کا ایک نقاد ہے جو آسمانِ ادب کی چادر کو نقد کی زمین پر بچھا کر اس کی قدر متعین کر دیتا ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اپنے کام کے طریقے کو اس نظر سے کسی اور نے کیا خود نارنگ صاحب نے بھی کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔

مصور ہونے کا ایک فائدہ جینت پرمار کو یہ بھی ہے کہ وہ کینوس اور تصویر

کے تناسب اور طول وعرض کی بہت اچھی sense رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کی تخلیقات میں کوئی لفظ کوئی مصرع فالتو یا بھرتی کا نہیں ہوتا۔ اکثر نظمیں مختصر ہیں۔ اور شائد اختصار کی ہی وجہ سے ان کے حسن، معنویت اور تاثر میں گہرائی وگیرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ نظم Visitor's Book ملاحظہ ہو:

جو بھی مسافر آتا ہے
ساحل کی چکیلی ریت پہ
انگلیوں کے قلم سے
اپنے دستخط کر جاتا ہے
ریت ہے گویا...
نیلے سمندر کے ساحل کی
Visitor's Book

تاہم اس مجموعے میں میری دل چسپی پرمار کی غزلوں میں زیادہ تھی کیونکہ اس سے پہلے کے مجموعوں میں ان کی تمام تر توجہ نظموں پر ہی رہی ہے۔ مجھے پہلی بار ان کی اتنی ساری غزلیں پڑھنے کو ملی ہیں۔

غبار جاں سے ستارہ نکلنا چاہتا ہے
یہ آسمان بھی کروٹ بدلنا چاہتا ہے
بہت گھٹن ہے کہ سانسیں بھی ہارگئی ہیں
مرا وجود بھی نقطے میں ڈھلنا چاہتا ہے

برگد کی زرد شاخ پہ بیٹھا تھا اک پرند
پھر اس کے بعد اندھے کنویں میں اتر گیا

میر کے شعر پڑھ کے سوتے تھے
رات بھر نیند میں بھی روتے تھے
عشق نے ایسے دن بھی دکھلائے
خون میں انگلیاں ڈبوتے تھے

اندھیرے میں رستہ دکھاتا رہا
ستارہ کوئی میرے اندر بھی ہے

وہ سامنے کی کھڑکی نے آواز دی مجھے
کتنے گلاب آنکھ کے صحرا میں کھل اٹھے

کمرے میں صرف میں تھا کوئی دوسرا نہ تھا
بتی بجھی تو کتنے اندھیرے لپٹ گئے

اس کی گلی سے گزرے تھے
دل کو روگ لگا بیٹھے

میں تنہا تھا ایسے میں
چاند ستارے آبیٹھے

آدھے سیارے پر اس کے جگنو کی بستی
آدھے سیارے پر اترے قلم دوات اور میں

ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے خلیل ابن احمد بصری (718 تا 791 عیسوی) پر بھی ایک خوب صورت نظم لکھی ہے جسے عربی میں عروض کا موجد بتایا جاتا ہے۔ لیکن خاص طور سے اپنی آزاد نظموں میں وہ عروض کی پابندی نہیں رکھ پائے ہیں۔ آزاد نظم اور نثری نظم کا فرق ان کے یہاں کم نظر آتا ہے۔ یہ 'وصف' گلزار کے یہاں بھی ہے۔ میری ذاتی رائے ہے کہ اس طرف جینت پرمار کو خاص توجہ دینی چاہئے۔ آخری بات یہ کہ مجموعے کی طباعت اور پیش کش بہت معیاری ہے۔

صفحات: 80؛ **قیمت**: 200 روپے

تقسیم کار: کرناٹک اردو اکادمی، کنڑا بھون، جے سی روڈ بنگلور۔ 560002

گنبد کے کبوتر/شوکت حیات

شاعری میں شجاع خاور اور فکشن میں شوکت حیات اردو کے وہ دو اہم فنکار ہیں جنھیں میں نے اپنی ذات کے سلسلے میں سب سے زیادہ زود حس پایا ہے۔ ذرا ذرا سی بات دل کو لگا لیتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ جو اعلیٰ تخلیقی معیار انھوں نے اپنی نگارشات کی بدولت اردو ادب کو عطا کیا ہے وہ بہتوں کے بس سے باہر ہے۔ یہ بھی شائد ایک طرح کی قلندری ہی ہے۔ زمانے کی اس ناانصافی پر تو وہ کوئی توجہ دیتے نہیں کہ ان کے فن کی عظمت کو صحیح طور پر تسلیم نہیں کیا جا رہا ہے، لیکن ان چھوٹے موٹے نکتہ چینوں سے پوری قوت کے ساتھ الجھ پڑتے ہیں جن کے کہے کی کوئی وقعت ہے نہ کیے کی۔

شوکت حیات کے اس تازہ مجموعے کے مختصر دیباچے میں جناب وارث علوی نے بھی انھیں 'ترنگی' اور 'ضدی' لکھا ہے۔ جس سے میرے مذکورہ بیان کو تقویت ملتی ہے۔

کافی پہلے میں نے ادبی رسائل میں شوکت حیات کا ذکر بے حد نمایاں علامتی افسانہ نگار کے طور پر پڑھا تھا اور تبھی سے میں ان سے خوف کھانے لگا تھا۔ اس مجموعے کے ابتدائی صفحے پر بھی ان کی ایک ایسی تحریر موجود ہے کہ مجھ جیسا کمزور دل قاری سہم کر رہ جائے اور مجموعے کو بچوں کی پہنچ سے دور کسی اونچے طاق میں حفاظت سے رکھ دے۔ آپ بھی ملاحظہ کریں۔ مجموعے کے جلی حروف میں لکھے ہوئے عنوان 'گنبد کے کبوتر' کے

نیچے قوسین میں آپ نے لکھا ہے:

''غیر روایتی ، غیر ترقی پسند، غیر جدید، غیر مابعد جدید افسانے جنھوں نے 'انامیت'، 'نامیاتیت' اور سارک رائٹرس کانفرنس 2005 علی گڑھ کے موقع پر 'امکانیت پسندی' کی تھیوریز دیتے ہوئے انام افسانے، نامیاتی افسانے اور امکانی افسانوں کی بنیاد گزاری کی ہے۔ ان کے خدوخال کو متشکل کرتے ہوئے عصری وآفاقی افسانوں کی تخلیق کی ہے۔'' شوکت حیات

ارے بھائی، ایسی کیا ضرورت پیش آگئی ہے جو آپ اپنے کیے دھرے کی اس قسم کی چیستانی وضاحت فرما رہے۔ آپ نے افسانے لکھ دیے، کتاب چھاپ دی اب چپ چاپ گھر بیٹھیے۔ آپ کے افسانے اچھے ہیں، ان میں بڑی جان ہے، وہ خود بولیں گے۔ آپ کو بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور پھر اس خوف ناک وضاحت کے بعد کس عام قاری کا دل اور جگر ہے کہ مجموعے کے مطالعے کی ہمت کر سکے۔ وہ تو شکر ہے کہ کئی سال پہلے میرا خوف تب زائل ہو گیا تھا جب میں نے کچھ رسالوں میں ان کے کچھ افسانے بے ارادہ پڑھ لیے تھے اور انھیں ایک ایسے علامتی افسانہ نگار کے روپ میں پایا تھا جس کی باتیں سمجھ میں بھی آتی ہیں اور پڑھنے والے پر اپنا اثر بھی چھوڑتی ہیں۔ تازہ مجموعے میں بھی بیش تر افسانوں میں شوکت حیات کی علامت کاری، حقیقت نگاری کے ساتھ پا بہ رکاب رہتی ہے اور متاثر کرتی ہے۔

مجموعے کا شہ افسانہ 'گنبد کے کبوتر' شوکت حیات کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے جو بابری مسجد کے انہدام کو ذہن میں رکھ کر لکھا گیا تھا اور جس پر 1996 میں انھیں 'قومی کتھا ایوارڈ' بھی دیا گیا تھا۔ 25 افسانوں کے اس مجموعے میں یوں تو تقریباً سبھی افسانے شوکت حیات کے نمائندہ افسانوں میں شمار کیے جانے کے لائق ہیں، تاہم مجھے کوبڑ، گھونسلہ، میت، گنبد کے کبوتر، سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ، بلّی کا بچہ اور رحمت صاحب خاص طور پر پسند آئے۔

شوکت حیات کے افسانوں میں علامتیں، چیستانی انداز میں نہیں برتی گئی ہیں۔ وہ جدیدیت سے متاثر ضرور رہے ہیں لیکن علامات واسطور اور اشارات وکنایات کا مصنوعی استعمال کر کے انھوں نے افسانہ نگاری کو معمہ نویسی نہیں بنایا ہے۔ علامتیں ان کے حقیقت آمیز بیانیے میں فطری انداز سے اپنی جگہ سنبھالتی ہیں چنانچہ افسانے کی قرأت مکمل ہونے پر علامتیں نہیں بلکہ وہ نتیجہ آپ کے ذہن میں باقی رہتا ہے، جس تک پہنچانے کے لیے افسانہ نگار نے ان علامتوں کو کہانی کا حصہ بنایا تھا۔

جوگندر پال، اقبال مجید، دیویندر اسر، رام لعل، خورشید اکرم جیسے اردو کے اہم ترین افسانہ نگاروں اور گوپی چند نارنگ، شمس الرحمن فاروقی، زبیر رضوی، وہاب اشرفی، کمار پاشی، قمر رئیس، مہدی جعفر، نورالحسن نقوی، مظہر امام، حامدی کاشمیری، علی احمد فاطمی اور سلیمان اطہر جاوید جیسے اہل نظر ادیبوں و دانش وروں اور خود شوکت حیات نے بھی شوکت حیات کی افسانہ نگاری کا لوہا مانا ہے۔ ان سب کے آگے حقیر فقیر نصرت ظہیر کی رائے کیا اہمیت رکھتی ہے۔ پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا جس طرح مجھے شاعری میں اوروں کے علاوہ شجاع خاور خاص طور پر پسند ہیں اسی طرح فکشن میں شوکت حیات کی بھی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ شوکت حیات کا تخلیقی سفر پوری شان سے جاری ہے اور ان کے افسانوں کے تین اور مجموعے، بھسینڈ، رانی باغ اور بانگ کے ناموں سے آنے والے ہیں۔ ان میں موخرالذکر دو عنوانوں سے لکھے گئے افسانے اس مجموعے میں بھی شامل ہیں۔ آپ بھی کے ساتھ مجھے بھی ان مجموعوں کا انتظار رہے گا۔ کیونکہ ان کی باتیں چاہے سمجھ میں نہ آئیں لیکن ان کی کہانیاں خوب میری سمجھ میں آتی ہیں۔

صفحات: 312؛ **قیمت**: 300 روپے

ناشر: شوکت حیات، 104 انجیلا شا اپارٹمنٹ

176 پاٹلی پترا کالونی، پٹنہ۔ 800013

شاعر بیوی کی حراست میں/ منظور عثمانی

اردو کے بزرگ طنز و مزاح نگار منظور عثمانی بزرگ دراصل اس لیے ہیں کہ انھوں نے مدرّسی سے ریٹائرمنٹ کے بعد وہ کام شروع کیا ہے جسے 'طنز و مزاح' کہا جاتا ہے، ورنہ درحقیقت اس میدان میں وہ اپنے جونیئرز کے بھی جونیئر ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کی بزرگی دراصل تخلیقی جوہروں کے کم یا بالکل معدوم ہوتے جانے کی عمر ہے۔ مثالیں دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی بھی زبان کے بڑے تخلیق کاروں کی زندگی کا احوال جان لیجیے، آپ پائیں گے کہ انھوں نے اپنا سب سے اہم تخلیقی کام اکاون باون کی عمر کو پہنچنے سے پہلے اپنی جوانی میں کر لیا تھا اور اس کے بعد فقط وہ خود کو دوہراتے رہے۔ جب کہ منظور صاحب نے خود کو دوہرانے کی عمر میں اصل تخلیقی کام شروع کیا ہے جو ویسے تو بڑی ہمت و جرأت مندی کی بات ہے مگر نتیجہ وہی نکل رہا ہے، جو عام طور پر اس عمر میں جوانی کو دوہرانے کا نکلتا ہے۔ یعنی درجن بھر تیر چلتے ہیں تب جا کر ایک نشانے پر لگتا ہے۔ بار بار قلم اٹھایا جاتا ہے اور بڑی مشکل سے کام کا ایک جملہ تحریر ہوتا ہے۔ ہاں استثنا ہر جگہ ہوتے ہیں،

چنانچہ کبھی کبھی سرعتِ افکار کی کیفیت بھی آجاتی ہے۔

منظور عثمانی اپنی تحریروں میں بھی بزرگ محسوس ہوتے ہیں۔ یہاں بزرگ کے معنی ہیں اولڈ، یعنی پرانا، کہنہ مشق بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر صرف ان معنوں میں کہ ان کے اندازِ تحریر، اسلوب، بیانیہ، لفظیات، محاورہ و معاملہ بندی، بات سے بات نکالنے کے ڈھنگ، صرف لفظوں سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش اور بیوی یا بیگم کے استعمال سے ظرافت کے پہلو نکالنے کی روش تک وہی کہنہ پن نظر آتا ہے جس کا دور بیت چکا ہے۔ بیسویں اکیسویں صدی کا اردو لب ولہجہ ان کے یہاں نہیں ہے۔

جہاں تک 'طنز ومزاح' کے عناصرِ خمسہ کا تعلق ہے تو ان کی تحریروں میں یہ منفی اور مثبت دونوں صورتوں میں حیرت انگیز طور پر یکساں مقدار میں ملتے ہیں، جو ایک خاصی کنفیوزنگ صورت حال ہے۔ یعنی کوئی چاہے تو چار مثبت مثالیں دے کر انھیں بے حد عمدہ مزاح نگار بھی قرار دے سکتا ہے اور اتنی ہی منفی مثالیں دے کر انھیں فضول گو بھی ڈکلیئر کرسکتا ہے۔ میری اپنی مجموعی اور ذاتی رائے ان کے بارے میں یہ ہے کہ اگر انھوں نے یہ کام جوانی میں نہ سہی ادھیڑ عمری میں بھی شروع کر دیا ہوتا تو ان کی تحریر میں غیر معنوعیت اور بے ساختگی و برجستگی یا spontaneity کا وہ عالم ہوتا کہ مجتبیٰ حسین جیسوں کے لیے بھی اپنا چراغ جلانا مشکل ہوجاتا، ہما شما کی تو بات ہی کیا ہے۔ طنز ومزاح کے تمام تر عناصر منظور صاحب کی تحریروں میں ملتے ہیں پھر بھی ہر جگہ کچھ کمی سی لگتی ہے۔ وہ سخن گو ہیں سخن ور ہیں سخن ساز ہیں پھر بھی محسوس یہ ہوتا ہے کہیں کچھ کم ہے۔ جس طرح فلم اور اسٹیج کی بہترین مزاحیہ اداکاری sense of timing سے پیدا ہوتی ہے اسی طرح نثر و نظم میں اعلیٰ مزاح spontaneity سے تخلیق پاتا ہے اور یہ دونوں انگریزی لفظ برجستگی کے آس پاس گھومتے ہیں۔

بہر کیف دس ہزار شعروں کے انتخاب پر مشتمل دو کتابیں تالیف کرنے کے بعد سبک دوشی کے عرصۂ بزرگی میں ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین کی آٹھ کتابیں چھاپ ڈالنا اور 9ویں کے لیے کمر بستہ نظر آنا، قابل رشک بھی ہے اور لائقِ تشویش بھی۔ زیر نظر کتاب ایک عدد پیش لفظ اور 24 مضامین پر مشتمل ہے۔ ان میں ایک علامہ اسرار جامعی کا خاکہ بھی ہے جو میرے پسندیدہ مزاح نگار ہیں اور پیروڈی میں کمال رکھتے ہیں۔ ایک عمدہ مضمون مرحوم یوسف ناظم پر ہے جسے انھوں نے موصوف کے برجستہ جملے پیش کر کے مستند نقادوں کے مضامین سے بھی زیادہ معیاری بنا دیا ہے۔ شعروں کے انتخاب کے بعد اگر منظور صاحب اردو مزاح نگاروں کے برجستہ جملوں کا انتخاب بھی کتاب بند کرڈالیں تو مزا آجائے۔ کتاب کا نام افسانوں کے مجموعوں کی طرح اسی نام کے ایک مضمون پر رکھا گیا ہے لہٰذا یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ پوری کتاب کسی محروس شاعر کے بارے میں ہے۔ باقی کتابوں کے عجیب سے نام بھی انھوں نے اسی طرز پر رکھے ہیں۔

صفحات:164؛ **قیمت**:200روپے

ناشر: منظور عثمانی، 17 غفور نگر، اوکھلا، نئی دہلی-110025

بازگشت/گگن بھارتی

میرٹھ میں پیدا ہونے اور مراداباد میں رہائش رکھنے والے سید اکرام الرحمٰن شاہ نے اپنے نام کو گگن بھارتی کیوں کیا اس کا صحیح جواب وہ خود ہی دے سکتے ہیں، کیونکہ غزلوں اور نظموں کے اس مجموعے میں یہ ذکر کہیں نہیں ہے۔ یہ غالباً ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ ایک سرسری سی ورق گردانی کے بعد ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ شاہ صاحب غزل سے زیادہ نظم کے شاعر ہیں اور اردو شعریات کا انھیں خاصا عرفان ہے، لہٰذا غزل گوئی میں بھی وہ نظموں سے کم تر نہیں ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

ہم اپنی تباہی کا سبب سوچ رہے ہیں
اب تک نہیں سوچا مگر اب سوچ رہے ہیں

کس کس کو کچلتے ہوئے بڑھتے رہے آگے
شامل ہیں جو اس بھیڑ میں کب سوچ رہے ہیں

یہ شخص تیرا مخلص و غم خوار ہے مگر
کچھ روز بعد اس کا بھی کردار دیکھنا

نظمیں بیشتر پابند ہیں اور اس دور سے متاثر ہیں جسے ساحر، کیفی، اختر الایمان وغیرہ کی نظموں کا دور کہہ سکتے ہیں۔ موضوعات کا انتخاب اور treatment بھی کم و بیش ویسا ہی ہے۔ اپنے شہر مراداباد کے تعلق سے ایک 'شہر آشوب' انھوں نے 'آج کچھ بھی نہیں' کے عنوان سے لکھا ہے جو خاصا پرسوز ہے۔

صفحات:144؛ **قیمت**:200روپے

تقسیم کار: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

3108 گلی وکیل والی، کوچہ پنڈت، لال کنواں دہلی-110006

عالمی رنگ ادب/مدیر: عارف منصور

کراچی پاکستان سے شائع ہونے والے اس 'کتابی سلسلے' کا مشترکہ شمارہ نمبر 18-17 میرے سامنے ہے اور میں حیران ہوں کہ کیا پڑھوں اور کیا

نہ پڑھوں۔ سوا تین سو صفحوں کے اس ادبی بساط خانے میں اتنا سامان بھرا پڑا ہے کہ ایک جگہ نظر نہیں ٹکتی۔ لہٰذا تبصرے کو آسان کرنے کے لیے تھوڑی دیر کو ترازو بدست بنیا بن جاتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ رسالے میں تخلیقی اور غیر تخلیقی ادب کا تناسب کیا ہے۔

تخلیقی ادب میں چار صفحے حمد، نعت، منقبت اور سلام کے، 20 غزلوں کے، 20 نظموں کے، 26 افسانوں کے، 34 صفحات پر رسالے کے مدیرِ اعزازی شاعر علی شاعر کے رومانی ناول 'گہرا زخم' کی پہلی قسط، باقی اللہ اللہ! یہ سب ملا کر ہوئے 106۔ یعنی 320 میں صرف ایک تہائی صفحے تخلیقی ادب کو ملے ہیں۔ دیکھ کر جھٹکا سا لگا کہ پاکستان میں بھی یہی ہو رہا ہے! وہ پاکستان جسے بقول مولوی عبدالحق اردو نے بنوایا تھا اور جہاں ابھی تک اردو اسی رتبے پر دکھائی دیتی رہی ہے جو ہندوستان میں انگریزی کو حاصل ہے۔

آخر ایسا کیا غضب آ گیا ہے تخلیقی ادب پر کہ ادبی رسالے اپنے آدھے صفحات بھی اس سے نہیں بھر پاتے۔ نیا ادب نہیں ملتا تو ماضی قریب و بعید کے بہترین پرانے افسانے، نظمیں، غزلیں اور ناولٹ ہی چھاپ دیجیے کہ شاید اسی طرح نئے لکھنے والوں کے لہو میں گرمی آئے۔ نوجوانوں میں جوش پیدا ہو۔

باقی یہ کہ رسالہ خاصا معیاری ہے۔ عصری رجحان کے تحت رفیع الدین راز، جمیل الدین عالی، سید سعید نقوی اور قاضی مشتاق احمد کے فکر و فن پر اچھے مضمون لکھے گئے ہیں۔ تنقیدی روش کے تحت، طاہر سعید کے ماہیوں، شاہدہ لطیف کے منظوم سفرناموں، آفتاب مضطر کے اشعار وغیرہ پر مضامین ہیں۔ سب سے ضخیم شعبہ، کتابوں پر تبصرے کا ہے جس میں 33 کتابوں پر تبصرے ہیں اور ان میں بھی زیادہ تر تبصرے شاعر علی شاعر کے لکھے ہوئے ہیں جنھوں نے حمایت علی شاعر کا ایک طویل انٹرویو بھی لیا ہے۔ یوں رسالے کے اصل مدیر کارو ہی لگتے ہیں کہ زیادہ تر قلم کاری اور محنت ان ہی کی دکھائی دیتی ہے۔

صفحات:320؛ **قیمت**:200روپے

تقسیم کار: ویلکم بک پورٹ، مین اردو بازار، کراچی

مانگے کی آگ/ بلقیس ظفیر الحسن

تعلیمی لیاقت کے اعتبار سے اردو کی شاید اکیلی غیر سند یافتہ، مگر ہزاروں سند یافتگان سے کہیں زیادہ مستند و مسلمہ ادیبہ محترمہ بلقیس ظفیر الحسن کی یہ کتاب ہندوستانی اور غیر ملکی زبانوں کے ان افسانوں کے اردو تراجم پر مشتمل ہے جو انھوں نے سب کے سب انگریزی سے کیے ہیں!

خدا کی پناہ۔ تعلیم کی کوئی باقاعدہ یا بے قاعدہ سند نہ رکھنے کے بعد موصوفہ کا یہ حال ہے۔ خدانخواستہ میٹرک و یٹرک کر لیا ہوتا یا، انٹر میں پاس ہو جاتیں تو نہ جانے کیا غضب ڈھاتیں۔ اردو کی معتبر شاعرہ اور افسانہ نگار و ڈرامہ نویس تو وہ ہیں ہی، متعدد ادبی ایوارڈ بھی حاصل کر چکی ہیں۔ اور یہ ایوارڈ ہی ہیں جنھیں آپ ان کی سند یا ڈگریاں مان کہہ سکتے ہیں۔

تخلیق کے بعد اب ترجمے کے میدان میں بھی کئی تجربے کرنے کے بعد بلقیس صاحبہ نے اپنا خاص مقام بنا لیا ہے۔ اپنی ترجمہ نگاری اور تجربہ کاری کے تعلق سے انھوں نے تفصیل کے ساتھ اس کتاب کے پیش لفظ 'سخن ہائے گفتنی' میں لکھا ہے اور جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے اس قولِ صادق کا بھی حوالہ دیا ہے کہ، ''کوئی بھی فن پارہ کسی فن پارے کی ہو بہو نقل نہیں ہو سکتا۔ ترجمہ بجائے خود ایک فن پارہ ہے۔ اسے ترجمہ کہنے کا حق اسی وقت ہے جب وہ اصل کی کیفیت اور احساس کو ممکن ترین حد تک دوبارہ خلق کر سکے۔'' اگرچہ فاروقی صاحب کی بات ہو بہو میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن جو کچھ انھوں نے عالمانہ انداز میں کہا ہے یا کہنا چاہا ہے اس سے مجھے پورا اتفاق ہے۔ بیں بائیس سال پہلے ایک مزاحیہ مضمون 'ترجمے کے مسائل' کے عنوان سے لکھا تھا جو میرے اولین مجموعۂ مضامین 'تحت اللفظ' میں شامل تھا۔ اس کی کچھ سطریں، آج لگتا ہے کہ خاصی کام کی تھیں۔ چنانچہ خود اپنا سرقہ کرتا ہوں:

''...ترجمہ تخلیق سے زیادہ مشکل اور اہم کام ہے۔ مصنف جب کچھ تخلیق کرتا ہے تو وہ اپنے خیال کے ہر پہلو سے واقف ہوتا ہے کیونکہ وہ اس کا اپنا خیال ہوتا ہے۔ تخلیق کی زبان لب و لہجہ اور استعارات و محاورات اس کی گھٹی میں پڑے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جب مترجم اس کی تخلیق کا ترجمہ کرتا ہے تو نہ خیال اس کا اپنا ہوتا ہے نہ زبان! اسے تخلیق کی ہی نہیں مصنف کی گہرائی میں بھی جانا پڑتا ہے۔ وہ مصنف کی روح کو ٹٹولتا ہے، اس کے لب و لہجے کو سمجھتا ہے، محاوروں اور استعاروں کے سمندر میں غوطے لگاتا ہے تب کہیں جا کر اس کے ایک پیراگراف کا ترجمہ کر پاتا ہے...''

فاروقی صاحب کے پہلے جملے میں اگر پہلا فن پارہ ترجمہ ہے اور دوسرا اصل (تخلیق)، تو بات صاف ہو جاتی ہے۔ بلقیس صاحبہ نے اچھا کیا جو ان کی بات کو گرہ میں باندھ لیا۔ اب بہتر ہوگا کہ وہ ان محترمہ کی بات کو ذہن سے نکال دیں بلکہ خود محترمہ کو ہی جھڑک دیں، جنھوں نے ان کے ماخوذ افسانوں یا آزاد ترجموں پر یہ کہا تھا کہ ''آپ تو جُڑ اجُڑ اکر افسانے لکھتی ہیں۔'' جب کہ انھوں نے کبھی یہ نہیں چھپایا کہ کس مصنف کے کس افسانے کے مرکزی خیال سے انھوں نے یہ افسانہ اخذ کیا ہے۔ ادب میں اخذ و سرقے کے فرق کو

مثانے پر آج کل یہی عمران بھنڈر، حیدر قریشی اور ان محترمہ جیسے شقی الذہن لوگ تلے ہوئے ہیں اور بزعم خود یہ سمجھتے ہیں کہ ادب کی بڑی بھاری خدمت فرما رہے ہیں۔ بلقیس صاحبہ سے میری گزارش ہے کہ وہ 'ماخوذ افسانے' لکھنا جاری رکھیں، ان کا ہر ماخوذ افسانہ 'ادب ساز' میں چھپتا رہے گا۔ دیکھتے ہیں کون ان کے اخذ واکتساب پر انگلی اٹھاتا ہے۔

'ناگنی کی آگ' اس مجموعے کا بڑا ہی خوب صورت اور پر معنی نام ہے۔ نئی نسل اگر 'ناگنی کی آگ' کا مطلب نہیں سمجھتی تو بھاڑ میں جائے۔ اپنی روایتوں کو جاننا سمجھنا ہر نسل کا پہلا فرض ہے۔ اس فرض کو ادا کر کے ہی وہ باشعور بن پاتی ہے۔ مجموعے کی ابتدا کینیڈین شاعرہ مارگریٹ ایٹ وڈ کی نظم 'یہ میرا فوٹو گراف ہے' سے کی گئی ہے۔ اس کے بعد امریکہ کی شارلٹ پرکنس گلیمن، امریکہ کی ہی کیٹ شوپین، برطانیہ کی پینی لوپی مارٹیمر، کنگسٹن جمیکا (ویسٹ انڈیز) کے سیاہ فام صحافی اور مصور راجر مائیس، امریکہ کے اسٹینلی برنارڈ ایلن، وہیں کے رے براڈ بری، برطانیہ کے روآل ڈال اور چینی نژاد امریکی مصنفہ ایمی ٹین کے علاوہ تامل میں بیری کے نام سے لکھنے والی افسانہ نگار لکشمی کنن، وولگا کے نام سے لکھنے والی تیلگو کی پوپوری للیتھا کماری، تامل زبان کی ادیبہ باما جن کا اصل نام فوسٹینا میری فاطمہ رانی ہے، مراٹھی کی وندنا بھاگوت اور ہندی کی ادیبہ مایا پردھان کی کہانیاں ہیں جن کے ترجمے انھوں نے انگریزی زبان سے کیے ہیں۔ راجر مائیس کی شہرہ آفاق کہانی 'بلیک آوٹ' کا بلقیس صاحبہ کا ترجمہ آپ 'ادب ساز' میں پڑھ چکے ہیں۔ کتاب میں مصنف Roger Maes کا نام غلطی سے راجر موریس Roger Morris شائع ہو گیا ہے جو دراصل اٹھارویں صدی کا مشہور انگلش آرکیٹیکٹ تھا۔ ویسے ایک راجر موریس Roge Morrice سترہویں صدی میں بھی گزر چکا ہے جو انگلینڈ کا کٹر پروٹسٹنٹ عیسائی پیشوا تھا۔ باما کی دل دوز کہانی 'لڑکی جو دھنوان ہو گئی' اسی شمارے میں شامل ہے۔

بلقیس صاحبہ نے یہ اچھا کیا کہ سبھی مصنفین کا تعارف افسانوں کی شروعات میں ہی کرا دیا ہے۔ اس سے مجموعے کی وقعت اور بڑھ گئی ہے۔

صفحات: 216؛ **قیمت**: 200/روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس
3108 گلی وکیل والی، کوچہ پنڈت، لال کنواں دہلی ۔ 110006

اک شب آوارگی/ خورشید اقبال

میری سمجھ سے اس دفعہ 'کتب نما' کی سب سے قیمتی کتاب یہی ہے۔ افریقی افسانوں کے تراجم کا مجموعہ۔ جسے انٹرنیٹ پر اردو کے شاید سب سے پرانے ویب ماسٹر اور اردو کی اولین ویب سائٹوں میں سے ایک 'اردو دوست' کے مالک و مدیر خورشید اقبال نے بڑی محنت سے ہم اردو والوں کے لیے تیار کیا ہے۔ یہ ان کی ترجمہ کاری کا پہلا نمونہ بھی ہے، جس میں انھوں نے بہت سے استاد مترجمین کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

افریقہ سے میرا ذہنی تعلق لڑکپن کے اس دور سے ہے جب میں دھڑا دھڑ رائیڈر ہیگرڈ کے ناول پڑھ رہا تھا۔ یہ سبھی ناول مظہر الحق علوی نے انگریزی سے اردو میں کیے تھے اور لکھنؤ کا نسیم بک ڈپو انھیں باقاعدگی سے چھاپے جا رہا تھا۔ تبھی سے افریقہ مجھے ہمیشہ fascinate کرتا رہا ہے۔ افریقی سماج، افریقی تہذیب اور افریقی حسیات کے لیے اردو میں سب سے پہلی کھڑکی مظہر الحق علوی نے ہی کھولی تھی یا اب چالیس پینتالیس سال بعد خورشید اقبال نے یہ کام کیا ہے۔ تاہم اس میں فرق یہ ہے کہ مظہر الحق نے رائیڈر ہیگرڈ، دانیال پی مانکس اور ولبر اسمتھ کے مہماتی ناولوں کے ذریعے افریقہ کے درشن کرائے تھے، جو دراصل سوڈیڑھ سو سال پہلے کا افریقہ تھا اور جسے تاریک براعظم کہا جاتا تھا۔ جب کہ خورشید اقبال نے آج کے افسانوں کے ذریعے آج کے افریقہ کو اور اس کے آج کے دکھ درد کو محسوس کرانے کا کار نمایاں انجام دیا ہے۔

دیکھا جائے تو کیا کچھ نہیں ہے اس کتاب میں۔ 'عرض حال' میں خورشید اقبال نے ترجمے پر بات کی ہے۔ وہ مانتے ہیں کہ کسی بھی زبان کے ادب کو دوسری زبان میں منتقل کیا جاتا ہے تو اس کی اپنی روح ختم ہو جاتی ہے اور ایک طرح کا بوجھل پن اس پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے انھوں نے ہر جملے کو ترجمہ کرنے کی بجائے re-write کرنے کا طریقہ استعمال کیا ہے جو ترجمے کا سب سے اچھا طریقہ مانا جاتا ہے۔ اس پر وہ بڑی خود اعتمادی سے کہتے ہیں، ''اتنا تو یقین ہے کہ میرا یہ انداز قارئین کو پسند آئے گا، لیکن ناقدین ادب کا رویہ کیا ہوگا، مجھے نہیں معلوم۔'' واہ بھئی خورشید اقبال صاحب۔ کیا سادگی ہے۔ اتنا بھی نہیں جانتے کہ کسی ادبی تحریر کو قارئین پسند کر رہے ہوں تو ناقدین ادب کا اس پر کیا تبصرہ ہوگا؟ خاص طور سے اردو کے ناقدین کا۔ وہ تو جناب اعلیٰ ادب مانتے ہیں ہی اسے جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے اور جسے کوئی مفت میں پڑھنے کو بھی تیار نہ ہو۔ پھر آپ کی کیا اوقات ہے؟

افریقہ کے مختلف ملکوں کے افریقی ادیبوں کی 13 منتخب کہانیوں کے تراجم پر مشتمل اس کتاب میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ حیدر قریشی، معید رشیدی، فیاض وجیہہ اور خود خورشید اقبال نے تراجم کی اہمیت، افریقی ادب کی خصوصیات، اور اس براعظم کے حالات کے بارے میں مختصر مضامین تحریر کیے

ہیں، جو شروع میں ہی افریقہ کے نقشے کے ساتھ دے دیے گئے ہیں۔ آخر میں خورشید اقبال نے افریقی زبانوں اور افریقی ادب کا ایک تفصیلی تعارف اس قدر محنت سے لکھ کر شامل کیا ہے کہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ افریقی ادب پر ایک اجمالی نظر، عصری افریقی افسانے، اور شاملِ انتخاب افسانہ نگار کے عناوین سے جو مضامین انھوں نے تحریر کیے ہیں ان کے لیے سرکاری اسکول میں پڑھانے والے اس ٹیچر کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل جانی چاہیے۔

افریقی ادب کو زبانی oral ادب اور نوشتہ written ادب کے دو خانوں تقسیم کرنے کے بعد انھوں نے اس براعظم کی مختلف زبانوں اور ان کے ادب کا جائزہ لیا ہے، براعظم میں رائج دیگر زبانوں مثلاً انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی اور عربی کے افریقی ادب پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد 'عصری افریقی افسانے' کے عنوان سے افریقی افسانوں کے موضوعات پر بحث کی ہے اور پھر 'افریقی افسانوں کا اسلوب' کے عنوان سے ایک ایسا مختصر مقالہ تحریر کیا ہے کہ نوجوان اسکالر اس کے ہر ذیلی موضوع پر ایک تحقیقی مقالہ خورشید اقبال کے ذریعہ فراہم کی گئی معلومات کی بنیاد پر لکھ سکتے ہیں۔ ذرا یہ ذیلی عنوان ملاحظہ فرمائیے: افریقی افسانوں کی زبان، افریقی افسانوں میں افریقیت، افریقی افسانوں میں قصہ گوئی کے عناصر، افریقی افسانوں میں طنزیہ عناصر، افریقی افسانوں میں روایت اور جدیدیت...

اس پر مستزاد یہ کہ جن مصنفین کے افسانوں کے تراجم کتاب میں شامل کیے گئے ہیں ان کے کوائف بھی، تصویروں کے ساتھ پیش کر دیے گئے ہیں۔

یعنی کل ملا کر خورشید اقبال نے سمندر کو دریاؤں میں، دریاؤں کو جھیل میں اور جھیلوں کو ایک کوزے میں بند کر کے رکھ دیا ہے۔ زندہ باد خورشید اقبال!

صفحات: 304؛ **قیمت**: 300 روپے
ناشر: عرشیہ پبلیکیشنز
سوریہ اپارٹمنٹ، دلشاد کالونی، دہلی۔ 110095

پسِ الفاظ/شاہد جمیل

"شاہد جمیل نے اپنی شعری و ادبی خدمات کے چالیس برس پورے کر لیے ہیں۔ 'پسِ الفاظ' ان کی پانچویں کتاب ہے، جو اُن کی تنقیدی تحریروں کے انتخاب پر مشتمل ہے۔" یہ شریفانہ اطلاع شاہد جمیل کی پیش نظر کتاب کے بیک کور پر دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ، "شاہد جمیل نے 1969 میں لکھنا شروع کیا۔ عین جدیدیت کے زمانے میں سفر شروع کرنے کے باوجود، جدیدیت کی فیشن والی شاعری سے دور رہے اور اپنے جداگانہ طریقِ اظہار اور انفرادی اسلوب کے باعث دور سے شناخت رکھنے والوں میں شمار ہونے لگے۔ بقول شخصے وہ 1970 کے آس پاس ابھرنے والے شعرا میں نہ صرف ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں بلکہ اپنے لہجے اور اپنی آواز سے پہچانے بھی جاتے ہیں...."

مجھے اس پورے مکتوب سے اتفاق ہے لیکن جداگانہ طریقِ اظہار، انفرادی اسلوب، ممتاز مقام، لہجے اور آواز سے میں قطعی اتفاق نہیں رکھتا۔ یہ وہ تراکیب و اصطلاحات ہیں جو اردو ادب میں ہرایرے غیرے کے لیے استعمال میں آنے کے بعد اب اپنا مفہوم کھو چکی ہیں۔ میرے پاس ہر ماہ درجن بھر کتابیں تبصرے کے لیے آجاتی ہیں اور ان میں جو شاعروں کی ہوتی ہیں ان میں سے بیش تر کے بیک کور اور فلیپوں پر گھما پھرا کر یہی الفاظ تحریر ہوتے ہیں۔ تحریروں کے کردار، مقامات اور واقعات بدلتے رہتے ہیں لیکن باتیں کم و بیش ایک سی کہی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہمارے نقاد حضرات نے بہت سے فلیپ لکھ کر اپنے پاس رکھ لیے اور جب کوئی سائل آتا ہے وہ اسے ایک فلیپ تھما دیتے ہیں کہ جا بابا عیش کر، اس تعویذ کو بنا پانی میں گھولے پیتا اور پلاتا رہ، تیرا بھلا ہوگا۔

کوئی شاعر ہو یا افسانہ نگار، میرے لیے اتنا بہت ہے کہ اسے اچھا اور سچا لکھ دیا جائے۔ اس کے بعد منفرد اور یگانہ تو وہ ہو ہی جائے گا۔ اچھا اور سچا لکھنے اور سوچنے والے دو فنکار اسلوب اور لہجے میں کبھی ایک جیسے ہو ہی نہیں سکتے۔ نقد و نظر کا یہ منتر مجھے ایک خاتون سے ملا ہے جو اکثر میرے اشعار پر یا میرے کالمی مضامین پر صرف اتنی داد دیتی تھیں کہ یہ اچھا ہے اور سچا ہے۔ ستیم شوم سندرم۔ ایک بار میں نے ایک نظم سنائی اور یہی داد پائی تو پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ کیا اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ انھوں نے کہا، یہ اچھی ہے اور سچی ہے، اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔ سن کر عقل ٹھکانے آگئی۔ اس سے بہتر اور جامع محاکمہ اور کیا ہو سکتا ہے کسی فن پارے کا؟ آپ ان کا نام پوچھیں گے تو سمجھ لیجیے ان کا نام رضیہ خاتون ہے۔ ویسے رشیدہ خاتون یا حمیدہ خاتون بھی برا نہیں، مگر مجھے رضیہ ہی پسند ہے۔ جب انھیں کوئی چیز خاص پسند نہیں آتی تو "بس ٹھیک ہے" کہہ کر آگے بڑھ جاتی ہیں۔

خیر، آمدم برسر شاہد جمیل۔ میں نہیں سمجھتا کہ جو جملے بیک کور کے مکتوب میں لکھے ہیں وہ ان کے تعارف کے لیے ضروری ہیں۔ وہ ایک اچھے اور سچے ادیب ہیں۔ ادب اطفال میں بھی ان کا دخل رہا ہے اور بچوں کے لیے خاص ترتیب و ترکیب سے لکھی گئی ان کی دو نظموں کی وجہ سے 'غزل نما' کا ایک اچھا خاصا جھگڑا ابھی چھڑا ہوا ہے، جس کا موجد کوئی انھیں بتاتا ہے تو کوئی کسی اور

کو۔ چلیے اس سے کچھ رونق تو ہے۔ ورنہ اردو کا ادبی میدان ان دنوں بھائیں بھائیں کر رہا ہے اور تقریباً ہر اچھے ذہن پر جمود طاری ہے۔ کہہ مکرنیوں پر بھی انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور اس صنف میں ان کا ایک مجموعہ 'عکس اندر عکس' کے عنوان سے آچکا ہے۔ اس کے علاوہ موصوف کے ماہیوں اور دوہوں کے بھی دو مجموعے 'سوماہیے' اور 'دوہارنگ' کے ناموں سے شائع ہو چکے ہیں۔

شاہد جمیل کے تنقیدی مضامین میں وہی وصف نمایاں ہے جو ایک تخلیق کار کے یہاں ہوتا ہے۔ وہ اردو میں پہلی صف کے شاعروں میں گنے جاتے ہیں، اور بنیادی طور پر تخلیق کار ہیں اس لیے ان کی تنقید تعصبات سے پاک ہے۔ وہ خود اپنی ایک نظر اور ایک چشمہ رکھتے ہیں۔ دوسروں کی عینک سے نہیں دیکھتے۔ دوسروں کے باٹ سے نہیں تولتے۔ پیش نظر کتاب میں سبھی مضمون شاعروں پر اور ان کی شاعری پر ہیں۔ ان میں بھی دوہے اور ماہیے پر انھوں نے زیادہ توجہ دی۔ شعری تخلیقات کے تکنیکی پہلوؤں میں ان کی دل چسپی زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ کتاب کے بارہ مضامین میں یوں تو ندا فاضلی، وزیر آغا، سلطان اختر، بیکل اتساہی، غلام مرتضیٰ راہی، مناظر عاشق ہرگانوی، ساحل احمد، طاہر سعید ہارون، قمر نعمانی اور خوشتر مکرانوی کے فن پر لکھے گئے مضامین شامل ہیں لیکن اردو ادب کے اب تک کے واحد منظوم تنقید نگار ڈاکٹر عبدالمنان طرزی پر لکھا ہوا ان کا مضمون خاصا دل چسپ ہے۔

صفحات: 112: **قیمت**: 200 روپے

تقسیم کار: نرالی دنیا پبلکیشنز، 358-A، بازار دہلی گیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔ 110002

دیوانِ محشر / محبوب محشر

دیوان محشر اور محبوب محشر کی خوبی یہ ہے کہ دونوں کو ساتھ ساتھ یا آگے پیچھے لکھا جائے تو قاری کے لیے یہ سمجھنا دشوار ہوگا کہ ان میں شاعر کون ہے اور مشاعرہ کون ہے۔ یعنی کتاب کون ہے اور مصنف کون۔ اظفر پیامی کے نام سے لکھنے والے دیوان بیریندر ناتھ، ہندوستانی راجوں رجواڑوں کی رنگ رلیوں پر مہاراجہ اور مہارانی کے ناموں سے کتابیں لکھ کر تہلکہ مچانے والے دیوان جرمنی داس، 'ریاست' نامی اخبار جاری کر کے ان راجوں رجواڑوں کے ہر دم پیچھے پڑے رہنے والے دیوان سنگھ مفتوں اور روزنامہ پرتاپ کے اردو والے مرحوم دیوان تصور (جن کے ساتھ راقم کو ان دنوں کام کرنے کا فخر حاصل ہے جب وہ اخبار 'ملاپ' میں آگئے تھے) کے ساتھ اردو میں دواوین کا رواج ختم ہو چکا تھا۔ خدا کا صد ہزار شکر کہ آخر کار اس زبان کو طویل عرصے بعد ایک دیوان میسر آگیا ہے۔ راقم السطور کی ناقص و ناتواں یادداشت میں یہ پہلا دیوان ہے جو سہارن پور کے منشی ثنا احمد صبر وعصر کے دیوان، 'بہار بے نظیر'، 1380 ہجری، عرف دیوان صبر وعصر' (مطبوعہ 1961 برقی پریس دہلی) کے بعد شائع ہوا ہے۔ آج کل کے اردو والے صرف شعری مجموعے پڑھنے، یا نہ پڑھنے کے عادی ہیں۔ دیوان صرف قدیم شعرا کے دیکھنے میں آتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر محبوب علی نے جن کا قلمی نام محبوب محشر ہے، اس کتاب کے پہلے ورق پر 'دیوان محشر' کے نیچے احتیاطاً قوسین میں، شعری مجموعہ لکھوا دیا ہے۔ اس سے پہلے محشر صاحب کے دو شعری مجموعے موج التہاب اور تریاق منظر عام پر آچکے ہیں تاہم دیوان یہ پہلا ہے۔ کتاب کی خوبیوں میں پروفیسر کرامت علی کرامت کا تحریر کردہ پیش لفظ شامل ہے جو معلومات سے لبریز ہے۔ دیوان میں الف سے لے کر ے تک اردو کے تمام حروف تہجی پر ختم ہونے والی ردیفوں کے ساتھ کہے گئے اشعار شامل ہیں۔ یہاں تک کہ ژ کی ردیف (ژاژ) کے ساتھ بھی ایک غزل شامل کی گئی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے زبان پر محشر صاحب کی قدرت کا اور مظہر امام نے ان کی (محشر صاحب کی) کلاسکیت اور کہنہ مشقی کا اعتراف کیا ہے۔ سید ظفر ہاشمی نے محشر کے فن کا احاطہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا اسلوب، اندازِ بیان، اصلاحی پہلو، اسلامی تلمیحات، استعارہ وغیرہ حیرت انگیز حد تک علامہ اقبال کی شاعری سے مماثلت رکھتا ہے۔ محمد بدیع الزماں نے بھی ان کی فکر پر اقبال کے اثر کی بات پر زور دیا ہے۔ خود مجھے بھی لگتا ہے کہ علامہ اقبال محشر صاحب کے ذہن پر اس قدر چھائے ہوئے ہیں کہ اگر آج علامہ زندہ ہوتے تو خود محشر صاحب سے متاثر ہو جاتے۔

صفحات: 112: **قیمت**: 100 روپے

ملنے کا پتہ: کامران پبلکیشنز، رحمت علی بلڈنگ، دیوان بازار، کٹک۔ 753001

جسم وجاں سے دور / خلیل مامون

خلیل مامون کی شخصیت ایک پر نوا کی شخصیت ہے۔ وہ ستارہ جو اچانک explode ہوتا ہے اور سب کچھ منور کر دیتا ہے۔ دو سال پہلے انھیں کرناٹک اردو اکیڈمی کا سربراہ بنایا گیا تو یوں لگا جیسے اکیڈمی روشنی کی رفتار سے سفر کرنے لگی ہے۔ ہندوستان میں اردو کی اب تک کی سب سے خوب صورت کتابیں اکیڈمی کے بینر تلے شائع ہوئیں، اردو کو زبان سے بھی آگے بڑھ کر ہندوستانی ثقافت وتہذیب کے دل کش اور اصلی چہرے کے طور پر سامنے لانے والے پروگرام مرتب کیے گئے، اور گزشتہ سال بنگلور میں

عالمی اردو کانفرنس منعقد کرانے کے لئے عدیم المثال منصوبہ بندی کی گئی لیکن بھارتیہ جنتا پارٹی کی ریاستی حکومت یہ سب ہضم نہیں کر سکی۔ سپرنووا ایکسپلوڈ ہوا۔ کرناٹک اکیڈمی کے بندھنوں سے مکتی ملی۔ خلیل مامون نے اردو کی اور اپنی آن کو قائم رکھنے کے لیے یہ کانفرنس خود اپنے ذاتی وسائل سے منعقد کرائی۔ اور اس کے بعد... سپرنووا ابھی تک روشن ہے۔

خلیل مامون سے میری ملاقات صرف ان کی شاعری کے وسیلے سے ہے۔ ان کے ایک مجموعے 'آفاق کی طرف' پر 'کتب نما' میں تبصرہ ہو چکا ہے اور اب یہ مجموعہ سامنے ہے جو 2 قطعات، 52 نظموں اور 4 غزلوں پر مشتمل ہے۔ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں اور ان کی شاعری پر کوئی واضح تبصرہ کرنے سے میں اس لیے قاصر ہوں کہ ابھی میں اسے پوری طرح انگیز کرنے کے مرحلے میں ہوں۔ ان کے پہلے شعری مجموعے 'آفاق کی طرف' پر تعارفی تبصرہ کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ خلیل مامون کی شاعری اتنی سیدھی سادی، سپاٹ اور زود فہم نہیں کہ آپ اسے بے ضرر یا معمولی کہنے لگیں۔ اب اس مجموعے کے مطالعے کے بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کا بیان اتنا گنجلک، چیستانی، علامتی اور ناقابلِ فہم بھی نہیں ہے کہ جو جس کے جی میں آئے وہ رائے ان کی شاعری کے بارے میں قائم کر لے۔ نہ سمجھ میں آنے والی جدید شاعری کی یہی 'خوبی' ہوتی ہے کہ اس کی تعریف میں آپ کچھ بھی لکھ سکتے ہیں۔ کوئی آپ کے کہے کو غلط ثابت نہیں کر سکے گا۔ یہاں تک کہ خود شاعر بھی آپ سے اختلاف کرنے لگے اور کہے کہ میری شاعری فضول ہے تو وہ بھی اپنے حق میں کوئی ثبوت نہیں لا سکے گا۔ یہ میں اس لیے جانتا ہوں کہ اس طرح کی صورت حال خود میرے ساتھ ایک دفعہ پیش آ چکی ہے۔ قصہ دل چسپ ہے، اس لیے سن لیجیے۔

لڑکپن کا زمانہ تھا۔ شہر (سہارنپور) کے سینیئر شاعروں کے ساتھ ہم یار دوست مسخرہ پن کرتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ جدیدیت کے حامیوں کو چھیڑنے کے لیے شرارت سوجھی۔ میں نے چند بے معنی شعر بے جوڑ مصرعوں کو ملا کر کہے اور ایک شعری نشست میں جدید غزل کہہ کر سنا دیے۔ میری اور دوستوں کی حیرت کا ٹھکانہ نہیں رہا کہ جدیدیت پسند ہر شعر پر اچھل اچھل کر داد دے رہے تھے۔ خاص طور سے مطلع تو بار بار پڑھوایا گیا، وہی یاد بھی رہ گیا ہے۔ کچھ اس طرح تھا:

> گردشِ وقت نہ ٹھہری مری رفتار کے ساتھ
> میرا سایہ بھی چلا سایۂ دیوار کے ساتھ

غزل ختم ہونے پر جب یہ دولخت مطلع دوبارہ پڑھوایا گیا تو میری ہنسی چھوٹ گئی۔ مجھے ہنستے دیکھ کر دوست بھی سب ہنس پڑے۔ ایک سنجیدہ جدیدیت پسند نے چلا کر اس بدتمیزی کا سبب پوچھا۔ انھیں پوری بات بتائی گئی کہ جناب یہ سب بے معنی شعر قصداً اور نیت باندھ کر کہے گئے ہیں۔ اس پر محفل میں خاموشی چھا گئی۔ تبھی وہ صاحب بولے، آپ بکواس کرتے ہیں۔ یہ تمام شعر بامعنی ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے شعروں کی تشریح شروع کر دی۔ مصرعوں کے ہر دوسرے تیسرے لفظ کو کسی نہ کسی ادق اور پیچیدہ مسئلے کی علامت قرار دیا اور ہر شعر میں معنی نکال کر رکھ دیے۔ اس کے بعد فرمایا۔ اگر میری بات غلط ہے تو ثابت کر کے دکھائیے کہ یہ شعر بے معنی ہیں! یہ سن کر ہم بھی سناٹے میں آ گئے اور ایک دوسرے کی بغلیں جھانکنے لگے۔

جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں خلیل مامون کی شاعری نہ تو سیدھی سپاٹ ہے نہ بہت پیچیدہ۔ وہ کہیں ان دونوں کے بیچ متوازن سطح پر ہے جہاں نہ شعر مجروح ہوتا ہے نہ اس کا مفہوم۔ ذرا یہ مختصر سی نظم دیکھیے۔ عنوان ہے 'اپنے بچوں سے':

> دروازے پر
> انتظار میں بیٹھے بیٹھے
> یوں ہی ساری عمر گزر جائے گی
> نرم ملائم ریشم جیسے چہرے پر
> جھریاں آ جائیں گی
> کالے بالوں میں چاندی چھا جائے گی
> آنکھیں پتھرا جائیں گی
> ندی نالوں دریاؤں سے
> سارا پانی بہہ جائے گا
> سمندر بھی ہوا بن کر اڑ جائے گا
> صحراؤں سے ساری ریت بکھر جائے گی
> پیڑ بھی سو جائیں گے
> روح و جسم کی ہری بھری وادی میں
> جذبوں کے بوجھل پتوں پر
> کالی رات اتر آئے گی
> اندھیرے میں بیٹھے بیٹھے
> ماں بوڑھی ہو جائے گی
> تم کب آؤ گے؟

اسی طرح ان کی تقریباً سبھی نظموں میں مفہوم مصرعوں کے اندر ہلکی ہلکی

جھلک دکھاتا ہے لیکن مصرعوں کے بیچ سے جھانکنے پر بے حجاب ہو اٹھتا ہے۔غزلیں اس مجموعے میں صرف چار ہیں اور دوسری غزل کے ان اشعار پر میں یہ تعارف نامہ ختم کرتا ہوں:

پکار کر چلا گیا کہاں پہ تو
نہ تو زمین پر نہ آسماں پہ تو
غبارِ جاں سے پھوٹ پڑے گی بیڑ میں
لگا رہا ہے مہر کیوں زباں پہ تو
سزا بھگت رہا ہوں میں زمین پر
چمک رہا ہے دور آسماں پہ تو
خلیلِ دشتِ غم کی گرد راہ ہے
اڑان بھر رہا ہے کہکشاں پہ تو

صفحات:164؛ قیمت:360روپے
ناشر:الفاظ پرنٹرز پبلکیشنز 22/1A.
4th Main,SK Garden, Bengalore-560046

پروین شیر،عہدِ ناتمام کی شاعرہ/عتیق اللہ

شکر ہے میری پسندیدہ شاعرہ،اپنی ذات میں مکمل فنکارہ،'ادب ساز' کی مخلص معاون اور اس کے کئی شماروں کے لیے بلا معاوضہ تصویریں پینٹ کرنے والی دردمند مصورہ،پروین شیر کے تعلق سے ایک ایسی کتاب بھی منظر عام پر آگئی ہے جسے زخمی ہونے کا خطرہ اٹھائے بغیر پڑھا جا سکتا ہے۔یہاں تک کہ لیٹ کر،سینے پر رکھ کر بھی آپ اسے بلا خوف وخطر پڑھ سکتے ہیں۔اس سے پہلے ان کے ایک شعری مجموعے'کرچیاں' کے کافی ٹیبل بک ایڈیشن کو میں نے اسی پوز میں پڑھنے کی کوشش کی تھی تو چند نظموں کے مطالعے سے ہی دل بری طرح دھڑکنے لگا۔مجموعہ بہ لحاظ معیار وضخامت اتنا وزنی نکلا کہ دورانِ مطالعہ ضرور منہ سے واہ واہ نکلتی رہی لیکن اگلے کئی روز تک سینہ آہ آہ کرتا رہا اور کئی بدنام زمانہ بام آزمائے تب کہیں جا کر پسلیوں کا درد دور ہوا۔

اس کے بعد'کرچیاں' سے بھی زیادہ وقیع کتاب'نہال دل پر سحاب جیسے' کا وزنی پارسل موصول ہوا۔آستینیں چڑھا کر پارسل کھولا،کتاب کو میز پر رکھ کر احتیاط سے ورق گردانی کی اور صحیح معنوں میں خود کو پروین شیر کی شاعری سے شرابور وسرشار کیا۔

ویسے میرے کمرے میں اور بھی کئی وزنی کتابیں ہیں جن کا مطالعہ کرنے سے پہلے قاری کو احتیاطاً فرسٹ ایڈ باکس،درد کش گولیوں اور بام جیسا سامان ساتھ رکھ لینا چاہیے۔ان میں ایک کتاب عزیزی پروفیسر محمد ظفر الدین کی بھیجی ہوئی ہے جو دراصل ڈاکٹر کرشنا مورتھی مڈی گونڈا کا انگریزی میں ترجمہ شدہ 'دیوانِ غالب' ہے (تعارفی تبصرہ آگے آئے گا)۔ایک اور ہے،دہلی اردو اکادمی کی چھاپی ہوئی جان پلاٹس کی 1884 کی'اردو کلاسیکل ہندی اینڈ انگلش ڈکشنری'۔لیکن وزن میں ان سبھی کتابوں کی اماں ہے قومی اردو کونسل کی نہایت وقیع وضخیم 'انگریزی اردو لغت' جو چھ جلدوں پر مشتمل ہے اور ہر جلد موٹے کاغذ کا استعمال کیے جانے کے سبب سے اس قدر وزنی ہو گئی ہے کہ میں جب بھی کسی لفظ کا مطلب دیکھنے کے لیے متعلقہ جلد الماری سے اٹھا کر لاتا ہوں تو بازوؤں میں درد کی وجہ سے وہ لفظ ہی بھول جاتا ہوں جس کے لیے ڈکشنری کو زحمت دی تھی۔مگر کیا کریں مجبوری ہے۔اس کے بغیر کام ہی نہیں چلتا کیوں کہ ابھی تک اس سے زیادہ جامع کوئی انگلش اردو ڈکشنری چھپی ہی نہیں ہے اور ابھی تک کوئی ایسا انگریزی لفظ میرے مطالعے میں نہیں آیا ہے جو اس میں موجود نہ ہو۔چنانچہ راقم کی انگریزی دانی میں کچھ توازن اس ڈکشنری کی بدولت بھی آیا ہے۔یہ اور بات ہے کہ کئی مرتبہ ڈکشنری کو اٹھاتے وقت خود میرا توازن بگڑ چکا ہے اور میں فرش پر گرتے گرتے بچا ہوں۔

پروین شیر نے اب تک جو کتابیں شائع کرائی ہیں ان کا وزن اس لئے بھی زیادہ رکھا گیا تا کہ ان کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول ہو سکے جو وہ بے سہارا بچوں کی مدد کے لیے اقوام متحدہ کے فنڈ میں دینے والی تھیں۔پیش نظر کتاب اردو کے معتبر نقاد پروفیسر عتیق اللہ نے مرتب کی ہے جو خود اچھے خاصے شاعر ہونے کے باوجود بے حد معتبر مانے جاتے ہیں۔انتساب جناب مغنی تبسم کے نام کیا گیا ہے۔نہایت سلیقے سے چھاپی گئی یہ کتاب پروین شیر کے فن اور شخصیت کے تمام جانے انجانے گوشوں کا احاطہ کرتی ہے۔کتاب کو طرزِ زندگی،طرزِ ادا،طرزِ خیال،طرزِ رنگ وآہنگ،طرزِ خطاب،مقدمات کی 'کرچیاں'،مقدمات'نہال دل پر سحاب جیسے'،طرزِ فسوں،طرزِ تفہیم اور صفِ مژگاں کے عنوانات سے 10 حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ان ابواب میں محمد نعمان خاں،بیتھر بیرل،امجد اسلام امجد،سلطان جمیل نسیم،ایس ایم معین قریشی،وارث علوی،شکیل الرحمٰن،محمد علی صدیقی،صدیق الرحمٰن قدوائی،کرامت غوری،قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی،رئیس الدین رئیس،انتخاب حمید،جاوید انور،وہاب اشرفی،علی احمد فاطمی،عبداللہ جاوید،تسلیم الٰہی زلفی،احمد امتیاز،انور سدید،سید محمد عقیل،لطف الرحمٰن،نیلوفر سلطانہ،افتخار امام صدیقی،ارمان نجمی،سلیم شہزاد،سیفی سرونجی،عشرت رومانی،خالد اشرف،افتخار اجمل

شاہین، محمد ایوب واقف، حیرالذفو کرٹ، گلزار جاوید، قمر رئیس، جمیل جالبی، حمایت علی شاعر، پیرزادہ قاسم رضا صدیقی، ستیہ پال آنند، سلطانہ مہر، غیر جہاں، سید تقی عابدی، علیم اللہ حالی، شاہد ماہلی، ساحر شیوی، حکیم سید ظل الرحمٰن، ابن کنول، عتیق اللہ، رے ڈرکس، میری این ٹی گلس، مغنی تبسم، ف س اعجاز، سلطانہ مہر، کوثر صدیقی اور خود پروین شیر کی تحریریں تقسیم ہیں۔ لیجیے، تبصرے کی آدھی اسپیس نام گنوانے میں ہی نکل گئی۔ اب اس کے سوا کیا کہوں کہ اس دور کے تقریباً سبھی اہم اردو ادیبوں نے پروین شیر کے فن کی قدر و قیمت کا اعتراف کیا ہے۔ اور حیرت صرف اس بات پر ہوتی ہے کہ ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی ان اہم ادیبوں میں کیوں شامل نہیں ہیں۔

بہرکیف کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں پروین شیر کی شاعری، مصوری اور موسیقی سے متعلق مضامین کے علاوہ، ان کے تحریر کردہ چند افسانے اور تنقیدی مضامین بھی شامل ہیں جو کم ازکم میرے لیے تو بالکل نئی چیزیں ہیں۔ چالیس سے زائد صفحات انگریزی میں ہیں جن میں مقصود جعفری، عبدالستار غزالی، گوپی چند نارنگ، احمد فراز، محمد علی صدیقی، ولی عالم شاہین، اسٹیفن ڈی بوریز، سارہ ایم میکلن، پرویز جمیل، کیون ہل اور کوینٹین ملزفین کے تاثرات شامل کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ پروین شیر کی 14 پینٹنگز بھی کتاب میں ہیں۔ مجھے یقین ہے یہ کتاب پروین شیر کو اردو زبان وادب میں صحیح اور جائز مقام ورتبہ دلانے میں معاون بلکہ کچھ حد تک فیصلہ کن بھی ثابت ہوگی۔

صفحات: 600؛ **قیمت**: 500 روپے

زیرِ اہتمام: کتابی دنیا، 1955 گلی نواب مرزا، ترکمان گیٹ، دہلی۔110006؛ موبائل: 9313972589

دیوانِ غالب/کرشنا مورتھی مڈی گونڈہ

جی ہاں، یہ وہی دیوانِ غالب ہے جس کا ذکر اوپر آیا ہے، اور جسے دیکھ کر آپ بے ساختہ کہہ اٹھیں گے کہ... یہ اٹھائے نہ اٹھے اور بٹھائے نہ بنے!... اور میر تقی میر جس کی بابت فرما گئے تھے کہ... کب یہ مجھ ناتواں سے اٹھتا ہے!

سچ کہتا ہوں، اگر بے دھیانی میں آپ نے اسے صرف ایک ہاتھ سے یہ دیوان اٹھانے کی کوشش کی تو یاد رکھیے کھوا بھی اکھڑ سکتا ہے۔ تاہم تقریباً پانچ سو جہازی صفحات پر پھیلے ہوئے اس دیوان کی اہمیت و افادیت اس کے وزن سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے۔ یہ بیک وقت اردو میں بھی ہے اور انگریزی میں بھی۔ غالب کا ہر شعر دائیں طرف اردو میں لکھا گیا ہے تو بائیں طرف سامنے وہ رومن رسم الخط میں بھی موجود ہے۔ اور دونوں کے نیچے شعر کا انگریزی میں ترجمہ کر دیا گیا۔ ترجمہ اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ کم سے کم لفظوں میں اس کا مفہوم پوری طرح نہ سہی بڑی حد تک ضرور سمجھ میں آجاتا ہے۔ اوپر آپ ایک تعارفی تبصرے میں پڑھ آئے ہیں کہ ترجمہ کس قدر مشکل کام ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی تو ترجمے کو بھی ایک طرح کی تخلیق مانتے ہیں۔ اور پھر شاعری کا ترجمہ! وہ بھی غالب کے شعر کا ترجمہ۔ اردو کے اس سب سے بڑے شاعر کے شعر تو اردو میں ہی مشکل سے ترجمہ ہو پاتے ہیں۔ بڑے بڑے عالم فاضل نقاد دیوانِ غالب پڑھ کر ماہرِ غالبیات بن گئے مگر غالب کا شعر نہ سمجھ سکے۔

لیکن اردو کے سوادِ اعظم سے دور براعظم امریکہ میں بیسوں سال سے سرجری کرنے والے ایک عاشقِ اردو و غالب نے نہ صرف اس شاعر کو اچھی طرح سمجھا ہے بلکہ انگریزی والوں کو سمجھا دیا ہے۔ اور وہ بھی اتنی سیدھی سادی عام فہم انگریزی میں کہ بعض اشعار آپ کو اردو میں کم سمجھ میں آئیں گے مگر انگریزی میں ڈاکٹر کرشنا مورتھی مڈی گونڈا کے ترجمے کی مدد سے آپ بخوبی سمجھ لیں گے۔ مثال کے طور پر، غالب کے اس مشہور زمانہ اردو شعر کو لیں:

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بردن صد دل پسند آیا

اس کا ترجمہ یوں ہے:

The fun of counting beads has become agreeable to my beloved, who likes difficulties.She enjoys the fun of capturing hundred hearts by a single hand.

آزمائش کے لیے یوں ہی شرارتاً میں نے غالب کی ایک اور غزل کا مطلع تلاش کیا کہ دیکھتے ہیں اس کا مطلب کس طرح بیان کیا ہے ڈاکٹر صاحب نے۔ اور صاحب واقعی پڑھ کر مزا آگیا۔ آپ بھی لطف لیجیے:

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منھ سے مجھے بتا کہ یوں

Dont show me the unblossomed bud (close mouth) from a distance and say me " It's done in this manner",When I ask you for a kiss , tell me with your mouth , that this is done in this manner!

اگر میں یہ کہوں کہ مجھے غالب کا شعر اس ترجمے کے آگے تشنہ محسوس ہوا تو پلیز مسکرایئے گا نہیں۔ اور میری نیت پر تو خدا کے لیے بالکل شک نہ کریں۔ اس کے بعد ایک اور شعر کا ترجمہ پڑھے بغیر نہیں رہ سکا۔

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

Slapping and fist is not her style , who is an entirely elegent person.Ghalib! This is because I myself exceeded the limits one day.

میں جانتا ہوں آپ کیا سوچ رہے ہوں گے۔ یہی نا کہ میری نیت میں پیچ پچ کھوٹ ہے۔ جی نہیں۔ ایسا قطعی نہیں ہے۔ میں دراصل یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے پیش دستی کا کیا مطلب نکالا ہے۔ اور صاحب میں واقعی ان کی استادی کا قائل ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کس surgical precision کے ساتھ شعر کو explain کیا ہے اور 'پیش دستی' کو پڑھنے والے کی تصوراتی مشق پر چھوڑ دیا ہے کہ جیسے چاہے نقش بنا لے۔

غالب کی شاعری کا ہندوستان کی اور دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ انگریزی میں بھی کئی تراجم ہو چکے ہیں۔ مترجمین میں یوسف حسین خاں، پروفیسر نذیر احمد خاں اور پروفیسر محمد مجیب جیسی اردو تنقید و تحقیق کی اہم شخصیتوں سے لے کر قرۃ العین حیدر اور علی سردار جعفری جیسے عظیم تخلیق کار تک شامل ہیں جنھوں نے اس نابغہ روزگار ہستی کے کلام کو انگریزی میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ حیدراباد کے، جامعہ عثمانیہ کے تعلیم یافتہ اور عثمانیہ میڈیکل کالج سے ڈاکٹری کرنے والے سرجن، ڈاکٹر کرشنا مورتھی نے جو ترجمہ کیا ہے وہ اس لحاظ سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کی فکر کا نتیجہ ہے جسے غالب اور اردو دونوں سے عشق ہے اور جس کا اردو ادب میں پچھلا کوئی خاص ریکارڈ نہیں ہے۔ بلکہ جس کی مادری زبان بھی اردو نہیں ہے اور جس کے شب و روز ادب کی دنیا سے بہت دور طب اور معالجے کی دنیا میں گزرتے ہیں۔ میری ڈاکٹر کرشنا مورتھی سے کوئی واقفیت نہیں، اس لیے گمان غالب ہے کہ وہ بھی مجھے نہ جانتے ہوں گے۔ ویسے اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، کیونکہ میں خود بھی اپنے آپ کو کہاں جانتا ہوں۔ تاہم غالب بیچ میں ہیں تو ڈاکٹر صاحب غیر بھی نہیں ہیں۔ ان کا یہ وزنی ترجمہ عزیز دوست پروفیسر محمد ظفر الدین نے مجھے تحفتاً دے کر گراں بار کیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر کرشنا مورتھی نے کسی ستائش اور صلے کی پرواہ کیے بغیر جس لگن اور محبت سے اسے چھپوایا ہے اور اس سے بھی زیادہ محنت سے غالب کا ترجمہ کیا ہے اس کا عشر عشیر بھی ہم دن رات اردو کا دم بھرتے رہنے والوں کو میسر آ جائے تو اردو اور ہم کہیں کے کہیں پہنچ جائیں۔ غالبیات میں دل چسپی رکھنے والوں کو ڈاکٹر کرشنا مورتھی کا احسان مند ہونا چاہیے۔

صفحات: 494: قیمت: ؟؟؟؟

ناشر: محترمہ شگفتہ، مطبع: سلور لائن آفسیٹ پرنٹرس، حیدراباد، اے پی۔

ڈاکٹر کرشنا مورتھی موڈی گونڈہ، 22 Oakwood Drive New Hartford NY 13413, USA

پندرہ پانچ پچھتر/گلزار

وہ جو اردو شاعری میں پارس پتھر نہیں بلکہ پارس ہیرا بن کر نمودار ہوا ہے، جس کے لمس سے ہر شے ایک شعر بن جاتی ہے، اور جس سے چھو جانے والا ہر خیال ایک نظم بن کر ہمارے احساسات میں گونجنے لگتا ہے، اس انوکھے شاعر کی منفرد نظموں کا یہ خاص انداز کا مجموعہ اردو ادب کی سب سے پراسرار مگر محترم شخصیت پروفیسر جابر حسین کے اردو مرکز کی وساطت سے اردو والوں تک پہنچا ہے۔ پروفیسر صاحب کی پراسراریت کا ذکر ذرا بعد میں، پہلے گلزار کا حق تو ادا کر لیں۔ ان کے گزشتہ کلیات نما مجموعے 'یار جلاہے' پر تبصرہ لکھتے وقت میں نے ان کی شاعرانہ ہستی کے تعلق سے جو کچھ عرض کیا تھا اسے یہاں دوہرانا چاہوں گا کیونکہ میں نہ صرف اب تک اپنی رائے اور تجزیے پر قائم ہوں بلکہ اس میں یہ نیا مجموعہ پڑھ کر مضبوطی بھی آئی ہے۔ میں نے لکھا تھا:

"گلزار سچے شاعر ہیں۔ ان کا شعور کائنات کی ہر شے میں شعر ڈھونڈ لیتا ہے۔ چاند میں ستارے میں، خاک میں زمین میں، پیڑ میں ٹہنی میں، دھوپ میں بدن میں، کبوتر میں گلہری میں، رستے میں کتاب میں، جنگل میں گلاب میں... جہاں جہاں بھی گلزار کی سوچ پہونچتی ہے وہاں ایک نظم سانس لینے لگتی ہے۔ میں جتنا گلزار کی شاعری کو پڑھتا اور سوچتا ہوں وہ مجھے آج کے کسی بھی بڑے شاعر سے کہیں زیادہ شاعر محسوس ہوتے ہیں۔ زیادہ۔ یعنی درجہ بندی کی بات نہیں۔ کسی شاعر سے بڑا یا چھوٹا ہونے کی بات بھی نہیں ہے۔ کینوس کی، کینڈے کی اور پیمانے کی بات ہے۔ عناصر کی بات ہے کہ کہاں کہاں سے کن کن چیزوں کو خام مواد کے طور پر چن کر آپ شاعری خلق کرتے ہیں۔ گلزار اس کائنات کے کسی بھی کونے کھدرے سے raw maeterial اٹھا کر، اسے اپنی سوچ کے رنگوں میں گوندھ کر، اپنے سخن کے چاک پر گھما کر، جمالیات کی دھیمی آنچ میں تپا کر ایک خوب صورت، خوش نما، آب دار فن پارہ تخلیق کرنے پر قادر ہیں۔"

یہ وصف خدا میں ہو تو ہو کہ اس کائنات کا سب سے بڑا تخلیق کار اسی کو مانا جاتا ہے۔ مذہبی صحیفے اس الوہی شاعری سے بھرے پڑے ہیں، جسے صحیح طور پر سمجھنے میں نہ جانے کتنی نسلیں کھپ چکی ہیں۔ اردو میں فی زمانہ اکیلے گلزار ہیں جن کی شاعری سے جڑ کر قاری پوری کائنات کے ساتھ سفر کرنے لگتا ہے۔ مردہ اور بے جان پڑے ہوئے لمحوں کو سمیٹ کر ایک من موہنی اور جیتی جاگتی شکل دینے کا یہی تخلیقی ہنر ہے جو شاعر کو اقلیم سخن کا پروردگار بناتا

ہے اوراس کے رتبے کوخدا کے قریب لے آتا ہے۔

گلزار سے بہت پہلے، میاں نظیر، شہر اکبر آباد کے گلی محلوں اور میلے ٹھیلوں میں کندھے پر اپنے قلم کا ویڈیو کیمرہ اٹھائے، زندگی کے ہر رنگ، ہر سُر، ہر تال، ہر تھرکن اور ہر درشن کو زندگی اور احساسات کی فوٹو البم میں سجاتے پھرتے تھے۔ آج وہی کام گلزار کا قلم کیمرا بھی کر رہا ہے۔ فرق فکری عمل اور مفہوم کی حد تک اس کے تکنیکی ارتقا کا ہے۔ نظیر کا کیمرہ ڈھائی سو سال پرانا تھا، گلزار کا جدید ترین۔ اس کیمرے کا لینس بڑا ہے اس لیے اس کی رینج بھی زیادہ ہے۔ منظر کو وہ جتنا چاہیں زوم ان اور زوم آؤٹ کر سکتے ہیں۔ روشنی اور فاصلوں کی کمی بیشی سے کیمرے کی کارکردگی متاثر نہیں ہوتی۔ وہ ہمہ جہت اور ہمہ پہلو عکاسی پر قادر ہے۔ رنگ اور زاویوں کے ساتھ، آواز، ذائقے، لمس، حرارت اور کشش کے درجات کو بھی امیج کا حصہ بنا سکتا ہے۔

نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ: پیڑ بولنے لگتے ہیں... بارش کو ہچکیاں آتی ہیں... سورج منکا بن کر اُلٹ جاتا ہے... وادی کو نزلہ رہتا ہے... کاغذ پر لفظ (بیج) پھوٹنے لگتے ہیں... تارے جمائیاں لیتے ہیں... آنکھیں رقعے لکھتی ہیں... ڈوبتا سورج ایک پلین کے نیچے آتے آتے بچ جاتا ہے... مسجد کے مینار کی باہیں مندر کے گلے سے لپٹ جاتی ہیں... کہاں کہاں تک حوالے دوں۔ ان معجزوں سے اور اس ملٹی ڈائی مینشنل امیجنگ Multi dimentional imaging سے یہ کتاب بھری پڑی ہے۔ اس طرح کی شاعری فی الوقت اردو شاعری میں گلزار کے علاوہ کہیں نہیں ملتی۔ تھوڑی سی اس کی جھلک جینت پرمار کے یہاں ضرور ملتی ہے بس! اور دونوں کو ملا کر دیکھیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اردو شاعری کا ڈکشن تبدیل ہو رہا ہے۔

ذرا دیکھیے تو سہی۔ یہ گلزار... یہ جلاہا، کیسے کیسے رشتے بُن دیتا ہے، یہ رنگ ریز ہتلاتے ہکلاتے رنگوں کو کس کس طرح بولنا سکھاتا ہے، یہ راج مستری اپنی دھن میں کیسی کیسی کہانیاں در و دیوار اور ان کی طاقوں میں چن دیتا ہے، یہ ہمارے آپ کے محلے کا درزی کن کن سلوٹوں کو کاٹ تراش کر ایک حسین مرقعہ کا جامہ پہنا دیتا ہے، یہ ہمارا کسان کیسے کیسے حالات میں لو کے تھپیڑوں پر امیدوں کی فصلیں لکھ دیتا ہے، یہ شوہر، یہ عاشق، یہ کلرک، یہ مسافر، یہ مصور، یہ میراثی، یہ سنگیت کار، یہ سنگ تراش، یہ مداری، یہ تماشائی... اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کائنات میں کچھ بھی بے مصرف، بے معنی نہیں ہے۔ وہ ہمیں شعر و شعور کی انجان وادیوں کی سیر کراتا ہے، ہمیں حیران کرتا ہے، گدگداتا ہے، ہنساتا ہے، رلاتا ہے اور بتاتا ہے کہ... یہ ہے زندگی!
یہی ہے زندگی!!

میں نے اوپر اس مجموعے کو منفرد نظموں کا خاص انداز کا مجموعہ لکھا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس میں نظموں کے پندرہ کولاژ collage ہیں اور ہر collage پانچ نظموں پر مشتمل ہے۔ اس طرح مجموعے کا نام وجود میں آیا ہے جو بظاہر کسی شہر کا لینڈ لائن فون نمبر، کسی جیل کے قیدی کا نام، کسی دفتری فائل کا ریفرنس نمبر، کسی ای میل آئی ڈی کا پاس ورڈ password، یا کسی کمپنی کے پراڈکٹ کا کوڈ code نمبر معلوم ہوتا ہے۔ مجھ جیسے تشنہ کاموں کے لیے یہ اس خزانے سے بھری ہوئی تجوری کا نمبر ہے جو میرے آپ کے مشاہدات، محسوسات اور تجربات کی روشنی کا خزانہ ہے۔ تجوری کھلتی ہے اور ہم روشنی میں نہا جاتے ہیں۔ اس میں پانچ شہروں (مدراس، بمبئی، نیویارک، دلی اور کلکتہ) اور پانچ درختوں (املتاس، املی، خوبانی/اخروٹ، پام اور پیپل) والے کولاژ 'ادب ساز' کے گزشتہ شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اب کتاب چھپی ہے تو گلزار صاحب نے، نہ جانے کیوں، درختوں والے کولاژ سے املتاس اور پام والی نظمیں ہٹا کر وہاں دو اور نظمیں رکھ دی ہیں جو یوں تو بہت عمدہ ہیں لیکن پہلی دو نظموں کو ہٹانے کی لاجک اب بھی وضاحت طلب معلوم ہوتی ہے۔

کتاب بڑے سلیقے سے پروفیسر جابر حسین نے غالباً ترتیب و تدوین میں ذاتی دل چسپی لے کر 'اردو مرکز عظیم آباد' سے چھاپی ہے۔ فلیپس flaps پر حسین صاحب کی بہت ہی حسین نظم موجود ہے جو گلزار کے شعر و شخصیت کو دل سے محسوس کراتی ہے۔ بیک وقت اردو ہندی اور انگریزی کے ادیب، تینوں زبانوں میں 14 کتابوں کے مصنف، یادداشتوں اور افسانوں پر مشتمل کتاب 'ریت پر خیمہ' کے لیے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ، راجیہ سبھا کے رکن، اقلیتوں اور دلتوں کے حقوق کے لیے خاموشی سے کام کرنے والے... یہ پروفیسر جابر حسین کا کم سے کم تعارف ہے۔ اس کے باوجود مجھے ان کی شخصیت پر اسرار اس لیے لگتی ہے کہ وہ عام ادیبوں اور عوامی شخصیتوں سے مختلف ہیں۔ میڈیا کی چمک دمک سے دور رہ کر اس خاموشی سے تخلیقی کاموں میں مصروف رہتے ہیں کہ ان سے مجھ جیسے مداح کی ملاقات محض دو یا تین دفعہ ٹیلی فون پر ایک دو منٹ کی مختصر گفتگو تک محدود ہے۔

اب آخر میں ان دو خوب صورت نظموں پر یہ تحریر تمام کرتا ہوں جو درختوں والے کولاژ سے حذف کی گئی ہیں۔ پڑھیے اور دیکھیے کہ کیا یہ درخت ہم انسانوں سے یا ہم انسان ان درختوں سے الگ اور مختلف ہیں:

پام

دور سنسان سے ساحل کے قریب
اک جواں پیڑ کے پاس

عمر کے درد لئے، وقت کا میلا دوشالہ اوڑھے
بوڑھا سا پام کا اک پیڑ، کھڑا ہے کب سے
سینکڑوں سالوں کی تنہائی کے بعد
تھک کے کہتا ہے جواں پیڑ سے... "یار!
سرد سناٹا ہے! تنہائی ہے!
کچھ بات کرو!"

املتاس

کھڑکی پچھواڑے کی کھلتی تو نظر آتا تھا
وہ املتاس کا یک پیڑ، ذرا دور اکیلا سا کھڑا تھا
شاخیں پنکھوں کی طرح کھولے ہوئے
اک پرندے کی طرح
ورغلاتے تھے اسے روز پرندے آکر
جب سناتے تھے وہ پرواز کے قصے اس کو
اور دکھاتے تھے اسے اڑ کے قلا بازیاں کھا کے
بدلیاں چھو کے بتاتے تھے مزے ٹھنڈی ہوا کے
آندھی کا ہاتھ پکڑ کر شاید
اس نے کل اڑنے کی کوشش کی تھی
اوندھے منھ بیچ سڑک جا کے گرا ہے!!

صفحات:150 : **قیمت**:150 روپے

دستیاب: اردو مرکز عظیم آباد، 247، ایم آئی جی، لوہیا نگر، پٹنہ۔800020
فون اور فیکس: 0612-2354077

پردے کے پیچھے/نسیم سہارنپوری

ظ انصاری ، راجندر کمار گرگ اور نسیم سہارنپوری وہ تین شخصیتیں ہیں جنھیں سہارنپور شہر کے بزرگ ادیبوں حنیف سیمابی، کوثر صدیقی ،ارم عمر پوری، ظہور احمد ظہور، حمید قریشی، نے ہم اٹھارہ بیس برس کے نوسکھیے ترقی پسند ادب پسندوں، ساحر اور فیض کے عاشقوں کے لیے مقامی اساطیری کردار بنا دیا تھا اور ہم ان سے ملاقات کے خواب اس لیے بھی دیکھا کرتے تھے، کہ تینوں ہمارے ہی شہر کے تھے لہٰذا ان خوابوں پر ہمارا حق بھی تھا۔

اکثر یہ بزرگ ان اصحاب ثلاثہ کے قصے دوہراتے تھے۔ ان تینوں نے شہر میں لٹریری کلب کے نام سے ایک ادبی تنظیم قائم کی تھی جو مشاعرے اور سیمینار کراتی تھی اور کچھ حد تک کمیونسٹ پارٹی کی محاذی ادبی تنظیم کے طور پر کام کرتی تھی۔ ظ انصاری کو تو دنیا جانتی ہے۔ راجندر کمار گرگ خود ادیب وغیرہ نہیں تھے لیکن الہ آباد یونیورسٹی میں طالب علمی اور فراق گورکھ پوری کی شاگردی کی وجہ سے ادب کا بڑا استھرا ذوق اور دل چسپی رکھتے تھے۔ نسیم سہارنپوری شاعر تو تھے لیکن ادبی ایکٹی وسٹ activist زیادہ تھے اور تنظیمی صلاحیت ان میں خوب تھی۔ ان تینوں میں ظ انصاری نے سب سے پہلے سہارنپور چھوڑا، ان کے بعد نسیم بھی بمبئی کی فلم نگری چلے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لٹریری کلب نے دم توڑ دیا۔ برسوں بعد نئی نسل کے کچھ لڑکوں کو اسے زندہ کرنے کا خیال آیا اور حنیف سیمابی و کوثر صدیقی کی سرپرستی میں راقم اور عزیز دوست ریاض حیدر نے لٹریری کلب کو دوبارہ فعال کر دیا۔ یہاں تک کہ تنقیدی ادبی نشستوں کا وہ سلسلہ بھی جاری کیا جس کی بنیاد ظ انصاری نے ڈالی تھی۔ اس دوران گرگ صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ ان حرکتوں سے بہت خوش ہوئے۔ عرصہ تک ان کا تعاون ہمیں حاصل رہا۔ نسیم صاحب تو نہیں ملے لیکن ان کے بھائی حسین نواز ہاتھ آ گئے۔ نہایت دل نواز اور شعر و ادب کے پارکھی۔ خود بھی بہت عمدہ شعر کہتے تھے۔ پھر عرصہ بعد نسیم صاحب سہارنپور آئے تو ان سے ایک دو ملاقاتیں ہوئیں۔ تب تک معاش کی جستجو اور جدوجہد نے سب ارمان ٹھنڈے کر دیے تھے۔ چائے اور سگریٹ کی رقم بھی نہیں جٹ پاتی تھی۔ لٹریری کلب کیا خاک چلتا۔ نسیم صاحب سے ملنے کی خوشی تو ہوئی مگر یہ کوئی یادگار واقعہ نہ بن سکا۔ اب جب کہ ظ انصاری، گرگ صاحب، حنیف سیمابی، کوثر صدیقی، ارم عمر پوری، ظہور احمد ظہور، حمید قریشی یہاں تک حسین نواز بھی اس دنیا میں موجود نہیں ہیں اور سہارنپور کے ریاض حیدر لکھنؤ کے ریاض حیدر کاظمی ہو چکے ہیں۔ ظ صاحب سے طویل عرصے بعد دہلی میں شجاع خاور کے گھر پر ملاقات ہوئی اور پہلی ہی ملاقات میں ان سے سہارنپوری بولی کی تضحیک پر اچھی خاصی جھڑپ ہو گئی اس کے بعد ان سے کبھی ملنا نہیں ہوا۔ خیر، نسیم صاحب سے بھرپور ملاقات اس کتاب کے ذریعے ہوئی ہے۔ اور کتاب نے لڑکپن نے تمام اساطیری کرداروں کو پھر سے زندہ کر دیا ہے۔

'پردے کے پیچھے' ہندی فلموں میں کوئی نصف صدی کی نسیم صاحب کی جدوجہد کی داستان سے کہیں زیادہ قلم سے تیار کی گئی ایک فوٹو البم ہے۔ داستان کا متن ان تصاویر کے کیپشنوں captions کی طرح لکھا گیا ہے جو میرے خیال سے کہانی کہنے کا ایک نیا ڈھنگ ہے۔ اردو نثر نگاری میں کسی نئے اسلوب کی قلم لگانا بڑے مجاہدے کی بات ہے۔ جوش ملیح آبادی اور ندا فاضلی کی خود نوشتوں، ظ انصاری کی تحریروں اور مشتاق یوسفی کی چاروں کتابوں کے علاوہ کسی حد تک مجاز کی ہمشیرہ اور جاں نثار اختر کی بیوی صفیہ اختر کے خطوط میں نثر کے الگ اسلوب ملتے ہیں۔ نسیم سہارنپوری نے بڑے اعتماد

اور کامیابی کے ساتھ خود اپنا منفرد اسلوب اس کتاب کی نثر میں برتا ہے، جو ابھی تک کہیں اور، کم از کم میرے پڑھنے میں نہیں آیا ہے۔

ایک بڑی خوبی نسیم کے بیانیے کی یہ ہے کہ انھوں نے قصوں کے دوران کہیں پر بھی خود کو سپر امپوز کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اپنی کوتاہیوں یا غلطیوں کو ایمانداری سے بیان کیا ہے اور یہ بڑی بات ہے۔ خود کو قلم کی دھار پر رکھ لینا بڑے قلم کاروں کا وصف ہوتا ہے اور اس وصف کو اپنا کر نسیم سہارنپوری نے خود کو بڑے قلم کاروں میں شامل کر لیا ہے۔ سہارنپور کی بہت سی جانی انجانی شخصیتوں کے علاوہ نسیم نے اس کتاب میں آزادی کے فوراً بعد کی 'بمبئی نگریا' اور اس میں رہنے والوں کا جس خوب صورتی سے بیان کیا ہے وہ سچ مچ پڑھنے کی چیز ہے۔ اس بیان میں اتنے کردار اور مقامات ہیں کہ قاری کو سانس لینے کی فرصت نہیں ملتی۔ وہ خود کو ایک ایسے آئینہ خانے میں پاتا ہے جو ہر طرف چہروں، پرچھائیوں اور طرح طرح کے رنگ اور نور سے بھرا ہوا ہے جہاں ہر لمحہ ہر لحظہ منظر بدلتا رہتا ہے۔ بمبئی کے چالیس سال کی چالیس فلموں اور چودہ ٹیلی سیریلز سے وابستگی کے دوران نسیم نشیب و فراز کے جن سلسلوں سے گزرے ان میں وہ 'مغل اعظم' تو نہ بن سکے نہ بنا سکے، لیکن جہاں رہے وہاں اپنا الگ مقام بنائے رکھا یہ بھی کم تسلی کی بات نہیں ہے۔ اشوک کمار اور دلیپ کمار سے لے کر سلمان خان تک سیکڑوں چھوٹے بڑے فلمی کرداروں کے ساتھ وہ رہے اور اس تجربات و کشاکش سے بھری زندگی کو اب وہ اس کتاب کی صورت میں ہم اردو قاریوں کے ساتھ بانٹ رہے ہیں، یہ ہم سبھی کے لیے فائدے کی بات ہے۔

صفحات: 176 : **قیمت**: 200 روپے

دستیاب: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، پرنس بلڈنگ، جے جے کارنر، ابراہیم رحمت اللہ روڈ، ممبئی۔ 400008

آہٹ/ شارق عدیل

شارق عدیل کیا ہیں، کیوں ہیں، کیا کرتے ہیں، کیوں کرتے ہیں میں نہیں جانتا۔ مگر یہ سب جانے بغیر اتنا پورے یقین اور دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ فنافی الادب ہیں۔ ان کا لکھنا پڑھنا، اوڑھنا بچھونا، نہانا دھونا، ہنسنا گانا، اور میرے خیال سے کھانا پینا بھی اردو ادب ہے۔

'ادب ساز' کے تعلق سے مجھے جو ڈھیروں خط ملتے ہیں ان میں سب سے زیادہ ان ہی کے ہیں۔ ان خطوں کے مطالعے سے دو بہت نمایاں پہلو اُن کی شخصیت کے سامنے آتے ہیں۔ ایک تو وہ خاصے صبر و ضبط والے آدمی ہیں۔ دوسرے اردو زبان و ادب کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ پہلی خوبی تو اس حقیقت سے عیاں ہوتی ہے کہ ابتدا میں اُن کے ہر خط میں پچھلے خط کا جواب نہ دینے کی شکایت ہوتی تھی۔ یہ شکوہ کئی سال چلتا رہا۔ خط کا جواب دینے کی درخواست مرحلہ وار، استدعا، التماس، التجا، عرض داشت، تقاضے، مطالبے، احتجاج اور دھمکی کی بلندیوں پر پہنچنے کے بعد اسی ترتیب سے واپس احتجاج، مطالبے، تقاضے، عرض داشت، التجا، التماس اور استدعا بنتی ہوئی درخواست کے مقام پر واپس آ گئی اور آخر کار زینت طاق نسیاں ہو گئی۔ یعنی کمال یہ ہے کہ دونوں اپنی وضع داری پر قائم رہے۔ نہ انھوں نے خط لکھنا بند کیا نہ میں نے خط کا جواب تحریر کیا۔

لیکن ٹھہریے... ایک مرتبہ نہ جانے کیوں ان کی لکھی ہوئی کسی بات پر کچھ شرم سی آئی اور میں نے ان کے بھیجے ہوئے پتہ لکھے پوسٹ کارڈ پر جواب لکھ دیا۔ اس کے بعد ان کے خط آتے رہے مگر انھوں نے جواب ملنے پر شکریے کا ایک لفظ تک نہیں لکھا۔ آخر ایک سال بعد اگلی سردیوں میں گرم کوٹ دھلنے کے لیے لانڈری بھیجے گئے تو ایک کوٹ کی (میرے کوٹ کی) جیب سے وہ خط جوں کا توں برآمد ہوا اور یوں ایک سال کا سفر طے کر کے 'مکتوب الیہ' کی بجائے 'کاتب الیہ' کے پاس پہنچ گیا۔

میں نے اس خط میں انھیں کچھ اس طرح کی باتیں لکھی تھیں کہ جناب والا، جس طرح چیل کے گھونسلے میں ماس نہیں ملتا، درزی اپنے کپڑے کم سیتا ہے اور راج مستری کو اپنے گھر کی مرمت کا خیال بہت کم آتا ہے، اسی طرح مجھ قلم مزدور کو اپنوں کے خط کا جواب لکھنے میں نہ صرف تساہل ہوتا ہے بلکہ وقت بھی میسر نہیں آتا۔

رہ گئی دوسری خوبی کہ وہ اردو زبان کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں تو یہ بھی ان خطوں سے ثابت ہے۔ ظاہر ہے جو شخص ایک اردو رسالے کی خیریت پوچھنے کے لیے لگاتار مدیر کو خط لکھ سکتا ہے وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا۔

اب آیئے 'آہٹ' کی طرف۔ میرے حافظے کے مطابق ان کا یہ دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ پہلا مجموعہ انہوں نے ہندی رسم خط میں یا شاید اردو ہندی دونوں کے رسم خط میں شائع کرایا تھا۔ موجودہ مجموعہ صرف اردو رسم خط میں ہے۔ اسّی سے زائد غزلوں، موشح نما غزلوں اور دیگر غزل نما غزلوں پر مشتمل ہے اس مجموعے میں شعریت کی کئی پرچھائیاں فکر کے کئی عکس اور زندگی کے کئی رنگ قاری سے روبرو ہوتے ہیں۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ شاعر نے کسی ایک اسلوب یا طرز کو اپنے اوپر اثر انداز نہیں ہونے دیا ہے۔ اردو شاعری خاص طور سے غزل میں جسے آپ نیا لہجہ کہتے ہیں، وہ شارق عدیل کے یہاں کسی ایک سانچے میں ڈھلا ڈھلایا نہیں ملتا۔ ان کے تمام ذہنی دریچے کھلے ہوئے ہیں۔ ان سے طرح طرح کی ہواؤں کا گزر ہوتا ہے۔ ان کا شعری مزاج کئی طرح کے اثر قبول کرتا ہے۔ کسی ایک پر اڑ نہیں جاتا، رک نہیں جاتا۔ میں سمجھتا ہوں یہ بڑی خوش آئند بات ہے، اور مجھے ایسا لگتا ہے

کہ عصری /فنی /شعری سرابوں، خرابوں اور عذابوں سے گزر مستقبل قریب میں ایک ایسا شارق عدیل برامد ہوگا جس کی پیروی خود ادب کرے گا۔ فی الحال وہ جس طرح کی فنی اختراع پسندی، جوشِ اجتہاد اور اصناف سازی میں مبتلا ہیں ذرا اس سے نمٹ لیں پھر ان پر تخلیق کے وہ دروازے وا ہوں گے جن کے کھلنے کا انتظار انھیں بھی ہوگا اور ہمیں تو خیر ان سے زیادہ ہے۔ بڑا فنکار بننے کے لیے صرف ایک شے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سینے میں ایک دردمند دل۔ اس دولت سے وہ قدرتی طور پر مالا مال ہیں یہ احساس ان کے موجودہ مجموعے کی ہر غزل کا دوسرا تیسرا شعر پڑھنے سے ہوجاتا ہے۔

ادھر حال ہی میں انھوں نے غزل کے علاوہ نظم گوئی کی طرف بھی توجہ دی ہے جن میں سے کچھ 'ادب ساز' میں بھی چھپی ہیں۔ یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ ان کے یہاں نظموں میں بھی دلِ دردمند کی وہی کشیدہ کاری نظر آتی ہے جو ان کے ایک اچھا اور سچا شاعر ہونے کا ثبوت بن چکی ہے۔

صفحات: 176؛ **قیمت**: 200 روپے

دستیاب: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، پرنس بلڈنگ، جے جے کارنر، ابراہیم رحمت اللہ روڈ، ممبئی۔ 400008

بیاضِ عمر اور دوسری نظمیں / ستیہ پال آنند

'کتب نما' کا بستہ سمیٹ ہی رہا تھا کہ بزرگ کرم فرما نند کشور وکرم صاحب کا بھیجا ہوا ڈاکٹر ستیہ پال آنند کا تازہ شعری مجموعہ مل گیا۔ پہلے سوچا کہ اسے آئندہ شمارے میں لیں گے، لیکن جب اس کی ورق گردانی کی تو مناسب معلوم ہوا کہ کتاب کا تعارف تو کرا ہی دیا جائے، تبصرہ پھر کبھی سہی۔

ڈاکٹر آنند کا شمار اردو کے ان معدودے چند پڑھے لکھے ادیبوں میں ہوتا ہے جو انگریزوں کو انگریزی ادب پڑھاتے ہیں اور جن کے ہزاروں شاگرد امریکہ، یوروپ اور ایشیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ 'ادب ساز' ان پر ایک خصوصی گوشہ 2008 (شمارہ 9-8) میں شائع کر چکا ہے جسے اپنی مجموعی فنی ادبی اور نجی زندگی کا احاطہ کرنے والا اب تک کا سب سے اچھا گوشہ خود انھوں نے تسلیم کیا تھا۔ چنانچہ یادداشت کو تازہ کرنے کے لیے صرف اتنا عرض ہے کہ آنند صاحب وہ منفرد اردو ادیب ہیں جنھوں نے شروع میں افسانہ نگاری کی، ناول لکھے اور خاصی مقبولیت فکشن نگاری میں پائی لیکن اس کے بعد یک لخت اس شہرت سے منھ موڑ کر شاعری کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ علاوہ ازیں دنیا کی تمام عظیم تہذیبوں سے وابستہ اساطیر کو اپنی شاعری میں خام مواد کے طور پر استعمال کر کے عصری دور کے تناظر میں معنویت رکھنے والی ان کی مختلف جہتوں، تہوں اور پرتوں کو کھول کر دیکھتے اور آگیرتے رہنے والے وہ اردو کے شائد اکیلے شاعر ہیں۔ ان کی تقریباً ہر نظم ہزاروں صدیوں پر پھیلی ہوئی انسانی تاریخ کے عظیم کردار واقعات و مقامات سے خود کو جوڑتی ہے اور آج کی تہذیبی قدروں کو آئینہ دکھاتی ہے۔

یہ سب اس مجموعے کی 63 نظموں میں بھی ہے جن میں کچھ نئی ہیں کچھ پرانی۔ تاہم خاص نظم 'بیاضِ عمر' ہے جسے میں پہلی نظر میں کتاب کا دوسرا دیباچہ سمجھا تھا، کیونکہ اسے کتاب کے پہلے دیباچے کے بعد ہی جگہ دی گئی ہے۔ وجہ اس تسامح کی یہ ہے کہ اسے عام نثری نظموں یا آزاد نظموں کے انداز میں نہیں پیش کیا گیا ہے، بلکہ اسی طرح پیراگراف بنا کر چھاپا گیا ہے جس طرح عام ڈائیریاں یا مضمون وغیرہ لکھے جاتے ہیں۔ فرق بس اتنا ہے کہ یہاں نثر پوری طرح منظوم ہے۔ بحر ہزج مثمن سالم، یعنی مفاعیلن مفاعیلن کی تکرار میں۔ ایک اقتباس دیکھیے:

بیاضِ عمر کھولی ہے!
بدلتا وقت، آندھی سا، ورق ایسے پلٹتا جا رہا ہے، مجھ کو لگتا ہے،
کوئی اک سال تو بس اک مہینے میں گزر جاتا ہے چپکے سے۔ کئی دن
ایسے آتے ہیں کہ اپنی طولِ عمری میں ہزاروں سال جیتے ہیں...

آنند صاحب کی ان عالمانہ و عارفانہ نظموں میں وجدان کی ایک الگ ہی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ جسمانی تکلیفوں سے وہ بڑی حد تک باہر آگئے ہیں، لیکن شریکِ حیات کے انتقال نے ان کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ عمر کا آخری پڑاؤ ہے اور زندگی کے اس مقام پر حساس فنکار، نہ چاہتے ہوئے بھی، اب تک جو کچھ ہو چکا ہے اس کا جائزہ لینے لگتا ہے، اندر ہی اندر بہت سے یادگار لمحوں کو دوبارہ جینے لگتا ہے، اور ان سبھی کیفیتوں کا اثر اس کی تخلیقات میں بھی جھلکنے لگتا ہے۔ یہی سب ڈاکٹر ستیہ پال آنند کے ساتھ بھی ہو رہا ہے۔ ہماری محبتیں، نیک خواہشات اور ان کا تخلیقی عمل اسی طرح جاری رہنے کی دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ چنانچہ امید ہے، ان کے شعری مجموعے اسی تواتر سے سامنے آتے رہیں۔ نظم 'بیاضِ عمر' کی ان آخری سطروں پر اپنی یہ تحریر ختم کرتا ہوں:

کپل وستو کا شہزادہ، میں گوتم بدھ، اپنا یہ جنم تو جی چکا ہوں
اور شاید اس جنم کے بعد پھر اک اور ہے، اک اور ہے، اک اور
ہے۔ نروان، تو میں جانتا ہوں، مجھ سے کوسوں دور ہے اب بھی...
بیاضِ عمر کو اب تہہ کروں اور طاق پر رکھ دوں!

صفحات: 160؛ **قیمت**: 200 روپے

دستیاب: پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، F-14/21(D) کرشن نگر، دہلی۔ 110051

نوازش نامے

آپ کے خط

مراسلہ نگاروں سے گزارش ہے کہ تعریف میں غلو سے اور تنقید میں تعصب سے کام نہ لیں

■ عزیزمن دعائیں! 'ادب ساز' کا ساحر لدھیانوی نمبر موصول ہوا، شکریہ۔ آپ واقعی مضبوط ارادوں کے مالک ہیں جو فیصلہ کر لیتے ہیں اسے عملی جامہ بھی پہنا دیتے ہیں۔ ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ آپ ایک بہت اچھے مدیر ہیں۔ آپ جیسے مدیر تو اب اردو ادب سے ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ دعا کرتا ہوں اللہ آپ کو سلامت رکھیں، خوش رکھیں اور آپ اسی طرح عمدہ 'ادب سازی' کرتے رہیں۔

بھائی، نمبر میں ساحر کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ مجھے ایک جاذب نظر پٹاری میں بند کر دیا ہے۔ ساحر کو آئندہ بھی جو پڑھنا دیکھنا اور ان کی شخصیت سے آشنا ہونا چاہے گا وہ سب سے پہلے آپ کی اس پٹاری کی طرف بڑھے گا، جب کھولے گا پٹاری، جادو کی یہ ٹوکری، تو ساحر اور ان کے دلکش رومانی جمالیاتی نغمے گرفت میں لے لیں گے۔ اس نمبر کو پڑھنے والا بلاشبہ جمالیاتی انبساط حاصل کرے گا۔

کئی یادیں تازہ ہوگئیں 52-1951 میں بھدرک کی ملازمت سے قبل ملازمت کی تلاش میں دہلی آیا تھا۔ آزاد ہند ہوٹل اردو بازار میں ایک کمرہ لیا تھا جہاں سلام مچھلی شہری اور ش مظفر پوری پہلے سے قیام پذیر تھے۔ یہی وہ ہوٹل تھا کہ جہاں میں نے جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری کا زبردست ٹکراؤ دیکھا تھا اور پرکاش پنڈت کی دعوت پر انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک جلسے کی صدارت کی تھی۔ اس جلسے میں پرکاش پنڈت کے ساتھ ساحر لدھیانوی بھی آئے اور اپنی ایک نظم سنائی۔ جلسے میں محترم سہیل عظیم آبادی، مخمور جالندھری (جنھوں نے مجھ پر ایک چھوٹی سی نظم کہی تھی) سلام مچھلی شہری، ش۔ مظفر پوری، فکر تونسوی، جگن ناتھ آزاد، ہنس راج رہبر اور کئی دوسرے حضرات موجود تھے۔ ساحر صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ دوسرے روز شام کے وقت مولانا سمیع اللہ صاحب کی دکان پر ساحر صاحب پھر ملے۔ وہاں کئی دوسرے احباب بھی حسب معمول موجود تھے، 'شاہراہ' کے دفتر کے پاس ہی کمال احمد صدیقی رہ رہے تھے۔ کمال صاحب بہت بیمار تھے لیکن چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ کمال صاحب سے بھی میری یہ پہلی ملاقات تھی۔ میں ان سے ملنے جا رہا تھا کہ ساحر اور پرکاش پنڈت بھی ساتھ ہو لیے۔ ہم تینوں کچھ دیر کمال صاحب کے پاس بیٹھے کمال نے ساحر کو اپنی کوئی نظم سنائی اور ہم سب کی فرمائش پر ساحر نے اپنی ایک نظم سنائی، کچھ دیر بیٹھ کر ہم نیچے آ گئے اس کے بعد ساحر صاحب سے ملنا نہ ہوا۔

ساحر صاحب کا نام لیتے ہی امرتا پریتم کا نام ذہن میں آ جاتا ہے۔ وہ میری یادوں میں اس طرح شامل ہیں کہ ہم دونوں ایک ساتھ پارلیمنٹ میں تھے، وہ راجیہ سبھا کی ممبر تھیں اور میں لوک سبھا کا ممبر تھا۔ ایک دو بار پارلیمنٹ کے سینٹر ہال میں ملاقات ہوئی، گفتگو میں ساحر صاحب کا بھی ذکر آیا۔ میری فرمائش پر اپنی ایک نظم بھی سنائی، پھر ہم دونوں پارلیمنٹ کی ایک اہم کمیٹی کے ممبر بنے جہاں ملاقات ہو جاتی تھی۔ بڑی ملنسار اور خوش اخلاق خاتون تھیں۔ کم گو تھیں، کمزور تھیں لیکن سوچتی ہوئی آنکھوں میں بڑی چمک تھی۔ ایسی چمکتی گہری فکر میں ڈوبی ہوئی آنکھیں میں نے کم دیکھی ہیں۔ 'ادب ساز' کے ساحر لدھیانوی نمبر سے دونوں زندہ کرداروں کی طرح میرے سامنے آن کھڑے ہوئے ہیں۔ دعا گو، بابا سائیں

پروفیسر شکیل الرحمن، سابق مرکزی وزیر صحت
گوڑگاؤں، ہریانہ

■ خدا خدا کر کے آپ کا ساحر نمبر وی پی سے کچھ روز قبل خاصی تاخیر سے ملا! مطالعہ کر چکا! اتنا سنجیدہ، اتنی معنویت سے بھرپور معلوماتی خاص شمارہ ساحر پر شائد ہی کسی نے شائع کیا ہو۔ تمام مضامین و تجاریر ذاتی تجرباتی معروضی اور خوب صورت تنقیدی تجزیاتی نوعیت کی ہیں۔ ادبی دنیا کے معتبر و ممتاز مشاہیر نے ساحر کو ذہنی سچائیوں اور تخلیقی آئینوں میں خوب خوب شناخت کیا۔ جتنی مقبولیت و محبوبیت و ہر دل عزیزی ساحر لدھیانوی کو ان کے عہد میں نصیب ہوئی، اتنی میں نہیں سمجھتا کسی اور ترقی پسند کے حصے میں آئی ہو۔ ساحر لدھیانوی نے ترقی پسندی کے اجتہادی ایجنڈے کو پڑھ کر اوڑھی ہوئی ترقی پسندی سے مغلوب ہو کر شاعری نہیں کی تھی بلکہ اپنے زردار زمیں دار ظالم باپ فضل محمد کی اپنی ماں پر جارحیت و ظلم و ستم کے خوں چکاں حالات کو برداشت کر کے 'اجتہاد' کو اپنے خون میں سدا سدا کے لیے سمو لیا تھا۔ ساحر لدھیانوی کی شاعری اسی لیے اس قدر زمین پرست حق شناس اور انتہائی شدتِ احساس کی متحمل ہے!! ساحر کی ماں نے اپنے بطن سے ساحر کے روپ میں اپنے عہد کا فرماں بردار بیٹا 'شروَن کمار' پیدا کیا تھا۔ ساحر نے تمام عمر شادی نہ کی بس اپنی ماں سے ازلی عشق کیا اور اپنی ماں کو اپنی سانسوں کی پالکی میں زندگی کے تمام سکھ آرام کے ساتھ اپنے ساتھ ساتھ رکھا۔ ساحر کی نوجوانی میں بے شمار خوب صورت عورتیں آئی ہوں گی مگر ساحر نے سنجیدگی سے شائد ہی کسی کو اپنی شریک حیات بننے کے قابل سمجھا۔ ساحر کی رگوں میں خوددار خاندانی خون بہتا تھا۔ اپنے شخصی کردار کو ساحر نے کبھی ذلیل نہ ہونے دیا۔ آج کل کے نام نہاد ممتاز شاعروں کی طرح ساحر مشاعروں یا فلم پارٹیوں میں

'ادب ساز' بیادِ ساحر لدھیانوی

مناظر عاشق ہرگانوی

نصرت ظہیر کی سوچ کی جڑیں تاریخی ہوتی ہیں۔ وہ متحرک ذہن کے مالک ہیں۔ 'ادب ساز' ان کا رسالہ ہے۔ ہر شمارہ غیر معمولی حیثیت کا ہوتا ہے۔ شمارہ 14-13-12 بیاد ساحر لدھیانوی 580 صفحوں میں ہے۔ ہر صفحے میں 64 سطریں ہیں اور فونٹ باریک ہے۔ اس طرح یہ نمبر ایک ہزار صفحوں کا ہو جاتا ہے۔ ساحر لدھیانوی پر پرت پرت اور ورق ورق مواد ہے۔ ابتدا میں 94 تصویریں ہیں۔ ان نایاب اور اہم تصویروں سے ساحر کی زندگی منعکس ہوتی ہے۔ 'شخص' کے عنوان سے 9 مضامین، ملاقاتیں کے تحت 3 انٹرویو، 'اظہار عقیدت' کی سرخی سے ساحر کی یاد میں دس شاعروں کی نظمیں، 'نقد و نظر' کے باب میں 9 مضامین، ساحر اور طنز و مزاح کے عنوان سے ساحر کی نظم 'خوب صورت موڑ' کی پیروڈی، ساحر کی مزاح نگاری اور ساحر کے مزاحیہ گیت، پرچھائیاں فینٹسی کے تحت 'دھندلکوں میں لپٹی ہوئی پرچھائیاں' کی کہانی، ساحر کے سبھی مجموعے، فلمی شاعری پر تین مضامین جن میں بھجن کی معنویت پر (پروفیسر گوپی چند نارنگ) کا مضمون بھی ہے، ساحر کے بھکتی گیت، قوالیاں اور بچوں کے لیے لکھے گیے گیت، اس نمبر کو شناخت عطا کرتے ہیں۔ آتش شوق کو شعلۂ آسا بنانے کے لیے جان آزری کی مانند متحرک اور سحر انگیز مواد شامل ہے، وجود کی تابنا کی صحت و توانائی کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ ساحر کی زندگی اور فنکاری مکمل طور پر اس میں سمٹ آئی ہے۔ اس دستاویزی نمبر میں 'ادب ساز' کا مستقل کالم 'گوشہ اختلاف' بھی ہے۔ چار مضامین میں ساحر کی نظم 'تاج محل' کا شمس الرحمانی تجزیہ بھی ہے۔ اس خاص شمارے کی قیمت 400 روپے ہے۔

'میر اسطالعہ' ماہنامہ 'رنگ' وبو حیدرآباد۔ شمارہ مارچ 2011

بھی بازاروں رنڈیوں کے ساتھ نہیں دیکھے گئے۔ جو لوگ ساحر کی جوتیاں اٹھاتے تھے اور صبح و شام اس کی چاکری کرتے تھے وہ آج ساحر لدھیانوی کے قد کو پستہ کرنے کی گنہگار کوشش کر رہے ہیں۔ ساحر کے اندر انسانیت کے لیے بے شمار ہمدردی غریبوں کے لیے بے انتہا درد اور دوستوں کے لیے بلا کا رحم دلانہ جذبہ موجود تھا۔ ساحر کا ڈرائیور اسلم شام کو ساحر کے ساتھ شراب کا وہی برانڈ پیتا تھا جو ساحر پیتے تھے۔ پرچھائیاں میں منتقل ہونے سے قبل ساحر نے اپنا پرانا مکان اسلم کو دے دیا جو کئی برس تک اپنے صاحب کی قبر پر آنسوؤں کا فاتحہ پڑھتا رہا۔ پرکاش پنڈت، رام پرکاش اشک کی بیماریوں پر ساحر نے پانی کی طرح پیسہ بہایا۔ لدھیانہ میں ایک فقیر جگا ہوتا تھا جو ساحر کے بچپن میں ساحر کے ساتھ کھیلتا بھی تھا۔ ایک بار ساحر کے پاس گھومتا گھامتا ممبئی پہنچ گیا، ساحر نے کئی دن اسے اپنے پاس رکھا، خوب لاڈ دلار کیا، نئے نئے کپڑے سلوا کر دیے اور خوب پیسے ویسے دے کر لوٹایا۔ 1970 میں ساحر لدھیانہ آئے تو دو تین روز لدھیانہ میں رہے۔ ایک دن سوسائٹی سنیما کے پاس پان کی ایک دوکان پر پان لینے رکے تو دیکھا پنواڑی نے کسی کی تصویر ٹانگ رکھی ہے۔ ساحر نے پوچھا یہ کون ہے؟ پنواڑی نے کہا، جناب جگا! ساحر نے کہا کہاں ہے؟ جناب مر گیا! ساحر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ بعد میں یش چوپڑہ کی فلم 'کالا پتھر' میں ساحر نے جگا کو مخاطب کرتا ہوا ایک بے مثل پنجابی ٹاپ گیت لکھا، جگیا... جگیا... جگیا! 1976 میں ساحر پٹھان کوٹ میرے شہر میں ایک کل ہند مشاعرے میں سردار جعفری، جاں نثار اختر، خمار بارہ بنکوی کے ساتھ تشریف لائے۔ میں ملاقات کی غرض سے ان کے کمرے میں چلا گیا، پاؤں چھوئے۔ کہا "آؤ بھئی جوان" میں نے کہا ساحر صاحب مجھے خبر ہے کہ میں لدھیانہ میں پیدا ہوا بولے، "بھئی ہمیں تو نکال دیا گیا تھا۔" مشاعرے کے منتظم نے کہا ساحر صاحب ہم آپ کو معاوضہ نہ پیش کر سکیں گے کہ مالی قلتیں ہیں۔ ساحر نے فوراً ایک ملازم سے ایک بیگ منگوایا جو نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ فرمایا، حضور جتنے چاہئیں اٹھا لیجئے۔ ساحر نے فلمی دنیا کو جو نغمہ نگاری کا زریں خزانہ عطا کیا وہ صرف اور صرف ساحر کا حصہ ہے۔ اردو دنیا میں ساحر لدھیانوی صرف ایک تھا ایک ہے اور ایک رہے گا۔ 'ادب ساز' کی طرف سے 'ساحر لدھیانوی نمبر' کی اشاعت پر صد ہزار مبارک باد! نصرت ظہیر زندہ باد، ساحر نمبر زندہ باد!

پروین کمار اشک، پٹھان کوٹ، پنجاب

■ 'ادب ساز' کا تاریخی 'ساحر نمبر' موصول ہوا۔ شکریہ۔ یہ ایک تاریخ ساز کارنامہ ہے۔ ہندو پاک میں ساحر پر لوگوں نے بہت کام کیا لیکن آپ کا یہ کارنامہ بہترین اور بے حد اہم ہے۔ اردو ادب کو آپ کا احسان مند ہونا چاہیے۔ آپ کو ڈھیر ساری مبارک باد۔ 30 اکتوبر 2010 کی تقریب (ساحر کی عصری معنویت کا جشن/ رسم اجرا خاص شمارہ بیاد ساحر لدھیانوی) میں حاضر ہو جاؤں گا۔

ڈاکٹر کیول دھیر، لدھیانہ، پنجاب

■ ڈاکٹر کیول دھیر کی معرفت 'ادب ساز' کا ساحر لدھیانوی نمبر ملا۔ میرے لئے واقعی یہ ایک تحفے جیسا ہے۔ گزشتہ دس بارہ برس میں کوئی پندرہ بار دلی گیا ہوں۔ حیرتی بھی ہوں اور شرمسار بھی۔ کہ کسی مشترکہ دوست نے آپ سے ملاقات نہیں کروائی۔

خلیق انجم، کیول سوری، دلیپ سنگھ، چندر بھان خیال، ظہیر ناصر، مخمور سعیدی، آغا قزلباش، نارنگ ساقی، اسلم پرویز کس کس سے نشست نہیں رہی۔ تقریبات بھی ہوئیں۔ مگر آپ سے ملاقات کی سبیل نہ نکلی۔

آپ نے مناظر عاشق ہرگانوی صاحب کی کتاب کے حوالے سے تبصرہ کیا ہے۔ آپ نے اصل کتاب دیکھ لی ہوتی، تو صورت حال مختلف ہوتی۔ دلی میں دو ناشرین نے یہ کتاب چھاپی ہے۔ انیس

بات سے بات چلے

انجم عثمانی

اردو دنیا میں ان دنوں ایک ایسے خوبصورت ادبی وقوعے کا چرچا ہے، جس نے بہت سے بوڑھے اور کم بوڑھے ادیبوں، شاعروں، ادیب وشاعرنما قارئین و سامعین کو ایک بار پھر اپنے ماضی کے اس دور میں پہنچا دیا ہے، جہاں جواں دل دھڑکتا تھا۔ آنکھوں میں چمک، تنہائی کی دھمک اور خوابوں کے دھندلکے ہر دم ساتھ رہتے تھے۔ جہاں کسی کی ہلکی سی ایک جھلک برسوں ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ جہاں ایک نامحسوس لمس بھی رگوں میں بجلیاں دوڑا سکتا تھا۔ جہاں اخفا اظہار چاہتا تھا اور اظہار اخفا کے پردوں میں جھلک دکھاتا تھا۔ گویا دل کی ایک ایسی دنیا آباد تھی، جس کا آج کا صارفیت زدہ، معصوم جذبات سے عاری معاشرہ نہ تصور کرسکتا ہے نہ مشاہدہ اور جو لساشوب سے پہلے کی نسل کے ادھیڑ جسموں میں موجود دلوں کے کسی گوشے میں آج بھی محفوظ ہے۔

آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ ایسا کون سا ادبی معاملہ ہوسکتا ہے، جو ماضی کو اچانک یوں احساس کی حدوں میں پھر سے زندہ کردے، جو مجھ جیسے تقریباً مٹی ہو چکے شخص کو ایک ادبی وقوعہ محسوس ہو؟ جی ہاں ایسا ہی ہوا ہے اور اس کی وجہ ہیں اس دور کے مشہور مزاح نگار، کالم نویس، آپ سب کے چہیتے اور ہمارے دوست نصرت ظہیر صاحب۔

نصرت ظہیر گزشتہ کئی برسوں سے اردو کا ایک بہت ہی معیاری مجلہ مرتب اور شائع کرتے ہیں، جس کا نام ہے 'ادب ساز'، جو ادبی جعل سازی کے اس دور میں واقعی صرف ادب سازی ہی نہیں بلکہ ادب پروری، اخلاص نوازی اور دوست داری کی بھی مثال ہے۔ ادب ساز کے وہ کئی خاص نمبر جاری کر چکے ہیں، جنھیں ادب کی دنیا میں بجا طور پر سراہا گیا ہے۔ ہم بھی ایک شریف النفس قاری اور سعادت مند دوست کی طرح ان شماروں کا مطالعہ کرتے رہے ہیں، بلکہ ایک دو شماروں میں تو شاید تحریری طور پر شرکت کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اس مرتبہ ادب ساز کا جو خاص نمبر انہوں نے شائع کیا ہے، وہ ساحر لدھیانوی کی یاد میں ہے، جسے میں اہم ادبی وقوعہ یا Important Literary Event کہہ رہا ہوں اور یہ صرف اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ اس نمبر کی ادبی حیثیت دستاویزی ہے اور یہ نصرت ظہیر کا تاریخ ساز کارنامہ ہے، نہ ہی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس نمبر نے تحقیق، تنقید اور تدوین کا معیار بلند کیا ہے۔ میں یہ اس لیے بھی نہیں کہہ رہا ہوں کہ اس سے ساحر لدھیانوی پر کام کرنے والے اسکالروں وغیرہ کو سہولت ہوگی یا ساحر کی زندگی اور فن سے متعلق بیشتر معلومات ایک جلد میں جمع ہوگئی ہیں، یہ سب بھی صحیح ہے، اس نمبر کے یہ فوائد تو ہیں ہی، میں تو اس مجلّے کو ایک ادبی وقوعہ، ایک مدیرانہ معجز نگاری اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس نمبر نے ہمیں اور ہم جیسے بہت سوں کو ادبی فلیش بیک کے ذریعے ایسے موڑ پر کھڑا کردیا ہے، جہاں سے ہم اپنے اس معصوم، سچے اور گہرے جذباتی ماضی کو اس نمبر میں پھر سے جی سکتے ہیں، جس کی ہلکی سی جھلک "گفتگو کی ابتدائی سطروں میں نظر آرہی ہے۔ مجھے یہ سوچ سوچ کر رشک آرہا ہے کہ جب مجھے اس نمبر کے مطالعے سے ساحر کا اتنا قرب اور اپنے ماضی کا اتنا لطف محسوس ہورہا ہے تو نصرت ظہیر کو ان چیزوں کو جمع کرنے، تازہ کرنے، مرتب کرنے، پڑھنے، بار بار پڑھنے میں کتنا مزہ آیا ہوگا۔ مالی طور پر ان کو اس نمبر کے معاملے میں نفع رہا یا نقصان معلوم نہیں، مگر حسی سطح پر ادبی حظ کے معاملے میں وہ ضرور ایسے بڑے منافع میں رہے ہیں جو ان کو بہت دن تک کسی اور گھاٹے میں نہیں جانے دے گا۔

ساحر لدھیانوی نمبر کے پہلے ایک صفحے پر مدیر کی حیثیت سے نصرت ظہیر صاحب نے لکھا ہے:

"ساحر لدھیانوی کا اردو شاعری میں کیا مقام ہے۔ ان کی بے مثل عوامی مقبولیت کے کیا معنی ہیں، نوجوان نسل کی ذہن سازی میں ان کی شاعری نے کیا کردار ادا کیا ہے، جس ادبی مرتبے کے وہ مستحق تھے، اس سے ہمارے نقادوں نے انہیں کیوں محروم رکھا، کیوں ان کے ترقی پسند قبیلے نے بھی ان کے ادبی قد کو گھٹانے کی کوشش کی... یہ اور ایسے ہی دوسرے کئی سوالوں کے جواب جانئے، سمجھئے اور سمجھانے کے لیے اس خاص نمبر کے آئندہ صفحے پر جاری

امروہوی اور ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس والوں نے۔ آپ نارنگ ساقی جی سے لے سکتے ہیں۔

میں نے اس میں واضح طور پر لکھا ہے، نہ یہ تنقید ہے نہ شخصی خاکہ، میری محبت کا اظہار ہے۔ جیسے جیسے جہاں جہاں سے معلومات ملیں، انہیں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ میں اب بڑھاپے کی زد پر ہوں۔ (73 برس کا ہوگیا ہوں، دو بار دل کے عارضے نے دبوچا ہے) اور کتنا جی لوں گا؟ بس، یوں ہی ہم ایسے لوگوں کے دل میں خیال آتا ہے شاید یہ قرض ہمارے ذمے ہے اسے ادا کردینا چاہئے۔ (کسی کمال کا دعویٰ نہیں)

میں نے یہ بھی عرض کیا ہے (اسی کتاب میں) جب 'گاتا جائے بنجارہ' کا پہلا ایڈیشن آیا تھا تو اس میں ہر گیت کے ساتھ فلم موسیقار اور گلوکار کا نام چھپا ہوا تھا۔ جو بعد میں ناشر صاحبان نے ختم کردیا۔ میں نے یہ بھی لکھا ہے، اس کتاب میں کسی بھی فلم کا ایک یا دو گیت ہیں، باقی کے پانچ، چھ، سات کہاں گئے۔

آنجہانی صابر دت نے وعدہ کیا تھا، وہ مہیا کردے گا اور یہ منصوبہ بھی بنا تھا کہ اس کا مرتب کیا ہوا ساحر لدھیانوی نمبر (فن وشخصیت) افسانوں کے ساتھ پاکستان سے چھاپا جائے۔ اسے بھی موت نے جلد نگل لیا۔ پاکستان میں (میرے اردگرد) کسی کے پاس ہندوستانی فلموں کے بارے میں معلومات نہیں۔ میں نے شاید کا سہارا لے کر، حوالے دیے ہیں۔ آپ نے ان کو درست کیا۔ اس کے لئے شکر گزار اور ممنون ہوں۔ کہیں

کے باقی 579 صفحے آپ کی توجہ کے منتظر ہیں۔"

نصرت ظہیر پہلے تخلیق کار ہیں، بعد میں اور بہت کچھ۔ اسی لیے مجھے لگتا ہے انہوں نے یہ مدیرانہ سطور نقادوں کی سہولت کے لیے لکھ دی ہیں، جیسے کلاس میں مولوی صاحب حروف لکھنا سکھانے کے لیے تختی پر قلم سے حروف کی جگہ نقطوں کی شکل میں حروف لکھ دیتے تھے اور کہتے تھے ان پر قلم چلاؤ، طالب علم کو لگتا تھا کہ حروف تختی پر اسی نے نقش کیے ہیں (کیا سچ مچ آج کے بہت سے نام نہاد نقاد اسی بھرم میں نہیں ہیں؟ لیکن یہ قصہ پھر کبھی) نصرت ظہیر صاحب با مروت شخص ہیں، اس لیے کچھ لوگوں کی 'مدرسانہ سہولت' کے لیے یہ صفحہ بھی لکھ دیا ہے اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے، لیکن ادب ساز کا یہ ساحر نمبر اس طرح کی گلی بندھی معلومات سے کہیں زیادہ بلند، وسیع اور وقیع کام ہے۔ یہ ادبی معلومات کی سطح پر، تدوین کی سطح پر اور اس سے بڑھ کر ساحر فہمی کی سطح پر ایک بڑا ادبی کارنامہ تو ہے ہی، مگر ان سب مروجہ صفات سے الگ، ان سب ظاہری باتوں سے مختلف اس نمبر کا ایک باطنی سچ اور سب سے بڑا سچ نصرت ظہیر اور ان کی نسل کا ساحر سے وہ ذہنی رشتہ ہے جو نہ جانے خون کے کتنے رشتوں سے زیادہ پائیدار اور گہرا ہوتا ہے۔ اسی ذہنی رشتے نے دراصل اس نمبر کو ایک ادبی وقوعہ جسی دنیا کا ایک یادگار نمبر بنا دیا ہے اور اسی رشتے کا خلوص ہے جس نے اس نمبر کے تاثر کو پڑھنے والے اور خاص طور پر اپنی نوجوانی کے دور میں ساحر کو پڑھنے والی نسل کے لیے پر کشش بنا دیا ہے۔

نصرت ظہیر کی طرح ان کی عمر اور ان کے آس پاس کی عمر کی پوری نسل نے جس طرح ساحر کو چاہا ہے اور نوخیز چاہتوں کی عمر میں ساحر کے فن نے جس طرح ان کا ساتھ دیا ہے، اس کی مثال شاعری اور ادب کی دنیا میں شاید دوسری کوئی نہیں ہے۔

میں ساحر لدھیانوی سے کبھی نہیں ملا، بس ایک بار اپنے لڑکپن میں (ہائے کیسا لڑکپن تھا کہ اب تک ساتھ چلتا ہے) کسی کل ہند مشاعرے میں (اردو میں مشاعرہ کم سے کم کل ہند ہی ہوتا ہے) اسٹیج پر لانگ شاٹ میں ان کو دیکھا تھا، جہاں ہزاروں سامعین کی آخری صف میں، میں کھڑا ہوا بھی بیٹھا سا لگتا تھا (پتہ نہیں ساحر صاحب نے بھی مجھے دیکھا تھا یا نہیں؟ ضرور دیکھا ہوگا ورنہ برسوں تک وہ اپنی شاعری میں میرے تاثرات کیسے بیان کرتے رہے) مگر کبھی ایسا نہیں لگا کہ ساحر صاحب میرے قصبے سے دور کہیں ممبئی وغیرہ میں رہتے ہیں، وہ تو زیادہ تر ہمارے ہی شہر بلکہ ہمارے محلے، بلکہ ہماری کلاس میں ہمارے ساتھ ہمارے گھروں میں ہم سب دوستوں کے ساتھ ساتھ ہی رہتے تھے اور سچ یہ ہے کہ ادھیڑ عمر کے اس لاغر جسم کے دل کے کسی گوشے میں ان کی شاعری جیسا ایک لڑکا کمزور ہی سہی اب بھی کہیں موجود ہے، جس کی آنکھیں ان دنوں نصرت ظہیر نے پھر سے نیم وا کر دی ہیں۔

ممکن ہے شاعری کی تاریخ کا کوئی مطالعچی، تنقیدی اصطلاحوں کا کوئی تھوک بیوپاری، نصابی معلومات کا کوئی ٹھیکیدار نصرت ظہیر کے مرتب کردہ اس ساحر نمبر میں کچھ تسامحات تلاش کر لے یا اس نمبر میں واقعی ظاہری طور پر کچھ اضافہ کیا جا سکتا ہو، مگر یہ سب ان لوگوں کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا، جنہوں نے ساحر کی شاعری کی ساحری کو جذبے کی سطح پر محسوس کیا ہے۔

اس گفتگو کو اسی نمبر میں شامل ساحر لدھیانوی پر نصرت ظہیر کی نظم 'ایک تھا شاعر' کے آخری چند مصرعوں پر ختم کرنا مجھے آسان لگتا ہے:

وہ سب کے آج کا شاعر تھا
وہ سب کے کل کا شاعر تھا
وہ ہر اک دور کا شاعر تھا
وہ ہر اک پل کا شاعر تھا

بشکریہ اردو ہفت روزہ چوتھی دنیا نئی دہلی

موقع ملا تو آپ کے شکریے کے ساتھ اظہار کروں گا۔

رہی بات ساحر کے یا کسی اور کے بھی خدا کو ماننے یا نہ ماننے کی، تو یہ یقیناً ہر کسی کا ذاتی اور نظریاتی معاملہ ہے۔ میں ان میں دخیل نہیں ہوتا۔ بلکہ دخل دینے والوں کو بھی اچھا نہیں سمجھتا۔ 'تخلیق' کے دفتر میں، خدا، محمدؐ، بابا گورو نانک، کرشن مہاراج، مہاتما بدھ، صلیب اور بہائی اور احمدی اصحاب کے عقیدے کے نمونے بھی دیواروں اور کارنس پر نمایاں سجے ہوئے ہیں۔ میرا ایمان کچھ بھی ہو، میں ان سب کا ماننے والا اور احترام کرنے والا ہوں۔

بدنصیبی یہ ہے پاکستان میں غیر ترقی پسند صاحبان، کمیونسٹ یا سوشلسٹ کو براہ راست دہریہ قرار دیتے ہیں۔ یہ اہل علم کمیونسٹ اور Atheist کو گڈ مڈ کر دیتے ہیں۔ یونہی دھیان آیا مرنے کے بعد تو ہمارے مُلاں اور علما ساحر کو کافر اور دہریہ نہ ثابت کرتے رہیں۔ میں نے شعوری طور پر خدا کے حوالے ڈھونڈ کر سموئے۔ یہ بھی تنقید یا تحقیق کی بات نہیں تھی۔ میرے جذبات کا عکس تھا۔ بہر کیف! آپ کی رائے مقدم ہے۔ آپ کے ذرائع اور وسائل ہیں اور حافظہ بھی بہت اچھا۔ ان بچے کچے گیتوں کو بھی تو کہیں سے ڈھونڈ نکالیے۔ آپ ساحر کی

نہیں، فلمی نغمہ نگاری کی تاریخ مرتب کریں گے۔

'تخلیق' کا تازہ شمارہ حاضر ہے، یہ 42 سال سے جاری ہے۔ ان دنوں دو مہینے کے وقفے سے چھپ رہا ہے۔ ملاحظہ کریں۔ مناسب سمجھیں تو اس میں شامل ہو جائیں۔ یوں ایک خوشگوار رابطہ ہو جائے گا۔

ہمارے اچھے حکمران ادھر والے، اُدھر والے، لکھنے پڑھنے والوں کو بھی ویزا نہیں دے رہے۔ دو سال سے میں بھی محروم ہوتا ہوں۔ ایمبیسی والے یہ کہہ کے ٹہلا دیتے ہیں کہ دلی سے کلیرنس نہیں آئی، حالانکہ مشاعروں کے دعوت نامے اور دوسرے

ساحر شناسی کی سمت میں ایک اچھا قدم

عبدالاحد ساز

'فن اور شخصیت' کا ساحر لدھیانوی نمبر زیر ادارت صابر دت، ساحر صاحب کی وفات کے بعد چند ہی برسوں میں شائع ہو گیا تھا۔ اس میں بلا شبہ مشاہیر اہل قلم کے مضامین ساحر کے بارے میں شامل تھے، مگر وہ بیشتر سوانحی اور کوائفی تھے یا تذکروں اور یادداشتوں پر مبنی جذباتی و تاثراتی نوعیت کے تھے۔ آج جبکہ ساحر کے انتقال کو 30 برس ہو چکے ہیں، ان کی شاعری کو تنقیدی نظر سے دیکھنے کے لیے فضا زیادہ سازگار بھی ہے اور ان کے فن کی قدر و قیمت اور اہمیت کو آج کے ادبی تناظر میں اجاگر کرنے کی ضرورت بھی زیادہ ہے۔ اس لحاظ سے ساحر پر 'ادب ساز' کی ضخیم خصوصی اشاعت لائق تحسین ہے کہ 'فن اور شخصیت' کا ساحر نمبر جہاں ڈیٹا Data کا حکم رکھتا ہے وہاں 'ادب ساز' کا یہ نمبر پروسس Process کی حیثیت کا حامل ہے، چنانچہ شخصیت اور کوائف سے متعلق جہاں احمد ندیم قاسمی، امرتا پریتم، حبیب جالب، قتیل شفائی، ندا فاضلی اور اس زمرے کے چند دیگر اکابر کے مضامین اس نمبر میں دوبارہ شامل کیے گئے ہیں اور بازدید کی کشش رکھتے ہیں، وہاں نقد و نظر پر مشتمل بیشتر مضامین نئے ہیں، جو گوپی چند نارنگ، احمد راہی، کیول دھیر، حقانی القاسمی، ابوالکلام قاسمی، ارمان نجمی، نصرت ظہیر، مناظر عاشق ہرگانوی، گلشن کھنہ، ناوک حمزہ پوری، شہناز خانم عابدی، مسعود مفتی اور دیگر معاصرین کی سعی نظر کا ثمرہ ہیں۔ چند پرانے مضامین کی بازشمولیت کا اعتراف اور نئے مضامین کی بازیافت کی دشواری کا اظہار 'ادب ساز' کے مدیر نصرت ظہیر نے اپنے پیش لفظ میں کر دیا ہے۔

ساحر لدھیانوی کی شاعری پر نئے تنقیدی اپروچ کے ضمن میں اہم اہم عصر ناقد حقانی القاسمی کے مقالے 'ساحر اور معیار عظمت کی منطق' سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''ساحر کے مدرکات و مکاشفات کی تعبیر و تفہیم کے لیے نئی قرأت کی ضرورت ہے تاکہ ساحر کی تخلیقی کاملیت، حسیت اور معنویت کے نئے باب روشن ہوں اور ساحر کا وہ مافیہ اپنی کلیت میں سامنے آئے جو ان کے نظمیہ اسپیس میں پنہاں ہے اور اس ساحر کی تلاش کی جائے جو اپنی تخلیق کی وجہ سے مختلف طبقات، درجات اور ادبیات میں اپنی الگ الگ مساواتوں Equations کے ساتھ زندہ ہے۔''

ابوالکلام قاسمی اپنے مضمون 'مقبولیت اور امکانات کے درمیان معلق شاعر' میں ساحر کے کلام کی مقبولیت، دلکشی اور جاذبیت پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''ساحر لدھیانوی کی شاعری کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب اس کی خوش آہنگی ہے۔ اس خوش آہنگی کی آئندہ صفحے پر جاری

کاغذات مکمل ہوتے ہیں۔ دیکھیں کب آپ سے ملاقات کا سلسلہ بنتا ہے۔ شاد و آباد رہیں۔

دردمح خود۔ پونہ سے نذیر فتح پوری صاحب نے 'اسباق' کے تازہ شمارے میں میرا ایک گوشہ چھاپا ہے۔ شاید آپ نے دیکھا ہو؟ یہ بھی نارنگ ساقی سے مل سکتا ہے یوں میرا تعارف (شاید) ہو جائے۔ مکرر! ملاحظہ فرمایئے۔ ڈاک خانے والوں کے کمالات پہلے پیکٹ تیار کیا، تو انہیں ڈاک قیمت پر اعتراض ہو گیا۔ اب اتنے دنوں بعد دوبارہ یہ 'زحمت' کر رہا ہوں۔ آپ کا

اظہر جاوید، پرانی انارکلی، لاہور، پاکستان

■ ظہیر میاں، شاد رہو، آباد رہو، کہانی حسب وعدہ ارسال کر رہا ہوں۔ قبول فرماؤ۔ اب تم پہ منحصر ہے کہ تم کہانی 'فراز' کے ساتھ کس طرز کا سلوک کرتے ہو؟ آج میں ساقی فاروقی سے مل رہا ہوں۔ تمہارا پیغام ذاتی طور پر اس کو پہونچا دوں گا۔ ساحر نمبر ابھی تک موصول نہیں ہوا۔ وصولیابی پر فون کر دوں گا۔ اچھا اجازت دو اور اپنا خیال رکھو۔ تمہارا اپنا

جتیندر بلو، لندن

■ برادر مکرم، میں تہہ دل سے آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے 'ادب ساز' کا خاص نمبر بیاد ساحر لدھیانوی پڑھنے کا موقع فراہم کیا۔ بہت محنت طلب اور صبر آزما کام کی صورت میں آپ نے اپنے محبوب شاعر کو عقیدت اور محبت کے پھول چڑھائے ہیں۔ مضامین کا انتخاب نہایت عمدہ ہے۔ ساحر کے فلمی نغموں پر آپ نے جو مقالہ تحریر فرمایا ہے وہ بے حد اوریجنل اور بھرپور ہے۔ 'ادب ساز' کے لیے ایک سال کا چندہ بھیج رہا ہوں۔ یہ چیک دلی میں ہی کیش ہو جائے گا۔ اپنا تازہ ناول بھی بھیج رہا ہوں اس امید کے ساتھ آپ وقت نکال کر اسے ضرور پڑھیں گے۔ کوئی خدمت ہو تو لکھیں۔

ویدراہی، گورے گاؤں ویسٹ، ممبئی

■ 'ادب ساز' کا 'ساحر نمبر' ملا، شکریہ۔ میرے لیے تو یہ بے حد قیمتی نمبر ہے۔ ایک زمانے میں ہم لوگ ساحر کی نظمیں گاتے پھرتے تھے، تقریروں میں مثال دیتے تھے۔ کیا مقبولیت تھی۔ میری نگرانی میں ایک پی ایچ ڈی بھی ہوئی ہے اور کتاب بھی چھپ گئی ہے۔ میرے بھی دو ایک مضامین ہیں۔ اگر آپ ذکر کرتے تو میں بھی کچھ پیش کرتا۔ خیر، پھر بھی یہ ایک اچھی کوشش ہے۔ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ راشٹریہ سہارا میں آپ کو خوب پڑھ رہا ہوں بے حد اچھا لگتا ہے۔

پروفیسر علی احمد فاطمی، الہ آباد، یوپی

■ 'ادب ساز' کا ساحر سے متعلق خاص نمبر کافی عرصہ پہلے مجھے مل گیا تھا اور تب سے اب تک میں اس نمبر کی اہم تحریریں اور ساحر کا کلام جو آپ کے انتخاب کی داد دے رہا ہے پڑھتا رہا ہوں۔ یہ کلام، جب ہم نے ساحر کو پڑھنا شروع کیا تھا تب بھی بڑے مزے لے لے کر پڑھا تھا اور 'پرچھائیاں' تو بہت حد تک

تعمیر وتشکیل میں پر پیچ تراکیب اور لفظی ومعنویت عقیدات سے احتراز کا عمل دخل بہت واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ساحر کے یہاں عجز بیان نام کی کوئی چیز نہیں اور وہ فارسی اور ہندی الفاظ وتراکیب کے امتزاج سے خوش آہنگ لفظیات کا تانا بانا تیار کرتے ہیں۔ بسا اوقات وہ علامتوں میں بات نہ کہنے کے باوجود اپنے الفاظ کو استعاراتی سیاق وسباق دینے کے باعث امیج سازی اور پیکر تراشی کے عمدہ نمونے پیش کرنے میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔"

دیگر مضامین میں بھی ساحر کے کلام کے تعلق سے نئے گوشے اور پیرائے سامنے لائے گئے ہیں، جن میں سے کچھ پر اب تک ناقدین کی نظر نہیں گئی تھی۔ جلیل القدر ناقد مجنوں گورکھپوری کا ساحر کے بارے میں یہ معروضہ اس خصوصی اشاعت کا ایک گراں قدر مشمولہ ہے:

"ساحر شاعری کی فطری صلاحیت اور بے دریغ قوت لے کر آئے ہیں... یہ بڑی بات ہے کہ وہ خارجی عوارض اور داخلی تاثرات کو سلیقے کے ساتھ سمو کر ایک آہنگ بنانے کا فن خوب جانتے ہیں... ہم کو اصرار ہے کہ ساحر نظم کہیں یا غزل ان کے کلام کی سب سے زیادہ ناگزیر اور ناقابل انکار خصوصیت غزلیت یا تغزل ہے..."

'ادب ساز' کے اس نمبر کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ساحر کا سارا ہی کلام قارئین کے روبرو کر دیا گیا ہے۔ ادبی شاعری کے ضمن میں ساحر کے دونوں مجموعے 'تلخیاں' اور 'آؤ کہ کوئی خواب بنیں' اور شہرہ آفاق طویل نظم 'پرچھائیاں' ہی نہیں، ان کتابوں کے بعد کا غیر مطبوعہ کلام بھی بہ صد خوبی تلاش مہیا کر دیا گیا ہے۔ اس طرح فلمی گیتوں کا مجموعہ 'گاتا جائے بنجارہ' ہی نہیں، بلکہ الگ الگ ابواب قائم کر کے ساحر کے بھکتی گیت، قوالیاں، بچوں کے لیے لکھے ہوئے گیت اور خصوصاً چند طنزیہ ومزاحیہ گیت بھی فراہم کر دیے گئے ہیں، جو اس سے پہلے مطبوعہ شکل میں دستیاب نہیں تھے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ ساحر نے فلمی گیتوں کو ادبی چاشنی بھی دی اور سماجی وسیاسی شعور بھی عطا کیا۔

ساحر کی فلمی شاعری کے سیاق میں ایک نہایت اہم مضمون پروفیسر گوپی چند نارنگ کا 'ساحر لدھیانوی اور بھجن کی معنویت' ساحر کے تحریر کردہ شاہکار بھجنوں کا ژرف بینی سے تفصیلی تجزیہ کرتے ہوئے اور اپنی بحث کو ان کے اقتباسات سے مدلل کرتے ہوئے نارنگ صاحب یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

"ایک نظر (ساحر کے) ان بھجنوں پر بھی جو کرشن اور رام کی شاعرانہ روایت سے ہٹ کر ہیں۔ ان کو بھی دو شقوں میں دیکھ سکتے ہیں۔ ایک وہ جو گیان دھیان یا اخلاقی تلقین یا ضبط نفس کے موضوعات سے قائم ہوئے ہیں۔ دوسرے وہ جو مذاہب کی برابری یا بین مذہبی رواداری اور اتحاد پسندی کی معنیاتی فضا کو ابھارتے ہیں... کرشن لیلا ہو یا رام بھگتی یا گیان دھیان کے مسائل ہوں یا ایشور اللہ، رام رحیم، کرشن کریم کی، کبیر یا نانک کی

آئندہ صفحے پر جاری

دوستوں کو زبانی یاد ہو گئی تھی۔ ساحر پر یہ خاص شمارہ آپ نے اپنے اعلان سے بھی بڑھ کر نکالا ہے اتنی ضخامت کے باوجود لگتا ہے ساحر کے بارے میں کچھ اور مضامین ہونے چاہئیں تھے۔ ساحر کی شاعری نوجوان لوگوں کے دل کی دھڑکن رہی ہے۔ ہم دوست لوگ ساحر کو خوب پڑھا کرتے تھے۔ اور دیر رات تک اس کی شاعری اور اس کی عاشقی کے قصے زیر بحث رہا کرتے تھے۔ 'ادب ساز' کے اس نمبر نے ایک بار پھر ساحر کو زندہ کر دیا ہے۔ ساحر کے چاہنے والوں کی دعائیں آپ کو ضرور ملیں گی...

اس بار اختلاف رائے میں شمیم حنفی کے انٹرویو کا ذکر ہے جو 'ایوان اردو' جنوری 2010 میں شائع ہوا تھا اور اس میں کہی گئی باتوں پر کچھ نوجوان (اردو میں آج کوئی نوجوان شاعر یا ادیب نہیں ہے جو لوگ لکھ رہے ہیں ان سب کی عمر 40 سے 50 کے درمیان ہے) حضرات کو، جو گوپی چند نارنگ صاحب کے مداحوں میں ہیں، سخت اعتراض ہے۔ میں نے وہ انٹرویو پڑھا ہے اور آپ نے جو اقتباسات 'ادب ساز' میں شائع کیے ہیں ان کو بھی پڑھا ہے۔ مجھے اس میں ایسی کوئی بات نہیں لگی جس پر نارنگ صاحب کے حامی چراغ پا ہو رہے ہیں۔ یہ سب باتیں تو بہت پہلے بھی ہو چکی ہیں اور اگر واقعی یہ سب باتیں قابل اعتراض ہیں تو نارنگ صاحب خود بھی تو ایک خط لکھ کر اپنا اعتراض جتا سکتے تھے، جسے شائع نہ کرنے کی ہمت کوئی بھی مدیر (مرغوب عابدی) نہیں کر سکتا تھا۔ گیان چند جین کی اس متنازعہ فیہ کتاب 'اردو بھاشا و لکھاوٹ ایک ادب' پر جب بھی بات ہو گی، ایسی ہی بات ہو گی۔ اس کتاب میں کہی گئی باتوں کی مذمت خود گوپی چند نارنگ صاحب کے یہ حامیان خود بھی کرتے ہیں، تو پھر یہ لوگ نارنگ صاحب کے ساتھ کیا وفاداری جتانا چاہتے ہیں۔ اگر ان کو کوئی اعتراض جتانا ہی تھا تو اس وقت جتاتے جب افتخار امام نے لکھا کہ گیان چند جین کی اس کتاب کے صفحے تو بچوں کا پاخانہ پونچھنے کے کام کے ہیں... ایک اور بات کہ 'ایوان اردو' کے مدیر نے یہ خط کیوں نہیں چھاپا تو صاحب مدیر کے اپنے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ وہ اپنے رسالے میں کیا چھاپے کیا نہ چھاپے یہ اس کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔ شان بھارتی نے اپنے رسالے 'رنگ' میں کسی خلیل تنویر کا خط میرے خلاف چھاپ دیا۔ میں نے جب اس خط کا جواب لکھا تو شان بھارتی نے اپنی شان دکھاتے ہوئے اسے نہیں چھاپا تو کیا اس پر دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ میں نے مدیر 'نیا ورق' کو کئی خط لکھے جو ان کے اشاعت پذیر مضامین سے تعلق رکھتے تھے نارنگ صاحب کے مضمون 'میرا موقف کیا ہے' پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا جو ساجد صاحب نے نہیں چھاپا۔ تو کیا کیا جائے۔ کچھ عرصہ پہلے ساجد رشید اودے پور آئے تھے تو ان سے بڑی گرما گرم بحث بھی ہوئی تھی۔ تو دیکھا آپ نے، مدیر کوئی بھی ہو وہ اپنے رسالے میں چاہے جو چیز چھاپے یہ اس کے اختیار کی بات ہے۔ میری ان باتوں سے اس خط کے قارئین یہ نہ سمجھ لیں کہ میں مدیران 'ایوان اردو' یا شمیم حنفی کے حواریوں میں

ہمہ گیرانہ اور لازوال روحانی روایت ہو، ساحر نے اسے تخلیقی محویت سے کچھ اس طرح متشکل کیا ہے کہ مدتوں اس کے رس اور لطافت میں کمی نہ آئے گی۔''

ساحر کی فلمی شاعری کے باب میں خود مدیر رسالہ نصرت ظہیر کا طویل مضمون بہت اہم ہے، جس میں کئی مشہور اور نمائندہ گیتوں کے موضوعات، پیرایوں اور پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مثلاً فلم سادھنا کے گیت ''عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اسے بازار دیا'' کی جذباتی و فکری روح کو ٹٹولتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''عورت کی سماجی حیثیت پر جو گانا فلم 'سادھنا' کے لیے ساحر نے لکھا تھا، وہ اس موضوع پر حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں ساحر کا تاریخی مادیت کا شعور اور سائنسی فکر، شعری جمالیات اور انسانی ہمدردی کے جذبات کے ساتھ روشن ہے۔''

پاکستان سے اظہر جاوید مدیر سہ ماہی 'تخلیق' لاہور کی ایک دلچسپ تصنیف 'ناکام محبت ساحر لدھیانوی' چند برس قبل منظر عام پر آئی تھی اور جاذب توجہ ہوئی تھی۔ اس نمبر میں اس کتاب پر مناظر عاشق ہرگانوی کا تحریر کردہ ایک بسیط احاطہ شامل ہے۔ اگر آپ نے عدیم الفرصتی یا عدم دستیابی کی وجہ سے مذکورہ کتاب نہیں پڑھی ہے تو یہ مضمون حوالے ہی کی نہیں، بلکہ تلخیص کی بھی نوعیت رکھتا ہے۔

اس خاص نمبر کے دیگر مشمولات میں ایک گوشہ اختلاف بھی توجہ طلب ہے۔ اس میں نسیم گنگوہی کی نگارش 'ساحر کی نظم' تاج محل' کا شمس الرحمانی تجزیہ' خاصی دلچسپ ہے۔ ممتاز نقاد شمس الرحمان فاروقی نے پتہ نہیں کیسے از راہ مروت یا عمداً صابر دت کی نظم تاج محل کو ساحر کی شہرہ آفاق نظم 'تاج محل' سے کسی زاویے سے بہتر قرار دیا تھا۔ ظاہر ہے یہ بات نسیم گنگوہی کیا، ادب کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ قاری کے بھی گلے سے اترنے والی نہیں تھی۔ گوشۂ اختلاف میں مشمول دیگر تین مضامین کے بارے میں البتہ یہ جملہ معترضہ لکھنا ہی پڑے گا کہ ان کا کوئی تعلق ساحر یا ان کی شاعری سے سرے سے ہے ہی نہیں، لہٰذا ساحر پر اس خاص اشاعت میں ان غیر متعلق مضامین کی شمولیت کا کوئی جواز ہی نہیں بنتا۔ انہیں 'ادب ساز' کی کسی عام اشاعت کے لیے اٹھا رکھنا چاہیے تھا۔

'ساحر اور طنز و مزاح' کے باب میں نصرت ظہیر کے مختصر رائٹ اپ کے ساتھ ساحر کے مزاحیہ گیتوں کی یکجائی اس خاص نمبر کا ایک اور خاصہ ہے اور ساحر کی گیت نگاری کے ایک جداگانہ ذائقے اور کیف تک رسائی کی سمت بھی۔ اس باب میں ساحر کی مقبول نظم 'خوب صورت موڑ' پر اسد رضا کی مزاحیہ سیاسی پیروڈی 'خوب صورت گٹھ جوڑ' بھی خوب ہے۔ اس کے آخری بند کا لطف لیجیے:

قیادت دے نہ پائے کچھ تو اس کو بھولنا بہتر
وفاداری سے نقصاں ہو تو اس کو چھوڑنا اچھا

آئندہ صفحے پر جاری

ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ مدیران میرے نام سے بھی ناواقف ہیں۔ شمیم حنفی کو نہیں معلوم کہ میں نظم نگار ہوں یا افسانہ نگار۔ وہ رسالوں میں صرف اپنے مضامین یا اپنی تعریف یا تنقید میں لکھے گئے مضمون ہی پڑھتے ہیں۔ یہ تو میرا شوق ہے کہ میں پڑھتا لکھتا رہتا ہوں اور جو بات مجھے صحیح لگتی ہے میں اپنے تاثرات ضرور لکھتا ہوں۔

'اختلاف رائے' میں مجھے یہ پڑھ کر دکھ ہوا کہ شمس الرحمن فاروقی صاحب نے ساحر کی نظم 'تاج محل' سے صابر دت کی نظم 'تاج محل' کو بہتر بتایا۔ اس سے فاروقی صاحب کی شعر فہمی پر حرف آتا ہے۔

شاہد عزیز، اودے پور، راجستھان

شاہد عزیز صاحب نے کئی باتوں کو باہم خلط ملط کر دیا ہے۔ پہلے اختلاف کو لیجیے۔ 'ادب ساز' کا اختلاف شمیم حنفی کی بے موقع اور غیر متعلق باتوں سے نہیں بلکہ ان کی باتوں پر اعتراض کرنے والوں کو، جو سب کے سب پی ایچ ڈی اسکالر ہیں، ایک سرکاری رسالے (ایوان اردو) میں اپنی بات رکھنے کے حق سے محروم کرنے پر تھا۔ آپ جس قسم کی مدیرانہ آزادیوں کی بات کر رہے ہیں ان کا استعمال کرنے کے لیے مرغوب حیدر عابدی صاحب اور ان کے عملے کو اپنا ذاتی رسالہ جاری کرنا چاہیے۔ 'ایوان اردو' ہم عام ٹیکس دہندگان کی گاڑھی کمائی سے شائع ہوتا ہے۔ اس کا مدیر ایک شخص (پروفیسر شمیم حنفی صاحب) کی اپنے حریف کے خلاف نکالی گئی بھڑاس کو تو چھاپ دیتا ہے مگر جب کچھ لوگ دوسرا پہلو سامنے لاتے ہیں تو ان کی باتوں کو شمیم حنفی کی ذات پر رکیک حملوں سے تعبیر کرتا ہے اور زبان کو ناقابل اشاعت قرار دے کر دھتکار دیتا ہے۔ وہ خط جسے ناقابل اشاعت کہا گیا تھا ہم نے من و عن چھاپ دیا ہے۔ شاہد صاحب خود ہی بتائیں اس میں 'رکیک' اور 'ناقابل اشاعت' جیسی کیا بات ہے؟ اور اگر مدیر کو کچھ ناقابل اشاعت لگ ہی رہا تھا تو اسے حذف کر دیتا، جو جملے یا جملے رکیک لگ رہے تھے انہیں بھی نکال دیتا۔ یہ نہیں تو خط کے کونے پر 'ناقابل اشاعت' لکھ کر اسے اپنی فائلوں میں بند کر دیتا۔ یہ تو نہ کرتا کہ باکس میں نمایاں طور پر خط لکھنے والوں کے نام چھاپ دیے اور ان پر 'رکیک' اور 'گندی زبان' کے استعمال کا الزام لگا ڈالا۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟

دوسری بات گیان چند جین کی کتاب کی ہے۔ جس نے بھی وہ کتاب کسی تعصب یا prejudice کے بغیر حرف بہ حرف غور سے پڑھی ہے وہ چند مقامات پر جین صاحب کی معمولی اور ذاتی نوعیت کی غلط بیانیوں کو چھوڑ کر بیشتر باتوں سے خود کو متفق پائے گا۔ مشکل یہ ہے کہ کتاب کا انتساب جن لوگوں کے نام تھا ان میں ایک ایسے 'کافر' کا بھی نام تھا جو دن رات اردو کے نام کی مالا جپتا ہے۔ یہ بات ایک 'مومن اردو' کو اس درجہ ناقابل ہضم محسوس ہوئی کہ اس نے کتاب کے صرف ان پہلوؤں کو سامنے رکھ کر

وہ گٹھ بندھن جسے کرسی تلک لانا نہ ہو ممکن
وزارت کے لیے جھٹکے میں اس کو توڑنا اچھا
چلو اک بار پھر سے مطلبی بن جائیں ہم دونوں

ساحر کی وفات پر خراج تحسین وعقیدت کے طور پر کئی نظمیں 'فن اور شخصیت' کے ساحر نمبر میں شامل تھیں۔ ان میں سے قتیل شفائی، حبیب جالب اور کرشن ادیب کی نظموں کے اعادے کے علاوہ اس نمبر میں پروین شیر، گلشن کھنہ، خالد رحیم، وسیم ملک، شارق عدیل اور نصرت ظہیر کی تازہ منظومات پیش کی گئی ہیں۔ کیفی اعظمی کی نظم 'ساحر کہاں ہو تم' یقیناً ایک تبرک ہے جو نہ صرف یہ کہ گزشتہ ساحر نمبر میں شامل نہیں ہے، بلکہ کسی اور رسالے میں بھی شاید ہی شائع ہوئی ہو۔ اسی نظم کا آخری شعر ہے:

مری نظروں میں میرے دوست اک مندر ہے لدھیانہ
یہ مندر اور تم اس کے صنم، ساحر کہاں ہو تم؟

ادب ساز کے اس وقیع خاص نمبر کے آخری صفحات میں پس نوشت سے پہلے ایک تازہ اور متوجہ کن مضمون ساحر کی ملکیت، یعنی ممبئی میں ان کی عمارت 'پرچھائیاں' کا موجودہ احوال ہے، جسے اطہر عزیز نے ذاتی مشاہدے اور معلومات کی بنا پر لکھا ہے۔ ساحر کی موت 59 برس کی عمر میں قبل از وقت ہی کہی جا سکتی ہے، ان کے وارثین میں صرف ان کی دو ماموں زاد بہنیں انور سلطانہ اور سرور شفیع ہی تھیں۔ 'فن اور شخصیت' کے مدیر صابر دت کو ساحر سے قربت کی وجہ سے 'پرچھائیاں' میں ہی رہائشی کمرہ اور دفتر الاٹ کر دیا گیا تھا، یہاں سے انھوں نے ساحر پبلشنگ ہاؤس قائم کر کے 'فن اور شخصیت' کے کئی گراں قدر خاص نمبر شائع کیے۔ یہ سلسلہ عمدگی کے ساتھ چلتا رہا، مگر پھر کم کم وقفے کے اندر انور سلطانہ، صابر دت اور سرور شفیع کا انتقال ہو گیا اور یہ عمارت کوئی واضح وارث نہ ہونے کی بنا پر دعووں اور قبضوں کے قانونی تنازع میں پڑ گئی اور آج بھی ہے۔

اس شمارے میں ساحر کی پرانی یادگار تصاویر کے ساتھ کچھ ایسی تصویریں بھی دستیاب کی گئی ہیں، جو اس سے پہلے نظر سے نہیں گزری تھیں۔ مثلاً صابر دت کی کوششوں سے باندرہ۔ جوہو لنک روڈ پر ساحر سے منسوب 'پدم شری ساحر لدھیانوی چوک' کے افتتاح کی تصویر یا 'پرچھائیاں' میں ساحر کے رہائشی کمرے اور اعزازات اور فلمی وادبی تصاویر سے مزین ڈرائنگ روم کی تصویر۔

مجملہ 'ادب ساز' کی یہ خصوصی اشاعت ساحر پر ایک بامعنی، کارآمد اور دلچسپ دستاویزی پیشکش ہے جو ایک انتہائی مقبول شاعر کی زندگی اور شاعری کی ایک بھرپور بازگشت ہی نہیں، بلکہ تنقید وادب کے نئے زاویوں سے اس کی بازیافت بھی ہے، جس کے لیے مدیر ادب ساز واقعی حرف تحسین کے مستحق ہیں۔

بشکریہ ماہنامہ 'بزم سہارا' دہلی، جنوری 2011

ایک طویل تبصرہ لکھ مارا جو اردو کے مسلمانوں کو ناگوار لگ سکتے تھے اور لگے بھی۔ اس کتاب کی رو سے جہاں جہاں مسلمان گرفت میں آسکتے تھے انھیں تبصرہ نگار نے قصداً نظرانداز کیا جو صریح بے ایمانی تھی۔ نتیجہ یہ کہ کتاب اور اس پر ہونے والی بحث نے فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیا۔ یہاں تک کہ 'ہلالی خنجروں' کی دھار پر آئے ہوئے 'کافر' کو بھی مدافعانہ defensive رخ اختیار کرنا پڑا۔ وہ تو شکر ہے کہ اردو کے خمیر اور ضمیر میں سیکولرزم کی جڑیں اس قدر گہری ہیں کہ ایک دو برس میں ہی یہ طوفان کمزور پڑ گیا اور "بچوں کے بول و براز" جیسی باتیں کرنے والوں نے بھی اپنے خیالات میں ترمیم کر لی اور مان لیا کہ ان سے جین صاحب کے معاملے میں واقعتاً کچھ زیادتی ہو گئی ہے۔ دراصل شاہد صاحب یہ مشہور مقولہ بالکل غلط ہے کہ تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ تصویر کے آگے پیچھے کے علاوہ دائیں بائیں اور اوپر نیچے کے رخ بھی ہوتے ہیں اور ایک رخ فریم کے اندر تصویر کے باطن کا بھی ہوتا ہے۔ کئی بار اس باطن کو دیکھنے پر پتہ چلتا ہے کہ وہ مشہور برطانوی مزاحیہ فلمی کردار مسٹر بین Mr Bean کی مشہور ترین فلم Ultimate Disaster میں دکھائی گئی 30 ملین ڈالر کی قیمتی پینٹنگ وسلرز پورٹریٹ آف ہز مدر Whistler's portrait of his mother کی طرح ہے جسے فلم میں ساری دنیا ایک بیش قیمت پینٹنگ مان لیتی ہے مگر یہ بات صرف مسٹر بین کو معلوم ہے کہ وہ پورٹریٹ نہیں بلکہ ایک پوسٹر ہے جو امریکن آرٹ گیلری میں لگا ہوا ہے، اور یہ کہ اصل پینٹنگ اپنی غلطی سے مسخ ہو جانے کے بعد اسی نے تصویر کے ایک عام پوسٹر پر انڈے کی سفیدی مل کر پوسٹر کو اصل تصویر کے فریم میں چپکا یا تھا۔ اردو کے مومن اعظم نے بھی وہ تبصرہ انڈے کی سفیدی لگا کر لکھا تھا تا کہ ملت بیضا بھڑک اٹھے۔

ساجد رشید صاحب کے بارے میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے اس کے بارے میں کوئی سوال آپ کو ان ہی سے کرنا چاہیے تھا ہم البتہ یہ ضرور کہیں گے کہ وہ اردو کے قطعاً غیر متعصب، روشن خیال اور دلیلوں کے ساتھ بے باکی سے اپنی بات کہنے والے ادیب اور صحافی تھے۔ 'ادب ساز' نے کئی بار ان کے تحریر کردہ اداریے مقتبس کر کے۔ بلکہ نہ بر جستہ تکرار کے طور پر ان کے تلخ خیالات میں اکثر سے اتفاق رکھتے ہوئے شائع کیے ہیں۔ یہی باتیں شان بھارتی صاحب کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہیں، اگرچہ ان سے زیادہ واقفیت نہیں ہے۔ شخصیتوں کے بھی شاہد صاحب تصویروں کی طرح بہت سے رخ ہوتے ہیں۔ اچھے سے اچھے انسان میں کم زور اور قابل مذمت ومرمت پہلو مل جاتے ہیں اور برے سے برے آدمی میں کئی باتیں لائق توصیف وتقلید نکل آتی ہیں۔ اور یہ تو سب سے بڑا سچ

ساحر لدھیانوی پر ایک قیمتی دستاویز

حقانی القاسمی

''ساحر کی شاعری کا مقام لوگوں کی روح اور تاریخ کی رگوں کا حصہ بن چکا ہے۔'' امرتا پریتم کے اس جملے سے آغاز کرنا شاید زیادہ مناسب ہو کہ امرتا پریتم کے اس جملے میں وہ ساری معنویت آ گئی ہے، جس کے حوالے سے لوگوں نے نہایت طویل اور بسیط مضامین تحریر کیے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ساحر کا مقام ہمارے عہد کی وہ پست قد تنقید متعین نہیں کر سکتی جو ہر ایک کے سر پر تاج رکھ دیتی ہے۔ ساحر نے اپنی شاعری کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں جو مقام بنایا ہے وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ مگر مقبولیت اور عظمت کی منطقیں الگ الگ ہیں۔ ساحر کے ساتھ المیہ یہ ہوا کہ انھیں ہر حلقے سے محبت تو ملی مگر ناقدین نے ان کی شاعری کے تعلق سے زیادہ سنجیدگی کا ثبوت نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ساحر پر بہت سی کتابوں، مقالات اور مضامین کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساحر ابھی تک ادھورا ہے۔ صابر دت نے 'فن اور شخصیت' کے ساحر نمبر کے ذریعہ کسی حد تک اس ستم کی تلافی کی کوشش کی تھی مگر ساحر پر تو اور بھی کچھ ستم ہوئے ہیں جس کی تلافی اب ممکن نہیں ہے۔

'فن اور شخصیت' بمبئی کے بعد 'ادب ساز' دہلی نے ساحر نمبر پیش کر کے ساحر شناسی کو ایک نئی راہ دکھائی ہے اور ساحر کے تعلق سے تعینِ قدر کی ایک نئی منزل تلاش کی ہے۔ 'ادب ساز' میں بیشتر مضامین اس کا ثبوت ہیں کہ ساحر کو جو مقام ملنا چاہیے وہ ناقدین نے انھیں عطا نہیں کیا اور صرف فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے ان کی شناخت قائم کرنے کی کوشش کی۔ جبکہ ساحر جہاں ایک عمدہ نغمہ نگار تھے وہیں ایک مکمل ادبی شاعر بھی تھے۔ ساحر کے ساتھ جو ناانصافیاں ہوئیں اس نے ساحر کے شیدائیوں کے ذہنوں میں بہت سی تلخیاں بھی پیدا کر دیں جس کی وجہ سے ساحر کے بعض چاہنے والوں کو نہایت تند لہجہ بھی اختیار کرنا پڑا۔ 'ساحر کا فن اور اس کی سائنس' اسی تلخی ذہن کا ثبوت ہے۔ مضمون نگار (نصرت ظہیر) نے لکھا ہے کہ ''میرے نزدیک بیسویں صدی میں اردو کے تین سب سے بڑے شاعر اقبال، فیض اور ساحر ہیں۔ باقی سب عطارد و مشتری جیسے چھوٹے بڑے یا زہرہ، زحل اور مریخ جیسے منفرد یا عجیب طرح کے سیارگان ہیں جو ان تینوں کے آگے پیچھے یا اغل بغل یا دور و نزدیک گھومتے ہیں۔ جدید اردو شاعری کے ان عظمائے ثلث کی مختصر فہرست میں ساحر کا نام میں نے سب سے آخر میں صرف اس لئے رکھا ہے کہ کہیں اسے پہلے یا دوسرے مقام پر رکھنے کی میری حرکت کو حد سے بڑھی ہوئی شخصیت پرستی نہ سمجھ لیا جائے اور مجھ پر کوئی دوسرا نہیں بلکہ خود میں ہی یہ الزام نہ لگانے لگوں کہ میاں تم بھی عظمت کے معاملے میں اپنی پسند کی ڈفلی بجا کر دوسروں کی عظمتوں کو حقیر گردان رہے ہو۔

لیکن میں ہوا میں گرہ نہیں لگا رہا ہوں۔ میرے پاس حساب کتاب موجود ہے جس کی رو سے حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی شاعری فنی عظمتوں کے تمام تر ہالوں کے باوجود فکری سطحوں پر اس برصغیر کو سب سے زیادہ نقصان پہونچانے اور قومی سماجی و سیاسی سطحوں پر انسانوں کی ہلاکت کا باعث بننے والی شاعری ہے۔ دوسری طرف فیض کی کلیات 'نسخہ ہائے وفا' تنوع سے عاری اور تقریباً یکساں محسوس ہونے والے موضوعات و میلانات کے غنائیت و جمالیات اور سوز و گداز سے بھرپور چمن زار سے زیادہ کچھ نہیں جس کے ہر پھول میں گل چیں یعنی شاعر کا اپنا عکس زیادہ دکھائی دیتا ہے پھول کا کم!''

آئندہ صفحے پر جاری

ہے کہ کوئی بھی ذات اپنے آپ میں مکمل نہیں ہوتی۔ آخر میں صرف یہ کہ آپ ایک معروضی ذہن اور فکر رکھتے ہیں اس پر کم از کم ہمیں قطعی شبہ نہیں۔ یقین کیجیے ہم بھی کسی شمیم حنفی، یا کسی مرغوب حیدر عابدی کے دشمن نہیں ہیں۔ یہ بھی ہماری اردو زبان کے روشن نام ہیں۔ اختلاف رائے الگ بات ہے وہ کسی سے بھی ہو سکتا ہے۔ ادارہ

■ 'ادب ساز' کا ساحر لدھیانوی خاص نمبر ملا، شکر گزار ہوں۔ اور رسالوں نے بھی ساحر لدھیانوی سے متعلق خصوصی شمارے شائع کیے ہیں لیکن آپ کا خاص نمبر بہت ضخیم جامع، معلوماتی اور فکر انگیز ہے۔ جامع ترین کلیات بھی شامل ہے۔ گوشہ اختلاف، شخصیت اور فن سے متعلق یہ شمارہ بہت متنوع اور جامع ہے۔ تصاویر بھی نایاب ہیں۔ کالج کے زمانے میں میں ساحر کا بہت بڑا مداح اور fan تھا۔ ساحر کی رومانی شاعری مجھے بہت اپیل کرتی تھی۔ مجاز اور فیض سے زیادہ مقبولیت ساحر کو حاصل ہوئی، حالانکہ ترقی پسندوں نے ساحر کے مقابلے فیض اور مجاز کو زیادہ اہمیت دی۔ فلمی گیت بھی ساحر کے بہت پر اثر اور پر درد ہیں۔ ریڈیو سے گلوکار کے ساتھ ساتھ ساحر نے گیت کار کا نام بھی شامل کروایا اور فلمی دنیا میں گیت کار کی انفرادیت کو قائم کیا۔ آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ شمارہ ساحر کی ایک اہم دستاویز بن گیا ہے۔ اس قدر معیاری اور اہم نمبر شائع کرنے پر میری جانب سے دلی مبارکباد قبول کیجیے۔

احتشام اختر، کوٹہ راجستھان

■ 'ادب ساز' کا ساحر لدھیانوی پر خاص نمبر دستاویزی نوعیت کا ہے۔ یہ تاریخ ساز نمبر منفرد سخن ساز ساحر کے لیے تو مختص ہے ہی، رجحان ساز صحافی جناب عزیز برنی کے نام معنون بھی ہے۔ اس طرح گویا آپ نے ساحر کو خراج عقیدت اور عزیز برنی کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ فکری طور پر آپ چونکہ ساحر سے بہت

''پھر یہ ہے کہ خود ساحر بھی اقبال اور فیض سے متاثر تھے۔ اقبال سے نظریاتی اختلاف کے باوجود ساحر کی ماقبل 'تلخیاں' شاعری پر اقبال کے ڈکشن کا بہت زیادہ اثر تھا اور یہیں سے ساحر کی اس سائنسی اپروچ اور معروضیت کا سراغ مل جاتا ہے جو بعد میں ان کی شاعری اور شخصیت دونوں میں غالب عناصر کی طرح نظر آتی ہے۔ یعنی جو کچھ بھی اچھا ہے، صحت مند ہے، مفید ہے اسے اپنالو، باقی سب delete کر کے recycle bin میں بھیج دو۔ چنانچہ ساحر نے فنی لحاظ سے تو اقبال سے کسب فیض کیا لیکن ان کی فکر کے ان بنیادی نکات کو نظر انداز کر دیا جو خودی کے پردے میں صرف ایک مذہب کی سربلندی، پان اسلامزم Pan Islamism اور کرۂ ارض پر صرف مومن کی حکمرانی کے نظریات کی اساس بنتے جا رہے تھے۔ اس کے برعکس فیض سے ساحر کی نظریاتی قربت و مطابقت تھی اور ان کے لہجے کی صداقت اور رومانیت کا اثر انھوں نے نظریاتی اور فنی دونوں سطحوں پر قبول کیا۔ لیکن اپنے اظہار اور اظہار کے موضوعات کو انھوں نے فیض کی طرح monotony کا شکار نہیں ہونے دیا۔''

نصرت ظہیر کی اس تحریر کو شاید بعض افراد ساحر کی عقیدت میں غلو سے تعبیر کریں اور ان کے معروضات سے اختلاف کریں مگر حقیقت یہ ہے کہ اردو شاعری میں عظمت کے معیار کی کوئی واضح منطق نہیں ہے اسی لئے ہر شخص اپنے اپنے طور پر عظمتوں کے معیار مقرر کر رہا ہے۔ اور اس پیمانے پر کسی بھی شاعر کو پرکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بہر حال اتنا تو طے ہے کہ ساحر ایک ایسا شاعر ہے جس کی عظمت کے لئے کسی تنقیدی کتبے کی ضرورت نہیں۔ خود ساحر نے بہت پہلے کہہ دیا تھا:

مجھ کو اس کا رنج نہیں ہے لوگ مجھے فنکار نہ مانیں
فکر و سخن کے تاجر میرے شعروں کو اشعار نہ مانیں

ساحر کی فنی عظمت کو پرکھنے کے لئے تنقید کا جو پیمانہ چاہئے وہ پیمانہ ہی ابھی وجود میں نہیں آیا ہے اسی لئے ساحر کو اگر ناقدین نے نظر انداز کیا ہے تو اس سے ساحر کی عظمت نہیں بلکہ ناقدوں کی دیانت مجروح ہوتی ہے۔ شاید اسی بددیانتی کے پیش نظر 'ادب ساز' نے ساحر لدھیانوی پر تحریریں مع تخلیقات شائع کر دی ہیں کہ ساحر کو سمجھنے کے لئے کسی اور رہبر یا رہنما کی ضرورت نہیں۔ ساحر کی تخلیق ہی اس کی عظمت کا ثبوت ہے۔

'ادب ساز' میں ساحر کی شخصیت کے حوالے سے جو مضامین شامل ہیں ان میں حافظ لدھیانوی، امرتا پریتم، ابراہیم جلیس، واجدہ تبسم، سرور شفیع، محمود ایوبی، کیول دھیر، نصرت ظہیر کے نام اہم ہیں۔ ساحر سے بلونت سنگھ، نریش کمار شاد اور ندا فاضلی نے انٹرویوز لئے ہیں وہ بھی شامل ہیں۔ ان مضامین اور تحریروں سے بھی ساحر کی شخصیت اور فن کے بہت سے نقوش روشن ہوتے ہیں۔ احمد راہی نے بہت اہم بات لکھی ہے کہ ''لوگ کہتے ہیں کہ ساحر نے کئی بار محبت کی ہے۔'' مجھے ان لوگوں سے اتفاق نہیں۔ ساحر کی زندگی میں ایک محبت ہے، اور ایک نفرت۔ محبت اس نے صرف اپنی ماں سے کی ہے اور نفرت صرف اپنے باپ سے۔''

ساحر کی شاعری کے تعلق سے ایم کاویانی، ابوالکلام قاسمی، ارمان نجمی، سراج نقوی، شہناز خانم عابدی، خان حفیظ اور نصرت ظہیر

آئندہ صفحے پر جاری

قریب ہیں اس لیے آپ نے 'ادب ساز' کا پورا شمارہ ساحر کے نام کر دیا ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ ساحر آج بھی دو دلوں کا غماز شاعر ہے، وصل ہو کہ فراق ہر دو صورت میں ساحر کا شعر دل کی ترجمانی کرتا ہے۔ بعض جدید نقادوں نے ساحر کو چشم کم سے دیکھا ہے مگر ساحر کا سحر آج تک نہیں ٹوٹ سکا۔ ساحر کی ماسٹر نثار سے ہمدردی ان کی اعلیٰ ظرفی کی مثال ہے ورنہ یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ دولت و شہرت کے نشے میں لوگ اپنے جاں نثار باپ تک کو بھول گئے ہیں۔ ویسے یہ انتقامی کارروائی بھی ہو سکتی ہے۔ ساحر نے ہمیشہ دوستوں اور رشتہ داروں کا خیال رکھا، لاوارث صابر دت کو ٹھکانہ دیا ہزاروں روپے کے خرچ سے اشک کا علاج کروایا، ریحانہ سلطان کو اپنا ایک فلیٹ رہنے کے لیے دے دیا۔ یہ فیاضی بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ ساحر کی اس بلڈنگ پر تالا لگ گیا

ہے کاش یہ جائیداد کسی فلاحی ادارے کے حوالے ہو جاتی۔ ثریا اور پروین بابی کی جائیدادوں پر بھی حکومت کا قبضہ افسوس ناک ہے۔ کسی دینی یا فلاحی ادارے کے لیے اگر ان لوگوں نے وصیت کی ہوتی تو یہ جائیدادیں ان کے حق میں ثواب جاریہ ثابت ہوتیں۔

ساحر کے بارے میں آپ نے تو بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ ادبی و فلمی اعتبار سے ساحر کی قدر و قیمت کا احساس دلایا ہے۔ جناب ایم کاویانی کا مضمون بھی بہت مدلل ہے۔ ساحر کے تعلق سے بے دلیل باتوں کا انھوں نے خوب رد کیا ہے۔ ساحر کے تعلق سے مشہور ہے کہ ان کے یہاں کئی شاعر پڑے رہتے تھے جو ساحر کی مدد کرتے تھے اور وہ ان کی مدد کرتے تھے۔ اس تعلق سے بھی ایم کاویانی کے قلم سے کچھ نکلتا تو سند ٹھہر جاتا، شاید اسی لیے انھوں اس پہلو پر کچھ نہیں لکھا۔ گوشۂ اختلاف کے سلسلے میں آپ نے لکھا:

''ناوک (حمزہ پوری) حد سے گزر گئے ہیں اور کچھ ایسی بیہودہ مناظر عاشق کے تعلق سے بلاوجہ لکھ دی ہیں کہ شریف آدمی دست درازی پر اتر آئے۔'' آپ نے اچھا کیا کہ بیہودہ باتیں حذف کر دیں ادبی معاملات میں شخصی حملے کرنا اوچھا پن ہے۔ یہ بات بزرگوں کو سمجھانی پڑ رہی ہیں۔ 'ادب ساز' کے بیک کور پر پروین شیر کی بنائی ہوئی ساحر کی تصویر ساحر کو 'خطرناک' ثابت کر رہی ہے۔ مخفی مباد کہ 'ادب ساز' کا یہ خاص نمبر میں افسانہ نگار یاسین صاحب سے مستعار لے آیا تھا۔ آپ کی طرف سے پرچہ ملنے تک میں اپنا اشتیاق نہ روک سکا۔

رؤف خیر، حیدرآباد

■ آپ کے جریدے کی تعریف اور مضامین کے تنوع کے بارے میں سنتا رہا ہوں۔ نعمان نے بیشتر اوقات میں آپ کا ذکر خیر بھی کیا۔ رسالے کی ضخامت

اور نصرت ظہیر کی تحریریں ساحر کی شاعری کی عظمتوں کے عناصر کی جستجو کرتی ہیں اور ان کی شاعری کی مختلف جہتوں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ یہ تحریریں اس لحاظ سے وقیع ہیں کہ نئے عہد میں ساحر کو نئے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ادب ساز میں ساحر کا کلیات بھی شامل کیا گیا ہے جن میں بعض وہ کلام بھی ہے جو کہیں اور مطبوعہ شکل میں دستیاب نہیں ہے۔

فلمی شاعر کی حیثیت سے ساحر کی ایک واضح شناخت ہے اس لئے ان کی فلمی شاعری سے متعلق بھی مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ جن میں گلشن کھنہ، گوپی چند نارنگ اور نصرت ظہیر کی تحریریں قابل ذکر ہیں۔ طنز و مزاح سے بھی ساحر کا رشتہ مضبوط تھا اس حوالے سے بھی کچھ تحریریں شائع کی گئی ہیں۔ جن میں اسد رضا کی پیروڈی (صفحہ 555) بہت ہی معنی خیز ہے۔

مجموعی طور پر ادب ساز کا 'ساحر نمبر' ساحر کی متنوع شخصی اور فنی جہتوں سے قاری کو روشناس کرانے کی ایک اچھی کوشش ہے۔ اطہر عزیز کا مضمون ساحر کے مکان 'پرچھائیاں' سے متعلق ہے، جو اب تنازعات میں گھرا ہوا ہے۔ اس کی مکمل تفصیل ان کے مضمون میں آ گئی ہے۔ اس کے علاوہ اظہر جاوید کی کتاب 'ناکام محبت' کے حوالے سے مناظر عاشق ہرگانوی نے ان کی محبتوں کی پوری داستان رقم کر دی ہے۔ اس میں امرتا پریتم، لتا منگیشکر، سدھا ملہوترا اور شکیلہ بھوپالی کے نام بھی آئے ہیں۔ یہ باب بہت دلچسپ ہے اس میں ساحر کی محبت کے جہاں بہت سے رنگ سامنے آ گئے ہیں وہیں اظہر جاوید نے اپنی کتاب میں ایک خاص بات کی تردید بھی کی ہے کہ ساحر مخنث تھے۔ امرتا پریتم کو ساحر سے بے پناہ عشق تھا۔ اتنا کہ امرتا نے رسیدی ٹکٹ میں لکھا ہے کہ 'ان کا بیٹا نوراج بالکل ساحر کا ہمشکل ہے۔' اظہر جاوید نے لکھا ہے کہ 'ساحر کو جسم کی یا لڑکیوں کی کمی نہیں تھی لیکن جو وابستگی اور ناتا امرتا پریتم سے بنتا تھا وہ کہیں اور نہیں تھا۔' امرتا پریتم کے بارے میں اظہر جاوید کا خیال ہے 'امرتا پریتم جو بہت بالغ نظر، بہت روشن خیال، بہت محبت کی دیوی، ایثار اور قربانی کا پیکر دکھائی دیتی ہے، جو جذبوں پر ایمان رکھتی ہے اور محبت ہی بنتی اور محبت ہی چنتی ہے۔ اسے بھی شاید چاہے جانے کی خواہش تھی اور ایسی خواہش جس میں جسم بھی شامل ہے اور سچ مچ امرتا پریتم نے اپنی خود نوشت 'رسیدی ٹکٹ' میں اپنے عشق کا حق ادا کر دیا۔ امرتا نے لکھا ہے...... اس کے جانے کے بعد اس کے چھوڑے ہوئے سگریٹوں کے ٹکڑوں کو سنبھال کر الماری میں رکھ لیتی اور پھر ایک ایک ٹکڑے کو اکیلی بیٹھ کر جلاتی تھی اور جب انگلیوں میں اسے پکڑتی تھی تو محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا ہاتھ چھو رہی ہوں—— سگریٹ پینے کی عادت مجھے تبھی پہلی بار پڑی تھی۔ ہر سگریٹ کو سلگاتے ہوئے لگتا تھا کہ وہ پاس ہے۔ سگریٹ کے دھوئیں میں وہ جیسے جن کی طرح نمودار ہو جاتا ہے......

ساحر کی شاعری تو لوگوں کے ذہن میں زندہ ہے ہی۔ ادب ساز نے 580 صفحات پر محیط 'ساحر نمبر' کے ذریعہ اسے اور زندہ و جاوید کر دیا۔ ساحر کی شاعری اور شخصیت پر یہ بھرپور دستاویز ہے۔ مستقبل کے محققوں کے لئے اس میں اتنا مواد ہے کہ کسی اور حوالے یا دستاویز کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ادب ساز کے مدیر نصرت ظہیر کا یہ ایسا کارنامہ ہے جسے اردو دنیا برسوں تک یاد رکھے گی۔ مگر 'گوشۂ اختلاف' مخمل میں ٹاٹ کے پیوند کی طرح ہے، اس سے گریز کرتے تو بہتر ہوتا۔

ای میل: mh_qasmi@rediffmail.com موبائل: 9873747593

بشکریہ ہفت روزہ 'عالمی سہارا' دہلی

اور معیار کے لئے دل کی گہرائیوں سے مبارکباد قبول فرمایئے۔ بلاشبہ ادب کی تفہیم اور توسیع میں کئی اور موضوعات کی نمائندگی کا حق ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر ایس اے مجید بیدار، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

■ میں یہ چند سطور ایک خط کی شکل میں لکھتے ہوئے فخر محسوس کر رہا ہوں کہ یہ اس کی نظر کے سامنے جائیں گی کہ جس کو میں ایک مدت سے رسائل و جرائد کے توسط سے جانتا ہوں اور قلبی طور پر اس کی تحریروں کا اور انداز تحریر کا مداح ہوں۔ میں اگرچہ پچھلے پچاس سال سے شاعری کر رہا ہوں، اور مختلف ادبی اور نیم ادبی رسائل میں میرا کلام شائع بھی ہوتا رہتا ہے لیکن 'ادب ساز' کے صفحات کے لئے پہلی مرتبہ اپنی تخلیقات روانہ کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر معظم علی خاںؔ، علی گڑھ، یوپی

■ 'ادب ساز' کا ساحر نمبر موصول ہوا۔ شکریہ۔ ساحر کی شخصیت سمندر کی مانند ہے۔ 'ادب ساز' کی ضخامت کے پیش نظر یہ کہنا غلط ہوگا کہ آپ نے سمندر کو کوزے میں بھر دیا ہے بلکہ میرے خیال سے کچھ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ آپ نے سمندر کو ایک دلکش جھیل کی صورت میں پیش کیا ہے۔ 'ادب ساز' کے اس انمول نمبر کو میں شاندار نہیں بلکہ شاہکار کہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا یہ صحافتی کارنامہ اردو دنیا میں قدر و ستائش کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

مراق مرزا، اندھیری (ویسٹ)، ممبئی

■ اچانک 'ادب ساز' کا نیا شمارہ ساحر نمبر کی شکل میں وارد ہو کر دل نواز مسرت دے گیا۔ پس نوشت کے تحت یہ پڑھ کر مزید خوشی میسر ہوئی کہ آئندہ کم ضخامت اور کم قیمت میں اردو کا یہ ادبی رسالہ وقت پر شائع ہونے جا رہا ہے۔ اللہ آپ کی پُرخلوص کوشش کو بار آور کرے۔

جعفر ساہنی، ٹوپسیا روڈ، کولکاتا، مغربی بنگال

مزید دعا کی درخواست ہے ساہنی صاحب! ادارہ

■ اے اردو اور ساحر سے آپ کا جنون عشق ہی کہا جائے گا کہ آپ نے 580 صفحات کا ضخیم و وقیع ساحر نمبر، کسی سرکاری اعانت کے بنا، کسی بھی اشتہار کے بغیر (باستثنا پنجاب کلچرل اکاڈمی کے ایک اشتہار کے) اپنے ہی دم پر شائع کر دیا، جب کہ آپ ہی کے شہر کے ایک اردو کتابوں کے تبصراتی مجلّے کے مدیر محترم اپنے رسالے کے ہر دوسرے شمارے میں اردو والوں کی بے حسی، اور عدم تعاون کا رونا رو کر جریدے

کی اشاعت بند کرنے کی دھمکی دیتے رہتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ رسالے کی کم از کم دس فی صدی ضخامت اشتہارات پر مشتمل ہوتی ہے، اور سرورق تک کئی عدد کتابوں کے اشتہاری Titles سے مزین نظر آتا ہے۔ آپ کے اداریوں (اور ادارتی نوٹس notes) کو میں نے عموماً بے لاگ، تصنع سے دور اور خلوص کا حامل پایا ہے۔ یہاں تک کہ کسی معاصر (بلکہ حریف) جریدے کی خوبیوں کی ستائش میں بھی آپ کے قلم نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ نہ ہی آپ نے کبھی 'ادب ساز' کے کثیر الاشاعت ہونے کا بلند بانگ دعوا کر کے قارئین کو بے وقوف بنانے کی کوشش کی۔ جب کہ اردو کے ایسے نو وارد رسالے بھی ہیں، جنھیں ڈیڑھ سو سالانہ خریدار میسر آتے ہیں تو وہ ڈیڑھ ہزار کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیتے ہیں۔

'ادب ساز' کے ساحر نمبر میں نئے اور پرانے اہم مضامین، یادگار تصاویر، اور مکمل ترین کلیات ساحر کے ساتھ ساتھ آپ نے مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر محمد حسن، خواجہ احمد عباس، راہی معصوم رضا، ظ انصاری، احمد ندیم قاسمی، کیفی اعظمی، جوگندر پال، اور فکر تونسوی جیسے مشاہیر اردو کے تنقیدی اور تبصراتی تراشوں کو سجا کر صحیح معنوں میں ساحر کی شخصیت اور فن کا نگار خانہ بنا کر پیش کر دیا ہے۔

ساحر پر اپنا مضمون میں نے آپ کی دی ہوئی مہلت (مہینے بھر) میں آپ کو سونپ دیا تھا، اور اندازہ نہ تھا کہ اس نمبر کی اشاعت اتنی موخر ہو جائے گی۔ اگر میں نظر ثانی کر پاتا تو کچھ کمیاں راہ نہ پاتیں۔ مثلاً (1) مجھے تمہیدی حصے میں یہ لکھنا تھا کہ اس دور کے زمین داروں کی معاشرت کو دیکھتے ہوئے، اور اولاد نرینہ کے حصول کے لیے چودھری فضل محمد کا کئی شادیاں کرنا تو ممکن ہے پر گیارہ شادیوں کا کہیں کوئی مستند حوالہ نہیں ملتا۔ ساحر کے کالج کے ساتھی حفیظ لدھیانوی اور ناز صدیقی (مسز مغنی تبسم)، جن کے ذریعے ساحر کے مستند حالات کی توقع غلط نہیں، دونوں ہی گیارہ شادیوں والی بات کے راوی نہیں ہیں۔ (2) میرے مضمون میں ص:133 پر درج شعر کی صحیح صورت غالباً یوں ہے:

وصل کا دن اور اتنا مختصر
دن گنے جاتے تھے اس دن کے لیے

اور یہ شعر امیر مینائی کا ہے نہ کہ بے نظیر شاہ وارثی کا۔ (3) ساحر کی نظم 'تاج محل' کے تذکرے میں ص:128 پر امریکی مصنف آلڈس ہکسلے کے بدنام زمانہ مقولے کا وہاں کوئی محل نہ تھا، میں اسے رد کر دیتا۔ خیر!

'گوشۂ اختلاف' کے لیے سر دست میں اپنی کوئی تازہ تحریر تو نہیں لکھ پایا ہوں، البتہ سکندر علی وجد اور ظ انصاری کی ایک ادبی نوک جھوک 'بلٹز' کے صفحات اور ظ انصاری کی 'کتاب شناسی' سے نقل کر کے ارسال کر رہا ہوں۔ دل چسپ لگے تو شامل کریں ورنہ رد کر دیں۔

ایم کاویانی، مڑگاؤں، ممبئی

■ 'ادب ساز' کی نذر:

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

جب تک ہماری نظر سے 'ادب ساز' نہیں گذرا تھا، ہمیں اردو زبان کے روشن مستقبل کا اندازہ نہ ہوا تھا۔ یہ ایک معیاری رسالہ ہے اور ہماری دل فریب اور شیریں زبان اردو کی ایسی خدمات کر رہا ہے جس کی آج خاص طور سے ضرورت ہے۔ اس رسالے کے مصنفین کی ان تھک کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ ادبی مہ پارہ پوری آب وتاب اور پابندی (؟؟؟ ادارہ) کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ جناب نصرت ظہیر کی نگرانی میں رسالے کا مستقبل اور اس کی باقاعدہ اشاعت میں اردو زبان کا مستقبل روشن اور محفوظ ہے۔

میں جناب نصرت ظہیر کا خاص طور سے ممنون و مشکور ہوں جنھوں نے مجھے اس بیش بہا ادبی ذخیرے سے روشناس کرایا۔ ان کے طفیل اب میں کارآمد طور پر مصروف رہنے لگا ہوں اور اس عمر میں اب اکیلا پن نہیں رہا۔ میں اس کا باقاعدہ خریدار تو نہیں بن سکا لیکن گاہے بگاہے اس سے مستفید ہوتا رہتا ہوں۔ میری مجبوری میری کمزور نظر ہے۔ ایک وقت میں پندرہ منٹ سے زیادہ دیر تک نہیں پڑھ سکتا۔ اس کا ایک شمارہ میرے لئے چھ ماہ تک کافی رہتا ہے۔ 'ساحر لدھیانوی' نمبر کے بارے میں سنا تو اشتیاق ہوا اور ظہیر صاحب کو اس کے لئے درخواست کی۔ انھوں نے مجھے وی پی کے ذریعہ ایک نسخہ بھیج دیا لیکن ڈاکخانے والوں کی مہربانی سے یہ 'وی پی لینے سے انکار ہے' لکھ کر واپس کر دی۔ حالانکہ میں اس کا بے تابی کے ساتھ منتظر تھا۔ ظہیر صاحب کی عنایت سے وہ مجھے دستیاب ہو گیا اور میرا لڑکا 'ادب ساز' لے آیا۔ میں ظہیر صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے ذاتی طور سے دلچسپی لے کر رسالہ مجھ تک پہنچانے کا اہتمام کیا۔

سدرشن کمار دگل، گوڑگاؤں، ہریانہ

■ 580 صفحے کا ساحر نمبر پرسوں ملا۔ تب سے آج تک سارا وقت 'ادب ساز' اور آپ کے ساتھ گذرا ہے۔ کیسے کیسے مضامین سے آپ نے اسے سجایا ہے، کیسے کیسے مواد سے اسے سنوارا ہے اور کیسے کیسے موضوعات پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ کلام کے انتخاب کا کیا کہنا۔ اتنی صحت کے ساتھ کلام کہیں بھی دستیاب نہیں ہے اور سو تصویروں، نایاب و نادر تصویروں سے مزین یہ شمارہ ہر لحاظ سے دستاویزی ہے۔ اسے ہر گھر کے ڈرائنگ روم میں رہنا چاہئے کہ یہ نمبر ساحر پر ہے۔ ہر صفحے سے آپ کی محنت، آپ کی محبت اور آپ کی چشم بینا کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

آپ بحیثیت ناقد بھی اس نمبر میں متوجہ کر رہے ہیں۔ ساحر کی مزاح نگاری (نصرت ظہیر) ساحر اور مجنوں کی معنویت (گوپی چند نارنگ) فلمی شاعری کا محسن ساحر (نصرت ظہیر) ساحر کا فن اور اس کی سائنس (نصرت ظہیر) ساحر اور معیار عظمت کی منطق (حقانی القاسمی) ساحر کی نظموں میں ڈرامائی عناصر (سراج نقوی)، ساحر ایک باغی شاعر (ارمان نجمی) کے ساتھ 'یادوں کی پرچھائیاں' 'ملاقاتیں' 'اظہار عقیدت' 'نقد و نظر' اور 'محبتیں' کے تحت دیگر گوشے سامنے آئے جو ہر لحاظ سے حوالہ جاتی ہیں۔ اطہر عزیز کا مضمون 'دھندلکوں میں لپٹی ہوئی پرچھائیاں' انکشافی ہے اور نسیم نکہتوی کا مضمون قابل توجہ ہے۔

'گوشۂ اختلاف' کے سلسلے میں بقیہ تینوں مضامین ادبی بددیانتی کو سامنے لاتے ہیں حالانکہ ناوک کی بھگتی بھگتی باتیں انہیں بونا ثابت کر رہی ہیں۔ اطلاعاً عرض ہے کہ غزل نما کے موجد شاہد جمیل ہیں۔ انہوں نے جو ہیئتی تجربہ کیا ہے وہ ظہیر غازی پوری سے دس سال قبل کا

ہے اور جسے پوری اردو دنیا کے شاعروں نے مان لیا ہے۔ انتیس شاعروں کی غزل نما کا انتخاب، سوانح اور تصویر کے ساتھ میں نے ترتیب دیا تھا۔ یہ کتاب چھپ گئی ہے۔ نرالی دنیا پبلیکیشنز، دہلی نے یہ انتخاب شائع کیا ہے۔ دو چار روز میں آپ کو بھیجوں گا۔ ناوک کے مضمون کے سلسلے میں صرف اتنا عرض ہے کہ 'گلبن' لکھنؤ اور 'فنون' اورنگ آباد میں شائع شدہ یہ مضمون (آپ نے ذاتیات کا حصہ حذف کردیا ہے جس کے لئے شکر گزار ہوں) رانچی کے ایم زیڈ خان سے تین سو روپے لے کر انہوں نے لکھا تھا۔ خان صاحب غزل نما پر مضامین کا مجموعہ ترتیب دے رہے ہیں۔ یہ کتاب جنوری میں لانے کا ارادہ ہے۔ ایم زیڈ خان کو جب مضمون ملا تو انہوں نے ناوک کو لکھا کہ اسے رجیکٹ کر رہے ہیں۔ تب ناوک نے یہ مضمون کئی رسائل کو بھیج دیا۔ حالانکہ پچھلے دنوں رانچی کے 'فاروقی تنظیم' میں وہ لکھ چکے ہیں کہ مناظر عاشق ہرگانوی کی تحقیق سے جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ غزل نما کے موجد شاہد جمیل ہیں تو ظہیر کو چاہئے کہ ان کی اولیت کو مان لیں۔ ظہیر کی ہیئت پر ناوک نے جو طول طویل لن ترانیاں لکھی ہے اس کے بارے میں مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ ظہیر کی ہیئت میں غزل نما محض ابیات ہے یا فردیات ہے۔ شاہد جمیل کی غزل نما کو ذہن قبول کرتا ہے کہ اس میں غزل کی روح مجروح نہیں ہوتی۔ شاہد جمیل کی غزل نما کو سامنے رکھ کر ہیئتی انصرام متعین کیا جا سکتا ہے یعنی غزل نما کے تمام اشعار غزل ہی کی طرح ایک ہی بحر میں لکھے جاتے ہیں جس میں ردیف وقافیہ ہوتے ہیں غزل نما کے شعر کا مصرع ثانی اوزان، ارکان کے اعتبار سے مصرع اول کا نصف ہوتا ہے جس میں ردیف وقافیہ ہوتے ہیں۔ یہ مصرع خود بھی ایک بحر میں ہوتا ہے مثلاً شعر کے پہلے مصرع میں اگر فاعلاتن چار بار آیا ہے تو دوسرے مصرع میں دوبار فاعلاتن آئے گا۔ اس طرح مصرع اول میں اگر آٹھ بار فعولن آیا ہے تو مصرع ثانی میں چار بار فعولن آئے گا۔ یہ التزام غزل نما کے تمام اشعار میں یکساں ہوگا۔ غزل نما کے لئے سالم بحروں میں طبع آزمائی افضل ہے۔ خواہ وہ مفرد بحر ہو یا مرکب بحر ہو۔ غیر یکساں یا مختلف افاعیل والی مزاحف بحروں میں غزل نما لکھنا مستحسن نہیں۔ البتہ یکساں زحاف والے ارکان میں غزل نما کے اشعار بخوبی لکھے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ صوتی اور بصری اعتبار سے یہ ارکان سالم بحر کے ارکان جیسے ہی ہوتے ہیں۔ ذیل کی مثالوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔

بحر ہزج کو لیتے ہیں۔

ہزج سالم: (الف) غزل نما کا پہلا مصرع:

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن۔ چار مفاعیلن

(ب) غزل نما کا دوسرا مصرع:

مفاعیلن مفاعیلن (دو مفاعیلن)

ہزج مزاحف بحر: (الف) غزل نما کا پہلا مصرع:

مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن۔ چار مفاعلن

(ب) غزل نما کا دوسرا مصرع:

مفاعلن مفاعلن (دو مفاعلن)

مزاحف بحر کی مثال دیکھیں۔

رجز مزاحف بحر: (الف) پہلا مصرع:

مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن (دوبار)

(ب) دوسرا مصرع: مفتعلن مفاعلن۔ ایک بار

اس نوع کی مزاحف بحروں کی صورت و خصوصیت سالم ارکان کے System سے ملتی ہے۔ اس لئے پہلے مصرع میں برتے گئے ارکان کا نصف ہمیں دوسرے مصرع کے لئے بہ آسانی دستیاب ہو جاتا ہے۔ لیکن غیر یکساں زحافات والی بحروں میں یہ ممکن نہیں۔ دو مثالیں دیکھیے۔

(الف) وزن: فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن۔ چار ارکان (بحر رمل مخبون محذوف مقطوع)

(ب) وزن: مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن: چار ارکان۔ ہزج رمل اخرم مکفوف۔ محذوف)

یہ دونوں بے حد مقبول اور کثیر الاستعمال بحریں ہیں۔ لیکن ان پر غزل نما کے اشعار کہتے جائیں گے تو دوسرے مصرع کے لئے کئی دو ارکان کو پہلے مصرع کے نصف کے طور پر برتیں گے۔ یہ قباحت بہر حال باقی رہے گی۔ حالانکہ ردیف اور قافیے کے مد نظر تیسرے اور چوتھے رکن (الف کے حوالے سے 'فعلاتن فعلن' اور ب کے حوالے سے مفاعیل فاعلن) کو دوسرے مصرع کے طور پر برتا جا سکتا ہے۔ اتنی تفصیل میں نے اس لئے لکھ دی کہ غزل نما کہنے والوں کو آسانی ہو اور یہ کہ شاہد جمیل کی ہیئت کو فردیات، ابیات اور فضولیات کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

'ادب ساز' کے اس بے حد اہم منفرد اور وقیع و یادگار ضخیم ''ساحر نمبر'' پر جلد ہی تبصرہ شائع کروں گا۔ آپ کو ڈھیروں مبارکباد۔ امید ہے نغمہ بار ہوں گے؟ ہاں، ساحر والی کتاب کا انتساب آپ کے نام ہے۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگل پور، بہار

■ 'ادب ساز' کے تازہ شمارہ 'ساحر نمبر' کے کالم 'گوشہ اختلاف' کے تحت حضرت ناوک حمزہ پوری صاحب کا 'غزل نما' کے تعلق سے چھپا مضمون دیکھ کر اور پڑھ کر کچھ بہت زیادہ حیرت نہیں ہوئی کیونکہ مجھے اس بات کا اندازہ تھا کہ محترم ناوک صاحب کچھ ایسا ہی کریں گے۔ لوگ نام وری کے لئے یا کہہ لیں، خبروں میں (وہ بھی متنازعہ) بنے رہنے کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہیں اور کسی حد تک جا سکتے ہیں۔ تسلیمہ نسرین (لجا) اور سلمان رشدی (سیٹنک ورسز) کی مثالیں کچھ زیادہ پرانی نہیں ہوئی ہیں۔ صرف تنازعات کھڑا کر دینا ان کی فطرت میں شامل ہو جاتا ہے۔ شاید انہیں کسی قسم کی روحانی تسکین ملتی ہو یا کچھ اور...؟ خدا جانے۔

پہلے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس قصے کی شروعات کیسے اور کہاں ہوئی؟ غزل نما کے تعلق سے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی صاحب کا ایک مضمون 'غزل نما کا موجد کون؟' 'پندار' پٹنہ، 'فاروقی تنظیم' رانچی اور 'روز نامہ سہارا' میں اپریل 2009 میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد فاروقی تنظیم، رانچی میں مضمون کی حمایت اور مخالفت میں درجنوں خطوط شائع ہوئے۔ غزل نما کے موجد ہونے کا تاج چھنتا دیکھ محترم ظہیر غازی پوری سے رہا نہ گیا اور انہوں نے اپنا ایک طویل مضمون 'غزل نما اور مناظر عاشق کی غلط بیانیاں' تین لگاتار قسطوں میں فاروقی تنظیم، رانچی میں چھیڑ کر تنازع کو ہوا دے دی کیونکہ اس مضمون میں ڈاکٹر مناظر عاشق کی ذات کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس مضمون کے رد عمل میں راقم الحروف کا ایک مضمون 'غزل نما اور ظہیر غازی پوری کی لن ترانیاں' فاروقی تنظیم، رانچی میں شائع ہوا تھا جس میں ڈاکٹر مناظر عاشق کی اردو خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے نئی تحقیق

کے حوالے سے یہ بات کہنے کی کوشش کی گئی تھی کہ تکنیک، ہیئت اور فنی اعتبار سے شاہد جمیل کا 1973 میں کیا گیا شعوری تجربہ ہی 'غزل نما' ہے جو ظہیر غازی پوری کے شعوری تجربہ کے آٹھ سال قبل وجود میں آیا تھا۔ پھر اسے ظہیر صاحب کو قبول کرنے میں کیا حرج ہے؟ کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ظہیر صاحب کو مان لینا چاہئے تھا اور ایسی ہی گذارش محترم ناوک صاحب نے بھی اپنے ایک مراسلہ 16 جولائی 2009 کے توسط سے کی تھی... پھر اس لایعنی بحث کو 'فنون' اور 'تگ آباد' 'گل بن' لکھنؤ اور دوسرے رسائل میں لے جایا گیا۔

ان سب کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ غزل نما کے تعلق سے ایک معیاری کتاب ترتیب دی جائے تاکہ اس کتاب کی روشنی میں صحیح اور غلط کا فیصلہ ہو سکے... میں نے مناظر صاحب کے مضمون کے زیراکس کاپی بھیج کر ناوک صاحب سے بھی جامع مضمون بھیجنے کی گذارش کی تھی۔ ناوک نے مجھ سے فون پر رابطہ قائم کیا اور کہنے لگے "میں زوردار مضمون لکھوں گا جو آپ کی کتاب کو ہٹ کردے گا۔ کمپوزنگ کے لئے مبلغ -/300 روپے بھیج دیں۔" میں نے انہیں جواب دیا آپ اپنا مضمون مجھے بھیج دیں۔ میں رانچی میں کمپوز کرالوں گا۔ وہ اس کے لئے تیار نہیں ہوئے اور اصرار کرتے رہے کہ بذریعہ منی آرڈر روپیہ ارسال کریں۔ ان کے اصرار پر میں نے روپیہ بھیج دیا۔ ڈیڑھ دو ماہ کے بعد مجھے بذریعہ ڈاک مضمون 'تحقیق یا سوکن ڈاہ' موصول ہوا۔ مضمون کے غیر ادبی عنوان کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ کس سمت جا رہا ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مضمون غزل نما کی بحث کو کنارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی شخصیت پر سوالیہ نشان کھڑا کرتا ہے۔

بہر کیف میں مضمون پڑھ کر اپنے آپ کو نہ روک سکا، اور اپنے ردعمل کا برملا اظہار کرتے ہوئے ناوک صاحب سے فون پر کہا کہ آپ کا یہ مضمون ذاتیات کے ارد گرد گھوم رہا ہے۔ اس مضمون میں غزل نما کے فنی اور تکنیکی پہلوؤں پر بحث نہیں کی گئی ہے۔ میرے تیکھے و تلخ ردعمل پر ناوک صاحب ڈاکٹر ہرگانوی کی ذات کو سامنے رکھ کر بے جا دلیلوں سے مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کرنے لگے لیکن میں ان کی دلیلوں سے مطمئن نہیں ہوا۔ اور سب سے غیر اخلاقی حرکت جو ناوک صاحب سے سرزد ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ انہوں نے اس مضمون کو ہندوستان کے کئی رسائل و جرائد میں چھپنے کے لئے بھیج دیا۔ تین میں تو اب تک شائع ہو چکا ہے (گل بن، فنون اور ادب ساز) اور بھیجا گیا تھا مگر پتہ نہیں کتنے رسالوں میں چھپے گا؟

یہ ایک سچائی ہے کہ ناوک صاحب نے یہ مضمون میری گذارش پر میری زیر ترتیب کتاب کے لئے لکھا تھا۔ کمپوزنگ کا چارج بھی مجھ سے لیا تھا۔ اخلاقی طور پر اس مضمون پر میرا پہلا حق تھا۔ بنا میری اجازت اسے دوسری جگہوں پر چھپوانا وہ بھی کتاب کے منظر عام پر آنے سے قبل، غیر اخلاقی فعل ہے لیکن انہوں نے خبروں میں بنے رہنے کے لئے انتہا درجے کی بے صبری دکھائی اور میرے یقین و اعتماد کو بھی ٹھیس پہنچائی۔ کیا اسے کسی بھی نکتہ نظر سے جائز ٹھہرایا جا سکتا ہے؟

محترم ناوک صاحب ایک طرف مجھے اخلاقیات کا درس دیتے ہیں اور دوسری طرف خود اخلاقی قدروں کی دھجیاں اڑاتے پھرتے ہیں۔ یہ کیسا اخلاقی سبق ہے؟ اس مضمون کو کتاب چھپنے سے قبل کئی رسائل میں چھپوانے میں ناوک صاحب کی کیا مصلحت تھی؟ محترم اتنی عجلت میں کیوں تھے؟ اتنا ڈھنڈورا پیٹنے کی کون سی ضرورت آن پڑی تھی؟ یہ تو خود جانیں۔ لیکن مجھے لگتا ہے اس کے پیچھے ایک ہی مقصد کارفرما تھا کہ کسی طرح غزل نما کے بہانے مناظر صاحب کی شخصیت کو داغدار کیا جائے۔ انہیں نشانہ ہدف بنایا جائے۔ ان کی کردار کشی کرکے ان کی ادبی خدمات (140 کتابیں) پر سوالیہ نشان کھڑا کیا جائے۔ لیکن محترم اس میں کامیاب نہیں ہو پائے۔ مثبت بحث کو راہ نہ دے کر ذاتیات کو گرفت میں لانا ارادۃً قطعی غیر اخلاقی و غیر ادبی فعل ہے۔ ناوک صاحب جیسے بزرگ و کہنہ مشق شاعر سے اس قسم کے غیر اخلاقی فعل کی امید نہیں تھی۔ ان سے صرف اتنی گزارش ہے کہ سماج کے لئے تعمیری ادب تخلیق کریں۔ بے ادبی، بے اصولی کو ادب میں راہ نہ دیں ورنہ ادب کے گلشن میں تنازعات کے صرف خار ہی نظر آئیں گے۔

آخیر میں میں کہنا چاہتا ہوں کہ ناوک صاحب کا مضمون نو صفحات پر مشتمل ہے۔ تین چوتھائی مضمون ذاتیات کے ارد گرد گھومتا ہے۔ یہ آپ نے بہت ہی اچھا کیا کہ اسے ایڈٹ کرکے شائع کیا۔ ان حصوں کو جن میں ذاتیات پر حملے کئے گئے تھے حذف کرنا کسی رسالے کے مدیر کے منصبی فرائض میں شامل ہوتا ہے تاکہ گندگی کے ریلے سماج تک نہ پہنچیں اور یہ فرض آپ نے بخوبی نبھایا ہے۔ یہ آپ کا ادبی بڑاپن ہے۔ اس کے لئے شکریہ۔ آپ کی عظمت کو سلام کرتا ہوں۔

ایم زیڈ خان، دفتر سی پی ایم جی جھارکھنڈ سرکل، رانچی

■ خاص نمبر بیاد ساحر لدھیانوی موصول ہوا، شکریہ۔ بلاشبہ یہ تاریخ ساز شمارہ ہے۔ مدت گزری جب صابر دت نے ساحر نمبر نکالا تھا لیکن وہ بھی اتنا جامع نہ تھا۔ آپ نے بہت محنت، محبت اور صدق دلی سے جو مواد اکٹھا کیا وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ آپ نے مجھے بھلا دیا ہے ورنہ اگر رابطہ رہتا تو میں بھی شمولیت کرتا۔ اگر کوئی خاص نمبر یا شمارہ نکالا کریں تو اس کے موضوع سے مطلع کر دیا کریں تو ممکن ہے میں بھی کچھ بھیج دیا کروں۔ شروع میں آپ نے رابطہ رکھا جو بھی ممکن تھا میں خدمت کر گزرا۔ جب بھی آپ نے شمارہ بھیجا میں نے بلا تاخیر اس کی قیمت ادا کر دی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے آپ کو 'ادب ساز' کے تعلق سے خط لکھا تھا، چند غزلیں بھی بھیجی تھیں مگر جواب نہ ملا۔ اس کے بعد قومی اردو کونسل کے 'اردو دنیا' اور 'فکر و تحقیق' کی ادارت پر مبارک باد کا بھی خط لکھا مگر آپ کی مصروفیات نے شائد آپ کو اجازت نہ دی۔ بہر حال آپ کا خلوص میرے دل پر نقش ہے اور میں 'ادب ساز' کے تعلق سے ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔

رئیس الدین رئیس، علیگڑھ، یوپی

اس خاص نمبر کے موضوع اور غرض و غایت کا اعلان بالتفصیل 'ادب ساز' کے شمارہ 11 کے 'پس نوشت' میں کر دیا گیا تھا، پھر بھی مستقل رابطہ نہ رکھ پانے کے لیے میں آپ ہی نہیں اور بھی تمام معاونین و مشفقین سے شرمندہ ہوں اور سبھی کے خلوص کے آگے سر جھکاتا ہوں۔ اصل میں دن رات اس قدر لکھنا پڑھنا رہتا ہے کہ جس طرح بڑھئی اپنی ٹوٹی ہوئی کرسی ٹھیک نہیں کر پاتا، راج مستری کے اپنے گھر کی دیوار اکثر ٹوٹی پڑی رہتی ہے اسی طرح میں اپنے خیر خواہوں کو جوابی خط لکھنے کا وقت نہیں نکال پاتا۔ میں واقعی شرمندہ ہوں۔ ن ظ

پس نوشت

'ادب ساز' کا پہلا خاص نمبر 1857 کی ناکام بغاوت کو منسوب تھا۔ دوسرا خاص نمبر جو پہلے نمبر سے بھی زیادہ ضخیم رہا، اردو کے سب سے مقبول شاعروں میں سے ایک ساحر لدھیانوی کے فن اور شخصیت کا احاطہ کرتے ہوئے اس لیے شائع کیا گیا تاکہ اس غیر معمولی شاعر کی غیر معمولی شاعری کی طرف ان نقادوں اور سنجیدہ ادبی قارئین کو متوجہ کیا جاسکے جن کے اذہان پر طرح طرح کے کلیشے حاوی رہتے ہیں۔ ان میں ایک کلیشے یہ ہے کہ جس تخلیقی ادب کو غیر معمولی عوامی مقبولیت حاصل ہو جائے اور جس کا اثر معمولی یا اوسط فہم وادراک رکھنے والا عام آدمی بھی قبول کرنے لگے وہ اعلیٰ درجے کا ادب نہیں ہوتا۔ اس تاثر کے تحت ساحر کو بھی صرف ایک اچھا فلمی شاعر قرار دے کر ادبی منظرنامے سے ہٹانے کی کوششیں کی گئیں۔ یہ کوششیں ساحر کی موت کے بعد نہیں بلکہ ان کی زندگی میں ہوئی تھیں اور اس حد تک کامیاب بھی رہیں کہ شہرت، مقبولیت اور عقیدت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ کر بھی ساحر کو محرومی کا احساس رہا۔ اور وہ محرومی یہ تھی کہ ان کے فن کو وہ مقام ادب میں نہیں دیا گیا جس کا وہ مستحق تھا۔ یہاں تک کہ کیفی اور جاں نثار اختر کو چھوڑ دیں تو ادب کی ان 'بڑی' ہستیوں نے بھی ساحر کے سلسلے میں بخل سے کام لیا جو ساحر کے ہم نظر اور ہم نوا تھے، اور مارکسسٹ تھے۔

ہم اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہیں کہ اس خاص نمبر نے ساحر کو ادب میں صحیح مقام دلا دیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بعض ناقدین نے اس نمبر میں بھی ساحر کے فن کی عظمت کو تسلیم کرنے سے احتراز کیا ہے۔ ایک ناقد صاحب نے اپنی بقراطیت کا اس حد تک مظاہرہ کیا کہ مضمون کی آخری سطور میں ساحر کو محض شاعر ماننے سے بھی موصوف کو تکلف رہا، حالانکہ خود وہ نقاد صاحب ایک مصرعہ بھی موزوں نہیں کر سکتے۔ تاہم ایک بات طے ہے کہ اس خاص نمبر نے ذہنوں پر دستک ضرور دی ہے اور کہا ہے کہ صاحب یہ بھی ایک شاعر تھا، ذرا اس پر بھی غور فرمایئے۔

اس خاص نمبر کو جو غیر معمولی پذیرائی ملی، کتنے ہی لوگ اسے خریدنے کے لیے مدیر کے گھر تک پہنچے، اسے دیکھتے ہوئے ہمیں یقین ہے کہ ساحر کی ادبی اہمیت کو سمجھنے سمجھانے میں یہ خاص شمارہ کچھ نہ کچھ مدد ضرور کر رہا ہے۔

دوستو، آئندہ شمارے سے ہم مشہور افسانہ نگار جتیندر بلو کی خودنوشت کا سلسلہ شروع کر رہے ہیں جو آپ کو یقیناً پسند آئے گا۔ اور ہاں۔ اس شمارے میں ہم، حقیقی معنوں میں منفرد لب و لہجے کے شاعر، جناب شجاع خاور کا خصوصی مطالعہ بھی ایک خاص گوشے کی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔ محبان ورفیقان وحریفانِ شجاع تیار رہیں۔

Volume:6 Issue:15,16,17,18 (Apr-Jun,Jul-Sep,Oct-Dec 2010;Jan-Mar 2011)

Quarterly ADABSAAZ Delhi

WORLD PANORAMA OF URDU LITERATURE

ایک خوب صورت وال پینٹنگ: حسن کی جمالیات

Printed, Published and Owned by Nusrat Zaheer Ahmed, Printed at Shobi Offset Press,2818 Gali Garhiya, Kucha Chelan, Darya Ganj, New Delhi-110002 and Published from 4/15 Khichripur-110091; Editor: Nusrat Zaheer Ahmed